سچی کہانیاں آپ بیتیاں جگ بیتیاں

ماہنامہ

سرگزشت

کراچی

اگست 2011

نگران اعلیٰ

معراج رسول

خاص نمبر

2012

PDFBOOKSFREE.PK

21 دسمبر 2012ء، دنیا کی تباہی کا حتمی دن...؟

مکروہ: اس شخص نے خدائی کا دعویٰ کیا اور آسمان پر ایک اور چاند بنا دیا

یقین بے یقینی: وسوسوں کا طوفان اٹھا دینے والی سچ بیانی

فلمی الف لیلہ، برمودا تکون، سراب اور بہت سے سچے واقعات

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سرگزشت 15
شعبدہ باز
ادارہ
ایک صفحے میں مکمل ایک نادر روزگار کا تعارفِ خاص

کفت وشنید 16
شہرِ خیال
مدیر اعلیٰ
آپ کی باتیں، آپ کے مشورے اور آپ کے سوال

پراسرار شخصیت 24
مکروہ
ڈاکٹر ساجد امجد
اس مکروہ شخص کی کتھا جس نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا

پراسرار انکشافات 51
21 دسمبر 2012ء
شیخ جابر
زمانہ قدیم کے کاہنوں کی پیش گوئی کہ اسی روز دنیا کا خاتمہ ہوگا

حیرت ناک 61
اہراموں کے اسرار
مریم کے خان
نامعلوم وقت میں تعمیر ہونے والی ان پراسرار عمارتوں کا راز کیا ہے

پراسرار شہر کتھا 85
گمشدہ سلطنت
آصف ملک
سمندر کی تہ میں نظر آنے والے ایک شہر کا تذکرہ خاص

پراسرار شب 109
ناسکا لکیریں
ابن کبیر
نامعلوم وقت میں تشکیل پانے والی لکیروں کا بیان

پراسرار سفر کہانی 99
جاپانی جوگی
الطاف شیخ
اس ڈھونگی کا تذکرہ جس نے جاپان کے سائنسدانوں کو بھی اپنا اسیر بنالیا تھا

پراسرار ہستی 125
پیش گو
ظفر سعید یوسفی
اس شخص کا زندگی نامہ جس کی پیش گوئیاں درست ہوتی ہیں

پراسرار واقعات 174
محوِ حیرت
قارئین
جنہیں عقل کی کسوٹی پر پرکھنا مشکل ہے ایسے ہی سچے واقعات

فلم و صحافت 143
فلمی الف لیلہ
علی سفیان آفاقی
فلم صحافت کی کہی ان کہی کہانیاں فلم نگری کی باتیں، یادیں

پراسرار معلومات 183
برمودا تکون
منظر امام
دنیا کا پراسرار ترین خطہ جہاں پہنچتے ہی بحری جہاز اور ہوائی جہاز غائب ہوجاتے ہیں

معاشرت 204
سراب
کاشف زبیر
بے مثل ولولوں سے گندھی تہلکہ خیز داستان، ایک دلچسپ تحریر

پراسرار زندگی نامہ 199
ڈیوڈ کوپرفیلڈ
میم۔الف
ایک ایسا شخص جو دھماکے سے اڑائی جانے والی عمارت سے زندہ نکل آیا

سچی پراسرار سچ بیانی 279
کالا آدمی
صدف
اس بدفطرت شخص نے ایک معصوم لڑکی کو حاصل کرنا چاہا تھا

سچی پراسرار سچ بیانی 269
ڈنڈا سانپ
شمیم خانم
ایک ایسے سانپ کا تذکرہ جو اپنی نوعیت کا انوکھا ہے

پراسرار سچ بیانی 244
یقین بے یقینی
سعدیہ افتخار
دل کو چھو لینے والی اور عقل کو حیران کردینے والی سچ بیانی

سچی پراسرار سچ بیانی 291
پرچی والے بابا
نوید احسن
اس کی پرچی میں ایسی کیا بات تھی جو سب رام ہوجاتے تھے

ماہنامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔
● تمام اشتہارات کمپیوٹرائزڈ کی بنیاد پر شائع کئے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی، علومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جلد 21 ❖ شمارہ 10 ❖ اگست 2011ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

مصور : شاہد حسین

شعبہ اشتہارات
منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789
نمائندہ کراچی محمد ضمان خان 0333-2168391
رانا محمد وحید 0323-2895528
نمائندہ لاہور فراز علی نازش 0300-4214400

◆◆◆

قیمت فی پرچہ 50 روپے ❖ زرسالانہ 600 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول
مقام اشاعت: C-63' فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ' کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن
مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس' ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200
Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER APNS CPNE

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قارئین کرام!
السلام علیکم!

ایک معروف روزنامہ کے صفحات پر ایک اہم شخصیت کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ اس نے ایک دوسری اہم شخصیت سے کہا کہ اسے سیاست کہتے ہیں، تمام مسائل بھول کر دونوں قومیں ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑی ہیں۔ میرا اپنا خیال ہے کہ یہ سوچ تباہ کن ہے۔ ہم دو تین یا چار قومیں نہیں، ایک قوم ہیں۔ صرف مسلمان ہیں جن کی اصل زبان وہی ہے جس میں قرآن پاک نازل ہوا ہے۔ یہ بات دیگر ہے کہ کوئی زنجباری زبان بولتا ہے تو کوئی فارسی، چینی یا سنگھالی۔ یعنی ہم میں ہزاروں قسم کی زبانیں بولنے والے ہیں مگر ہم سب ایک ہیں۔ اگر ایک نہ رہتے تو پھر فلسطین، بوسنیا جیسے دور دراز کے علاقوں میں مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم پر کبھی آواز نہ اٹھاتے۔ عراق یا افغانستان کے مسئلے پر بھی خاموش رہتے۔ ہم صرف اور صرف مسلمان ہیں بقول علامہ اقبال۔

اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفوی ہے

معراج رسول

شعبدہ باز سادھو

1926ء میں بھارتی ریاست آندھرا پردیش جو اس وقت سلطنتِ عثمانیہ "دکن" کہلاتا تھا، اس کے ایک گاؤں پتا پرتھی میں ایک بچے نے جنم لیا۔ جب وہ چھ دن کا تھا، اس وقت اس بچے کی "نام کرن پوجا" ہوئی۔ اسی پوجا کے دوران بچے کا نام رکھا جاتا ہے۔ بچے کا نام ستیہ نرائن راجو پتا پرتھی رکھا گیا۔

بچہ بڑا ہوتا گیا اور ساتھ ہی ساتھ اس کی عادات و اطوار میں بھی تبدیلی آتی گئی۔ بعض اوقات وہ ایسی باتیں کرنے لگتا کہ لوگ حیران رہ جاتے۔ اس کی باتیں اتنی گہری ہوتیں کہ لوگوں کی سمجھ میں نہ آتیں اور لوگ کہنے لگتے کہ یہ سنکی ہے۔ اس بات سے طعنوں سے اس کے والدین پریشان رہتے۔ اس کا علاج انہوں نے یہ ڈھونڈا کہ اس کے سر پر استرا پھرا دیا جاتا اور ٹنڈ پر استرے سے زخم بنا کر اس پر لیموں کا رس ٹپکاتے۔ یہ علاج گاؤں کے پنڈت وید نرائن وینکھوتی شرن نام دیو نے تجویز کیا تھا تاکہ اس کے دماغ کا خناس نکلتا رہے، پھر بھی اس کے دماغ کا یہ "خناس" دور نہ ہوا اور اس کی عجیب و غریب حرکات میں کمی نہ آئی بلکہ اضافہ ہی ہوتا گیا۔ ایک وقت وہ بھی آیا کہ وید نرائن وینکھوتی کے مندر کا کرتا دھرتا ستیہ نرائن بن گیا۔ مندر کا پجاری تو وید نرائن کا بیٹا رہا مگر وہ "تانترک" (عامل) بن کر وہاں "آسن" (جادو ٹونے کی محفل) لگانے لگا۔ آسن لگاتے ہی لوگ اپنی اپنی مشکلات کا حل پوچھنے آنے لگے۔ اس کی باتیں سچ ثابت ہوتیں اس لیے اس کی شہرت پھیلنے لگی، دیگر گاؤں تک پہنچنے لگی۔ دور کے شہروں سے بھی مستقبل کا حال پوچھنے والے آنے لگے۔ اس کا سب سے بڑا "چمتکار" یہ تھا کہ وہ سائل کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر کچھ دیر تک بدبداتا پھر سائل کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کو رگڑتے ہوئے کہتا "لے تیرا علاج ہو گیا" اور اس کی چٹکی سے راکھ جھڑنا شروع ہو جاتی۔ پوجا کے لیے جلائی گئی آگ کو "ہون" کہتے ہیں اور اس کی راکھ کو وینکھوتی۔ وہ کہتا "یہ وینکھوتی ہی تیرا علاج ہے" لوگ اس راکھ کو چاٹتے اور مرض دور ہو جاتا۔ آہستہ آہستہ اس کی شہرت ساؤتھ انڈیا سے نکل کر دہلی تک پہنچ گئی اور اندرا گاندھی نے اسے اپنا گرو بنا لیا۔ ہندو ایک خاص قسم کا بیج جو چھوارے کے برابر ہوتا ہے، گلے میں دھاگے کے سہارے پہنتے ہیں، اسے "رودراکھ" کہتے ہیں، اس پر لکیریں سی بنی ہوتی ہیں۔ ایک لکیر والا سب سے اہم مانا جاتا ہے۔ اسے "ایک مکھی" کہتے ہیں۔ ستیہ نرائن نے اندرا گاندھی کو بطور تحفہ ایک مکھی رودراکھ دیا تھا جسے وہ ہمہ وقت گلے میں پہنے رکھتی تھیں۔ مشہور ہے کہ جس کے گلے میں ایک مکھی ہوگا اسے حادثہ پیش نہیں آئے گا۔ ستیہ نرائن اب خود کو سری ستیہ سائیں بابا کہلواتا کیونکہ مہاراشٹر کے شہر شری ڈی میں ایک مجذوب رہا کرتا تھا جسے ہندو مسلمان سب مانتے تھے۔ اس کے حالاتِ زندگی پر بمبئی میں کئی فلمیں بنیں، بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔ اسی شری ڈی کے سائیں بابا کے نام پر اس نے خود کو متعارف کرانا شروع کر دیا۔ وہ "چمتکار" دکھانے کی وجہ سے مشہور ہوتا جا رہا تھا۔ السر' یا نی بی یا کسی اور پیچیدہ امراض کے مریض آتے تو وہ ہوا میں ہاتھ لہراتا۔ اس کے ہاتھ میں قینچی یا چھری آ جاتی۔ وہ اسے مریض کے پیٹ یا زخم والی جگہ پر پھیرتا کہ میں نے آپریشن کر دیا۔ حیرت انگیز بات کہ مرض میں افاقہ بھی ہو جاتا۔ وہ ہوا میں ہاتھ لہرا کر دوا برآمد کرتا اور مریض کو دے دیتا۔ اسی طرح جنتر (تعویذ) وغیرہ بھی ہوا سے برآمد کرتا۔ اس قسم کے چمتکاروں کے خلاف شعبدہ بازوں نے بھرپور مہم چلائی اور ایسے تمام چمتکاروں کو پیش کرنے کا طریقہ بتایا جس کی فلم آج بھی یوٹیوب پر دیکھی جا سکتی ہے لیکن اس کا سحر ٹوٹ نہ سکا۔ لوگ اسی طرح اس کے آشرم میں بھرے نظر آتے۔ چڑھاوے کے طور پر ہر روز بہت بڑی رقم آتی تھی۔ اس نے اس رقم سے فلاحی کام بھی کیے۔ اپنے گاؤں "پتا پرتھی" کے نزدیک آشرم کے گرد ایک نیا شہر بسایا۔ ایک ائرپورٹ، دو اسپورٹس کمپلیکس، ایک جدید اسپتال اور اعلیٰ درجے کے اسکول و کالج بنوائے۔ بھارت بھر میں پرائمری تک مفت تعلیم کے انتظامات کیے۔ بنگلور شہر میں بھی ایک اعلیٰ مشینوں سے مزین اسپتال تعمیر کرایا جہاں مفت علاج کیا جاتا ہے۔ کرشن ندی سے مدراس تک پانی پہنچانے اور اسے پینے کے قابل بنانے کے لیے پائپ لائن بچھوائی، فلٹر پلانٹ لگوایا۔ 5 ارب ڈالر کا امدادی ٹرسٹ فنڈ قائم کیا جس کی نظیر ایشیا بھر میں نہیں ہے۔ 24 اپریل 2011ء کو 85 سال کی عمر میں وہ طبعی موت مرا۔ اس کے مرنے کے بعد آشرم کے ایک کمرے سے 103 کلو سونا، 403 کلو چاندی، ڈھائی کروڑ کے جواہرات اور 11 کروڑ روپے نقد برآمد ہوئے۔ تادمِ تحریر بھارتی حکومت اس کے مجموعی اثاثے کی قیمت لگا نہیں پائی ہے۔ بھارت اور دیگر ممالک میں اس کے 7 کروڑ سے زائد بھگت (مرید) ہیں پھر بھی یہ فیصلہ نہیں ہو پایا ہے کہ واقعی اس کے پاس کوئی آلوکک شکتی (روحانی قوت) تھی یا وہ شعبدے باز تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شعاعِ خیال

بالآخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوگئیں۔ پُراسراریت نمبر آپ تک پہنچ ہی گیا۔ 2002ء میں سالگرہ نمبر شائع ہوا تھا، اس کے بعد سے عام شمارے آتے رہے تھے اس لیے خاص نمبر کے معیار کو برقرار رکھنے کے لیے مضامین کے انتخاب میں کافی دشواری ہوئی کیونکہ سرگزشت کا مزاج جدا ہے، سرگزشت کے قارئین کا شمار بھی عام قارئین میں نہیں ہوتا، سب کے سب باشعور، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اس لیے من گھڑنت باتوں سے گریز کیا گیا۔ نانی دادی کی سنائی بھوتوں، چڑیلوں کی بے تکی کہانیوں سے بھی دامن بچایا گیا اور تحقیقی تحریروں کو فوقیت دی گئی۔ اس کے لیے ہمیں جبراً سچ بیانیوں کی تعداد بڑھانا پڑی۔ علمی آزمائش اور بیت بازی کے صفحات بھی روکنے پڑے تاکہ خاص نمبر خاص نمبر ہی ثابت ہو۔ آخر میں ایک گزارش اور ہے کہ بھرپور تبصرہ کریں تاکہ اگلا خاص نمبر بہ آسانی ترتیب دیا جاسکے۔

✉ **ناصر حسین رند**، بہاولپور سے لکھتے ہیں ”سب سے پہلے سرگزشت کے بانی معراج رسول صاحب، عذرا رسول صاحبہ اور سرگزشت کی تمام ٹیم کو پُراسراریت نمبر شائع کرنے پر دل کی تمام تر گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتے ہیں اور سونے پہ سہاگا کہ سرگزشت کا پُراسراریت نمبر ایسے تین زبردست موقعوں پر ہمارے پاس آرہا ہے جو کہ کسی بھی خاص تحفوں سے بڑھ کر ہے۔ اگست کا شمارہ، جشنِ آزادی کا تحفہ۔ رمضان المبارک کی آمد، جب رمضان المبارک کی رحمتوں اور برکتوں کے ساتھ خاص نمبر کا تحفہ بھی میسر ہوگا اور جس وقت یہ شمارہ ہمیں ملے گا اس وقت ساون کا مہینہ برس رہا ہوگا۔ واہ، مزہ آجائے گا پُراسراریت نمبر کے مطالعے کا۔ بقول شخصے برسات کے موسم میں، تنہائی کے عالم میں، میں گھر سے نکل آیا، پُراسراریت نمبر بھی اٹھالایا۔ دل میں ایک خواہش تھی کہ پُراسراریت نمبر جس وقت ملے یا تو سردیوں کا موسم ہوتا کہ رضائی میں گھس کر سرگزشت کا مطالعہ کیا جاتا یا پھر بارشوں کے مہینے میں جب آسمان پر بجلی کڑک رہی ہو، زبردست قسم کی بارش ہورہی ہو اور ہم لیمپ کی روشنی میں رات کے پچھلے پہر سناٹے میں پُراسراریت نمبر کو مزید پراسرار ماحول میں پڑھ رہے ہوں۔ معراج صاحب آپ نے ہمارے دل کی آواز سن لی، آپ کا بہت بہت شکریہ۔ سب سے پہلے پُراسراریت نمبر کا اشتہار دیکھا۔ کچھ منظر واضح ہوگئے۔ کیا دسمبر 2012ء میں کرۂ ارض فنا ہوجائے گا؟ حضرت دانیال علیہ السلام کی پیش گوئی بھی کچھ اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔ مایا تہذیب کا پراسرار کیلنڈر بھی 21 دسمبر 2012ء پر جاکر ختم ہوجاتا ہے۔ امریکا، برطانیہ، آسٹریلیا اور دیگر ممالک میں پائے جانے والے پُراسرار دائرے بھی اسی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ 21 دسمبر 2012ء کو ایک شہاب ثاقب کا ذکر ہے جو کہ زمین سے ٹکرائے گا۔ اور بھی بہت سی وجوہات ہیں جو 21 دسمبر 2012ء بروز جمعۃ المبارک کے دن زمین کے لیے انتہائی نحوست کا دن ہے۔ ہمارے شہرِ خیال کے ساتھی ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی صاحب نے ہمارے منہ یعنی دل کی بات آپ سے کہہ ڈالی کہ پُراسراریت نمبر ایسا موضوع ہے جس کا ایک شمارے میں احاطہ ممکن نہیں ہے۔ ہم بھی ان کی اس بات سے متفق ہیں بلکہ صدفی صد متفق ہیں اور ان کا یہ کہنا کہ جس طرح جیل نمبر دو تین شماروں پر محیط تھا اسی طرح پُراسراریت نمبر کو بھی کردیں۔ معراج صاحب حصہ اول اور حصہ دوم کردیں۔ اس طرح پُراسراریت نمبر کا بہت سا مواد ضائع ہونے سے بچ جائے گا۔ (مواد ضائع نہیں ہوگا، انشاء اللہ کسی مناسب موقع پر پُراسراریت نمبر دوبارہ شائع کیا جائے گا) وہ بھلا کیسے ذرا غور کیجیے۔ اہرامِ مصر کی پُراسرار تعمیر کا ذکر ہو اور برطانیہ کے اسرار میں لپٹے ستونوں کا ذکر نہ ہو جو کہ اسٹون ہینج کے نام سے مشہور ہیں۔ نہ جانے وہ کون سی مخلوق تھی جو اتنے بھاری ستون ایک پہاڑی کی چوٹی پر لے کر گئی جو کہ ایک بھید ہے۔ امریکی سرزمین پر قدرت کی بنائی ہوئی منحوس لکیروں کا ذکر ہو اور برطانیہ، آسٹریلیا، امریکا اور دیگر ممالک میں بنے پراسرار دائروں کا ذکر نہ ہو، جو کسی پراسرار مخلوق سے وابستہ ہیں جس پر ہالی وڈ کی مشہور زمانہ فلم The Sings میل گبسن کا شاہکار ہے۔ خدائی دعوے دار ابن مقنع کا کہ جس نے نیا چاند پیدا کرکے دکھایا تھا، اس کا ذکر ہو اور تاریخ کے سب سے پُراسرار آدمی حسن بن صباح کا ذکر نہ ہو۔ فری میسن جیسی شیطانی تنظیم کا ذکر ہو اور سریس مسٹری کے پراسرار لوگوں کا ذکر نہ ہو، جن کا دعویٰ ہے کہ ان کا رابطہ دوسرے سیاروں پر رہنے والی مخلوق سے ہے اور جاوجوگر کا ذکر ہو اور دجال کا ذکر نہ ہو۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ پُراسراریت نمبر کا پارٹ ون اور پارٹ ٹو بھی شائع کریں۔ (آپ کی تجویز کا شکریہ، انشاء اللہ ہم ان موضوعات پر تحقیق ضرور کروائیں گے) ہم کئی سالوں سے کہتے آرہے ہیں کہ تاریخ کے سب سے بڑے اور پُراسرار نجومی ناسٹرڈیمس پر لکھیں۔ اگر ناسٹرڈیمس پُراسراریت نمبر میں شائع ہونے سے رہ گیا تو پھر سمجھیے کہ رہ گیا اور اس کا زندگی بھر افسوس رہے گا۔ (ناسٹرڈیمس پر مضمون شامل ہے۔ اگلے خصوصی شمارے میں بھی مزید معلومات فراہم کی جائیں گی، انشاء اللہ) اب جولائی کے شمارے پر تبصرہ پیشِ خدمت ہے۔ سب سے پہلے ٹائٹل پر نظر پڑی۔ ایک حسینہ اپنا تھوڑا سا چہرہ آنچل میں چھپائے نظر آئی۔ اس سے آگے معراج رسول صاحب اپنے قلم سے

جہاد کرتے نظر آئے۔ موجودہ حالات میں سچ کہنا اور سچ لکھنا جہاد سے کم نہیں ہے۔ فیثا غورس سے ہوتے شہرِ خیال میں پہنچے تو ہمارے دوست ہمارے بھائی سہیل احمد عباسی صاحب ہمیں یاد کرتے نظر آئے۔ جو کافی سالوں سے لاپتا ہوگئے تھے اور ہمارے یاد کرنے پر ہم سے دوبارہ آن ملے۔ ہم ان کو دیکھ کر کرتے ہیں۔ ان کی فری میسن کا شدت سے انتظار کرتے ہیں۔ رانا محمد سجاد نے خوب تبصرہ لکھا۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری صاحبہ، بشریٰ افضل صاحبہ کو شدت سے یاد کررہی تھیں، ان کا آپس میں پیار اور تعلق ایسے لگا جیسے کہ عالمِ ارواح کا رشتہ ہو کیونکہ جب ہم عالمِ ارواح میں تھے تو وہاں پر کچھ روحوں کی دوستی ہوگئی تھی اور پیار کا رشتہ قائم ہوگیا تھا۔ ملک ثاقب شاد تحولی ایڈووکیٹ صاحب، آپ کا کہنا سر آنکھوں پر، لیجیے ہم حاضر ہیں۔ ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی، اگر ہمارے آنے سے رونق ہوگئی ہے تو پھر بسم اللہ کردی ہے۔ عزیز اللہ صاحب، جناب ہم نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا۔ افتخار احمد گھمن اور خالد کبیر آپ دونوں کی محبت کا شکریہ۔ آنٹی سدرہ بانو ناگوری، ہمیں سال بعد پڑھ رہی تھیں۔ جناب، اب ہم نہیں آپ کا پیچھا چھوڑنے والے۔ ویسے ہم تو آپ کے ہیرو سلمان خان سے دس سال چھوٹے ہیں، آپ کترینہ کیف سے کتنی چھوٹی ہوں گی۔ ہمیں تو جولائی کا شمارہ پُراسراریت نمبر کا ٹریلر لگ رہا تھا۔ وہ بھلا کیسے، اس میں ڈریکولا، آدم خور، جل پری، قاتل پہاڑ ناگا پربت، ڈولفن اور سب سے بڑھ کر سچی کہانیوں میں اندھیرے کی موت تو ایک نہایت ہی پُراسرار کہانی تھی۔ اگر اس کہانی کو آپ پُراسراریت نمبر کے لیے رکھ لیتے تو کتنا اچھا ہوتا، بہرحال یہ ایک ایسی کہانی تھی جو ہمیں مدتوں یاد رہے گی اور ایسی تحریریں ہی سرگزشت کا خاصہ ہوا کرتی ہیں۔ اگر اس کہانی کا نام اندھیرے کی موت کے بجائے ”چیخ“ ہوتا تو کہانی پرفٹ ہوجاتا بہرحال یہ کہانی پہلے نمبر پر رہی۔ معراج صاحب، آپ کو یاد ہوگا کہ ہم نے مئی کے شمارے میں لکھا تھا، پُراسراریت نمبر ایسا ہوگا جسے قارئین جلدیں کروا کر رکھیں گے، اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آپ نے ہالی وڈ کی فلمیں دیکھی ہوں گی، ان میں کسی شیطانی قوت اور بدروح سے نجات کے لیے ان کو فلم کے آخر میں ایک ایسی کتاب میسر آجاتی ہے جس سے ان کو اس عفریت سے نجات مل جاتی ہے اور اس کتاب میں ایسا نسخہ یا دعا ہوتی ہے جسے پڑھنے کے بعد اس خونخوار بلا سے نجات مل جاتی ہے۔ آخر میں شہرِ خیال کے ساتھیوں میں سے ملک ثاقب تحولی ایڈووکیٹ، ایم خالق بھٹی، سعید احمد چاند، ملک جاوید محمد خان درانی، اعجاز حسین سٹھار، سدرہ بانو ناگوری، ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری اور سہیل احمد عباسی کو بہت بہت سلام۔ سہیل احمد عباسی کے بعد علی حسنین بھٹی، محمد یونس بلوچ اور سمیرا تبسم کا شدت سے انتظار ہے۔“

✉ **سدرہ بانو ناگوری**، شیر شاہ کراچی سے ”امید ہے کہ خیر و عافیت سے ہوں گے۔ سرگزشت کا شمارہ ہاتھ میں آتے ہی سب سے پہلے انکل کا اداریہ پڑھا۔ ملک کے موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے یہی دعا دل سے نکلتی ہے کہ خدا پاکستان کی اور پاکستان میں بسنے والے ہم وطنوں کی حفاظت کرے، آمین! شہرِ خیال میں شوکت رحمن خٹک صدارت کی کرسی پر براجمان نظر آئے۔ سعید احمد چاند، ایم اے خالق بھٹی، طاہر الدین بیگ، افتخار احمد گھمن کا بہت شکریہ کہ آپ لوگوں نے میرا تبصرہ پسند کیا، فلمی الف لیلیٰ میں اس دفعہ ماضی کی سپر اسٹار اداکارہ شمیم آرا کا تذکرہ اچھا لگا اور عبرت آموز بھی کہ کیسے کیسے معشوق زمانہ آج یار رفتگاں بنتے جارہے ہیں۔ وہ جو دلوں کی دھڑکن تھی، آج اس کی اپنی دھڑکنوں نے بے وفائی کی ٹھانی ہے اور آج جو ہے وہ کل نہیں ہوگا۔ یہی الف لیلیٰ نے سبق سکھایا ہے۔ اے حمید اور سعادت حسن منٹو کا تذکرہ بھی اچھا لگا۔ کیسے کیسے لوگ مٹی ہوگئے۔ یہ وقت ہی ایسا ہے کہ بڑے بڑے نام بے نام ہوتے جارہے ہیں۔ بقول شاعر بہت آگے گئے باقی جو ہیں، تیار بیٹھے ہیں۔ اب آتے ہیں سراب کی طرف۔ پچھلے ماہ میں نے کہا تھا کہ ایک ہی تصویر کوئی کب تک دیکھے، انکل کاشف زبیر نے تو یہ تصویر ہی مٹا ڈالی۔ ایک اذیت ناک موت کا شکار زرین، شاید میں بھی تمہاری موت کی ذمے دار ہوں۔ سوری ویری سوری۔ سچ بیانیوں میں بے گناہ مجرم فریدہ صاحبہ کی آپ بیتی کہ انہوں نے اپنے شوہر کے ساتھ بے وفائی کی اور دولت کی خاطر نواب صاحب سے دوسری شادی رچالی اور نواب صاحب کی محبتوں کی مشکور ہونے کے بجائے ان کو اتنا بڑا دھوکا دیا کہ وہ اتنا بڑا صدمہ برداشت نہ کرسکے اور موت کو گلے لگا بیٹھے۔ آخری راستہ ڈاکٹر ایس ایم صدیقی کی کہانی میں دو نوجوان اور خوبصورت لڑکیوں کی خودکشی کے بارے میں پڑھ کر دل کانپ سا گیا۔ بھائی صاحب ایک بہت ہی مزاحیہ تحریر تھی اور کارل مارکس کے جملوں نے تو بہت ہی مزہ دیا۔ قسمت کا دھنی واقعی دلچسپ کہانی تھی کہ فیاض کی جو قسمت تھی ایسی قسمت بہت ہی کم لوگوں کو ملتی ہے۔ باقی کہانیاں بھی بہت پسند آئیں اور آخر میں انکل معراج رسول صاحب، آنٹی عذرا رسول صاحبہ، سرگزشت کی پوری ٹیم اور تمام ہم وطنوں کو یومِ آزادی 14 اگست کی بہت بہت مبارک باد۔“

✉ **اعجاز حسین سٹھار**، نور پور تھل سے حاضر ہیں ”پچھلے ماہ ہم اس محفل سے دور اور اللہ تعالیٰ کے قریب رہے۔ عمرہ کی سعادت حاصل ہوئی اور روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حاضری دی اور درود و سلام پیش کرنے کی سعادت ملی۔ (آپ کو ادارے اور شہرِ خیال کے دوستوں کی جانب سے بہت بہت مبارک ہو) پاک سرزمین پر پورا ایک ماہ قیام رہا اور برادر محترم معراج رسول کا باقاعدہ نام لے کر ان کی صحت و تندرستی کے لیے دونوں مقامات پر دعائیں مانگیں، قبول کرنے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے۔ (جزاک اللہ) فلمی الف لیلیٰ میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ موجودہ قسط کافی معلومات لیے ہوئے ہے اور تصویروں نے گزری یادیں تازہ کردیں۔ امید ہے آنے والے ماہ پھر سے فلم نگری کے قصے پڑھنے کو ملیں گے۔ آدم خور بھی لہو گرم رکھنے کا اچھا بہانہ ثابت ہوا ہے۔ شکار کی یہ مہم کافی مشکل ثابت ہوئی۔ آخر انسانی ہمت اور بہادری نے کامیابی سے ہمکنار کیا۔ اگر شکاری کا نام ساتھ دیا جائے تو بہتر ہوگا اور یہ تو مسلمان تھے۔ سراب تجسس، تحیر، دلچسپی، ہیجان اور روانی کے لحاظ سے عروج پر ہے، ہر صفحہ بلکہ بدلتے حالات کے ساتھ ہماری آنکھیں بند ہوتی اور کھلتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہیں۔شہباز کی خود اعتمادی دیکھ کر ہم نے اپنے کئی خیالات بدلنے کی کوشش شروع کر دی ہے۔کئی واہموں کو ذہن سے جھٹک رہے ہیں لیکن کچھ صفات فطری ہوتی ہیں، وہ موت سامنے دیکھ کر بھی زندگی کی امید لگائے رکھتے ہیں، اللہ کی ذات پر یقین رکھتے ہیں اور ہمارے لیے یہ حیرت کی بات ہے کہ ان کے عزائم، یقین اور خود اعتمادی دیکھ کر موت بھی نظریں جھکائے، تھکے قدموں کے ساتھ اور شکست خوردہ حالت میں واپس چلی جاتی ہے۔کبھی ہم میں بھی ایسی خود اعتمادی آ جائے تو ساری پریشانیاں دور بھاگ جائیں۔اللہ کرے ایسا ہو جائے۔سچ بیانیوں میں پہلی کہانی ''بے گناہ مجرم''.....فریدہ کو عزت کی زندگی راس نہ آئی اور وہ نواب صاحب کا پیار اور خلوص نہ سنبھال سکی اور بیگمات کی سازشوں کا شکار ہو گئی۔ایسی سادگی اور شرافت کا کیا فائدہ کہ برے بھلے میں تمیز نہ کی جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ محض فریدہ کے غلط فیصلے کی وجہ سے نواب صاحب جیسا وعدہ نبھانے والا زندگی سے گزر گیا بلکہ ایک خاندان تباہ ہو گیا وہ اللہ کی رضا پر راضی رہتی تو یہ دور کی بات نہیں تھی کہ اس کی بیٹی کو دولت اور جائداد میں حصے دار ٹھہرا دیا جاتا، وہ جلد بازی میں دنیا اور آخرت ہار بیٹھی جس کا ازالہ ممکن نہیں۔''آخری راستہ'' کی تعارفی سطروں میں خود اذیت پسندی کو مرض لکھا گیا ہے، میں سمجھتا ہوں، یہ بڑے لوگوں کے شوق ٹھہرے.... کوڑے کے ڈھیر سے رزق تلاش کرنے والی، گھروں میں جھاڑو، برتن مانجھنے اور سڑکوں پر پتھر کوٹنے والی کسی لڑکی کو یہ مرض کبھی لاحق نہیں ہوا۔شیریں فرہاد میں دراصل انسانی اقدار اور روایتوں کا تجزیہ کیا گیا ہے، کچھ لوگ کتنے ابن الوقت ہوتے ہیں۔ایک اپنی ذات کو فائدہ پہنچانے کے لیے دوسرے دس بھائیوں کو مشکلات میں جھوک دیتے ہیں۔اس کا مظاہرہ ہم ہر شعبۂ زندگی میں دیکھ سکتے ہیں لیکن یہاں انسانیت کا سر بلند کرنے والے کردار تھے جو اپنے حصے کی خوشیاں بھی دوسروں کی جھولی میں ڈال کر خوش و مطمئن ہیں۔سچ کا سودا اور بھائی صاحب عجیب کہانیاں ہیں، اندازِ تحریر اور پلاٹ نے متاثر نہیں کیا بس اپنے مزاج اور رجحان کی بات ہے۔ اندھیرے کی موت پڑھ کر خوف طاری ہے، شاید یہ پُراسراریت نمبر کی ایک جھلک ہے لیکن سچی بات ہے، ایسے واقعات کو ذہن آسانی سے تسلیم نہیں کرے گا اور نہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ حقیقت کو قریب سے دیکھنے اور پرکھنے کے لیے ان واقعات کا حصہ بنیں بس ایسے حالات سے اللہ دور ہی رکھے، آمین! تعبیرِ خواب میں روبی کی نیک نیتی اور کردار کی مضبوطی کا عمل دخل ہے۔والدین کی دعاؤں اور کسی نیکی نے بھی اسے حصار میں لیے رکھا اور وہ خراماں خراماں چلتے ہوئے من پسند جنت میں داخل ہو گئی وگرنہ جیسے منصوبے زبیر کے تھے، وہ آلہ کار بن جاتی تو ذلت، خواری اور عزت گنوانے کے بعد جیل کی کال کوٹھری میں نفسیاتی مریضہ بن کر پڑی سسک رہی ہوتی۔''

* **سید محمد عظیم شاہ بخاری**، خان پور کٹورہ سے ''چار مہینوں میں یہ میرا شاید تیسرا خط ہے مگر مسلسل دو خطوط شاید دیر سے موصول ہوئے۔ملک میں گرمی اور لوڈ شیڈنگ دونوں کا زور عروج پر ہے لیکن ہم خان پور والے آموں کو دیکھ دیکھ کر جی رہے ہیں۔اس بار شہرِ خیال میں کافی نئے چہرے دیکھنے کو ملے۔ہم تو خیر میڈیکل کی تعلیم کی وجہ سے چند ماہ سے غائب تھے، کوئی ہمیں کہاں جانتا ہوگا۔سرگزشت میں فیثا غورس کا تعارف پسند آیا۔فلمی الف لیلہ کافی اچھی رہی۔ٹائٹانک پر بہت کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوئیں۔کوہ نور، ڈریکولا اور فضائی قزاق بھی اچھی رہیں۔سچ بیانیوں میں بے گناہ مجرم اور قسمت کا دھنی خوب تھیں۔بھائی صاحب پڑھ کر حیرانی ہوئی کہ بھائی صاحب جیسے لوگ بھی ہوتے ہیں۔کمال ہے بھئی، آخری راستہ عبرت آموز تحریر تھی۔خود اذیت پسندی آہستہ آہستہ ہمارے معاشرے میں جڑ پکڑ رہی ہے۔اس کو روکنا ہی ہوگا۔شیریں فرہاد جیسی کئی کہانیاں ہمارے آس پاس ہیں مگر فرق اتنا ہے کہ ان کہانیوں میں ہر آدمی فرہاد نہیں ہوتا۔اٹک برج بہت اعلیٰ، معلوماتی مضمون تھا۔اٹک کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔ایک اور بات کہ ضلع اٹک کا جنوبی حصہ تیل کی دولت سے مالا مال ہے۔پنجاب میں سب سے زیادہ تیل اسی حصے سے نکالا جاتا ہے جس میں توت، کھوڑ، ڈھلیاں اور بسال کے علاقے شامل ہیں۔نائیجر پر مضمون سب سے اچھا لگا۔ایک غیر مشہور دریا کی دریافت کی کہانی بہت مزے دار تھی۔نائیجر مغربی افریقا میں زندگی کی علامت ہے۔مالی کی آدھی سے زائد آبادی اس کے کنارے آباد ہے۔جبکہ مالی کی زراعت کا انحصار اسی دریا پر ہے۔صفحہ 158 میں نیامے کو نائیجر یا کا دارالحکومت لکھا گیا ہے جبکہ نیامے نائیجر نامی ملک کا صدر مقام ہے۔ایک اور بات یہ بھی بتاتا چلوں کہ نائیجر ڈیلٹا وسیع تیل کے ذخائر رکھتا ہے۔نائیجر یا میں بیشتر تیل کے کنویں نائیجر ڈیلٹا کے علاقے میں ہی واقع ہیں جو آج کل بلکہ گزشتہ چند برسوں سے جنگ و جدل اور خون خرابے سے متاثرہ علاقہ ہے۔میری انکل زلفی شاہ سے گزارش ہے کہ قلعہ دیراوڑ، ہونگ مسجد اور فورٹ منرو جیسی خوبصورت جگہوں کے بارے میں بھی لکھیں۔اللہ ہم سب کا اور پاکستان کا حامی و ناصر ہو۔''

* **طاہر الدین بیگ**، میر پور خاص سے ''جولائی کا سرگزشت اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ ملا۔ایڈونچر، تھرل، رومانس اور تاریخی پس منظر میں لکھی ہوئی کہانیاں معلومات میں بیش بہا اضافہ کرتی ہیں۔کیمیائی ہتھیار روتنگنے کھڑے کر دینے والی کہانی جسے مشہور لکھاری مریم کے خان نے لکھا اور خوب ہی لکھا۔ابن کبیر ڈریکولا لے کر آئے اور خوب لے کر آئے۔ڈریکولا پڑھتے ہوئے ہمیں کرسٹوفر لی بہت یاد آئے جو انگلش فلموں کے مستند ڈریکولا تھے۔حبیب صاحب کی زندہ لاش بھی پاکستان میں بننے والی پہلی اور آخری کوشش تھی جس میں ریحان صاحب ڈریکولا بنے تھے پھر جل پری بچوں اور بڑوں سب کے لیے ایک معلومات سے پُر کہانی جسے ابراہیم جمالی نے ترجمہ کیا اور خوب ہی کیا۔پھر یوسفی صاحب کی تشہیر ایک ایسے انسان کی سرگزشت جو اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتا تھا اس لیے سب کا بیڑا غرق کرتا گیا، یہ تھا ایڈورڈ گرین اور جس نے آنکھیں کھلی رکھی ہوئی تھیں، وہ تھیں مس سارا۔اچھی کہانی تھی، دلچسپ بھی اور سبق آموز بھی۔طارق عزیز خان کی نائیجر پڑھ کر معلومات میں زبردست اضافہ ہوا۔سرگزشت کے کرتا دھرتاؤں سے التماس ہے کہ ایسی کہانیوں کو

آتے رہنا چاہیے، بہت شاندار اضافہ ہے سرگزشت کے صفحات پر۔اب آتے ہیں ایڈونچر، تھرل کی طرف، اور وہ ہے شکیل ادریس صاحب کا معجزہ سطر سطر دل کی دھڑکن تیز کر دینے والی کہانی۔بہت ہی زبردست ہے، خوب ہی معلومات پر مبنی ہے، کوہ نور۔کیا کہنے، ہماری معلومات میں زبردست اضافہ ہوا۔شکار کے موضوع پر کافی دنوں کے بعد کوئی کہانی آئی اور خوبصورت آئی ہے۔آپ بیتی کہہ لیں یا جگ بیتی کہہ لیں، اچھی ہوتی ہیں اور دلچسپ بھی جیسے محبت زندگان اور ایک کہانی ہے آخری راستہ۔اب کچھ تذکرہ ہو جائے خطوط کے بارے میں۔شہرِ خیال میں سدرہ بانو ناگوری، بلی سفیان آفاقی سے گلہ کرتی ہوئی نظر آئیں اور خوب ہی نظر آئیں، اچھی تحریر ہے۔آفاقی صاحب سے شکایت ہمیں بھی ہے۔اتنے زبردست لکھنے والے اور معین اختر مرحوم کے لیے ایسی دل توڑنے والی معمولی تحریر جو آفاقی صاحب کے شایانِ شان نہیں، معین پرفیکٹ تھے، ان جیسا فنکار اب صدیوں میں پیدا ہوگا اگر یقین نہ آئے تو انور مقصود صاحب کے خاکے دیکھ لیں اور معین اختر کی پرفارمنس دیکھ لیں، واقعی وہ لیجنڈ تھے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔اس ماہ کہانیوں کا انتخاب سپر کلاس رہا۔''

* **سہیل احمد عباسی**، پوٹھوہار سے ''جولائی کا سرگزشت اپنے گلہائے رنگا رنگ کے ساتھ وقت مقررہ پر جلوہ افروز ہوا۔وقت موجود کا نوحہ معراج رسول صاحب کی زبانِ دل کی آواز تھا لیکن اسے کیا کہیں کہ چارہ گروں کی بیداری کا وقت شاید ابھی نہیں آیا۔بانی جیومیٹری فیثا غورس کا تذکرہ مختصر لیکن جامع تھا۔یک صفحی سرگزشت میں روحانیات یا مذہبی اسکالرز وغیرہ کا تذکرہ بہت کم کیا گیا ہے، کیا یہ صفحہ صرف سائنس و ادب کے لیے مخصوص ہے۔ شہرِ خیال میں اپنے خط کو سب سے پہلے پڑھا، میرے فری میسن والے مضمون کے شائع ہونے یا نہ ہونے کا پتا نہیں چلا اس لیے مایوسی ہوئی کہ عربوں کا مقولہ ہے، الانتظار اشد من الموت کہ انتظار موت سے بھی سخت ہوتا ہے۔دوسرے خطوط میں طاہر الدین بیگ، تفسیر عباس بابر، رانا محمد سجاد، سعید احمد چانڈ، افتخار احمد گھمن کے خطوط پسند آئے۔ابن رشد کا تذکرہ حیات صدیوں چلنے والی اس جنگ کا افسانہ تھا جو فقہا اور محدثین اور عقل پسند فلسفیوں کے درمیان جاری ہے اور اس کا سب سے بہترین امتزاج حضرت محی الدین ابن عربیؒ کو سمجھا جاتا ہے جبکہ ابن رشد کبھی بھی وہ شرفِ قبولیت حاصل نہ کر سکے اور اپنے ایسے نظریات کا شکار رہے جو امت میں کبھی مقبول نہ ہو سکے حتیٰ کہ جن کا کھلی مجالس میں دفاع کرنے والا بھی کوئی نہ رہا۔لیکن امتِ مسلمہ کے دورِ زوال میں یورپ کی ذہنی غلامی کے تحت اور اسلام اور اسلامی نظریات کو یورپی اور مستشرقین کی عینک سے دیکھنے کا رواج شروع ہوا اور ہر باغی، عقل پسند اور فلسفی کو اسلام کا ہیرو کہا جانے لگا۔اپنے وطن کے عظیم الشان پہاڑی سلسلوں میں واقع ہیبت ناک چوٹی نانگا پربت کا تذکرہ معلومات افزا تھا۔اٹک برج کی تفصیلی داستان بہترین تھی، اس میں مزید یہ بتاتا چلوں کہ سکھر اور روہڑی کے جڑواں شہروں کو ملانے والے لوہے کے پل کے گرڈرز بھی ویسٹ ووڈ بیلی اینڈ کمپنی لندن کے بنے ہوئے ہیں اور آج تک ٹریفک کے لیے استعمال ہو رہے ہیں اور انہیں بھی تقریباً ایک سو تیس سال ہوئے ہیں اور پنجاب کے زائرین جو حضرت لال شہباز قلندرؒ کے عرس پر جاتے ہیں وہ اس پل کو خوب جانتے ہیں کہ حضرت کے مرشد سید صدرالدین شاہؒ کا مزار اس پل کے قریب واقع ہے۔کیمیائی ہتھیار روس کے خلاف مغربی پروپیگنڈا تحریروں کا ایک اور افسانہ معلوم ہوا۔حالانکہ سوویت یونین اتنا نکما اور نااہل نہیں تھا جتنا کہ مغربی میڈیا اسے بنا کر پیش کرتا ہے اور نہ ہی روسی ہتھیار اتنے بیکار ہوتے ہیں جیسا کہ امریکی بیان کرتے ہیں۔روسی ہتھیار انتہائی پائیدار اور وفادار ہوتے ہیں جن کے مقابلے میں امریکی یورپی ہتھیار جلد خراب ہونے والے اور محدود صلاحیت کے مالک ہوتے ہیں جبکہ ان ہتھیاروں کی انڈسٹری جو۔ان کی سب سے بڑی انڈسٹری ہے، مسلسل حرکت کرتی رہی۔روسی ساختہ سخوئی طیارہ اس وقت دنیا بھر میں اول نمبر پر مانا جاتا ہے جس کا دنیا بھر میں کوئی توڑ نہیں اور اس کے علاوہ یہ کہ ایک زرعی اور آن پڑھ ملک کو ایک جدید ریاست میں ڈھال کر ہر قسم کی ایجادات روسیوں نے کی ہیں جسے غیر جانبدار مبصرین سراہتے ہیں اور اس کے ٹوٹنے کا سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو ہوا ہے کہ امریکی غنڈا گردی کو کوئی چیلنج کرنے والا نہیں رہا۔''

* **مونا گل** آف بنوں تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں'' کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تحریر کا آغاز کیسے کروں؟ زرین کی بے دردی سے موت نے بہت رلا دیا ہے۔اس دفعہ بنوں میں سرگزشت و جاسوسی دونوں بہت لیٹ ہوئے۔سرگزشت تو خدا خدا کر کے کم جولائی کو ملا ہے۔ابھی دکاندار صحیح بنڈل ہی کھول رہا تھا کہ ابتدائی سرگزشت ہم نے خریدا لیکن جاسوسی پھر بھی نہ ملا۔بہر حال سراب کی قسط نے اس دفعہ دل کو زخمی کر کے رکھ دیا۔شہباز صاحب پہلے کبھی اتنے مجبور نہیں ہوئے جتنے اب اس درندہ صفت ڈاکٹر کی وجہ سے ہوئے۔زرین کی موت سے جہاں شہباز کی زندگی میں خلا پیدا ہوگا اسی طرح ہمارے لیے بھی ایک خلا بن گیا ہے۔سراب کو اگر ایک مخصوص سوچ سے پڑھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ ایک ایسی کہانی ہے جس میں زندگی کے ہر پہلو، ہر مسئلے پر مکمل وضاحت پیش کی گئی ہے۔اس میں ہم نے مختلف ممالک کی سیر بھی کی وہاں کے لوگوں کے رہن سہن بھی دیکھے۔واقعی سراب ہر لحاظ سے ایک انسان کی آنکھیں کھول دیتی ہے۔ویل ڈن کاشف زبیر صاحب۔پچھلے ماہ کی سچ بیانی گم شدہ محبت زبردست رہی۔اس ماہ بے گناہ مجرم، اندھیرے کی موت زبردست رہیں۔شیریں فرہاد میں فرہاد نے افشاں کو اپنا کر اس کہانی کو منفرد بنایا، بہت پسند آئی۔آخری راستہ بہت ہی امیر زادیوں کی کہانی ہے۔محبت زندگان میں مقبول کی معصوم محبت نے رلا دیا۔سچ کا سودا خوب رہی۔بھائی صاحب، قسمت کا دھنی میں مذاق کا پہلو تھا۔اندھیرے کی موت جیسی منفرد کہانیاں ہوں تو دل کو لگتی ہیں۔تعبیرِ خواب میں قسمت نے روبی کا ساتھ دیا، ایسی قسمت ہر لڑکی کی نہیں ہوتی۔جل پری پڑھ لی اس حوالے سے میرے پاس اسلامی معلومات ہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکن پہلے ہی خط بہت لمبا ہوگیا ہے۔ اگر بے ادبی معاف ہو تو میں الطاف شیخ سے صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ وہ اسلام کا مطالعہ کریں جس طرح سات آسمان طبق بہ طبق بنے ہیں اسی طرح اللہ کے لیے سات سمندر بنانا مشکل نہیں اور جل پری مخلوق موجود ہے۔"

***ابن مقبول جاوید احمد صدیقی**، راولپنڈی سے "سرگزشت سے ناتا تو عرصۂ دراز سے جڑا ہے، صرف کچھ سستی اور زیادہ مصروفیت کی وجہ سے شہرِ خیال میں حاضر نہ ہوسکا۔ امید واثق ہے کہ محترم جناب معراج رسول بخیریت ہوں گے۔ خداوند کریم انہیں صحت عطا فرمائے، آمین۔ خوبصورت ترین ٹائٹل اور رنگین اشتہارات کے بعد الگست میں پُراسراریت نمبر کا پڑھ کر دل پہلے ہی آپ لوگوں کو دعائیں دینے لگا، انتظار ہے اب۔ فہرست تو آسمانِ صحافت پر ستاروں کی طرح جگمگاتی ہمارے سامنے تھی اور ہم انگشت بدنداں کہ اتنے منفرد اور معلومات سے بھرپور مواد کو یکدم کیسے پڑھنا شروع کریں۔ آخر میں نو عدد دیع بیانیاں بھی تو منتظرِ مطالعہ تھیں۔ اداریہ دل کے اندر اتر گیا اور شعر نے تو اور بھی سوچنے پر مجبور کر دیا اور امینِ فراست میں فیثاغورس کا پڑھ کر اپنا دسویں بار ہویں کا زمانہ یاد آ گیا۔ کیا جینئس ترین انسان تھا۔ لیجئے، شہرِ خیال میں ہم نے قدم رنجہ فرمایا اور شوکت رحمان خٹک نے وضاحتوں کی بوچھاڑ کر دی۔ ان کی وضاحت قابلِ قبول رہی۔ طاہر الدین بیگ، آپ نے امن و امان کی جو تصویر کھینچی اور پچھلے زمانے کو یاد کیا تو ہم اسی زمانے میں کھو گئے۔ تبصرہ خوب تھا۔ تفسیر عباس بابر نے حکمرانوں کی بے حسی کا رونا رویا ہے۔ بھئی یہ کب نہ تھی۔ رانا محمد سجاد کی فرمائشیں پڑھ کر ہم بھی زبردست حمایت کرتے ہیں۔ انتساب عباس، ذرا وضاحت فرمادیں تاکہ سجاد کی تسلی ہوجائے۔ ایم اے خالق بھٹی کا تبصرہ خاص طور پر پڑھا، لیجئے دل خوش ہوا، آپ کا نیم تفصیلی تبصرہ پڑھ کر۔ سعید احمد چاند آ گئے اور ہاں بھئی، میں بھی کہوں گا، علی محمد وفا بروہی سے کہ بھارتی فلموں سے کیوں مخالفت۔ ہاں بھئی، مونا گل ٹھیک کہہ رہی ہیں کہ کاشف زبیر تعریف کے قابل ہی نہیں بلکہ تعریف کے آسمان جیسے رویّہ کے قابل ہیں یقین مانیں یہ ہمارے لیے آسمان میگزین کے درخشاں ترین تارے ہیں بلکہ سورج ہیں۔ بشیر احمد بھٹی کا دلچسپ خط پڑھا۔ تبصرہ بہت خوبصورت تھا۔ محمد اسماعیل اجاگر، بھئی ہر کوئی ایک جیسا نہیں ہوا کرتا، کال سینٹرز اچھے بھی ہیں اور بہت لوگوں کو روزگار ملا ہوا ہے، تبصرہ پسند آیا۔ عبدالعزیز جی آ اتنے عرصے میں نہ معلوم ہوسکا کہ کون ہمارے خطوط کو ڈیل کرتا ہے۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری، آپ کے ساتھ پے در پے یہ واقعات پیش آتے رہے، مشیتِ ایزدی کے آگے مخلوق صرف سر ہی جھکا سکتی ہے۔ آج یہ گئے کل ہم سب کی باری۔ بھائی انصاری کی وفات، ابو کا چلے جانا اور اب بھائی بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ نہیں بہن جی، یہ غم ہے ہی پہاڑ سے بڑا۔ خداوند کریم مرحومین کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور اہلِ خانہ اور آپ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے کہ موت سے کس کو رستگاری ہے۔ ملک جاوید محمد خان کا معلومات سے بھرپور خط اور تبصرہ بھی بہت خوب تھا۔ سہیل احمد عباسی نے قیمتی درستگی کی۔ اللہ جزا دے، تبصرہ بے حد اچھا تھا۔ احمد خان توحیدی، بخشوانے نماز گئے اور روزے بھی پلے پڑ گئے۔ آپ کی مثال تو وہی ہے، آ بیل مجھے مار۔ اور وضاحت کیجئے اور سزہ چکھیے۔ عاصف سیال برق کی فرمائش کہ امام شامل کی بھی سوانح حیات صفحات کی نذر کیجئے۔ ہم تائید کرتے ہیں۔ امریکا سے بھی فاروق رحمانی کی فرمائش آئی ہے۔ تبصرہ مختصر مگر اچھا تھا۔ نئے آنے والوں کو خوش آمدید۔ اب کہانیوں اور معلومات کی طرف۔ فخرِ اندلس ضرور پڑھتا ہوں کیونکہ سائنس کا طالب علم رہا اور پھر تاریخ کا مطالعہ گہرا نہ کرسکا۔ ڈاکٹر ساجد امجد بہترین لکھتے ہیں کہ ایک ہی نشست میں ختم کرتا ہوں۔ زبردست! مگر قدر نہ ہونے پر ان مشاہیر کے لیے دل غم کے آنسو روتا ہے۔ قاتل پہاڑ، ناگا پربت کی کہانی زبردست معلوماتی اور بہت سے پہلو اجاگر کیے جو ہمارے لیے باعثِ صد معلومات ہیں۔ اٹک برج بڑے غور سے اور ایک ایک لفظ پڑھا کیونکہ میں ملازمت کے سلسلے میں 18 سال پشاور متعین رہا اور بے تحاشا دفعہ پنڈی، لاہور رشتے داروں سے ملنے آنا جانا ہوا تو میرے سامنے اس مضمون کو پڑھتے ہوئے پوری فلم چلتی رہی اور نئی نئی معلومات ملیں۔ دریائے کابل کا ملنا، برج کے سامنے قلعہ نما عمارت، وغیرہ وغیرہ۔ آصف شاہ صاحب دعائیں کہ اتنی پچھلی یادیں تازہ کروادیں۔ فضائی قزاق تو پڑھتے ہوئے ایک لمحے کو آنکھ نہ جھپکی جیسے اصلی پردے پر اصلی کہانی دیکھ رہے ہیں۔ بہت ہی مزیدار تھی اور کوپر کو تلاش نہ کیا جاسکا، یہ حیرت انگیز ہے نا۔ آفاقی صاحب کی فلمی الف لیلہ میں اے حمید مرحوم کی معلومات زندگی سے واقفیت ہوئی حالانکہ میں بھی ان کا ایک فین تھا۔ کیا ہستی تھی، پھر منوع ندیم قاسمی کا قصہ بے حد خوب رہا۔ شمیم آرا کا تذکرہ تفصیل سے کیا گیا ہے۔ واقعی یہ صحیح ہے کہ برصغیر میں اسلام پھیلانے میں اہم ترین کردار ہمارے ان صوفیائے کرام نے ہی ادا کیا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے۔ مریم کے خان کی کیمیائی ہتھیار کی کہانی زبردست معلوماتی اور روانی والی معلومات تھیں اور بورس آج بھی خدمتِ انسانیت پر ڈٹا ہوا ہے۔ ڈریکولا سے معلومات کے کئی نئے پہلو معلوم ہوئے اور علم میں اضافہ ہوا۔ ابراہیم جمالی کے الطاف شیخ کے ذریعے سفرنامے ہمیشہ ہی دلچسپی کا باعث رہے ہیں۔ جل پری زبردست تھی اور پھر جاپان کا سفر۔ قاری کے لیے انوکھے اور ہلکے پھلکے انداز میں معلومات کا خزانہ بھی بھرپور تھا۔ تشہیر میں معلوماتی مواد بھرپور تھا۔ دلچسپی بھی آخر تک برقرار رہی۔ انسانی دماغ اگر چاروں طرف چلے تو ایسے ہی کامیاب انسان وجود میں آتے ہیں۔ زیادہ عقلمند بننے کے چکر میں ایڈورڈ منہ کے بل گرا اور آخر کار جیمسن نے صحیح راستے کا چناؤ کر کے بھرپور انداز میں کام شروع کر دیا۔ یہ سب پبلسٹی کے ہنر کے آنے اور صحیح سمت استعمال کرنے سے ہوا، بہت خوب۔ مغربی افریقا کا دریائے نائجر سے ملاقات زندگی میں پہلی دفعہ ہوئی اور طارق عزیز خان نے انمول اور قیمتی معلومات فراہم کیں۔ ڈولفن کا مضمون بھی زبردست تھا اور شارک سے اللہ نے ڈولفن ہی کی وجہ سے بچایا۔ ویری گڈ اسٹوری۔ معجزہ میں تو یونیورسٹی کے طالب علموں نے جان جوکھوں والا کام کیا اور سب ہی بخیریت رہے اگرچہ اچھی خاصی تگ و دو کے بعد۔ کوہ نور ایک معلوماتی اور عام مضمون رہا۔ آدم خور بھی درمیانہ درجے کی کہانی تھی اور پھر کئی جگہ

مصنوعی پن محسوس کیا گیا۔ بہرحال کاوش اچھی تھی۔ اب آیئے نو سچ بیانیوں کی طرف۔ ان میں بے گناہ مجرم سب سے بہترین رہی، گھر سے نکلنے، نوابوں کی خدمت، عاقبت نااندیشی کی انتہا، اولاد کے لیے گھناؤنا جرم، انجام کار نواب بھی گیا، ہر چیز ختم ہوگئی اور اب سہارا صرف بیٹی رہ گئی۔ سو رہے نام اللہ کا۔ زبردست داستان تھی، تعبیرِ خواب دوسرے نمبر پر رہی۔ زندگی کے نشیب و فراز سے بھرپور داستان اپنے اندر بے شمار نصیحتیں سمیٹے ہوئے ہے۔ صرف امیر و کبیر بننے کے خبط میں مبتلا ہونے کے سبب بھی تھا لیکن ہزاروں کے لیے نصیحت آموز اور کئی ٹھوکروں سے بچاؤ والی داستان بے حد اچھی رہی۔ آخری راستہ تیسرے نمبر پر رہی۔ ایک ڈاکٹر کے مریضِ عجیب و غریب کی داستانِ حیات۔ والدین کو اس پہلو کو بھی مدِنظر رکھ کر اولاد کی خوب نگرانی کرنی چاہیے۔ پھر دونوں کی موت قاری کو بے حد اداس کر گئی۔ یہ زبردست، حقیقی اور بڑی ہی عبرت انگیز داستان تھی۔ کمپیوٹرائیٹ کی دنیا کی ایک اور داستان شیریں فرہاد زبردست رہی۔ پہلے تو ایسے ہی لگا کہ عام ڈگر کی داستان ہوگی مگر انوکھا ہوتا چلا گیا۔ یہ اثر انگیز داستان اور اچھی ہوگئی جب فرہاد کا آخر میں فیصلہ بڑا حقیقی اور ایک صنفِ نازک کے حق میں ہوا جو بے انتہا مستحق تھی۔ محبت زدگان پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ دنیاوی عشق و محبت اکثر و بیشتر ایک روگ ہی ثابت ہوتا ہے۔ یہی چیز مقبول کی موت کا سبب بنی۔ جاسوسی طرز کی کہانی اپنی جگہ بہرحال اچھی ہی رہی۔ بھائی صاحب فراڈ کے حوالے سے اچھی کہانی رہی۔ معاشرے کی عام کہانیوں میں سے ایک تھی اور پھر خوب بے عزت ہوئے مگر ڈھیٹوں کی طرح پھر آگے کا سوچنے لگے۔ قسمت کا دھنی میں فیاض لمبے چکر میں پڑ کر پیر فقیر ہوگیا، کیا دوسرے لوگوں کی قسمت بھی ان کا ساتھ دے گی؟ داستان اچھی تھی۔ اندھیرے کی موت ایک ماورائی اور انہونی طرز کی کہانی ثابت ہوئی۔ ایسی کہانی حقیقی ہو ہی نہیں سکتی بلکہ ناممکن ہے۔ سچ کا سودا تو بالکل من گھڑت اور افسانوی خیالات کی کہانی لکھی گئی ہے۔ نہ معلوم جہانگیر صاحب کو کہیں سے یہ کہانی ملی اور سچ بیانی میں بھیج دیا۔ بہرحال بحیثیت مجموعی سرگزشت ایک اعلیٰ پائے کا میگزین ہے اور ہم فخر سے اس کو دوسروں کے مقابلے میں رکھ سکتے ہیں۔ بیت بازی زبردست رہی اور خاص کر حکیم سید محمد رضا، انعم خورشید، صنم شیرازی، زہرا امجد، منظر علی، نازیہ آرزو اور احمد خان ٹاپ پر رہے۔"

***تفسیر عباس بابر**، اوکاڑہ سے رقم طراز ہیں "زندگی کے گوناگوں مسائل، مصروفیات، الجھنوں، حالات کی تلخیوں اور گردشِ وقت کی تلخ و سفاک حقیقتوں سے فرصت نکالنا تقریباً جوئے شیر لانے کے مترادف ہے لیکن سرگزشت کا معیار اور اس سے پیار دونوں ایسی نایاب چیزیں ہیں جن کے حصول کے لیے بہت کچھ پسِ طاق رکھا جاسکتا ہے لہٰذا محبت و اپنائیت کے اسی سلسلے میں کافی سے زیادہ کچھ پسِ طاق رکھتے ہوئے 29 جون کی کڑکتی دوپہر میں یہ گوہرِ نایاب حاصل کیا۔ دیدہ زیب رنگوں سے مزین سرورق کی تعریف نہ کرنا، یقیناً بخل ہوگا۔ خوبرو دوشیزہ سرورق کو بصد شوق دیکھتے ہوئے محترم جناب معراج رسول کے اداریے تک جا پہنچے جو کہ ہمیشہ خاصے کی چیز ہوتا ہے۔ یک سطحی داستان میں امینِ فراست، فیثاغورس سے متعلق آگاہی ہوئی ان سے متعلق کافی کچھ نظر سے گزر چکا ہے۔ پراسرار نمبر کی آمد کے مہینے کا فیصلہ کن اعلان۔ دلِ مضطرب کو تسلی ہوئی ہے شدت و مدت سے اتنا انتظار ہے کہ اب تو ہر شے پراسراری لگنے لگی ہے۔ یہاں تک کہ ہم خود بھی پُراسرار ہوئے بیٹھے ہیں، بہت کچھ کہا سنا اور دیکھا جارہا ہے، قیامت سے متعلق۔ لاقانونیت اور جبرِ مسلسل کے اس اذیت ناک دور میں یقیناً کسی اور قیامت کی ضرورت یا گنجائش نہیں ہے لیکن موت کی طرح قیامت بھی بے شک برحق ہے پر اس سے پہلے ابھی بہت کچھ ہونا باقی ہے۔ ابھی تو آمد امام مہدی علیہ السلام کا انتظار ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور بھی یقینی ہے اور پھر قوم یاجوج ماجوج..... جو کہ ذوالقرنین کی بنائی ہوئی دیوار کے پیچھے پیچ و تاب کھا رہی ہے۔ کافی سے زیادہ احباب شہرِ خیال کی رونقوں کو دوبالا کر رہے ہیں لیکن پرانے دوستوں کی مسلسل خاموشی باعثِ تشویش ہے جن میں ہمایوں دین پوری، آفتاب احمد نصیر، ٹی اے مرزا، شہناز ندیم جونیجو، سمیرا ساجد، ثمینہ کوثر لطیف، جرمنی سے یونس بلوچ، عبدالرؤف عدم اور کافی لوگ ہیں جو کہ شاید نذرِ نئی ایام ہوگئے ہیں۔ پشاور سے شوکت رحمن خٹک، ہمیں از حد خوشی اور احساسِ تفاخر ہو رہا ہے کہ آپ جیسے بزرگ اور معتبر لوگ بھی سرگزشت سے منسلک ہیں، محبتوں کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہنا لازم ہے۔ سرگودھا سے حسنین عباس یہاں بھی پائے جاتے ہیں۔ بہت خوشی ہوئی آپ سے دوبارہ مل کر۔ ہماری حقیری تحریر کی اشاعت کے لیے بھی تہ دل سے نوازش۔ مرزا طاہر الدین بیگ کا جذبۂ حب الوطنی قابلِ تحسین ہے لیکن ہم یا آپ کچھ بھی کہہ لیں، نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات کیونکہ ہر شاخ پہ الو بیٹھا ہے، گلشن کا خدا ہی حافظ ہے۔ ساہیوال سے بہت پیارے دوست راجا ثاقب نواز ثاقب کی بہترین باتیں، کیا کہنے۔ بنوں سے مونا گل کی عقیدتوں نے بھی متاثر کیا اور بہت پیاری روبینہ نفیس انصاری، کم و بیش چار سال سے زائد مدت کے بعد آپ سے مل کر جو خوشی ہوئی بیان سے باہر ہے۔ آپ کے دکھ پڑھ کر تکلیف ہوئی، لیکن وہ کیا ہے کہ حادثے زندگی کا شعور دیتے ہیں اور زندگی کا ہر ورق درد سے عبارت ہے۔ سکھر سے سہیل احمد عباسی، ہم آپ کی اپیل سے متفق ہیں کہ ناصر حسین رند کو باقاعدہ حاضر ہونا چاہیے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے حسبِ روایت بہترین مصنف کی بہترین و شاہکار تحریر، سراب بصد خلوص و اہتمام ملاحظہ کی، زرین کی المناک موت نے سن کر کے رکھ دیا۔ یوں نہ ہوتا تو کیا ہوتا، شہباز کی ہمت و جواں مردی قابلِ داد ہے۔ ڈاکٹر توفیق جیسے گھناؤنے اور مکروہ کردار یقیناً ہر معاشرے کا بوجھ ہیں لیکن کیا کوئی محض حصولِ دولت کے لیے، اتنا شقی القلب بھی ہوسکتا ہے؟ ابتدائی صفحات کی لازوال تحریر فخرِ اندلس، ڈاکٹر ساجد امجد نے بحرِ تحقیق سے ایک اور نادر و نایاب خزینہ دریافت کیا یقیناً یہ سرمایۂ وطن تھا جسے ملک بدر کر کے فخرِ اندلس بننے پر مجبور کر دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ترقی کے میدان میں سب سے پیچھے ہیں۔ آصف ملک کی قاتل پہاڑ تحیر آفریں تحریر تھی۔ اٹک برج نے بھی معلومات میں اضافہ کیا۔ فضائی قزاق نہایت دلچسپ واردات کا پُراثر احوال۔ فلمی الف لیلہ، شاعروں، ادیبوں اور اداکاروں کے عروج و زوال کا عبرت اثر احوال، اسے کہتے ہیں بے مہری عالم کا صلہ۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آفاقی صاحب ساغر صدیقی اور انس معین سے متعلق بھی قلم کو زحمت دیں۔ جمیل نقری بھی گزشتہ دنوں انتقال کر گئے، اس زندہ دل فنکار سے متعلق مفصل آگاہی درکار ہے۔ مریم کے خان کیمیائی ہتھیار متعارف کروا رہی تھیں۔ سائنس نے بلاشبہ خطرناک حد تک ترقی کر لی ہے۔ ابن کبیر ہمیشہ خاصے کی چیز لے کر آتے ہیں، ڈریکولا مشہور زمانہ کردار سے متعلق مفصل آگاہی ہوئی۔ آدم خور شیر کا سنسنی خیز شکار۔ دلچسپ قصہ تھا معجزہ، قدرت بے شک کسی بھی پل انسان سے غافل نہیں رہتی۔ سرورق کی پہلی سچی کہانی، بے گناہ مجرم غلام گردشوں میں پنپتی ہوئی سازشوں کا دل فگار واقعہ۔ زمانے کی بے ثباتی کا ثبوت اور کیا ہوگا۔ فریدہ کی ایک لغزش نے گلشنِ امید کو تج کے رکھ دیا۔ نواب صاحب کے انجام پر رونا آیا۔ نفسیاتی مسائل کا احاطہ کرتی ہوئی ڈاکٹر ایس ایم صدیقی کی فکر انگیز کہانی آخری راستہ نے کافی افسردہ کیا۔ حضرت انسان بھی عجیب معما ہے۔ انسپکٹر صاحب کی پُراثر تحریر محبت زدگان..... محبت کے ساتھ اکثر یہی ہوتا ہے۔ لوگ محبت سے شکایت کرتے ہیں لیکن محبت کس سے شکایت کرے کہ اسے ہمیشہ پامال کیا گیا۔ جدید دور کی آفت، انٹرنیٹ کا شاخسانہ، شیریں فرہاد بھی دلچسپ رہی لیکن اب کہاں وہ فرہاد کے جس کے پاس پختہ عزم کا تیشہ ہو اور وہ پہاڑوں کے سینے سے دودھ کی نہر نکالنے میں رضائے محبوب کے لیے راضی بہ رضا ہو، ایک اور تلخ کہانی۔ سچ کا سودا، ناقابلِ یقین مگر عصر حاضر کے رویّوں سے ہم آہنگ۔ سچ یقیناً کڑوا اور ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔ بھائی صاحب، سچ اور جھوٹ کا امتزاج، خاصا دلچسپ رہا۔ اندھیرے کی موت ایک پراسرار اور بھید بھری تحریر تھی۔ ہوسکتا ہے ایسا ہوتا بھی ہو کیونکہ شیطان کے ہونے سے انکار قطعی ناممکن ہے۔ قسمت کا دھنی، چند جاہلوں کا دلچسپ فسانہ ثابت ہوا اور آخری کہانی، روبی شاہ کی تعبیرِ خواب، یقیناً روبی کے مقدر نے ہر موڑ پر یاوری کی، ایسے خوش نصیب لوگ بہت کم ہی دیکھے ہیں جنہیں خدا بھی ملے اور وصالِ صنم بھی۔"

* **ملک جاوید محمد خان سرکانی** درانی، بروزئی، چمچھ سے "اداریہ پڑھ کر یہی کہہ سکتے ہیں، ٹھیک ہے خودکشی حرام ہے لیکن اتنی مایوسی پیدا کرنے والوں کا کیا کچھ حلال ہے جو ایسے حالات پیدا کرتے ہیں کہ لوگ خودکشی کرنے اور اولاد تک کو قتل کر دینے جیسا گھناؤنا جرم بھی کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ خیر کرے، اگر معاشی حالات درست نہ کیے گئے تو ڈر لگتا ہے کہ اجتماعی خودکشیاں نہ ہونے لگیں۔ اگر ایسا ہوا تو پردیس میں مقیم اہلِ وطن وہاں کیا منہ دکھائیں گے اور دوسری طرف دیکھیں تو عالمی حالات ہی ایسے بنا دیے گئے ہیں، اس دجالی نظام کے تحت جسے نیو ورلڈ آرڈر کا نام دیا جاتا ہے۔ 2007ء میں اقوامِ متحدہ کے فکہ خوراک وزراعت کے کیے گئے تجزیے کے مطابق اس انتہائی ترقی یافتہ دور میں بھی کہ جب انسان مریخ پر کمندیں ڈال رہا ہے، دنیا کا ہر ساتواں فرد روزانہ بھوکا سوتا ہے۔ بنیادی علاج میسر نہ ہونے کی وجہ سے ہر سال ایک کروڑ بچے موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ عالمی سرمایہ پر اختیار رکھنے والے افراد بھوکی اور بیمار انسانیت کو خوراک اور علاج کی فراہمی کے بجائے بارود کی بارش میں نہانے اور انگارے کھانے پر مجبور کر رہے ہیں۔ عالمی ماہرینِ معیشت کے مطابق دنیا کے گیارہ سو کھرب پتی لوگوں کی مجموعی مالی حیثیت 5 ارب انسانوں کی مجموعی مالی حیثیت کے برابر ہے۔ اگر مراعات دی جاتی ہیں تو بھی سرمایہ دار طبقے کو۔ مثال کے طور پر قیمتی گاڑیوں پر چھوٹ کے نتیجے میں سڑکوں پر مہنگی گاڑیوں کا طوفان سا آ گیا۔ دولت مند قیمتی گاڑیاں مہنگے پیٹرول سے چلا رہے ہیں اور نچلا طبقہ روٹی اور پانی کو ترس رہا ہے۔ سرمایہ داروں کو چاہیے کہ اپنا سرمایہ ایسے کاموں پر لگائیں جن سے بے روزگاروں کو روزگار مہیا ہو سکے ورنہ لوٹ مار کا بازار گرم ہو کر امن وامان تباہ ہو جائے گا۔ یہاں غریب تو ویسے ہی بدحالی کی چکی میں پس رہا ہے۔ آئندہ جو نقصان، بے سکونی اور بربادی ہوگی تو صاحبِ ثروت طبقے کی۔ عظیم یونانی سائنس داں فیثا غورس کی ایک صلحی سرگزشت خوب رہی۔ مہاتما بدھ اور فیثا غورس کی ملاقات کے بارے میں پہلے معلوم نہیں تھا، یہ بھی حقیقت ہے کہ مصلحین کے معاملے میں یونان اہلِ ہند کا مقابلہ نہیں کر سکتے جیسے مہاتما بدھ، مہاویر گورو نانک وغیرہ، اگر مسلمان مصلحین ان میں نہ شمار کیے جائیں تب بھی۔ شہرِ خیال میں داخل ہوئے تو مسندِ صدارت پر بیٹھے خٹک صاحب آشنا پوسلے کے نام کے سلسلے میں متاسفانہ انداز اور مستند حوالے سے ہماری اصلاح فرمانے کے بعد نہایت مبالغہ آمیز الفاظ میں اداکار گل حمید کی توصیف فرما رہے تھے، ویسے خان جی کس جہان میں گل حمید صاحب نے دلیپ کمار سے زیادہ شہرت حاصل کر لی تھی۔ رانا محمد سجاد صاحب، نام مختصر کرنے کا مطالبہ ایڈووکیٹ آصف علی سیال برق، سید امتیاز حسین بخاری چکڑالوی، راجا ثاقب نواز ثاقب، ملک ثاقب شاد تنولی ایڈووکیٹ، ایڈووکیٹ قرۃ العین زینب اور ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری سے بھی کرنا چاہیے۔ میرے نام پر آپ کو اختیار ہے جتنا مختصر لکھنا پڑھنا چاہیں لیکن محمد کے علاوہ۔ آپ کی خوشی میں ہماری خوشی ہے۔ محمد ہارون تنولی صاحب، آپ نے تو اتنی تعریف کر دی جتنی ہم ڈاکٹر ساجد امجد کی کرتے ہیں۔ اتنا مبالغہ بھی اچھا نہیں ہوتا۔ بہرحال خط پسند کرنے پر شکریہ۔ سہیل احمد عباسی صاحب، امام صاحب کا نام لکھتے ہوئے قلم چوک گیا تھا لیکن آفاقی صاحب کی آراء کے متعلق میرا موقف اتنا غلط نہیں جتنا آپ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے صحیح فرمایا کہ ڈاکٹر ساجد امجد کو شناخت دلانے والا ادارہ سرگزشت ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ ان کا قلم اگر اسی شان سے چلتا رہا تو وہ خود کئی اداروں کی شناخت بن جائیں گے۔ ابن رشد کی سرگزشت ڈاکٹر صاحب کا ایک اور قلمی کارنامہ ہے۔ اے حمید کی وفات کا پڑھ کر سارا ماحول افسردہ سا لگا۔ یہ الگ بات ہے کہ مرحوم نے قلمی خدمات انجام دے کر خود کو امر کر لیا۔ کیا اچھا ہوتا کہ ان کا تفصیلی انٹرویو سرگزشت کے صفحات کی زینت بنتا۔"

* **ایم اے خالق** بھٹی، صدر پریس کلب اللہ آباد، ضلع رحیم یار خان کی تشریف آوری "سرگزشت معلوماتی مضامین سے خوب سجتا جا رہا ہے۔

اس دفعہ مختصر بیتی میں فیثا غورس کے علاوہ اٹک برج، زلفی شاہ۔ قاتل پہاڑ، آصف ملک۔ فضائی قزاق، سلیم انور۔ کیمیائی ہتھیار، مریم کے خان۔ نائجر، طارق عزیز خان۔ جل پری، الطاف شیخ۔ ڈولفن، شکیل صدیقی۔ معجزہ، شکیل ادریس نے بہت متاثر کیا۔ علی سفیان آفاقی کی قلمی الف لیلہ میں شمیم آرا، اے حمید کے بارے میں نئی معلومات ملی ہیں۔ فخر اندلس ڈاکٹر ساجد امجد کی بہترین کاوش تھی۔ کوہ نور، رازق شاہ کوہر نے کچھ نئی معلومات فراہم کی ہیں۔ فلمی معلومات کے یعنی شاہد شوکت رحمن فنک کا خط بھی پڑھنے کو ملا ہے۔ طاہر الدین بیگ، تنویر عباس، رانا محمد سجاد، ملک ثاقب شاد تنولی، افتخار احمد گھمن، رانا ثاقب نواز ثاقب، سعید احمد چاند، بشیر احمد بھٹی، سدرہ بانو ناگوری، ملک جاوید محمد خان سرکانی، فاروق رحمان، امریکا نے تبصرے کا صحیح حق ادا کیا ہے۔ ہمارے شہید بھائی کی بہن روبینہ نفیس انصاری، ایک تو گرمی نے لبوں سے ہنسی کو چھینا ہوا ہے اوپر سے لوڈ شیڈنگ نے ادھ موا کر دیا ہے۔ آپ تو ڈاکٹر ہیں اس کا اچھا سا نسخہ تجویز کریں، مجھے تو اپنا بھائی ہونے کے ناتے سے ادویات بھی مفت فراہم کیجئے گا۔ عبدالعزیز جی آسرگزشت جیسا معلوماتی ڈائجسٹ میں نے زندگی میں دوسرا نہیں دیکھا، یہی وجہ ہے کہ اس کی آمد کا انتظار ہر پل رہتا ہے۔"

* **محمد شاہ بٹ**، موضع حمید، ضلع اٹک سے "اس دفعہ کا اداریہ خونِ دل سے سینچا ہوا، حالاتِ حاضرہ کی ترجمانی کر رہا تھا۔ عظیم سائنس داں فیثا غورس کی یک صلحی سرگزشت متاثر کن تھی۔ جبکہ کچھ عرصہ تک اپنوں، بیگانوں اور حکومت وقت کے زیرِ عتاب رہنے والے عظیم فلاسفر، محقق اور طبیب ابن رشد کا متاثر کن زندگی نامہ، جناب ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی ایک اور عظیم کاوش تھی۔ قلمی الف لیلہ میں اس دفعہ اے حمید، منٹو صاحب اور شمیم آرا کے تفصیلی حالات تھے۔ شمیم آرا بیمار ہیں، ان کے لیے دعائے صحت، آفاقی صاحب پر ان دنوں صوفیانہ رنگ غالب ہے، پسند آ رہا ہے۔ اٹک برج میں اپنے ضلع اٹک کے ایک اور باب کی تاریخ سے آگاہی ہوئی۔ صاحبِ مضمون زلفی شاہ صاحب سے رابطہ ادارے کے ذریعے ہی ممکن ہوگا شاید (بے شک) ڈریکولا میں فلاد سوم کے ڈریکولا بن جانے میں اس کے باپ بھائیوں اور اردگرد کے تکلیف دہ ماحول کا ہاتھ تھا۔ جناب الطاف شیخ صاحب اس دفعہ جل پری اور سمندروں سے متعلق مفید معلومات دے رہے تھے۔ تشہیر این جی اوز کے بعض بھیانک پہلوؤں کا پردہ چاک کر رہی تھی۔ چند ایک کو چھوڑ کر شاید سبھی این جی اوز کی حقیقت یہی ہے کہ دکھی انسانیت کی خدمت کے نام پر اپنے ذاتی مفادات کے حصول کا سہل ذریعہ بنایا ہوا ہے۔ این جی اوز کے کارکن عموماً معاشرے کے پسے ہوئے اور ظلم وستم کا شکار ہو جانے والے لوگ ہوتے ہیں لیکن جب انہیں اختیار ملتا ہے اور وہ کسی تنظیم کا حصہ بن جاتے ہیں تو بجائے دیگر مظلوموں کی خدمت کرنے کے اور ان کے کام آنے کے وہ اپنے اوپر ہونے والے ظلم وستم کا بدلہ لینا شروع کر دیتے ہیں اور یہیں سے این جی اوز کی اصل خرابی شروع ہوتی ہے۔ قاتل پہاڑ، ڈولفن اور معجزہ بھی پسند آئیں۔ سراب کی قسط 51 میں ڈاکٹر توفیق کی نفسیاتی وحشت وبربریت کا شکار ہو جانے والی زرین کی موت افسردہ کر گئی۔ سچ بیانیوں میں نہر ایک پر بے گناہ مجرم کی گناہ گار فریدہ بیگم کا انجام عبرت اثر ہوا۔ اپنے بھولپن کی وجہ سے اپنے پہلے شوہر سے بے وفائی کی مرتکب ہونے والی فریدہ بیگم دوسرے شوہر سے بھی وفا نہ کر سکی۔ اس طرح وہ بے گناہ نہیں بلکہ دہرے گناہ کی مرتکب ہوئی۔ محبت زدگان میں مقبول کے ساتھ منظور کی طرف سے زیادتی ہوئی لیکن کوئی بھی غیرت مند باپ یہ پسند نہیں کر سکتا کہ اس کی گھر کی عزت کو گلی محلے میں بدنام کیا جائے۔ مقبول سے بھی یہ بہت بڑی بے احتیاطی ہوئی۔ آخری راستہ، دین سے دوری کی وجہ سے دو نوجوان لڑکیوں کی خودکشی کا باعث بنی۔ اگر ان کے گھر کا ماحول دینی ہوتا یا گھر میں دین کی فہم رکھنے والا کوئی فرد ہوتا تو وہ ان کی صحیح رہنمائی کر کے انہیں توبہ کی طرف مائل کرتا۔ ہماری نئی نسل کمپیوٹر کا غلط استعمال کر کے تباہ وبرباد ہو رہی ہے بلکہ پورا معاشرہ اس سے متاثر ہو رہا ہے لیکن اسی کمپیوٹر سے کبھی کبھار ایسے اٹوٹ بندھن بھی بندھ جاتے ہیں جیسے شیریں فرہاد میں بندھ گئے۔ شیریں فرہاد کی قربانی جوانہوں نے افشاں کے لیے دی قابلِ ستائش ہے۔ سچ کا سودا میں عجیب وغریب واقعات کا شکار ہونے والا شخص اپنی داستان بیان کر کے افسردہ کر رہا تھا۔ واقعی آج کل سچائی پر قائم رہنا بڑا خطرناک ہوتا جا رہا ہے۔ بھائی صاحب، ناقابلِ یقین شاطرانہ رنگ لیے ہوئے واقعات سے پُر تھی۔ اندھیرے کی موت میں انتہائی پراسرار واقعات بیان ہوئے۔ واقعی ہمارے اردگرد بے پناہ شیطانی قوتیں کارفرما ہیں اور انسانوں کو گمراہ کرنے کے درپے ہیں۔ ان سے بچاؤ اللہ رب العزت کی سچی بندگی اور اس کی عبادت وریاضت میں ہے۔ قسمت کا دھنی، منگیتر سے ملنے کے لیے گھر سے نکلنے والے فیض علی کے پیر بننے کا واقعہ، دلچسپ اور سبق آموز بھی تھا کیونکہ آج کل پیروں کی اکثریت اسی طرح کی ہے اور یہی لوگ سچے اللہ والوں سے لوگوں کو برگشتہ کرنے کا باعث ہیں اور ہمارے پورے معاشرے کو اللہ اور اللہ والوں سے دوری ہی ہمیں مختلف قسم کے مصائب وآلام سے دوچار کیے ہوئے ہے۔ تعبیرِ خواب میں زبیر کی مکاریوں سے اپنی خوش قسمتی سے بچ جانے والی روبی کی داستان عبرت اثر تھی۔ انسان کو ہر حال میں اللہ کا شکر گزار بندہ بن کر رہنا چاہیے۔ اگر حالات بھی اچھے نہ ہوں اور بندہ ناشکرا بھی ہو جائے تو یہ اپنے آپ کو دہرے عذاب میں مبتلا کرنے والی بات ہے۔ آخر میں سرگزشت کے تمام قارئین اور اراکین کی خدمت میں سلام اور بالخصوص محبتوں کے پیامبر جناب طاہر جاوید مغل کی خدمت میں سلامِ عقیدت۔ ان سے گزارش ہے کبھی کبھار سرگزشت کے لیے بھی ٹائم نکالا کریں۔"

★★★

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مکروہ

ڈاکٹر ساجد امجد

اس دنیا میں ایسے بے شمار افراد گزرے ہیں جنہوں نے خود کو بلند کرنے کے لیے کفر کو سیڑھی بنایا، ایمان کو داؤ پر لگاکر جہنم خریدنے کی سعی کی۔ انہی میں سے ایک پُراسرار شخص کے مکروہ کارنامے۔ اس پُراسرار شخص کی کتھا جس کا دعویٰ تھا کہ وہ نعوذ باللہ خدا ہے اور لوگ اسے سجدہ کریں۔ اس نے اپنے پیروکاروں کے لیے ایک چاند بناکر آسمان پر روشن کردیا تھا۔ تاریخ کے صفحات سے ایسے ہی قابلِ نفرت کردار کازندگی نامہ، مختصر مختصر سی جھلک

خاص نمبر کے لیے خصوصی طور پر مرتب کردہ خاص تحریر

وہ کون سا ایسا نامور تھا کہ لوگ اس کا نام جاننے کی کوشش کرتے یا اس کا نام لے کر اسے پکارتے۔ وہ خاندانی دھوبی تھا لہٰذا اس کا نام ہی دھوبی پڑ گیا تھا۔ ''آج دھوبی نہیں آیا۔ آج دھوبی کپڑے لے کر نہیں گیا۔'' خود اس کا گاؤں اور آس پاس کے گاؤں انہی آوازوں سے گونجتے رہتے تھے۔ اس کے پاس ایک گدھا تھا جسے لے کر وہ گھر سے نکلتا۔ اس کی بیوی بھی اس کے ساتھ ہوتی۔ میلے گیلے کپڑے گھروں سے جمع کرتے۔ پھر ان کو دھوکر گھروں تک پہنچاتے۔ یہ ان کا خاندانی کام تھا۔ اس کا باپ بھی دھوبی تھا اور اب وہ بھی یہی کام کررہا تھا۔

یہ خراسان کے علاقے مرو کے قصبات کا ایک گاؤں تھا۔ قریب قریب اور کئی گاؤں بھی آباد تھے۔ یہ دیہات اتنے پسماندہ تھے کہ ڈیڑھ صدی گزر جانے کے باوجود اسلامی تعلیمات یہاں تک ٹھیک طرح سے نہیں پہنچ سکی تھیں۔ گاؤں میں ایک مسجد ضرور بنی ہوئی تھی لیکن نمازیوں کی تعداد بہت کم تھی اور یہ بھی بس اتنی پڑھتے تھے جتنی آتی تھی۔ اسلامی دنیا ان دنوں بنوامیہ اور عباسیوں کے تنازعات میں گھری ہوئی تھی لیکن ان دیہاتیوں کو ان حالات سے بھی کوئی سروکار نہیں تھا، بلکہ یہ خبریں وہاں تک پہنچتی ہی نہیں تھیں اور جو پہنچتی تھیں یہاں تک پہنچتے پہنچتے کچھ سے کچھ ہوجاتی تھیں۔ گاؤں کیا تھا، ایک جزیرہ تھا جس کے چاروں اطراف لہریں اٹھ رہی تھیں لیکن گاؤں والے محفوظ و مامون تھے۔ اپنے کام سے کام رکھے ہوئے تھے۔

گاؤں میں سب ہی لوگ نچلی ذات کے تھے لیکن وہ تو دھوبی تھا۔ لوگوں کا میل کچیل صاف کرنے والا، سب ہی سے گیا گزرا خیال کیا جاتا تھا لیکن اپنے اخلاق کی بدولت اس نے لوگوں کے دلوں میں جگہ بنالی تھی۔ گاؤں والے اتنی مہربانی کرتے تھے کہ اس کا حال احوال دریافت کرلیا کرتے تھے۔

کئی دن سے وہ اکیلا ہی گدھا لے کر نکل رہا تھا۔ اس کی بیوی نظر نہیں آرہی تھی۔ عورتوں کو ایسی باتوں کی بہت فکر ہوجاتی ہے۔ آخر ایک دن وہ ایک گھر میں گیا تو گھر کی عورت نے پوچھ ہی لیا۔

''تیری بیوی آج کل نظر نہیں آرہی ہے۔ کیا جھگڑا ہوگیا ہے تم دونوں میں کہ اکیلا ہی محنت میں لگا ہوا ہے۔''

''نہیں جی، وہ تو بہت اچھی ہے۔ کبھی جوانی میں مجھ سے جھگڑا نہیں کیا، اب کیا کرے گی۔''

''پھر کیا بات ہے، بیمار ہے؟''

''بڑی مضبوط ہے جی وہ۔ بیماری تو اس کے قریب سے ہوکر نہیں گزری۔''

''پھر کیا بات ہے؟''

''بس ہے کوئی ایسی بات۔'' وہ کسی قدر شرما رہا تھا۔

''ایسی کیا بات ہے جو تو بتا نہیں رہا ہے؟''

''بات یہ ہے کہ اس کے بچہ ہونے والا ہے۔ میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ وہ گھر میں رہے۔'' اس نے کہا اور عورت کو ہنسی آگئی۔

''اس عمر میں بچہ ہورہا ہے اُس کے؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ابھی چالیس کی تو ہوئی ہے وہ۔"

"تو، تو پچاس سے آگے بڑھ گیا ہوگا۔"

"نہیں جی، میں اس سے دو سال آگے ہوں۔ وہ تو غربت نے یہ حال کر دیا ہے۔ کپڑوں کی دھلائی سے ملتا ہی کیا ہے؟"

"ہاں، یہ تو ہے۔ چل اب تیرے بڑھاپے کا سہارا تو آجائے گا۔"

"کیا خبر بیٹا ہوتا ہے یا بیٹی۔"

"جو بھی ہوگا تیرا سہارا تو ہوگا۔"

"پھر بھی دعا کریں بیٹا ہو۔"

"یہ کپڑے اٹھا اور چلتا بن۔ بہت ہو چکیں باتیں۔ اور ہاں، کپڑے دھو کر جلدی لانا۔ یہ نہ ہو کہ بیوی کا بہانہ کر کے دیر لگا دے۔"

"نہیں جی، جلدی لاؤں گا۔ کپڑے لاؤں گا تو پیسے ملیں گے۔" اس نے کپڑے اٹھائے، گدھے پر رکھے اور اگلے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

کئی مہینے گزر گئے۔ گاؤں میں ایک عورت کو معلوم ہوا تو کئی گھروں تک بات پہنچ گئی تھی لیکن نہ تو یہ انوکھی بات تھی اور نہ وہ کوئی اہم آدمی تھا۔ کسی نے پوچھنے کی زحمت بھی نہیں کی۔

دھوبی کی دھوبن اب بھی گھر سے نہیں نکل رہی تھی۔ ایک عورت کو پھر تجسس ہوا۔ اس نے ایک دن پوچھ ہی لیا۔

"دھوبی، کیا ہوا۔ تیرے گھر بچہ ہوا یا نہیں؟"

"ہو گیا جی۔"

"بیٹا ہوا یا بیٹی؟"

"بیٹا ہوا ہے۔"

"نام کیا رکھا؟"

"نام کا کیا ہے، بس رکھ دیا۔ ہاشم نام رکھا ہے۔"

"کیا بات ہے، تو خوش نہیں ہے، تجھے تو خوش ہونا چاہیے۔ بیٹا ہوا ہے تیرے گھر۔"

"بدصورت بہت ہے۔ مجھے تو ذرا اچھا نہیں لگا۔"

"اور تیری دھوبن کو؟"

"اب وہ اپنے ہاتھ سے گلا تھوڑی گھونٹ سکتی ہے اس کا۔"

"کمال ہے، تم کیسے ماں باپ ہو۔ اپنی اولاد تو سب ہی کو اچھی لگتی ہے۔"

"بس اتنی خوشی ہے کہ بڑا ہو کر میرا ہاتھ بٹا دیا کرے گا۔"

وہ تو یہ کہہ کر چلا گیا لیکن اس عورت کو فکر ہو گئی۔ وہ یہ جاننا چاہتی تھی کہ ایسا کیا بدصورت ہے کہ ماں باپ خود بے زار ہیں۔ اس کا جی چاہنے لگا کہ دھوبی کے گھر جا کر اس کے بچے کو دیکھے لیکن کوئی بھی دھوبی کے گھر جانے کو اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ اس عورت نے کئی عورتوں سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ دھوبی کے گھر چلیں لیکن کوئی بھی تیار نہیں ہوئی .... بالآخر ایک عورت بڑی مشکل سے تیار ہو گئی۔ وہ دونوں مل کر دھوبی کے گھر گئیں۔ انہوں نے بچہ دیکھا تو ڈر کر پیچھے ہٹ گئیں۔ بالشت بھر سے زیادہ نہیں تھا۔ چپٹی سی ناک چہرے پر پھیلی ہوئی تھی۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ پیشانی ضرورت سے زیادہ آگے کو نکلی ہوئی تھی۔ کوئلے کی طرح سیاہ رنگ تھا۔

ان عورتوں کو دھوبی کی باتوں میں صداقت نظر آنے لگی تھی۔ وہ واقعی اتنا بدشکل تھا کہ والدین کو بھی اچھا نہیں لگنا چاہیے تھا۔ ان عورتوں نے پھر بھی دھوبی کا حوصلہ بڑھایا کہ اس کے گھر مرد پیدا ہوا ہے۔ بڑھاپے میں اس کا سہارا بنے گا۔

یہ بچہ جب ذرا بڑا ہوا تو گھر سے باہر نکلنے لگا۔ بچوں کو بدصورتی اور خوبصورتی کی زیادہ تمیز نہیں ہوتی لیکن خوف کا عنصر تو ان میں ہوتا ہے۔ وہ اسے دیکھ کر ڈرنے لگے تھے۔ وہ تنہا کھڑا رہ جاتا تھا اور روتا ہوا گھر چلا آتا تھا۔

رفتہ رفتہ بچوں کا خوف دور ہو گیا۔ وہ اس کے ساتھ کھیلنے بھی لگے لیکن ہاشم کو یہ احساس ہونے لگا کہ وہ دوسرے بچوں کی طرح نہیں ہے۔ ذرا بڑا ہوا تو احساسِ کم تری کا شکار ہو گیا۔ گھر کی غربت اور ذاتی شکل صورت نے اسے تنہائی پسند بنا دیا۔ اس نے بچوں کے ساتھ کھیلنا ترک کر دیا۔ ماں باپ گھر سے نکل جاتے اور وہ گھر میں اکیلا بیٹھا سوچتا رہتا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے حالانکہ اس کی عمر ابھی سوچنے کی نہیں تھی۔

اس کا باپ اس کی اس تنہائی پسندی کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ اسے اپنے ساتھ لے کر کام پر جایا کرے تاکہ وہ ذرا بڑا ہو جائے تو کچھ کمانے کے لائق ہو جائے۔

ہاشم بے دلی سے سہی لیکن باپ کے ساتھ جانے لگا۔ اس کی ماں بھی اس کے ساتھ جایا کرتی تھی۔ دھوبی خوش تھا کہ

ایک کمانے والے کا اضافہ ہو رہا ہے لیکن ہاشم اس کام سے ذرا بھی خوش نہیں تھا۔ خاص طور پر اس وقت تو اسے بہت ہی دکھ ہوتا تھا جب وہ یہ دیکھتا تھا کہ گاؤں کا کوئی بھی فرد اس کے ماں باپ کے ساتھ عزت سے بات نہیں کرتا۔ وہ ایک بے عزت خاندان کا بے عزت بچہ ہے۔ جب اس کے ماں باپ مر جائیں گے تو وہ بھی ہاشم نہیں کہلائے گا محض دھوبی بن کر رہ جائے گا۔

اس دن گاؤں کی مسجد میں "مرو" سے کوئی عالم دین آئے ہوئے تھے۔ وہ بھی کھیلتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا کہ مسجد کے مولوی صاحب اس عالم دین کی آؤ بھگت میں لگے ہوئے ہیں۔ گاؤں کا ہر آدمی ان سے جھک کر مل رہا ہے۔ اس سے ان کی یہ عزت دیکھی نہیں گئی اور گھر چلا آیا۔ تھوڑے سے غور کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ ان کی یہ عزت اس لیے ہے کہ وہ دھوبی نہیں ہیں۔

دوسرے دن اس کا باپ گدھا لے کر تیار ہوا اور اس سے ساتھ چلنے کو کہا تو وہ اکڑ گیا۔ اس نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔

"میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔"

"میرے ساتھ نہیں جائے گا تو کام کیسے سیکھے گا؟"

"کیا کروں گا کام سنبھال کر اور سیکھ کر؟"

"ہمارے بعد تو ہی اس خاندانی پیشے کو قائم رکھے گا۔"

"مجھے دھوبی نہیں بننا ہے۔"

"ہمارے خاندان میں ہر پیدا ہونے والا دھوبی ہی ہے، تو بھی بنے گا۔"

"دھوبی کی لوگ عزت نہیں کرتے۔"

"ہمارے بغیر ان کے کپڑے نہیں دھل سکتے، عزت کیسے نہیں کریں گے۔"

"بچے بھی مجھے دھوبی کہہ کر چھیڑتے ہیں۔"

"اس میں چھیڑنے کی کیا بات ہے، ہم ہیں دھوبی۔"

"میں دھوبی ہوں مگر دھوبی کا کام نہیں کروں گا۔"

"پھر کیا کام کرے گا؟"

"اس دن دیکھا تھا، مسجد میں مولوی صاحب آئے تھے، لوگ ان کی کیسی عزت کر رہے تھے۔ اس لیے عزت کر رہے تھے کہ وہ دھوبی نہیں تھے، میں وہی بننا چاہتا ہوں۔"

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

اگست 2011ء
ماہ آزادی کے شمارے کی ایک جھلک

خبطی ..... محی الدین نواب
محبت کے لیے لوگ تخت و تاج ٹھکرا دیتے ہیں لیکن ان دیوانوں پر جان لینے اور دینے کی دھن سوار تھی۔

للکار ..... طاہر جاوید مغل
جانِ للکار..... عمران کی زندگی کے گمشدہ اوراق جس کی ہر سطر میں جوش جستجو اور سنسنی پنہاں تھی

گرداب ..... اسما قادری
چلے تو کٹ ہی جائے گا سفر..... پے در پے رونما ہونے والے حادثات کی یادگار داستان

سرد رخ کے رنگ

لمحے کا فیصلہ ..... احمد اقبال
وہ فیصلہ کن لمحات..... جن میں زندگی کی بقا تھی

بے بس اختیار ..... پروین زبیر
اختیارات رکھنے والے بے اختیار شخص کا قصۂ دل دوز

جرم کتھائیں

ہر جرم کے پیچھے کوئی نہ کوئی واقعہ مضمر ہوتا ہے..... انہی تغیرات سے جنم لینے والی..... ناقابل فراموش کہانیاں

چینی نکتہ چینی

آپ کے تبصرے ... مشورے ... محبتیں ... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... آپ کے قلم سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دھوبی تو سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کی بیوی بھی رونے لگی کہ بچہ کام سے گیا، کمانے سے گیا۔ مسجد میں جو امام ہیں ان کا یہ حال ہے کہ کسی نے کچھ دے دیا تو کھالیا۔ ہم سے بھی زیادہ غریب ہیں وہ۔ خالی عزت سے کیا ہوتا ہے؟

اس کے باپ نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کسی کی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ دھوبی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور مسجد میں لے گیا۔

''اسے مولوی بنادو۔''

''تم تو دھوبی ہو؟''

''ہاں، مگر یہ دھوبی بننا نہیں چاہتا۔''

''اسے کچھ بھی بنالو رہے گا تو دھوبی۔''

''میں بھی اس سے یہی کہہ رہا ہوں مگر یہ بات اس کی سمجھ میں آتی ہی نہیں۔''

''بھیج دیا کرو اسے میرے پاس۔ میں اسے لکھنا پڑھنا سکھادوں گا۔''

اس نے مسجد جانا شروع کردیا۔ کچھ بچے اور بھی وہاں آتے تھے۔ ہاشم خوش ہوگیا کہ وہ دوسرے بچوں کے ساتھ بیٹھتا ہے اور کوئی اسے دھوبی نہیں کہتا کیونکہ مولوی صاحب نے پہلے ہی دن کہہ دیا تھا کہ اسلام میں کوئی چھوٹا بڑا نہیں، سب برابر ہیں۔ یہاں نہ کوئی امیر ہے نہ غریب۔ جتنے مسلمان ہیں، سب بھائی بھائی ہیں۔

مولوی صاحب اسے قرآن پڑھا رہے تھے۔ ساتھ ساتھ اس کا مطلب بھی سمجھاتے جاتے تھے۔ سب کو تعجب ہو رہا تھا کہ دھوبی کا بیٹا تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ دھوبی کا یہ حال تھا کہ دن رات اسے لعن طعن کرتا رہتا تھا۔

ہاشم کا ذہن اچھا تھا۔ اس نے جلد ہی قرآن ختم کرلیا۔ اچھا خاصا لکھنا پڑھنا بھی آ گیا لیکن ظاہر ہے، مسجد کے امام اسے اتنا ہی پڑھا سکتے تھے جتنا وہ خود جانتے تھے۔ انہوں نے اس کا شوق دیکھ کر اسے قریبی گاؤں کی مسجد کے پیش امام کے پاس بھیج دیا جو اُن سے کچھ زیادہ جانتے تھے۔ کچھ دن وہ ان کے پاس بیٹھ کر پڑھتا رہا۔ انہوں نے اسے علم شعر کی تعلیم دی جو ایران کا ایک بڑا علم سمجھا جاتا تھا۔ اسے بھی کچھ دنوں اس علم میں دلچسپی معلوم ہوئی لیکن پھر وہ اس سے اکتا گیا۔

اب حال یہ تھا کہ پوری طرح تعلیم بھی حاصل نہیں کرسکا اور دھوبی بننا بھی گوارا نہیں کیا۔ وہ گھر کا رہا تھا نہ گھاٹ کا۔ گاؤں سے نکل کر دن دن بھر جنگلوں میں گھومتا رہتا اور شام کو گھر چلا آتا۔ اس کی اس آوارگی سے اس کا باپ تنگ آ چکا تھا۔ آخر ایک دن اس نے اسے گھر سے نکال دیا۔

''ہمارے لیے کچھ کما کر لاؤ ورنہ ہم تمہیں اپنے پاس نہیں رکھ سکتے۔''

وہ اس گاؤں میں کون سا خوش تھا۔ اس نے گاؤں چھوڑ دیا۔ ایران کے کئی شہر اس وقت علم و ادب کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ ان شہروں میں اس کی سیرابی کے سامان چھپے ہوئے تھے۔ ''مرو'' ان میں سب سے قریب تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ''مرو'' میں ہر فن کے اساتذہ کثرت سے موجود ہیں۔ وہ مرو آ گیا۔ اسلام کا ابتدائی زمانہ تھا۔ علوم محدود تھے لیکن ذوق و شوق حد سے بڑھا ہوا تھا۔ طالب علموں کی بے حد عزت کی جاتی تھی اور ان کا ہر طرح سے خیال رکھا جاتا تھا۔ ہر مسجد ایک مکتب بنی ہوئی تھی جگہ جگہ علما درس دے رہے تھے۔

اس نے بھی یہاں رہ کر تعلیم حاصل کرنا شروع کردی۔

ہاشم کا غائب ہوجانا کوئی قابلِ ذکر واقعہ نہیں تھا۔ اس کے ماں باپ تک کو پروا نہیں تھی۔ چلا گیا تو چلا گیا۔ کبھی کبھی اس کی ماں اسے یاد کرلیتی تھی لیکن پھر یہ کہہ کر صبر بھی کرلیتی تھی کہ ہمارے کون سے کام آ رہا تھا۔

کئی سال گزر گئے۔ ہاشم کا کہیں پتا نشان نہیں تھا۔ لوگ اسے بھول بھی چکے تھے کہ ایک دن وہ اچانک آ گیا۔ وہ گاؤں کی سرحد میں داخل ہوا تھا کہ گاؤں کے لوگوں نے اس کی آمد کی خبر دھوبی کو دے دی۔ ماں کی ممتا کو انتظار کی تاب کہاں تھی؟ وہ گھر سے بھاگی اور راستے ہی میں ہاشم کو دیکھ لیا۔ پستہ قد کا نوجوان اس کے سامنے تھا۔ وہ اسے گھر لے کر آئی۔ بڑی دیر تک روتی رہی۔ وہ اسے تقریباً بھول چکی تھی لیکن جب وہ سامنے آیا تو اس کے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ دھوبی گھر آیا تو وہ بھی بیٹے کو اپنے سامنے دیکھ کر پھولا نہیں سما رہا تھا۔ دل میں سوچ رہا تھا کہ اتنے دنوں بعد آیا ہے تو ضرور کوئی ایسا کام سیکھ کر آیا ہوگا کہ وہ کمائے گا اور ہم بیٹھ کر کھائیں گے۔

ہاشم گاؤں آنے کے بعد مسجد کے امام کے پاس گیا۔ یہ وہی پیش امام تھے جن سے اس نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ بے چارے کم پڑھے لکھے آدمی اور ہاشم مختلف علوم و فنون بہترین اساتذہ سے حاصل کر کے آیا تھا۔ اس نے جو امام صاحب سے گفتگو شروع کی تو امام صاحب ششدر رہ گئے۔ وہ جس موضوع کو چھیڑتا ایسے ایسے نکتے پیش کرتا کہ معلوم ہوتا، علم کا دریا ہے جو بہہ رہا ہے۔

''ارے ہاشم تو وہی ہاشم ہے؟''

''ہاں، میں وہی ہوں۔''

''دھوبی کا لڑکا اور اتنا بڑا عالم بن گیا۔''

''آپ کی نظر میں کمال ہوگا۔ میں تو ذرا بھی مطمئن نہیں ہوں۔ مجھ جیسے بہت سے لوگ ہوں گے جو ان علوم پر دسترس رکھتے ہوں گے۔ میں تو کوئی ایسا کام کرنا چاہتا ہوں جو آج تک کوئی نہ کرسکا ہو۔''

''وہ کون سا کام ہے جو صرف تو کرسکے کسی اور نے نہ کیا ہو یا کوئی اور کر ہی نہ سکے۔ اگر تو انسانوں کو بھی زندہ کرنے لگے تو تجھ سے پہلے یہ کام بھی عیسیٰ علیہ السلام کرچکے۔ اب کیا رہ جاتا ہے۔ تو اگر آسمانوں تک چلا جائے تو بھی نئی بات نہیں ہوگی۔ ہمارے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلے ہی آخری آسمان تک جاچکے۔ ان خیالات سے باز آجا۔ اللہ نے جن علوم سے تجھے نوازا ہے اس پر اللہ کا شکر ادا کر۔''

اس کے علم کی شہرت پورے گاؤں میں ہوگئی۔ گاؤں کے نوجوان اس کے پاس آ کر بیٹھنے لگے۔ وہ ان سادہ نوجوانوں کو ایسی ایسی ہوش رُبا داستانیں سناتا کہ سب کے منہ کھلے رہ جاتے۔ اس کی باتوں میں ایسا جادو تھا کہ یہ نوجوان اس کی باتوں پر سر دھنتے رہتے۔ بہت سے تو یہ بھی کہنے لگے تھے کہ اس میں کوئی پُراسرار روح داخل ہوگئی ہے جو اسے نئی نئی باتیں سکھاتی رہتی ہے۔ بہت سے ضعیف العقیدہ لوگ اسے ایک پُراسرار ہستی تصور کرنے لگے تھے ورنہ دھوبی کا لڑکا ایک دم سے کیسے عالم بن گیا۔ کسی کا خیال تھا کہ اس پر غیب کے دروازے کھل گئے ہیں۔ جو باتیں کسی کو نہیں معلوم اسے معلوم ہوجاتی ہیں۔

لوگوں کی یہ باتیں اس کے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ اس نے انسانی نفسیات کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ لوگ ان باتوں میں دلکشی محسوس کرتے ہیں جو اُن کے لیے نئی ہوں جو انہوں نے کبھی نہ سنی ہوں۔ اس نے ان لوگوں کو گرویدہ کرنے کے لیے اپنی باتوں میں جھوٹ شامل کرلیا۔ ایسی ایسی داستانیں بیان کرتا کہ وہ لوگ دنگ رہ جاتے..... دلچسپی کا جذبہ آہستہ آہستہ عقیدت کا رنگ اختیار کرنے لگا جب وہ انہیں پوری طرح اپنے سحر میں گرفتار کرچکا تو اس نے یہ کہنا شروع کردیا کہ خدا اس سے براہِ راست خطاب کرتا ہے۔

اسے کسی نے نماز کے قریب تک جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اس کا یہ دعویٰ سن کر بعض بڑی عمر کے لوگ لاحول پڑھتے ہوئے اس کی مجلس سے اٹھ گئے لیکن نوجوان بیٹھے رہے۔ یہی وہ چاہتا بھی تھا۔ یہ نوجوان ہی اس کے کام آسکتے تھے۔

وہ یہ سن چکا تھا کہ لوگ اس کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ اس میں کوئی پُراسرار روح داخل ہوگئی ہے۔ اس نے اس خیال سے فائدہ اٹھایا اور ایک دن ایک عجیب اعلان کردیا۔

''مجھ میں کسی پیغمبر کی روح آ گئی ہے مگر یہ بات تم باہر جاکر کسی کو مت بتانا۔ لوگ یقین نہیں کریں گے اور تمہیں مجھ سے جدا کردیں گے۔''

''کیا یہ ممکن ہے کہ ایک انسان کی روح کسی دوسرے انسان میں داخل ہوجائے؟'' ایک نوجوان نے پوچھا۔

''مجھے یہ ہرگز پسند نہیں کہ کوئی میری باتوں پر شک کرے لیکن پھر بھی میں تجھے بتاتا ہوں۔ جب تم سوتے ہو تو تمہاری روح کہاں چلی جاتی ہے؟''

''ہمیں کیا معلوم۔ یہ تو تم ہی بتاؤ۔''

''کچھ معلوم ہے نہیں اور بحث کرتے ہو۔'' اس نے نوجوان کو سرزنش کی ''روح ہمارے بدن سے نکل جاتی ہے اور ہم پر ایک طرح کی موت واقع ہوجاتی ہے۔ پھر یہ روح دوبارہ بدن میں داخل ہوتی ہے اور ہم جاگ جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ روح، بدن سے نکلتی بھی ہے اور واپس بھی آتی ہے، پھر یہ کیسے نہیں ہوسکتا کہ کسی پیغمبر کی روح مجھ میں داخل ہوگئی۔''

''پھر تو تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ یہ روح کس پیغمبر کی ہے؟''

''مجھے معلوم ہے لیکن بتانے کا حکم نہیں۔''

''اگر ایسا ہوتا ہے تو ہم میں بھی کسی کی روح آسکتی ہے۔''

''بالکل آسکتی ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک انسان دنیا میں بار بار جنم لیتا ہے۔ ہم جس سے محبت کرتے ہیں اس کی روح ہم میں حلول کرجاتی ہے۔''

اس نے تناسخ روح کا فلسفہ پڑھا تھا۔ ہندو مذہب کا بھی مطالعہ کیا تھا جس کے مطابق ایک انسان بار بار جنم لیتا ہے۔ اس نے اس فلسفے کو اس خوبصورتی سے بیان کیا کہ ان جاہلوں کو یقین آ گیا اور وہ ایمان لے آئے کہ ہاشم میں کسی پیغمبر کی روح ہے۔

اب اس کی اتنی عزت ہونے لگی تھی جو اس نے خواب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ اسے یقین آ گیا کہ وہ جتنی بے سروپا باتیں کرے گا، اتنی ہی اس کی عزت کی جائے گی لیکن وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ ان خیالات کے رد کے لیے اسلامی تعلیمات موجود ہیں۔ یہ نوجوان اس وقت تک اس کے ساتھ ہیں جب تک اسلامی تعلیمات تک ان کی رسائی نہیں ہے۔ اس نے نہایت چالاکی سے اسلامی تعلیمات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا شروع کر دیا تا کہ ان کا ایمان کمزور ہو جائے۔

اسے بھرپور کامیابی مل رہی تھی لیکن اس کا باپ اس سے قطعی خوش نہیں تھا۔ وہ جو تعلیم حاصل کر کے آیا ہے اسے کمائی کا ذریعہ ہی نہیں بنا سکتا تو بے کار ہے۔ اسے تو یہ آس بندھ گئی تھی کہ ہاشم آ گیا ہے، اب اس کے دن پھر جائیں گے لیکن اس کا حال یہ تھا کہ وہ نوجوانوں کی ٹولی کے ساتھ آوارہ گردوں کی طرح پھرتا رہتا تھا۔ ان نوجوانوں کے والدین بھی دھوبی کے پاس آ رہے تھے کہ تمہارے آوارہ لڑکے نے ہمارے لڑکوں کو بھی روزگار سے محروم کر دیا ہے۔ وہ ہمارے مددگار بنتے تھے، اب بے کار گھوم رہے ہیں۔

ان شکایتوں سے تنگ آ کر ہاشم کے باپ نے ایک مرتبہ پھر اس پر زور دینا شروع کیا کہ وہ یا تو کچھ کما کر دے یا یہاں سے چلا جائے۔

اس نے غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ اب آتش شوق بھڑکانے کا وقت آ گیا ہے۔ جو جتنا پیاسا ہوگا پانی کی قدر و قیمت اس کے نزدیک اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ وہ اگر کچھ دنوں کے لیے غائب ہو جائے تو اس کی قیمت میں اضافہ ہوگا۔ وہ اب جس راہ پر چل پڑا تھا اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ بعض ایسے علوم حاصل کرے جس سے عام لوگ محروم ہیں۔ وہ اپنی سیاحت کے دوران ان علوم کی جادوگری دیکھ چکا تھا۔ یہ علوم ابھی ابتدائی حالت میں تھے اور چند لوگوں تک محدود تھے۔ اس نے سوچا اسے یہ علوم حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ علم کیمیا تھا جسے اس وقت علم طلسم کہا جاتا تھا۔

سردیوں کی رات تھی۔ لوگ اپنے بستروں میں دبکے ہوئے تھے۔ وہ اپنے بستر سے اترا۔ ایک موٹی اونی چادر سے اپنے بدن کو چھپایا۔ ایک نظر اپنی سوئی ہوئی ماں پر ڈالی اور گھر سے نکل گیا۔ رات کا آخری پہر تھا، کچھ ہی دیر میں صبح ہونے والی تھی۔ اسے جلد سے جلد گاؤں سے باہر نکل جانا تھا اور اس احتیاط کے ساتھ کہ کوئی اسے جاتا ہوا نہ دیکھ سکے۔

جب تک سورج نکلتا، وہ گاؤں سے نکل چکا تھا۔

گاؤں کی یہ صبح ہاشم کے بغیر ہوئی تھی۔ اس کے دوست دوپہر تک اس جگہ ان کا انتظار کرتے رہے لیکن وہ وہاں نہیں پہنچا۔ سب لوگ مل کر دھوبی کے گھر پہنچے تو معلوم ہوا وہ تو رات ہی کو کہیں چلا گیا ہے۔ اس کے دوستوں نے کہنا شروع کر دیا کہ گاؤں کے لوگوں نے اس کی قدر نہیں کی اس لیے ناراض ہو کر چلا گیا ہے۔ اب دیکھنا اس گاؤں پر کوئی نہ کوئی آفت ضرور ٹوٹے گی۔

اتفاق یہ ہوا کہ ہاشم کے چلے جانے کے دو دن بعد ایک مکان میں آگ لگ گئی۔ سارا ساز و سامان جل گیا اور گھر میں جتنے افراد تھے، سب جھلس کر ہلاک ہو گئے۔ یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ مرنے والوں میں وہ شخص بھی تھا جو ہاشم کا سب سے زیادہ مخالف تھا۔ ہاشم کے دوستوں نے کہنا شروع کر دیا کہ یہ سب ہاشم کی بددعاؤں کا نتیجہ ہے۔

یہ خبریں دھوبی تک پہنچیں تو اس کا گھبرانا لازمی تھا۔ ہاشم کو سب سے زیادہ لعن طعن وہی کرتا تھا۔ کہیں اس کی بددعائیں مجھے کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔ اس نے دھوبن سے کہا۔ وہ بھی ڈر گئی، اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ہاشم کوئی غیر نہیں، اس کا بیٹا ہے۔

''ہاشم کے ابا، ماں باپ اولاد کو بہت کچھ کہہ لیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھوڑی ہوتا ہے کہ اولاد کی بددعائیں انہیں لگیں۔''

''یہی تو میں کہہ رہا ہوں لیکن اس کے آوارہ دوست کہہ رہے تھے، میں نے اسے مجبور کیا ہے کہ وہ گاؤں چھوڑ کر چلا جائے اس لیے مجھے سزا ضرور ملے گی۔''

''مجھے تو لگتا ہے اس کے دوستوں ہی نے اسے کہیں چھپا دیا ہے اور اب ہمیں ڈراتے پھر رہے ہیں۔''

''ہمارا بیٹا ہمیں نقصان تھوڑی پہنچائے گا۔''

وہ دونوں سونے کے لیے لیٹ گئے تھے۔ صبح اچھے خاصے اٹھے تھے۔ اب انہیں روز کی طرح گدھے پر کپڑے لاد کر دریا پر جانا تھا۔

''جلدی کر۔'' اس نے بیوی سے کہا ''کپڑے بہت جمع ہو گئے ہیں۔ دونوں مل کر دھوئیں گے تو جلدی دھل جائیں گے۔''

''اس بڑھاپے میں تجھے اور مجھے مشقت اٹھانی پڑ رہی ہے۔ آج کو بیٹا اس قابل ہوتا تو ہمیں محنت کیوں کرنی پڑتی۔''

''ٹھیک کہتی ہے تو۔ بیٹے ہی نے تو ہمیں اس حال کو پہنچایا ہے۔''

''تو گدھے کو لے کر باہر نکل، میں آتی ہوں۔''

دھوبی باہر نکلا ہی تھا کہ دوڑتا ہوا واپس آ گیا۔ وہ بری طرح چیخ رہا تھا ''میرا گدھا مر گیا، باہر چل کر دیکھو، گدھا مرا پڑا ہے۔ میں لٹ گیا، برباد ہو گیا۔''

اس کی آواز پر دھوبن بھی دوڑتے ہوئے گئی۔ گدھا واقعی مرا پڑا تھا۔ یہ گدھا ہی ان کے روزگار کا ذریعہ تھا۔ جب گدھا نہ رہا تو انہوں نے اس طرح رونا شروع کر دیا جیسے ان کے گھر میت ہو گئی ہے۔ گاؤں کے لوگ بھی جمع ہو گئے۔ ان کی زبانوں پر بھی یہی تھا کہ یہ سب ہاشم کی ناقدری کا نتیجہ ہے۔ ہاشم کا باپ اب بھی اسے گالیاں دے رہا تھا کہ یہ کیسا بیٹا ہے جس نے ہمارا گدھا مار دیا۔

پے در پے دو واقعات ایسے ہو گئے تھے جو ہاشم کے چلے جانے سے تعبیر کیے جا رہے تھے۔ اس کے دوستوں نے اس کی ذات کو مزید پُراسرار بنا دیا تھا۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے سنائی دے رہے تھے کہ ہاشم پر کوئی آسیب سوار ہے۔ اس کا گاؤں سے چلا جانا ہی اچھا ہے۔ وہ یہاں رہتا تو اس سے بھی زیادہ اور خطرناک حادثات ہوتے۔

ہاشم کے دوستوں نے نیا گدھا خرید کر دھوبی کو دے دیا۔

اب ہاشم کسی پُراسرار شخصیت کے طور پر یاد کیا جا رہا تھا جو اچانک غائب ہو گیا تھا لیکن اس کا یہ غائب ہونا صرف آنکھوں کی حد تک تھا۔ لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ اب بھی گاؤں میں موجود ہے۔ سب کی باتیں سن رہا ہے، سب کی حرکتیں دیکھ رہا ہے۔ گاؤں میں اب کوئی بھی خوشگوار یا ناخوش گوار واقعہ پیش آتا تھا، اس کا تعلق ہاشم کی ذات سے جوڑ دیا جاتا تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ کئی سال بعد ہاشم پھر پلٹ کر آ گیا۔ اس مرتبہ وہ کچھ نئے علوم حاصل کر کے لوٹا تھا۔ ان میں طب اور کیمیا شامل تھے۔

اس کے آنے کے تین دن بعد ہی گاؤں میں کسی کو بخار آیا۔ ہاشم اسے دیکھنے گیا۔ وہ طب کی تعلیم حاصل کر کے لوٹا تھا۔ مریض کو دیکھتے ہی مرض کی نوعیت کو سمجھ گیا۔ کچھ دوائیں تجویز کر کے اپنے سامنے پلائیں اور بخار فوراً اتر گیا۔ گاؤں والوں نے اسے بھی اس کی پُراسراریت کا شاخسانہ قرار دیا۔

یہ لوگ طبیب سے بھی واقف تھے اور دواؤں سے بھی لیکن یہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ دھوبی کا لڑکا طبیب ہو سکتا ہے۔ وہ تو اس کے بارے میں یہی طے کیے بیٹھے تھے کہ اس میں کوئی روح حلول کر گئی ہے جو اس سے ایسے بڑے بڑے کام لے رہی ہے۔

جب سے وہ آیا تھا لوگ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ وہ طرح طرح کے تجربات کرتا رہتا ہے۔ کبھی آگ جلا کر اس میں مختلف دھاتوں کے ٹکڑے ڈال رہا ہے، کبھی ایک پیالی میں پارا رکھ کر اس سے کھیل رہا ہے۔ کبھی کسی بوتل میں تیزاب بھر کر لوہے کے ٹکڑے اس میں ڈال رہا ہے۔ ہر وقت کسی نہ کسی تجربے میں مشغول رہنے لگا تھا۔ اب وہ لوگوں سے باتیں بھی کم کرتا تھا۔

علم کیمیا اس وقت اس علم کو کہتے تھے جس میں کم قیمت دھاتوں کو ایک خاص تناسب سے ملا کر سونا بنانے کے دعوے کیے جاتے تھے۔ ہاشم بھی اسی قسم کے تجربات میں مشغول تھا۔ اس کے پاس آنے والے گھنٹوں اس کے پاس بیٹھے رہتے اور پھر خاموشی سے اٹھ کر چلے جاتے۔ رفتہ رفتہ اس کے حلقۂ احباب میں بہت کم لوگ رہ گئے۔

انہی دنوں اسے بخار آیا پھر چہرے پر دانے نکلنے لگے۔ پورا چہرہ ان دانوں سے بھر گیا۔ بدبو ایسی تھی کہ کوئی قریب بھی نہیں آتا تھا۔ لوگوں کو اس کی طرف سے شک ہونے لگا۔ اگر اس کے اندر کوئی پاکیزہ روح ہے تو اسے ایسا مرض کیسے لاحق ہو گیا جو دوسروں کو عذاب میں مبتلا کرتا تھا خود کیسے عذاب میں مبتلا ہو گیا۔ اس کے پاس آنے والے اب دروازے کے باہر کھڑے رہتے۔

''اس سے چل کر پوچھا تو جائے، ہم نے اس کی ناقدری کی تھی تو گاؤں والوں کو کتنا نقصان ہو گیا۔ خود اس کے باپ کا گدھا مر گیا تھا۔ اس سے پوچھو تو سہی، یہ ہمارا وہم تو نہیں تھا۔ اس میں اگر اتنی طاقت ہے تو اس بیماری سے خود کو کیوں نہیں بچا سکا۔''

یہ نوجوان اندر گئے اور اس سے یہی سوالات کیے۔ وہ اطمینان سے ان کی باتیں سنتا رہا پھر ان سے سوال کیا۔

''تم میں سے کسی نے ایوب علیہ السلام کا نام سنا ہے؟''

''سنا ہے۔'' سب نے بہ یک زبان کہا۔

''انہیں ایسی بیماری ہوئی تھی کہ پورا بدن گل سڑ گیا تھا۔ بستی کے لوگ انہیں بستی سے باہر چھوڑ آئے تھے، کوئی ان کے قریب نہیں جاتا تھا.... تو کیا تم میں سے کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ اللہ کے پیغمبر نہیں تھے؟ بس مجھے بھی یہ مرض اللہ کی طرف سے ملا ہے۔ وہ میرا امتحان لینا چاہتا ہے۔ میں صبر

www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر رہا ہوں۔ اگر میں شکایت کر بیٹھوں تو پورا گاؤں زمین میں دھنس جائے۔ تم ہو کہ مجھ پر شک کر رہے ہو۔"

وہ باتیں کرنے کا ماہر تھا۔ اپنی دلیلوں سے ان سب کو قائل کرلیا۔ سب نے اسی وقت توبہ کی کہ ہم اپنے دلوں میں کیسے اندیشے پیدا کر رہے تھے۔

"ہم تمہارے لیے بہترین طبیبوں کا انتظام کریں گے۔"

"خبردار، کسی طبیب کو میرے پاس مت لانا۔ میرا علاج اللہ تعالیٰ خود کر رہا ہے۔ دیکھنا، میں بہت جلد ٹھیک ہوجاؤں گا۔ کسی دن غیب سے صدا آئے گی اور میں تندرست ہوکر بستر سے اٹھ کھڑا ہوں گا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ایوب علیہ السلام کو خوش خبری سنائی تھی۔"

وہ اپنی بیماری کا ذکر کرتے ہوئے بار بار ایوب علیہ السلام کا ذکر کرنے لگتا تھا تاکہ لوگوں پر اس کی جلالت کا رعب پڑے۔ لوگ اسے ایوب علیہ السلام کا ہم پایہ سمجھیں اور پہلے سے بھی زیادہ اس کی عزت کریں۔

لوگوں نے اسے اور اس کے خاندان کو ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھا تھا۔ اس کی بدصورتی نے رہی سہی کسر پوری کردی تھی۔ اب وہ یہ چاہتا تھا کہ لوگ اس کی عزت کریں۔ اسے غیر معمولی درجہ دیں، اس کے یہ سب دھوکے اسی عزت کے حصول کے لیے تھے۔ ضعیف الاعتقاد لوگ ہر دور میں ہوتے ہیں، اس وقت بھی تھے۔ وہ بڑی چالاکی سے اپنی عظمت کا بت تراش رہا تھا اور لوگ اس کے جھانسے میں آتے جارہے تھے۔ وہ چالاک تھا اور لوگ بے وقوف۔

اس کے شدید چیچک نکلی تھی۔ وہ چپکے چپکے اپنا علاج خود کر رہا تھا لیکن لوگوں پر یہی ظاہر کر رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کا علاج خود کر رہا ہے۔ وہ اپنے پاس آنے والوں سے بھی یہی کہہ رہا تھا کہ اس کے پاس فرشتے آتے ہیں جو اسے ایک خاص قسم کا مرہم دے کر چلے جاتے ہیں۔ وہ اس مرہم کو اپنے چہرے پر مل لیتا ہے۔ وہ بہت جلد ٹھیک ہوجائے گا۔

اس کے چہرے پر نکلنے والے دانے آہستہ آہستہ خشک ہونے لگے تھے۔ یہ دانے ختم ہوگئے لیکن اس کا چہرہ چیچک کے نشانات سے داغ دار ہوچکا تھا۔ وہ پہلے ہی بدصورت تھا، چیچک نے اس کا چہرہ مزید مکروہ کردیا۔ اس پر مستزاد یہ ہوا کہ اس کی ایک آنکھ بیٹھ گئی۔ وہ چیچک کا علاج کرسکتا تھا، اس نے کرلیا۔ آنکھوں کے علاج سے واقف نہیں تھا، آنکھ گنوا بیٹھا۔ اس کی بدصورتی میں چار چاند لگ گئے۔ وہ شدید احساسِ محرومی کا شکار ہوگیا۔ سب ساتھیوں نے اسے چھوڑ دیا۔ اب اس کی مصروفیات نہایت پُراسرار ہوگئی تھیں۔ صبح سب کے جاگنے سے پہلے گھر سے نکل جاتا اور رات کو جب سب سوجاتے تو گھر لوٹ آتا۔ اس کے متعلق طرح طرح کی باتیں مشہور ہورہی تھیں۔ کسی کا خیال تھا، وہ اکیلے میں روحوں سے باتیں کرتا ہے۔ کوئی کہتا تھا، وہ جادو کر رہا ہے۔ کچھ لوگوں نے ہمت کرکے اس کا پیچھا کیا تو واقعی اسے عجیب وغریب حرکات میں مشغول دیکھا۔ وہ آگ جلائے بیٹھا تھا۔ کچھ برتن اس کے پاس پڑے تھے۔ خود ایسے بیٹھا تھا جیسے کوئی مراقبہ کر رہا ہو۔ وہ کیمیا گر تھا اور غالباً سونا بنانے میں مشغول تھا۔ اس کے دن رات انہی تجربات میں کٹ رہے تھے جسے گاؤں کے لوگ طرح طرح کے معنی پہنا رہے تھے۔

اپنے تجربات میں کامیابی کی امید ہوئی تو اسے کچھ مددگاروں کی ضرورت پڑی۔ گاؤں میں بے روزگاروں کی اور غریبوں کی کمی نہیں تھی۔ جلد ہی اسے چند نوجوان ہاتھ لگ گئے۔ اس نے انہیں کیمیا گری کے شعبدے دکھا دکھا کر مرعوب کرلیا۔ وہ ہر وقت اس کے ساتھ لگے رہتے تھے۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ چند تجربات کے بعد ہاشم نے سونا بنالیا ہے تو وہ اس کی جادوگری کے قائل ہوگئے۔ اس سونے کی مدد سے اس نے ایک مصنوعی چہرہ تیار کرلیا جو اس کے چہرے پر پڑا رہے اور کوئی اس کا مکروہ چہرہ نہ دیکھ سکے۔ اس نے جو منصوبہ اپنے لیے تیار کیا تھا، اس میں اس نقاب کی بڑی ضرورت تھی۔ وہ اب تک پیغمبری کا دعویٰ کرنے کا ارادہ کر رہا تھا لیکن اس نقاب نے ایک اور ہی راہ سجھائی۔ پیغمبر تو انسان ہوتے ہیں۔ انسانوں میں آتے جاتے ہیں، منہ چھپا کر نہیں پھرتے۔ میں نے اگر پیغمبری کا دعویٰ کیا تو نقاب پہنے رہنے کا میرے پاس کوئی جواز نہیں ہوگا۔ مجھے اپنے لیے اس سے بھی اعلیٰ عہدہ درکار ہے۔ اس کے مددگار نوجوان اس روز اس کے پاس آئے تو اس نے ان سے عجیب بات کہی۔

"کل رات تمہارے استاد کو عجیب مرتبہ حاصل ہوا ہے۔ خدا کی روح مجھ میں حلول کرگئی ہے۔"

"کیا خدا کی بھی روح ہوتی ہے؟"

"تم ان باریک باتوں کو نہیں سمجھو گے۔ بس یہ سمجھ لو کہ خدا مجھ میں حلول کرگیا ہے۔ اب میرا حکم خدا کا حکم ہوگا۔ میں ہی خدا ہوں۔"

"خدا کو یہ ضرورت کیوں پیش آئی استاد!"

"دنیا بہت خراب ہوچکی ہے۔ خدا میری شکل میں دنیا میں اتر آیا ہے۔ اب میں اس دنیا کو سنواروں گا اور تم میرا ساتھ دو گے۔ اس کے صلے میں تمہیں کسی مناسب وقت پر آسمانوں اور جنت کی سیر کرائی جائے گی۔"

"ہمیں کیا کرنا ہوگا؟"

"تم مجھے ربِ کائنات کہہ کر پکارو گے اور مجھے سجدہ کرو گے۔"

ان سب نے جو اس وقت وہاں موجود تھے اسے سجدہ کیا۔ وہ بہت دیر سجدے میں پڑے رہے۔ جب ہاشم خوب خوش ہوچکا تو انہیں سجدے سے اٹھایا۔

"بس اب سجدے سے سر اٹھاؤ۔ تمہارا امتحان پورا ہوا۔" انہوں نے سجدے سے سر اٹھایا تو ہاشم نے انہیں ہدایت کی "یہاں سے جانے کے بعد ابھی کسی کو کچھ مت بتانا جب تک میں نہ کہوں۔ آج کے بعد سے تم بس میرا حکم مانو گے۔"

"جی ربِ کائنات!"

اس نے سوچا وہ یہاں رہ کر کتنی ہی ترقی کرلے، لوگ اسے ہمیشہ دھوبی کا لڑکا ہی کہتے رہیں گے۔ میرے چہرے کی بدصورتی انہیں ہمیشہ مجھ سے متنفر رکھے گی۔ میں جو دعویٰ کرنے والا ہوں، اس پر لوگ کبھی یقین نہیں لائیں گے۔ زیادہ سے زیادہ مجھے جادوگر کہا جائے گا اور بس۔ مجھے کسی نئے علاقے میں جانا چاہیے۔ جہاں لوگ مجھے نہ جانتے ہوں۔ جہاں کسی نے میری شکل نہ دیکھی ہو۔ وہ کہاں جائے گا، یہ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ تیاری کرنے لگا۔ سفر کے لیے گھوڑے تیار کرلیے۔ یہ تمام کام خفیہ طور پر ہورہا تھا۔ جب تیاریاں مکمل ہوگئیں تو اس نے ساتھیوں کو مطلع کردیا۔

"میرا حکم ہے، تم اپنے گھر بار چھوڑ کر میرے ساتھ سفر پر روانہ ہوگے۔"

"ہماری منزل!"

"خدا کسی کے ارادوں کا پابند نہیں۔ یہ سب زمین میری ہے۔ میں جہاں چاہوں گا، قیام کروں گا۔ تم میرے ساتھ ہوگے۔"

یہ کل بیس افراد تھے، جو اس کے ساتھ جانے پر تیار ہوئے تھے۔

اس نے ایک گھوڑے پر دو افراد کو سوار کیا۔ خود اکیلے گھوڑے پر سوار ہوا اور رات کے اندھیرے میں گاؤں سے نکل گیا۔

یہ سفر چاند کی روشنی میں خاموشی سے طے ہورہا تھا۔ حکم یہی تھا کہ کوئی کسی سے آپس میں گفتگو نہیں کرے گا۔

رات بھر چلنے کے بعد جب صبح نمودار ہوئی تو ساتھیوں نے دیکھا، سنہرے نقاب سے اس کا چہرہ چھپا ہوا ہے۔ انہیں تو معلوم تھا کہ نقاب کے پیچھے کیسا چہرہ ہے لیکن کوئی اجنبی دیکھتا تو قطعی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ نقاب کے پیچھے کیسا بھیانک چہرہ ہے۔ وہ تو یہی دیکھتا کہ سونے کے نقاب پر کرنیں پڑ رہی ہیں تو وہ چمک رہا ہے۔

"ربِ کائنات، آپ کے چہرے پر یہ نقاب کیسا؟"

"اب میرے چہرے پر ایسا رعب وجلال طاری ہوچکا ہے کہ تم اس کی تاب نہ لاسکو گے۔ اسی لیے میں نے جنت سے یہ نقاب اپنے لیے منگوالیا ہے۔"

"ہم تو آپ کو عرصہ دراز سے دیکھتے چلے آرہے ہیں۔"

"اب میرا چہرہ وہ نہیں رہا ہے جو تم دیکھ چکے ہو۔"

"پھر بھی ہم سے کیا پردہ!"

"پاگل مت بنو۔ کیا تم نے نہیں سنا کہ میں نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی ایک جھلک دکھائی تھی اور وہ بے ہوش ہوگئے تھے۔ وہ تو موسیٰ تھے، میں نے اگر نقاب اتار دیا تو تم جل کر خاک ہوجاؤ گے اور خبردار! آئندہ ایسی ضد مت کرنا۔ تمہاری ضد میرے غضب کو دعوت دے گی۔"

سب کے سب اس پر اتنا یقین لاچکے تھے کہ مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ اب وہ ماوراالنہر کے علاقے "کش" میں پہنچ گئے تھے۔ یہ سرسبز وشاداب پہاڑیوں کا علاقہ تھا۔ جنگی نقطۂ نگاہ سے بھی یہ جگہ بہت مناسب تھی۔ درختوں کی کثرت بتا رہی تھی کہ رات کو اندھیرا رہتا ہوگا۔ خفیہ سرگرمیوں کے لیے یہ علاقہ بے حد کارآمد ثابت ہوسکتا تھا۔ اس نے آبادی سے ہٹ کر ویران پہاڑوں کا رخ کیا۔ یہ دیکھ اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی کہ پہاڑوں کے درمیان ایک قلعہ بنا ہوا ہے۔ دیکھنے میں ویران معلوم ہورہا تھا۔ اس کی فراست نے بھانپ لیا کہ قلعے میں کوئی نہیں ہے۔

"میرے فرشتوں نے مجھے بتایا ہے کہ قلعہ خالی پڑا ہے۔ تم میں سے ایک قلعے کے اندر جائے اگر پھر بھی وہاں کوئی ذی نفس موجود ہے تو اس سے کہنا، اے مردِ خدا! خدا نے آدم کو زمین پر اتارا تھا۔ اب وہ خود مجسم ہوکر زمین پر اتر آیا ہے اور تجھے بلاتا ہے۔"

کسی کو یہ پوچھنے کی جرأت نہیں تھی کہ جب فرشتوں نے بتادیا ہے تو کسی کو کیوں اندر بھیجا جارہا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہاشم کو اندازہ ہو گیا تھا کہ قلعہ خالی پڑا ہے لیکن وہ یقین کرنا چاہتا تھا۔ اگر کوئی اندر گیا تو یا تو زندہ واپس نہیں آئے گا یا آ کر بتا دے گا کہ اندر سپاہ موجود ہے۔ پھر وہ قلعے میں نہیں جائے گا۔ باہر پڑاؤ ڈال لے گا۔ قلعے والوں سے کہہ دے گا کہ وہ مسافر ہے۔ پھر وہ کہیں اور ٹھکانا ڈھونڈ لے گا۔

اس کے حکم پر ایک سوار اندر گیا اور گھوم پھر کر واپس آ گیا۔ اطلاع مل گئی۔ وہ سب کو لے کر قلعے کے اندر چلا گیا۔ اس نے دیکھا کہ قلعے کے اندر پانی کا قدرتی چشمہ موجود ہے۔ اب اسے غذا کا انتظام کرنا تھا۔ اس نے اپنے لوگوں کو سونے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے دے دیے۔

''یہ لے کر قریب کی بستیوں کی طرف چلے جاؤ۔ جتنا غذائی سامان گھوڑوں پر لاد سکتے ہو لے کر چلے آؤ لیکن خبردار، کسی کو میرے بارے میں کچھ مت بتانا۔''

''یہ بھی نہیں کہ خدا زمین پر اترا ہے۔''

''ہرگز نہیں۔ میں رازق ہوں، پہلے ان کے لیے غذا جمع کرلوں، پھر میں انہیں اپنا مہمان بناؤں گا۔ اگر وہ اس سے پہلے آ گئے تو جنت کے پھل ان کے لیے بے کار ہوں گے۔ انہیں تو دنیاوی غذا ہضم ہوگی۔''

اس کے آدمی مختلف بستیوں میں پھیل گئے اور شام ہونے سے پہلے غذائی سامان لے کر آ گئے۔ یہ سلسلہ کئی دن تک برابر چلتا رہا۔ اناج اور مختلف چیزوں سے کوٹھریاں بھر گئیں۔ پھر اس نے گائے اور بکریاں جمع کرنا شروع کر دیں تاکہ بوقتِ ضرورت گوشت کا بندوبست ہو سکے۔

جب کئی روز تک مخصوص افراد غذائی اجناس خریدتے رہے تو تاجر یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ یہ کون لوگ ہیں اور کس کے لیے اتنا سامان خرید کر لے جاتے ہیں اور وہ بھی سونے کے ٹکڑوں کے بدلے۔ پوچھو تو کچھ بتاتے نہیں ہیں۔ انہوں نے ان لوگوں کو قلعہ کش میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ خلیفہ مہدی کی فوجیں قلعہ میں فروکش ہوئی ہیں۔ ان دنوں یہ عباسی خلیفہ بنو امیہ سے جھڑپوں میں مشغول تھا۔ لوگوں کو یقین آ گیا کہ کوئی انتظامی تبدیلی عمل میں لائی گئی ہے۔

ہاشم جب ان انتظامات سے فارغ ہو گیا تو اس نے اپنے آدمیوں کو اس ہدایت کے ساتھ تبلیغ کے لیے روانہ کیا کہ وہ اس کی تعریف بیان کریں اور انہیں یہ خوش خبری سنائیں کہ خدا انسانی شکل میں نمودار ہوا ہے۔ اگر تمہارے بارے میں پوچھیں تو کہنا تم اس کے مقرب فرشتے ہو اور تم بھی انسانی شکل میں آئے ہو۔ خدا جو چاہے وہ کر سکتا ہے۔

یہ لوگ اِدھر اُدھر پھیل گئے اور لوگوں کو بشارتیں دینے لگے۔ پہلے تو ان لوگوں کو یقین نہیں آیا۔ باتیں سنتے اور مذاق میں اڑا کر چلتے بنتے لیکن پھر جب یہ صدائیں مسلسل ان کے کانوں میں آنے لگیں تو انہوں نے سوچا، جھوٹے کو گھر تک پہنچایا جائے۔ چند لوگوں نے ہمت کی اور انسانی خدا کے دیدار کے لیے قلعہ کش پہنچ گئے۔ ہاشم کے ساتھی انہیں ایک پردے کے قریب لے کر پہنچے جو سونے کے تاروں سے بنا ہوا تھا۔ ان لوگوں نے دیکھا کہ ان کے پہنچتے ہی وہ پردہ خود بخود اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ انہوں نے دیکھا، ایک پستہ قد آدمی ایک اونچی کرسی پر بیٹھا ہے۔ اچنبھے کی بات یہ تھی کہ اس کا چہرہ سنہرے نقاب کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔

انسانی آواز نے انہیں مخاطب کیا ''خوش قسمت انسانو! تمہیں نوید ہو کہ تمہارا خدا انسانی شکل میں نمودار ہوا ہے۔''

''خدا کو یہ ضرورت کیوں پیش آئی؟'' کسی نے سوال کیا۔

''اس لیے کہ میں لاکھوں سال سے اس زمین پر پیغمبر بھیجتا رہا ہوں۔ آخری نبی بھی بھیج کر دیکھ لیا لیکن کوئی تبدیلی نہیں آ سکی۔ اب میں خود زمین پر اتر آیا ہوں کہ اپنے نامراد بندوں کو تسلی دوں۔''

''آپ نے اس ملاقات کے لیے حکمرانوں کا انتخاب کیوں نہیں کیا؟''

''اس لیے کہ میں انہیں اپنی رحمت سے نکال چکا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ اقتدار کے نشے میں اتنے بدمست ہو چکے ہیں کہ مجھ سے لڑنے پر کمربستہ ہیں۔ بہت جلد ان کا یہ غرور خاک میں مل جائے گا۔ میں ان کی جگہ غریبوں کو سرفراز کروں گا۔''

''آپ نے اپنا چہرہ نقاب میں چھپایا ہوا ہے۔ یہ کیسا دیدار ہے؟''

''تم میرے دیدار کی تاب نہیں لا سکتے۔ میں تمہیں اپنے جلوے سے قیامت کے دن فیض یاب کروں گا۔ اس دن میں تمہارے دلوں کو مضبوط کر دوں گا۔ ابھی تم برداشت نہیں کر سکتے اور ہاں، آئندہ نقاب کشائی پر اصرار مت کرنا۔''

ان لوگوں کو بہترین کھانا کھلایا گیا اور رخصت کر دیا گیا۔ یہ لوگ جب اپنے علاقوں میں گئے تو ہاشم کو مفت

کے مبلغ ہاتھ آ چکے تھے۔ وہ قلعے اور نئے خدا کی باتیں مزے لے لے کر بیان کر رہے تھے۔ ان کی باتوں میں عقیدت نہ سہی لیکن دلچسپی ضرور تھی۔ ایک نئی دنیا کا انکشاف تھا جو وہ دوسرے لوگوں کے سامنے کر رہے تھے۔ دوسرے لوگوں کو بھی اشتیاق ہوا کہ وہ قلعہ کش میں جائیں اور اس آدمی سے ملاقات کریں جو خود کو خدا کہتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ باتیں دور دور تک پھیل گئیں۔ اس کی صداقت جاننے کے لیے دور دور سے لوگ آنے لگے۔ قلعے میں ہر وقت بھیڑ لگی رہنے لگی۔ یہاں کھانا ہر وقت تیار رہتا تھا۔ جو شخص کھانا چاہے اسے یہاں کھانا مل جاتا تھا لہٰذا بہت سے نادار لوگ ایسے تھے جو یہاں صبح شام کھانا کھانے لگے۔ اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کو کس طرح کھانا فراہم کر دیا جاتا ہے، کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔

بہت سے نادار لوگوں نے سوچا اس خدا پر ایمان لا کر قلعے ہی میں رہا جائے۔ کم از کم کھانے کو تو ملا کرے گا۔ وہ اس پر ایمان لے آئے۔ بہت سے ایسے تھے جو اس کی شعبدہ بازیوں سے واقعی متاثر ہوئے تھے۔ انہوں نے اسے سجدہ کیا اور اس پر ایمان لے آئے۔

وہ چونکہ چہرے پر نقاب ڈالے رہتا تھا اس لیے وہ ''ابنِ مقنع ....'' (نقاب کا بیٹا یا نقاب والا) کے نام سے مشہور ہو گیا۔

جب اس کے پیروکاروں کی تعداد بڑھنے لگی تو اسے ان دس بیس مددگاروں کی ضرورت نہیں رہی جو اس کے ساتھ گاؤں سے آئے تھے۔ اس نے ان تمام لوگوں کو اپنے پاس بلایا۔

''زمین پر کام کرنے والوں کی تعداد اب بہت ہو گئی ہے۔ اب تمہاری ضرورت آسمانوں پر ہے۔ تم وہاں جاؤ اور جنت میں قیام کرو۔''

''ہم ہمیشہ آپ کے ساتھ رہے ہیں۔ آپ کا ساتھ چھوڑنا ہمیں گوارا نہیں۔''

''تمہارا خدا ہر وقت اور ہر جگہ تمہارے ساتھ ہے۔ وہاں بھی تم مجھے اسی طرح بیٹھا ہوا دیکھو گے۔''

''ہم آسمان پر جائیں گے کیسے؟''

''قلعے کی دیوار پر چڑھو اور جنگل کی طرف کود جاؤ لیکن خبردار، ایک ایک کر کے نہیں، سب ایک ساتھ کودنا۔''

''اس طرح تو ہماری جانیں ہلاکت میں پڑ جائیں گی۔''

''زمین پر گرنے سے پہلے فرشتے تمہیں اپنے پروں پر اٹھا لیں گے۔''

وہ اس کی عقیدت میں اتنے اندھے ہو گئے تھے کہ اس کی باتوں میں آ گئے۔ رات کے وقت دیوار پر چڑھے اور نیچے کود گئے۔

اب ابنِ مقنع مطمئن تھا۔ اس کے سب گواہ مارے جا چکے تھے۔ اب کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کا نام کیا ہے، کس علاقے سے آیا ہے اور اس نقاب کے پیچھے کس کا چہرہ ہے۔ اب تمام نئے لوگ تھے جو اسے خدا مانتے تھے یا نہیں مانتے تھے لیکن اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔

اردگرد کے علاقوں میں دھوم مچی ہوئی تھی کہ قلعہ کش میں خدا اترا ہے۔ لوگ جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ بچوں تک کو اپنے ساتھ لا رہے تھے۔ وہ اپنی شعبدہ بازیوں سے انہیں مسحور کر رہا تھا۔ کچھ اسی وقت اس پر ایمان لے آتے تھے، کچھ ڈانواں ڈول گھروں کو لوٹتے تھے لیکن ایمان ان کا بھی بگڑ چکا ہوتا تھا۔ ایک بڑی تعداد ایسی بھی تھی جو اس کے ساتھ ہی قلعے میں رہنے لگی تھی ... اس نے انہیں حکم دیا کہ وہ اپنی عورتوں کو بھی اگر وہ جوان ہیں، قلعے میں لے آئیں۔

''وہ کس لیے؟'' دوچار نے تجسس آمیز لہجے میں پوچھا۔

''میں نے عورت کو نہایت حسین مخلوق بنایا ہے اور نسلِ انسانی میں اضافے کا ذریعہ بھی۔ عورتوں کے بغیر یہ قلعہ بے رونق ہو گیا ہے۔ تم خوش قسمت ہو کہ تمہارا خدا تمہاری عورتوں پر توجہ دے گا۔ ان سے جو اولاد پیدا ہوگی، وہ خدا کی اولاد ہوگی جو خدا کے دین کی مضبوطی کا باعث بنے گی۔''

''ربِ کائنات! خدا کو عورتوں کی کیا ضرورت؟''

''میں خدا ضرور ہوں لیکن انسانی شکل میں نمودار ہوا ہوں، مجھے ضرورت ہے۔''

''ہم نے تو سنا ہے ایک کی بیوی دوسرے پر حرام ہے۔ اور یہ شریعت آپ ہی نے بنائی ہے۔''

''جو شریعت بناتا ہے، وہ تبدیل بھی کر سکتا ہے۔ ختم بھی کر سکتا ہے۔ میرے نئے دین میں محرم نامحرم کا سوال نہیں۔ جو عورتیں قلعے میں آتی ہیں، وہ سب کی ملکیت ہیں۔ خود بھی فائدہ اٹھاؤ، دوسروں کو بھی اٹھانے دو۔ یہی قانون میں آہستہ آہستہ پوری دنیا میں رائج کروں گا۔''

وہ کئی دن تک یہ باتیں ان کے ذہنوں میں بٹھاتا رہا اور... بالآخر وہ اپنی عورتوں کو قلعے میں لے آئے جن میں کئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ابن مقفع کی بیویاں بن گئیں۔

اب وقت آ گیا تھا کہ وہ اپنے پیروکاروں کو ایسے لالچ دے جو انہیں ہمیشہ کے لیے اس کا اسیر بنا دیں۔ اس نے لوٹ مار اور ڈاکازنی ان کے لیے جائز کر دی۔ اس نے حکم دیا کہ جو لوگ ابھی تک مجھ پر ایمان نہیں لائے ہیں ان کا مال و دولت تمہارے لیے مباح ہے۔ انہیں لوٹ لو، ان کی عورتوں کو اٹھا کر لے آؤ۔ وہ تمہاری باندی بن کر رہیں گی۔ ان میں جو سب سے خوبصورت ہوگی، وہ میری ہوگی۔

ان میں بہت سے ایسے تھے کہ اسلام کی آمد سے قبل ان کے قبائل ڈاکازنی کا پیشہ اپنائے ہوئے تھے۔ مسلمان ہو جانے کے بعد لوٹ مار سے توبہ کر لی تھی۔ ان کی رگوں میں وہی خون دوڑ رہا تھا۔ اجازت ملتے ہی ان کے منہ میں پانی بھر آیا۔ ہتھیار فراہم کیے اور لوٹ مار میں مشغول ہو گئے۔ جو مال ملتا اس کا کچھ حصہ ابن مقنع اپنے پاس رکھ لیتا۔ یہی حال لڑکیوں اور عورتوں کا تھا۔ جو اسے پسند آتی اس کی ہو جاتی۔

جب اس فتنے کی خوب شہرت ہوئی اور اس کی تعلیمات کا چرچا ہونے لگا تو سب سے پہلے علمائے وقت چوکنا ہوئے۔ معاملہ مذہبی تھا اس لیے انہوں نے ضروری سمجھا کہ باز پرس کی جائے۔ علما کا ایک وفد اس سے ملنے "کش" آیا۔

ابن مقنع کا واسطہ اب تک سادہ لوح دیہاتیوں سے رہا تھا اور وہ اب پوری طرح اس کی مٹھی میں تھے۔ وہ ان علما سے مل کر کسی نئی بحث میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے قلعے کے دروازے بند کرا دیے، اس کے آدمیوں نے ان علما سے کہا کہ رب کائنات ان سے ناخوش ہے۔ اس لیے ملاقات نہیں کر سکتا۔ بہت جلد وہ اس کے عذاب سے دوچار ہوں گے۔

وفد کے ارکان اندر جانے کی کوشش کرتے رہے۔ کامیاب نہ ہوئے تو رات کو قلعے کے باہر ہی سو گئے۔ ابن مقنع بھی سوچتا رہا کہ علما کو کیسے ٹالا جائے۔ پھر اس کے چالاک ذہن نے ایک منصوبہ تیار کر لیا۔

اس نے صبح ہوتے ہی علما کے وفد کو اندر بلا لیا۔ انہیں حیران کرنے کا انتظام اس نے پہلے ہی کر لیا تھا۔ وہ جہاں بیٹھا تھا اس کے سر کے اوپر ایک مصنوعی سورج ہوا میں معلق تھا۔ لیکن اس سے دھوپ نہیں ٹھنڈی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ گرمیوں کے دن تھے لیکن دیواروں سے ٹھنڈی ہوا پھوٹ رہی تھی جیسے کھڑکیاں کھلی ہوئی ہوں۔ ہوا بھی ایسی معطر جیسے جنت سے آ رہی ہو۔ علما کو معلوم تھا کہ وہ جس شخص کے پاس آئے ہیں وہ ماہرِ طلسم ہے اس لیے وہ ذرا بھی مرعوب نہیں ہوئے۔

"اے شخص! اپنے چہرے سے نقاب ہٹا تا کہ ہم تجھے دیکھیں اور تجھ سے بات کریں۔"

"میرے بنائے ہوئے انسا تو، تم پر لازم ہے کہ مجھے سجدہ کرو۔"

"سجدہ صرف خدا کے لیے ہوتا ہے۔"

"کیا فرشتوں نے آدم کو سجدہ نہیں کیا تھا؟ انہوں نے پیکر خاکی کو نہیں مجھے سجدہ کیا تھا۔ تم بھی میرے خاکی پیکر کو نہیں مجھے سجدہ کرو گے۔"

"اگر تو خاکی ہے تو چہرے سے نقاب ہٹا۔"

"تم خود کو عالم کہتے ہو اور اتنا نہیں جانتے کہ تم میرے نور کی تاب نہیں لا سکو گے۔ کیا تمہیں موسیٰؑ کا حال نہیں معلوم؟"

"ہم اپنی ہلاکت کے خود ذمے دار ہوں گے۔ تو نقاب ہٹا۔"

"میرا ہر کام حکمت کے مطابق ہوتا ہے۔ حکمت نہیں ہے کہ نقاب ہٹایا جائے۔"

"یہ کیوں نہیں کہتا کہ ہم تیری حقیقت جان چکے ہیں، کیا تو علاقہ مرو کا رہنے والا ہاشم نہیں؟"

"میرے بہت سے نام ہیں اور میں کسی کے جسم میں بھی حلول کر سکتا ہوں۔"

"کیا یہ اسلامی عقیدہ ہے کہ روح حلول کر سکتی ہے؟"

"میں قادرِ مطلق ہوں، جو چاہوں کر سکتا ہوں۔"

"پہلے یہ تو معلوم ہو کہ تو ہے کون؟ چہرے سے نقاب کیوں نہیں ہٹاتا؟"

علما بار بار اصرار کر رہے تھے کہ وہ نقاب اتارے لیکن وہ کسی صورت تیار نہیں ہوتا تھا بلکہ اتنا ڈر گیا تھا کہ نقاب کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا کہ کہیں آگے بڑھ کر کوئی خود ہی نہ اتار دے۔ علما اس سے کوئی علمی سوال کرتے تھے تو وہ یہ شرط رکھ دیتا تھا کہ پہلے سجدہ کرو پھر جواب دوں گا۔ کچھ دیر بعد علما کو باہر نکال دیا گیا۔ ابن مقنع کا منصوبہ پورا ہو گیا تھا۔ اس کے آدمی اِدھر اُدھر دوڑ پڑے۔ کہتے پھر رہے تھے کہ علما بحث کرنے آئے تھے لیکن خدا سے بھی کسی نے بحث کی ہے۔ لاجواب ہو کر واپس چلے گئے، بلکہ قائل ہو کر واپس گئے ہیں۔

سوناگھاٹ کا پجاری، انکا، اقابل...

جیسی یادگار اور سدا بہار داستانیں جو آج بھی قارئین کے دلوں میں زندہ ہیں ہوش ربا، پر تحیر، پر تجسس اور سنسنی خیز کہانیوں کے خالق

انوار صدیقی

کے قلم سے

ایک نئی

سلسلے وار،

دلچسپ کہانی

کشکول

سسپنس ڈائجسٹ اگست 2011ء میں ملاحظہ فرمائیں

ازل سے برسرِ پیکار، خیر و شر کی متضاد قوتوں کی آویزش کی داستان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جاہل دیہاتی اس واقعے سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے سوچا جب بڑے بڑے عالم اسے پہچان گئے اور اسے خدا تسلیم کرلیا تو اگر ہم ابھی تک اس پر ایمان نہیں لائے تو یہ ہماری نادانی ہے۔

اب بڑی تیزی سے لوگ اپنا ایمان خراب کر کے اس کی طرف راغب ہونے لگے تھے۔

کش کے قریب ''نخشب'' نامی جگہ تھی۔ یہ پہاڑی علاقہ تھا اور درختوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ چاند کے علاوہ ان لوگوں کے پاس روشنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ جن دنوں چاند، ہلال کی صورت میں ہوتا تھا، یہاں گھپ اندھیرا رہتا تھا۔ ان لوگوں نے ابن مقنع کی شہرت سنی تو کہنے لگے ابن مقنع خدا ہے، اس کے ہاتھ میں تو سب کچھ ہے، ہم اپنے مسئلے کا حال اس کے پاس لے کر چلتے ہیں۔''

اس قبیلے کے کچھ لوگ ابن مقنع کے پاس آئے ''کیا ہم نے صحیح سنا ہے کہ تو ہی خدا ہے؟''

''خدا خود کو منوانے کے لیے دلیلیں پیش نہیں کرتا۔ تمہیں ماننا ہے تو خود ہی مان لو۔ مانو گے تو میری رحمتوں سے مالا مال ہو جاؤ گے نہیں مانو گے تو بھی میں تمہیں کھانے کو دیتا رہوں گا۔ جب میں آسمان پر تھا، نہیں ماننے والے اس وقت بھی مجھے نہیں مانتے تھے۔''

''اگر تو خدا ہے تو تیرے ہاتھ میں سب کچھ ہوگا۔''

''ہاں، سب کچھ ہے۔''

''ہم جہاں رہتے ہیں، وہاں اندھیرا بہت ہے۔ چاند کی روشنی ہمارے لیے بڑی فائدہ مند ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ تو نے جو چاند بنایا ہے اس کی روشنی گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ تو اس چاند کی روشنی ایک ہی حالت پر کردے۔''

''کرتو سکتا ہوں لیکن نظامِ کائنات تتر بتر ہو جائے گا۔''

''پھر تو کیسا خدا ہوا؟''

''میں ایک کام کرسکتا ہوں۔ ایسا ہی ایک چاند اور بنادوں جو آسمان پر چمکا کرے اور جس کی روشنی ہمیشہ ایک حالت میں رہے۔''

''ہمیں تو روشنی سے مطلب ہے۔ اچھا ہے ہمیں دو چاند کی روشنی مل جائے گی۔''

''میں اپنی خدائی سے یہ کام کردوں گا۔''

''ہمارا پورا قبیلہ تجھ پر ایمان لے آئے گا اور تیرے دشمنوں سے تیرے لیے لڑے گا۔''

''اب تم لوگ جاؤ۔''

ان افراد نے اسے سجدہ کیا اور چلے گئے۔

ان کے جاتے ہی ابن مقنع سوچ میں پڑ گیا۔ اب اس کی خدائی کا انحصار دوسرے چاند کے طلوع ہونے پر تھا۔ اس کی مہماتی طبیعت نے یہ وعدہ کرلیا تھا لیکن یہ معمولی ایجاد نہیں تھی۔ اس نے اپنی خواب گاہ کے لیے ایسے ستارے تو بنائے تھے جو ہوا میں معلق بھی رہتے تھے اور چمکتے بھی تھے لیکن چاند بنانا اور اس کو میلوں تک ہوا میں بلند رکھنا، یہ تو معجزاتی کام تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ یا تو ایسا چاند بنالے گا یا خاموشی سے اس علاقے سے نکل جائے گا۔ لوگ سمجھ لیں گے کہ آسمان کا خدا آسمان پر چلا گیا۔ وہ خلوت میں چلا گیا۔ بس کچھ دیر کے لیے باہر نکلتا تھا۔ وہ بھی اس لیے کہ باہر کے حالات کی خبریں ملتی رہیں۔ وہ کسی سے ملاقات نہیں کررہا تھا۔ بس اپنے تجربات میں مشغول تھا۔

اس کے مخبر اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے جو اس کے لیے خبریں لایا کرتے تھے۔ اسے خبر ملی کہ ان علما نے جو اس کے پاس سے نامراد لوٹے تھے ایک محضر تیار کر کے خلیفۂ بغداد کے پاس بھیجا ہے جس میں اس سے استدعا کی ہے کہ وہ اس فتنے کی سرکوبی کرے۔ یہ وقت اس کے لیے بہت نازک تھا۔ ایک طرف وہ اپنے تجربات میں مشغول تھا دوسری جانب یہ خبر تھی... جو بتا رہی تھی خلیفہ بہت جلد اس کی طرف فوجیں بھیجے گا لیکن وہ ذرا بھی نہیں گھبرایا۔

''خلیفہ اس محضر پر مطلق توجہ نہیں دے گا۔ اٹھا کر ایک طرف پھینک دے گا۔ میں نے اس کے دل میں یہی بات ڈالی ہے۔''

اس وقت لوگوں کو اس کی خدائی پر ایک اور دلیل مل گئی جب یہ خبر آئی کہ بالکل ایسا ہی ہوا۔ مہدی نے اس محضر کو پڑھا اور بے توجہی سے ایک طرف رکھ دیا اور کسی قسم کا حکم جاری نہیں کیا۔

مہدی کے سامنے اس وقت اور بڑے بڑے مسائل تھے۔ سب سے بڑا مسئلہ تو بنوامیہ کی بغاوت کو کچلنا تھا جس کے لیے وہ مختلف علاقوں کی طرف فوجیں روانہ کررہا تھا۔ علاقہ کش نہایت دشوار گزار اور پہاڑی علاقہ تھا۔ وہاں تک پہنچنا آسان نہیں تھا۔ پھر اس نے یہ بھی سوچا کہ ابن مقنع کا معاملہ چھوٹا موٹا سا مذہبی فتنہ ہے جسے وہ جب چاہے گا کچل دے گا۔

یہ خبر ٹل گئی تھی لیکن ابن مقنع جیسے عیار کو ہوشیار کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ لوہاروں

کو بلا کر ہتھیار بنانے کا کام شروع کردیا جائے۔

مسلمان کسی بھی وقت ہم پر حملہ کرسکتے ہیں، ان سے مقابلے کے لیے تیاری ضروری ہے۔ میں انہیں یوں بھی ملیامیٹ کرسکتا ہوں لیکن دنیاوی جنگ، دنیاوی ہتھیاروں سے لڑی جاتی ہے۔

کئی مہینے گزر گئے۔ وہ اپنے تجربات میں مشغول تھا۔ علاقہ نخشب کے لوگ مایوس ہو چکے تھے۔ ایک دوسرے سے کہتے پھر رہے تھے کہ اگر وہ واقعی خدا ہوتا تو اب تک ہمارے لیے چاند نکال چکا ہوتا۔

ابن مقنع اب قلعے سے نکل کر مغرب کی طرف پہاڑیوں میں چلا گیا تھا۔ ایک روز قلعے میں رہنے والوں نے دیکھا کہ پہاڑوں کی طرف سے روشنی کا ایک گولا آسمان کی طرف بلند ہوا اور پھر نیچے آ گیا۔ یہ عمل کئی مرتبہ دہرایا گیا۔ پھر کئی راتوں تک ایسا ہی ہوتا رہا اور ایک رات انہوں نے دیکھا، آسمان پر دو چاند چمک رہے ہیں۔ ایک چاند زیادہ فاصلے پر دوسرا چاند کم فاصلے پر۔ اس کی روشنی سے نخشب کا سارا علاقہ روشن ہو گیا ہے۔

یہی وہ مصنوعی چاند تھا جو ابن مقنع نے اپنی خدائی کا بھرم قائم رکھنے کے لیے بنایا تھا۔ اس کی روشنی تیس میل تک پھیلتی تھی۔ صبح ہوتے ہی یہ چاند نخشب کے قریب ایک کنویں میں اتر جاتا تھا۔

نخشب کے لوگوں کو ان کا چاند مل گیا تو وہ ڈھول تاشے بجاتے ہوئے قلعہ کش میں داخل ہوئے اور ابن مقنع کے سامنے سجدے میں گر گئے۔

یہ ایک جنگجو قبیلہ تھا۔ یہ قبیلہ اس کے پاس آیا تو اس کی طاقت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ اب وہ بلاشرکتِ غیرے اس علاقے کا خدا تھا۔ جو لوگ ابھی تک پس و پیش کررہے تھے، وہ بھی ابن مقنع پر ایمان لے آئے۔ دور دراز کے علاقوں سے بھی لوگ اس چاند کو دیکھنے کے لیے آنے لگے۔ رات کے وقت کوئی تجارتی قافلہ اس طرف سے گزرتا تھا تو ٹھہر کر اس چاند کو ضرور دیکھتا تھا۔ ان میں سے بہت سوں کو شوق ہوتا کہ اس پُراسرار شخص سے ملاقات کریں جو خدا نہ سہی لیکن خدائی کے کام انجام دے رہا ہے۔ اس کا چہرہ آج تک کسی نے نہیں دیکھا۔ وہ صرف باتیں کرتا ہے۔ جب لوگ سننے پر آمادہ ہوں تو کہانیاں سنانے والے بہت مل جاتے ہیں۔ یہی اس کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔ اس کے معجزات کے ایسے ایسے من گھڑت قصے سنائے جارہے تھے جنہیں سن کر لوگ مبہوت ہو جاتے تھے۔

اب وہ اتنی طاقت پکڑ چکا تھا کہ ہتھیاروں سے لیس تیس ہزار کا لشکر اس کے پاس موجود تھا۔ اس لشکر کی خوراک اور دیگر اخراجات کے لیے رقم کی ضرورت ہوتی تھی۔ وہ کسی مملکت کا بادشاہ تو تھا نہیں کہ محصولات کی آمدنی سے سلطنت کا خرچ چلایا جاتا۔ اس نے چند جنگجو سرداروں کو اپنے پاس بلایا۔

''کیا تم ایمان رکھتے ہو کہ جس کو جو کچھ ملا ہے وہ میری ہی عطا ہے؟''

''تو ہی دینے والا ہے۔''

''اب مجھے اس میں سے کچھ واپس چاہیے؟''

''ہم سمجھے نہیں ربِ کائنات!''

''شاہراہوں پر گھات لگا کر بیٹھ جاؤ اور آتے جاتے تجارتی قافلوں کو لوٹ لو تاکہ میں تمہارے لیے مزید قلعے تعمیر کراؤں۔''

''ہم ایسا ہی کریں گے ربِ کائنات!''

''لیکن یاد رہے ہمیں صرف مال نہیں لوٹنا ہے بلکہ کوشش کرو کوئی زندہ بچ کے واپس نہ جائے۔ سب کو قتل کردو یا گرفتار کر کے میرے پاس لاؤ۔ نہ کوئی زندہ بچ کر جائے گا، نہ جا کر بتائے گا کہ یہ حادثہ کہاں پیش آیا۔ اور ہاں، عورتیں بہت نازک ہوتی ہیں۔ اگر وہ ملیں تو نہایت احتیاط سے میرے پاس پہنچا دیا کرو۔ میں انہیں تم میں تقسیم کردیا کروں گا۔ وہ تمہارے لیے زمینی حوریں ہوں گی۔ ان سے اولاد پیدا کرو تاکہ تمہاری طاقت میں اضافہ ہو۔''

انسان کو اور کیا چاہیے؟ جب گناہ ثواب کا تصور ہی اٹھ گیا۔ محرم، نامحرم کا فرق ہی ختم ہو گیا تو یہ لوگ وحشی بن گئے۔ بستیوں کی بستیاں اجڑ گئیں۔ کوئی عورت اپنے گھر میں نہ رہ سکی۔ امان صرف انہیں تھی جو قلعے میں تھے لہٰذا جو اس پر ایمان نہیں لائے تھے، وہ بھی جان بچانے کے لیے قلعے میں آ گئے۔ رات ہوتے ہی قلعے کے دروازے بند ہو جاتے تھے۔ پھر عورتوں کی چیخیں گونجتی تھیں یا قہقہے۔

شاہراہیں محفوظ نہیں رہی تھیں۔ جو قافلہ گزرتا تھا، اسے لوٹ لیا جاتا تھا۔ مرد قتل ہو جاتے تھے اور عورتیں باندی بنالی جاتی تھیں۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ لوٹنے والا کون ہے؟ کش کے ناظم تک یہ شکایتیں پہنچ رہی تھیں لیکن اسے معلوم تھا کہ ابن مقنع کی طاقت بہت بڑھ گئی ہے۔ وہ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ ابن مقنع کا مشغلہ صرف لوٹ مار ہے۔ سلطنت کا حصول نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لہٰذا وہ آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا یا کبھی کبھی مہدی کو لکھ دیتا تھا۔ ادھر بھی یہی حال تھا۔ حکمران تو اس وقت بیدار ہوتے ہیں جب ان کی حکومت کو خطرہ ہو۔ ابن مقنع ابھی کسی کے لیے خطرہ نہیں بنا تھا۔

وہ خاموشی سے اپنی طاقت بڑھا رہا تھا۔ اس نے خاموشی سے دو قلعے تعمیر کرالیے۔ ایک کا نام وثیق رکھا گیا دوسرے کا صیام۔ صیام کے قلعے میں پہاڑی محل وقوع کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ یہ جگہ پُرپیچ پہاڑیوں میں واقع تھی۔ کوئی معمولی فوج یہاں تک پہنچنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ اس کی مضبوطی کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ یہاں بھی اس کی کیمیا گری کام آئی تھی۔ دیواروں میں ایسی دھاتیں پگھلا کر ڈالی گئی تھیں جن پر کوئی حملہ اثر انداز نہیں ہوسکتا تھا۔

جب یہ قلعے تعمیر ہوگئے تو اس نے صیام کے قلعے کو اس طرح آراستہ کیا کہ جنت اور دوزخ کے مناظر کو مدِنظر رکھا۔ ایک طرف باغات، نہریں اور حوریں تھیں تو دوسری جانب منکروں کو سزا دینے کے لیے آگ دہکائی گئی تھی۔ اس قلعے کو اس نے غذائی اجناس سے بھر دیا اور خود بھی وہاں منتقل ہوگیا۔ کش کا قلعہ اب اس کے لشکر کے لیے تھا۔

کچھ دنوں سے لوٹ مار کا بازار سرد ہوگیا تھا۔ ابن مقنع اسے اپنے لوگوں کی کامیابی سمجھ رہا تھا لہٰذا انہیں غیظ و غضب کی حالت میں اپنے حضور طلب کیا۔

''تم اب لوٹ مار کے لیے کیوں نہیں نکلتے؟''

''نکلتے تو ہیں لیکن کچھ ہاتھ نہیں آتا۔''

''کیوں، کیا تمہاری تلواریں زنگ آلود ہوگئی ہیں یا لڑنے والے بہادر ہوگئے ہیں؟''

''یہ دونوں باتیں نہیں ہیں۔''

''پھر کیا ہے؟''

''قافلے والے ہوشیار ہوگئے ہیں، دن کے وقت سفر کرتے ہیں۔''

ان کی باتیں سن کر ابن مقنع سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس کے عیار ذہن نے عیاری دکھائی۔

''شاہراہوں سے ہٹ کر مسجدیں تعمیر کراؤ۔ ہر مسجد میں موذن بھی ہونا چاہیے اور ایک ایک سرائے بھی ہونا چاہیے۔''

اس کے پیروکار اس حکم پر اس کی طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے کیونکہ اس نے اپنے دین میں نمازوں کا کہیں ذکر نہیں کیا تھا۔ اپنے ماننے والوں پر نمازیں معاف کردی تھیں۔

''آپ نے تو نمازیں معاف کردی ہیں۔''

''یہ سہولت تم لوگوں کے لیے ہے کیونکہ میں تمہارے سامنے ہوں اور تم نے میری رضا خرید لی ہے۔ میں جن سے دور ہوں انہیں یہ مشقت کرنی پڑے گی۔''

اس نے دلیل دے دی تھی لیکن پھر بھی مسجدوں کی تعمیر عجیب سی بات تھی لیکن جلد ہی یہ منطق ان کی سمجھ میں آگئی۔

جب مساجد تعمیر ہوگئیں تو اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ ''ادھر سے جو قافلے گزریں اور مسجد دیکھ کر نماز کے لیے داخل ہوں تو تم بھی نمازی بن کر وہاں پہنچو اور ان لوگوں کو مجبور کرو کہ وہ سرائے میں قیام کریں اور موقع دیکھ کر انہیں میرے پاس لے آؤ۔ خون کا ایک نشان تک سرائے کے فرش پر نہیں ہونا چاہیے۔''

یہ اس کی لوٹ مار کا نیا طریقہ تھا۔

ایک قافلہ ایک مسجد میں آکر ٹھہرا تھا۔ نماز کے بعد ابن مقنع کے آدمی اسے سرائے میں لے گئے اور ان کی خوب خاطر تواضع کی۔

''جانتے ہو یہ خاطر تواضع کس کی طرف سے کی جارہی ہے؟''

''ہمیں کیا معلوم لیکن جو بھی اللہ کا بندہ ہے، وہ نیک آدمی ہے جو اتنے ثواب کا کام کررہا ہے۔''

''کیا تم اس سے ملنا نہیں چاہو گے؟''

''کیوں نہیں، اس کا شکریہ ادا کرنا ہم پر واجب ہے۔''

''رات یہاں گزار لو۔ ہم کل صبح تمہیں اس نیک آدمی کے پاس لے چلیں گے۔''

صبح ہوئی تو اونٹوں پر سامان لاد دیا گیا۔ ابن مقنع کے آدمی ان اونٹوں کو قلعے میں لے جانے کے لیے تیار تھے۔

''سنا ہے اس علاقے میں مشہور جادوگر ابن مقنع بھی رہتا ہے جو مسافروں کو لوٹ لیتا ہے۔''

''کسی نے تمہیں غلط بتایا ہے۔ لوٹ مار تو کوئی اور کرتا ہے۔ ابن مقنع تو اس کی روک تھام کے لیے اس علاقے میں آکر بیٹھا ہے۔''

''تو کیا اس نے خدائی کا دعویٰ نہیں کیا ہے؟''

''اس سے چل کر خود ہی پوچھ لو۔''

''تو کیا ہم ابن مقنع کے پاس جارہے ہیں؟''

''یہ مسجدیں اور سرائیں سب اس کی بنوائی ہوئی ہیں۔''

''وہ تو اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ ہم اس کے بارے میں خواہ مخواہ بدگمانی میں مبتلا تھے۔''

ابن مقنع بہت دن سے قلعہ صیام میں رہ رہا تھا۔ ان

لوگوں کو قلعہ کش میں لے جایا گیا۔ ان کا مال و اسباب قلعہ صیام میں ابن مقنع کے پاس بھیج دیا گیا۔

رات ہوئی اور ان قیدیوں نے آسمان پر دو چاند دیکھے تو حیران ہوئے۔ یہ کیسا آسمان ہے جس پر دو چاند چمک رہے ہیں۔ انہوں نے پہرے داروں سے پوچھا۔

''تم لوگ خوش قسمت ہو کہ ایک ایسے علاقے میں آگئے ہو جہاں خدا رہتا ہے۔ اسی نے یہ چاند بنایا ہے۔''

''خدا تو آسمان پر رہتا ہے۔ یہ کیسا خدا ہے؟''

''یہ آسمانی خدا ہی ہے۔ اس نے انسانی شکل میں زمین پر ظہور کیا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے ہم نے صحیح سنا تھا۔''

''کیا سنا تھا؟''

''یہی کہ ابن مقنع نے خدائی کا دعویٰ کیا ہے۔''

''دعویٰ کیسا، وہ خدا ہی ہے، تم خود دیکھ لوگے۔''

''اب تو ہمیں بھی اس سے ملنے کا اشتیاق ہوگیا ہے۔''

آسمان پر چمکتے ہوئے چاند نے ان میں سے بہت سوں کے ایمان ڈانواں ڈول کردیے تھے چنانچہ جب وہ ابن مقنع کے سامنے پیش ہوئے تو ان پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ ان میں سے کچھ اسے دیکھتے ہی سجدے میں گر پڑے۔ کچھ اہلِ ایمان اسے خدا ماننے سے انکار کررہے تھے۔ اس نے حکم دیا کہ جو لوگ مجھ پر ایمان نہیں لائے ہیں، انہیں دوزخ میں بھیج دیا جائے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انہیں جلتی ہوئی آگ میں پھینک دیا جائے۔ ان میں دو عورتیں بھی تھیں۔ انہیں جب لے جایا جانے لگا تو وہ اتنی خوف زدہ ہوگئیں کہ ان میں سے ایک فوراً ایمان لے آئی۔ یہ تھی بھی اتنی خوبصورت کہ ابن مقنع نے اسے اپنے لیے منتخب کرلیا۔

''اسے جنت میں لے جاؤ اور بناؤ سنگھار کرکے میری خواب گاہ میں پہنچا دو۔''

جو لوگ ایمان لے آئے تھے، انہیں جنت میں بھیج دیا گیا۔ وہ یہاں جنت میں رہنے تو آئے نہیں تھے۔ اپنے اپنے گھروں کو جانا تھا۔ دو چار دن بعد انہوں نے جانے کی اجازت مانگی لیکن جو یہاں آگیا اسے جانے کون دیتا، وہ تو یہاں اتنے انسان جمع کرلینا چاہتا تھا کہ اگر کوئی حملہ ہو تو دشمن کے سامنے انسانوں کی دیوار بنا دے۔ ان سے کہہ دیا گیا کہ اب تم جنت میں آگئے، کھانے کو بھی ملے گا۔ عورتیں بھی ملیں گی لیکن واپس نہیں جاسکتے۔

یہ مسجدیں اسی طرح لٹتی رہیں اور قافلے کے قافلے غائب ہوتے رہے مگر کب تک؟ یہ علاقے جلد ہی سنسان ہوگئے۔ ابن مقنع اب ایک ایسی پُراسرار شخصیت بن چکا تھا جو نظر نہیں آتا اور جو چاہتا ہے کرگزرتا ہے۔

ابن مقنع کو اب اپنی طاقت کا گھمنڈ ہوگیا تھا لیکن لوٹ مار کے مواقع کم ہونے لگے تھے۔ اسے اب کوئی اور طریقہ اختیار کرنا تھا۔ اس نے بڑے بڑے بادشاہوں کے پاس خطوط روانہ کیے۔

''خدا میری ذات میں منتقل ہوگیا ہے بالکل اسی طرح جیسے آدم کی ذات میں منتقل ہوا تھا۔ پھر نوح کی ذات میں اور ہر پیغمبر کی ذات میں۔ اسی لیے میں خدائی کا دعویٰ کرتا ہوں، اب کوئی پیغمبر نہیں آئے گا اس لیے میں خود آگیا ہوں۔ میں زمین پر ہوں اور انسان ہوں اس لیے میری ضروریات بھی ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ مجھے خدا تسلیم کریں اور میری ذات کے لیے نذرانے روانہ کریں۔''

ایسا ہی ایک خط اس نے خلیفہ بغداد کی خدمت میں بھی روانہ کیا اور جواب کا انتظار کرنے لگا۔ یہ خط مہدی کو موصول ہوا تو اسے بے اختیار ہنسی آگئی لیکن ساتھ ہی اس فتنے کا احساس بھی ہوا جو اب اتنا جوان ہوگیا تھا کہ اسے للکار رہا تھا۔

اس خط کو تحریر کرنے کے بعد ابن مقنع کو یقین تھا کہ اس کے خلاف فوجی کارروائی ہوگی۔ اس نے تیاریاں شروع کردیں۔ اپنے مقربین کو طلب کیا جنہیں وہ فرشتوں کا درجہ دینے لگا تھا۔

''میں دیکھ رہا ہوں کہ خلیفہ بغداد ہم پر حملہ آور ہونے کی تیاری کررہا ہے۔ تم ان سے جنگ کروگے اور ان کے خیمے نصب ہونے سے پہلے انہیں شکست دے دوگے۔ تم میں سے کچھ لوگ قتل بھی ہوں گے لیکن میرا وعدہ ہے کہ تمہیں دوبارہ زندہ کروں گا۔ فتح ملتے ہی تم دوبارہ زندہ ہوجاؤ گے اس لیے مرنے سے ہرگز نہ ڈرنا۔''

خلیفہ بغداد نے اس کی طاقت کا غلط اندازہ لگایا اور ایک مختصر سی فوج اس پر حملہ کرنے کے لیے بھیج دی۔

یہ فوج دشوار گزار راستہ طے کرکے ماوراالنہر کے علاقے میں پہنچی تو بری طرح تھک چکی تھی۔ وہ ابھی خیمے نصب کررہے تھے کہ ابن مقنع کے لشکر نے انہیں جالیا۔ تھکن کے باوجود اسلامی لشکر ان کے مقابلے پر ڈٹ گیا۔ ان کے دلوں میں یہ جذبہ کارفرما تھا کہ وہ مرتدوں سے جنگ کررہے ہیں۔ دوسری طرف ابن مقنع کے پیروکار تھے جنہیں اس خیال نے طاقت دی ہوئی تھی کہ خدا ان کے ساتھ ہے۔ اگر مرگئے تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوبارہ زندہ ہوجائیں گے۔ وہ بھی بے خوفی سے لڑے۔ دیکھتے دیکھتے اس جنگ نے خوفناک شکل اختیار کرلی۔ آخرکار ابن مقنع کے آدمی غالب آئے اور اسلامی لشکر شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔

ابن مقنع کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی تھی۔ اسلامی لشکر کو خیمے نصب ہونے سے پہلے شکست ہوئی تھی۔ اس کے پیروکاروں کو ایک مرتبہ پھر یقین آ گیا کہ وہ واقعی خدا ہے۔

اتفاق یہ بھی ہوا کہ جتنے لوگ قتل ہوئے تھے، ان سب کی بیویاں حاملہ تھیں۔ اس نے خوش خبری سنائی کہ جتنے لوگ قتل ہوئے ہیں، ان کی روحیں تمہارے پیٹ میں آ گئی ہیں۔ وہ ان بچوں کی شکل میں دوبارہ اس دنیا میں آ جائیں گے۔

ابن مقنع نے خلیفہ کی افواج کو شکست دی تو سب کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔

خلافتِ عباسیہ کے باغیوں کی بڑی تعداد بخارا اور دوسری جگہوں پر موجود تھی لیکن عباسیوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے سامنے عاجز تھی۔ انہوں نے جب سنا کہ ابن مقنع نے خلیفہ کی فوجوں کو شکست دے دی ہے تو انہیں احساس ہوا کہ خطے میں ایک نئی طاقت ابھر رہی ہے۔ دونوں کا دشمن مشترکہ ہے۔ اگر ابن مقنع سے اتحاد کرلیا جائے تو مہدی کا تختہ الٹا جاسکتا ہے۔ ان باغیوں نے اپنا ایک وفد ابن مقنع کے پاس بھیجا۔

اس وفد کو کچھ دیر کے انتظار کے بعد ابن مقنع کے پاس بھیج دیا گیا۔ اسی سنہرے پردے نے اس وفد کا استقبال کیا جو ملاقاتیوں سے ملاقات کے وقت پڑا رہتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ یہ پردہ ایک طرف کو کھسک گیا۔ ایک تیز اور چمک دار روشنی نے آنکھوں کو خیرہ کردیا۔ خوشبو کا ایک جھونکا آیا اور ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں۔ پھر کمرا دھوئیں سے بھر گیا۔ یہ دھواں چھٹا تو ایک کرسی پر ایک پستہ قد آدمی چہرے پر سنہرا نقاب لگائے نظر آیا۔ یہی ابن مقنع تھا۔

''نادان مسلمانو! اپنے رب کو سجدہ کرو۔'' نقاب سے پیچھے سے آواز آئی۔

''ہم یہ بتانے یہاں نہیں آئے ہیں کہ آپ کو خدا تسلیم کرلیا ہے۔ اس لیے ہم سجدہ نہیں کرسکتے۔ ہم تو یہ بتانے آئے ہیں کہ ہم آپ کی دنیاوی طاقت کے قائل ہیں۔ آپ نے خلیفہ مہدی کی فوج کو شکست دی اس پر ہم آپ کو مبارک باد پیش کرتے ہیں کیونکہ ہم نے اس سے بغاوت کی ہوئی ہے۔ وہ ہمارا بھی دشمن ہے۔''

''مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''ہم چاہتے ہیں، ہم دونوں کا اتحاد ہوجائے۔ اگر مہدی کی فوج ہم پر حملہ آور ہو تو آپ ہماری مدد کریں اور اگر وہ آپ پر حملہ آور ہو تو ہم آپ کی مدد کو آ جائیں گے۔''

''اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ لوگ میرے خدا ہونے پر ایمان لائیں۔''

''اگر آپ خدا ہوتے تو کسی جنگ کے بغیر ہی جنگ جیت جاتے۔ یوں دنیا داروں کی طرح تلواروں کا سہارا نہ لیتے۔''

''یہ تو وہی بات ہوئی کہ میں حکم دیتا اور دنیا برائیوں سے پاک ہوجاتی۔ پیغمبروں کو بھیجنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ مجھے کوئی کام کرنا ہوتا ہے تو میں اس کا ذریعہ بناتا ہوں۔''

''اسلامی وفد اس وقت کوئی مذہبی بحث کرنے نہیں آیا تھا۔ اس نے ابن مقنع کو روک دیا اور اتحاد و تعاون کی بات کرنی چاہی۔

''اس وقت تو آپ ہم سے اتحاد کی بات کیجیے۔''

''میں جب آسمان پر تھا اس وقت بھی بہت سے لوگ مجھے نہیں مانتے تھے۔ میں تم پر بھی زور نہیں دوں گا۔ اب بتاؤ یہ اتحاد کن شرائط پر ہوگا۔''

''جو شہر ہم فتح کریں گے وہ آپس میں آدھے آدھے بانٹ لیں گے۔ اسی طرح مالِ غنیمت میں بھی حصہ ہوگا اور فتح تو ہماری ہی ہوگی کیونکہ خدا ہمارے ساتھ ہے۔'' وفد کے ارکان نے طنز کیا۔

''یہ تم طنز کررہے ہو یا مجھے خدا تسلیم کرلیا ہے۔''

''یہ ہماری آیندہ کی فتوحات پر منحصر ہے کہ ہم طنز کرتے ہیں یا تسلیم کرتے ہیں۔''

''تم مجھے خدا تسلیم کرو یا نہ کرو لیکن کسی کو میرے خلاف ورغلاؤ گے نہیں۔''

''ہم اپنے کام سے کام رکھیں گے۔''

اِدھر یہ باتیں ہورہی تھیں، اُدھر خلیفہ مہدی نے اپنے وزیر معاویہ بن عبداللہ کو طلب کرلیا تھا۔ اسے اس ملاقات کا علم ہوگیا تھا۔ اسے باغیوں کے اتحاد کے بعد اندازہ ہوگیا تھا کہ ابن مقنع کتنا طاقتور ہوجائے گا۔ اب اسے اپنا اقتدار خطرے میں نظر آیا تو اس فتنے کی سرکوبی کا خیال بھی آ گیا۔ معاویہ بن عبداللہ کی رائے بھی یہی تھی کہ اب اس فتنے کو اس کی مرضی پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔ ماوراالنہر سے بھی برابر

خبریں پہنچ رہی تھیں کہ ابن مقنع دین کا چہرہ مسخ کررہا ہے۔ خلیفہ مہدی نے زید بن یحییٰ کو حکم دیا کہ وہ لشکر تیار کرے اور اس فتنے کو کچل دے۔ زید بن یحییٰ نے اسے جہاد قرار دیا اور لشکر تیار کرکے روانہ ہوگیا۔

زید بن یحییٰ ابھی راستے میں تھا کہ اسے خبر ملی کہ خلیفہ نے ایک دوسری فوج بخارا کی طرف روانہ کردی ہے جسے باغیوں کی سرکوبی کا حکم دیا ہے۔ اس کی سپہ سالاری زید کا بھائی جبریل بن یحییٰ کررہا تھا۔

یہ خلیفہ کا نہایت دانش مندانہ فیصلہ تھا۔ اب بخارا کے باغی ابنِ مقنع ..... کی مدد کو نہیں پہنچ سکتے تھے کیونکہ درمیان میں زید کا لشکر موجود تھا۔

اس سے پہلے کہ بخارا کے باغی ابن مقنع کی مدد کو پہنچتے انہیں اپنی جنگ میں الجھنا پڑ گیا۔ وہ نہایت بہادری سے لڑے۔ انہیں خیال تھا کہ ابن مقنع ... بالآخر ان کی مدد کو پہنچ جائے گا۔ اس انتظار میں وہ چار مہینے تک لڑتے رہے اور پھر بھاگ کر روپوش ہونا پڑا۔

زید بن یحییٰ نے ان سرایوں کو مسمار کردیا اور مسجدوں میں اپنے آدمی بٹھا دیے جو ابن مقنع کی مقتل گاہیں بنی ہوئی تھیں۔ وہ آگے بڑھا تو اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ پورا علاقہ ابن مقنع کے پیروکاروں سے بھرا پڑا ہے۔ عام لوگ گروہ در گروہ باہر آتے تھے اور اسلامی لشکر پر حملے کرتے رہتے تھے۔ جو لوگ گرفتار ہوتے تھے، ان کے پاس ایک ہی جواب تھا ''ابن مقنع ہمارا خدا ہے، ہم اس کے پرستار ہیں۔''

زید پوچھتا ''یہ کیسا خدا ہے جو تمہیں راہزنی کی تعلیم دیتا ہے۔''

وہ کہتے ''یہ تو ہمارا جہاد ہے، مالِ غنیمت ہمارا حق ہے۔''

زید پھر پوچھتا ''اسلام تو یہ سب نہیں سکھاتا جو خدا کا پسندیدہ دین ہے۔''

''وہ کہتے!'' ''یہ سب پوچھنا ہے تو ابن مقنع سے جا کر خود پوچھ لو۔

یہ لوگ قتل کردیے جاتے یا انہیں توبہ کرا کے چھوڑ دیا جاتا۔

اسی طرح لڑتے بھڑتے اسلامی لشکر قلعہ صیام کے پاس جا کھڑا ہوا اور مورچہ بند ہوگیا۔ اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ کوئی جنگی حکمتِ عملی اختیار کیے بغیر ابنِ مقنع کا لشکر بھیڑ بکریوں کی طرح قلعے سے باہر نکل آیا۔ ان کی بہادری قابلِ دید تھی بلکہ کچھ دیر کے لیے مسلمان فوج سراسیمہ ہوگئی تھی کہ کن وحشیوں سے پالا پڑ گیا ہے۔ جو بہادر اپنی جان کی پروا نہیں کرتے، فتح ..... ان کا مقدر ہوتی ہے۔ مسلمان فوجی ایک دوسرے سے کہتے پھر رہے تھے اور سنبھل سنبھل کر حملے بھی کرتے جارہے تھے۔

زید بن یحییٰ نے یہ حال دیکھا تو خود گھوڑے پر سوار ہوا اور قلب میں پہنچ گیا ''بہادرو! یہ جہاد ہے۔ جہاد کرنے والے پیچھے نہیں ہٹتے۔ تمہارا دشمن بہادر نہیں بے وقوف ہے۔ ابن مقنع جنگی چالوں سے بالکل ہی بے خبر ہے۔ اگر اسے ذرا بھی سمجھ بوجھ ہوتی تو اپنے لوگوں کو یوں موت کے منہ میں نہ دھکیلتا۔ اب تمہارا کام ہے کہ اسے اس بے وقوفی کی سزا دو۔''

اس تقریر نے اثر دکھایا اور اسلامی فوج بے جگری سے لڑنے لگی۔ دیکھتے دیکھتے ابن مقنع کے آدمی گاجر مولی کی طرح کٹنے لگے۔ چند گھنٹوں میں ایک ہزار گردنیں زمین پر آ گئیں۔ اب ان لوگوں کو اندازہ ہوگیا کہ انہوں نے باہر نکل کر غلطی کی تھی۔ بڑھتے ہوئے قدموں نے واپسی کا راستہ لیا۔ یہ سب بھاگ کر قلعے میں واپس چلے گئے۔

اتنی ہلاکتوں کے بعد ایسی سنسنی پھیلی کہ خود ابن مقنع پر شک کیا جانے لگا۔ اس کے خلاف پہلی مرتبہ کچھ آوازیں بلند ہوئی تھیں۔ ان کے دل و دماغ میں یہ سوال اٹھ رہے تھے کہ خدا ان کے ساتھ ہے پھر بھی انہیں اتنا نقصان اٹھانا پڑا۔ وہ اگر بروقت قلعے میں محصور نہ ہوجاتے تو شاید ایک بھی زندہ نہ بچتا۔ یہ کیسا خدا ہے کہ دیکھتا رہا اور ہم قتل ہوتے رہے۔

ابن مقنع ایک ایسی جگہ بیٹھا تھا جہاں اس کے بنائے ہوئے چاند کی روشنی براہِ راست اس پر پڑ رہی تھی جس سے ماحول نے ایک آسیبی صورت اختیار کرلی تھی۔ وہ اس شکست سے بہت آزردہ اور طیش میں تھا۔ اس نے اپنے ماننے والوں کو طلب کیا اور ان پر برس پڑا۔

''تمہیں معلوم ہے تم نے کتنی شرمناک حرکت کی ہے۔ تم لوگ بھاگ کر قلعے میں کیوں آ گئے۔''

''ربِ کائنات! ہم اگر واپس نہ آتے تو سب کے سب مارے جاتے۔''

''کیوں، کیا میں تمہاری پشت پر نہیں تھا؟''

اس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ مکمل سکوت تھا کہ ابن مقنع کی آواز پھر گونجی ''تم اگر کچھ دیر اور ٹھہر جاتے تو میں تمہاری مدد کو آنے ہی والا تھا۔''

''ربِ کائنات! اب ہمارے لیے کیا حکم ہے۔ ہماری اس غلطی کے بعد جیسا آپ کہیں گے، ویسا ہی ہوگا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"حکم کیسا، تم اس چھوٹی سی جھڑپ سے دل برداشتہ ہوگئے۔ تمہارے جو لوگ قتل ہوئے ہیں، انہیں میں شہادت کا اعزاز دینا چاہتا تھا۔ میں نے انہیں یہ اعزاز دے دیا۔ فتح اور شکست دونوں میرے ہاتھ میں ہے۔ اصل جنگ تو اب ہوگی۔ مسلمانوں کا نام ونشان تک باقی نہیں رہے گا۔ ابھی تم قلعے میں بند بیٹھے رہو۔ دیکھو کہ ہوتا کیا ہے۔ میں نے آسمان سے فرشتوں کو طلب کرلیا ہے۔ وہ تمہیں نظر نہیں آئیں گے لیکن تمہارے شانہ بشانہ لڑیں گے۔"

"ربِ کائنات، ہم تیرا شکر ادا کرتے ہیں۔" اس کے پیروکار سجدے میں چلے گئے۔

"اب جاؤ اور اگلے مرحلے کا انتظار کرو۔"

ابن مقنع جانتا تھا کہ اس کا قلعہ ناقابلِ تسخیر ہے۔ چاروں طرف خندقیں اور گہرے کھڈ ہیں۔ جنگل ایسا گھنا ہے کہ روشنی بھی اندر داخل ہوتے ہوئے ڈرتی ہے۔ مسلمان محاصرہ کیے پڑے رہیں گے لیکن اندر داخل نہیں ہوسکیں گے اور... بالآخر واپس چلے جائیں گے۔ اسے یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ اس نے اپنی طاقت سے مسلمانوں کو واپس بھیج دیا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے باغی اس کی مدد کو آجائیں اور مسلمانوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑے۔

رات ہوگئی تھی۔ آسمان پر دو چاند چمکے تو اسلامی فوج میں کھلبلی مچ گئی۔ یہ کون سی آسمانی جگہ ہے جہاں آسمان پر دو چاند چمکتے ہیں اور مزہ یہ تھا کہ ایک چاند ابتدائی دنوں کا تھا دوسرا چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ خود زید بن یحییٰ حیران تھا کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ وہ تمام رات مسلمانوں نے استغفار کرتے ہوئے گزار دی۔ صبح ہوئی، آسمان سے چاند غائب ہوگیا۔ زید بن یحییٰ نے چند فوجیوں کو مقامی آبادی کی طرف بھیجا کہ اس چاند کی حقیقت دریافت کرکے آئیں۔ وہ جو خبر لائے، وہ عجیب وغریب تھی۔ مقامی لوگوں نے بتایا کہ یہ چاند ابن مقنع نے ان کے لیے آسمان پر روشن کیا ہے۔ خبر لانے والے نے یہ بھی بتایا کہ یہاں سب لوگ اسے اپنا خدا تسلیم کرتے ہیں۔

فوجیوں کو اس خبر کے باوجود حیرانی تھی۔ عقل یہ تسلیم ہی نہیں کررہی تھی۔ یہ یا تو جادو ہوسکتا ہے یا ابن مقنع واقعی خدا ہے۔ فوجی یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ اگر یہ جادو ہے اور ابن مقنع جادوگر ہے تو ہم سب ہلاک ہوجائیں گے اور اگر وہ خدا ہے پھر تو اور بھی برا ہوگا۔ خدا ہونے کی بات تو انہیں ہضم نہیں ہورہی تھی لیکن انہیں یہ یقین آگیا تھا کہ وہ جادوگر ضرور ہے۔

قلعے کا محاصرہ جاری تھا۔ لشکر کے لوگ ہر رات چاند کو بلند ہوتے دیکھ رہے تھے۔ وہ کس طرف سے آتا ہے یہ تو معلوم نہیں ہوتا تھا لیکن جب اس کی چمک سے دور دور کا علاقہ روشن ہوجاتا تھا تو فوجیوں کی پیشانی پر حیرانی تحریر ہوجاتی تھی۔ جیسے جیسے راتیں گزرتی جارہی تھیں جادو کے زور سے فوجیوں کے دم اکھڑنے لگتے تھے۔

زید بن یحییٰ اپنے سپاہیوں کی بے دلی کو محسوس کررہا تھا لیکن خاموش تھا۔ یہ ثابت کرنے کے لیے اس کے پاس الفاظ نہیں تھے کہ یہ جادو بھی نہیں ہے اور ابن مقنع خدا بھی نہیں ہے۔ شاید وہ بھی قائل ہوگیا تھا کہ ابن مقنع ایک پُراسرار شخصیت ہے۔ اس سے لڑنا اتنا آسان نہیں ہوگا۔ وہ یہ تک سوچنے لگا تھا کہ ابن مقنع اندر بیٹھا کوئی جادو کررہا ہوگا۔ نہ جانے کون سی آفت نازل کرے۔ یہی حال عام سپاہیوں کا بھی تھا۔ ذرا تیز ہوا چلتی تھی تو وہ ڈر جاتے تھے کہ یہ ہوا طوفان میں بدل جائے گی۔

کئی ہفتوں سے محاصرہ جاری تھا لیکن آگے بڑھنے کی ہمت کسی کی نہیں ہورہی تھی۔

ایک مرتبہ پھر خلیفہ مہدی کی پیشانی پر بل پڑتے نظر آئے۔ وقائع نویسوں نے اطلاع دی تھی کہ سپہ سالار زید بن یحییٰ ابن مقنع پر قابو پانے میں ناکام ہوچکا ہے۔ مہدی یہ خبر سن کر پریشان ہوگیا تھا۔ اس نے ابوعون نامی ایک سپہ سالار کو روانہ کردیا۔ وقائع نویسوں نے اس کے متعلق بھی وہی رائے لکھ کر بھیجی جو وہ زید کے بارے میں بھیج چکے تھے۔ اس کے بعد دربار بغداد سے معاذ بن مسلم کا نام تجویز ہوا جو اُن دنوں خراسان کا ناظم تھا۔ ابن مقنع کے قلعے اسی کے علاقے میں تھے لہٰذا یہ خیال کیا گیا کہ وہ ان سے واقف ہوگا لہٰذا کارآمد ثابت ہوگا۔ اس کے ہمراہ عقبہ بن مسلم بھی تھا جو بھاری جمعیت کے ساتھ آیا تھا۔ کچھ دنوں بعد سعید حرشی کو بھی لشکر کا افسرِ اعلیٰ مقرر کرکے روانہ کردیا۔

اس نئے لشکر نے یہ طے کیا کہ راستے میں ابن مقنع کے جتنے قلعے ملتے ہیں، انہیں فتح کرتے ہوئے صیام کے قلعے تک پہنچا جائے۔ پہلا قلعہ طواویس نامی مقام پر تھا۔ یہاں ابن مقنع کی خاصی فوج موجود تھی اور اس نے مقابلہ بھی خوب کیا لیکن... بالآخر پسپا ہونا پڑا۔ اس قلعے پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا لیکن اس مقام پر معاذ بن مسلم اور سعید حرشی کے درمیان اختلافات پیدا ہوگئے۔ معاذ بن مسلم حد سے زیادہ احتیاط سے کام لے رہا تھا جبکہ حرشی عجلت اور سرگرمی کا مظاہرہ کررہا

ہار موٹا نک ٹوتھ پیسٹ سے منہ، مسوڑھے اور دانت بہترین صاف ہوتے ہیں

ہار موٹا نک ٹوتھ پیسٹ سے خون، پیپ، بدبو، درد، پان، نسوار، سگریٹ کے داغ ختم

صرف ایک بار کے استعمال سے بھی آپ واضح فرق محسوس ہوگا۔ ایک دن چھوڑ کر ایک دن ضرور استعمال کریں

دانت اور حفاظتی تہہ:

دانتوں پر ایک قدرتی سخت، مضبوط اور چمکدار حفاظتی تہہ Hard Enamel ہوتی ہے جو خوراک کے چبانے پر رگڑ سے دانتوں کو خراب ہونے سے بچاتی ہے جب ہم کھانا کھاتے ہیں تو کھانے کے کچھ ذرات داڑھ دانتوں کے خلاء میں پھنس جاتے ہیں اور پھر ان کے گلنے سڑنے سے نہ صرف منہ میں بدبو ہوتی ہے بلکہ اس عمل میں حفاظتی تہہ بھی متاثر ہوتی ہے جس سے حفاظتی تہہ بھی گل جاتی ہے اور پھر اس جگہ پر ایک نہایت چھوٹا سا خلا بن جاتا ہے اس طرح اس خلاء میں مختلف اقسام کے بکٹریا اور وائرس پرورش پانے لگتے ہیں جن کو عام زبان میں کیڑا لگنا بھی کہتے ہیں۔ پھر یہ خلا بڑا اور گہرا ہونا شروع ہوجاتا ہے حتیٰ کے دانتوں کی جڑوں یعنی مسوڑھوں تک پہنچ جاتا ہے۔ جس سے مسوڑھے بھی گلنا سڑنا شروع ہوجاتے ہیں۔ جس سے مسوڑھوں سے خون اور پیپ آنا اور درد شروع ہوجاتا ہے۔ اور پھر یہ پیپ یا خون اگر معدے میں پہنچ جائے تو وہاں پر بھی یہ مختلف پیچیدہ اور خطرناک امراض کا سبب بن جاتا ہے۔ مسوڑھے، جبڑے اور ڈائجسٹ کی حیات بھی متاثر ہوتی ہے۔ اسی لیے دانتوں کے امراض کو مرضوں کی ماں ام الامراض بھی کہتے ہیں۔ جب مسوڑھے متاثر ہوجائیں تو پھر مسوڑھوں سے خون یا پیپ کے ساتھ ساتھ منہ سے بدبو آنا شروع ہوجاتی ہے۔ اور ٹھنڈا یا گرم شدت سے محسوس ہوتا ہے۔ اسی طرح کھٹا میٹھا بھی شدت سے محسوس ہوتا ہے اور دانتوں میں درد شروع ہوجاتا ہے۔ جس کا ازالہ تو بعض بلکہ اکثر اوقات داڑھ دانت نکلوانا ہوتا ہے۔ جس سے چہرے کے خدوخال میں بھی فرق آتا ہے اور انسان وقت سے پہلے بوڑھا دکھائی دینے لگتا ہے۔ دانتوں کے امراض ام الامراض سے بچنے کیلئے انتہائی ضروری ہے کہ ان کی بہترین حفاظت کی جائے۔ لہٰذا جب بھی کھانا کھائیں تو بعد میں خلال کرکے دانتوں کے بیچ والے خلا کو اچھی طرح صاف ضرور کریں کی ان میں کوئی ذرہ پھنسا رہ نہ جائے۔ دانتوں کی بہترین صفائی ہی دانتوں کی بہترین حفاظت ہے۔ اگر کھانا نہ بھی کھایا جائے تو بھی منہ میں تیار ہونے والا لعاب دہن سے بھی ایسے مادے دانتوں کے درمیان میں جمع ہوتے رہتے ہیں جو دانتوں اور مسوڑھوں کو خراب کرسکتے ہیں اور منہ سے بدبو آنے کا سبب بنتے ہیں۔

الارم:

منہ سے بدبو آنا دراصل ایک الارم ہے کہ اپنے دانت، منہ اور مسوڑھے صاف کرلیں، خلال کریں یا برش، منہ کی صفائی یعنی Mouth Wash بھی ضروری ہے۔

صحت اور زندگی:

سانس اور نبض اپنی رفتار، جبکہ قد اور وزن عمر کے ساتھ خوراک پر انحصار کرتے ہیں ان کا قریبت معیار (Level of Suger & Blood Pressure) وغیرہ ہی معیار صحت ہے اور معیاری صحت ہی معیاری زندگی ہے۔

خوراک کی اہمیت:

طلب مقدار معدہ کا تیسرا حصہ معیاری خوراک سانس اور نبض کا چلانے کے ساتھ ساتھ معمولی عبادات کی ادائیگی قد اور وزن کی بہتری کیلئے درکار توانائی پیدا کرنے کیلئے کافی ہے اور اگر معدے کے تین کا دوسرا حصہ بھی بھریں تو روزمرہ کے کام کاج محنت مشقت کیلئے کافی ہے۔ اس سے آگے یعنی تینوں حصے بھریں تو موٹاپا، بلڈ پریشر، شوگر، جوڑوں کا درد وغیرہ بلکہ ان کے بگڑنے کیلئے ہر وقت تیار ہیں۔ غرض ہم جو بھی کھاتے ہیں وہ ہماری زندگی یعنی سانس اور نبض چلانے اور معمولی عبادات کی ادائیگی روزمرہ کے کام کاج محنت، مزدوری اور مشقت کیلئے ضروری توانائی مہیا کرنے پر خرچ ہوتا ہے۔ فاضل خوراک بصورت فضلا خارج ہوجاتی ہے اگر اس پر بھی غور کریں تو صاف نظر آتا ہے کہ ہم کتنی خوراک زائد خوراکی کرکے فضلا کی شکل میں خارج کرتے ہیں۔ یاد رہے جو خارج ہوتی ہے وہ ضرور کچھ نہ کچھ کرکے خارج ہوتی ہے۔ یعنی توانائی ساتھ میں کچھ امراض بھی دیئے ہوں گے۔ غرض جو جتنا زیادہ فضلا اخراج کرتا ہے۔ اس کو اتنے ہی زیادہ امراض کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

دانت اور خوبصورتی:

دانت اور مسوڑھوں کی صحت انسانی صورت اور صحت پر کتنی اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ اس طرح سے بخوبی لگ سکتا ہے کہ دانت نکلنے سے قبل تقریباً بھی بچوں کی شکل ایک جیسی ہوتی ہے۔ دانتوں سے انسانی صورت، صحت، سیرت اور شخصیت میں نمایاں فرق آتا ہے۔ مسوڑھے اور دانت صحت مند نہ ہوں تو خوبصورتی اور شخصیت بھی متاثر ہوتی ہے کہ انسان مکمل کرانپا مقصد، مدعا بیان نہیں کرپاتا۔ اور نہ ہی مقام خوشی پ مکمل کر خوشی کا اظہار کرسکتا۔ بلکہ دانتوں کی تکلیف اور بدبو کی وجہ سے شرما کر رہ جاتا ہے۔ جس سے اس کی شخصیت لحاظ سماجی اور سیاسی ترقی پیچھے رہ جاتی ہے۔

اثرات مسائل دندان:

دانتوں کے مسائل میں جتنا فرق آواز اور چہرے کے مناسب اتار چڑھاؤ سے دوسروں کو متاثر اور مطمئن نہیں کر پاتا۔ بالفاظ دیگر افہام، تفہیم کے سنہرے طریقوں سے واقف نہیں ہو پاتا اور اپنے خود ساختہ طریقہ کار پر الگ تھلگ زندگی گزارنے لگتا ہے۔ نیز دانتوں کے مسائل کے اثرات چہرے کے خدوخال پر بھی پڑتے ہیں۔ چہرے پر معمولی فرق سے ایک صورت دوسری سے جدا ہوتی ہے۔ کوئی بہت خوبصورت تو کوئی عام صورت۔ یاد رہے جسم کا فرق چھپ سکتا ہے مگر چہرے کا نہیں اور دانتوں کا تو کھلکھلاہٹ کی اوٹ سے بھی آواز کی لہروں سے باہر ہوجاتی ہے۔

دانت اور شخصیت:

اگر منہ، مسوڑھوں اور دانتوں کی صحت اچھی ہو تو آواز بھی ہر دلعزیز لہروں کے ساتھ نکلتی ہے۔ صحت مند منہ، مسوڑھوں اور دانتوں والے اسی وجہ سے بڑے اعتماد اور اطمینان سے بات کرتے ہیں۔ لوگ ان کی باتوں کو توجہ سے سنتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فلاں جب بات کرتا ہے تو اس کے منہ سے موتی سے جھڑتے ہیں۔ اسی وجہ سے صحت مند منہ، مسوڑھوں اور دانتوں والے افراد کامیاب اور کامران زندگی گزارتے ہیں۔

ذاتی تجربہ:

خود دانتوں کے مسائل رکھتے اور لوگوں کو ہنستا دیکھا تو سوچتے ہوئی کہ اس کا کوئی سدِباب ہونا چاہئے۔ غرض مختلف برانڈ آزمائیم کرکے فائنلی بالآخر خود تحقیق شروع کی اور مندرجہ بالا تمام باتوں اور وہ بھی جو غیر مطبوعہ تحریر نہ ہوسکیں کو مدنظر رکھ کر عمل تحقیق آگے بڑھا تو قدرت نے انعام کیا اور ایسا پیسٹ بنانے میں کامیاب ہوگئے جو کہ مندرجہ بالا تمام مسائل کا حل ثابت ہوا اس کا نام تجویز ہوا ہار موٹا نک ٹوتھ پیسٹ۔

طریقہ استعمال ہار موٹا نک ٹوتھ پیسٹ:

عام ٹوتھ پیسٹ سے کافی کم یعنی اگر صبح شام کرنا ہو تو گندم کے آدھے دانے کے برابر اور اگر ایک بار روزانہ کرنا ہو تو گندم کے ایک دانے کے برابر روزانہ ہار موٹا نک ٹوتھ پیسٹ برش پر لگا کر داڑھ، دانتوں، باہر اور اوپر یعنی تینوں اطراف میں لگا کر تین یا پانچ منٹ بعد دانتوں میں اندر، باہر اور اوپر تینوں اطراف میں اچھی طرح برش کریں اور ساتھ ہی گالوں کے اندر زبان کے نیچے اوپر اور تالو بھی برش کرنے کے بعد اچھی طرح کلیاں کرلیں۔ ہار موٹا نک ٹوتھ پیسٹ کم از کم ہفتے میں دو بار یا ایک دن چھوڑ کر ایک دن ضرور لگائیں۔

ہار موٹا نک ٹوتھ پیسٹ کے فوائد:

ہار موٹا نک ٹوتھ پیسٹ کے استعمال سے دانت، داڑھ اور مسوڑھوں سے پیپ، خون اور بدبو آنا ختم، درد، ٹھنڈا، گرم، کھٹا میٹھا لگنا بند، سگریٹ، پان اور نسوار کے داغ اور بدبو ختم، زبان کے ذائقے بحال۔ ہار موٹا نک ٹوتھ پیسٹ منہ، مسوڑھوں اور دانتوں کے صفائی کے ساتھ ساتھ Mouth Wash بھی کرتا ہے۔ جو کہ آپ کو باقاعدہ محسوس بھی ہوگا یعنی آپ رہیں گے سارا دن تر و تازہ اور خوش وخرم جیسے ابھی ابھی برش کیا ہو۔ دانتوں کی بہترین صفائی تو ہار موٹا نک ٹوتھ پیسٹ ہی کرتا ہے۔

تیار کردہ: اے۔ کے۔ کاسکوپانڈ، مینگورہ (سوات)

042-37666818
0300-9486848

نوٹ: ہار موٹا نک ٹوتھ پیسٹ حقوق (پیکنگ، ڈیزائن، بروشر، مونوگرام، کیلی گرافی، ٹریڈ مارک وغیرہ بحق رفیق شاکر محفوظ ہیں 0946-723586

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ طواویس کا قلعہ فتح کرنے کے بعد جب آگے بڑھنے کا مرحلہ آیا تو معاذ نے حرشی سے اختلاف کیا۔

''زیادہ تیزی اور عجلت ہمیں نقصان پہنچا سکتی ہے۔ ہمیں ایک فتح کے بعد دوسری فتح کے درمیان وقفہ رکھنا چاہیے۔''

''میں آپ کی رائے سے اتفاق نہیں رکھتا۔'' حرشی نے کہا ''ہمیں تیزی سے آگے بڑھنا چاہیے۔ مسلسل فتوحات ہی سے دشمن کا حوصلہ پست ہوگا۔ عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ سنبھلے بغیر دشمن کے سر پر پہنچ جانا چاہیے۔ ہم نے سستی دکھائی تو دشمن کو سوچنے کا موقع مل جائے گا۔''

''اب تم مجھے عقل سکھاؤ گے۔ میں نے جو فیصلہ کیا ہے وہی ہوگا۔ ہم ابھی آگے نہیں بڑھیں گے۔''

''بے شک! مجھ سے زیادہ آپ میں عقل ہوگی لیکن یہاں آپ سے بھول ہو رہی ہے؟''

''امیر میں ہوں، تم نہیں ہو۔ تم میری اطاعت کرو اور اپنے فیصلے اپنے پاس رکھو۔''

''آپ ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ شاید میری رائے سے آپ کو اتفاق ہو جائے۔''

''میں ایک مرتبہ فیصلہ کرنے کے بعد غور کرنے کا عادی نہیں ہوں۔''

اس کے بعد تو بات ہی ختم ہو جاتی تھی لیکن حرشی اس کی رائے ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے خفیہ طور پر ایک خط خلیفہ مہدی کے نام روانہ کیا جس میں اس نے اپنی اور معاذ کی رائے بیان کرنے کے بعد فیصلہ خلیفہ پر چھوڑ دیا تھا کہ وہ جو بھی فیصلہ کرے۔

رائے بیان کرنے کے بعد اس نے یہ بھی لکھ دیا تھا۔

''اگر آپ معاذ کی رائے سے اتفاق رکھتے ہیں تو مجھے واپس بلا لیں کیونکہ میں نے جو فیصلہ کر لیا ہے، اس پر اٹل ہوں۔ تمام معاملات میرے ہاتھ میں دے دیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ بہت جلد اس فتنے پر قابو پا لوں گا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو مفاد اسلامی کو بہت نقصان پہنچے گا۔''

خلیفہ کی جانب سے مثبت جواب ملا۔ اس نے حرشی کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے تمام اختیارات اس کے ہاتھ میں دے دیے تھے اور معاذ کو حکم دیا تھا کہ سعید حرشی جو کچھ کرنا چاہتا ہے اسے کرنے دیا جائے۔ معاذ کے لیے یہ سخت بے عزتی کی بات تھی لیکن خلیفہ کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

اب سعید حرشی کے ارادوں میں بجلی کی سی تیزی آ گئی تھی۔ وہ سرعت سے آگے بڑھا اور آرام کیے بغیر دشمن کو ہر محاذ پر شکست دیتا چلا گیا۔

ابن مقنع کے آدمی بھاگ بھاگ کر قلعہ صیام میں پناہ لے رہے تھے۔ ابن مقنع اس صورت حال سے گھبرا گیا۔ ایک تو اسے یہ فکر تھی کہ یہ سب بھاگ بھاگ کر یہاں آ رہے ہیں، عساکر اسلامی بھی ان کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک پہنچیں گے۔ دوسرے اس کی خدائی پر حرف آ رہا تھا۔ اس کے آدمی اب چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ وہ کیسا خدا ہے؟ اس کے ہوتے ہوئے مسلمان ہم پر غالب آتے جا رہے ہیں۔ وہ اپنے آدمیوں کو اب بھی تسلی دے رہا تھا کہ یہ تمہارا امتحان ہے۔ اس میں پورے اتر جاؤ تو فتوحات تمہارا راستہ دیکھ رہی ہیں۔ یاد رکھو، میں نے ان کے دل میں ایسی ہیبت ڈال دی ہے کہ وہ یہاں تک پہنچ ہی نہیں سکیں گے۔''

سعید حرشی واقعی مصیبت میں گھرا ہوا تھا۔ وہ راستے کے قلعوں کو فتح کرتا ہوا قلعہ صیام تک پہنچ گیا تھا لیکن اب اسے گہری اور چوڑی خندقوں کا سامنا تھا جنہیں عبور کیے بغیر قلعے تک پہنچنا ممکن ہی نہیں تھا۔ جب بھی کوئی قریب جاتا، فصیلوں سے تیروں کی بوچھاڑ ہونے لگتی۔ وہ کھلے میدان میں تھے اور آسمان پر چمکتے ہوئے دو چاند انہیں خوف زدہ کرنے کے لیے بہت تھے۔ انہیں قلعے تک پہنچنے میں جس دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا، وہ اسے بھی جادو کا اثر سمجھ رہے تھے۔ کئی مہینے ہو گئے تھے اور وہ ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ پائے تھے۔ ان کے نزدیک یہ جادو کا اثر ہی تو تھا۔ رات کے وقت جب اسلامی فوج کے سپاہی ایک جگہ جمع ہوتے تو ابن مقنع اور اس کے جادو کا ذکر نکل آتا۔ لشکر میں طرح طرح کی افواہیں گردش کرنے لگی تھیں۔ سعید حرشی نے جب یہ حال دیکھا تو بڑی بڑی سیڑھیاں بنانے کا حکم دیا جنہیں خندقوں پر رکھ کر قلعے کے سامنے پہنچا جا سکے، کئی مہینوں کی محنت کے بعد ایسی کئی سیڑھیاں تیار ہو گئیں لیکن یہ عجیب بات ہوئی کہ سیڑھیاں چھوٹی پڑ گئیں۔ یہ تجربہ ناکام ہو گیا۔ اسلامی عساکر نے اسے بھی جادو کا نتیجہ قرار دیا اور اب تو بے دلی انتہا کو پہنچ گئی۔ اوپر سے بارش ہو گئی اور خندقیں پانی سے بھر گئیں۔

قلعے کے اندر ابن مقنع کی خدائی کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ وہی لوگ جو ابن مقنع کی طرف سے شکوک و شبہات میں مبتلا ہو گئے تھے، وہ اب توبہ کرتے پھر رہے تھے۔ رب کائنات! ہم تجھ سے توبہ کے طالب ہیں۔ ہم نے تجھ پر شک کیا۔ تو نے ٹھیک کہا تھا، مسلمان ذلیل و خوار ہوں گے۔ وہ بھی

قلعے کے اندر داخل نہیں ہو سکیں گے۔ تو نے ان کی ہر تدبیر کو ناکام کر دیا۔ انہوں نے سیڑھیاں بنائیں۔ وہ بھی چھوٹی پڑ گئیں۔ اب تو نے آسمان سے بارش کرا دی۔ تو عظیم قدرت والا ہے۔

ابن مقنع اپنے مخصوص ٹھکانے پر بیٹھا تھا۔ مصنوعی چاند کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ سنہرے نقاب سے اٹھنے والی شعاعیں نظروں کو خیرہ کر رہی تھیں۔ اس کے پیروکار سجدے میں پڑے اس سے معافی کے خواستگار تھے۔ ابن مقنع کی آواز گونجی۔

''سجدے سے سر اٹھاؤ، میں نے تمہاری خطائیں بخش دیں۔ آج کی رات جشن مناؤ۔ کسی پر کوئی پابندی نہیں۔ میں عنقریب مسلمانوں پر بیماریاں اور وبائیں بھیجوں گا۔ ان کے بہت سے لوگ لقمۂ اجل ہو جائیں گے۔ میں انہیں محاصرہ اٹھانے پر مجبور کر دوں گا۔''

اس رات شیطان نے قلعے کے ہر کونے میں رقص کیا۔

ابن مقنع نے اندازہ لگا لیا تھا کہ بارش کے بعد بیماریاں ضرور پھیلیں گی۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ جیسے ہی بارش ختم ہوئی خندقوں اور گھاٹیوں میں جمع ہونے والا پانی سڑنے لگا۔ اسلامی لشکر میں بیماریاں پھیلنے لگیں۔ پیٹ کی خرابی اور بخار کی بیماری عام تھی۔ ان بیماریوں کے سبب کئی ہلاکتیں ہو گئیں۔

ابن مقنع کے آدمی فصیلوں سے اس منظر کا مشاہدہ کر رہے تھے اور پل پل کی خبریں ابن مقنع کو پہنچا رہے تھے۔

اسلامی لشکر کی بے دلی عروج کو پہنچ رہی تھی۔ اب وہ کھل کر کہنے لگے تھے کہ ابن مقنع کا جادو عمل میں آ چکا ہے۔ یہ بیماریاں اسی کی بھیجی ہوئی ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی ہلاک ہونے سے نہیں بچے گا۔

فوج کے کئی اعلیٰ عہدے دار حرشی کی خدمت میں پہنچے اور یہ ماجرا بیان کیا۔

''ہم ابن مقنع کی خدائی کے قائل نہیں لیکن وہ عجیب پُراسرار شخص ثابت ہو رہا ہے۔ وہ ہماری کسی تدبیر کو کارگر نہیں ہونے دے رہا ہے۔ اب بیماریاں پھیل رہی ہیں۔ سیکڑوں جانور اور سپاہی ہلاک ہو چکے ہیں۔ ہماری رائے یہ ہے کہ ہمیں محاصرہ اٹھا لینا چاہیے۔''

''تم مجھے بزدلی کا سبق پڑھانے آئے ہو؟'' سعید حرشی ان پر برس پڑا ''تم چاہتے ہو میں محاصرہ اٹھا کر چلا جاؤں، خدا کے باغی کا قلع قمع نہ کروں، محاصرہ ہر حال میں جاری رہے گا۔''

خواجہ حسن نظامی

حال ہی میں خواجہ حسن نظامی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک خودنوشت واقعہ نظر سے گزرا جس کا تعلق تسخیر ہمزاد سے ہے۔ افسوس کہ میں نے اس تحریر کو محفوظ نہیں رکھا۔ واقعے کی جزئیات تو یاد نہیں البتہ عمومی تاثر یاد ہے۔ کہتے ہیں کہ ہم نے ایک کوٹھری میں حصار کھینچ کر عمل تسخیر ہمزاد شروع کیا۔ دوسرے یا تیسرے روز کوٹھری کے روشندان میں ایک ننھا منا انسانی وجود نظر آیا۔ وہ چھلانگ لگا کر کوٹھری کے فرش پر اتر آیا۔ پھر اسی طرح کی ایک دوسری مخلوق آن کودی۔ وہ دونوں آپس میں گفتگو کرنے لگے۔ کہا، کیا ہی اچھا ہو کہ پوریاں پکائی جائیں۔ اچھا تو پھر پوریوں کا سامان لے آئیں۔ پھر وہ دونوں اچھلے اور فضا میں بلند ہو کر روشن دان کے راستے باہر نکل گئے۔ کچھ دیر بعد پھر اسی روشن دان کے ذریعے اندر داخل ہوئے۔ اس مرتبہ وہ پوریاں تلنے والی کڑھائی لے کر آئے تھے۔ کڑھائی چڑھا دی۔ اس میں خود بخود تیل نمودار ہو گیا۔ پھونک ماری تو آگ کے شعلے بھڑکنے لگے، تیل ابلنے لگا۔ ابلتے ہوئے تیل میں زندہ چوہا نظر آیا۔ ایک ہمزاد نے دوسرے ہمزاد سے کہا کہ بہتر یہ ہے کہ اس شخص (خواجہ حسن نظامی) کا سر کاٹ کر تیل میں پکایا جائے۔ خواجہ حسن نظامی کی یہ تحریر سیارہ ڈائجسٹ خاص نمبر میں شائع ہوئی تھی۔

''گستاخی معاف۔ اس محاصرے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہم برسوں تک یہاں پڑے رہیں گے، خندقیں عبور نہیں ہوں گی۔ لشکر میں بغاوت پھیلنے کا اندیشہ ہے۔''

''تم ابن مقنع سے خوف زدہ ہو اور خدا پر بھروسا نہیں۔ وہ ضرور کوئی نہ کوئی راہ نکالے گا۔''

اس کے افسران مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد سعید حرشی نے سنجیدگی سے سوچا۔ اس نے اپنی فوج کو خندقوں سے دور چلے جانے کا حکم دیا تاکہ گندے پانی سے پیدا ہونے والی بیماریوں سے نجات مل جائے لیکن محاصرہ نہیں اٹھایا، قلعے والوں نے دور سے دیکھا کہ فوجیں پیچھے ہٹ رہی ہیں تو خوشی سے بے حال ہو گئے۔ فوراً ابن مقنع کے پاس پہنچے اور حالات سے آگاہ کیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ابن مقفع کی شیطانی آواز ابھری ''تمہارا خدا کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ میری بھیجی ہوئی بیماریوں نے مسلمانوں کو ہلاکت میں مبتلا کردیا ہے۔ دیکھ لینا محاصرہ اٹھا کر چلے جائیں گے۔''

''محاصرہ تو جاری ہے۔''

''شیطان مردود ان کے ساتھ مل گیا ہے۔ وہ انہیں ورغلا رہا ہے لیکن ایک دن وہ مجبور ہوجائیں گے۔''

سعید حرشی مسلسل اس فکر میں تھا کہ کسی طرح خندقیں عبور کی جاسکیں لیکن کوئی ترکیب ذہن میں نہیں آتی تھی۔ کوئی اور معمولی درجے کا سپہ سالار ہوتا تو ان حالات سے مایوس ہوکر واپس چلا جاتا لیکن اس کا پختہ عزم اسے ایسا کرنے سے روک رہا تھا۔ چھ مہینے اسے مایوس کرنے کے لیے بہت تھے لیکن وہ اب بھی پُرامید تھا۔ اس کی یہ بھی خوش قسمتی تھی کہ معاذ بن مسلم اس کا پوری طرح ساتھ دے رہا تھا۔ اسے حرشی کی حکمتِ عملی کا فائدہ اب نظر آرہا تھا۔ راستے کے تمام قلعے ابن مقنع کی فوجوں سے خالی ہوچکے تھے اس لیے رسد پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آرہی تھی البتہ اسے یہ تعجب ہورہا تھا کہ کوشش کے باوجود قلعہ صیام کیوں فتح نہیں ہورہا ہے۔ ابن مقنع اب اس کے لیے بھی ایک پُراسرار شخصیت بن چکا تھا جس نے وسائل کے بغیر اتنے مضبوط قلعے تعمیر کرلیے تھے اور قلعے میں اتنا اناج بھر لیا تھا کہ سال بھر سے بیٹھا کھا رہا تھا۔ اگر حرشی کا عزم قابلِ تعریف تھا تو ابن مقنع کی چالاکیاں بھی قابلِ داد تھیں۔

سعید حرشی کی عجلت پسندی اس بات پر تیار نہیں تھی کہ قلعہ صیام میں غذائی قلت کا انتظار کرے اور انتظار کرے کہ قلعہ والے ہاتھ اٹھا کر خود باہر نکل آئیں۔ اس نے معاذ سے مشورہ کیا اور یہ تجویز پیش کی کہ خندق کو بڑے بڑے پتھروں سے پاٹ دیا جائے۔

''تجویز تو اچھی ہے لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں۔ اتنی گہری خندق کو پاٹنا مذاق نہیں۔''

''فوجیں میدان میں پڑے پڑے سست ہوگئی ہیں۔ بے کار خیالات انہیں پریشان کرتے رہتے ہیں۔ یہ شغل ان کے ہاتھ آئے گا تو وقت بھی کٹے گا اور کبھی نہ کبھی خندق، پتھروں سے بھر بھی جائے گی۔''

اس کا حکم جاری ہونے کی دیر تھی کہ فوج اس کام پر لگ گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے خلیفہ مہدی کو لکھا کہ جانوروں کی کھالوں میں ریت بھر کے اس کے پاس بھیجی جائے۔

چھکڑوں اور گاڑیوں میں اناج کے ساتھ ریت سے بھری کھالیں بھی اس کے پاس پہنچنے لگیں۔

ابن مقنع کے سپاہی فصیلوں سے دیکھ رہے تھے اور یہ سوچ کر ان پر کپکپی طاری ہورہی تھی کہ اگر خندق کو پاٹ دیا گیا تو مسلمانوں کو قلعے تک پہنچنے اور دیواریں منہدم کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔ وہ دوڑتے ہوئے ابن مقنع کے پاس گئے۔

''خداوند! مسلمان تو ہمارے سروں پر آگئے ہیں۔''

''یہ ممکن ہی نہیں۔ میں لوحِ محفوظ پر ان کی تباہی دیکھ رہا ہوں۔''

''وہ خندقوں میں بڑے بڑے ریت کے بورے پھینک رہے ہیں۔ اب نہیں تو کبھی نہ کبھی وہ خندق عبور کرلیں گے۔''

''تم نے فصیلوں سے ان پر تیر کیوں نہیں برسائے۔''

''اب تو ہمارے پاس تیر بھی کم رہ گئے ہیں۔ ہوا مخالف چل رہی ہے۔ ہمارے تیر ان تک پہنچنے سے پہلے گر جاتے ہیں۔ ان کا لشکر ہم سے بہت دور ہے۔ ہم پتھر لڑھکائیں تو وہ بھی ان تک نہیں پہنچ سکتے۔''

''انتظار کرو، وہ خود ہی ہلاک ہوجائیں گے۔''

''خداوندا! آپ اپنے فرشتوں کو کیوں طلب نہیں کرتے۔ وہ آئیں اور ہماری مدد کریں۔''

''بے وقوفو! فرشتے عبادت کے لیے بنائے گئے ہیں، جنگ کے لیے نہیں۔ جنگ تو تمہیں خود کرنی ہوگی۔''

''ہمارے پاس تیس ہزار سے زیادہ سپاہ نہیں جبکہ مسلمان لاکھوں میں ہیں۔''

''تمہارا خداوند تمہارے ساتھ ہے۔''

''ہمیں کب تک انتظار کرنا ہوگا؟''

''میں نے کہہ دیا، مسلمان خود ہلاک ہوجائیں گے۔ انتظار نہیں کرسکتے تو باہر نکل کر جنگ کرو۔ میں تم میں فرشتوں جیسی طاقت ودیعت کردوں گا۔''

''میں اپنی فوج کو کیسے ہلاکت میں ڈال دوں؟'' فوج کے کماندار نے کہا۔

''کیا میں نے تمہارے لیے آسمان پر چاند نہیں نکالا؟''

''یہ چاند ہمیں روشنی دے سکتا ہے زندگی نہیں۔''

''تجھے اپنے خدا پر یقین نہیں رہا۔ تجھے شیطان نے اپنے قابو میں کرلیا ہے اور جلد ہی تجھے ہلاک کردے گا۔''

ابن مقنع کی آواز سے شعلے بلند ہورہے تھے۔

یہ معلوم ہوتا تھا جیسے نقاب کے پیچھے آگ جل رہی ہو۔ سب کے سب سہم کر رہ گئے۔ کسی کو کچھ کہنے کی جرأت نہیں تھی۔

ابن مقنع کی آواز میں ایسی ہلاکت خیز سنسنی تھی کہ اس رات ہر زبان پر تالے پڑے ہوئے تھے۔ فصیلوں پر بیٹھے سپاہی خاموش تھے۔ کبھی کبھی اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے مسلمانوں کی طرف کوئی تیر چلا دیتے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہے۔

ایک انجانے خوف نے اس وقت حقیقت کا روپ دھار لیا جب چند سپاہی کماندار کے گنبد نما کمرے میں گئے۔ اس کی لاش زمین پر پڑی تھی اور پھول کر کسی مشکیزے کی طرح ہوگئی تھی۔ جگہ جگہ سے گوشت پھٹ گیا تھا۔ ایک نظر میں یہی سمجھا گیا کہ اس پر ابن مقنع کا قہر نازل ہوا ہے لیکن کچھ لوگ یہ بھی باتیں کررہے تھے کہ اسے زہر دے کر ہلاک کیا گیا ہے۔

یہ کماندار اس قبیلے سے تعلق رکھتا تھا جو نخشب کے قریب رہتا تھا۔ یہ لوگ نہایت جنگجو اور بہادر تھے، انہوں نے کماندار کو مرے ہوئے دیکھا تو شور مچانے لگے۔ بغاوت کے آثار پیدا ہوگئے لیکن کچھ سمجھ دار لوگوں نے انہیں خاموش رہنے کی ہدایت کی اور یہ طے ہوا کہ ٹھنڈے دل سے ایک جگہ بیٹھ کر سوچا جائے کہ اب ہمیں کیا قدم اٹھانا ہے۔ اس کے لیے رات کا وقت منتخب کیا گیا۔

چند سردار قلعے میں بنی دوزخ کے قریب جا کر بیٹھ گئے۔ یہ مقام اس لیے منتخب کیا گیا تھا کہ اس طرف کوئی آتا جاتا نہیں تھا۔ ابن مقنع کے جاسوس بھی اس طرف آتے ہوئے ڈرتے تھے۔

ابھی ان لوگوں کو آئے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی اور چند ہی باتیں ہوئی تھیں کہ اندھیرے میں کوئی آتا ہوا نظر آیا۔

''شاید خداوند کو ہماری موجودگی کا علم ہوگیا۔''

''وہ واقعی خدا ہے ورنہ اسے کیسے معلوم ہوتا۔''

''اب ہمیں بھی اس کے عتاب سے کوئی نہیں بچا سکتا۔''

وہ سایہ قریب آیا تو معلوم ہوا کہ وہ کوئی عورت ہے۔ وہ اتنی خوبصورت تھی کہ اندھیرے میں اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔

''میں تمہارے خداوند کی بیویوں میں سے ایک ہوں۔ میں نیشاپور کی رہنے والی ہوں۔ میں قافلے کے ساتھ سفر کررہی تھی کہ اس ظالم کے آدمیوں نے مجھے گرفتار کرلیا۔ اس وقت سے اب تک میں اس کی قید میں ہوں۔ اس نے مجھے بیوی بنا کر رکھا ہوا ہے۔ اب تک میں اس لیے خاموش تھی کہ دوسروں کی طرح میں بھی اسے خدا سمجھنے لگی تھی۔ کل رات جب وہ میرے ساتھ خلوت میں تھا اور نشے میں بدمست ہورہا تھا۔ ظاہر ہونے والی بات تھی کہ اس نے نقاب اتار دیا۔ اف میرے خدا! میں نے ایسا بھیانک اور مکروہ چہرہ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اسی وقت مجھے یقین ہوگیا کہ وہ خدا نہیں ہوسکتا۔ وہ تو کہتا تھا، میں نقاب اس لیے نہیں اتارتا کہ لوگ میرے چہرے سے پھوٹنے والی روشنی کی تاب نہیں لاسکتے لیکن میں نے جو چہرہ دیکھا وہ اس کے بیان سے مختلف تھا۔ اس نے گھبرا کر نقاب چہرے پر ڈال لیا تھا لیکن میں دیکھ چکی ہوں۔ وہ شیطان ہے خدا نہیں۔ وہ تم سب کو بے وقوف بنا رہا ہے۔ اس کے پاس کوئی غیبی طاقت نہیں۔ وہ اب یہ بھی منصوبہ بنا رہا ہے کہ تم سب کو چھوڑ کر بھاگ جائے۔''

اس انکشاف کے بعد باتوں کا رخ ہی بدل گیا۔ اب یہ باتیں ہورہی تھیں کہ اس شیطان سے نجات کیسے حاصل کی جائے۔ کسی نے رائے دی کہ اسے قتل کردیا جائے لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ اس کے جان نثار ہر وقت اس کے ساتھ رہتے ہیں۔ پھر یہ طے ہوا کہ اس کی بیویوں میں سے کوئی اسے قتل کردے لیکن اس کی بیوی نے جو انکشاف کیا اس کے بعد یہ بھی ممکن نہیں تھا۔

''اس کے نزدیک شرم بے شرمی، جائز و ناجائز کوئی چیز نہیں۔ وہ جب اپنی بیویوں کے ساتھ خلوت میں ہوتا ہے، اس وقت بھی دو گرانڈیل جوان مسلح حالت میں موجود ہوتے ہیں۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ یہ جوان اس کے حکم پر دیکھتے ہیں اس کے حکم پر نابینا ہوجاتے ہیں۔ یہ تو مجھے اب معلوم ہوا کہ یہ محض فریب تھا۔ وہ دیکھتے بھی تھے، سنتے بھی تھے۔'' یہ کہہ کر وہ عورت اپنی بے عزتی پر رونے لگی۔

یہ تجویز بھی پیش ہوئی کہ اس پر حملہ کردیا جائے لیکن اس میں یہ قباحت تھی کہ ایسے لوگ بھی تھے جو اسے اب بھی خدا سمجھ رہے تھے۔ وہ اس کے دفاع میں اٹھ کھڑے ہوتے۔ ایک کو مارنے کے لیے بہت سوں کا خون خرابہ ہوتا اور ممکن تھا کہ وہ پھر بھی بچ نکلتا۔ یہ تجویز بھی مسترد ہوگئی۔ آخر یہ طے ہوا کہ کچھ دن خاموشی سے دیکھا جائے۔ اگر مسلمان غالب آتے ہیں تو ہم سپاہ کو لے کر باہر نکل جائیں گے اور قلعہ خالی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کردیں گے۔ اپنے آپ کو مسلمانوں کے حوالے کردیں گے۔

دوسرے دن ابن مقنع نے اجلاس طلب کیا اور نیا کماندار مقرر کردیا۔ اتفاق سے یہ انہی میں سے ایک تھا جو رات کو ہونے والے اس اجلاس میں تھا جس میں ہتھیار پھینکنے کی تجویز منظور ہوئی تھی۔ اب کام بہت آسان ہوگیا تھا۔ نیا کماندار موقع کا انتظار کرنے لگا۔

ابن مقنع کے سپاہی فصیلوں سے دیکھ رہے تھے کہ مسلمان خندق کو پاٹنے میں کامیاب ہوگئے ہیں اور اب وہ نہایت احتیاط کے ساتھ خندق عبور کررہے ہیں۔ اب اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ قلعے کی دیواروں کو منہدم کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ اس کوشش میں چند روز اور لگ سکتے ہیں لیکن فتح بہرحال مسلمانوں کی ہوگی۔ کماندار نے اپنے سرداروں سے بات کی کہ وہ مسلمانوں سے امان طلب کرنے کے لیے قلعے سے باہر جارہا ہے۔ اگر امان مل گئی تو قلعے کے دروازے کھول کر سب باہر نکل آتا۔

قلعے کے باہر اللہ اکبر کی آوازیں بلند ہورہی تھیں جو ابن مقنع کے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھیں لیکن اسے اب بھی اپنی تیس ہزار سپاہ کی طرف سے امیدیں تھیں۔ اس کی سو سے زیادہ بیویاں اسے گھیرے بیٹھی تھیں اور اس سے التجا کررہی تھیں کہ وہ مسلمانوں کو نیست و نابود کردے۔

''اس کے لیے مجھے آسمان پر جانا پڑے گا۔ لوٹ کر آؤں گا تو مسلمانوں کا نام و نشان تک مٹ جائے گا۔''

''جلدی جایئے، دیر کیوں کرتے ہیں؟''

''تم سب کو بھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ میں نہیں چاہتا کہ تم میں سے کوئی یہاں رہے۔ خدا ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔ میں یہاں بھی رہوں گا لیکن نقاب کے بغیر۔ تم میں سے کوئی میرے چہرے کی تاب نہیں لاسکے گی۔ اس لیے تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔''

''ہم تیار ہیں۔''

یہ پہلا موقع تھا جب اس نے گرانڈیل نوجوانوں کو جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتے تھے، کمرے سے باہر جانے کا حکم دیا۔ وہ باہر نکل گئے۔ ایک محلول انہیں دیا کہ تھوڑا تھوڑا سب پی لیں۔ اس کے اثر سے وہ نورانی مخلوق بن جائیں گے جو کسی کو نظر نہیں آئے گی۔ اگر مسلمان اندر آ بھی گئے تو وہ انہیں دیکھ نہیں سکیں گے۔ یہ تقریباً بیس افراد تھے جنہوں نے محلول پی لیا۔ اس کے بعد وہ اندر آیا اور یہی محلول اپنی تمام بیویوں کو بھی پلا دیا۔ وہ سب اسی وقت مرگئیں۔ اس کے بعد وہ باہر آیا۔ اس کے جتنے باڈی گارڈز تھے، وہ سب مرے پڑے تھے۔

کمان دار سعید حرشی سے امان طلب کرکے آچکا تھا اور اب اس کے سپاہی غیر مسلح ہوکر قلعے کے دروازے سے باہر نکل رہے تھے۔

ابن مقنع نے اپنے چہرے سے نقاب اتارا اور مردہ لوگوں میں سے ایک کے چہرے پر چڑھا دیا اور خود باہر نکلنے والوں کے ہجوم میں شامل ہوگیا۔ کچھ لوگوں نے اس کے بدصورت چہرے کو دیکھا ضرور لیکن ابن مقنع مطمئن تھا۔ اس کے چہرے کو آج تک کسی نے نہیں دیکھا تھا مگر وہ بھول گیا تھا کہ ایک عورت ایسی ہے جس نے اس کے اصلی چہرے کو دیکھ لیا ہے اور وہ تھی اس کی ایک بیوی جو نیشاپور کی تھی اور قیدی بنالی گئی تھی۔ وہ ان بیویوں میں شامل نہیں تھی جسے ابن مقنع ہلاک کرچکا تھا۔ وہ امان لینے والوں میں شامل تھی۔ اس کی نظر ابن مقنع پر پڑی اور اس نے شور مچادیا۔ ابن مقنع نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن پکڑا گیا۔ مسلمان فوجی اسے سعید حرشی کے پاس لے جارہے تھے کہ اس نے زہر کھا کر خود کو ہلاک کرلیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا بدن پھولنے لگا۔ اسے سعید حرشی تک پہنچایا گیا تو اس کا گوشت پھٹنے لگا تھا۔ وہ اس قابل نہیں تھا کہ اس کی لاش کو بغداد لے جایا جاتا۔ حرشی نے اس کا سر اس کی گردن سے الگ کرلیا۔ عجیب بات یہ تھی کہ زہر کا اثر اس کے چہرے پر نہیں ہوا تھا۔ بس اتنا ہوا تھا کہ اس کا مکروہ چہرہ اور زیادہ مکروہ ہوگیا۔

حرشی نے امان طلب سپاہیوں کو اجازت دے دی کہ وہ جہاں چاہیں جاسکتے ہیں۔

اسلامی لشکر کی واپسی ہوئی تو ابن مقنع کا سر اس لشکر کے ساتھ تھا۔

ابن مقنع کا بنایا ہوا چاند چند راتوں تک طلوع ہوا۔ یہ چاند نخشب کے ایک کنوئیں میں غروب ہوتا تھا۔ ایک دن رات بھر چمکنے کے بعد چاند نخشب میں غروب ہوا تو کنوئیں کی دیوار سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا۔ ابن مقنع کے ساتھ ہی اس کی یہ نشانی بھی ختم ہوگئی۔

ماخذات: تاریخ ابن خلدون، تاریخ طبری، نبوت کے جھوٹے دعویدار، ضیا تسنیم بلگرامی

پس اگلے سال یہ دنیا تباہ ہونے والی ہے۔ زمین آگ اگلنے والی ہے اور آسمان سے انگارے برسنے والے ہیں۔ سمندر بپھرے گا اور تباہ کن سونامی کی صورت سب کچھ تہ وبالا کرنے کے لیے کئی کئی سو میل دور کے ممالک میں بھی لہریں در آئیں گی۔ یہ پیش گوئیاں ان مردہ تہذیبوں کے ستارہ شناسوں، منجموں نے کی ہیں جن کی تباہی کو بھی کئی کئی ہزار سال ہوچکے ہیں۔ ان مردہ تہذیبوں کے کاہنوں کی پیش گوئیاں کیا صحیح ہیں؟ کیا آئندہ سال واقعی ایسا ہوگا؟

21 دسمبر 2012ء

شیخ جابر

مایا اور دیگر مردہ تہذیبوں کی روح فرسا پیش گوئیوں کا جائزہ

انسانی تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ بہت سی تہذیبیں، بہت سے مذاہب، بہت سے سائنس داں، حکومتیں اور دنیا بھر کے بے شمار عام لوگ کسی ایک دن اور ایک تاریخ پر متفق ہوئے ہوں۔ اور وہ تاریخ بھی کیسی، دنیا کے خاتمے کی تاریخ!

ابتدا میں تو یہ بات بہت عجیب لگی تھی۔ لوگ اسے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے لیکن اب جوں جوں وقت قریب آرہا ہے، یقین کرنے والے بڑھتے چلے جارہے ہیں۔ ہر ذہن میں یہ سوال پیدا ہونے لگا ہے کہ.....

''کیا واقعی دنیا کے خاتمے کا وقت قریب آگیا ہے؟''

''یہ زمین، یہ آسمان، سب کچھ ختم ہوجائے گا؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سورج سے نکلنے والا گولا زمین سے ٹکرا سکتا ہے

زمین کی تباہی کا یہ نظریہ ان چند نظریات میں سے ایک ہے جس کی کوئی سائنسی توجیہہ پیش کی جا سکتی ہے۔ اس نظریے کے مطابق 2012ء میں دسمبر کے مہینے کے آخر میں سورج کی سطح سے ایک بہت بڑا شعلہ یا گیس کا گولا نکل کر زمین کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا اور زمین پر موجود ہر چیز جل کر فنا ہو جائے گی۔ زمین کا ایکو سسٹم ختم ہو جائے گا اور یوں زندگی ناپید ہو جائے گی تاہم ایسے شواہد موجود نہیں کہ آیا ماضی میں یہ سانحہ رونما ہو چکا ہے یا نہیں۔

مایا کلینڈر کے مطابق سورج کی ایک گردش کا دورانیہ 11 برس پر محیط ہے اور ممکن ہے اگرچہ یہ ایک کمزور سی شہادت ہے کہ سورج کی گردش 2012ء دسمبر کے اواخر میں کسی ایسی حالت میں ہو جہاں سے زمین براہِ راست اس کے مہیب شعلوں کی زد میں آ جائے۔ اس قسم کے شواہد موجود ہیں کہ سورج کی سطح سے اٹھنے والے شعلوں کے باعث سیٹلائٹ سسٹم میں خرابیاں رونما ہو جاتی ہیں۔ مواصلاتی نظام میں خلل واقع ہوتا ہے یا مناسب حفاظتی اقدامات کے بغیر کوئی خلانورد زخمی ہو جائے لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ سورج کی سطح سے کسی ایسے طاقتور شعلے کے اٹھنے کا امکان کم از کم 2012ء میں نہیں کہ جو زمین کو راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ تاہم بعض سائنس دانوں کے مطابق مستقبل میں جب سورج کا ایندھن ختم ہو جائے گا تو اس وقت سورج ایک بہت بڑے سرخ رنگ کے ستارے Red giant کی شکل اختیار کر لے گا اور زمین کو اپنے اندر کھینچ لے گا لیکن یہ کام 2012ء کے بجائے اب سے 5 ارب سال بعد رونما ہونے کی توقع ہے۔

طاہر محمود مجاہد- منڈی بہاؤالدین

ہم جانتے اور مانتے ہیں کہ قیامت برحق ہے، ضرور آئے گی لیکن کیا یہ قیامت 21 دسمبر 2012ء کو بپا ہونے والی ہے؟

اگر نہیں، تو آخر ایسا کیوں ہے کہ قدیم مایا تہذیب کے پیروکاروں نے زمین کے خاتمے کی جو پیش گوئی کی ہے، وہ تاریخ 21 دسمبر 2012ء ہے۔

ہوپی انڈینز نے بھی اسی تاریخ میں زمین کی تطہیر کی پیش گوئی کی ہے۔

ناسٹرڈیمس نے زمین سے ایک بڑے شہاب ثاقب کے ٹکرانے کی بات کی ہے۔

ای چنگ بھی تاریخ کے خاتمے کا اعلان کر رہی ہے۔

بائبل کو ڈ قیامت کا ذکر کر رہا ہے۔

سینٹ مالے کی پیش گوئی کے مطابق موجودہ پوپ ہی آخری یا آخری سے پہلے پوپ ہیں۔

آئن اسٹائن نے قطبین کی تبدیلی سے متنبہ کیا ہے۔

ناسا نے بھی کنفرم کیا ہے کہ دسمبر 2012ء کے آس پاس شدید شمسی طوفان آئیں گے۔

دسمبر 2012ء میں زمین اپنا 26000 سالہ Wobble (گردش) مکمل کرے گی۔

فلکیات دان بتاتے ہیں کہ ہمارا سورج اور زمین Milky Way کے Plane سے ہم آہنگ ہو جائے گا۔

اور یہ سب کچھ 21 دسمبر 2012ء کو ہونے والا ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ قیامت جس دن واقع ہو گی، وہ جمعہ کا دن ہو گا اور تاریخ 10 محرم ہو گی۔ کچھ افراد کا تخمینہ ہے کہ عیسوی کلینڈر کے مطابق 21 دسمبر 2012ء کو جمعے کا دن ہے۔

ممکن ہے یہ سب کچھ نہ ہو۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا کبھی انسانی تاریخ میں ایسا ہوا کہ سب کے سب ایک ہی تاریخ پر متفق ہوئے ہوں؟

کیا یہ ایک نئی صبح کا آغاز ہو گا یا ہم خود ہی اپنے خاتمے کے گواہ بننے والے ہیں؟

تو آیئے اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے پرانی تہذیب کی پیش گوئیوں پر نظر ڈالتے ہیں تاکہ ان کی صداقت کو بہ آسانی پرکھا جا سکے۔

مایا تہذیب:

میکسیکو ایک پُراسرار جگہ ہے۔ یہاں دفن سربستہ راز دنیا پر آہستہ آہستہ کھل رہے ہیں۔ یہ تیسری سے دسویں صدی عیسوی میں جنوبی میکسیکو، گوئٹے مالا، ایل سلواڈور سے لے کر بے لائیز اور مغربی ہونڈراس تک کم و بیش ایک ہزار کلومیٹر وسیع و عریض خطے پر ایک عظیم الشان تہذیب نے جنم لیا تھا۔

آتش فشاں پھٹنے والا ہے

آتش فشاں جب پھٹتے ہیں تو اس کے نتائج بہت تباہ کن ہوتے ہیں۔ قیامت یا دنیا کے خاتمے کے متعلق نظریات پیش کرنے والوں کے مطابق بہت جلد کرۂ ارض پر ایک ایسا آتش فشاں پھٹنے والا ہے جس کی نظیر جدید دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ان لوگوں کے خیال میں زمین کے اندر کسی جگہ پر بہت بڑی مقدار میں میگما جمع ہونا شروع ہو جائے گا لیکن اسے باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملے گا۔ زمین کی سطح کے نیچے شدید قسم کا دباؤ پیدا ہو گا جس کے باعث زمین کا ایک بہت بڑا حصہ دھماکے کے ساتھ پھٹ کر تباہ ہو جائے گا۔ کئی ملین ٹن کے حساب سے ملبہ آتش فشانی راکھ اور زہریلی گیس سیکڑوں میل اوپر اٹھ کر ماحول میں شامل ہو جائے گی اور سورج کی روشنی کو زمین تک پہنچنے سے روک دے گی جس کی وجہ سے ''نیوکلیئر سردیاں'' شروع ہو جائیں گی اور ایک نئے برفانی دور کا آغاز ہو جائے گا۔ آتش فشاں پھٹنے سے جو مخلوق زندہ بچ جائے گی اسے برفانی دور نگل جائے گا۔ 2012ء میں قیامت کی پیش گوئی کرنے والوں کے خیال میں جس جگہ آتش فشانی کا یہ عمل وقوع پذیر ہو گا وہ امریکا کے یلوا سٹون نامی علاقے کے نیچے موجود ہے۔

گزشتہ چند برسوں سے اس علاقے کا خلائی سیارے کے ذریعے جائزہ لیا جا رہا ہے اور تصاویر سے اس بات کے شواہد ملے ہیں کہ یلوا سٹون میں زمین کے دس میل نیچے پگھلی ہوئی چٹانوں کی حرکت جاری ہے۔ ماہرین کے خیال میں اس آتش فشانی دھماکے کا امکان 10 میں سے 1 فی صد ہے۔

طاہر مجاہد- منڈی بہاؤالدین

ہم اسی تہذیب کو قدیم مایا تہذیب کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

یہاں ایسے ایسے جوہرِ قابل پیدا ہوئے کہ چشم فلک نے پھر ایسے نابغۂ روزگار نہ دیکھے۔ علم ہندسہ، فلکیات اور تعمیرات پر انہیں ناقابلِ یقین دسترس حاصل تھی۔ انہوں نے اسی دور میں ''صفر'' کا استعمال سیکھ لیا تھا۔ انہوں نے انوکھے اہرام بنائے اور ان سے کلینڈر کا کام لیا (365 سیڑھیوں کا اہرام آج تک موجود ہے) یہ حقیقت ہے کہ اس دور میں ان کے بنائے ہوئے کلینڈر ہمارے آج کے کلینڈرز سے زیادہ درست ہیں۔ ان کا حساب اتنا درست ہے کہ فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ سورج کب نصف النہار پر ہو گا، سال کے کن حصوں میں دن رات برابر ہوں گے۔ ہمارے نظام شمسی میں دیگر سیارگان کے گزرنے کے راستے اور اوقات کیا ہیں۔ زہرہ اور مریخ کے مدار کون سے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

انہوں نے ہزاروں برس قبل اور بعد کے حسابات کر رکھے تھے۔ ان حسابات کی بنیاد پر وہ مختلف پیش گوئیاں کیا کرتے تھے۔ سورج گرہن اور چاند گرہن کے جو اوقات مایا کلینڈر میں درج ہیں، سیکڑوں برس کا تجربہ انہیں درست ثابت کرتا آ رہا ہے۔ انہوں نے جنرل کوریٹز کے حملے کی خبر کئی سو برس قبل دے دی تھی۔

مایا کے کاہنوں نے کئی کلینڈر بنائے تھے۔ ان کے تیسرے کلینڈر کو Long Cunt کلینڈر کہا جاتا ہے۔ اس میں دنوں کا ایک حساب مسلسل ہے۔ یہ ہر 5 ہزار برس بعد شروع ہوتا ہے۔ موجودہ Long Count، 3114 قبل مسیح کو شروع ہوا تھا۔ 5126 برس بعد یہ 21 دسمبر 2012ء کو ختم ہو رہا ہے۔ خیال کیا جا رہا ہے کہ قدیم مایا تہذیب کے کلینڈر کے ساتھ ہی یہ دنیا بھی 21 دسمبر 2012ء کو ختم ہو جائے گی۔

ہوپی انڈینز:

دنیا کے خاتمے کی پیش گوئی صرف مایا کلینڈر ہی میں نہیں، کئی دیگر تہذیبوں میں بھی پائی گئی ہے۔

کبالسٹ، ایزنٹز، پیرو کے کیرالڈرز، نواجا، چیوکی، اپاچی، ایروکیٹس کالفی ڈرے کی، ڈوگان اور ایبروگائنس کی طرح ہوپی ہندیوں نے بھی دسمبر 2012ء کو دنیا کے خاتمے یا Dooms Day کی پیش گوئی کی ہے۔

ہوپی قبیلہ امریکی ریاست Arizona میں پایا جاتا ہے۔ ہوپی کے معنی ہیں ''پُرامن''۔ ان کا مذہب مختلف عقائد اور رسومات کا مجموعہ ہے۔ یہ روحانیت پر یقینِ کامل رکھتے ہیں۔ اگر آپ ''شمن ازم'' سے واقف ہیں تو بس یہ اسی قبیل کے افراد ہیں۔ ان کے ہاں پائی جانے والی دیومالا انوکھی اور گنجلک ہے۔ یہ پیش گوئیوں اور مابعد الطبیعیاتی توجیہات کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بہت اہمیت دیتے ہیں۔

1940ء میں ہوپی قبیلے کے ایک بزرگ اپنے خاص علاقے سے باہر آئے اور انہوں نے دنیا کو خبردار کیا کہ موجودہ دور کا خاتمہ قریب ہے۔ قربِ قیامت کی 9 ہوپی نشانیاں پوری ہونے والی ہیں اور یہ دنیا جلد ختم ہوجائے گی، ان کے الفاظ یہ تھے۔

''ایک ان دیکھی مکڑی دنیا کے گرد اپنا جال بُن رہی ہے، جوں ہی یہ جال مکمل ہوگا، آسمان ایک نیلگوں ستارے سے منور ہوجائے گا۔ یکے بعد دیگرے حادثات ایک تواتر سے پیش آئیں گے اور یہ دنیا تباہ ہوجائے گی۔''

تیسری جنگِ عظیم، زمینی درجۂ حرارت میں اضافہ، جغرافیائی تبدیلیاں، قحط، خشک سالی اور ایک بڑی تباہی، حیرت انگیز طور پر یہ سب کچھ دسمبر 2012ء کے آس پاس وقوع پذیر ہوگا۔

ناسٹرڈیمس:

مائیکل ڈی ناسٹرڈیمس (14 یا 21 دسمبر 1503ء تا 2 جولائی 1566ئ) ایک فرانسیسی عطار اور کاہن تھا۔ اس کی پیش گوئیوں کی شہرت ساری دنیا میں ہے جو آج بھی برقرار ہے۔ اس کی کئی پیش گوئیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ پوری ہوئیں۔ ناسٹرڈیمس کی پیش گوئیاں رباعیات اور اشعار کی شکل میں ہیں۔ ہر دور میں ان رباعیوں کی تشریح کی جاتی رہی ہے اور رونما ہونے والے واقعات پر منطقی بحث کر کے پیش گوئیوں کی درستی پر اصرار کیا گیا ہے۔

ناسٹرڈیمس لکھتا ہے۔

11`41

ساتویں دن کا روشن ستارہ جل بجھے گا
بادلوں سے دو سورج نمودار ہوں گے
لمبے کانوں اور ہونٹوں والے کتے تمام رات روئیں گے

جب عظیم پوپ ممالک تبدیل کرتا ہے۔

11`46

انسانیت کو ایک کے بعد دوسری لاچاری لاحق ہے
صدیوں کا عظیم چکر بدلنے کو ہے
خون کی بارش ہوگی، قحط جنگیں اور بیماری
تو آسمان پر دُم دار چنگاریوں والی آگ دیکھے گا۔

مندرجہ بالا اور دیگر کئی رباعیوں سے ناسٹرڈیمس کے شارحین یہ نتیجہ نکال رہے ہیں کہ

''2012ء میں زمین سے ایک بڑا شہاب ثاقب ٹکرانے والا ہے، جو عظیم تباہی کا باعث بن سکتا ہے۔

2012ء میں تیسری جنگِ عظیم ہوگی جو دنیا کی تباہی کا سبب بن سکتی ہے۔''

وہ کن حسابات کی مدد سے یہ نتائج نکال رہے ہیں، ایک عام فرد کے لیے جاننا آسان نہیں، کیا ہوسکتا ہے؟ کیا ہونے والا ہے؟ درحقیقت کوئی نہیں جانتا۔

مدر شپٹن:

ایک انگریز رمّالہ ''مدر شپٹن'' (1488۔1561ء) گزری ہے۔ سترہویں، اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی میں برطانیہ، آسٹریلیا اور شمالی امریکا میں ان کی پیش گوئیوں کی دھوم تھی۔ کئی سانحات اور بڑے واقعات کو ان کی پیش گوئیوں سے نتھی کیا جاتا ہے۔ انہوں نے بھی شاعرانہ انداز میں پیش گوئیاں کی ہیں۔ 2012ء کے حوالے سے ''مدر شپٹن'' کے دو مصرعے ملاحظہ فرمائیے۔

''ایک آتشیں اژدہا آسمان پر ظاہر ہوگا
زمین کے خاتمے سے قبل وہ اس کے چھ چکر لگائے گا۔''

آپ ان مصرعوں کے کچھ بھی معنی لیں لیکن مدر شپٹن کے شارحین کا خیال ہے کہ مدر شپٹن نے خلا سے کسی بڑے شہاب ثاقب یا کسی سیارے مثلاً Planet-x یا Nibiru کے آنے کی اطلاع دی ہے۔ یاد رہے کہ پُراسرار سیاروں Planet-x یا Nibiru کے ظہور کی اطلاعات ایک تواتر سے خاص حلقوں کی جانب سے دی جاتی رہی ہیں۔

جدید سائنس اس بارے میں کیا کہتی ہے، وہ ہم آگے دیکھیں گے، فی الحال تو یہ جان لیں کہ مایا، ہوپی انڈینز، ناسٹرڈیمس..... مدر شپٹن وغیرہ دنیا کے عنقریب خاتمے کے بارے میں یک زبان ہیں یہاں تک کہ طے شدہ تاریخ 21 دسمبر 2012ء کا اعلان کرتے نظر آتے ہیں۔ نیز یہ کہ زمین سے کوئی شہاب ثاقب یا سیارہ ٹکرائے گا۔ زمین پر بہت بڑی بڑی تبدیلیاں اور تباہیاں نازل ہوں گی۔ یاد رہے کہ Global Warming اور Climete Change کو تو ہم محسوس کر بھی رہے ہیں۔

مزید آگے بڑھنے سے پہلے دنیا کی ایک اور قدیم تہذیب کا رخ کرتے ہیں کہ چین کا قدیم علم ''ای چنگ'' اس

سلسلے میں کیا کہتا ہے۔

ای چنگ اور 2012ء 21'12

ای چنگ کو مغرب میں The Book of Change بھی کہا جاتا ہے۔ شاید یہ دنیا کی سب سے قدیم کتاب ہے۔ اسے قدیم ''فال نامہ'' بھی کہہ سکتے ہیں۔ سیکڑوں نہیں ہزار سے بھی زائد برسوں سے چین کے لوگ اس کتاب سے فال نکالتے آئے ہیں۔ آج ای چنگ سے استفادہ کرنے والے دنیا کے ہر علاقے میں مل جاتے ہیں۔

کچھ عرصہ قبل ای چنگ کے ایک مشہور شارح ''میکنّا'' نے ای چنگ پر ایک مختلف انداز میں کام کیا۔ یہ بہت سا کام ''نیٹ'' پر بھی موجود ہے۔ میکنّا نے یہ کیا کہ ای چنگ کی چھ لکیروں اور 64 ممکنہ نقوش کو تبدیلی کی ترتیب قرار دیا۔ نقوش کی ترتیب کو ایک خاص گراف پر منتقل کیا گیا اور پھر اسے گراف سمیت Time-Line پر رکھ دیا گیا۔ اس گراف کی ابتدا ای چنگ کی ابتدا سے کی گئی۔ یعنی اب سے تقریباً 4 ہزار برس قبل۔ 64 نقوش Haxagrams تاریخ میں 64 مرتبہ دہرائے گئے۔ میکنّا نے انہیں Time Wave Zero کی بلندی اور پستی قرار دیا (یہ عمل کمپیوٹر کی مدد لے کر ذرا سی محنت اور توجہ سے آپ بھی کر سکتے ہیں) حیرت انگیز نتائج آپ کے سامنے ہوں گے۔

میکنّا کا یہ گراف حیرت انگیز درستی سے نتائج پیش کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر سلطنت روما کا زوال، نئی دنیا کی دریافت، بیسویں صدی کی دو عظیم جنگیں وغیرہ۔ اب آیئے اس سے بھی زیادہ دلچسپ اور حیرت ناک نتیجے کی طرف۔ یہ گراف جس تاریخ پر آ کر ختم ہو رہا ہے، وہ ہے 21، دسمبر 2012ء۔

مایا کلینڈر، ہوپی انڈینز..... ناسٹرڈیمس اور ای چنگ۔ آخر یہ سب اپنے اپنے طور پر ایک ہی تاریخ پر آ کر کیوں رک جاتے ہیں؟ کیا یہ سب محض اتفاق ہے؟

بائبل کوڈ:

16ویں صدی عیسوی یا اس سے بھی قبل مذہبی اور صوفی منش افراد بائبل کا مطالعہ پیش گوئی کرنے کے لیے کرتے آئے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ بائبل کے ظاہری معنوں کے علاوہ اس میں خفیہ پیغامات بھی موجود ہیں۔ یہ خفیہ پیغامات مستقبل اور دنیا کے خاتمے کے بارے میں ہیں۔ ان تک رسائی ہر فرد کے بس کی بات نہیں۔ یہ رمز کسی کسی پر ہی آشکار ہوتے ہیں۔

شہد کی مکھیاں ختم ہونے پر قیامت آئے گی

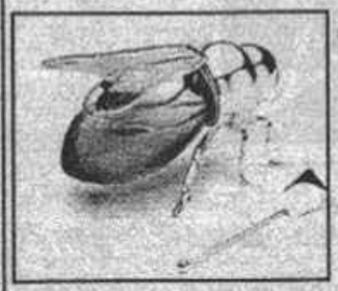

2008ء کے موسم سرما میں امریکا میں شہد کی مکھیوں کے بے شمار چھتے کسی پُراسرار بیماری کے باعث ختم ہوگئے۔ اس پُراسرار بیماری کو CCD کا نام دیا گیا۔ اس بیماری کا شکار ہونے والے چھتوں میں کارکن مکھیاں اچانک ہلاک ہوگئی تھیں اور ملکہ مکھی تن تنہا رہ گئی تھی۔ جلد ہی پُراسرار بیماری امریکا سے نکل کر یورپ کے کئی ممالک میں پھیل گئی۔ اس بیماری کی وجوہات کے متعلق بہت کچھ کہا گیا لیکن حتمی نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکا۔ اس بیماری کا ابھی تک کوئی علاج نہیں مل سکا اور گاہے گاہے نئے ملکوں میں یہ بیماری تباہی پھیلاتی رہتی ہے جس کی وجہ سے یہ خطرہ حقیقت کا روپ دھارتا دکھائی دیتا ہے کہ جلد ہی کرۂ ارض سے شہد کی مکھیاں ناپید ہوجائیں گی۔

قیامت کے منتظر افراد اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ شہد کی مکھیوں کی نسل معدوم ہونے سے ایک طرف شہد کا حصول ناممکن ہوجائے گا تو دوسری جانب انسان کے استعمال میں آنے والی بہت سی اہم فصلیں بھی ختم ہوجائیں گی جن میں سویابین، کپاس، براسیکا، برازیل نٹ، بادام، انگور، سیب اور سورج مکھی جیسی اہم فصلیں شامل ہیں۔ نباتاتی ذرائع سے حاصل ہونے والی خوراک کا تقریباً ایک تہائی حصہ ان مکھیوں کی وجہ سے ہی حاصل ہوتا ہے کیونکہ ان فصلوں کا زردانہ ان مکھیوں کے ذریعے ہی زچہ دے سے مادہ پودے تک پہنچتا ہے۔ اگر شہد کی مکھیاں ختم ہوگئیں تو بہت سی فصلیں ناپید ہوجائیں گی۔ خوراک کی کمی، قحط اور قتل و غارت گری کے واقعات اس کا لازمی نتیجہ ہوں گے جنہیں پھیلنے سے روکنا ممکن نہیں ہوگا۔

رضوانہ شاہین۔ گجرات

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

معدنی تیل کا خاتمہ

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ دنیا کا تیل بتدریج ختم ہورہا ہے کیونکہ اس کے استعمال میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے۔ دنیا کے خاتمے کو تیل کے خاتمے کے ساتھ وابستہ کرنے والے لوگوں کے مطابق تیل کی طلب اور رسد میں فرق بڑھتا چلا جائے گا اور پھر وہ لمحہ آجائے گا کہ جب تیل کی طلب اس کی رسد سے بہت بڑھ جائے گی۔ کچھ لوگوں کے خیال میں یہ فرق رونما ہوچکا ہے جبکہ بعض لوگوں کے مطابق یہ واقعہ 2020ء کے آس پاس رونما ہوگا۔ تیل کے خاتمے یا اس کی پیداوار میں بہت زیادہ کمی ہوجانے کی وجہ سے دنیا بھر میں صنعتیں اور زراعت کے شعبے شدید متاثر ہوں گے۔ بہت بڑا معاشی بحران جنم لے گا۔ کھادیں، کیڑے مار ادویات اور زمینی پانی کی کمی کی وجہ سے فصلیں تباہ ہوجائیں گی یا زرعی پیداوار انتہائی کم ہوجائے گی جس کی وجہ سے معاشرتی زندگی کا نظام درہم برہم ہوکر رہ جائے گا۔

تیل یقیناً ایک دن ختم ہوجائے گا لیکن اہم سوالات یہ ہیں کہ ایسا کب ہوگا؟ یا اس کے خاتمے سے قبل انسان کوئی متبادل ایندھن دریافت کرلے گا؟ ایم کنگ ہوبرٹ نے 1956ء میں یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ 1965ء سے 1970ء کے درمیانی عرصے میں امریکا کے تیل کی پیداوار اپنے عروج پر پہنچنے کے بعد روبہ تنزل ہوجائے گی اور ان کا یہ نظریہ درست ثابت ہوا۔ اس کے بعد عالمی اقتصادی بحران کے دوران تیل کے کاروبار سے بہت بڑی مقدار میں سرمایہ نکال لیا گیا اور نئے کنوؤں کی تلاش کا کام تو قریب قریب ٹھپ ہوکر رہ گیا تھا۔ ماہرین کے اندازوں کے مطابق تیل کے خاتمے کے ساتھ دنیا میں ہونے والی معاشرتی تباہی کا امکان دس میں سے 4 فی صد ہے۔

راحیلہ شیخ۔ کراچی

ان خفیہ پیغامات کے مطالعے کو ''بائبل کوڈ'' کا نام دیا گیا ہے۔ بائبل زمانۂ قدیم سے پیش گوئیوں کے حوالے سے بھی معروف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بائبل کی کئی پیش گوئیاں پوری ہوئیں۔ مثال کے طور پر ''یرمیاہ نبی'' کی پیش گوئی کہ یروشلم بابل کے لوگ فتح کریں گے یا یسوع مسیح کی پیش گوئی، یروشلم کو روم والے تباہ کریں گے، وغیرہ۔

بائبل کے عہدنامہ جدید کا آخری باب ''یوحنا عارف'' کے مکاشفات پر مشتمل ہے۔ یہ مکاشفے دنیا کے خاتمے کے بارے میں ہیں۔ لیکن بائبل کوڈ ان سب سے الگ معاملہ ہے۔ آپ اسے توریت کوڈ بھی کہہ سکتے ہیں۔

یہ وہ خمسۂ موسوی ہیں یعنی وہ پانچ کتابیں جو خداوند نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی تھیں۔ وہ اصل زبان جس میں یہ خمسۂ موسوی یا عہدنامہ عتیق نازل ہوا تھا، کب کی امتدادِ زمانہ کا شکار ہوکر ختم ہوچکی ہے لیکن موجودہ عبرانی میں خمسۂ موسوی کے نسخے موجود ہیں۔ بائبل کوڈ انہی عبرانی نسخوں کے درمیان پوشیدہ مانا جاتا ہے۔

کچھ عرصہ قبل جب ایک ماہر ریاضی دان نے پوشیدہ بائبل کوڈ کو کمپیوٹر کی مدد سے حل کرنے کا دعویٰ کیا تو سائنس کی دنیا میں نئے مباحث کا آغاز ہوا۔ ریاضی دان نے اسے شماریاتی سائنس یا Statistical Science کا نام دیا اور اس تکنیک کو E L S یا Equadistant Letter Sequence کہا۔ اس تکنیک کے استعمال سے حاصل کیے گئے جوابات بہت ہی دلچسپ تھے۔

نائن الیون تک کی پیش گوئیاں حرف بہ حرف درست نظر آئیں۔ جب قیامت اور دنیا کے خاتمے کے بارے میں جاننے کی کوشش کی گئی تو بائبل کوڈ سے حاصل ہونے والے جوابات بہت ہی حیرت ناک بلکہ خوفناک نظر آئے۔ مایا، ہوپی انڈینز..... ناسٹرڈیمس اور ای چنگ کی طرح بائبل کوڈ کے مصنفین بھی دنیا کے خاتمے کی جس تاریخ پر آزادانہ طور پر پہنچے، وہ ہے 21 دسمبر 2012ء۔

ہے نا حیرت انگیز اتفاق!

سینٹ مالکی۔ Saint Malachy

کیتھولک اور دیگر عیسائی مکاتبِ فکر ایک طویل عرصے سے دنیا کے خاتمے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمدِ ثانی کی بات کرتے آرہے ہیں۔ اس سلسلے میں 112 آخری پوپ کی پیش گوئی کو ایک خاص شہرت ملی۔

زمین کا اینیرو سے ٹکراؤ

ایسی ویب سائٹس کی تعداد بلاشبہ ہزاروں میں ہے جن پر بے شمار لوگ اس خدشے کا اظہار کرچکے ہیں کہ اکیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں زمین کسی نامعلوم سیارے سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہوجائے گی۔ زمین سے ممکنہ طور پر ٹکرانے والے اس سیارے کو ''اینیرو'' کا نام دیا گیا ہے۔ ''اینیرو'' کا نام پہلی مرتبہ 1960ء میں سامنے آیا۔ یہ نظریہ پیش کرنے والے کے مطابق ہمارے نظام شمسی میں 37 ہزار برس بعد کوئی آوارہ سیارہ گھس آتا ہے اور بہت کچھ تباہ و برباد کرکے رکھ دیتا ہے تاہم ''ژشیریہ سٹیشن'' نامی اس شخص نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ''اینیرو'' کبھی زمین سے ٹکرائے گا۔ بعض ماہرین کے مطابق ''اینیرو'' ایک بونا سیارہ ہے جو سورج کے ساتھ ہی وجود میں آیا تھا اور اس سیارے کو پہلی مرتبہ اس برس کے آخری دنوں میں دیکھا جاسکے گا۔ اس سلسلے میں کوئی ٹھوس شواہد موجود نہیں ہیں۔ کچھ لوگوں کے مطابق یہ وہی سیارہ ہے جس کے متعلق 2005ء میں امریکی ادارے ''ناسا'' نے دعویٰ کیا تھا کہ نظام شمسی کی آخری حد پر ایک دسواں سیارہ دریافت کیا گیا ہے۔ بعض ماہرین کے خیال میں یہ سیارہ 2012ء میں زمین کے انتہائی قریب سے گزرے گا تاہم اس کے اپنے مدار سے بھٹک کر نظام شمسی میں گھس آنے کا کوئی امکان نہیں ''اینیرو'' کے ساتھ زمین کے تصادم کا خطرہ 10 میں سے 2.0 فیصد بیان کیا جاتا ہے۔

سعدیہ رحمان۔ ملتان

یہ پیش گوئی سینٹ مالکی (1094ء۔ 2 نومبر 1148ء) نے کی۔ وہ ارماغ کے آرچ بشپ تھے۔ یہ پہلے آئرش ہیں جنہیں گرجا نے سینٹ کے درجے پر فائز کیا۔ عقیدت مند آخری پوپ کی پیش گوئی کے علاوہ کئی دیگر کرامات بھی ان سے منسوب کرتے ہیں۔

سینٹ مالکی نے کہا کہ ''خداوند یسوع مسیح نے مجھے دنیا کے خاتمے تک کے تمام پوپ دکھائے ہیں۔''

کچھ لوگوں کا اصرار ہے کہ یہ پیش گوئی گزشتہ 700 برس سے حرف بہ حرف پوری ہوتی چلی آرہی ہے۔ مثال کے طور پر سینٹ مالکی نے پوپ جان تیسویں کے بارے میں پیش گوئی کی جو صد فی صد درست رہی۔ پوپ پال ششم کو مالکی نے The Flos Floram (شناختی نشان) قرار دیا۔ یہ پیش گوئی بھی پوری ہوئی کیونکہ اس پوپ کا Coat of arms (شناختی عبارہ) تھا Lilly among Lilly's (للی پھولوں میں ایک پھول)

یا مثال کے طور پر ''پوپ جان پال دوم'' کے بارے میں پیش گوئی میں تحریر تھا۔ De Labore Fdlis۔ مطلب سورج گرہن۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ پوپ سورج گرہن میں پیدا ہوئے تھے۔

موجودہ پوپ ''بینیڈکٹ'' کے بعد آخری پوپ پیٹر دی رومن کی پیش گوئی کی گئی ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ آخری پوپ ثابت ہوں گے اور انہی پر روم اور دنیا کا خاتمہ ہوگا، واللہ اعلم۔

اس حوالے سے چند دلچسپ باتوں کا تذکرہ ضروری ہے۔

پوپ جان پال دوم کا انتقال 2005ء میں ہوا۔ مالکی کے مطابق یہ 110 ویں پوپ تھے۔ 111 ویں پوپ کے چناؤ کے موقع پر دیگر کئی قیاسات کے ساتھ سینٹ مالکی کی پیش گوئی کا بھی خاصا تذکرہ سننے میں آیا۔ اس دوران انڈیا سے شائع ہونے والے ایک خط کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اس خط میں پوپ کا چناؤ کرنے والے ''کارڈینلز'' سے دردمندانہ درخواست کی گئی تھی ''آپ یقیناً ہمارے لیے ایک عظیم روحانی شخصیت کا چناؤ کریں گے۔ ایک ایسی شخصیت جو ہمارے نوجوانوں میں مقبولیت حاصل کرے، چرچ کو جوڑ کر رکھے..... وغیرہ۔ لیکن..... خدا کے لیے کسی ایسے فرد کا چناؤ نہ کیجئے گا جس کا زیتون سے دور کا بھی واسطہ ہو۔''

غور کیجئے، یہ زوردار درخواست کیوں کی جارہی تھی۔ بات یہ تھی کہ سینٹ مالکی نے 111 ویں پوپ کے لیے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''رفعتِ زیتون'' کا استعارہ استعمال کیا تھا۔ اب خطرہ یہ تھا کہ اگر انتخاب کسی ایسے پوپ کا ہوگیا جس کا کسی بھی طور، کوئی بھی تعلق زیتون سے قائم ہوا تو پیش گوئی درست ثابت ہوگی۔ نیز منتخب ہونے والے پوپ پیش گوئی کے مطابق آخری سے پہلے ہوں گے۔

رات گزری، صبح ہوئی۔ مقدس چمنی سے دھواں برآمد ہوا۔ مبارک سلامت کا غلغلہ بلند ہوا۔ نئے پوپ کی شناخت بیان کی گئی، وہ ہیں ''کارڈینیل رٹزنگر'' آپ کا تعلق جرمنی سے ہے۔ گویا یہ سمجھا گیا کہ زیتون سے ان کا دور کا بھی تعلق نہیں۔ کیا 700 برس بعد مالکی کی پیش گوئی غلط ثابت ہوگئی؟ لیکن نہیں، یہاں ایک انتہائی حیرت انگیز واقعہ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ پوپ نے اپنے لیے جو خاص نام منتخب کیا وہ ہے۔ Benedict xvi۔ سینٹ بینیڈکٹ یورپ کا سینٹ تھا۔ اس سے جو سلسلہ شروع ہوا اسے ''بینیڈکٹین آرڈر'' کہا جاتا ہے۔ ہر ''آرڈر'' کی طرح اس ''آرڈر'' کی بھی ایک خاص علامت ہے۔ آپ کو یقیناً دلچسپی محسوس ہورہی ہوگی کہ وہ خاص علامت کیا ہے؟ جسے سولہویں بینیڈکٹ پوپ کے طور پر موجودہ پوپ نے بھی اپنے Coat of Arms کے طور پر اپنایا..... وہ ہے زیتون۔

مزید دلچسپ بات یہ ہے کہ موجودہ پوپ 75 برس کی عمر میں پوپ منتخب ہوئے ہیں۔ ان کی عمر زیادہ ہے اور 2012ء کا دسمبر قریب۔

جدید سائنس اور 21 دسمبر 2012ء

اب تک تو ہم نے قدیم تہذیبوں اور پیش گوئیوں کے حوالے سے بات کی، اب ہم دیکھیں گے کہ جدید سائنس اس بارے میں کیا کہتی ہے۔ سب سے پہلے ہم دنیا کے معتبر ترین ادارے NASA کا ذکر کرتے ہیں۔ ناسا نے اصولی طور پر ایسے ہر امکان کو رد کردیا کہ 21، دسمبر 2012ء کو دنیا ختم ہوسکتی ہے۔

لیکن..... اور یہ لیکن بہت اہم ہے۔ بہت کچھ کہنے کے لیے ہے۔ Nasa کی مندرجہ ذیل ویب سائٹ پر یہ خبر اب تک پڑھی جاسکتی ہے کہ ناسا نے 2012ء کے بارے میں کیا پیش گوئی کی۔ سب سے پہلے ویب ایڈریس۔

(http://Science.nasa.gov/headlines/y

(2006/10mar Storm warning.htm

اس رپورٹ میں ناسا نے کنفرم کیا ہے کہ 2012ء میں شدید شمسی طوفان آئیں گے۔ سورج کے اپنے قطبین تبدیل ہوجائیں گے۔ اسی دوران شمسی دھبوں کا دورانیہ بھی مکمل ہورہا ہے۔ ان سب کے نتیجے میں سورج کی سطح پر شدید شمسی طوفان آئیں گے۔ ان شمسی طوفانوں سے زمین یقینی طور پر متاثر ہوگی۔ نیشنل سینٹر فار اٹماسفیرک ریسرچ NCAR کی موسامی ڈکپائی کا کہنا ہے کہ یہ 30 سے 50 فیصد شدید ہوگا۔ یہ سب کچھ ناسا کی مندرجہ بالا ویب سائٹ پر موجود ہے۔

یہ بھی ہمارے علم میں ہے کہ کائنات میں بے شمار شہابیے ہر وقت گردش کرتے رہتے ہیں۔ ان کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ یہ اور ان کے بیش تر مدار سائنس دانوں سے پوشیدہ ہیں۔ جدید فلکیات کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہمارے سائنس دانوں کو ان میں سے اکثر کے وجود کا اس وقت پتا چلا جب وہ ہماری زمین سے ٹکرائے۔

ادھر کچھ فلکیات دان اس امکان کا جائزہ لے رہے ہیں کہ ایک بہت بڑا شہاب ثاقب ایک خفیہ مدار میں گردش کررہا ہے اور وہ 21 دسمبر 2012ء کو زمین سے ٹکرا کر بڑی تباہی لانے والا ہے۔ سائنس دانوں کے خیال کے مطابق اس شہابیے کا حجم 50 سے 300 میٹر (150۔1000 فٹ) ہوسکتا ہے۔ اس کے ٹکرانے کا امکان 250 میں سے ایک ہے۔ کچھ دیگر ماہرینِ فلکیات کہتے ہیں کہ یہ امکان تو ہر وقت رہتا ہی ہے۔ ان کی رائے میں ایسا کوئی بہت بڑا شہاب ثاقب جو زمین سے ٹکرا کر زمین کو تباہ کرڈالے یا بڑی تباہی لائے۔ مثلاً ڈیڑھ کلومیٹر طویل وعریض شہابیہ اگر زمین سے ٹکرائے تو ڈیڑھ ارب سے زائد ہلاکتیں ہوسکتی ہیں۔ سائنس دانوں کا اطمینان ہے کہ اس کا امکان کم ہے۔ یعنی دس لاکھ میں صرف دو۔

زمین سے شہاب ثاقب ٹکرانے کے بارے میں سائنس دانوں اور ماہرینِ فلکیات کی رائے آپ کے سامنے آگئی۔ اب دیکھیے 21 دسمبر 2012ء پر کام کرنے والے کیا کہتے ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ مایا انسانی تہذیب کی وہ معلوم قوم اور برادری تھی جن کا اوڑھنا بچھونا فلکیات تھا۔ ایسے ماہرینِ فلکیات چشمِ فلک نے آج تک نہیں دیکھے۔ انہوں نے ہزاروں برس آگے اور پیچھے کی فلکی شماریات اس صحت کے ساتھ کیں کہ آج تک ایسا نہیں کیا جاسکا۔ آج تک سورج

گرہن اور چاند گرہن ان کے بتائے ہوئے وقت پر ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ لہٰذا عین ممکن ہے کہ انہوں نے اپنے دور میں وہ مدار دریافت کرلیے ہوں جو ہماری نگاہوں سے آج بھی پوشیدہ ہیں۔ ایسے ہی کسی خفیہ مدار سے آنے والے ایک بہت بڑے شہابیے کے زمین سے ٹکرانے کے امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ امکان اس وقت اور بڑھ جاتا ہے جب عین اسی وقت یعنی 21 دسمبر 2012ء کو زمین کچھ اور فلکی حادثات سے بھی دوچار ہونے جارہی ہے، واللہ اعلم۔

ان میں سب سے اہم ہے ''کہکشانی ہم آہنگی'' یا Galactic Alignment۔ جس طرح ہمارا زمینی خطِ استوا ہے بعینہٖ ایک کہکشانی خط استوا بھی ہے۔ جب دسمبر کے قب کا سورج کہکشانی استوا کی سیدھ میں ہوجائے تو اسے سورج کی کہکشانی ہم آہنگی قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے لیے 1998ء کا سال بیان کیا گیا تھا۔

(Jean Meevs.Mathematical astronomy

(Morsels 1997

اب اس کی مساوات ملاحظہ فرمائیے۔

Galactic Alignment"Zone"is

(1998+/-18years=1980-2016 (era-2012

یہ امر بھی خاص دلچسپی کا حامل ہے کہ یہ فلکی مظہر ہر 26000 برس میں صرف ایک مرتبہ پیش آتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ زمین کی گردش اپنے محور پر کس قدر جھوم کر ہوتی ہے۔ جس طرح ایک لٹو گرنے سے قبل جھومتا ہے اسی طرح زمین بھی کسی قدر جھوم کر گردش کرتی ہے۔ اس مظہر کو Wobble of Earth کہا جاتا ہے۔ یہ کئی طرح کے ہیں۔ ایک تو ہر 18 برس میں مکمل ہوتا ہے۔ جبکہ سب سے طویل جھوم یا لہر 25800 یا 26000 برس میں مکمل ہوتی ہے۔ حیرت انگیز طور پر زمین کا یہ Wobble دسمبر 2012ء میں ہونے جارہا ہے۔ اس کے نتیجے میں کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ یقیناً ایسا کچھ جو گزشتہ 26000 برس میں اب تک نہیں ہوا۔

بلیک ہول:

2012ء میں سائنس دانوں کو ایک اور خطرہ اور خدشہ زمین اور کہکشانی نظام کے ایک بہت بڑے بلیک ہول میں گرجانے کا بھی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ تمام بڑی کہکشاؤں کے عین مرکز میں ایک بلیک ہول ہوتا ہے۔ ہمارے کہکشانی

کیا آپ
لبوب مُقوّی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مُقوّی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مُقوّی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مُقوّی اعصاب ٹیلیفون کرکے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں فون صبح 10 بجے تا رات 9 بجے تک

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی یونانی دواخانہ)
ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061
0301-6690383

آپ صرف فون کریں۔ آپ تک لبوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نظام کے عین وسط میں بھی ایک مہیب بلیک ہول موجود ہے۔ یہ وہ مقام ہے جسے ہم سائنس اور ضمیات کا نقطۂ اتصال بھی کہہ سکتے ہیں۔

قدیم مایا کے افراد کا خیال ہے کہ یہ بلیک ہول ہے جہاں سے کائنات کا آغاز ہوا تھا۔ زندگی اپنی موجودہ شکل میں اسی مقام سے ظہور پذیر ہوئی تھی اور عین ممکن ہے 21 دسمبر 2012ء کو عین اسی جگہ جا کر ضم ہو جائے یا شاید ایک نئی ابتدا ہو۔

سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ کہکشائیں باہمی انضمام کے ذریعے آگے بڑھتی ہیں۔ ایسے میں دونوں کہکشاؤں کے بلیک ہول ثنوی نظام Binary System تشکیل دیتے ہیں۔ ماہرین فلکیات کا خیال ہے کہ 2012ء میں کئی بلیک ہولز ضم ہونے جا رہے ہیں۔ اس کے نتیجے میں پوری کائنات میں شدید انفجاری کیفیت پیدا ہوگی اور نہیں کہا جا سکتا کہ کیا کیا رونما ہوگا؟

اس بات کے ایک سے زائد شواہد موجود ہیں کہ ہماری کہکشاں کے عین وسط میں ایک بہت بڑا بلیک ہول موجود ہے۔ بلیک ہولز ہماری کائنات کے بہت ہی دلچسپ لیکن بہت ہی ہولناک اجسام ہیں۔ بلیک ہولز کے بارے میں ایک جدید دیومالا جنم لے چکی ہے۔ اس میں بہت بڑا ہاتھ تو ''ہالی وڈ'' کا ہے۔ ٹیلی وژن، اخبار، رسائل اور موویز نے کبھی تو بلیک ہولز کو وقت کے پار سفر کرنے کی گزرگاہ بنا دیا تو کبھی کسی دوسرے اور مختلف ابعاد Dimension تک جانے کی جگہ قرار دیا۔ کسی نے اسے ''کائناتی ویکیوم کلینر'' کا نام دے دیا۔ غرض یہ کہ کسی نے کچھ تو کسی نے کچھ۔ جب کہ اصل میں بلیک ہول بڑے بڑے ستاروں کے ارتقائی انجام کے علاوہ کچھ نہیں۔ لیکن اس سادہ سی تعریف سے ان اجسام کی پُراسراریت اور ہولناکیت کم نہیں ہوتی۔ نہ ہی پیش آمدہ خطرات۔ 2012ء نزدیک ہے اور بلیک ہولز بھی۔ کہا جا رہا ہے کہ ہر بلیک ہول میں ایک نئی کہکشاں یا کائنات پنہاں ہے۔ کیا ہماری موجودہ کائنات بھی کسی بلیک ہول میں ہے۔ 2012ء میں کیا ہونے والا ہے؟ تباہی یا ایک نئی کائنات کا تجربہ؟ یا کچھ بھی نہیں.....!

21 دسمبر 2012ء کو کیا ہونے والا ہے؟ اس گمبھیر سوال کا جواب دو ہی طریقوں سے ممکن ہے یا تو یہ مان لیا جائے کہ مایا اور دیگر پیش گوئیاں اوہام اور غیر سائنسی باتیں ہیں۔ ایک ایسی تہذیب کے توہمات جو خود کو بھی امتداد زمانہ سے نہ بچا سکی، فنا ہوگئی۔ یا اسے ایک ایسی تہذیب کی جانب سے تنبیہہ سمجھا جائے جو علم فلکیات میں ہم سے کہیں آگے تھی۔

حقیقت صرف آنے والے وقت کے پردوں میں چھپی ہے۔

وقت..... جسے ''مایئز'' ہم سے زیادہ جانتے تھے۔

وقت..... جو تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔

21 دسمبر 2012ء کے حوالے سے لکھنے کو اتنا کچھ ہے کہ ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے اور ظاہر ہے کہ 2012ء کے حوالے سے بہت کچھ لکھا جانا ابھی باقی ہے۔ ذیل میں ہم 2012ء کے حوالے سے پیش آمدہ امکانات کی فہرست پیش کر رہے ہیں جو موضوع سے دلچسپی رکھنے والے افراد کے مطالعۂ مزید میں ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔

21 دسمبر 2012ء..... امکانات

1 فلکی:

..... نجم انفجاری (کاسمک ریز کی برسات)

..... بلیک ہولز میں گرنے کا خطرہ

..... شہاب ثاقب کی زمین پر بارش

..... سورج سے تباہ کن مادوں کا اخراج (شمسی طوفان)

..... گیما ریز اور دیگر فلکی شعاعوں کا زمین کی طرف رخ کر لینا۔

..... بٹر فلائی افیکٹ (نظام شمسی سے علیحدگی)

..... خلائی مخلوق کا حملہ

2 ارضی:

..... قطبین کی تبدیلی

..... گلوبل وارمنگ

..... آتش فشاں کبیر

..... آئس ایج

..... بالائی زمینی تبدیلی قطب

3، انسانی:

..... فلو

..... جوہری جنگ، حیاتیاتی و کیمیائی جنگ

..... نینو ٹیکنالوجی (ہائیڈروجن بم سے زیادہ خطرناک کیمیائی ہتھیاروں کا استعمال)

..... مشینوں کی حکومت

..... جینیاتی تبدیلی، کلوننگ

..... وقت کے سفر میں غلطی

نامعلوم وقت میں تعمیر کیے جانے والے، عقل کو کند کر دینے والے دیوہیکل اہراموں کے خالق کون ہیں؟ کن لوگوں نے اور کب انہیں تعمیر کیا؟ کہنے کو انہیں فرعونوں کے مقابر قرار دیا جاتا ہے لیکن سائنسی تحقیق سے ثابت ہے کہ یہ فرعونوں کے دور سے بھی قبل تعمیر ہوئے ہیں۔ وہ کون لوگ تھے جو کئی کئی سو فٹ چوڑے اور لمبے پتھر اتنی دور لے کر آئے کیونکہ صحرا کے قریب کیا، کئی کئی میل دور تک ماضی بعید میں بھی کوئی پہاڑی سلسلہ نہیں تھا، پھر یہ پتھر آئے کہاں سے اور کس طرح پہنچائے گئے؟ انہیں بنانے کے لیے کون سی تکنیک استعمال کی گئی؟ آج جب علم سائنس اپنے عروج پر ہے تو بھی ایکس رے کی شعاعیں پتھروں کو پار کرنے سے قاصر کیوں ہیں؟ اہراموں کے نیچے کیا ہے، اس کا پتا لگانے میں سائنسی آلات فیل کیوں ہو رہے ہیں؟

اہراموں کے اسرار

کیا واقعی اہراموں کی تعمیر میں کسی دوسرے سیارے کی مخلوق کا ہاتھ ہے؟

مریم کے خان

آپ نے اہرام مصر ضرور دیکھا ہوگا، اصل نہ سہی تصویر تو دیکھی ہی ہوگی، یہ ایک ایسی پُراسرار عمارت ہے جس کے اسرار کو سمجھنے کی کوشش آج بھی جاری ہے۔ اگر چاہیں تو اس کا اندازہ بہ آسانی لگا سکتے ہیں کہ یہ تین کوئی عمارت کیسی اسرار بھری ہے۔ اس کے لیے ایک معمولی سا تجربہ کرنا ہوگا۔

اس تجربے کے لیے گتے یا سخت کاغذ کا ایک ٹکڑا لیں اور اسے چار عدد برابر کے تکونے ٹکڑوں میں کاٹ لیں۔ خیال رہے کہ تکون کا ہر ضلع برابر ہو، پھر ٹیپ سے ان تمام ٹکڑوں کو جوڑ کر اسے اہرام والی صورت دے دیں۔ لیجیے آپ کا چھوٹا سا ذاتی اہرام تیار ہے، آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اس کا کیا کریں؟ تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عرض ہے اگر آپ نے بالکل درست پیمائش کے ساتھ بنایا ہے تو یہ کاغذ کا بنا معمولی سا اہرام بھی وہی اثرات رکھتا ہے جو پتھر کے بنے لاکھوں ٹن وزنی اہرام رکھتے ہیں۔ آپ اس کا تجربہ بھی کر سکتے ہیں۔ تھوڑا سا کچا دودھ لے کر اس اہرام کے نیچے اس طرح رکھ دیں کہ اہرام کا ہر کونا ایک سمت کی طرف ہو۔ یعنی ٹھیک شمال، جنوب، مشرق اور مغرب کی طرف ہو اور اس کے لیے آپ قطب نما کی مدد لے سکتے ہیں۔ کچا دودھ عام حالات کی نسبت کہیں زیادہ دیر پھٹنے سے محفوظ رہے گا۔ نہ اس کے معیار میں فرق آئے گا اور نہ رنگ بدلے گا۔ صرف دودھ نہیں بلکہ خراب ہو جانے والی کوئی بھی غذا اسی طرح اہرام تلے رکھنے سے دیر تک محفوظ رہتی ہے۔

تجربات سے یہ بات ہمیشہ درست ثابت ہوئی ہے اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اہرام کاغذ کا ہے لکڑی یا پلاسٹک کا یا پھر پتھر کا بنا ہوا ہے۔ اگر اسے درست انداز میں بنایا گیا ہے اور اس کی سمتوں کا تعین بھی ٹھیک ہے تو یہ اتنا ہی جادوئی اثر رکھے گا جتنا اصلی اہرام رکھتا ہے۔ اہرام کی انوکھی ساخت اور اس کے مقناطیسی اثرات کے تجربات سے بڑے دلچسپ نتائج سامنے آئے۔ اہرام تلے رکھی جانے والی غذائی اشیا غیر معمولی طویل مدت تک ٹھیک حالت میں رہتی ہیں اور ان کی غذائیت میں بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اہرام میں رکھی جانے والی دوائیں نہ صرف محفوظ رہتی ہیں بلکہ ان کی شفا بخش تاثیر بھی بڑھ جاتی ہے۔ اہرام نما چیمبر میں سونے سے مریض بھی صحت یاب ہو جاتے ہیں اور لاعلاج مریضوں کے مرض میں بہتری دیکھنے میں آئی ہے۔

عام افراد جو اہرام نما چیمبر میں سوتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ ان کو نیند بہت اچھی آتی ہے اور سو کر اٹھنے کے بعد وہ اپنے اندر اضمحلال کے بجائے ایک انوکھی توانائی محسوس کرتے ہیں، انہیں برے خواب بھی نہیں آتے۔ ڈاکٹروں نے ایسے افراد میں منفی آئن کا تناسب معمول سے زیادہ پایا۔ منفی آئن صحت بخش اجزاء ہیں جو آلودگی کو ختم کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ان افراد میں ٹاکسن کی سطح کم پائی گئی ہے۔ اسکینڈے نیوین ممالک میں خاص طور سے اس امر پر تحقیق ہو رہی ہے کہ کیا واقعی اہرام نما ساخت کسی خصوصی اثر کی حامل ہے جو عام حالات میں دیکھنے میں نہیں آتا ہے۔ متعدد تجربات سے ثابت ہوا ہے کہ اس ساخت میں کوئی غیر معمولی بات ہے۔ اہرام تلے برقی مقناطیس اور ریڈیائی لہروں کا ارتکاز پایا جاتا ہے اور اس کا سب سے زیادہ اثر اہرام کی نوک پر ہوتا ہے۔ کیا یہ ان ہی برقی مقناطیسی لہروں کا اثر ہے کہ اہرام تلے اشیا کی ساخت زیادہ دیر برقرار رہتی ہے؟ کیا یہاں چیزوں پر وقت کا اثر کم ہو جاتا ہے؟ اور اس وجہ سے ان کی فرسودگی کی شرح کم ہو جاتی ہے؟

ماہرین ان سوالوں کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور امید ہے کہ جلد اس کا حتمی پتا چل جائے گا کیونکہ آج کی سائنس میں کچھ معلوم کرنا زیادہ دشوار نہیں ہے لیکن وہ سوالات جو اہراموں کے بارے میں گزشتہ کئی سو سال سے انسانی ذہنوں میں کلبلا رہے ہیں ان کا جواب شاید آنے والے وقتوں میں بھی نہ مل سکے۔

اہراموں کے بارے میں اور خاص طور سے مصری اہراموں کے بارے میں معلومات دو طرح سے حاصل ہوتی ہیں۔ اول تو خود قدیم مصریوں نے ان اہراموں اور ان سے ملحق تعمیرات پر جو لکھا اس سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ اہرام کس نے بنائے۔ کسی حد تک ان کی تعمیر کے مقاصد پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ لیکن اس میں دو مسائل ہیں ایک تو ماہرین آج بھی قدیم مصریوں کا تصویری تحریر کا معما درست طریقے سے حل نہیں کر سکے ہیں، ان میں سے بہت سی علامات آج بھی لاینحل ہیں۔ قدیم مصری اپنی تحریر میں حروف کے بجائے چیزوں کی طرح علامات استعمال کرتے تھے لیکن چینی زبان آج بھی زندہ ہے اور قدیم مصری تصویری زبان مردہ ہو چکی ہے اس لیے اس کی کون سی علامت کا کیا مطلب تھا یہ جاننا دور سے کم نہیں ہے۔ ایسے ماہرین بھی گزرے ہیں جن کی زندگیاں ان تحریروں کو پڑھنے کی کوشش میں گزر گئیں اور وہ بھی یقین سے نہیں کہہ سکے کہ انہوں نے جو نتائج نکالے تھے وہ درست تھے یا نہیں۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ پرانے مصری اعلیٰ درجے کے جھوٹے تھے اور جھوٹ بولنا ان کی گھٹی میں تھا۔ عظیم الرتبت بادشاہوں کا یہ حال تھا کہ جب وہ تخت پر جلوہ افروز ہوتے تو ملک کی تمام تعمیرات پر کندہ کارناموں اور احوال میں اپنا نام شامل کرا دیتے تھے۔ یعنی وہ بنا کچھ کیے فاتح بھی بن جاتے تھے اور عظیم تعمیرات کے معمار بھی۔ اس لیے قدیم مصر کی تاریخ کسی بھی ملک سے زیادہ پُراسرار اور دھندلکوں میں لپٹی ہوئی ہے۔ اسی بنا پر مندرجہ بالا سوالات کے جواب حاصل کرنا کبھی بھی آسان نہیں رہا ہے۔

دوسرا ذریعہ جو ان اہراموں کے بارے میں جاننے کا ہے وہ قدیم سیاح ہیں جو اس وقت مصر میں آئے جب یہاں فرعونوں کی حکومت تھی اور کم سے کم اہرام سازی کے ماہرین

موجود تھے اور اپنا کام بھی کر رہے تھے۔ ان میں سب سے اہم شخصیت یونانی مورخ ہیروڈوٹس کی ہے۔ وہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے کوئی ساڑھے چار سو برس پہلے یہاں آیا تھا اور اس نے نہ صرف مصر کا دورہ کیا بلکہ اس نے یہاں موجود مصریوں سے ملاقات کر کے یہ بھی جاننے کی کوشش کی کہ اہرام کس طرح بنائے جاتے تھے۔ اس نے ان طریقوں کی وضاحت خاکوں کی مدد سے کی تھی۔ اس نے سب سے زیادہ خوفو کے اہرام کا ذکر کیا جسے ہیروڈوٹس کی آمد تک تعمیر ہوئے کوئی دو ہزار سال گزر چکے تھے۔ لیکن اس وقت یہ اہرام بہت اچھی حالت میں تھا۔ اس اہرام کے بارے میں ہیروڈوٹس کہتا ہے۔

"چونے کے پتھر اتنے بے عیب انداز میں جوڑے گئے ہیں کہ ان میں کہیں جوڑ نظر ہی نہیں آتا ہے۔"

ہیروڈوٹس کی یہ بات درست ہے کیونکہ آج جب کہ خوفو کا اہرام خستہ حال ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود اس کی ٹنوں وزنی چٹانوں کے جوڑ نمایاں نہیں ہوئے ہیں اور ان کو جوڑنے والا مسالا ابھی تک اپنی ساخت برقرار رکھے ہوئے ہے۔ ہیروڈوٹس نے خوفو کے اہرام کو دیکھ کر کہا تھا۔ "یہ پورا اہرام روغنی ٹائلوں سے ڈھکا ہوا ہے جو چونے کے پتھروں کو صحرا کی گرمی اور خشک ہواؤں سے بچاتی ہیں۔ یہ ٹائلیں بہت نفاست سے پورے اہرام پر اس طرح لگائی گئی ہیں کہ دور سے دیکھنے پر اہرام ہیرے جیسا لگتا ہے۔"

آج اگرچہ یہ اہرام بالکل ننگا ہو چکا ہے۔ اس پر کہیں کسی روغنی ٹائل کا نام و نشان نہیں ملتا ہے اور اسی وجہ سے صحرائی ہوا نے اسے نقصان بھی پہنچایا ہے۔ ہیروڈوٹس کے بیان کی تصدیق عباسی خلیفہ المامون کے دور کی بعض تحریروں سے ہوتی ہے۔ یہ اولین مسلم خلیفہ تھا جس نے علم کی ترویج سائنسی بنیادوں پر کی۔ اس نے ساری دنیا سے کتابیں جمع کیں اور ان کا عربی میں ترجمہ کرایا۔ کوئی بھی شخص اسے کوئی کتاب لا کر دیتا تو وہ اسے اس کے وزن کے برابر سونا دیتا تھا اور اسی طرح جو شخص کسی کتاب کا عربی میں ترجمہ کرتا تھا اسے بھی ترجمے کے وزن کے برابر سونا دیا جاتا تھا۔ بعض اہم کتابوں خاص طور سے یونانی فلسفے کی کتب کے ترجمے کے عوض تو مامون نے برابر وزن کے جواہرات بھی دیے تھے۔ اس کی فیاضی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ساری دنیا سے کتابوں اور عالموں کا سیلاب بغداد کا رخ کرنے لگا تھا۔ مامون صرف علم کا ہی نہیں بلکہ تحقیق کا بھی شوقین تھا اور اسے جب کسی انوکھی چیز کے بارے میں معلوم ہوتا تو وہ اس کو جاننے کی کوشش ضرور کرتا تھا۔ مامون کے عہد تک مصر نہ صرف مسلمانوں کے ماتحت آ گیا تھا بلکہ یہاں کی اکثر آبادی بھی اسلام قبول کر چکی تھی۔

مامون کو پتا چلا کہ مصر کے صحراؤں میں ایسی عظیم الشان تعمیرات ہیں جو قدیم دور میں کی گئی تھیں۔ اس نے مصر سے عالموں کو بلایا اور ان سے اہراموں کی پُراسراریت پر گفتگو کی۔ خاص طور سے خوفو کے اہرام کے بارے میں جس کے لیے مشہور تھا کہ اس اہرام میں انوکھی چیزیں اور ایک بہت بڑا خزانہ ہے اور اس خزانے تک جانے کا راستہ اہرام کے شمالی حصے میں ہے جسے آج تک دریافت نہیں کیا جا سکا ہے۔ مامون نے فیصلہ کیا کہ وہ اہرام کا راز معلوم کر کے رہے گا۔ وہ عالموں اور تعمیراتی ماہرین کی ایک فوج کے ہمراہ مصر پہنچا اور اس نے خوفو کے اہرام کے سامنے ڈیرے ڈال لیے۔ اس نے ماہرین کو حکم دیا کہ اہرام کا خفیہ شمالی دروازہ تلاش کیا جائے جو گزشتہ چار ہزار سال سے پوشیدہ ہے۔ ماہرین اس کام میں جت گئے۔ اس وقت بھی اہرام روغنی ٹائلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کا ذکر مامون کے ساتھ جانے والے مورخوں نے کیا ہے۔ ان ٹائلوں کو احتیاط سے اتار کر ماہرین نے اہرام کے نچلے حصے میں دروازے کی تلاش شروع کی لیکن انہیں ناکامی ہوئی۔ اس کے بعد تلاش کا دائرہ وسیع کر دیا گیا اور اسے اوپر تک لے گئے۔ لیکن کہیں کوئی دروازہ نہیں تھا یا تھا تو ماہرین اسے تلاش نہیں کر سکے تھے۔ جب دروازہ نہیں ملا تو مامون کی ہدایت پر اہرام کی چٹانیں توڑ کر اندر جانے کے لیے سرنگ بنانے کی کوشش شروع کی گئی۔ لیکن چونے سے بنا گرینائٹ کا پتھر اتنا سخت ثابت ہوا کہ اس پر فولادی اوزار بے اثر ثابت ہوئے۔

مگر مامون عزم کر کے آیا تھا کہ وہ اہرام کے اندر تک رسائی حاصل کر کے رہے گا، اس نے یہ بات واضح بھی کر دی تھی۔ اس کے عزم کو مدِنظر رکھ کر ماہرین نے یہ طریقہ نکالا کہ پتھروں کے قریب آگ جلا کر پتھروں کو دہکا دیا اور پھر ان پر سرکہ ڈال دیا۔ یک دم ٹھنڈے ہونے سے پتھر تڑخ گئے اور پھر ہتھوڑوں کی مدد سے ان کو توڑ دیا گیا۔ یہ طریقہ اگرچہ بہت مشکل لیکن قابلِ عمل تھا اور اس کی مدد سے سرنگ روزانہ ایک ایک فٹ کر کے آگے بڑھنے لگی۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ آگے صرف چٹانیں تھیں اور کہیں کوئی خلا نہیں تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ بس چٹانوں پر چٹانیں رکھ کر اس عجوبہ عمارت کو بنا دیا گیا تھا اور اس کے اندر سوائے عمومی راستے اور کمروں کے کچھ نہیں تھا۔ یہ کمرے شروع سے سب کے علم میں تھے اور لوگ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اندر تک جا کر ان کی سیر کر چکے تھے۔ خفیہ چمبرز جن کی کہانیاں تو مشہور تھیں لیکن آج تک کسی نے ان کو دیکھا نہیں تھا۔ مامون اسی خفیہ چمبر تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہاں سے قدیم علوم کے لازوال خزانے ملیں گے۔

وہ کئی مہینوں تک اہرام کے سامنے ڈیرے ڈالے رہا۔ ممکنہ طور پر اس کا کیمپ ابوالہول کے مجسمے کے عین اوپر تھا کیونکہ اس وقت یہ مجسمہ مٹی تلے بالکل دب کر رہ گیا تھا۔ بالآخر سرنگ ایک چمبر میں جا نکلی جسے آج کوئین چمبر کہا جاتا ہے لیکن یہ چمبر بالکل خالی تھا۔ مامون کے معماروں نے اس کی ایک دیوار کاٹ کر اس کے برابر میں واقع کنگ چمبر میں جانے کا راستہ نکال لیا مگر وہ بھی خالی تھا اور اس میں سوائے ایک ڈھکن سے عاری سنگی تابوت کے اور کچھ نہیں تھا۔ دیواروں پر قدیم مصری رسم الخط میں تحریریں تھیں۔ مامون کے ساتھ آئے عالم ان تحریروں کو پڑھنے سے قاصر تھے اس لیے وہ سخت مایوس ہوا اور واپس بغداد چلا گیا۔ اس کے آدمیوں نے جو توڑ پھوڑ کی تھی اور کھدائی کر کے ملبا نکالا تھا وہ ایسے ہی پڑا رہ گیا تھا۔

اس وقت تک مقامی مسلمان قدیم اوہام کے زیر اثر اہراموں کو جادوئی اثرات کا حامل سمجھتے تھے اور اس کے پاس جانے سے گریز کرتے تھے لیکن جب مامون آیا اور کئی مہینے تک اپنے لوگوں کے ساتھ یہاں رہا اور کسی کو کچھ نہیں ہوا تو مقامی لوگوں کی بھی ہمت ہوئی اور انہوں نے اہرام میں گھس کر لوٹ مار شروع کر دی۔ اسی دور میں اہرام پر لگی تمام روغنی ٹائلیں اتار لی گئیں اور ان سے شہر میں عالی شان محلات اور عمارتوں کی تعمیر ہوئی۔ قاہرہ کی مشہور مسجد سلطان حسن ان ہی روغنی پتھروں سے تعمیر ہوئی تھی۔ یوں خوفو اور شاید دوسرے اہرام بھی روغنی ٹائلوں سے محروم ہو کر ننگے ہو گئے اور صحرا کی خشک اور تیز ہوا نے ریت سے رگڑ رگڑ کر ان کو گھسنا شروع کر دیا۔ ایک اندازے کے مطابق خوفو کے اہرام کی چوٹی تقریباً تیس فٹ تک گھس چکی ہے اور اب گرینائٹ کے پتھروں میں شکست وریخت کے آثار بھی نمایاں نظر آنے لگے ہیں۔

جب اہراموں میں لوٹ مار کے لیے سوائے پتھروں کے اور کچھ نہیں بچا تو مقامی لوگوں نے یہاں کا رخ کرنا ترک کر دیا۔ اس کے بعد یہ ویران اہرام اوہام کا مرکز بن گئے اور ان کے بارے میں پُراسرار اور خوف ناک کہانیاں مشہور ہو گئیں۔ اسے قدیم فرعونوں کی روحوں کا مسکن قرار دے دیا گیا جو یہاں آنے والے انسانوں کو آفتوں اور پریشانیوں میں ڈال دیتی ہیں۔ خوفو کے اہرام کے بارے میں کہا گیا کہ اسے ایک بڑی جادوگرنی نے بنایا تھا اور اس کی روح آج تک وہاں ایک حسین برہنہ عورت کے روپ میں بھٹکتی ہے۔ اگر کوئی اسے دیکھ لے تو اس پر عاشق ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور تب یہ بدروح اس شخص کو اہرام کے اندر لے جاتی ہے اور اپنے اصل بھیانک روپ میں آ کر اس شخص کا گوشت کھا جاتی ہے۔

ان کہانیوں میں کوئی حقیقت نہیں لیکن لوگوں نے خوف سے اہراموں کے پاس سے گزرنا بھی چھوڑ دیا اور ان کا ذکر کرنے سے بھی گریز کرتے تھے۔ عباسی خلفا کے بعد آنے والے مسلم حکمرانوں کو علوم سے خاص دلچسپی نہیں رہی تھی اس لیے ان اہراموں کے بارے میں سنجیدہ سائنسی تحقیق کی کوشش نہیں کی گئی۔ اسپین کے راستے سائنسی علوم یورپ میں سرایت کر رہے تھے اور ان کا ابتدائی مرکز اٹلی، فرانس اور انگلینڈ تھے۔ اٹلی کے علاوہ باقی دو ممالک پر کلیسائی گرفت کمزور پڑ گئی تھی اس لیے یہاں سائنسی علوم کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا تھا۔ 1638ء میں ایک انگریز ماہر فلکیات اور تاریخ دان گریوس مصر آیا۔ اس وقت یہاں سلطنت عثمانیہ کا قبضہ تھا اور مصر کی حیثیت ایک غلہ پیدا کرنے والے ملک سے زیادہ نہیں تھی۔ گریوس اہرام مصر کا سن کر آیا تھا اور جب اس نے ان عظیم الشان تعمیرات کو دیکھا تو اسے خیال آیا کہ یہ عمارت یقیناً زمین کی پیمائش کے لیے بنائی گئی تھی۔ گریوس اس سرنگ کے راستے کوئن اور پھر کنگ چمبر تک گیا جو مامون نے کھدوائی تھی۔ کئی صدیوں بعد وہ اس جگہ جانے والا پہلا انسان تھا۔ سرنگ بعض مقامات سے صحرائی ریت اندر آنے سے بند ہو چکی تھی۔ وہ مقامی مددگاروں کی مدد سے کھدائی کراتا ہوا اندر پہنچا تھا۔ اس نے اور تو کچھ نہیں کیا لیکن ایک اہم کام سرانجام دیا کہ اس نے پہلی بار اہرام کی جدید پیمائش کی اور یہ پیمائشیں نوٹ کر کے انگلستان واپس چلا آیا۔ یہاں آ کر اس نے ایک کتاب ''دی ڈسکرپشن آف پیرامڈز گرافیا آف دی پیرامڈ آف ایجپٹ'' لکھی۔

اس وقت مغربی یورپ کے لوگ مصر اور اہرام کے بارے میں بس یہی جانتے تھے جو ان کو صلیبی لشکر کے ساتھ آنے اور بچ کر واپس جانے والوں نے بتایا تھا۔ اس کتاب نے اہلِ یورپ اور خاص طور سے انگلستان میں مصری اہراموں سے متعلق ایک نئی بحث کا دروازہ کھول دیا۔ یوں اہراموں کے بارے میں سائنسی تحقیق کا آغاز ہوا۔ اس وقت

ایک مسئلہ دنیا میں رائج مختلف پیمائشوں کا آپس میں درست موازنہ تھا۔ ان میں یورپی پیمائشیں اور خاص طور سے مشرقی پیمائشیں آپس میں بالکل میل نہیں کھا رہی تھیں اس لیے مغربی سائنس دانوں کو مشرقی علوم سیکھنے میں شدید دشواریوں کا سامنا تھا۔ نیوٹن اپنے مشہور زمانہ حرکت کے قوانین پر کام کر رہا تھا اور ساتھ ہی وہ زمین کی کشش پر کام جاری رکھے ہوئے تھا۔ اسے بھی وہی مشکلات تھیں۔

لیکن جب گریوس مصر کی پیمائشیں لے کر آیا اور خاص طور سے مصری پیمانہ اسٹیڈیم (607 فٹ کے برابر) نیوٹن کے علم میں آیا تو اسے اپنے حساب کتاب میں بہت آسانی ہو گئی اور کہتے ہیں کہ کششِ ثقل کا معما اس نے اسی پیمائش کی مدد سے حل کر لیا۔ مشرق میں رائج لمبائی کے پیمانے جن میں الحادی گز جو کہ بیس برطانوی انچ سے ذرا بڑا تھا، اسی طرح یہودی گز جو پچیس انچ کے مساوی تھا۔ (اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یورپی سائنس اور علوم میں مسلمانوں سے کتنا پیچھے تھے' یہ تمام مسائل مسلمان دوسری صدی ہجری تک حل کر چکے تھے اور ساری مسلم دنیا میں ناپ تول کے تقریباً ایک جیسے پیمانے اور ان کی سو فی صد درست شرح مبادلہ رائج تھی)

نیوٹن صحیح معنوں میں نہایت ذہین آدمی تھا، اس نے جب یہودی اور الحادی گز کی پیمائش کا موازنہ مصری اسٹیڈیم کے پیمانے سے کیا تو اسے محسوس ہوا کہ گریوس نے اہرام کی درست پیمائش نہیں کی تھی اور اس وجہ سے حساب کتاب میں غلطی آ رہی تھی لیکن وہ بھی اس غلطی کو درست نہیں کر پایا۔ کچھ عرصے بعد ایک فرانسیسی ماہر نے اس غلطی کو درست کیا اور نیوٹن نے اپنا حساب کتاب مکمل کر کے کششِ ثقل کے قوانین کو پیش کر دیا۔ نیوٹن کو بھی اہرامِ مصر سے دلچسپی تھی اور وہ اہرام کی ساخت پر غور بھی کرتا رہا تھا، اس نے اپنے خیالات کا اظہار ایک چھوٹے کتابچے میں کیا تھا۔

مامون کے بعد کسی اور مسلمان سائنس داں نے اہراموں کی طرف توجہ نہیں دی۔ حالانکہ خود مصر میں ابن الہیثم جیسا سائنس داں موجود تھا جس نے اس دور میں جب اسے تعمیر کرنے کے لیے ضروری وسائل نہیں تھے، اسوان ڈیم کا منصوبہ پیش کیا تھا اور ایک ہزار سال بعد یہ ڈیم ٹھیک اسی ڈیزائن سے بنا جو ابن الہیثم نے بنایا تھا۔ اگرچہ اس کی اصل وجہ شہرت روشنی اور آنکھ پر اس کی کی گئی تحقیق ہے۔ لیکن اس نے بھی اہراموں پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ اسوان ڈیم کا منصوبہ پیش کرنے والا تعمیرات کے فن سے کس طرح ناواقف ہو سکتا ہے اس کے باوجود یہ حیرت انگیز سچ ہے کہ اس نے یا کسی اور مسلم سائنس داں یا ماہر نے اہراموں کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔

اہرام مصر کو جاننے کی اگلی کوشش بھی یورپ کی طرف سے کی گئی تھی۔ اس بار یہ بیڑا نپولین بوناپارٹ نے اٹھایا۔ جب وہ تخت فرانس پر بیٹھا تو اس نے فرانسیسیوں کے انگریز مخالف جذبات سے فائدہ اٹھایا اور مصر کے راستے ہندوستان کی فتح کا ارادہ کیا۔ اس وقت انگریز ہندوستان میں اپنے پاؤں پھیلا رہے تھے اور فرانسیسی بھی اس سنہری چڑیا کو اپنے قبضے میں دیکھنا چاہتے تھے۔ فرانسیسی فوج پہلے ہی ہندوستان میں موجود تھی اور نپولین بذاتِ خود وہاں جا کر انگریزوں کو جڑ سے اکھاڑ دینا چاہتا تھا۔ وہ ایک بہت بڑا بیڑا لے کر مصر پہنچا اور وہاں حکومت کرنے والے عثمانی گورنر مراد بے کی فوج کو شکست دے کر قاہرہ پر قبضہ کر لیا۔ وہ خاص طور سے اہراموں پر تحقیق کے لیے فرانسیسی سائنس دانوں کی ایک فوج الگ سے لایا تھا اور اس نے آتے ہی ان کو کام پر لگا دیا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ اہرام واقعی کوئی روحانی حیثیت رکھتے ہیں؟

عقیدے کے لحاظ سے نپولین فری میسن تھا اور اسی وجہ سے وہ روحانیت اور ماورائیت پر بھرپور یقین رکھتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اہراموں میں ایسا اسرار ہے جو آنے والے زمانوں کے بارے میں اسے بتا سکتا ہے۔ ساتھ ہی وہ یہاں پرانی یادگار اشیا کی تلاش کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے ساتھ آئے ماہرین کو اہرام کے آس پاس کی زمین کی کھدائی کرنے کا حکم دیا اور خود اس نے اہرام کے راستے کی اندر سے صفائی کرائی تاکہ اس جگہ کو دیکھ سکے۔ اس نے سن رکھا تھا کہ یہ اہرام روحانی اثرات رکھتے ہیں اور وہ خود اس کا تجربہ کرنا چاہتا تھا۔

12 اگست 1799ء کے دن وہ اہرامِ مصر میں داخل ہوا۔ اس نے اس دوران میں کسی کو بھی اندر آنے سے منع کر دیا تھا حتیٰ کہ اس کے ذاتی محافظ جو اس کی خواب گاہ تک میں اسے اکیلا نہیں چھوڑتے تھے چاہے وہ اپنی بیوی یا محبوبہ کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو۔ اس نے انہیں بھی باہر رہنے کا حکم دیا تھا۔ اس روز نپولین نے اہرام میں کیا دیکھا اور اس پر کیا گزری تاریخ اس بارے میں خاموش ہے کیونکہ باہر آنے کے بعد نپولین نے اس بارے میں اپنے قریب ترین ساتھیوں سے بھی بات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کہا جاتا ہے اس روز نپولین نے اپنے مستقبل کے بارے میں جان لیا تھا کہ اب اسے کوئی کامیابی نہیں ملے گی، وہ جو کرنا چاہے گا اس میں ناکام رہے گا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ ہندوستان نہیں جا سکے گا (لارڈ ایڈمرل نیلسن کے بحری بیڑے نے نپولین کے بحری بیڑے کو اسکندریہ کے پاس کھلے سمندر میں عبرت ناک شکست دے کر اس کے ہندوستان جانے کا خواب چکنا چور کر دیا) نپولین کی روس کی مہم ناکام رہے گی (نپولین کی فوج روس کے برف زاروں میں پھنس کر تباہ ہو گئی) اسے اپنی زندگی کی سب سے اہم جنگ میں شکست ہو گی (انگریز جنرل نے واٹرلو میں نپولین کو شکست دے کر گرفتار کر لیا) وہ اپنے دشمن کی قید میں مرے گا (انگریزوں نے اسے سینٹ ہیلینا کے جزیرے میں قید کر دیا اور وہیں اس کا انتقال ہو گیا)

کہا جاتا ہے کہ نپولین اکیلا بہت دیر اہرام میں رہا تھا اور اس سب سے بڑے اہرام میں مقناطیسی توانائی بھی بہت زیادہ ہے جس نے نپولین کے دماغ پر اثر کیا اور اس کی خفیہ صلاحیتیں بیدار ہو گئی تھیں جس کی وجہ سے وہ مستقبل کے بارے میں جان گیا تھا۔ اس کا اظہار اس نے اپنی ڈائری میں بھی کیا تھا۔ پھر سینٹ ہیلینا میں اپنی وفات سے پہلے اس نے اپنے خدمت گار کو بتا دیا تھا کہ اب وہ زیادہ عرصے زندہ نہیں رہے گا۔ جب شکست کھا کر نپولین مصر سے رخصت ہوا تو اس کے ساتھ آئے ماہرین اور فرانسیسی سائنس دانوں کو انگریز فوج نے گرفتار کر لیا جو اب مصر پر قابض ہو گئی تھی۔ لیکن خوش قسمتی سے انگریزوں نے ان سے ان کی چیزیں اور تحقیقی کام نہیں چھینا تھا اور ان کو فرانس جانے کی اجازت دے دی تھی۔ ان کی واپسی پر نپولین نے ان ماہرین سے کہا کہ وہ اہراموں کے جامع مطالعے کا منصوبہ تیار کریں تو وہ ان کو مکمل مدد دے گا۔ اس پر تقریباً چار سو ماہرین، سائنس دانوں، مصوروں اور نقاشوں نے اپنی خدمات پیش کیں اور ان لوگوں نے اگلے پچیس برس تک کام کر کے اس وقت تک دریافت ہونے والی ہر یادگار چیز، عمارت اور جگہ کو نوٹس، تصاویر اور مجسموں کی صورت میں محفوظ کر لیا تھا۔ یہ اہرام مصر اور ان کی چیزوں کو محفوظ رکھنے کی پہلی سائنٹیفک کوشش تھی جس نے آنے والے لوگوں کے لیے تحقیق کی راہ متعین کر دی تھی۔

جب نپولین مصر میں تھا تو اس کے ایک بحری جہاز کے کپتان کو دریائے نیل کے ڈیلٹا میں ایک پتھر کی سل ملی۔ یہ مقام روزیٹا کہلاتا تھا، اس مناسبت سے یہ روزیٹا اسٹون کہلایا۔ لیکن جب بحری جنگ میں نپولین کی فوج کو شکست ہوئی تو یہ پتھر انگریزوں کے ہاتھ لگ گیا۔ انہوں نے اسے برٹش میوزیم کے شعبہ مصریات میں رکھ دیا لیکن وہ اس پتھر پر کندہ تصویری معمے کو حل کرنے میں ناکام رہے تھے۔

بالآخر ایک فرانسیسی جین فرینکوئیس شمپولین نے اس معمے کو پڑھ لیا۔ اس کے ایجاد کیے طریقے پر عمل کر کے زبان پڑھنے کے ماہرین اس قابل ہوئے کہ مصر کی قدیم تصویری زبان کو جان سکیں، یوں قدیم مخطوطات کے ترجموں کا آغاز ہوا۔ اگرچہ یہ کام بہت سست رو تھا کیونکہ مصری تصویری زبان میں کوئی کلیہ استعمال نہیں ہوا تھا بلکہ اسے لکھنے والوں نے اپنے اپنے طور پر تبدیلیاں بھی کی تھیں تاکہ اس تحریر کو ہر کوئی نہ پڑھ سکے۔ اس کے باوجود انیسویں صدی کے آخر تک تقریباً نوے فی صد مخطوطات کا ترجمہ کر لیا گیا تھا۔

اس آغاز نے یورپ کے دوسرے مہم جوؤں اور محققوں کو مصر کی طرف متوجہ کیا۔ ان میں اٹلی سے تعلق رکھنے والا ایک بحری جہاز کا مالک اور کپتان سی پی کیوگلیا بھی تھا۔ اسے اہراموں کے بارے میں زیادہ نہیں معلوم تھا لیکن ایک بار وہ مصر آیا اور چند دن کے لیے جہاز چھوڑ کر اہرام مصر کی سیر کو آیا تو ان عظیم الشان تعمیرات نے اسے سحر زدہ کر دیا تھا اور اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ باقی عمر ان کا اسرار کھوجنے میں گزارے گا۔ واپس جانے کے بجائے وہ غزہ میں رہ گیا اور اس نے اہرام کے اسراروں سے پردہ اٹھانے کی سعی شروع کر دی۔ یہ آسان اور کم خرچ کام نہیں تھا، جلد اس کی دولت ختم ہو گئی تو اس نے اٹلی جا کر اپنا بحری جہاز، جائداد اور ہر چیز فروخت کر دی مگر یہ دولت بھی زیادہ دن اس کا ساتھ نہ دے سکی اور اسے گزر اوقات کے لیے آنے والے سیاحوں کے گائیڈ کے فرائض انجام دینا پڑے تھے۔ وہ اتنا نادار ہو گیا تھا کہ اسے اہرام میں رہائش پذیر ہونا پڑا تھا کیونکہ اس کے پاس ہوٹل کے کمرے کا کرایہ ادا کرنے کی رقم بھی نہیں تھی۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی مالی حالت کس قدر خراب ہو چلی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ مالی مشکلات کے ہاتھوں کام بند کرنے پر مجبور ہوتا اس کی ملاقات ایک انگریز فوجی افسر ہاورڈ وائس سے ہوئی۔ اس اکھڑ مزاج شخص سے نجات پانے اور خود سے دور رکھنے کے لیے اس کے خاندان والوں نے اسے فوج میں بھرتی کرا دیا تھا اور وہ مصر چلا آیا تھا۔ یہاں اہراموں نے اس پر وہی سحر کیا جو کیوگلیا پر کیا تھا اور اس نے باقی عمر یہیں رہنے کا فیصلہ کیا لیکن مسئلہ وہی تھا، رقم اس کے پاس بھی نہیں تھی۔ ہاورڈ نے اپنے خاندان والوں کو خط لکھ کر ان سے مالی مدد طلب کی اور انہوں نے اسے مصر میں رو کے رکھنے کے لیے بڑی خوشی سے مدد بھیجنا شروع کر دی۔

ہاورڈ سمجھتا تھا کہ اہرام اندر سے ٹھوس ہیں لیکن جب اس نے اندر گھوم پھر کر دیکھا تو اسے بے شمار کمرے اور راہداریاں ملیں اور ان میں سے اکثر کمرے اور راہداریاں ایسی تھیں کہ ان کا مقصد سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ہاورڈ کو خیال آیا کہ یقیناً ان کمروں اور راہداریوں میں خفیہ راستے تھے جو اہرام کے اندر چھپے حصوں تک جاتے تھے اور ان کو کھوجنا اصل کام تھا۔ کیوگلیا سے مل اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس کام میں اس کا بہترین رفیق ہو سکتا تھا کیونکہ وہ ان اہراموں کے بارے میں اس سے کہیں زیادہ جانتا تھا۔ انہوں نے رقم ملتے ہی مقامی مزدوروں کی خدمات حاصل کیں پھر اہرام اور اس کے آس پاس کی کھدائی کا کام شروع کرا دیا۔ مگر جلد ان میں کھٹ پٹ ہوئی اور دل برداشتہ ہو کر کیوگلیا اپنا سارا کام ہاورڈ کے سپرد کر کے وہاں سے چلا گیا۔

اب ہاورڈ اکیلا ہی اس سارے منصوبے کا انچارج تھا۔ ایک طرف وہ زمین میں کھدائی کروا رہا تھا کیونکہ اس کے خیال میں اس سارے علاقے پر شاید سو فٹ سے زیادہ ریت پڑ چکی تھی اور سارے اہم آثار سوائے اہرام کے جو ساڑھے چار سو فٹ سے زیادہ بلند تھا اس ریت تلے دب چکے تھے۔ ہاورڈ نے درست طور پر اندازہ لگایا کہ بہت ساری اہم تعمیرات جو اہرام کے آس پاس بنی تھیں اب ریت تلے دبی ہیں، اس نے ان میں سے کئی ایک کے کھنڈر... دریافت بھی کر لیے لیکن اس کا سب سے اہم کارنامہ اہرام میں ایک خفیہ کمرے کی دریافت تھی۔ اگرچہ اس کمرے سے بھی کچھ نہیں ملا تھا لیکن اس کی سرخ پتھروں سے بنی دیواروں پر کچھ ایسی تصویریں بنی تھیں جو اس سے پہلے کسی نے نہیں دیکھی تھیں۔ ان تصویری تحریر میں فرعون شی اوپس کا نام بھی تھا۔ ایسی ہی تحریریں غزہ سے سیکڑوں میل دور ایک کان میں پائی گئیں جہاں سے ان اہراموں اور ملحقہ تعمیرات کے لیے بڑی بڑی سنگی سلیں تراشی گئی تھیں۔ شی اوپس ایک پرانے دور کا بادشاہ تھا اور وہ خوفو سے بہت پہلے گزرا تھا۔ اس لحاظ سے اہرام میں اس کا نام ہونے کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔ تو کیا شی اوپس نام کا کوئی اور فرعون بھی گزرا تھا جس نے بعد میں اس اہرام پر اپنا نام کندہ کرایا تھا لیکن تاریخ میں اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ یہ معما آج تک حل نہیں ہو سکا کہ اس کمرے کی دیوار پر شی اوپس کا نام کیوں اور کہاں سے آیا۔

اس کے علاوہ ہاورڈ نے ایک کام اور کیا۔ اس سے پہلے یہ بحث چلی آ رہی تھی کہ کیا اہرام کے اوپر ٹائلز لگائے گئے تھے اور بعد میں ان کو اتار لیا گیا تھا۔ ہاورڈ کے عرب کارکنوں نے اسے یہی بتایا تھا کہ ان اہراموں پر ٹائلز لگائے گئے تھے اور بعد میں انہیں اکھاڑ کر قاہرہ میں مختلف عمارات میں لگایا گیا تھا۔ ان عربوں نے ہاورڈ کو وہ ٹائلز دکھائے بھی تھے لیکن وہ اس بات کا حتمی ثبوت چاہتا تھا اور حتمی ثبوت اس طرح مل سکتا تھا کہ وہ اہرام کی بنیاد تک کھدائی کرے۔ اسے امید تھی کہ بنیاد میں دبی کچھ ٹائلیں باقی ہوں گی۔ اہرام کے چاروں طرف جمع ہونے والا ملبا کم نہیں تھا اور اس کی بلندی تیس چالیس فٹ تک تھی۔ اگر اہرام کی بنیاد مل جاتی تو اس کی درست پیمائش بھی ممکن ہو جاتی۔ ہاورڈ نے سیکڑوں مزدوروں کو اس کام پر لگا دیا اور انہوں نے کئی مہینے تک محنت کے بعد اہرام کی بنیادوں کے پاس سے ملبا بالکل صاف کر دیا۔

بالآخر ہاورڈ کو چند ایسی ٹائلز مل گئیں جو اصل میں لائم اسٹون کو پالش کر کے تیار کی گئی تھیں اور یہ بنیاد کے پاس ایک پتھر پر نہایت نفاست اور مہارت سے جڑی ہوئی تھیں۔ ہاورڈ ان کی نفاست دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے لکھا۔ ”ان ٹائلز کے جوڑ چاندی کے ورق سے بھی زیادہ باریک تھے اور ان کے کناروں کی درستگی کا معیار چشمے کے شیشے سے بھی زیادہ تھا۔ اہرام کے چاروں طرف ایک جیسے پتھروں سے تیار کی ہوئی چکنی اور ہموار روش تھی۔ میں نے کبھی اتنے بڑے پتھروں کو اتنے ہموار اور نفیس انداز میں جڑے نہیں دیکھا۔ یہ اتنے سیدھے تھے کہ ان پر انڈا رکھنے سے وہ لڑھکنے کے بجائے اپنی جگہ قائم رہتا تھا اور کئی ٹن وزنی پتھروں کے جوڑ بالکل غیر واضح تھے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ وہ کون سے ماہر کاری گر تھے جنہوں نے اتنی درستگی اور صفائی سے کام کیا۔ سب سے اہم بات ان کے پاس اوزار کون سے تھے کیونکہ مجھے اہرام اور اس کے آس پاس لوہے کے اوزاروں کا کوئی سراغ نہیں ملا ہے۔ قدیم مصری صرف کانسی کا استعمال جانتے تھے۔“

ہاورڈ نے ٹھیک پتا چلایا تھا۔ واقعی قدیم مصری لوہے کے استعمال سے ناآشنا تھے اور لوہے کو مصر میں رومنوں نے متعارف کرایا تھا۔ تب انہوں نے کون سے اوزار استعمال کر کے اتنے سخت اور بڑے پتھروں کو بالکل ٹھیک ٹھیک کاٹا اور پھر ان کو بالکل درست طریقے سے آپس میں جوڑا تھا؟

خوفو کے اہرام میں کوئی تیس لاکھ پتھر استعمال ہوئے ہیں جن کا وزن دو سے تیس ٹن تک تھا۔ ان تمام پتھروں کو سیکڑوں میل دور کانوں سے نکال کر دریائے نیل کے راستے غزہ تک لایا گیا تھا۔ ان کی ابتدائی تراش کا کام کانوں کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پاس ہی کرلیا گیا تھا اور حتمی تراش اور پالش اہرام کے پاس ہوئی جہاں پھر انہیں اپنی جگہ لگایا گیا۔

ہاورڈ نے بنیادیں صاف ہونے کے بعد جب اہرام کے چاروں ضلعوں کی پیمائش کی تو وہ حیران رہ گیا تھا۔ اس کے چاروں ضلعوں کی لمبائی بالکل ایک جیسی تھی اور اس میں انچ کے دسویں حصے جتنا فرق بھی نہیں تھا۔ آخر وہ کون سے ماہرین تھے جنہوں نے تیس لاکھ مختلف پتھروں کو جو مختلف وزن اور سائز کے تھے بالکل درستگی کے ساتھ اس طرح جوڑا کہ اہرام کی ساخت وجود میں آ گئی، پھر انہوں نے اس کے اندر راہداریوں اور کمروں کا اہتمام بھی کیا تھا۔ ان کے پاس آرکی ٹیکچر کی کیسی مہارت تھی کیونکہ موجودہ آرکی ٹیکٹ جن کو جدید کمپیوٹرائزڈ آلات کی مدد حاصل ہے، وہ بھی یہ کام آسانی سے نہیں کرسکتے۔ عام آدمی اس بات کو اتنی آسانی سے نہیں سمجھ سکے گا لیکن ایک آرکی ٹیکٹ اس بات کو آسانی سے سمجھ لے گا اور وہ وضاحت بھی کرسکتا ہے کہ اہرامِ مصر جتنے سادہ نظر آتے ہیں ان کی تعمیر اتنی ہی مشکل ہے۔

ہاورڈ نے جو ٹائلز نکالی تھیں، اس کا ارادہ انہیں مصری حکومت کی اجازت کے بعد انگلستان لے جانے کا تھا اور جب اس کی خبر مقامی آبادی کو ہوئی تو ان میں سے کچھ افراد نے رات کی تاریکی میں ان ٹائلوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تاکہ مصر کا یہ ورثہ یہاں سے باہر نہ جانے پائے۔ یوں ہاورڈ نے جو ثبوت حاصل کیا تھا وہ کسی حد تک ضائع ہو گیا، وہ دل برداشتہ ہو گیا اور اس نے کام ختم کرکے واپس جانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے اپنے تمام مزدوروں کو فارغ کر دیا اور ان کو اجرت کے ساتھ انعام بھی دے دیا پھر اس نے اپنا سارا تحریری کام سمیٹا اور اہراموں سے جو اشیا حاصل کی تھیں ان کے ساتھ انگلستان کا رخ کیا۔ وہاں اس نے اس کام کی مدد سے ایک کتاب ''آپریشن کیریڈ آن ایٹ پیرامڈ ایٹ غزہ ان 1837ء'' لکھی۔ اس وقت یہ اہراموں پر مغرب میں لکھی جانے والی سب سے مستند کتاب تھی۔

اگرچہ یہ نام خاصا طویل اور تقریباً وضاحت کرتا ہوا ہے کہ ہاورڈ نے مصر میں کیا کیا تھا لیکن اس زمانے میں تحقیقی کتب کے نام ایسے ہی رکھے جاتے تھے۔ ہاورڈ کچھ کما کر نہیں لایا تھا اور اس کی کتاب شائع کرنے کا خرچ بھی اس کے خاندان کو برداشت کرنا پڑا تھا۔ بہرحال اس وقت یہ اہرام کی پیمائشوں پر درست ترین کتاب تھی جس نے اہراموں پر تحقیق کرنے والوں کے لیے بڑی آسانی مہیا کی تھی۔ ہاورڈ کا ایک نائب بھی تھا جو پہلے ہی انگلستان واپس چلا گیا تھا اور اس نے بھی اس موضوع پر ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام ''دی پیرامڈ آف غزہ فرام ایکچوئل سروے اینڈ میورمنٹ آن دی اسپاٹ'' ہے۔ جیسا کہ بتایا کہ اس وقت لمبے اور تفصیلی نام رکھنے کا رواج تھا۔ بہرحال یہ ہاورڈ اور اس کا نائب تھا جن کی کتابوں میں درست ترین اعداد وشمار دستیاب ہوئے۔ اس کے بعد ماہرین اور سائنس دانوں نے مصر کے اہراموں پر کام تیز کیا اور جلد اس کے لیے سائنس کی ایک الگ شاخ یا پیرامڈالوجی وجود میں آئی۔

بیسویں صدی میں اہراموں پر تحقیق کے مغربی ماہرین کا ایک سیلاب مصر کی طرف بہنے لگا تھا۔ خاص طور سے جب انگریزوں نے مصر اور اس سے ملحقہ علاقوں پر مکمل قابو پالیا اور یہاں سے سلطنتِ عثمانیہ کا اثر ورسوخ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ یہ پہلی جنگِ عظیم اول سے پہلے کی بات ہے۔ اب مغربی ماہرین کو کوئی خدشہ نہیں تھا۔ ان کی حفاظت کے لیے یہاں انگریز فوج موجود تھی۔ ان ماہرین کی آمد کا اثر یہ ہوا کہ مصر آثاریات کے میدان میں تحقیق کے لیے دنیا کا سب سے بڑا ملک بن گیا تھا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے درمیان کوئی تیس ہزار مغربی ماہرین مصر آئے اور یہاں قدیم آثاروں پر تحقیق کی۔ کھدائی کا کام زور شور سے جاری ہوا اور قدیم آثار ملنے کی رفتار بھی تیز ہوئی تھی۔ لاکھوں مصری اس کاروبار سے منسلک ہو گئے تھے۔ لوگ خود بھی مشکوک جگہوں پر کھدائی کرتے تھے اور وہاں سے ملنے والی اشیا چوری چھپے مغربی سیاحوں اور ماہرین کے ہاتھ بھاری داموں بیچ دیتے تھے۔ اس سے تحقیق کے کام کو بہت نقصان ہوا اور ممکن ہے کوئی ایسی چیز دنیا کے سامنے آنے سے رہ گئی ہو جو ان اہراموں کی حقیقت پر روشنی ڈالتی ہو۔ اس دور کی سب سے اہم دریافت تو تخ آمون کے مقبرے، اس کی ممی اور خزانے کی دریافت تھی۔ یہ ان چند مقبروں میں سے ہے جو لٹیروں کے ہاتھ سے بچ گیا تھا ورنہ لیٹروں نے نہایت جتن سے بنائے گئے محفوظ ترین مقبرے بھی کھول کر انہیں فرعون کی ممی سمیت لوٹ لیا تھا۔ درحقیقت لیٹروں نے سوائے سنگی عمارات اور پتھروں کے کچھ نہیں چھوڑا۔ انہوں نے تاریخی مخطوطے تک چرا لیے۔ ان لٹیروں سے بچنے کے لیے فرعونِ مصر اپنے مقبرے خفیہ بناتے تھے اور ان کو اس طرح بند کراتے تھے کہ انہیں کھولنا آسان نہیں تھا، اس کے باوجود لٹیرے وہاں تک پہنچ جاتے تھے۔ ایک محتاط اندازے کے

مطابق مصر میں ایک ہزار فرعون اور ان کے طاقتور گورنر اور سردار گزرے ہیں جن کے پاس بے شمار دولت تھی اور انہوں نے اپنے مقبرے زندگی میں ہی بنوا لیے تھے اور مرنے کے بعد انہی میں دفن ہوئے لیکن مشکل سے ایک درجن ایسے مقبرے ملے ہیں جن میں لاش اور مرنے والے کا خزانہ موجود ہے۔

یہ تو وہ احوال ہے جو مصری اہراموں کے بارے میں ساری دنیا جانتی ہے کیونکہ یہ سب کے سامنے ہے۔ لیکن مصریات کے ماہرین کہتے ہیں ان اہراموں کا ایک پوشیدہ رخ بھی ہے جو اب تک دنیا والوں کی نظروں سے اوجھل ہے اور ماہرین بھی اس بارے میں صرف اندازوں کے گھوڑے دوڑا سکتے ہیں۔ اس سے مراد یقیناً اہراموں کے خفیہ کمرے اور ان تک رسائی کے خفیہ دروازے نہیں ہیں بلکہ وہ اسرار ہیں جو صدیوں سے اب تک لاینحل ہیں اور مستقبل میں بھی ان کے حل ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔

ہیروڈوٹس نے مصریوں کے طرزِ تعمیر پر روشنی ڈالی لیکن اس نے خوفو کے اہرام کو اپنی آنکھوں کے سامنے بنتے نہیں دیکھا تھا بلکہ اس کی آمد سے کم سے کم دو ہزار سال پہلے یہ اہرام تعمیر ہو چکا تھا۔ اس کی قدامت کا اندازہ چار ہزار چھ سو سال لگایا جاتا ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ بن تین ہزار پانچ سو عیسوی میں بھارت آنے والا ایک سیاح تاج محل کی تعمیر کے طریقوں پر مقامی لوگوں سے سن کر ہی روشنی ڈالے گا کہ یہ حسین عمارت جس میں فنی نزاکتیں یقیناً اہرامِ مصر سے کہیں زیادہ ہیں، کن طریقوں سے بنی۔ اس میں یقیناً غلطی کا احتمال کہیں زیادہ ہو گا۔ کیونکہ بدلتے وقت کے ساتھ حقائق بھی بدلتے ہیں اور کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں۔ وہ بھی اس طرح کہ سچ میں جھوٹ کی آمیزش اس قدر ہو جاتی ہے کہ سچ کو جھوٹ سے الگ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

تاریخ داں ہیروڈوٹس کو ایک جھوٹے کے طور پر زیادہ اہمیت دیتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اس نے اپنی کتاب ''تاریخ'' لکھتے ہوئے حقائق سے زیادہ اپنے تخیل کو استعمال کیا تھا اور اس نے جو سوچا اسے سچ سمجھ کر لکھ دیا۔ یعنی ہیروڈوٹس نے جو لکھا درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ خاص طور سے مصری اہراموں کے بارے میں اس کے بیان کردہ واقعات اور حقائق بہت زیادہ مشکوک ہیں۔ ایسا سمجھنے کی کئی ایک معقول وجوہات ہیں۔ یہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ خود مصری جھوٹ بولنے والی قوم تھی۔

آج کے ترقی یافتہ دور میں جب جھوٹ سچ معلوم کرنا زیادہ دشوار نہیں ہے پھر بھی سیاحوں کو مقامی گائیڈ جھوٹ آمیز داستانیں سناتے ہیں اور لوگ ان پر یقین بھی کرتے ہیں تو کیا مصری گائیڈوں نے ہیروڈوٹس کو سچ بتایا ہو گا؟ کیونکہ ہیروڈوٹس نے اہراموں کی تعمیر کے جو طریقے بیان کیے ہیں وہ دیکھنے میں تو بہت اچھے اور قابلِ عمل لگتے ہیں لیکن عملی طور پر ناممکن ہے۔

نوجوان ماہرین کی ایک ٹیم نے 2007ء میں مصر کا دورہ کیا، اس میں کل سات نوجوان تھے جن میں دو لڑکیاں بھی تھیں اور یہ ایک پروجیکٹ لے کر مصر آئے تھے۔ ان کا مقصد یہ جاننا تھا کہ کیا واقعی اس طریقے سے سکڑوں میل دور اسوان کی کانوں سے گرینائٹ کے پتھر نکال کر لانا اور انہیں ایک خاص بلندی تک پہنچانا ممکن ہے یا نہیں۔ اس پروجیکٹ کے تحت انہیں بالکل اسی طرح کام کرنا تھا جس طرح ہیروڈوٹس نے بتایا تھا اور ان کو وہی سامان اور اوزار استعمال کرنا تھے جو قدیم مصری استعمال کرتے تھے۔ ان کو چٹانیں حاصل کرنے کے لیے کانوں تک جانا تھا اور وہاں سے چٹانیں کاٹ کر اور نکال کر دریائے نیل اور اس سے ملحق نہروں کے ذریعے غزہ تک لانا تھا۔ خوفو کے اہرام میں کئی ٹن وزن والی چٹانیں عام ہیں لیکن اس میں بعض پتھر ایسے بھی ہیں جن کا انفرادی وزن نوے ٹن تک ہے۔

مگر پروجیکٹ کے تحت ان کو دو، چار، دس اور پندرہ ٹن وزنی پتھر غزہ تک پہنچانے تھے۔ یہ پروجیکٹ خاصا مہنگا تھا ایک محتاط اندازے کے مطابق اس پر ایک ملین ڈالرز کا خرچہ متوقع تھا۔ خوش قسمتی سے ان پروجیکٹ کو پیرامڈ کارپوریشن اور ایک ٹی وی چینل نے اسپانسر کرلیا۔ پروجیکٹ کا سربراہ مائس لوتھر ایک امریکی سائنس داں ایم کے جیسوپ سے متاثر تھا اور اس نے اس کے نظریات اور خیالات کا بہ غور مطالعہ کیا تھا۔ جیسوپ اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ پرانے اہرام اور اس سے ملتی جلتی تعمیرات جو ساری دنیا میں پائی جاتی ہیں اور ان میں بہت بڑے اور وزنی پتھروں کو استعمال کیا گیا ہے، ان کو مصریوں یا اس علاقے کے مقامی لوگوں نے تعمیر کیا ہے۔ مائس نے جیسوپ سے عقیدت کی بنا پر اس پروجیکٹ کو اس کے نام سے موسوم کیا تھا۔ خود مائس کا بھی یہی خیال تھا کہ اہرام ان مصریوں نے نہیں بنائے ہیں بلکہ ان کو بنانے والے لوگ کوئی اور تھے لیکن مائس نے اس کے باوجود اس پروجیکٹ کو پوری ایمان داری سے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا فیصلہ کیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تناسب کا وہ غیر معمولی خیال رکھا گیا ہے جو خوفو اور اس کے ساتھ کے دو اہراموں میں پایا جاتا ہے۔ دیگر اہراموں میں پتھر بھونڈے انداز میں تراشے گئے ہیں اور ان کے جوڑ بھی بہت نمایاں ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ جس قوم نے تقریباً پونے پانچ ہزار سال پہلے غزہ میں اتنے شاندار اہرام بنا لیے تھے وہ بعد میں ویسا اہرام بھی نہیں بنا سکی؟

مگر اس سے کیا یہ ثابت نہیں ہوتا ہے کہ خوفو اور اس کے ساتھ کے دو اہرام مصریوں نے نہیں بنائے تھے؟ ہاں یہ مان سکتے ہیں کہ اس کے بعد پورے مصر میں جا بہ جا کھمبیوں کی طرح اگ آنے والے اہرام مصریوں نے ضرور بنائے ہوں گے۔ شاہوں کی وادی جہاں کئی سو فرعون دفن ہیں وہاں پر مصری طرز تعمیر کے نادر نمونے دیکھنے میں آتے ہیں۔ جن میں آمون کا معبد نمایاں ہے۔ اسے ایک فراموش کردہ فرعونہ حاتشی پست نے تعمیر کرایا تھا اور اس کے بعد اقتدار میں آنے والے اس کے سوتیلے بیٹے نے ایک انتقامی کارروائی کے تحت پورے ملک کی تعمیرات سے اس کا نام مٹا کر ان پر اپنا نام کندہ کرا دیا تھا۔ اس کے علاوہ دریائے نیل کے ساتھ ساتھ اور صحراؤں میں آباد ہونے والے مصری شہروں میں بے شمار خوب صورت اور عالی شان عمارتیں بنائی گئی تھیں۔ لیکن ان کا مقصد بھی واضح تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ ان کو کس طرح تعمیر کیا گیا۔ اگرچہ ان عمارتوں میں بھی بہت وزنی سنگی بلاک استعمال کیے گئے تھے اور ان کی توجیح بھی موجود ہے۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ نہ تو غزہ کے اہراموں کی تعمیر کی کوئی معقول وجہ موجود ہے اور نہ ہی یہ بتایا گیا ہے کہ ان کو کس طرح تعمیر کیا گیا ہے۔

جہاں تک ہیرو ڈوٹس کا بتایا گیا طریقہ کار ہے تو وہ اس کے اپنے دماغ کی پیداوار لگتا ہے کیونکہ مصریوں نے کہیں بھی اسے بیان نہیں کیا ہے۔ ہاں بعض چھوٹے اہراموں پر ایسی مشکوک تصاویر موجود تھیں جن میں اہراموں کی تعمیر کی تکنیک کی عکاسی کی گئی تھی۔ لیکن ان کو بنانے کا انداز بتاتا ہے کہ قدیم مصریوں نے صرف اپنی اہمیت جتانے کے لیے کہ اہرام ان کے تعمیر کردہ ہیں یہ تصاویر بنائی تھیں۔ مزے کی بات ہے کہ یہ ہیرو ڈوٹس کے بعد بنائے گئے تھے اور ان میں تقریباً وہی خاکے بنائے ہیں جو ہیرو ڈوٹس نے اپنی کتاب میں دیے ہیں۔

مصری جانتے تھے کہ یہ اہرام انہوں نے نہیں بنائے ہیں، یہ ان کو ورثے میں ملے تھے۔ بعض محققین دعویٰ کرتے ہیں کہ غزہ کے اہرام اس سے کہیں زیادہ پرانے ہیں جتنی کہ ان کی قدامت بتائی جاتی ہے۔ یہ شاید دس ہزار سال یا اس سے بھی زیادہ پرانے ہیں۔ جب وسط افریقا سے انسان نے پھیلنا شروع کیا تو وہ دریائے نیل کے آغاز تک پہنچے اور پھر اس دریا کے ساتھ ساتھ ان کی آبادیاں پھیلتی ہوئی کوئی آٹھ ہزار سال پہلے مصر میں داخل ہوئیں۔ مصر شروع سے ایک صحرائی ملک رہا ہے اور وہاں سبزے یا کاشت کاری کا تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا اگر وہاں پر دریائے نیل نہ بہہ رہا ہوتا۔ اولین مصری تہذیب کے معمار یہی افریقی تھے۔ انہوں نے نیل کی وادی میں کاشت کاری شروع کی اور جلد یہاں باقاعدہ بستیاں بسا لیں۔ شہر آباد ہوئے تو پہلے علاقائی اور پھر مرکزی حکومتیں وجود میں آئیں۔ اولین فرعون خاندان آج سے کوئی پانچ ہزار دو سو سال پہلے مصر میں اقتدار میں آیا اور انہوں نے شہروں کی تعمیر شروع کی۔ لیکن ظاہر ہے وہ ابھی ترقی پذیر تھے اور ان کے لیے فوری طور پر اہرام جیسی بڑی اور اعلیٰ تعمیر کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس صورت میں متمدن ہونے کے صرف چھ سو سال بعد مصریوں نے غزہ کے اہرام کس طرح تعمیر کر لیے تھے؟ اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے۔

ایک جرمن فلکیات دان فورشے ملر ہٹلر کے دور میں اس وقت مصر آیا جب یہاں کچھ عرصے کے لیے جرمن فوجوں کا قبضہ ہو گیا تھا اور اس نے پہلی بار اہراموں پر سائنٹیفک تحقیق کی تھی۔ اسے دورانِ طالب علمی اہراموں سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور اس نے سنا تھا کہ اہراموں پر کچھ ایسی اشکال بنی ہیں جو مصریوں کی فلکیات میں دلچسپی اور دسترس کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ مصر جا کر ان اشکال کو اپنی آنکھوں سے دیکھے لیکن مصر پر انگریزوں کا قبضہ تھا اور وہاں جرمنوں کا داخلہ منع تھا۔ بہرحال ایک مختصر وقت کے لیے فورشے کو موقع ملا اور وہ مصر آیا۔ اس نے غزہ کے اہراموں میں مذکورہ اشکال دیکھیں تو اسے مایوسی ہوئی کیونکہ مصریوں نے آسمان کا بہت سادہ سا نقشہ بنا دیا تھا اور اس میں مختلف ستاروں کو اپنی پوزیشن میں دکھایا گیا تھا۔ ایسا نقشہ تو ایک بچہ بھی رات کے وقت آسمان دیکھ کر بنا سکتا تھا اور شاید کسی مصری مصور نے اسے بہت بڑا کارنامہ سمجھتے ہوئے اہرام کی دیواروں پر بنایا تھا۔

فورشے نے اہراموں کی مزید سیر کی اور اس کی قسمت کہ اسے ایک ایسی حقیقت کا علم ہو گیا جس کا علم اس وقت کسی بھی ماہرِ مصریات کو نہیں تھا۔ اس نے غزہ کے تینوں اہراموں کا تفصیلی معائنہ کیا اور ایک ماہر مصری گائیڈ کے ہمراہ دن رات

جوش ملیح آبادی

خدا خدا کر کے نیند آئی تو خواب دیکھا کہ سامنے بہت بڑا میدان ہے جہاں خیمہ نصب کرنے کے لیے میخیں ٹھونکی جا رہی ہیں۔ کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ۔ اس کے بعد ایک دل ہا دل خیمہ نصب کر دیا گیا۔ خیمے کے اندر باہر بڑے بڑے گیس کے ہنڈے روشن کیے جا رہے ہیں۔ اس کے بعد دس پندرہ فراش آ گئے اور بڑی بڑی دریوں کو زور زور سے جھٹک کر بچھا رہے ہیں۔ دریوں کے جھٹکے جانے سے گرد اڑ رہی ہے۔ گرد سے مرچوں کی دھانس آ رہی ہے۔ ایک کپھوڑاڑھی کا فراش چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ ابے رمضیا! سالے زندہ ہے کہ مر گیا؟ ارے اگال دان لا اگال دان! اب کچھ لوگ خیمے میں داخل ہو رہے ہیں۔ ان کی ٹوپیاں، دو دو گز لمبی ہیں۔ ٹوپیوں پر مرغے کڑھے ہوئے ہیں۔ کچھ لوگوں کے سروں پر بڑے بڑے کالے پگڑے ہیں۔ پگڑوں پر بڑے بڑے آ گیا بیتال بیٹھے تاش کھیل رہے ہیں۔ ان کے جسموں پر چیتے کی کھال منڈھی ہوئی ہے۔ جوتوں کی ڈوریوں میں مگرمچھ بندھے ہوئے ہیں۔ ان کی جیبوں سے بار بار بندر جھانک رہے ہیں۔ بندروں کی گردن میں ناگوں کے مفلر پڑے ہوئے ہیں اور جب وہ لوگ بیٹھ گئے قالینوں پر تو بیٹھتے ہی ان کی ناکیں دفعتاً چھ چھ فٹ لمبی ہو گئیں۔ اور ناکوں کی چونچوں پر ریچھ ناچنے لگے۔ اوہو، ایک مشعلچی بڑھا چلا آ رہا ہے۔ اس کی ٹھڈی پر لنگور کی دم جیسی پتلی ڈاڑھی ہے اور اس کے پیچھے پیچھے ایک پورا طائفہ چلا آ رہا ہے، بڑے زبردست ہنگامے کے ساتھ۔ طائفہ خیمے کے بیچوں بیچ آ کر بیٹھ گیا۔ حاضرین حقے پینے اور سازندے ساز ملانے لگے۔ سازوں کے ملانے سے دو خونخوار بلیوں کے لڑنے کی آوازیں آنے لگیں اور حقوں کے کڑاکے ایک دوسرے کو فحش گالیاں دینے میں سرگرم ہو گئے۔ گانے والی سامنے آئی۔ اس کا منہ گھوس کا سا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں کھڑاویں بندھی ہوئی ہیں۔ سارنگیا تانت کی طرح پتلا اور تاڑ کی طرح لمبا ہے۔ طبلچی اس قدر موٹا ہے کہ پندرہ گز زمین گھیرے بیٹھا ہے اور وہ اپنے سونڈوں کے سے ہاتھوں سے دھما دھم طبلہ بجا رہا ہے۔ اس کے طبلے کی تھاپ سے گیس کے ہنڈے پھٹتے جا رہے ہیں۔ گھوس کی شکل والی مغنیہ گا نہیں رہی، چیخ رہی ہے اور اس کے منہ سے موٹے موٹے کوے نکل نکل کر کائیں کائیں کر رہے ہیں۔ اتنے میں یہ دیکھا کہ مشکل سے دو بالشت کا ایک بونا گل مچھے رکھے مٹکتا چلا آ رہا ہے۔ اس کے گلے میں ایک بڑی سی دیگ لٹکی ہوئی ہے اور وہ لوہے کے ایک ٹکڑے سے اس دیگ کو ٹن ٹن ٹن بجا کر تال دے رہا ہے۔ اتنے میں دیکھتا ہوں کہ اس دیگ سے ایک مرہٹہ کود پڑا اور جھانجیں بجانے لگا اور جھانجیں اس زور سے بجنے لگیں کہ مجھ بدبخت کی آنکھ کھل گئی۔ دیکھا گھڑی تین بجا رہی ہے۔

(یادوں کی برات سے اقتباس)

وہاں رہا تھا۔ اسے اہراموں کو دیکھنے کا اتنا شوق تھا کہ وہ چوبیس میں سے بہ مشکل چار گھنٹے سوتا تھا اور اس کا باقی وقت ان اہراموں میں گھومتے پھرتے گزرتا تھا۔ یہی نہیں وہ اہرام میں موجود کمرے اور راہداریاں دیکھتا تھا بلکہ وہ ان کی دیواروں اور چھتوں کا معائنہ بھی کرتا تھا۔ ایک دن وہ اہرام میں موجود سب سے اوپر واقع کنگ چیمبر کی چھت کا معائنہ کر رہا تھا کہ اسے اس میں ایک باریک سوراخ نظر آیا۔ یہ سوراخ اتنا باریک تھا کہ نیچے کھڑے ہو کر گہرے رنگ کی چھت میں نظر بھی نہیں آتا تھا اور مزے کی بات تھی کہ سوراخ اہرام کی چھت کے پاس نکل رہا تھا۔ ترچھا ہونے کی وجہ سے یہ بند نہیں ہوا تھا۔

اس وقت فورشے کو یہ سوراخ خاص نہیں لگا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس سوراخ سے دن میں کسی وقت سورج کی روشنی کچھ دیر کے لیے اندر آتی ہو گی لیکن جب اس نے اہرام کے باہر اس سوراخ کا دوسرا رخ تلاش کیا تو وہ سورج کے زاویے سے خاصا ہٹا ہوا پایا گیا اور سورج کی روشنی دن یا سال کے کسی بھی حصے میں اس سوراخ سے گزر کر کنگ چیمبر تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ پھر اس نے غزہ کے باقی اہراموں کا معائنہ کیا تو اس نے ان کے بھی سب سے اوپر والے کمرے میں ایسے ہی سوراخ پائے جو اہرام کے اوپر نکل رہے تھے۔ یہ سوراخ بند ہو گئے تھے لیکن فورشے نے انہیں فولادی سلاخوں کی مدد سے کھول لیا۔ پھر اس نے تینوں سوراخوں کا موازنہ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ تینوں سوراخ ایک ہی زاویے پر کھلتے ہوں گے لیکن اسے ان کے زاویوں میں معمولی سا فرق

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ملا تھا۔ اس وقت وہ نہیں جان سکا تھا کہ یہ سوراخ کیوں بنائے گئے تھے اور یہ تو طے تھا کہ انہیں اہرام کی تعمیر کے دوران ہی بنایا گیا تھا۔

کچھ ہی عرصے میں مصر جرمنوں سے آزاد کرا لیا گیا تھا اور جرمن ماہرین کو بھی وہاں سے جانا پڑا تھا۔ ان میں فورشے بھی شامل تھا۔ جنگ کے بعد اس نے امریکا کا رخ کیا اور وہاں کی شہریت حاصل کر لی۔ اس دوران میں اس نے مصر اور اہراموں کے بارے میں مطالعہ جاری رکھا تھا، اس بارے میں جو بھی نئی تحقیق سامنے آتی تھی فورشے اسے لازمی دیکھتا تھا۔ ان ہی دنوں اس نے ایک ماہر تحریر کی لکھی کتاب دیکھی جس میں اس نے مصریوں کی فلکیات سے دلچسپی کا احوال لکھا تھا اور اس نے ایک جگہ تحریر کیا تھا۔

''مصریوں نے کسی بڑی عمارت کی تعمیر کے سن کو ظاہر کرنے کا ایک بڑا دلچسپ طریقہ ایجاد کیا ہے جو کسی بھی سن یا کلینڈر سے مطابقت کر سکتا ہے۔ وہ عمارت مکمل ہونے والے سال میں اس کے اوپری حصے میں ایک طویل سوراخ بناتے ہیں جس سے قطبی تارہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ سوراخ اتنا طویل ہوتا ہے کہ اس سے قطبی تارہ اگلے سال نظر نہیں آتا ہے اور پھر ہر سال وہ ہٹتا جاتا ہے۔ اس ہٹاؤ کی مدد سے فلکیات کا کوئی ماہر آسانی سے بتا سکتا ہے کہ مذکورہ عمارت کب تیار ہوئی۔''

فورشے یہ تحریر پڑھ کر اچھل پڑا تھا۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ اہراموں کے اوپری حصوں میں بنے سوراخوں کا کیا مقصد تھا۔ اس نے دوبارہ سے مصر کا قصد کیا اور اس بار وہ فلکی پیمائش کے جدید آلات بھی ساتھ لے کر گیا تھا۔ اس نے اہراموں میں موجود سوراخوں سے نظر آنے والے آسمان کا قطبی تارے سے فاصلہ ناپا اور حساب لگایا کہ قطبی تارہ کتنے سال پہلے اس سوراخ کی سیدھ میں ہوگا۔ جو جواب آیا وہ حیران ہی نہیں پریشان کرنے والا بھی تھا۔ فورشے کے حساب کے مطابق قطبی تارہ آج سے کوئی پندرہ ہزار سال پہلے اس سوراخ کی سیدھ میں تھا۔ تو کیا خوفو کے نام سے موسوم کیا جانے والا عظیم الشان اہرام اس کے دور سے کوئی ساڑھے دس ہزار سال پہلے بن چکا تھا۔ یہ بات قطعی ناقابلِ یقین تھی۔ پھر فورشے نے باقی دو اہراموں کے سوراخوں کی سیدھ اور قطبی تارے کے فرق کی پیمائش کی تو وہ بھی تقریباً اتنے پرانے نکلے تھے۔ یہ چودہ ہزار آٹھ سو اور ساڑھے چودہ ہزار سال پہلے بنے تھے۔ یعنی تینوں اہرام یکے بعد دیگرے بنائے گئے تھے۔ لازمی بات ہے ان کے بنانے والے بھی ایک ہی نسل کے لوگ تھے اور انہوں نے یکساں تعمیراتی تکنیک استعمال کی تھی۔

اپنے تجربات کو فورشے نے ایک مقالے کی صورت میں پیش کیا، اس نے کہا۔ ''اگر یہ بات درست ہے جیسا کہ میرے تجربات سے ثابت ہے کہ مصری اپنی بڑی تعمیرات کے سنِ تکمیل کا حساب اس طرح سے بیان کرتے تھے اور ان کی دوسری تعمیرات میں موجود تکمیلی سالوں کے سوراخوں سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ تکنیک درست تھی۔ مثال کے طور پر کنگ ویلی میں ایک چھوٹے معبد میں موجود سوراخ بتاتا ہے کہ یہ عمارت آج سے تین ہزار سال پہلے بنائی گئی تھی اور اس کا درست تکمیلی سال بھی یہی ہے۔ تو پھر یہ بھی ماننا ہوگا کہ خوفو اور اس کے ساتھ کے باقی دو اہرام اصل میں کم سے کم پندرہ ہزار سال پہلے کے بنے ہیں۔ ہم یہ بات وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ مصر میں آباد ہونے والے اولین لوگ ان کے خالق نہیں تھے۔ یہ اہرام ان سے بھی پہلے کسی اور قوم نے بنائے تھے۔''

سوال یہ ہے کہ جب مصری پانچ ہزار سال پہلے وادیٔ نیل میں منظم ہوئے اور انہوں نے ایک تہذیب کی بنیاد رکھی تو ان سے دس ہزار سال پہلے یہ اہرام کس نے بنائے؟''

فورشے فلکیات کا ماہر تھا، تاریخ اور انسانی تہذیب کے بارے میں اس کی معلومات محدود تھیں اس لیے وہ نہیں جان سکا کہ اہرام مصر اصل میں کن لوگوں نے تیار کیے تھے۔ لیکن فورشے کے ایک ہم سر اور ہم عصر ڈاکٹر ایم جیسوپ نے اس سلسلے میں بیش قدر کام کیا۔ اگرچہ وہ بھی ایک ماہر فلکیات تھا اور اس نے بیسویں صدی کے ابتدائی نصف میں فلکیاتی مشاہدے کے لیے بہت کام کیا تھا۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا اور اس نے ڈریک یونیورسٹی اور مشی گن یونیورسٹی سے فلکیات کی تعلیم حاصل کی تھی اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی تھی۔ انہی یونیورسٹیوں میں اس نے کچھ عرصے تدریس بھی کی تھی۔ پھر وہ یونیورسٹی کے ایک پروجیکٹ پر جنوبی افریقا چلا گیا جہاں اس نے ایک جدید انعکاسی دوربین تیار کر کے نصب کرائی اور اس دوربین کی مدد سے اس نے آسمان کے ان حصوں کا مشاہدہ کیا جو شمالی کُرے سے نظر نہیں آتے ہیں اور اس نے بے شمار نئے ستارے دریافت کیے جن میں سے اکثر جوڑے کی صورت میں تھے۔ ان ہی مشاہدوں کے دوران اسے ایسی مخلوق سے دلچسپی پیدا ہوئی جو غیر ارضی تھی۔ دوسرے لفظوں میں اسے خلائی مخلوق کے وجود کا یقین ہو گیا تھا۔

پھر جیسوپ کو اپنے کام کے دوران دنیا کے مختلف حصوں

میں جانے اور وہاں قدیم زمانے کی تعمیرات دیکھنے کا موقع ملا۔ دوسری جنگِ عظیم میں جب جاپان نے مشرقِ بعید پر قبضہ کر لیا اور ربر کی رسد رک گئی تو امریکی حکومت نے جیسوپ کو ایک ٹیم کے ہمراہ برازیل بھیجا کہ وہ وہاں پر ربر کے پودے لگا کر ربر کی رسد بحال کرنے کی کوشش کرے کیونکہ جنگی مقاصد کے لیے یہ لازمی خام مال تھا۔ جیسوپ نے اپنا کام تو کیا لیکن ساتھ ہی اس نے پورے جنوبی امریکا کی خوب سیر کی اور برازیل، ارجنٹائن، چلی، پیراگوئے، بولیویا، ایکوے ڈور اور یوراگوئے کے دور دراز علاقوں کو دیکھا۔ یہاں اسے بے شمار قدیم زمانے کی ایسی تعمیرات نظر آئیں جن میں حیرت ناک حد تک وزنی پتھر کی چٹانیں استعمال کی گئی تھیں۔ اس نے ان آثاروں کے جو مشاہدے کیے اور ان سے جو نتائج اخذ کیے ان کو اپنی کتاب ''دی کیس فار یو ایف اوز'' میں بیان کر دیا اس کتاب کا شائع ہونا تھا کہ ڈاکٹر جیسوپ کے خلاف مخالفت کا ایک طوفان کھڑا ہو گیا تھا۔

پہلے UFO کی وضاحت کر دی جائے۔ اس کا مطلب ہے ان آئیڈینٹی فائڈ فورین اوبجیکٹ۔ یعنی باہر سے آنے والی نامعلوم اشیا۔ یہ اصطلاح خاص طور سے خلائی جہازوں اور اڑن طشتریوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ اس قسم کے خلائی جہاز اور اڑن طشتریاں تقریباً ساری دنیا میں دیکھی جاتی ہیں اور حالیہ ہی نہیں بلکہ زمانہ قدیم کی دستاویزات سے پتا چلتا ہے کہ اُس وقت بھی لوگ آسمان پر اڑنے والی ان عجیب و غریب چیزوں کے وجود سے آگاہ تھے۔ اسی طرح حالیہ دنوں میں اس قسم کی چیزوں کو دیکھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ رہی ہے اور یہ دنیا کے بیشتر ملکوں میں نظر آئی ہیں۔ لیکن سائنس دانوں اور ماہرین کی بہت بڑی تعداد ان کو جھوٹ اور دھوکا ہی قرار دیتی ہے یعنی ان کا کہنا ہے کہ دنیا سے باہر اگر کسی مخلوق کا وجود پایا بھی جاتا ہے تب بھی وہ زمین تک نہیں آئی ہے۔

اس سے پہلے بھی بے شمار لوگوں نے یو ایف او اور غیر ارضی مخلوق پر تحقیق کی اور انہوں نے شواہد کے ساتھ اس بارے میں بیان بھی کیا لیکن ان کی بدقسمتی کہ ماہر نہ ہونے کی وجہ سے ان کی تحقیقات کو غیر تسلی بخش اور غلط فہمی قرار دے کر رد کر دیا گیا لیکن ڈاکٹر جیسوپ جو ایک اعلیٰ درجے کا سائنس دان اور ماہر فلکیات تھا، اسے کام کرنے کا طریقہ آتا تھا اور وہ دلائل اور حقائق کے ساتھ بات کر سکتا تھا۔ یہ بات اس نے اپنی کتاب میں واضح بھی کر دی تھی۔ یہ ان حلقوں کے لیے خطرے کی گھنٹی تھی جو غیر ارضی مخلوق کے انکاری تھے اور ان میں سب سے نمایاں امریکی حکومت تھی۔ اس سے تعلق رکھنے والے تمام ماہرین اور سائنس داں اس بات کی شدومد سے مخالفت کرتے تھے۔

ڈاکٹر جیسوپ سے ان کا ٹکراؤ برمودہ ٹرائی اینگل میں کثرت سے نظر آنے والے ایسے طیاروں پر ہوا جو کسی صورت بھی زمینی نہیں لگتے تھے۔ یہ بہت بڑے اور بہت ہی تیز رفتار تھے۔ بعض واقعات میں ان کی رفتار آواز سے چودہ گنا زیادہ ریکارڈ کی گئی تھی۔ اگرچہ ڈاکٹر جیسوپ نے براہِ راست یو ایف او کی حمایت نہیں کی تھی بلکہ اس کا کہنا تھا کہ اس کی تحقیق کے مطابق قدیم دور کی ایسی سنگی عمارتیں جن میں ٹنوں وزنی پتھر استعمال کیے گئے ہیں۔ اس وقت انسان معمولی عمارت بنانے کے قابل نہیں تھا تو اس نے تقریباً ساری دنیا میں ایک ہی وقت میں اتنی بڑی سنگی عمارتیں کس طرح بنا لیں جن کو آج کا ترقی یافتہ انسان بنانے سے بھی قاصر ہے۔ جب کہ اس کے پاس جدید ترین آلات اور ٹیکنالوجی دستیاب ہے جس سے وہ حسبِ ضرورت نئے آلات اور اوزار بھی بنا سکتا ہے اس کے باوجود وہ اہرام مصر یا اس جیسی دوسری عمارات نہیں بنا سکتا ہے۔

ڈاکٹر نے اہرام مصر کا بھی دورہ نہیں کیا لیکن اس کے پاس اہرام مصر اور خاص طور سے غزہ کے اہراموں کے بارے میں تمام معلومات تھیں۔ اس نے ان معلومات کو اچھی طرح پرکھا ہوا تھا اور اسے یقین تھا کہ اہرام مصر بھی اسی زمانے میں بنے تھے جب جنوبی امریکا میں اہرام یا دوسری طرز کی عظیم الشان تعمیرات جاری تھیں۔ صرف جنوبی امریکا ہی نہیں بلکہ ایسی عظیم الشان عمارات ہمیں مشرقِ وسطیٰ، ایران، عراق، چین اور وسط ایشیا میں بھی نظر آتی ہیں۔ ان سب میں ایک چیز مشترک ہے کہ ان میں بہت وزنی یک سنگی چٹانوں کا استعمال ہے۔ ان چٹانوں کا وزن کہیں تو سیکڑوں ٹن تک چلا جاتا ہے جن کو کسی بھی زمینی ذریعے سے اٹھانا اور مخصوص بلندی تک لے جانا تقریباً ناممکن ہے۔

ڈاکٹر جیسوپ سے پہلے لوگ ان کے بارے میں بہت کم جانتے تھے اور اس وقت میڈیا بھی اتنا ترقی یافتہ نہیں تھا کہ ہر خبر عام لوگوں تک پہنچ جائے اور نہ لوگوں کا شعور اتنا تیز تھا کہ ہر غیر معمولی بات کو فوراً سمجھ جائیں۔ یہی وجہ تھی کہ ماہرین کو بھی ان غیر معمولی عمارتوں کی تعمیر کا صحیح ادراک نہیں تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ یہ ایسے بادشاہوں کی یادگاریں ہیں جو انسانوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے ظالمانہ بیگار لینے کے ماہر تھے۔ حالانکہ انسانوں سے یہ کام لینا ممکن ہی نہیں تھا۔ اصل میں عصر حاضر کے مسائل سے نمٹنے والے ان ماہرین نے ان چیزوں کو گہرائی میں جا کر سوچا ہی نہیں تھا۔

اس لحاظ سے جیسوپ پہلا شخص تھا جس نے ان ماورائی سمجھی جانے والی چیزوں کا سائنسی تجزیہ کیا اور دلیل کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس وقت اسے امید تھی کہ اس کے سائنس دان ساتھی اور ماہرین اس کا ساتھ دیں گے کیونکہ سائنس تو نام ہی انجان چیزوں کو تحقیق کر کے جاننے کا ہے۔ مگر ان کا ردِعمل حد درجے مخالفانہ تھا۔ انہوں نے بنا کسی دلیل اور بحث کے جیسوپ کی بات کو رد کر دیا۔ ان کا رویہ سترہویں صدی کے کلیسا سے مختلف نہیں تھا جو سائنس اور علم کی ہر بات کو بنا کسی دلیل کے رد کر رہے تھے اور اس کے نتیجے میں... بالآخر کلیسا معاشرے سے الگ ہو گیا۔ مگر اب وہی رویہ پڑھے لکھے لوگ اپنا رہے تھے۔ جیسوپ کو دکھ اور حیرت ہوئی تھی لیکن اس نے اپنی راہ نہیں چھوڑی اور پوری قوت سے اس پر ڈٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنا کیریئر چھوڑ دیا اور خود کو ان تعمیرات اور غیر ارضی مخلوق پر تحقیق کے لیے وقف کر دیا۔

دوسری جنگِ عظیم کے فوراً بعد دنیا تیزی سے تبدیل ہو رہی تھی۔ انسانی شعور میں اضافہ ہو رہا تھا اور لوگوں کی سائنس سے دلچسپی بڑھ رہی تھی۔ دوسری جنگِ عظیم سے پہلے یہ تصور تھا کہ سائنس صرف چند لوگوں کے لیے مخصوص ہے جو اسے جانتے ہیں لیکن اس کے بعد لوگوں کا ذہن بہت تیزی سے بدلا اور محسوس کیا جانے لگا کہ سائنس میں ایک عام آدمی کا حصہ بھی ہے۔ اس بارے میں رسائل اور کتب شائع ہونے لگیں۔ ڈاکٹر جیسوپ کی کتاب ایک عام آدمی نے بھی پڑھی اور اسے ڈاکٹر نے لکھا بھی اس انداز میں تھا کہ عام آدمی اسے سمجھ سکے اس لیے عام حلقوں میں اس کی پذیرائی ہوئی تھی اور پورے ملک سے ڈاکٹر جیسوپ کو خطوط اور سوالات ملنے شروع ہو گئے تھے۔ لوگ متجسس تھے۔ جیسوپ ان کے سوالات کے جواب دیتا تھا۔ پھر اس نے اس بارے میں عوامی بیداری پیدا کرنے کے لیے کالجز اور یونیورسٹیز کے دورے شروع کر دیے جہاں وہ لیکچر دیتا تھا۔ ان لیکچرز سے جیسوپ اور اس کے نظریے کی مقبولیت میں اضافہ ہوا تھا۔

اس پر امریکی حکومت نے یونیورسٹیز اور کالجز پر دباؤ ڈال کر اسے ان لیکچرز سے روک دیا اور مجبوراً اس نے نجی طور پر لیکچر دینا شروع کر دیے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ حکومت ایک خالصتاً علمی اور تحقیقی کام کی اتنی مخالفت کیوں کر رہی تھی کہ کالجز اور یونیورسٹیز کے دورے سے روک دیا۔ سرکاری مخالفت کے باوجود اس نے اپنا کام جاری رکھا اور مختلف شہروں میں جہاں سے اسے دعوت ملتی تھی ہال کرائے پر لے کر لیکچر دینے کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہ ان لیکچرز سے کچھ کما بھی نہیں رہا تھا کیونکہ اس کا مقصد دولت کمانا نہیں تھا۔ بعض اوقات تو وہ اپنی جیب سے خرچ کر کے لیکچر دینے جاتا تھا۔ اس نے ان لیکچرز کے دوران بعض اوقات جو جوابات دیے ان کے کچھ حصے یہاں پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ قارئین کو اندازہ ہو کہ وہ لوگوں کو کیا بتانا چاہتا تھا۔

"آج سے ایک سے ڈھائی لاکھ سال پہلے تک دنیا میں ایک ہی تہذیب کی حکمرانی تھی۔ اس کا ثبوت وہ تقریباً ایک جیسی عمارات ہیں جو ساری دنیا میں ملتی ہیں اور جنہیں ہم اہرام کہتے ہیں۔ یہ دنیا کے تمام قابلِ ذکر مقامات پر موجود ہیں۔ لیکن مصر کو اس معاملے میں زیادہ شہرت حاصل ہو گئی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو مصر کا دنیا کے مصروف ترین تجارتی راستے پر واقع ہونا ہے اور دوسرے ماہرینِ یورپ بھی یہاں آسانی سے آ سکتے تھے۔ وہ آئے اور انہوں نے یہاں دل کھول کر تحقیقات کیں۔ میرے خیال میں اہرام مصر کے زیادہ مشہور ہونے کی ایک وجہ اس کا مسلم ملک ہونا بھی ہے۔ مسلمانوں کے عقائد میں اہرام مصر کی کوئی مذہبی حیثیت نہیں ہے اور نہ ہی مسلمان ان سے کوئی عقیدت رکھتے ہیں اس وجہ سے دوسرے لوگوں کے لیے یہاں تحقیق کرنا آسان ثابت ہوا اور ایسا لگا جیسے دنیا میں صرف مصر میں اہرام پائے جاتے ہیں۔

درحقیقت جتنے اہرام مصر میں پائے جاتے ہیں اس سے کہیں زیادہ جنوبی امریکا میں پائے جاتے ہیں۔ چین میں بھی ایسے عظیم الجثہ اہرام ہیں جن کے سامنے خوفو کا اہرام بھی کھلونا لگتا ہے۔ اس طرح وسط ایشیا اور عراق میں بھی اہرام نما عمارتیں پائی جاتی ہیں۔ اگر جنوبی امریکا کے اہرام دیکھے جائیں تو ان میں حیرت انگیز تنوع نظر آتا ہے۔ مصر کے سارے اہرام ایک جیسے ہیں لیکن جنوبی امریکا میں محراب دار اور سیڑھی نما ساخت رکھنے والے اہرام بھی ملتے ہیں۔ اس کے استوائی جنگلوں میں ایسے اسکائی اسکریپر نما اہرام بھی ہیں جو کئی سو فٹ اونچے ہیں لیکن ان کی بنیاد اتنی بڑی نہیں ہے۔

میرا خیال ہے اس پرانی تہذیب کے پاس ہوا میں اٹھنے اور بے انتہا وزن اٹھانے والی کوئی نہ کوئی مشین یا طریقہ تھا۔ کیونکہ جس قسم کی سنگی عمارات تعمیر ہوئیں اور ان کو جس مقام

پر بنایا گیا ہے وہ اس قسم کی کسی مشین کی مدد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ میں آپ کو ایک مثال دیتا ہوں۔ میں جنوبی امریکا کی ایک قدیم تہذیب "انکا" کے دور کا ایک شہر دیکھنے گیا۔ یہ شہر پیرو میں کوہ انڈیز کے سلسلے میں واقع ہے۔ میں جب کراکو نامی اس شہر کو دیکھنے پہنچا تو مجھے اس کے اوپر بہت بلندی پر ایک قلعہ نما عمارت نظر آئی۔ گائیڈ نے بتایا کہ یہ قلعہ سیکسا ہومان کہلاتا ہے اور جدید دنیا کے بہت کم لوگ اسے دیکھنے آئے ہیں۔ میں نے اس وقت انکا تہذیب کے بارے میں تمام جدید کتابیں اور آرٹیکلز پڑھ لیے تھے لیکن مجھے کہیں اس قلعے کا ذکر نہیں ملا تھا۔ میں انتہائی بلندی (تقریباً آٹھ ہزار فٹ) پر واقع اس قلعے نما عمارت کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ یہ بے انتہا وزنی پتھروں سے بنائی گئی تھی اور ان پتھروں کو ایک دوسرے پر جمانے کی تکنیک نے مجھے حیران کر دیا۔ یہ تکنیک بھاری غیر دھاتی اشیا کو آپس میں رگڑ کر ایک دوسرے پر درست زاویے سے جمانے کی تکنیک کہلاتی ہے۔ بے انتہا وزن خود زبردست رگڑ پیدا کر کے اشیا کو آپس میں بالکل درست طریقے سے جوڑ دیتا ہے۔ اس کی مثال یوں لیں کہ پتھر کی دو دس ٹن وزنی گول ڈسک نما چٹانیں ایک دوسرے پر رکھ کر ان کو آہستہ آہستہ آگے پیچھے حرکت دی جائے تو رفتہ رفتہ ان کے آپس میں رگڑ کھانے والے حصے بالکل ہموار ہو جائیں گے۔ نیچے والا پتھر کسی قدر پیالے نما شکل اختیار کر لے گا اور اوپر والا پتھر کسی قدر گولائی میں باہر نکل آئے گا اور یہ پیالے نما ساخت میں بالکل فٹ بیٹھے گا کیونکہ یہ ساخت اس کی اپنی رگڑ سے پیدا ہوئی ہو گی اور اس میں سطح اس قدر ہموار ہو گی کہ کسی بھی دوسرے طریقے سے اتنی ہموار سطح حاصل نہیں کی جا سکتی ہے۔ آج ہم بڑی خلائی دوربینوں کے ٹنوں وزنی عدسے اسی تکنیک سے رگڑ کر تیار کرتے ہیں۔ کیونکہ اس طرح بہترین عدسہ حاصل ہوتا ہے۔ میں ان قدیم عمارتوں میں اس تکنیک کو دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا کیونکہ یہ تکنیک سائنسی علوم میں بہترین مہارت کے بغیر حاصل نہیں کی جا سکتی ہے۔ اس سے بھی زیادہ حیران کن بات اتنی بلندی پر ان پتھروں کو لانا اور ان کو آپس میں رگڑ دے کر اس طرح سے فٹ کرنا کس طرح سے ممکن ہوا۔ قلعے کی ابتدائی سیڑھیاں اسی تکنیک سے بنائی گئی تھیں۔ پھر قلعے کے اندر اور خاص طور سے پہاڑی کے کونے والے بڑے پتھر بھی اسی طرح آپس میں جوڑے گئے تھے۔ ان میں سے بعض پتھر پندرہ فٹ لمبے، بارہ فٹ چوڑے اور بیس فٹ اونچے تھے۔ کیا آپ ان کے وزن کا اندازہ کر سکتے ہیں؟ یہ ڈھائی سو ٹن سے بھی زیادہ وزنی تھے۔ یہ تمام چٹانیں بے حد سخت سیاہ بسالٹ پتھر سے نکالی گئی تھیں اور اس پتھر کی چٹانیں کوئی چھ ہزار فٹ نیچے کی ڈھلانوں پر پائی جاتی ہیں۔ بسالٹ اتنا سخت پتھر ہوتا ہے کہ اسے آج کل تعمیراتی کاموں میں استعمال نہیں کیا جاتا ہے۔ اس کی کٹائی اور گھسائی بہت مشکل ہوتی ہے۔

آخر دھاتوں کے استعمال سے نابلد انکا قوم نے کس طرح ان پتھروں کو کاٹ کر... ان کو بلاک کی صورت دی؟ اس سے بھی زیادہ اہم بات کہ وہ کس طرح ڈھائی سو ٹن وزنی ان پتھروں کو چھ ہزار فٹ سے زیادہ بلندی پر لے کر آئے جب کہ اس علاقے میں سوائے پتلی پگ ڈنڈیوں کے اور آنے جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ آج بھی کوئی ایسی مشین نہیں ہے جو پہاڑ کی ناہموار ڈھلان پر ڈھائی سو ٹن وزنی پتھر کو کھینچ سکے۔ اگر یہ کہا جائے کہ انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے کسی نہ کسی طرح ان پتھروں کو اوپر تک پہنچا بھی دیا تب بھی ان کو قلعے میں ان کے مقام پر کس طرح رکھا گیا کہ یہ آپس میں بالکل فٹ بیٹھ گئے اور پھر ان کی رگڑائی کے لیے ان کو حرکت کس طرح دی گئی۔ کیونکہ پتھر فٹ کرنے والے مقام کے آس پاس اتنی جگہ نہیں تھی جہاں انسانوں کی بہت بڑی تعداد کھڑے ہو کر ان پتھروں کو حرکت دے سکے۔ اس تنگ قلعے میں ایسی کوئی گنجائش نہیں تھی اور اس سے باہر صرف خلا ہے جس میں کوئی قدم نہیں جما سکتا۔"

اس سوال کے جواب میں کہ ان پتھروں کو لکڑی کی بہت بڑی چرخیوں کی مدد سے لگایا گیا تھا۔ ڈاکٹر جیسوپ نے کہا بہ ظاہر اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا ہے۔ اتنے وزنی بلاک کو اٹھا کر اس کے مقام پر رکھنے والی چرخیوں کا سائز بھی لازمی طور پر بہت بڑا ہو گا اور قلعے میں ان کی جگہ نہیں بنتی ہے۔ فرض کر لیا جائے کہ اس وقت قلعے کی جگہ ایک میدان ہو گا اسی وقت چند پتھر اس تکنیک سے لگائے گئے ہوں گے لیکن اس کے بعد تو جگہ نہیں بچتی تھی پھر باقی پتھر کس طرح سے لگائے گئے اور خاص طور سے اوپر لگائے جانے والے ڈھائی سو ٹن وزنی بلاک تو بالکل سمجھ سے بالاتر ہیں۔ ان کو لگانے کے لیے نہ تو کوئی جگہ بچتی تھی اور نہ ہی کسی مشین کی گنجائش تھی۔ ان وزنی پتھروں کو پھیلی ہوئی قوت سے حرکت دینا اور ہٹانا ناممکن نہیں ہے بلکہ اس کے لیے قوت کو پتھر پر کسی ایک جگہ مرکوز کرنا لازمی تھا۔

پھر ان عظیم الجثہ پتھروں کو آپس میں اتنی نفاست اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صفائی سے جوڑا گیا ہے کہ ان کے درمیان کاغذ کا ورق بھی داخل نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے انکا تہذیب کی دوسری تعمیرات بھی دیکھی ہیں اور ان کو دیکھنے کے لیے زیادہ دور نہیں جانا پڑتا ہے، قلعے سے ذرا نیچے ہی کراکو کا شہر ہے۔ ان تعمیرات کے معیار اور صفائی کا سیکسا ہومان کے قلعے سے موازنہ کیا جائے تو بہت واضح فرق سامنے آتا ہے۔ ان معمولی درجے کے مکانوں کا طرزِ تعمیر معمولی سا ہے اس میں نہ تو وزنی پتھر استعمال کیے گئے ہیں اور نہ ہی ان کو بنانے میں صفائی ہے۔ صاف پتا چلتا ہے کہ دونوں کو بنانے والے لوگ اور ان کی تعمیراتی تکنیک بالکل مختلف ہے۔

اس سلسلے میں کسی کیمیائی توانائی کا استعمال بھی ممکن نہیں ہے کیونکہ یہ توانائی معمولی درجے کے وزن کو اٹھا سکتی ہے۔ اتنے غیر معمولی وزن کو اٹھانا آج کل کے بہترین ہائیڈرولک جیک کے لیے بھی آسان نہیں ہے۔ اب ایک ہی طریقہ رہ جاتا ہے کہ وزنی پتھروں کو ہوا میں اٹھا کر مطلوبہ مقام تک پہنچایا جائے اور ان کو وہاں نصب کر دیا جائے۔ آج کل وزنی چیزوں کی بلندی پر تنصیب کے لیے یہی تکنیک استعمال کی جاتی ہے۔ یعنی ہیلی کاپٹر کی مدد سے چیزوں کو مطلوبہ مقام تک پہنچایا جاتا ہے لیکن اس میں بھی ایک حد ہے۔ ہیلی کاپٹر بیس ٹن سے زیادہ وزنی چیز نہیں اٹھا سکتا۔ یعنی ڈھائی سو ٹن وزنی پتھر اٹھانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ اتنا وزن بہت بڑے ہوائی جہاز اٹھاتے ہیں اور وہ بھی ان کو فضا میں کہیں پہنچانے کی استعداد نہیں رکھتے۔

وہ ارضی یا غیر ارضی تہذیب جو اس وقت زمین پر موجود تھی اس نے ایک ہی وقت میں دنیا بھر میں ایک ہی جیسی بہت بڑی عمارات بنائیں اور ان میں ایسی اعلیٰ انجینئرنگ کا استعمال کیا جو آج کے انجینئرز کے بس کی بات نہیں ہے۔ ان لوگوں نے نہ صرف عمارات بنائیں بلکہ جگہ کے لحاظ سے انہوں نے بہترین طرزِ تعمیر اور نمونوں کا انتخاب بھی کیا۔ جیسے اہرام مصر ریت پر بنائے گئے تو ان کو زمین میں دھنسنے سے روکنے کے لیے یہ ساخت دی گئی۔ پہاڑوں پر چھوٹے قلعے بنائے۔ اس طرح انہوں نے میکسیکو کی سنگلاخ زمینوں پر کچی اینٹوں سے بنے اہرام بنائے جو اگرچہ مصری اہراموں کی طرح پُرشکوہ اور بہت پائیدار نہیں تھے لیکن ان کو بھی اہرام کے مخصوص اصولوں کے تحت بنایا گیا تھا۔"

لیکچر کے دوران سوال کیا گیا کہ یہ قدیم تہذیب کون سی تھی جو لاکھوں سال پہلے ساری دنیا میں موجود تھی۔ جیسوپ نے اس کے جواب میں کہا۔ "ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت ایک بہت ترقی یافتہ، یعنی بعض معاملات میں آج سے بھی زیادہ ترقی یافتہ تہذیب موجود تھی۔ کم سے کم انہوں نے فضا میں پرواز کا ایک ایسا طریقہ ایجاد کر لیا تھا جو بہت وزنی اشیا کو بہ آسانی فضا میں اٹھا سکتا تھا اور اسی طریقے سے انہوں نے دنیا بھر میں اتنی وزنی تعمیرات بنائیں۔ شاید یہ طریقہ ان کو محدود پیمانے پر میسر تھا اور وہ اسے ہر چیز کے لیے استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ اگر یہ طریقہ عام ہوتا تو اس کا کوئی نہ کوئی سراغ ملتا۔ ممکن ہے انہوں نے اسے خلائی سفر کے لیے مخصوص کر دیا ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں اتنی ترقی یافتہ قوم کس طرح مٹ گئی کہ آج ہمیں اس کا سراغ صرف پتھر کی بنائی ان عمارتوں کی صورت میں ملتا ہے۔ ممکن ہے اس وقت زمین پر کہیں باہر سے حملہ ہوا ہو اور حملہ آوروں نے سب کو فنا کے گھاٹ اتار دیا ہو۔ یا ہو سکتا ہے زمین سے کوئی شہابیہ ٹکرایا ہو اور اس نے اس تہذیب کو مٹا دیا ہو۔ بدلتے ہوئے موسمی حالات بھی اس کی ایک وجہ ہو سکتے ہیں۔"

ڈاکٹر جیسوپ کے ایک بڑے مخالف جون کیل نے اپنی کتاب "ان آور ہانڈ پلینٹ" میں جیسوپ کے دعویٰ پر تبصرہ کیا ہے۔ "اگر مان لیا جائے کہ اس وقت زمین پر کوئی تہذیب تھی اور شاید یہ غیر ارضی مخلوق تھی جو کہیں باہر سے آئی تھی اور وہ یہاں اپنا کوئی نشان چھوڑ کر جانا چاہتے تھے اور ان کے پاس اس کام کے لیے قوت بھی تھی تو انہوں نے صرف پتھر کے بلاکوں سے کھیل کیوں کیا۔ وہ تو بہت گھٹیا کام ہے، وہ چاہتے تو اس سے کہیں بہتر کام کر کے جا سکتے تھے۔ مثلاً وہ کوئی بہترین اور جدید ساخت کی عمارت بنا کر جا سکتے تھے۔ وہ اس پر دنیا کی اس وقت کی رائج تمام زبانوں میں اپنے بارے میں بتا سکتے تھے۔ آخر انہوں نے پتھر کی یہ گھٹیا عمارتیں ہی کیوں بنائیں؟ جن کے بارے میں آج تک کوئی نہیں سمجھ سکا ہے کہ ان کو بنانے کا مقصد کیا تھا؟"

ڈاکٹر جیسوپ نے بعد میں اس کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "ہمیں اس قسم کے نظریات کا مذاق اڑانے کے بجائے ان پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ دیکھئے آئن اسٹائن نے یونی فائڈ تھیوری پیش کی جس میں کائنات کی چاروں قوتوں کے متحد کرنے کی بات کی گئی ہے۔ اس تھیوری سے بھی ہمیں ایسی چیزوں کا علم ہوتا ہے جو کششِ ثقل کو بے اثر کر سکتی ہیں۔ تو کیا اس وقت کی تہذیب جو ممکنہ طور پر باہر سے آنے والوں پر

مشتمل تھی ان کے پاس کوئی ایسا طریقہ موجود تھا جس سے انہوں نے کششِ ثقل کو بے اثر کر دیا تھا۔ اس طرح وہ بہت وزنی اجسام کو بھی بہ آسانی ہوا میں اٹھا لیتے تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تقریباً تمام تہذیبوں میں ہمیں ایسی کہانیاں ملتی ہیں جن میں قدیم زمانے میں لوگ ہوا میں اڑتے تھے اور ان کے طریقے موجودہ طریقوں سے بالکل مختلف ہوا کرتے تھے۔ ان میں ایک چیز مشترک ہے وہ کششِ ثقل کو بے اثر کر دیا کرتے تھے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ تہذیب کے لوگوں نے زمین سے جانے یا تباہ ہونے سے پہلے ان بے مصرف عمارتوں کے بجائے کوئی واضح اشارہ یا کوئی واضح تحریر کیوں نہیں چھوڑی تو اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ ان کے خیال میں کوئی بھی چیز اتنے طویل عرصے تک باقی رہنے والی نہیں تھی جب تک زمین پر دوبارہ کسی تہذیب کا دور آئے اور اس کے باسی ان کے بارے میں جان سکیں۔ اعتراض کرنے والے بتا سکتے ہیں کہ کیا پتھر کی عظیم الشان عمارتوں کے علاوہ کوئی اور چیز باقی رہ سکتی تھی؟ لاکھوں سال کا طویل عرصہ پتھر کے علاوہ کسی اور میٹریل حد یہ کہ دھات کو بھی تباہ کرنے کے لیے کافی نہیں ہے؟ اس صورت میں ان کے پاس اس کے سوا اور کیا راستہ تھا کہ پتھر کی بہت وسیع و عریض عمارات تیار کریں۔ ایسی عمارات جو اپنے حجم اور مضبوطی کی وجہ سے لاکھوں اور ہزاروں سال گزرنے کے بعد بھی سلامت رہیں۔ وقت نے ثابت کر دیا کہ ان عمارتوں میں باقی رہنے کی صلاحیت تھی۔ اپنی تہذیب اور ترقی کی نشان دہی کے لیے بھی انہوں نے ان عمارتوں کو استعمال کیا۔ کیا اعتراض کرنے والے کہہ سکتے ہیں کہ آج بھی ایسی عمارات بنانا ممکن ہے؟ میرا خیال ہے ان کا جواب نہیں میں ہوگا۔ کیونکہ سیکسا ہومان جیسا قلعہ بنانا اور اس پر ڈھائی سو ٹن وزنی پتھر پہنچانا آج کی ٹیکنالوجی کے لیے بھی بہت ہی مشکل ہے۔ اگر یہ کام ممکن بھی ہوا تو اس کا خرچ ناقابلِ یقین ہوگا۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ انہوں نے کوئی تحریر یا واضح نشانی کیوں نہیں چھوڑی جو ان کے بارے میں بتا سکتی تھی تو میرا خیال ہے کہ انہوں نے یقیناً کوئی تحریر یا نشانی چھوڑی تھی لیکن جب انسان متمدن ہونے لگا اور وہ ان عمارتوں کے آس پاس آباد ہوا تو اس نے ان چیزوں کو مٹا دیا یا مٹا کر ان پر اپنا نشان ڈال دیا۔ اس وقت قوموں کی یہ عادت بھی تھی کہ جو وہ خود نہیں بنا سکتی تھیں اسے کسی اور نے بنایا ہو تو وہ اسے تباہ کر دیتی تھیں اور اگر تباہ نہ کر سکیں تو کم سے کم اسے بے نام و نشان ضرور کر دیتی تھیں۔

جب ڈاکٹر جیسوپ سے سوال کیا گیا کہ وہ ممکنہ قوت کیا ہو سکتی تھی جس سے ہوا میں پرواز ممکن ہوئی تو اس نے کہا۔ "ممکنہ طور پر وہ برقی مقناطیسی توانائی تھی۔ اس میں کسی بھی چیز کے اوپر اور نیچے یکساں دباؤ پیدا کر دیا جاتا ہے۔ نتیجے میں وہ چیز بہت ہلکی ہو جاتی ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ ٹنوں وزنی چیز چند کلو وزنی رہ جاتی ہے۔ کسی چیز کے ہوا میں بلند ہونے کی

تین دنیائیں

عالم دو ہیں 1، عالم امر۔ 2، عالم خلق۔ عالم خلق کو دو درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (یہ تقسیم نظری ہے اور صرف آسانی کی غرض سے عالم کی درجہ بندی کی گئی ہے) عالم مثال اور عالم مادی گویا اس طرح تین دنیائیں ہوئیں۔ 1، عالم امر۔ 2، عالم مثال اور 3، عالم مادی۔ ان تینوں دنیاؤں کے مجموعے کا نام کائنات ہے۔ عالم مادی یہی اینٹ پتھر کی دنیا جس میں ہم پیدا ہوتے اور مر جاتے ہیں۔ یہ ٹھوس مادے کی دنیا ہے۔ اس دنیا کے دوش بدوش عالم مثال اور عالم امر واقع ہے۔ عالم مثال اور عالم امر، کرۂ ہوا اور کرۂ حرارت کی طرح ہمارے ساتھ ہے۔ ہم اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔ ہم اسے چھو نہیں سکتے، سونگھ نہیں سکتے، چکھ نہیں سکتے۔ البتہ سمجھ سکتے ہیں۔ عالم مثال اور عالم امر .... فضا میں اس طرح جگہ نہیں گھیرتا جس طرح عالم مادی جگہ گھیرتا ہے۔ عالم مثال و عالم امر خوشبو، روشنی اور حسن کی دنیاؤں کی طرح ہر جگہ موجود ہے۔ حواس خمسہ کے ذریعے کوئی شخص عالم مثال اور عالم مادی تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ صرف ارتکاز، توجہ اور مراقبہ کے ذریعے ہم عالم غیب (عالم مثال اور عالم امر، عالم غیب ہی تو ہیں) میں دریچہ وا کر کے اس کا نظارہ کر سکتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جس طرح ہم عالم غیب کی مخلوق کی ہم سائیگی سے بے خبر ہیں اسی طرح عالم غیب کے رہنے والے بھی ہمارے وجود کا احساس نہیں کر سکتے۔ جنات بھی عالم مثال ہی کی مخلوق ہیں۔

اقتباس: عالم برزخ از رئیس امروہوی
مرسلہ: نعمان عباسی، لاڑکانہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بنیادی شرط یہ ہے کہ اس پر ہوائی دباؤ نیچے زیادہ ہو جائے بہ نسبت اوپر والی سمت کے۔ لیکن اس تہذیب کے باسی کوئی ایسا طریقہ ایجاد کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے جس سے ان اشیا کا اوپر نیچے کا دباؤ وقتی طور پر یکساں ہو جاتا تھا۔"

لیکچر میں شامل ایک شخص نے سوال اٹھایا کہ کیا اس تہذیب کا کوئی سراغ ملتا ہے اس کو کیا نام دیا جا سکتا ہے؟

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر نے کہا۔ "کیا یہ سنگی عمارات کافی نہیں ہیں؟ ان کے معمار اسی تہذیب سے تعلق رکھتے تھے۔ جہاں تک اس کا کوئی نام ہونے کا تعلق ہے تو ہمیں دنیا کی تقریباً پانچ مختلف تہذیبوں کی قدیم ترین دستاویزات سے پتا چلتا ہے۔ وہ سب ایک ہی دعویٰ کرتے ہیں، ان کا تعلق ایک ایسی ترقی یافتہ تہذیب سے ہے جس کے لوگ ہوا میں اڑنا جانتے تھے اور وہ اس تہذیب کو میو کا نام دیتے تھے۔ تلفظ کے معمولی سے فرق کے ساتھ ہمیں ہر جگہ میو کا نام ملتا ہے۔"

آپ اڑن طشتریوں کے وجود کے حامی ہیں، کیا پُراسرار سنگی عمارات اور اڑن طشتریاں بالکل مختلف موضوع نہیں ہیں۔ اس سوال پر ڈاکٹر جیسوپ نے کہا۔ "نہیں درحقیقت دونوں چیزیں آپس میں ملی ہوئی ہیں۔ کیونکہ میو کی قدیم تہذیب اسی طاقت سے کام لیتی تھی جو... بالآخر اڑن طشتریوں کی صورت میں سامنے آئی۔ مجھے یقین ہے اڑن طشتریاں اسی میو تہذیب کی ایجاد تھی۔ لیکن میو کے فنا ہونے کے بعد یہ راز بھی ہم سے چھپ گیا۔

اگر یہ بات درست تسلیم کر لی جائے کہ اُڑن طشتریوں کا تعلق میو تہذیب سے تھا تو یہ آج بھی نظر آتی ہیں آپ اس کی کیا وضاحت پیش کریں گے؟ اس سوال پر ڈاکٹر جیسوپ نے کہا۔

"اس کی ممکنہ وضاحت یہی ہو سکتی ہے کہ اُڑن طشتریاں اصل میں بیرونی مخلوق کی ہوتی ہیں۔ میو تہذیب اگر بیرونی حملے میں تباہ ہوئی تو اس کا مطلب ہے کہ اس کی ایجادات اور اشیا حملہ آوروں کے ہتھے چڑھ گئی تھیں۔ یہ بیرونی حملہ آور آج بھی اپنے مقاصد کے لیے دنیا میں آتے جاتے ہیں۔ ان کی آمد و رفت اُڑن طشتریوں کے ذریعے ہوتی ہے۔"

"آپ کے خیال میں میو تہذیب کے کچھ لوگ بچے تھے؟"

ڈاکٹر جیسوپ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے بولے۔ "بالکل میرے خیال میں کچھ نہ کچھ لوگ بچ گئے ہوں گے اور یہی لوگ اصل میں تہذیبِ انسانی کے معمار ہیں۔ یہ گروہ ساری دنیا میں بکھر گیا اور اس نے بالآخر بادشاہوں، کاہنوں اور پجاریوں کے روپ میں اقتدار حاصل کر لیا۔ یہ لوگ صاحبِ علم اور ٹیکنالوجی کے ماہر تھے۔ یہ عام لوگوں سے کہیں زیادہ جانتے تھے۔ یہ خاص گروہ تھا جو ہر تہذیب کا معمار بنا اور اس نے لوگوں کو زندگی گزارنے کے طریقے سکھائے بالآخر یہ مختلف معاشروں میں ضم ہو کر اپنی اصل حیثیت کھو بیٹھا تھا اور آج شاید سب بھول چکا ہے۔ مگر اس تہذیب کی نشانیاں ان سنگی عمارتوں کی صورت میں باقی ہیں اور ایک دن یقیناً ایسا آئے گا جب ہم ان کے اسراروں سے واقف ہو جائیں گے اور مجھے یقین ہے وہ وقت زیادہ دور نہیں ہے کیونکہ سائنس اس قابل ہو چکی ہے کہ ان عمارات کی تعمیر اور اس کے طریقوں کو سمجھ سکے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کو سمجھنے کے لیے ایک وسیع پروجیکٹ شروع کیا جائے جس میں دنیا کے ذہین ترین سائنس داں شامل ہوں۔"

ڈاکٹر جیسوپ اپنے کاز کے لیے بہت سرگرم تھا اور اس کا جارحانہ انداز لوگوں کو اپنی طرف متوجہ بھی کر رہا تھا۔ اس نے اپنی تجویز پر خود ہی عمل کرتے ہوئے ہم خیال سائنس دانوں اور ماہرین سے رابطہ شروع کر دیا تھا لیکن اچانک ہی اس کی زندگی کے خاتمے کا وقت آ گیا اور اپریل 1959ء آخری تاریخ میں وہ ڈیڈ کاؤنٹی پارک کے قریب اپنی گاڑی میں یوں مردہ پایا گیا کہ اس کی کار میں کاربن مونو آکسائیڈ گیس بھری ہوئی تھی اور یہ گیس اس کی اپنی کار کے انجن سے پیدا ہوئی تھی۔ ایک پائپ سائیلینسر سے لگا کر اسے کار کے اندر پہنچایا گیا تھا۔ پولیس نے انکوائری کے بعد اسے خودکشی قرار دیا کیونکہ بیوی سے علیحدہ ہونے کے بعد وہ شدید ذہنی پریشانی کا شکار تھا۔ مگر کیا یہ واقعی خودکشی تھی یا کچھ لوگ نہیں چاہتے تھے کہ ڈاکٹر جیسوپ اپنے کام کو وسیع پیمانے پر پھیلائے اور بعض لوگوں کے لیے خطرہ بن جائے جو اپنے مفاد کے لیے حقائق دنیا والوں سے چھپا رہے ہیں۔ یہ کون لوگ ہیں ان پر بھی ڈاکٹر کی پُراسرار موت کی طرح پردہ پڑا ہوا ہے۔

☆☆☆

جیسا کہ پہلے بھی بتایا ہے کہ صرف مصر میں نہیں بلکہ دنیا کے اور حصوں میں بھی اہرام پائے جاتے ہیں۔ ان میں جنوبی امریکا کے اہراموں پر ماہرین نے خاصا کام کیا ہے اور ان کا تعلق اس براعظم کی پرانی تہذیب سے جوڑا جاتا ہے۔ جنوبی

امریکن اہرام ساخت میں تنوع رکھتے ہیں لیکن یہ مصری اہراموں کی طرح بھاری بھرکم اور پُرشکوہ نہیں ہیں۔ پھر ان میں سے اکثر کی ساخت میں اہرام والی درستگی اور حسابی معیار بھی نہیں پایا جاتا ہے۔ تیسرے ان میں سے اکثر اہرام مٹی کی کچی اینٹوں سے تیار کیے گئے ہیں اور تیار ہونے کے بعد ان کو کچی اینٹوں یا پتھر سے ڈھک دیا گیا تاکہ پانی اور موسمی اثرات سے محفوظ رہیں۔ ان میں سب سے مشہور میکسیکو میں پائے جانے والے اہرام ہیں جو اصل میں قدیم ریڈ انڈین قبائل کے معبد اور قربان گاہیں تھیں۔ یہاں وہ دشمن کے پکڑے جانے والے افراد یا اپنے ہی معتوب مجرموں کی قربانی پیش کرتے تھے۔ قربان کیے جانے والے افراد کے سر اہرام میں دیواروں میں نصب کر دیے جاتے تھے۔ جب اسپینی حملہ آور یہاں پہنچے تو ان کو ایک ایک اہرام میں لاکھ سے بھی زیادہ انسانی سر ملے تھے۔ بہرحال یہ ایک الگ موضوع ہے، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ قدیم انکا اور مایا قبائل اہرام سازی کے فن سے واقف تھے۔

شمالی امریکا میں ہمیں اہرام نہیں ملتے ہیں لیکن جنوبی امریکا میں ان کی کثرت ہے۔ خاص طور سے انکا قبائل اہرام سازی کرتے تھے اور انہوں نے اس مقصد کے لیے کچی اور پکی ہوئی اینٹوں سے کام لیا تھا۔ کہیں کہیں یہ پتھر بھی استعمال کرتے تھے۔ انکا قوم کے بنائے اہرام میکسیکو سے پیرو تک کے علاقے میں ملتے ہیں یا ان کے آثار ملتے ہیں۔ ان کے اکثر اہرام سیڑھی دار ساخت رکھتے تھے اور ان کی اونچائی ان کی بنیادوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتی تھی۔ پھر ان کا طرزِ تعمیر اور استعمال قابلِ فہم تھا۔

قدیم عراق میں جو سمیری تہذیب کا گڑھ تھا وہاں چھوٹے اہرام بنائے جاتے تھے اور یہ اہرام زیادہ تر مقبرے ہوتے تھے۔ کہنے کو تو مصری اہرام بھی مقبرے ہوتے تھے۔ یا ظاہر ایسا ہی کیا گیا ہے لیکن ان میں سے کسی اہرام میں کسی فرعون یا اعلیٰ شخص کی لاش نہیں ملی ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے یہ اہرام مقبرے نہیں تھے بلکہ فرعونوں کو جوں کے توں مل گئے تھے اور انہوں نے ان کی دیواروں پر نقش کاری کر کے اپنا اور اپنے دور کا نام کندہ کروا دیا تھا۔ کم سے کم غزہ کے اہراموں کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ وادیٔ نیل میں انسانوں کی باقاعدہ آبادکاری سے بھی پہلے بنائے جا چکے تھے۔ ان کے معمار اور بنانے کا مقصد آج تک تاریکی میں ہے۔ مصر کے دوسرے اہرام ان اہراموں کی بھونڈی نقل قرار دیے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس میں شبہ نہیں ہے کہ بعد میں مصریوں نے عمارت سازی میں شاندار ترقی کی اور پوری وادیٔ نیل میں عالی شان عمارات تعمیر کرائیں، جو آج بھی دیکھنے والوں کو دنگ کر دیتی ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح کرتی ہیں کہ خوفو اور اس کے ساتھ کے اہرام ان کے بنائے ہوئے نہیں تھے کیونکہ اگر یہ مصریوں نے بنائے ہوتے تو آنے والے فرعون اپنا نام اونچا کرنے کے لیے ان سے بھی بڑے اہرام بنواتے جبکہ ہم دیکھتے ہیں چار ہزار سال پہلے سے مصریوں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ حقیقت یہ ہے خوفو اور اس کے بعد آنے والے فرعونوں نے بھی ایسی کوئی کوشش نہیں کی تھی اور یہ اہرام ان کے بنائے ہوئے نہیں تھے اور نہ ایسے اہرام بنانا ان کے بس کی بات تھی۔

ایشیا بھی اہراموں سے خالی نہیں ہے۔ چین کے وسیع میدانی علاقوں میں جہاں مٹی نرم اور بارشیں بہت زیادہ ہوتی تھیں وہاں پر پکا کر بنائی گئی اینٹوں سے بہت بڑے اہرام بنائے گئے۔ زمانے کی گرد پڑنے اور اس گرد پر سبزہ اگ آنے سے یہ اہرام پہاڑیوں کی صورت اختیار کر گئے ہیں لیکن ان کے نچلے حصے سے جھانکتی اینٹیں صاف نظر آتی ہیں اور ان کی مدد سے اس اہرام کے رقبے کا احاطہ کیا جا سکتا ہے یہ چوتھائی مربع میل سے بھی زیادہ کا رقبہ ہے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ کتنا بڑا اہرام ہے۔ ممکن ہے اس کے اوپری حصے کو نقصان ہوا ہو لیکن اس کے اندر کے حصے یقیناً محفوظ ہوں گے کیونکہ ابھی تک ماہرین اس اہرام کے اندر نہیں جا سکے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ یہ اہرام چین کے ایک دور دراز علاقے شان شی میں ہیں جہاں آج بھی رسائی آسان نہیں ہے۔ دوسرے چین کی حکومت یہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں دیتی ہے، جو چند مغربی باشندے یہاں پہنچنے میں کامیاب ہوئے تو وہ بھی اتفاقاً آئے تھے اور ان کو علم ہی نہیں تھا کہ چین کے اس علاقے میں اتنے بڑے اہرام موجود ہیں۔ مقامی باشندے صدیوں سے ان کے وجود سے واقف ہیں۔

شان شی پہنچنے والوں میں ایک انگریز سیاح رابرٹ گورین بھی تھا۔ یہ دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں یہاں آیا تھا جب چین پر جاپان کا قبضہ ہو چکا تھا اور یہاں پر خانہ جنگی بھی جاری تھی۔ رابرٹ کا ارادہ چین کے دور دراز علاقوں اور تبت کی سیر کا تھا۔ وہ ریل لائن کے ذریعے شان شی تک آیا۔ لیکن باقی دو سو میل کا سفر اسے چھکڑوں پر کرنا پڑا تھا جنہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیل کھینچ رہے تھے۔اس سست اور طویل سفر کے بعد وہ ایک چھوٹے سے گاؤں پہنچا۔انارکی کی وجہ سے اس علاقے میں کوئی حکومت نہیں تھی جو کسی غیر ملکی کے آنے پر اعتراض کرتی۔گاؤں کے لوگوں نے اسے خوش آمدید کہا تھا اور وہ ایک چھوٹے سے جھونپڑے میں رکا تھا۔اگلے روز گاؤں کا ایک کسان جو کسی قدر انگریزی جانتا تھا وہ رابرٹ کو گاؤں کے قریبی علاقوں کی سیر کرانے لے گیا۔تب رابرٹ نے اس پہاڑی کو دیکھا جو کسی قدر عجیب ساخت رکھتی تھی۔خوش قسمتی سے رابرٹ مصر بھی جا چکا تھا اور وہاں اس نے اہرام مصر کو دیکھا تھا۔اسے یہ پہاڑی اہرام نما لگی۔اس نے مقامی کسان سے پوچھا۔

''یہ کیا ہے؟''

''یہ کوئی پرانی تعمیر ہے۔'' کسان نے سادگی سے بتایا۔''اب اس پر مٹی پڑ گئی ہے اور سبزہ اگ آیا ہے۔''

رابرٹ نے اس پہاڑی کو چاروں طرف سے چل کر دیکھا اور اسے کئی مقامات پر مٹی کی پکی اینٹوں کی دیوار نظر آئی۔ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ پہاڑی پوری کی پوری پکی اینٹوں سے بنی تھی۔اگر یہ درست تھا تو اس کا مطلب تھا کہ یہ بہت بڑی تعمیر تھی۔شاید دنیا کی سب سے بڑی تعمیر تھی۔رابرٹ کے علم میں دنیا کی ایسی کوئی عمارت نہیں تھی جو مکمل طور پر کورڈ ہو اور وہ چوتھائی مربع میل سے زیادہ رقبے پر پھیلی ہو۔تعمیراتی سامان کے لحاظ سے خوفو کا اہرام دنیا کی سب سے بڑی عمارت ہے جس کا وزن کوئی دو کروڑ ٹن بنتا ہے لیکن یہ اہرام تعمیری لحاظ سے اس سے کہیں بڑا تھا۔رابرٹ پُرجوش ہو گیا۔

''یہ تعمیر یہاں کب سے ہے؟''

کسان نے رابرٹ کو بتایا۔''یہ بات تو گاؤں کے بڑے بوڑھے بتا سکتے ہیں کیونکہ ان کے بزرگوں کے بزرگوں نے بھی اس پہاڑی کو ایسے ہی دیکھا ہے۔کبھی مٹی گرنے سے نظر آنے والی اینٹیں بھی چھپ جاتی ہیں اور کبھی کہیں اور سے نکل آتی ہیں۔''

رابرٹ اس گاؤں کے بوڑھے بدھ راہب سے ملا۔اس نے بتایا کہ پہاڑی چینی شہنشاہوں کے ابتدائی خاندان کے دور میں بھی تھی اور اس وقت بھی لوگ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔کسی کو نہیں معلوم کہ یہ تعمیر کب اور کن لوگوں نے کی تھی۔پھر رابرٹ کو پتا چلا کہ صرف یہی پہاڑی نہیں ہے بلکہ اس علاقے میں ایسی کم سے کم دو پہاڑیاں اور بھی ہیں۔لیکن ان کا اوپری حصہ مکمل طور پر ختم ہو چکا ہے اور اب ان کی بس چند فٹ کی بنیادیں باقی رہ گئی ہیں۔یہ پہاڑیاں یا اہرام اس اہرام سے چند میل شمال میں واقع تھے۔رابرٹ نے ان کی بنیادیں دیکھیں اور ان کو بالکل چوکور پایا۔یہ اس پہاڑی نما اہرام کے مقابلے میں چھوٹے اہرام تھے اور ان کی بنیاد میں اینٹوں کے ساتھ پتھر بھی استعمال کیے گئے تھے۔یہ دونوں اہرام جن کی بس بنیادیں باقی رہ گئی تھیں ایک جیسے رقبے پر پھیلے تھے۔مقامی لوگوں نے نہ صرف ان سے اینٹیں اور پتھر نکال لیے تھے بلکہ اب وہاں کسی قسم کی کوئی پرانی چیزیں ملنے کا امکان بھی نہیں تھا۔کیونکہ یہاں بچے کھیلتے تھے اور بڑے اپنی بیٹھک جماتے تھے۔یہ اہرام صدیوں پہلے آثار سے خالی ہو چکے تھے اور مقامی لوگوں نے رفتہ رفتہ ان کی اینٹیں نکال کر اپنے گھروں کی تعمیر میں استعمال کر لی تھیں۔

رابرٹ کے بعد کئی افراد نے ان اہراموں کو دیکھا اور ان کی سیر کی لیکن یہاں نہ تو کوئی تحقیقی کام ہوا اور نہ چینی حکومت نے کسی کو یہاں کھدائی کی اجازت دی۔یوں یہ اہرام ابھی تک دنیا والوں کی نظروں سے اوجھل ہیں اور کچھ نہیں معلوم کہ پہاڑی نما اہرام کے اندر والے حصے میں کچھ ہے یا یہ پورا بھرا ہوا پہاڑی نما اہرام ہے۔اگر اس کے ارد گرد کھدائی کی جائے تو ممکن ہے کہ یہاں اندر جانے کا کوئی راستہ نکل آئے اور معلوم ہو سکے کہ یہ اہرام کس مقصد کے تحت اور کن لوگوں نے بنائے تھے۔

جنوبی امریکا میں سیڑھی دار اہرام ہیں جن کی اونچائی ان کی بنیادوں کی چوڑائی کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔عجیب بات ہے ایسا ہی ایک اہرام امریکا کے ساحل سے کچھ دور برمودہ کے سمندر میں پایا جاتا ہے جس کی تصاویر اور ویڈیو انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں۔یہ بالکل اسی طرح کا سیڑھی دار اہرام ہے جیسے انکا تہذیب اور آزٹک تہذیب میں بنائے جاتے تھے۔آزٹک انکا کی ایک ذیلی تہذیب تھی اور پورے جنوبی امریکا میں ان کے آثار جا بہ جا ملتے ہیں۔یہ لوگ انکا قوم کے جنگجو گروپ سے تعلق رکھتے تھے اور یہ پہاڑوں کی عبادت کرتے تھے اور ان کے حضور انسانوں کی قربانیاں دیتے تھے۔اسی وجہ سے یہ زیادہ تر پہاڑوں میں آباد تھے۔انکا قوم کے اکثر پہاڑی شہر ان کے بسائے ہوئے تھے اور حیرت انگیز طور پر انہوں نے کوہ انڈیز میں بائیس ہزار فٹ کی بلندی پر بھی مکان اور بستیاں بنا رکھی تھیں جہاں یہ کسی خاص

مقصد کے لیے جاتے تھے اور یہ خاص مقصد کسی انسان کی قربانی ہوتا تھا۔وہ قربانی کے لیے مخصوص کیے جانے والے شخص کو خواب آور دوا پلا کر عام کپڑوں میں کسی قبر میں زندہ دفن کر دیتے تھے اور وہ وہاں دم گھٹ کر یا بے پناہ سردی سے مر جاتا تھا۔

حال ہی میں دریافت ہونے والے سمندری اہرام نے اہراموں کے بارے میں ایک نئی بحث کو جنم دیا ہے۔کیونکہ اس سے پہلے اہراموں کا اصل گھر مصر کو سمجھا جاتا تھا۔مگر اس سمندری اہرام نے بتایا کہ اس ڈوب جانے والی سرزمین پر مصر سے بھی پرانا اہرام موجود ہے۔ماہرین کہتے ہیں کہ سمندر کا یہ خطہ آج سے کوئی دس ہزار سال پہلے سمندر میں ڈوب گیا تھا اور اس کے ساتھ اس پر آباد ایک پُرشکوہ تہذیب بھی فنا ہو گئی تھی۔یہ وہ تہذیب تھی جو اس دنیا کے اولین متمدن معاشروں سے بھی پہلے یہاں موجود تھی۔یہ لوگ بے حد ترقی یافتہ تھے اور اس وقت ترقی کے عروج پر تھے جب کہ باقی دنیا کے لوگ غاروں اور جنگلوں میں رہ رہے تھے۔

اصل میں اہراموں کا آغاز انہی لوگوں نے کیا تھا اور انہوں نے ہی باقی دنیا میں پھیل کر اہرام نما عمارتیں بنائی تھیں۔افلاطون نے بحر اوقیانوس میں ایک سرسبز و شاداب جزیرے کا ذکر کیا ہے جس کے لوگ بہت ترقی یافتہ تھے اور انہوں نے سورج اور شیشوں سے توانائی حاصل کرنے کا طریقہ ایجاد کر لیا تھا اور یہی توانائی ... بالآخر ان کی تباہی کا سبب بھی بن گئی۔اس جزیرے کو بحرِ اوقیانوس کی نسبت سے اٹلانٹس کہا جاتا ہے۔لیکن اس مفروضہ جزیرے کا ابھی تک کوئی حتمی ثبوت نہیں ملا ہے اور اس کے بارے میں صرف کہانیاں مشہور ہیں۔سوائے افلاطون کے اور کسی مغربی مورخ یا تاریخ داں نے ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا ہے۔تاریخی داستانوں میں ان کا ذکر بہت معمولی سا ملتا ہے۔

اہرام نما عمارتیں ساری دنیا میں بنی ہیں۔حد یہ کہ سمندر کے اندر بھی ان کی موجودگی کے ثبوت ملے ہیں۔ایک دوسرے سے ہزاروں میل کے فاصلے پر اور ہزاروں سال پہلے جب انسان سرے سے تہذیب یافتہ نہیں تھا تو کن لوگوں نے یہ عمارات تعمیر کیں اور ان کا مقصد کیا تھا؟اس کا جواب دو گروہ ذرا مختلف انداز میں دیتے ہیں۔ایک گروہ جس کا تعلق مغربی دنیا کے سائنس پسند حلقوں سے ہے اس کا کہنا ہے کہ اہراموں کی تعمیر اور استعمال سے انسانوں کا کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ یہ تو خلا سے آنے والی غیر انسانی مخلوق نے بنائے اور وہ ان کو یہاں اپنے کنٹرول سینٹر اور خلائی جہازوں کے بیس کے طور پر استعمال کرتی تھیں۔اتنی بڑی عمارت بنانے کا مقصد ایک تو اپنے خلائی جہازوں کو گائیڈ کرنا اور پھر ان کو اہرام کے اندر پارک کرنا تھا۔ان لوگوں کو یقین ہے کہ بڑے اہراموں کے اندر ایسے خفیہ خانے ہیں جہاں یہ خلائی جہاز پارک کیے جاتے تھے اور یہ خفیہ خانے آج تک دریافت نہیں ہوئے ہیں بلکہ ان کو تو اس حد تک یقین ہے کہ ان خفیہ خانوں میں خلائی جہاز اور خلائی مخلوق کے ساتھ آنے والا دوسرا سامان جس میں ان کے آلات و ہتھیار اور ممکنہ طور پر ان کی لاشیں ہیں اب تک محفوظ ہیں۔

اگر یہ اہرام سچ مچ خلا سے آنے والی کسی مخلوق کے تیار کردہ ہیں تو انہوں نے ان کی حفاظت کا ایسا بندوبست کر رکھا ہے کہ اب تک انسان وہاں تک رسائی حاصل نہیں کر سکا اور ہمارے جدید آلات جو خفیہ پناہ گاہوں کا پتا چلا لیتے ہیں، وہ بھی اہرام میں چھپے خفیہ خانوں کا پتا نہیں چلا سکے ہیں۔حد یہ کہ سائنس دانوں نے جب اہراموں کا ایکسرے کی مدد سے جائزہ لینا چاہا تو ان کی طاقت ور ایکسرے مشینوں نے کام کرنے سے انکار کر دیا اور نتیجہ صفر رہا تھا۔اہراموں کے بیچ میں ایسی کون سی چیز ہے جس سے ایکسرے شعاعیں بھی نہیں گزر پاتی ہیں۔یہ تجربہ غزہ کے تینوں اہراموں پر کیا گیا اور نتیجہ ناکامی کی صورت میں نکلا لیکن جب یہی تجربہ مصر میں موجود دوسرے عام اہراموں میں کیا گیا تو ایکسرے شعاعیں ان سے گزر گئیں اور اندر کا سارا احوال بیان کر دیا۔خلائی مخلوق پر یقین رکھنے والوں کا کہنا ہے کہ اہرام بنانے والوں نے اس کے اندر کچھ حفاظتی نظام رکھا ہے کہ باہر سے اندر کا حال کسی صورت معلوم نہیں ہو سکتا۔کیونکہ ان اہراموں میں خفیہ خانے ہیں اور ان خانوں میں خلائی مخلوق نے اپنی چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔جب وہ آنے والے زمانوں میں دوبارہ کبھی زمین کی طرف آئیں گے تو ان خفیہ خانوں کو کھولیں گے اور ان میں رکھا ہوا سامان استعمال کریں گے۔

مغرب میں یہ نظریہ بہت مقبول ہے اور اس پر بے شمار فکشن ناول، کتابیں اور تحقیقی مقالے لکھے جا چکے ہیں۔درجنوں کے حساب سے فلمیں بن چکی ہیں۔مگر مغرب کے سنجیدہ سائنسی حلقوں نے کبھی اس طرف توجہ نہیں دی ہے۔یہ چند شوقین حضرات ہیں جو اس تھیوری کا پرچار کرتے ہیں اور اس پر یقین رکھتے ہیں۔یہ سراسر مادہ پرستانہ نظریہ ہے اس کے برعکس ایک اور گروہ ہے جس کا تعلق مغرب اور مشرق دونوں سے ہے اور یہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اہراموں کو ایک روحانی نشانی کے طور پر لیتے ہیں ان کا کہنا ہے اہرام اصل میں ابدی زندگی کی نشانی ہیں۔ یہ علامت ہیں اس زندگی کی جو ہمیشہ رہے گی اور ہر انسان کو اس زندگی سے دوچار ہونا پڑے گا۔

اہراموں کو ماورائیت کا مرکز ماننے والے گروہ کے خیالات کچھ متضاد ہیں۔ کچھ لوگ اسے اعلیٰ روحانیت کے طور پر لیتے ہیں جس کا سرا... بالآخر خدائے واحد سے جا ملتا ہے۔ لیکن اس گروہ کا غالب حصہ ان اہراموں کو ایک پُراسرار اور انجانی دنیا کا دروازہ سمجھتا ہے جو آج تک انسانوں پر نہیں کھل سکا ہے بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ صرف چند مخصوص انسان اس کے بارے میں جانتے ہیں۔

تبت جو بدھ مت کا گڑھ ہے اس کی بعض قدیم کتب میں دنیا بھر میں ایسی بڑی عمارتوں کا ذکر ہے جن میں کوئی عام آدمی داخل نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ عمارتیں اصل میں زیرِ زمین سرنگوں میں داخلے کا راستہ ہیں۔ یہ سرنگیں ساری دنیا میں ہیں اور ان کی مدد سے دنیا کے کسی بھی حصے کا سفر کیا جاسکتا ہے۔ حیرت انگیز طور پر یہ سرنگیں سمندروں کے نیچے سے گزر کر دوسرے براعظموں سے جا ملتی ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ زمین کے نیچے سرنگیں ہیں بلکہ ان کتب کے مطابق زمین کے نیچے شہر بھی آباد ہیں اور ان شہروں میں وہ اعلیٰ ذہین اور روحانی طور پر بلند افراد مقیم ہیں جو اس دنیا کے حقیقی حکمران ہیں۔ اس زیرِ زمین دنیا کا دارالحکومت شمبورانامی شہر ہے جو تبت میں کہیں واقع ہے۔ ان سرنگوں اور ان کے راستوں کے بارے میں صرف وہ افراد جانتے ہیں جو روحانی لحاظ سے بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان افراد میں دلائی لاما، پنچن لاما اور متعدد ہائی لاما شامل ہیں۔

ان تبتی نظریات کو اس گروہ نے یوں اپنا لیا کہ ان میں جن عمارتوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ اصل میں اہرام ہیں۔ کیونکہ دنیا میں قدیم زمانے سے جو عمارات موجود ہیں اور بہت بڑی ہیں وہ یہ اہرام ہی ہیں جو سارے براعظموں پر پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ وسط ایشیا کے پرانے معبد اور شمالی امریکا میں وسیع پتھریلے پلیٹ فارم جو نہ معلوم وقتوں میں بنائے گئے تھے وہ بھی ان عمارتوں کے زمرے میں آتے ہیں۔ ان عمارتوں کے اندر کہیں وہ خفیہ دروازے ہیں جو زیرِ زمین سرنگوں میں کھلتے ہیں اور ایک بار ان کا راز سامنے آگیا تو دنیا والے زیرِ زمین دنیا سے بھی واقف ہوجائیں گے لیکن اس گروہ کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ اس وقت ہوگا جب شدید اتھل پتھل کے بعد دنیا تباہی سے دوچار ہوگی اور جب دنیا کا آخری بادشاہ آئے گا تب دنیا کے سارے سربستہ راز کھل جائیں گے اور سب سامنے آجائے گا۔ اس وقت ان سرنگوں اور زیرِ زمین دنیا کا راز بھی کھل جائے گا اور زمین کے باسی باہر آجائیں گے۔

یہ سرنگیں، عمارتیں اور اہرام بنانے والے زمین کے وہ پرانے لوگ تھے جو ایک زمانے پر زمین پر حکمرانی کرتے تھے اور ساری دنیا پر ان کا سکہ چلتا تھا۔ وہ بہت ترقی یافتہ تھے اور انہوں نے طویل مسافتوں کو محفوظ طریقے سے طے کرنے کے لیے یہ سرنگیں بنائی تھیں۔ کیونکہ اس وقت ذرائع آمدورفت اتنے ترقی یافتہ یا عام نہیں تھے کہ براعظموں کے درمیان محفوظ انداز میں سفر کیا جاسکے تو انہوں نے یہ سرنگیں بنائیں۔ یہ ہر خطرے سے محفوظ تھیں پھر کسی برے وقت کے لیے ان سرنگوں سے بھی نیچے شہر بسائے گئے اور وہاں شاندار عمارات تعمیر کی گئیں، وہاں ایسے بندوبست کیے گئے کہ انسان سکون سے رہ سکے اور جب زمین کے اوپر ایک بڑی تباہی آئی تو بچ جانے والے انسان ان زیرِ زمین شہروں میں منتقل ہوگئے تھے اور وہ اب تک وہاں موجود تھے۔

سوال ہے کہ اگر یہ کسی تباہی کی وجہ سے زیرِ زمین جانے پر مجبور ہوئے تو پھر باہر کیوں نہیں آئے کیونکہ اب تو کوئی تباہی نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ لوگ یہ دیتے ہیں، کیونکہ زیرِ زمین جانے والے روحانیت کے نمائندے ہیں اور اس وقت دنیا پر مادہ پرستوں کا قبضہ ہے اس لیے وہ باہر نہیں آسکتے اور وہ زیرِ زمین رہ کر ہی اپنی کوشش جاری رکھے ہوئے ہیں اور اس وقت کا انتظار کر رہے ہیں جب آسمان سے آخری بادشاہ اتارا جائے گا اور وہ روحانیت پرستوں کو دوبارہ اقتدار دلائے گا اور تب زیرِ زمین رہنے والے باہر آئیں گے۔

آخری بادشاہ کا نظریہ ایسا لگ رہا ہے جیسے الہامی مذاہب سے متاثر ہوکر لیا گیا ہے کیونکہ تمام ہی الہامی مذاہب میں ایک ایسے نجات دہندہ کا ذکر ہے جو آکر دنیا کو فتنہ و فساد سے نجات دلا دے گا اور یہاں امن قائم کرے گا۔ تینوں الہامی مذاہب والے اپنے اپنے انداز میں اس کی تشریح کرتے ہیں۔ مگر ان کی داستانوں میں کہیں بھی کسی زیرِ زمین شہر یا سرنگوں کا ذکر نہیں ملتا ہے۔ شاید آنے والا وقت ان رازوں سے پردہ اٹھائے جو اہراموں اور ان سے منسوب ہیں کیونکہ سچ چھپایا جاسکتا ہے لیکن اسے فنا نہیں کیا جاسکتا۔

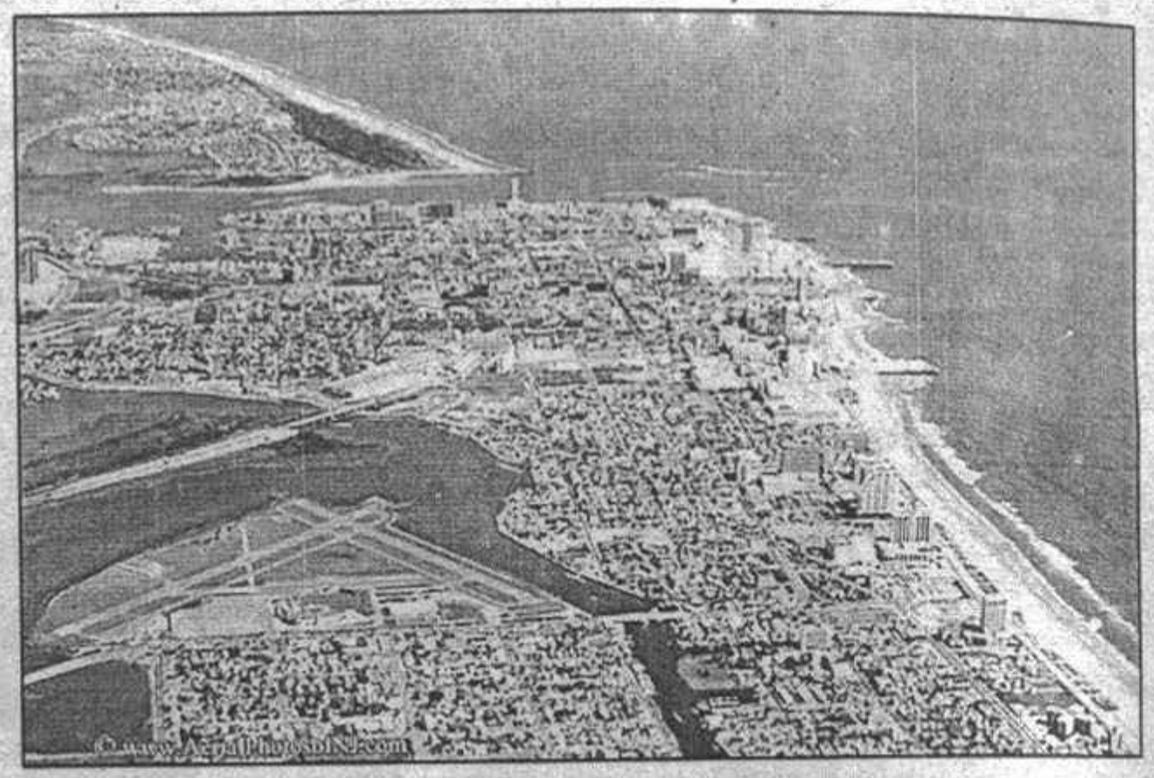

گمشدہ سلطنت

آصف ملک

بحرِ اٹلانٹس کے نیچے جس شہر کے آثار نظر آرہے ہیں کیا اس شہر کے لوگ واقعی وقت سے بہت آگے نکل گئے تھے؟ ہر شعبۂ زندگی میں ترقی کی مثال قائم کرچکے تھے؟ کیا یہ درست ہے کہ یہاں کے باشندوں نے دنیا والوں کو ترقی کے طریق کار سمجھائے، بتائے؟ سمندر کی تہ میں مدفون اہرام جو ہو بہو مصر کے اہرام جیسا ہے، کیا اسی کو دیکھ کر مصریوں نے اہرام تعمیر کیے، ایسے ہی بے شمار سوالات پر مبنی ایک چشم کشا تحریر۔

اسرار کے دامن سے ڈھکے، سمندر کی تہ میں مدفون ایک شہر کی روداد

شمالی امریکا میں بطورِ خاص امریکا اور کینیڈا کی ندیوں میں برف پگھلتے ہی پانی کی آمد شروع ہوتی ہے۔ ندی میں کہیں کہیں تھوڑے سے پانی میں، پتھروں کی ریخوں میں اور پودوں کے درمیان ننھی سالمن مچھلیوں کا جنم ہوتا ہے پھر یہ جھنڈ کے جھنڈ ندیوں کے بہتے پانی کے ساتھ سمندر کی طرف روانہ ہوجاتے ہیں۔ گوکہ یہ مچھلیاں اتنی چھوٹی ہوتی ہیں کہ دیکھنے پر مشکل سے نظر آتی ہیں۔ سیکڑوں میل کا سفر طے کرکے اور کئی آبشاروں سے گزر کر یہ... بالآخر سمندر تک

www.digestpk.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہنچتی ہیں۔ یہاں امریکا کے مشرقی ساحل کے ساتھ ان کا دو ہزار میل کا نیا سفر شروع ہوتا ہے۔ یہ ننھی مچھلیاں اس سفر کے دوران سمندری پلانک اور غذائی ذرات پر پرورش پاتی ہیں۔ اس سفر کے دوران جب یہ فلوریڈا کی ریاست کو نے پر واقع کریبین کے سمندر میں پہنچتی ہیں تو یہ خاصی بڑی ہو چکی ہوتی ہیں اور یہاں پر یہ ایک عجیب حرکت کرتی ہیں۔ یہ جھنڈ اچانک میامی ویسٹ پام سے ساحل کی پٹی چھوڑ کر مشرق کی طرف گھوم جاتے ہیں اور کھلے سمندر میں سفر کرنے لگتے ہیں جب کہ اس پورے سفر کے دوران یہ مچھلیاں کہیں بھی ساحل سے جدا نہیں ہوتیں کیونکہ ان کی خوراک پلانک اور دوسری چیزیں صرف ساحل کے ساتھ ہی ملتی ہیں۔

اس کے باوجود مچھلیاں بہاماز کے سمندر میں اس کے جزائر سے پرے سمندر میں سفر کرتی ہوئی کھلے اوقیانوس میں پہنچ جاتی ہیں۔ یہ بہاماز اور اس کے جزائر کی آخری حد ہوتی ہے اور اس کے بعد سمندر بہت گہرا ہو جاتا ہے جہاں ان مچھلیوں کے لیے مناسب مقدار میں خوراک موجود نہیں ہے بلکہ وہاں ان کو شکار کرنے والی مچھلیاں اور آبی جانور ہیں۔ یہاں سے سالمن مچھلیوں کے جھنڈ واپسی کا سفر شروع کر دیتے ہیں۔ اس وقت تک یہ بالغ ہو کر عمر کے آخری حصے کی طرف رواں ہوتی ہیں۔ یہ اسی طرح گھوم کر ویسٹ پام سے دوبارہ ساحل تک آجاتی ہیں۔ راستے میں تمام اقسام کی شکاری مچھلیاں ان پر حملہ آور ہوتی ہیں۔ ان سے بچتی بچاتی یہ مچھلیاں بہ مشکل ان ندیوں کے دہانے تک پہنچتی ہیں جہاں سے یہ بچپن میں سمندر میں داخل ہوئی تھیں۔

لیکن اس سفر میں ان کی تعداد بہت کم رہ جاتی ہے اور سو میں مشکل سے ایک سالمن کو واپس ندی میں جانے کا موقع ملتا ہے اور صرف اسی سالمن کو موقع ملتا ہے جو تیز اور طاقت ور ہو۔ کیونکہ اسے راستے میں شکاریوں سے بچنا ہوتا ہے۔ لیکن ان کی مضبوطی اور طاقت کا اصل امتحان اس وقت ہوتا ہے جب یہ ندی کی مخالف سمت میں سفر کرتی اور آبشاروں کو عبور کرتی واپس اس جگہ پہنچتی ہیں جہاں کبھی انہوں نے انڈے سے جنم لیا تھا اور ندی کے پانی میں سمندر کی جانب اپنا سفر شروع کیا تھا۔ مادہ مچھلیاں جو اس وقت انڈوں سے بھری ہوتی ہیں وہاں کروڑوں کی تعداد میں انڈے دے کر مر جاتی ہیں۔ کیونکہ ان کی زندگی کا مقصد پورا ہو چکا ہوتا ہے۔ یہ انڈے سارے سرما ایسے ہی پڑے رہتے ہیں اور جب بہار کی آمد ہوتی ہے تو ان سے بچے نکل آتے ہیں اور یہ پھر اسی طرح سفر شروع کرتے ہیں۔ ان کی کل زندگی مشکل سے آٹھ مہینے کی ہوتی ہے۔

کروڑوں اربوں سالمن مچھلیوں کے یہ جھنڈ اور ان کا عجیب و غریب سفر اصل میں قدرت کی طرف سے اس پورے علاقے میں خوراک کی ایک چین مہیا کرنا ہے۔ لیکن بہاماز کے قریب ان مچھلیوں کا یک دم ساحل سے الگ ہو کر کھلے سمندر میں چلے جانا ایسی حرکت ہے جسے ماہرین سمجھ نہیں پائے ہیں۔ یہ مشرق میں کھلے سمندر میں پہنچنے کے بعد دوبارہ جنوب کا رخ کرتی ہیں اور ان کی آخری حد ٹرکس اینڈ کائکوس آئی لینڈز ہیں جو برطانیہ کے زیر انتظام ہیں۔ اس سے آگے گہرا سمندر ہے اور یہاں سے سالمن واپس جاتی ہیں۔ آبی حیات کے ماہرین سالمن کی اس حرکت کی وجہ نہیں سمجھ پائے ہیں کیونکہ ان مچھلیوں کو غذا ساحل کے ساتھ ملتی ہے اور اس پورے سفر میں یہ ساحل کے ساتھ ہی رہتی ہیں۔ صرف ویسٹ پام سے یہ کھلے سمندر کی طرف مڑتی ہیں۔

لیکن قدیم تہذیبوں اور آثاریات کے ماہرین کسی حد تک اس کی وضاحت کر سکتے ہیں۔ ان میں ایک جارج ایرکسن ہیں جن کی شمالی اور جنوبی امریکا کی قدیم تہذیبوں پر گہری نظر ہے اور وہ ان پر بیش بہا کام کر چکے ہیں۔ ان کا کہنا ہے۔ ”سالمن مچھلیوں کی اس غیر معمولی حرکت کی وضاحت کی جا سکتی ہے۔ ممکن ہے کسی زمانے میں یہ جگہ سمندر نہ ہو بلکہ کوئی بڑا جزیرہ ہو جو ویسٹ پام سے شروع ہو کر ہزار میل دور ٹرکس اینڈ کائکوس آئی لینڈز تک موجود ہو اور تب یہ سالمن مچھلیاں اس کے ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتی ہوں۔ ہزاروں سال پہلے اچانک یہ جزیرہ سمندر میں ڈوب گیا۔ مگر معصوم سالمن کو اس کی خبر ہی نہیں ہوئی۔ یہ ننھی مخلوق اپنی فطرت کی وفادار ہے اور جو اس کی فطرت میں ہے یہ وہی کرتی ہے۔ اس لیے گزشتہ ہزاروں برس سے سالمن مچھلیاں اسی راستے پر سفر کر رہی ہیں اور ان کو اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ وہ جزیرہ اب باقی نہیں رہا ہے۔“

کیا یہ سچ ہے کہ بہاماز کے سمندر میں کبھی کوئی اتنا بڑا جزیرہ تھا؟ اتنا بڑا جزیرہ جو ایک ہزار میل سے بھی زیادہ طویل تھا اور اس کی چوڑائی سو سے چار سو میل تک تھی۔ لیکن ہمیں تاریخ میں اس جزیرے کا کوئی ذکر نہیں ملتا سوائے فلسفی اور تاریخ داں افلاطون کی تاریخ کے۔ افلاطون جسے مغرب میں پلیٹو کہا جاتا ہے۔ اس نے اپنی کتاب تاریخ میں لکھا۔

”یہ جزیرہ اس یادگار کے بالکل سامنے تھا جسے ہم ہرکولیس کے ستون کہہ کر پکارتے ہیں۔ اگر لیبیا اور ایشیا کو ملایا جائے تب بھی یہ جزیرہ ان سے بڑا تھا اور کسی بھی دوسرے جزیرے سے فاصلے پر تھا۔ چاروں طرف سے گہرے سمندروں میں گھرا ہوا تھا۔ اس جزیرے پر ایک عظیم الشان تہذیب قائم تھی اور یہاں کے لوگ بہت ترقی یافتہ تھے۔ انہوں نے شیشوں سے توانائی حاصل کرنے کا طریقہ بنا لیا تھا۔ ان کے مال بردار تجارتی بحری جہاز ساری دنیا میں جاتے تھے اور ان کے شہر سونے چاندی اور دوسری قیمتی اشیا سے بھرے ہوئے تھے۔ پھر آتش فشاں پھٹے اور سمندر جزیرے پر چڑھ گیا۔ ایک رات اور ایک دن میں سارا جزیرہ سمندر تلے چلا گیا اور یہ تہذیب دنیا سے مٹ گئی۔ یہ آج سے آٹھ ہزار سال پہلے کی بات ہے۔“

افلاطون کا شمار ارسطو اور سقراط کے ساتھ اہلِ یونان کے تین عظیم ترین فلسفیوں میں ہوتا ہے۔ وہ خود ارسطو کا شاگرد تھا۔ افلاطون کو تاریخ سے دلچسپی تھی اور اس نے اس بارے میں ایک کتاب بھی لکھی تھی جس میں اس وقت تک یورپی اقوام کی تاریخ تفصیل سے لکھی تھی۔ لیکن ساتھ ہی اس نے مغرب کے سمندر میں ایک بڑے جزیرے کا ذکر بھی کیا تھا جس کا آج تک کوئی واضح ثبوت نہیں مل سکا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے دعویٰ کیا کہ اس جزیرے پر ایک بہت ترقی یافتہ اور جدید تہذیب آباد تھی۔ افلاطون نے اس قوم کی جو تصویر کشی کی ہے اس سے ایسا لگ رہا ہے کہ وہ قوم جو اس جزیرے پر آباد تھی۔ آج سے تقریباً چوبیس سو سال پہلے کے یونان سے کہیں زیادہ تہذیب یافتہ قوم تھی۔ جب کہ وہ افلاطون کے دور سے بھی کوئی آٹھ ہزار برس پہلے صفحہ ہستی سے نابود ہو چکی تھی، اس کا مسکن جزیرہ اچانک ہی سمندر کی تہ میں چلا گیا تھا اور یقیناً اس قوم کے کسی فرد کو بچ نکلنے کا موقع نہیں ملا ہوگا سوائے ان لوگوں کے جو اس وقت اپنے بحری جہازوں میں جزیرے سے کہیں دور تھے۔

افلاطون نے اس کی وجہ آتش فشاؤں کے پھٹنے سے آنے والے زلزلے کو قرار دیا تھا۔ افلاطون کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ دنیا کی تمام قوموں کو اسی قوم نے تہذیب اور جینے کا سلیقہ دیا۔ وہ صحیح معنوں میں تہذیب یافتہ تھے کہ اتنے ترقی یافتہ اور طاقت ور ہونے کے باوجود انہوں دنیا کو فتح کرنے اور دوسری اقوام کو اپنے زیر نگیں لانے کی کوشش نہیں کی اور اپنی تمام توانائیاں اپنی قوم اور ملک کے لیے صرف کر دی تھیں، یہی وجہ تھی کہ وہ آج سے کوئی گیارہ ہزار سال پہلے اپنی تباہی کے وقت ترقی کے عروج پر تھے۔

مگر یہی ترقی ان کی تباہی کی وجہ بن گئی۔ انہوں نے کرسٹلز کی توانائی سے سوئے ہوئے آتش فشاؤں کو چھیڑ دیا اور آتش فشاں پھٹ پڑے جس سے شدید زلزلے نے جنم لیا اور اس زلزلے نے اور اس سے پیدا ہونے والے سونامی نے پورے جزیرے کو غرقاب کر دیا۔ یہ ایک روایت ہے۔ کیا واقعی ایسا ہوا ہوگا؟ اس کا سائنسی ثبوت تو ہے کیونکہ بہاماز کا پورا سمندر آتش فشاؤں سے بھرا ہوا ہے، ان میں سے اکثر تو مردہ ہو چکے ہیں لیکن کچھ ابھی زندہ ہیں اور وقفے وقفے سے لاوا اگلتے رہتے ہیں جس سے اس سمندر کی سطح آہستہ آہستہ بلند ہو رہی ہے۔ یہی نہیں بلکہ زیرِ زمین جغرافیائی عوامل کی وجہ سے یہاں زمین اوپر آ رہی ہے۔ جو پہاڑی چوٹیاں پہلے سمندر کے اندر تھیں اب وہ باہر نکل آئی ہیں اور یہ زیادہ پرانی بات نہیں ہے بلکہ آج سے پچاس سال پہلے اس بات کو نوٹ کیا گیا کہ بہاماز کے سمندر کی گہرائی رفتہ رفتہ کم ہو رہی ہے اور بعض مقامات پر تو اس کی رفتار ایک میٹر سالانہ سے زیادہ ہے۔ یہ رفتار ہمالیہ کے بلند ہونے کی شرح سے دو سو گنا زیادہ ہے۔ اگر اس علاقے کے بلند ہونے کی یہی رفتار جاری رہی تو آج سے سو سال بعد یہاں بہت سارے علاقے سمندر سے باہر آ چکے ہوں گے۔ اس وقت عملاً بہاماز کا سمندر ختم ہو جائے گا کیونکہ بہاماز کے سمندر کا ستر فی صد حصہ صرف پچاس سے سو فٹ گہرا ہے۔ یہ پورا حصہ سمندر سے باہر نکل آئے گا اور سمندر صرف چند جھیلوں اور کھاڑیوں کی صورت میں باقی رہ جائے گا اور اگر مصنوعی کوشش کی گئی تو وہ پرانا جزیرہ دوبارہ بحال ہو جائے گا جو گیارہ ہزار سال پہلے ڈوب گیا تھا جسے اٹلانٹس کہا جاتا ہے۔

اس پورے علاقے میں دو سو سے زیادہ جزیرے ہیں جن میں بہاماز اور اینڈروس جیسے بڑے جزائر بھی ہیں۔ ان میں سے تیس سے زیادہ جزائر آباد ہیں۔ ممکن ہے یہ جزائر کسی زمانے میں اٹلانٹس کے بلند پہاڑ ہوں جو اب جزیروں کی صورت میں باقی رہ گئے ہیں۔

افلاطون کو اس جزیرے اور اس پر رواں دواں تہذیب کی اطلاع کس نے دی؟ اس نے اس کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ نہ تو جزیرے کی درست سمت بتائی اور نہ ہی اس کے جغرافیائی محل وقوع کے بارے میں کوئی اشارہ دیا۔ صرف اتنا کہہ دینا یقیناً کافی نہیں کہ وہ جزیرہ مغرب میں واقع سمندر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں تھا۔لیکن افلاطون کے مقام اور اس کی علمیت کے پیشِ نظر ہم اس کی بات کو مسترد نہیں کر سکتے۔اگر اس نے اس بات کو اتنا اہم جانا کہ اپنی کتاب میں اسے بیان کیا تو یقیناً اس کے پسِ پشت ٹھوس عوامل ہوں گے۔افلاطون کی ایک بات قابلِ غور ہے کہ ایک تو تمام دنیا کو تہذیب ان لوگوں نے دی اور دوسرے ان کا حلیہ اور لباس اہلِ یورپ اور خاص طور سے یونانیوں سے ملتا تھا۔اس جزیرے کی غرقابی کے کوئی آٹھ ہزار سال بعد اہلِ یونان وہی لباس استعمال کر رہے تھے نیز ان کا رنگ وروپ بھی غرقاب قوم جیسا تھا تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اٹلانٹس کے باسی اصل میں یورپ سے اس طرف گئے ہوں گے اور جب جزیرہ غرق ہو گیا تو بچ جانے والے اپنے پرانے ملک لوٹ آئے اور اہلِ یونان اصل میں ان کی اولاد تھی۔افلاطون کو کسی ذریعے سے یہ حقیقت معلوم ہوئی اور اس نے اس کا ذکر کر دیا۔مسئلہ یہ ہے کہ صرف افلاطون نے ہی کیوں اس کا ذکر کیا ہے باقی اور کسی مورخ کو اس بارے میں کیوں نہیں معلوم ہے۔

اگر اٹلانٹس نام کی تہذیب اس جگہ آباد تھی جہاں آج بہاماز کا سمندر ہے تو اس کا تعلق یقیناً امریکا کے قدیم باشندوں سے نہیں تھا۔کیونکہ وہ لوگ خود آخری برفانی دور میں اس وقت ایشیا سے آبنائے بیرنگ عبور کر کے الاسکا میں داخل ہوئے۔واضح رہے کہ الاسکا اور روس کے آخری حصے میں صرف بائیس میل کا فاصلہ ہے۔سال کے نو مہینے یہاں سردی سے سمندر منجمد رہتا ہے اور صرف دو مہینے کے لیے برف پگھلتی ہے۔کیونکہ یہاں زیرِ سمندر کوئی گرم پانی کی رو نہیں ہے بلکہ آرکٹک کے سمندر سے سرد پانی کی روئیں نکلتی ہیں جن کے اثر سے جاپان اور کوریا تک کے سمندر سردیوں میں جم جاتے ہیں۔جب کہ اس طویل البلد پر ہونے کے باوجود امریکا اور کینیڈا کی ساحلی پٹی جمنے سے محفوظ رہتی ہے کیونکہ وہاں گرم پانی کی رو بہتی ہے۔

الاسکا سے یہ قدیم نسل کے لوگ پھیلے اور پہلے شمالی امریکا اور اس کے بعد درمیانی پٹی سے گزرتے ہوئے جنوبی امریکا کے آخری سرے تک چلے گئے تھے۔الاسکا میں داخل ہونے کے تین ہزار سال کے اندر یعنی آج سے کوئی پانچ ہزار سال پہلے یہ جنوبی امریکا کے انتہائی جنوبی جزائر تک پہنچ چکے تھے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ کتنی تیزی سے پھیلے تھے۔جب گورے اس براعظم تک پہنچے تو یہاں دس کروڑ سے زیادہ لوگ آباد تھے اور آج ان کا نام ونشان نہیں ملتا ہے۔لیکن ان لوگوں کا اٹلانٹس کی سلطنت سے کوئی تعلق نہیں تھا کیونکہ اس کے خاتمے کے بھی کوئی دو ہزار سال بعد یہ الاسکا میں آئے تھے اور یقیناً بہاماز کے علاقے تک آنے میں ان کو مزید ایک ڈیڑھ ہزار سال لگے ہوں گے۔دوسرے قدیم انڈین باشندوں کے ڈی این اے ٹیسٹ سے ظاہر ہے کہ اصل میں یہ ہن نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ہن نسل میں چین، کوریا، جاپان، مشرقِ بعید، انڈونیشیا اور سائبیریا میں آباد ہونے والے شکاری قبائل تھے اور یہی شکاری قبائل آبنائے بیرنگ کراس کر کے شمالی امریکا میں داخل ہوئے تھے۔

تمام ہی ریڈ انڈین کہلانے والے قبائل میں یہ شعور بہت گہرا ہے کہ ان کے آباؤاجداد شمال میں ایسی سرزمین سے آئے تھے جہاں سارے سال برف جمی رہتی ہے اور ایسی سرزمین صرف الاسکا اور سائبیریا کی ہو سکتی ہے۔ان کی کسی کہانی یا روایت میں کسی جزیرے کا ذکر نہیں ملتا اور نہ ہی انہوں نے کبھی سمندری سفر کا دعویٰ کیا۔بلکہ یہ سمندری سفر سے اس حد تک متنفر تھے کہ شمالی اور جنوبی امریکا کے دونوں طرف کی ہزاروں میل طویل پٹی پر آباد ہونے کے باوجود یہ کبھی کھلے سمندر میں نہیں گئے اور جو لوگ سمندر میں مچھلیاں پکڑنے جاتے تھے وہ بھی ساحل کے پاس ہی رہتے تھے۔ان کے پاس بہت چھوٹی کشتیاں ہوتی تھیں جن میں کھلے سمندر کا سفر کسی طرح سے ممکن نہیں تھا۔اگر وہ کسی جزیرے سے آئے ہوتے تو یقیناً ان کو جہاز رانی کے طریقے آتے ہوتے لیکن ریڈ انڈین کی تاریخ میں کبھی کسی سمندری سفر کا ذکر نہیں ملتا۔حتیٰ کہ جب مایا اور انکا تہذیبیں قائم ہوئیں اور انہوں نے وسیع رقبے پر حکومت کی۔ان کی باقاعدہ انتظامی مشینری، آباد شہر اور فوجیں تھیں تب بھی انہوں نے سمندر کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔

بعض ماہرینِ آثاریات ریڈ انڈین قبائل کو اٹلانٹس قوم کے بچے کھچے افراد قرار دیتے ہیں۔لیکن ان کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے کہ بے حد ترقی یافتہ اٹلانٹین نے مکمل تباہی سے پہلے شمالی اور جنوبی امریکا پر کوئی توجہ کیوں نہیں دی جبکہ وہ ہزاروں سال سے ان دونوں براعظموں کے بالکل پاس آباد تھے۔بلکہ اگر جزیرے کا محلِ وقوع بہاماز کو تسلیم کر لیا جائے تو شمالی امریکا کا ساحل یقیناً جزیرے کے ساحل سے نظر آتا ہوگا جب کہ جزیرے کی جنوب مغربی سمت سے ٹرکس اینڈ کائکوس سے جنوبی امریکا کی سرزمین پر وینزویلا

کا ساحل صرف ہزار میل دور ہے اور یہ ہزار میل بھی کھلا سمندر نہیں ہے بلکہ درمیان میں ہیٹی اور ڈومینیکن ری پبلک سمیت کئی جزائر آتے ہیں اور اٹلانٹین یقیناً ان سے بے خبر نہیں ہوں گے۔ظاہر ہے جس جزیرے کے لوگ مال بردار بحری جہاز لے کر ساری دنیا میں جاتے تھے وہ اپنے آس پاس کی سرزمینوں سے کس طرح بے خبر ہو سکتے تھے۔

اس کے باوجود اٹلانٹین نے ان براعظموں پر آباد ہونے کی کوشش نہیں کی۔اس کی دو ہی وجوہات سمجھ میں آتی ہیں۔ایک تو وہ ترقی یافتہ تھے اور انہوں نے اپنی سرزمین پر تمام آسائشیں مہیا کر لی تھیں دوسرے وہ شاید اجنبی سرزمینوں پر جانے کے قائل نہیں تھے۔اس لیے شمالی اور جنوبی براعظموں سے واقف ہونے کے باوجود وہ اٹلانٹس کے جزیرے پر رہے اور یہی چیز ان کے اس طرح خاتمے کا سبب بن گئی کہ آج کرۂ ارض پر اٹلانٹین نامی قوم کا کوئی وجود نہیں ہے۔وہ سب اٹلانٹس میں رہے اور جب جزیرہ مٹا تو ان کا وجود بھی مٹ گیا۔بس وہی معدودے چند لوگ بچے جو اس وقت بحری جہازوں میں دنیا کے دور دراز علاقوں میں موجود تھے۔جب وہ واپس آئے تو انہوں نے اپنے جزیرے کی جگہ سمندر پایا اور پھر ان کو دوسری سرزمینوں پر جانا پڑا ہو۔اس وقت ممکن ہے انہوں نے جنوبی اور شمالی امریکا کا رخ کیا ہو۔

جارج ایرکسن جو اٹلانٹس نامی جزیرے کا قائل ہے اس نے اس امر پر تحقیق شروع کی کہ جب اٹلانٹس تباہ ہوا تو بچ جانے والے لوگ کہاں گئے۔جارج کی توجہ کا مرکز میکسیکو میں یوکاٹان پینیسولا کا علاقہ بنا جہاں قدیم آثار ملے ہیں اور ان میں ایک اہرام بھی ہے۔اس سیڑھی دار بلند اہرام کے چاروں طرف صحن میں بے شمار ستون کھڑے ہیں۔ایسا لگ رہا ہے جیسے ان ستونوں پر کبھی کوئی عالی شان عمارت کھڑی تھی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ عمارت گر گئی اور اس کے ستون باقی رہ گئے۔ان ستونوں کی تعداد سو سے بھی زیادہ ہے اور ان کی اونچائی تیس چالیس فٹ تک ہے۔حیرت انگیز طور پر بہت بھاری یہ ستون ایک ہی پتھر سے تراش کر بنائے گئے ہیں اور ان کا وزن کسی طرح دس ٹن سے کم نہیں ہے۔اس بارے میں جارج ایرکسن کا کہنا ہے۔

''قدیم انکا اور آزٹک قبائل عمارت سازی کے ماہر نہیں تھے۔میں نے ان کی بنائی عمارتیں دیکھی ہیں، وہ زیادہ تر چھوٹے پتھر اور مٹی کی پکی اور کچی اینٹوں کا استعمال کرتے تھے۔بہت بڑے اور بھاری وزن والے پتھر ان کی کسی تعمیر میں شامل نہیں ہیں۔جبکہ یوکاٹان کے اس اہرام کی تعمیر میں دس اور پندرہ ٹن وزنی پتھر بھی استعمال ہوئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ یہ عمارت کئی ہزار سال گزرنے کے بعد آج بھی صحیح سلامت ہے۔جب کہ انکا اور آزٹکس کی بنائی دوسری تعمیرات تباہ ہو چکی ہیں۔اور اس کا الزام صرف اسپینی حملہ آوروں پر نہیں لگایا جا سکتا کیونکہ انہوں نے تو ان اہراموں کو بھی تباہ کرنے کی پوری کوشش کی لیکن یہ ان کی کوششوں سے کہیں زیادہ مضبوط ثابت ہوئے۔یوکاٹان کے علاقے میں اس اہرام کے ساتھ ایک بہت بڑا قلعہ بھی ہے اور اسے بھی پتھروں سے تعمیر کیا گیا ہے جب کہ اس سے پہلے یہاں ہمیں پتھروں کی کوئی تعمیر نہیں ملتی ہے۔

صرف یوکاٹان ہی نہیں میکسیکو میں جہاں جہاں بھی انکا اور آزٹک لوگوں نے کوئی تعمیر کی وہ آسانی سے بن جانے والی اور بہت سادہ انداز میں تعمیر کی گئی کیونکہ ان کے پاس پتھروں کو کاٹنے والے آلات نہیں تھے۔وہ دھاتوں میں صرف سونے اور چاندی کا استعمال جانتے تھے۔ان دھاتوں سے کوئی آلہ نہیں بن سکتا ہے اس لیے وہ بھی اسے صرف برتنوں اور کچھ گھریلو اشیا کی تیاری میں استعمال کرتے تھے۔ان کے پاس کوئی دھات کا بنا ہوا ہتھیار نہیں ہوتا تھا۔وہ پتھر اور جانوروں کی ہڈیوں سے بنے اوزار اور ہتھیار استعمال کرتے تھے۔

پھر یوکاٹان کی تعمیرات میں ہمیں نہ صرف نقاشی اور مجسمہ سازی نظر آتی ہے بلکہ اس میں وہ اعلیٰ معیار جھلکتا ہے جو یونان کا خاصہ رہا ہے۔دیواروں کے ساتھ جانوروں کے مجسمے نہایت نفاست سے تراشے گئے ہیں۔حیرت انگیز طور پر ان میں ہاتھی کا مجسمہ بھی ہے۔اگرچہ یہ بالکل ہاتھی کی طرح نہیں بنایا گیا ہے بلکہ کسی قدر مختلف ہے لیکن اس میں سونڈ اور ہاتھی کے چوڑے ماتھے کا انداز نمایاں ہے۔شمالی وجنوبی امریکا میں ہاتھی نہیں پائے جاتے تھے، اس لیے انکا یا آزٹک قبائل ہاتھی کا مجسمہ کس طرح بنا سکتے تھے۔اس کے علاوہ ان دیواروں پر گینڈے کی شبیہ بھی موجود ہے جب کہ شمالی وجنوبی امریکا میں گینڈے بھی نہیں پائے جاتے تھے۔

سب سے اہم شہادت جو ہمیں بتاتی ہے کہ انکا یا آزٹک ان تعمیرات کے خالق نہیں ہو سکتے..... وہ اہرام اور قلعے میں دیواروں پر بنے انسانی چہرے ہیں۔یہ انکا قبائل کے مخصوص چہروں سے بالکل مختلف لمبے منہ اور سر والے اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھڑے نقوش والے چہرے ہیں جیسے کہ یورپیوں کے ہوتے ہیں اور ان پر مونچھیں بھی ہیں۔ جب کہ انکا قبائل کے چہرے اس سے بالکل مختلف ہوتے ہیں، وہ چوڑے اور بیٹھی ہوئی ناکوں والے لوگ تھے اور پورے جنوبی اور شمالی امریکا میں کسی ایک چہرے کی شبیہہ پر مونچھیں موجود نہیں ہیں۔ ان لوگوں کو قدرتی طور پر رُواں نہیں آتا تھا اور ان میں بہت کم لوگوں کی معمولی سی شیو اور مونچھیں ہوتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بنائی انسانی شبیہوں پر ہمیں مونچھیں یا ڈاڑھی نظر نہیں آتی ہے۔

اگر انکا یا آزٹک قبائل نے یہ اہرام اور اس سے ملحقہ عمارات اور مجسمے نہیں بنائے تھے تو پھر کن لوگوں نے یہ کام کیا تھا؟ میرے پاس اس سوال کا جواب اٹلانٹین قوم کی صورت میں موجود ہے۔ جب اٹلانٹس زلزلے اور آتش فشاں پھٹنے سے سمندر میں ڈوب گیا تو اس کے بچ جانے والے افراد نے جنوبی امریکا کے اس علاقے کا رخ کیا۔ پتھروں سے عمارتیں بنانا اٹلانٹین قوم کو آتا تھا اور انہوں نے یوکاٹان میں یہ پتھریلا اہرام اور اس سے ملحق قلعہ نما آبادی بنادی۔

جو لوگ اٹلانٹس پر ایک عظیم الشان تہذیب ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ وہ پتھر کی ناقابلِ یقین حد تک وزنی عمارات تعمیر کرنے کے ماہر تھے جیسا کہ مجھے یوکاٹان میں نظر آیا ہے۔ جب کہ انکا اور آزٹک ایسی عمارات نہیں بناتے تھے۔ اہرام اور اس سے ملحقہ قلعہ اور دوسری تعمیرات اعلیٰ درجے کی تھیں جب کہ انکا اور آزٹک لوگوں نے جو تعمیرات میکسیکو اور جنوبی امریکا کے دوسرے علاقوں میں کیں وہ معمولی درجے کی اور ویسی ہی تھیں جیسی انکا جتنی ترقی یافتہ قوم کرسکتی تھی۔ ان میں چونکا دینے اور حیران کرنے والی کوئی بات نہیں تھی۔ جب کہ یوکاٹان کی تعمیرات میں یہ دونوں باتیں موجود تھیں۔ یہ حیران بھی کرتی تھیں اور چونکاتی بھی تھیں۔ حیران اس لحاظ سے کہ اتنے وزنی پتھروں سے یہ اہرام اور قلعہ کس طرح تعمیر ہوا، دس ٹن تک وزنی ستون کس طرح زمین میں نصب کیے گئے جو آج تک نصب ہیں۔ چونکانے والی بات ان تعمیرات پر بنائے گئے نقش ونگار ہیں جو انکا یا آزٹک تہذیبوں سے تعلق نہیں رکھتے ہیں۔

جارج ایرکسن کی تحقیق قابلِ قدر ہے۔ لیکن اس سلسلے میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یوکاٹان کی تعمیرات اصل میں بچ جانے والے اٹلانٹین افراد نے کی تو پھر وہ اسے چھوڑ کر کیوں چلے گئے۔ جارج ایرکسن کے خیال میں اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ بچ جانے والے افراد کا اس سرزمین پر دل نہیں لگا تھا کیونکہ یہ انسانوں سے خالی تھی اور یہاں بس وہی تھے۔ اس لیے وہ بحری جہازوں میں بیٹھ کر کہیں اور چلے گئے۔ وہ ایشیا، افریقا اور یورپ سے واقف تھے جہاں انسان موجود تھے۔ دوسرے انکا قبائل یہاں تک آ پہنچے اور وہ تعداد میں زیادہ اور جنگجو ذہنیت رکھتے تھے۔ اٹلانٹین ان کا مقابلہ نہیں کرسکے اور یہاں سے جانے پر مجبور ہوگئے۔ جہاں تک اٹلانٹین کے کہیں اور جانے کا تعلق ہے تو ساری دنیا ان کے لیے کھلی تھی۔ جب انہوں نے اتنی شاندار تعمیرات کی تھیں تو یقیناً اپنے تباہ ہونے والے بحری جہاز بھی پھر سے بنالیے ہوں گے اور وہ ان میں سوار ہوکر ان علاقوں کی طرف گئے ہوں جہاں کبھی ان کے تجارتی بحری جہاز جاتے ہوں گے۔ لیکن جب وہ وہاں پہنچے تو ان آبادیوں کو بھی نابود پایا اور ان کی جگہ وہاں نیم وحشی چرواہے موجود تھے۔ اس لیے اٹلانٹین کو نئے سرے سے لوگوں کو تہذیب سکھانی پڑی ہوگی۔

جس وقت جارج ایرکسن میکسیکو اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں گمشدہ اٹلانٹس تہذیب کے نشانات تلاش کرتا پھر رہا تھا اس وقت سائنس دان ڈاکٹر گریگ لٹل اور اس کی بیوی ڈاکٹر لورالٹل بہاماز کے سمندر میں اس غرق ہوجانے والی تہذیب کے آثار تلاش کررہے تھے۔ دونوں میاں بیوی نے نفسیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی تھی اور وہ وکیل بھی تھے۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر ان کو اٹلانٹس کی گمشدہ تہذیب کی تلاش سے دلچسپی تھی۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ بہاماز کے سمندر میں جاکر اٹلانٹس کے ڈوبے ہوئے آثار تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔ انہوں نے اپنے مقاصد طے کیے اور پھر وہ بہاماز کے لیے روانہ ہوگئے۔

بہاماز کا سمندر دنیا کی مصروف ترین سمندری گزرگاہ ہے۔ بڑے سمندری ٹریفک کے علاوہ یہاں دنیا کی کل تفریحی کشتیوں کا چالیس فی صد پایا جاتا ہے۔ اس لیے سال بھر میں سمندر کا شاذ ہی کوئی حصہ انسانوں سے خالی ہوتا ہے۔ یہاں زیرِ آب غوطہ خوری کا سلسلہ جاری رہتا ہے، ان میں شوقیہ اور پیشہ ور دونوں طرح کے غوطہ خور ہیں۔ شوقیہ جو زیرِ آب دنیا دیکھنا چاہتے ہیں اور پیشہ ور جو یہاں مختلف کاموں اور آثار تلاش کرنے کے لیے غوطہ لگاتے ہیں۔ بہاماز کے سمندر میں بے شمار خزانوں سے لدے جہاز ڈوبے پڑے ہیں۔ اسپینی حملہ آور جب شمالی اور جنوبی امریکا

پہنچے تو انہوں نے وہاں مقامی باشندوں کو قتل کرکے ان کی دولت کو لوٹ لیا۔ سونے چاندی سے لدے بحری جہاز بہاماز کے راستے ہی واپس یورپ جاتے تھے اور راستے میں طوفانوں اور دوسری وجوہات کی بنا پر بے شمار جہاز ڈوب گئے تھے۔ خزانوں کے متلاشی بھی یہاں غوطہ خوری کرتے ہیں۔

اب سوال ہے کہ اگر یہاں کوئی جزیرہ جس پر ایک بڑی آبادی تھی اور اس آبادی نے بہت ساری تعمیرات کر رکھی تھیں ڈوب گیا تھا تب بھی زیرِ آب اس کے کچھ آثار ملنے چاہیے تھے اور کچھ آثار ملے بھی ہیں۔ لیکن یہ اتنے معمولی ہیں کہ ان کو کسی صورت گمشدہ اٹلانٹس کی دریافت قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ڈاکٹر لورا کہتی ہے۔

”سمندر میں ڈوب جانے کا مطلب ہے گم ہو جانا، نشان مٹ جانا۔ ایسا ہی کچھ اٹلانٹس جزیرے کے ساتھ ہوا۔ جب یہ زیرِ آب آگیا تو اس کے آثارات اور عمارات پر ریت چڑھ گئی۔ اس ریت پر پودے اگ آئے اور پھر یہاں مونگے کی چٹانیں تشکیل پانے لگیں۔ گیارہ ہزار سال کا وقت کم نہیں ہوتا ہے۔ اس دوران میں سب کچھ گزوں موٹی ریت کی تہ تلے چھپ جاتا ہے اور کیونکہ یہ گرم پانی کا علاقہ ہے اس لیے یہاں اتھلے پانی میں مونگے کی چٹانیں تشکیل پاتی ہیں۔ زیرِ آب جہاں بھی سمندر کی گہرائی بیس سے سوفٹ ہے وہاں نوے فی صد مونگے کی چٹانیں قبضہ جما چکی ہیں۔“

ڈاکٹر گریگ اور لورا نے بہاماز کے ایک علاقے جو جزیرہ اینڈروس سے کچھ ہی فاصلے پر تھا یہاں زیرِ آب آثار کی تلاش کا کام شروع کیا۔ اس علاقے کی نشان دہی ایک زیرِ آب جانے اور وہاں فوٹو گرافی کرنے والی ٹیم نے کی تھی۔ ان کو یہاں زیرِ آب ایسے قطعات نظر آئے جیسے پتھروں سے بنی ایک بڑی چوڑی اور ہموار سڑک ہو۔ یہ پانی میں کوئی پچاس سے ساٹھ فٹ کی گہرائی میں ہے اور اس کی لمبائی ایک ہزار چھ سوفٹ سے زیادہ ہے۔ بیمنی روڈ کہلانے والی اس سڑک کی دریافت 1968ء فضا میں اڑتے ایک طیارے کے پائلٹ نے کی جب اس نے سمندر میں پتھروں سے بنی ایک سڑک نما چیز دیکھی۔ دو سال بعد جیالوجسٹوں نے اس سڑک کے پتھر ڈھونڈ کر نکال لیے تھے۔ یہ جزیرے سے لے کر سمندر میں دور تک چلی گئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ جگہ جو اینڈروس کے شمال مغرب میں ہے اٹلانٹس کی بندرگاہ کی طرف آنے والی سڑک تھی کیونکہ یہ جگہ قدرتی طور پر ایک

فنی تجربات

تھامپسن اسپتال (لندن) کے ماہر برقیات ڈاکٹر والٹر جے کلنر کیلشیم کے فاسفورنٹ سلفائڈ پر N شعاعوں کے بارے میں تجربات کررہے تھے کہ انہیں یہ خیال آیا کہ جسم انسانی سے توانائی کی جو لہریں خارج ہوتی ہیں، اس کی چھان بین کی جائے۔ ڈاکٹر والٹر جے کلنر کو صرف یہ علم تھا کہ حرارت کے علاوہ جسم انسانی سے جو انرجی خارج ہوتی ہے، اس کا تعلق بائیں سرخ (انفراریڈ) سے ہے۔ ڈاکٹر کلنر نے ایک ایسا فوٹوگرافی پردہ (فلم) تیار کرنے کی کوشش کی جس کے ذریعے جسم انسانی سے نکلنے والے ”ہالۂ نور“ کا مطالعہ کیا جاسکے۔ چنانچہ انہوں نے مختلف کیمیاوی محلولوں سے فلموں کو رنگا لیکن ناکامی ہوئی اور انسانی جسم سے نکلنے والی بائیں سرخ شعاعیں کسی پردے پر نظر نہ آسکیں۔ آخر انہوں نے کولتار کے کیمیاوی مواد سے فلم کو رنگنے کا ایک کیمیاوی مسالا تیار کیا اور شیشے کی ایک اسکرین پر پہلے جے لٹن اور کول ڈین نامی مرکبات کا ایک استر تیار کیا۔ اس کے بعد اپنی مشہور اسکرین کو ایجاد کیا جسے مابعد النفسیات میں ”آسٹرل باڈی“ یوگ میں شکما شریر اور تصوف میں جسم مثالی کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر والٹر جے کلنر نے اپنی کتاب ”ہیومن ایٹ ماسفیر“ میں نہایت تفصیل کے ساتھ انسان کے ہالۂ نور پر روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر کلنر کی تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ انسانی جسم سے توانائی کا جو اخراج (تابکاری، ریڈی ایشن) ہوتا ہے، وہ ایک دائرے کی طرح انسانی جسم کے گرد نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر کلنر نے اپنے اسکرین پر انسانی ہمزاد کو بھی دیکھا۔ اسے وہ ایتھرک ڈبل کہتے ہیں۔ ہمزاد ایک شفاف سایہ ہے جو انسان کے ٹھوس جسم سے ایک انچ باہر کی طرف ہوتا ہے۔ اس ہمزادی جسم یا ہالے کے اندر ایک اور جسم ہوتا ہے جو پہلے جسم کے مقابلے میں لطیف تر ہے اسے ”جسم مثالی“ کہتے ہیں پھر اس جسم مثالی کے اندر ”روحانی وجود“ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کلنر کی تحقیقات کا نچوڑ یہ ہے کہ انسان کے ایتری جسم (ایتھرک ڈبل) کا رنگ بھورا خاکستری ہوتا ہے اور کبھی کبھی اس کا پھیلاؤ آٹھ انچ تک ہوجاتا ہے۔

اقتباس AuraBy Nil O Thompson

مرسلہ: روبی جوکھیو، حیدرآباد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بہترین بندرگاہ ہوسکتی تھی۔ یہ سب بہت بڑے پتھر تھے اور ان کو رگڑ کر اور تراش کر بہت مہارت اور صفائی سے جوڑا گیا تھا۔ پتھروں کی یہ سلیں خاصی وزنی تھیں اور ان کو لگانے کا مقصد ایک ایسی سڑک تیار کرنا تھا جو بے انتہا وزن بھی برداشت کرلے۔ اس کا مطلب ہے کہ اٹلانٹس کی بندرگاہیں بہت مصروف رہا کرتی تھیں کیونکہ کسی معمولی بندرگاہ کے لیے اتنی چوڑی اور مضبوط سڑک بنانے کی ضرورت نہیں تھی۔

لیکن کیا یہ واقعی کسی بندرگاہ کی سڑک تھی جسے انسانوں نے بنایا تھا یا سمندر میں پایا جانے والا ہموار پتھر جو تھلے پانی میں آتی جاتی لہروں سے گھس کر سیدھا اور چکنا ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر گریگ کا اس بارے میں کہنا ہے۔ ”کوئی بھی سمندری چٹان جو گھس کر سیدھی ہو جاتی ہے وہ بالکل چوکور نہیں ہوتی ہے بلکہ وہ گول، تکونی یا ہشت پہلو ہوسکتی ہے جب کہ بیمنی روڈ کے پتھر بالکل چوکور ہیں اور ایک ہی سائز کے چوکور ہیں۔ اس کا مطلب ہے یہ قدرتی ساحلی چٹانیں نہیں ہیں۔“

پھر بہاماز کے سمندر پر تحقیق کرنے والوں نے سمندر کے اندر ماربل اور پتھر سے بنی ہوئی مختلف اشکال دریافت کیں، یہ دیوار نما اور بنیادوں جیسی تھیں۔ یہ سب تناسب زاویے رکھتی ہیں جو قدرتی چٹانوں اور پتھروں میں نظر نہیں آتے ہیں۔ ڈاکٹر گریگ لٹل اور اس کی بیوی جب اس علاقے میں تحقیق کرنے آئے تو ان کو توقع تھی کہ کامیابی اتنی آسانی سے نہیں ملے گی لیکن یہ کام ان کی توقع سے زیادہ مشکل ثابت ہوا تھا۔ جب وہ زیرِ آب بیمنی سڑک دیکھنے اترے تو اس کے بیشتر حصے پر ریت چھا چکی تھی اور اب وہاں سوائے ٹرٹل گھاس کے اور کچھ نہیں تھا لیکن جزیرے تک سڑک کے واضح آثار موجود تھے۔ انہوں نے جزیرے کے پاس اتھلے پانی میں ریت ہٹا کر ان چٹانوں کا معائنہ کیا تھا اور انہوں نے پتھروں کو آپس میں جڑے پایا تھا۔

ان کو اصل کامیابی اس جگہ سے کوئی سو میل دور بہاماز کے سب سے بڑے جزیرے اینڈروس کے دوسری طرف ایک چھوٹی سی خلیج میں حاصل ہوئی۔ جب وہ تحقیق کے لیے یہاں آئے تو انہوں نے زیرِ آب تلاش کے لیے ایک نیا طریقہ سوچا تھا۔ ان کے پاس تار کی مدد سے پانی میں لٹکایا جانے والا ایک چھوٹا سا لیکن جدید کیمرا تھا۔ پانی میں خود جانے کے مقابلے میں وہ اس کیمرے کی مدد سے تہ کو زیادہ تیزی سے اور بہتر طریقے سے کھنگال سکتے تھے۔ ساحل سے کوئی دو ناٹیکل میل کے فاصلے پر انہوں نے اپنا کیمرا استعمال کیا تو ان کو فوراً ہی پتھروں سے بنا ایک بہت بڑا پلیٹ فارم نظر آ گیا۔ اس کے پتھر بھی بیمنی روڈ کی طرح جڑے ہوئے تھے لیکن یہ اس کے مقابلے میں کہیں بڑے تھے اور ان کا سائز کم سے کم بارہ بائی پندرہ فٹ تھا اور یہ سب ایک ہی انداز کے تھے۔

اینڈروس کے ساتھ یہ ایک اتھلی خلیج ہے جس میں پانی کہیں بھی چالیس فٹ سے زیادہ نہیں ہے لیکن اس سے پہلے یہ پتھر جنہیں ڈاکٹر گریگ نے اینڈروس پلیٹ فارم کا نام دیا ہے نظر نہیں آئے تھے۔ ڈاکٹر گریگ کا خیال ہے کہ 1992ء میں ہری کین اینڈریو نے اس پورے علاقے کے سمندر کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور اس نے یہاں تہ سے ریت صاف کر دی جس سے یہ پلیٹ فارم نکل آیا تھا۔ انہوں نے اس جگہ کو پہلے 2000ء میں دیکھا تھا اور اس کے بعد وہ 2003ء میں یہاں پھر آئے تھے۔ اس بار انہوں نے خود غوطہ لگا کر اس پلیٹ فارم کا تفصیلی معائنہ کیا اور یہ حیرت انگیز چیز ثابت ہوئی تھی۔ انہوں نے پتھروں کے سیدھے کنارے دیکھے جو آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ قدرتی چٹانوں میں یہ انداز نہیں ہوتا ہے۔ انہوں نے اس پلیٹ فارم کا سائز ناپا یہ کوئی ساڑھے چار سو گز لمبا اور کوئی پچاس گز چوڑا تھا۔ اس میں وسط میں لمبے پتھر بھی لگے تھے جس کی لمبائی تیس فٹ تھی اور یہ بے حد مناسب ڈیزائن کی صورت میں تھے۔

2006ء میں یہاں ایک اور بڑا ہری کین آیا اور اس نے سمندر کو تہ و بالا کر دیا تھا اس لیے گریگ اور لورا اس امید پر یہاں آئے کہ سمندر کی ریت تلے سے کچھ اور بھی نکل آیا ہوگا۔ ایسا ہی کوئی اور پلیٹ فارم یا کچھ اور جو کسی انسان کا بنایا ہوا ہو لیکن ان کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ سمندر میں کچھ بھی نیا نہیں ملا بلکہ اینڈروس پلیٹ فارم بھی مٹی تلے چھپ چکا تھا اس پر گھاس اگ آئی تھی اور کہیں کہیں مونگے کی چٹانوں کی تشکیل بھی شروع ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر لورا نے مایوسی کے عالم میں کہا۔ ”لگتا ہے اٹلانٹس ابھی اپنا وجود ظاہر کرنے کے موڈ میں نہیں ہے۔“

اٹلانٹس کی یہاں موجودگی کے بارے میں پُریقین ڈاکٹر گریگ کا کہنا ہے۔ ”میرا خیال ہے کہ اٹلانٹین پر کوئی ناگہانی آفت اچانک نازل ہوئی تھی اور ان کو سنبھلنے کا موقع نہیں ملا۔ ممکن ہے خلا سے کوئی شہابیہ آ کر اس جگہ گرا ہو۔ اس کے گرنے سے ایک طرف تو سمندر میں تباہ کن لہر پیدا ہوئی ہو

اور دوسری طرف اس تصادم نے زیرِ آب آتش فشاؤں کو جگا دیا ہو اور دونوں نے مل کر اٹلانٹس کو ڈبو دیا ہو۔“

لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ ایسا ہی ہوا ہو گا۔ شکاگو پلانٹری میں کام کرنے والا فلکیات دان ڈاکٹر مارک ہیمر گرین کا کہنا ہے کہ ایک چھوٹا شہابیہ یہ کام کر سکتا ہے اور ممکن ہے وہ جس جگہ سمندر میں گرا ہو وہاں گہرائی زیادہ ہو اور اس وجہ سے تصادم کا کوئی نشان باقی نہیں رہا ہے۔ ایک دو سو میٹرز قطر کا شہابیہ تیس ہزار میل فی گھنٹے کی رفتار سے گرتے ہوئے سمندر میں تباہ کن لہر پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن ہمیں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے۔ دوسرے ایسا شہابیہ لہر تو پیدا کر سکتا ہے لیکن وہ کسی بڑے جزیرے کو سمندر میں ڈبو نہیں سکتا..... ایک ایسا تصادم جس میں ایک بڑا جزیرہ مکمل طور پر نابود ہو جائے میرے حساب سے بہت زیادہ اثرات کا حامل ہوگا اور اس کا اثر در حقیقت پوری دنیا پر پڑے گا اور اس میں کسی کے بچ نکلنے کا امکان نہیں ہوگا چاہے وہ سمندر میں کہیں پر بھی ہو۔ بڑے تصادم سے بہت بڑے سونامی نے جنم لیا ہوگا جس نے نہ صرف جزیرے کو تباہ کر دیا ہوگا بلکہ اس نے شمالی اور جنوبی امریکا، یورپ اور افریقا کے ساحلی علاقوں کو دور تک تہ و بالا کر دیا ہوگا۔ اس سے بچنا ناممکن ہوگا۔ اس لیے شہابیے سے تباہی کا امکان بہت کم ہے۔ اگر یہاں کبھی اٹلانٹس تھا تو ممکنہ طور پر وہ کسی شدید زلزلے اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے سونامی سے تباہ ہوا ہوگا۔

لیکن کیا کوئی سونامی کسی سرزمین کو دبا کر سمندر میں کئی سو فٹ کی گہرائی تک لے جا سکتا ہے؟ ماہرینِ ارضیات کے نزدیک اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔ سونامی اصل میں زیرِ سمندر آنے والے زلزلے کی وجہ سے پیدا ہونے والی لہر ہے جو خشکی پر چڑھ جاتی ہے۔ یعنی سونامی میں پانی کی لہر اٹھتی ہے اس میں کوئی زمین یا جزیرہ نیچے کی طرف نہیں دھنستا ہے۔ جب سونامی کی لہر واپس چلی جاتی ہے تو زمین یا جزیرہ اسی طرح قائم رہتا ہے۔ جب کہ زیرِ آب آثار جو پچاس فٹ سے لے کر تقریباً چھ سو فٹ کی گہرائی میں ملتے ہیں، یہ آثار بتاتے ہیں کہ یہ زمین کبھی سمندر سے اوپر تھی اور کسی وجہ سے زمین دھنسی اور اب سمندر کے اندر ہے۔

افلاطون اس سلطنت کی غرقابی کا دورانیہ آج سے آٹھ ہزار سال پہلے کا بتاتا ہے۔ جب کہ قدیم تہذیبوں کے کھنڈر بتاتے ہیں کہ یہ بستیاں آج سے سات سے آٹھ ہزار سال پہلے آباد ہونا شروع ہوئی تھیں۔ ان تہذیبوں میں دریائے نیل، دریائے سندھ، دجلہ و فرات کی وادی اور چین میں یانگ سی کیانگ کی وادی میں آباد ہونے والی تہذیبیں تھیں۔ آج ماہرینِ آثاریات ہمیں بتاتے ہیں کہ اس سے پہلے انسان خانہ بدوشوں والی زندگی بسر کرتا تھا اور اپنے جانور لے کر چراگاہوں میں مارا مارا پھرتا تھا۔ کیا یہ بات معنی خیز نہیں ہے کہ جیسے ہی ایک طرف اٹلانٹس کی مفروضہ سلطنت تباہ ہوتی ہے دوسری طرف دنیا کے معروف دریاؤں کی زرخیز وادیوں میں انسانی آبادکاری کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ جو سب ایک دوسرے سے ہزاروں میل کے فاصلے پر ہیں۔ جیسے نیل کی وادی دجلہ و فرات کی وادی سے کوئی ہزار میل کے فاصلے پر ہے۔ دجلہ و فرات کی وادی سندھ کی وادی سے دو ہزار میل دور ہے اور یانگ سی کیانگ کی وادی سندھ سے کوئی تین ہزار میل کے فاصلے پر ہے۔ اتنی دوری پر اس زمانے میں ان وادیوں اور ان میں آباد ہونے والے اولین انسانوں میں رابطے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت لوگ اپنے اپنے علاقوں میں محصور ہوتے تھے اور آمد و رفت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ ابھی سمندری سفر شروع نہیں ہوا تھا۔ دریاؤں اور جھیلوں میں محدود کشتی رانی کی جاتی تھی۔ اس لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ ان دور دور آباد ہونے والی اولین تہذیبوں کے لوگوں نے تقریباً مشترک طریقے اپنائے۔ مثلاً انہوں نے کاشت کاری کے لیے ایک جیسے اوزار استعمال کیے، ہل چلانے کے لیے بیل، اونٹ اور گھوڑے استعمال کیے، گندم، کپاس، مکئی اور چاول کی کاشت شروع کی، سب نے دریاؤں سے نہریں نکالیں اور سب نے مٹی کی پکی اینٹوں سے گھر بنائے۔ ان کو کس نے یہ سب بتایا؟

آج سے آٹھ ہزار سال پہلے دنیا میں ایک شہر بھی نہیں تھا لیکن دو ہزار سال کے اندر درجنوں منظم شہر وجود میں آ گئے تھے۔ صرف پاکستان کے خطے میں ایسے تین شہر برآمد ہوئے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت انسان کتنی تیزی سے منظم ہوا تھا۔ ان تہذیبوں نے لکھنا پڑھنا شروع کیا۔ ان کو حساب آ گیا تھا اور انہوں نے سلے کپڑے پہننا شروع کر دیے تھے۔ اس وقت یہ مذہبی لحاظ سے بہت سادہ تھے اور مظاہرِ قدرت کی عبادت کرتے تھے۔ یعنی مذہب کے لحاظ سے یہ تقریباً سیکولر معاشرے تھے اور یہاں مذہب کی اور اس حوالے سے بعض خاص لوگوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ یعنی جن لوگوں نے ان تہذیبوں کے افراد کی مدد کی تھی انہوں نے مذہب کا معاملہ ان پر چھوڑ دیا تھا۔ اصنام اور بت پرستی شروع

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں ہوئی تھی اور اسے بہ طور مذہب ابھی تک پذیرائی نہیں ملی تھی۔ پھر معاشرے کے چالاک لوگوں نے مذہب کو بہ طور آزادی سلب کرنے والے آلے کے طور پر استعمال کرنا شروع کیا۔ انہوں نے مصنوعی دیوی دیوتا بنائے اور ان کے نام پر خود لوگوں پر حکومت کرنے لگے۔

فرض کر لیا جائے کہ اس وقت اٹلانٹس نامی ایک ترقی یافتہ سلطنت تھی جو اپنے زمانے میں ترقی کے ان مدارج تک پہنچ گئی تھی جن کے بارے میں ہم شاید آج بھی کچھ نہیں جانتے ہیں۔ سب سے اہم بات کہ انہوں نے یہ ترقی کسی ظلم یا کسی دوسری قوم کو محکوم بنا کر نہیں کی تھی بلکہ اپنے زورِ بازو پر اور علم اپنا کر کی تھی۔ انہوں نے اپنے جزیرے سے نکل کر دنیا کو ترقی کا درس دینا شروع کیا تھا لیکن انہوں نے کسی ملک پر قبضہ نہیں کیا کیونکہ تاریخی لحاظ سے ہمیں کسی بھی تہذیب میں ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے کہ انہوں نے کسی کی غلامی سے نجات پا کر ترقی کی تھی۔ اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ چرواہے قبائل یکا یک کاشت کار بن کر شہری زندگی میں داخل ہو گئے اور انہوں نے شاندار شہر آباد کیے۔ ان کو یہ سب اٹلانٹس کے باسیوں نے سکھایا تھا جو سامانِ تجارت لے کر ساری دنیا میں گھومتے تھے اور خرید و فروخت کرتے تھے۔ انہوں نے ان غیر مہذب چرواہوں کو تہذیب اور علم کی روشنی دی اور یہ کام انہوں نے خود کو ان پر تھوپے بغیر کیا۔ وہ بے غرضی سے ان لوگوں کے کام آئے تھے۔

اٹلانٹین اس زمانے میں گہرے سمندروں میں اتنے دور دراز کے ممالک کا سفر کر لیتے تھے۔ جیسے وہ ہندوستان اور چین تک پہنچے ہوئے تھے اور انہوں نے یقیناً شمالی اور جنوبی امریکا کو بھی چھانا ہوگا۔ لیکن اس زمانے میں وہاں انسانی آبادی نہیں تھی اس لیے وہ دوسرے انسانوں کی تلاش میں دنیا کے دور دراز خطوں تک جانے لگے۔ یقیناً انہوں نے بحری جہاز بنانے کی ٹیکنالوجی اور سمندری راستوں کا علم اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ ان کے بحری جہازوں میں ایسے آلات لگے تھے جو گہرے سمندر میں راستوں کی درست نشان دہی کرتے ہوں گے۔ ان کی مدد سے وہ بالکل درست مقام پر پہنچ سکتے ہوں گے۔ مثال کے طور پر مصر کے دریائے نیل کے ڈیلٹا تک، اسی طرح فرات و دجلہ کا مشترکہ ڈیلٹا، پھر سندھ اور چین میں یانگ سی کیانگ کا ڈیلٹا۔ گہرے سمندروں میں افق کے پار کچھ نظر نہیں آتا ہے اور راستہ تلاش کرنے کے لیے نہ صرف ستاروں اور سورج سے مدد لی جاتی ہے بلکہ قطب نما بھی ہونا لازمی ہے۔ اگر اٹلانٹین اس طرف آئے تھے اور جیسا کہ آثار بتاتے ہیں وہ آئے تھے تو ان کے پاس قابلِ اعتماد بڑے بحری جہاز اور ان میں دوسرے آلات لازمی ہوں گے۔

ایک گروہ کے ماہرینِ ارضیات اس معاملے میں ایک نظریہ اور بھی رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ طوفانِ نوحؑ سے پہلے انسان متمدن زندگی گزارنا سیکھ چکا تھا۔ اس نے دریاؤں کی وادیوں میں بستیاں بسالی تھیں اور وہ جہاز رانی کے طریقے بھی سیکھ چکا تھا۔ اس لیے صرف اٹلانٹس ہی ایک مہذب تمدن نہیں تھا بلکہ اس کے علاوہ بھی دنیا میں منظم معاشرے موجود تھے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اٹلانٹین دوسرے معاشروں سے اسی طرح زیادہ ترقی یافتہ ہیں جیسے آج امریکا کسی پسماندہ افریقی ملک کے مقابلے میں ترقی یافتہ ہے۔ اگر آج دنیا میں کوئی ایسی آفت آتی ہے جس سے امریکا صفحہ ہستی سے مٹ جاتا ہے اور دوسرے معاشرے بھی ختم ہو جاتے ہیں تو بچے کھچے انسان پھر سے آبادیوں کو بسائیں گے اور تمام ہنر و فنون و علوم کو دوبارہ سے حاصل کریں گے اور پھر کئی ہزار سال بعد ان کو پتا چلے گا کہ جہاں بحر اوقیانوس اور بحر الکاہل مل رہے ہیں وہاں کسی زمانے میں امریکا نامی ایک بڑا اور طاقت ور ملک تھا تو کیا ہم اس کے بارے میں بالکل اسی طرح قیاس آرائیاں نہیں کریں گے جیسے کہ آج اٹلانٹس کے بارے میں کر رہے ہیں۔

حالات بتاتے ہیں کہ اس وقت انسان اس سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھا جتنا کہ آج ہم سمجھتے ہیں۔ وہ کشتی سازی جانتا تھا۔ لہٰذا جب حضرت نوحؑ نے اپنی کشتی بنانی شروع کی تو ان کی بستی والوں نے تعجب کا اظہار نہیں کیا کہ وہ کیا چیز بنا رہے ہیں بلکہ وہ ان کا استہزا اڑاتے تھے کہ کیا وہ یہ کشتی خشکی پر چلائیں گے۔ یعنی ان کو کشتی کا علم تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ یہ کشتی کہاں استعمال ہوتی ہے۔ دوسرے حضرت نوحؑ کی کشتی اتنی بڑی تھی کہ اس میں تمام جانوروں کے جوڑے آ گئے تھے اور ہر پھل، سبزی اور پودے کا بیج بھی رکھ لیا گیا تھا۔ آپؑ کا دور آج سے کوئی آٹھ یا نو ہزار سال پہلے کا ہے۔ یعنی ٹھیک وہ وقت جب اٹلانٹس غرقاب ہوا تھا۔

ممکن ہے اس وقت دوسرے معاشروں کے لوگ بھی اتنے ہی ترقی یافتہ ہوں جیسے کہ آج ایشیا اور افریقا میں ہیں اور اٹلانٹس سے ان کے ایسے ہی تجارتی روابط ہوں جیسے کہ آج کل دنیا کے ممالک کے درمیان ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ

بڑے بحری جہاز بنانا جانتے تھے۔ حضرت نوحؑ کی کشتی کی جو لمبائی چوڑائی بیان کی جاتی ہے وہ آج کل کے بڑے بحری جہازوں سے کسی طرح کم نہیں ہے بلکہ ممکن ہے اس سے زیادہ ہی ہو۔ ذرا اس کشتی کا تصور کریں جس میں سو کے قریب انسان مع خوراک اور دوسرے سامان کے اور ہر جانور کا ایک ایک جوڑا سوار ہوا اور اس کی خوراک بھی ہو کیونکہ طوفانِ نوحؑ کے بعد مہینوں تک پانی نہیں اترا تھا اور خشکی کے آثار نظر نہیں آئے تھے پھر جب خشکی ملی تب بھی انسانوں اور جانوروں کو فوری خوراک نہیں ملی ہوگی بلکہ اس کے اگنے میں کچھ وقت لگا ہوگا تو کشتی میں انسانوں اور جانوروں کی کم سے کم ایک سال کی خوراک بھی ہوگی۔ اس لیے اس کی جسامت لازمی بہت زیادہ ہونی چاہیے۔

اس وقت انسان بڑے بحری جہاز بنانا اور گہرے سمندر میں سفر کرنا جانتا تھا۔ یعنی صرف اٹلانٹین نہیں تھے جو دوسرے ملکوں کا سفر کرتے تھے بلکہ دوسرے ملک والے بھی اٹلانٹس آتے ہوں گے۔ کیونکہ تجارت کبھی یک طرفہ نہیں ہوتی ہے۔ ہر ملک کے پاس لینے دینے کے لیے کچھ نہ کچھ ہونا چاہیے تبھی بین الاقوامی تجارت وجود میں آتی ہے۔ یعنی اٹلانٹین اپنے ملک کی مصنوعات بیچنے جاتے ہوں گے تو جواب میں وہ بھی کچھ نہ کچھ لاتے ہوں گے۔ دوسرے وہ ترقی یافتہ لوگ تھے اور ان کی مصنوعات استعمال کرنے والوں کو بھی کچھ نہ کچھ ترقی یافتہ ہونا چاہیے۔

پھر کچھ ایسا ہوا کہ اچانک ہی اٹلانٹس اور ساری دنیا کے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر معاشرے مٹ گئے۔ ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا۔ ان کی بستیوں کو کسی عذاب نے اچانک ہی اس طرح مٹا دیا جیسے ساحل کی ریت کے نقش آتی جاتی لہریں مٹا دیتی ہیں۔ آخر ایسا کیا ہوا تھا؟ مذہبی حلقے کہتے ہیں کہ یہ طوفانِ نوحؑ تھا جبکہ سائنسی ماہرین اس آفت کی ذمے داری برفانی دور کے خاتمے کے سر ڈالتے ہیں۔ یہ برفانی دور کیا ہے اور سائنس اس بارے میں کیا کہتی ہے؟

ارضیات کے ماہرین کہتے ہیں کہ زمین پر ہر کچھ ہزار سال کے بعد ایک برفانی دور آتا ہے اور تمام دنیا میں شدید برف باری ہوتی ہے اور عملاً زمین ایک برف کے گولے میں بدل جاتی ہے اور صرف خطِ استوا کے علاقے اس آفت سے کسی قدر محفوظ رہتے ہیں۔ برفانی دور ہر دس سے بارہ ہزار سال بعد آتا ہے اور تقریباً ایک ہزار سال جاری رہتا ہے اس دوران میں شمالی کرہ تو مکمل طور پر برف سے ڈھک جاتا ہے اور اس کے شاید صرف جزیرہ نما عرب والے حصے برف سے بچتے ہیں۔ اس ایک ہزار سال کے دوران موسموں کا چکر بھی ختم ہو جاتا ہے اور جب سمندروں اور دریاؤں کا اکثر پانی برف کی صورت میں جم جاتا ہے تو برف باری کا سلسلہ بھی رک جاتا ہے۔ لیکن زمین کا موسم سرد ہی رہتا اور یہ سردیاں اس وقت تک جاری رہتی ہیں جب تک برف پگھل نہیں جاتی۔ برف پگھلنے سے سمندر کی سطح بلند ہو جاتی ہے اور زمین کا موسم اعتدال پر آ جاتا ہے۔ برف صرف قطبین تک محدود ہو جاتی ہے۔

زمین پر آخری برفانی دور آج سے کوئی دس ہزار سال پہلے آیا تھا اور پھر آہستہ آہستہ یہ ختم ہو گیا۔ یعنی آج سے کوئی دس ہزار سال پہلے سمندروں کی سطح آج کی سطح سے بہت کم ہو گی۔ بحیرۂ قلزم خشک ہوگا اور بحیرۂ روم میں جابہ جا چھوٹے بڑے جزیرے ہوں گے۔ بحیرۂ اسود اور بحیرۂ کیسپین منجمد شکل میں ہوگا۔ اس وقت ایشیا، افریقا اور یورپ کے درمیان سفر کرنا آسان ہوگا۔ یہی صورتِ حال دنیا کے دوسرے گہرے سمندروں کی ہوگی کیونکہ ان کی گہرائی کئی سو فٹ کم تھی اس لیے ان میں سفر کرنا آسان تھا۔ یقیناً اس وقت بڑے سمندروں میں بھی بے شمار جزیرے بن گئے ہوں گے جو بعد میں برف پگھلنے اور سمندر بلند ہونے پر زیرِ آب چلے گئے ہوں گے۔

سوال یہ ہے کہ کیا دنیا میں طوفانِ نوحؑ سے پہلے پائے جانے والے تمدن کے خاتمے کی وجہ طوفانِ نوحؑ تھا یا اس آخری برفانی دور کا ختم ہونا اور اس سے بھی زیادہ اہم سوال ہے کہ اٹلانٹس جو بحرِ اوقیانوس میں طوفانِ نوحؑ کے اصل مقام سے کوئی سات ہزار میل کی دوری پر تھا وہ اس سے کیسے متاثر ہوا۔ آج زیرِ آب اٹلانٹس کے جو آثار ملے ہیں ان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کی بندرگاہیں تقریباً اسی سمندری حد پر تھیں جو آج کل ہیں یعنی سمندر اس وقت بھی اتنا ہی بلند تھا جتنا کہ آج ہے اور اس کا صریحاً مطلب ہے کہ جب اٹلانٹس تباہ ہوا تو برفانی دور ختم ہو چکا تھا اور سمندر بھی اپنے معمول پر آ گئے تھے۔

پھر حضرت نوحؑ جس خطے کے بتائے جاتے ہیں وہ آج کل عراق کا شمالی حصہ بنتا ہے۔ اسے وسط ایشیا میں شمار کیا جاتا ہے۔ برفانی دور میں یہ سرزمین لازمی برف تلے دفن تھی اور اس پر آبادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یعنی اگر ہم کہیں کہ طوفانِ نوحؑ اصل میں برفانی دور کے خاتمے پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

برف پگھلنے سے آیا تو یہ غلط ہوگا۔ تب کیا وجہ ہوسکتی تھی کہ طوفانِ نوحؑ کی آمد کے بعد اٹلانٹس اور اس کے ساتھ دنیا میں آباد ہونے والی دوسری تہذیبیں بھی مٹ گئی تھیں۔ کیونکہ جس وقت طوفانِ نوحؑ آیا تو انسان سائبیریا تک میں آباد تھا اور اس کے آخری سرے تک جا پہنچا تھا جہاں سے وہ آبنائے بیرنگ عبور کرنے والا تھا یا عبور کر چکا تھا اور امریکا کی سرزمین پر قدم رکھ چکا تھا۔

اس سلسلے میں یونانی قدیم دستاویزات کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ ان میں بعض قدیم ترین نقشے بھی ہیں۔ ایسے ہی ایک نقشے میں بحر اوقیانوس کو شمالی علاقے سے لے کر جنوب میں انٹارکٹیکا کے براعظم تک دکھایا گیا ہے۔ شمالی امریکا میں جارجیا تک کا ساحل بالکل واضح ہے۔ نقشے میں کیوبا اور اس کے ساتھ ایک بڑا جزیرہ بھی ہے۔ اس نقشے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اولین یونانی ملاحوں کو یہ دیوتاؤں نے عطا کیا تھا تاکہ وہ گہرے سمندروں میں بھی آرام سے سفر کرسکیں۔ اہم بات یہ ہے کہ اس میں جنوبی امریکا کا پورا ساحل بالکل اسی طرح نمایاں ہے جیسا کہ آج کل نقشوں میں ہوتا ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ اس میں براعظم انٹارکٹیکا کی سرزمین دکھائی ہے۔ انٹارکٹیکا کی اصل سرزمین اب برف تلے پوشیدہ ہے اور یہ برف سمندر پر خاصی آگے موجود ہے۔ یعنی انٹارکٹیکا کا اصل ساحل جاننا آسان کام نہیں ہے۔ مگر یونانی نقشے میں انٹارکٹیکا کی اصل سرزمین دکھائی گئی ہے اور مزید حیرت کی بات ہے کہ اس وقت انٹارکٹیکا کو برف سے آزاد ایک سرسبز زمین دکھایا گیا ہے۔ یعنی آج سے دس ہزار سال پہلے جب شمالی کرہ برف سے ڈھکا ہوا تھا تو جنوبی کرّے میں برف نہیں تھی اور کم سے کم انٹارکٹیکا برف سے آزاد تھا۔

اس نقشے کی تصدیق ایک امریکی مہم نے کی جو 1949ء میں ایڈمرل بائرڈ کی قیادت میں انٹارکٹیکا گئی تھی اور انہوں نے وہاں سے برف کے جو نمونے حاصل کیے ان سے بھی تصدیق ہوتی ہے کہ دس ہزار سال پہلے یہ براعظم برف سے آزاد تھا۔ برفانی دور کے خاتمے کے بعد انٹارکٹیکا پر برف آئی۔ لیکن یہ برف آئی کہاں سے؟ اس سوال کے جواب میں ماہرِ ارضیات پروفیسر چارلس ہوپ گڈ کہتے ہیں۔

"یہ برف ممکنہ طور پر کسی ایسے شہاب کے گرنے سے وجود میں آئی جس میں پانی کی بہت بڑی مقدار تھی اور جب وہ زمین کی بالائی تہوں میں داخل ہوا جہاں درجہ حرارت منفی پچاس ڈگری سینٹی گریڈ ہوتا ہے تو یہ پانی برف بن گیا اور قطب جنوبی پر برف کی طرح گرا جب ایک بار وہاں برف جم گئی تو اس علاقے کا موسم سرد ہوگیا اور وہاں مسلسل برف باری کا ایک چین ری ایکشن شروع ہوگیا۔"

لیکن یہ نہایت کمزور تھیوری ہے، ممکن ہے اس وقت قطب جنوبی برف سے خالی ہو لیکن جب ایک بار برف پگھلی اور موسمی بارش اور برف کا دوبارہ سے آغاز ہوا تو قطب جنوبی پر بھی برف باری ہوئی کیونکہ قطبین خطِ استوا سے ہمیشہ سرد ہوتے ہیں اس لیے جتنی برف پگھلتی تھی اس سے کہیں زیادہ برف گرتی تھی اور اس وجہ سے قطب جنوبی پر برف کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا۔ اس میں شہابیے والی تھیوری کہیں فٹ نہیں آتی ہے کیونکہ قطب جنوبی میں لاکھوں مکعب میل برف جمع ہے اور کسی شہابیے میں پانی کی اتنی مقدار اول تو ممکن نہیں ہے اور اگر کسی شہابیے میں اتنا پانی ہو تو وہ خلا میں ہی برف کی صورت میں ہوگا کیونکہ خلا میں درجۂ حرارت زمین کی بالائی تہوں سے کئی گنا زیادہ کم ہوتا ہے۔ یہ شہابیہ زمین پر کسی جمی ہوئی برفانی گیند کی طرح گرے گا اور زمین کی ساری حیات کو تہ و بالا کردے گا جیسا کہ ماضی میں کئی بار شہابیے گرنے سے زمین پر حیات کا چکر دوبارہ سے شروع ہوا اور اس تصادم میں حیات کی بیشتر اقسام نابود ہو کر رہ گئیں۔ لیکن آج سے دس ہزار سال پہلے کسی ایسے تصادم کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

امکان ہے کہ ابتدائی انسانوں میں سے کچھ اس وقت جب زمین برف کی لپیٹ میں تھی سمندروں کی کم سطح کا فائدہ اٹھا کر معمولی درجے کے بحری جہازوں اور کشتیوں میں اوقیانوس پار کر کے اٹلانٹس کے جزیرے تک پہنچنے میں کامیاب رہے اور وہاں آباد ہوگئے۔ یہ بلند حوصلہ لوگ جستجو اور علم رکھتے تھے اس لیے انہوں نے جلد قدرتی وسائل کو مصنوعات میں ڈھالنا سیکھ لیا۔ انہوں نے جزیرے پر ایک شاندار تمدن کی بنیاد رکھی اور زندگی کے ہر شعبے میں بے انتہا ترقی کی۔ اس سلسلے میں ایک بات قابلِ غور ہے۔ حضرت آدمؑ سے حضرت نوحؑ تک انسانوں کی کڑی بہت پھیلی نہیں ہے۔ یعنی انسانوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں تھی۔ اس لیے انہوں نے اپنے باپ حضرت آدمؑ سے کچھ نہ کچھ علم ضرور سیکھا ہوگا۔ حضرت آدمؑ دنیا کے بارے میں سب سے باعلم آدمی تھے کیونکہ اشیا کا علم اللہ نے خود آپؑ کو سکھایا تھا جس کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے کہ آدمؑ کو وہ علم تھا جس کو جاننے سے فرشتے بھی قاصر تھے۔ آپؑ نے یقیناً اپنی اولاد کو دنیا کا

علم سکھایا ہوگا جو اس دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اس لیے شروع میں انسان یقیناً بہت ترقی یافتہ تھا۔ جیسا کہ اٹلانٹین تھے یا جیسے کہ حضرت نوحؑ کے زمانے کے لوگ تھے۔

امکان ہے کہ اٹلانٹس کی طرف آنے والے اور اس وقت دریائی وادیوں میں آباد ہونے والے لوگ حضرت آدمؑ کی ذہین اور تعلیم یافتہ اولاد تھی اور جو اس معاملے میں پیچھے رہ گئے ہوں گے وہ شاید کم تر درجے کے چرواہے بن گئے ہوں گے۔ اپنے جانور چرانے کے لیے دور دراز علاقوں کی طرف چلے گئے ہوں گے اور اپنی اصل سے کٹ کر ایک جاہلانہ زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے ہوں گے۔ لیکن جب طوفانِ نوحؑ یا کسی اور قدرتی آفت سے متمدن بستیاں نابود ہوگئیں تو یہی بچ جانے والے چرواہے نسلِ انسانی کے امین ثابت ہوئے تھے۔ اگرچہ اپنے دوسرے بھائیوں کی نسبت ان کو ترقی کے مدارج طے کرنے میں بہت زیادہ عرصہ لگا تھا۔

جب یوکاٹان سے نقل مکانی کرنے والے اٹلانٹین ان وادیوں میں داخل ہوئے تو انہوں نے یہاں موجود چرواہوں اور نیم وحشی قبائل کو پھر سے سب کچھ سکھایا اور انہوں نے آہستہ آہستہ شہر بسا کر رہنا سیکھا۔ ممکن ہے شروع میں اٹلانٹین کو ان لوگوں پر کوئی فوقیت حاصل ہو لیکن جب ان اقوام نے علوم و فنون سیکھ لیے تو اٹلانٹین لوگوں کی حیثیت ختم ہوگئی اور پھر یہ ہوا ہوگا کہ وہ جہاں جہاں آباد ہوئے تھے وہاں مقامی لوگوں میں ضم ہوتے چلے گئے اور ان کی ایک الگ قوم کی حیثیت مٹ گئی۔ یہ ایک فطری امر تھا کیونکہ اٹلانٹین تعداد میں یقیناً کم ہوں گے اور مقامی لوگ وحشی ہونے کے باوجود ان سے کہیں زیادہ تھے اور اقلیت کبھی اکثریت پر ہمیشہ کے لیے حکومت نہیں کرسکتی..... اس لیے اگر شروع میں اٹلانٹین لوگوں کی حکومت بھی تھی تو جلد انہیں اس سے دست بردار ہونا پڑا ہوگا۔ اس کی ایک مثال حضرت یوسفؑ کی مصر پر حکومت تھی لیکن آپؑ کی وفات کے بعد اکثریت رکھنے والے مصری اقلیت بنی اسرائیل پر حاوی ہوگئے اور ان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ پھر ان ہی ہتھکنڈوں سے جو مصریوں نے بنی اسرائیلیوں کے خلاف اپنائے تھے مقامی آبادی نے اٹلانٹین کی برتری کو ختم کر دیا اور بالآخر ان کو خود میں ضم کر دیا۔ چاہے اس کے لیے مقامی لوگوں نے جبر اور تشدد کے حربے کیوں نہ آزمائے ہوں۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ اٹلانٹین سلطنت کا خاتمہ اور طوفانِ نوحؑ تقریباً ایک ہی زمانے کی بات ہے یعنی آج سے کوئی دس ہزار سال پہلے۔ تو ایسی کیا چیز ہوسکتی ہے جس نے ان دونوں واقعات کو بیک وقت جنم دیا۔ مذہبی کتابوں اور داستانوں میں طوفانِ نوحؑ کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ اس کا آغاز بیک وقت زمین اور آسمان سے ہوا تھا۔ یعنی آسمان سے پانی برسنا شروع ہوا تھا تو زمین بھی پانی اگلنے لگی تھی اور اس کی سطح اتنی تیزی سے بڑھی تھی کہ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے پہاڑوں کو بھی ڈھک دیا تھا۔ حضرت نوحؑ کا نافرمان بیٹا ایک اونچے پہاڑ پر چڑھ گیا تھا اور اس کا خیال تھا کہ وہ اس طرح سے بچ جائے گا لیکن پانی وہاں تک بھی پہنچ گیا تھا۔

پھر یہ روایت بھی ہے کہ حضرت نوحؑ کی کشتی ترکی میں کوہِ ارارات کے سلسلے پر رکی تھی۔ یہ پہاڑی سلسلہ دس سے سترہ ہزار فٹ بلند ہے۔ یہاں کوئی کشتی رکی تھی یا نہیں اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن یہاں آنے والے بعض افراد کو بہت بلند پہاڑ پر کچھ ایسے آثار ضرور ملے جیسے یہاں کبھی کوئی کشتی رکی تھی۔ اسی طرح مصنوعی سیارے سے جب اس سلسلۂ کوہ کی تصاویر لی گئیں تو ان میں بھی ایک کشتی جیسی شبیہہ نظر آتی ہے لیکن ابھی تک اس کا کوئی حتمی ثبوت نہیں ہے کہ کشتی اسی مقام پر رکی تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جب خشکی نکل آئی ہو اور کشتی کے مکین اس سے اترے ہوں تو دیگر مقاصد کے لیے کشتی کو توڑ کر لکڑی نکال لی گئی ہو جیسے مکان بنانا یا لکڑی جلا کر کھانا بنانا کیونکہ ایک تو ارارات بہت بلند اور بنجر علاقہ ہے، یہاں درخت نہ ہونے کے برابر ہیں اور دوسرے موسم نہایت سرد ہے تو حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھیوں کو آگ جلانے کے لیے لکڑی کی ضرورت پڑی ہوگی۔

اگرچہ حضرت نوحؑ کے واقعات کا اٹلانٹس سے بہ ظاہر کوئی تعلق نہیں بنتا ہے لیکن جیسا کہ کہا گیا ہے دونوں واقعات کا تقریباً ایک ہی زمانے میں ہونا اور اس وقت برفانی دور کا ختم ہوجانا ظاہر کرتا ہے کہ تباہی کے ان واقعات میں کچھ نہ کچھ مماثلت ضرور تھی۔ فرض کریں ایک جزیرہ اٹلانٹس آباد تھا یہ کوئی ہزار میل لمبا اور سو سے چار سو میل تک چوڑا تھا۔ اس جزیرے پر اپنے وقت کی نہایت ترقی یافتہ اور ذہین قوم آباد تھی جس نے کرسٹلز سے توانائی حاصل کرنے کا طریقہ ایجاد کرلیا تھا۔ دوسری طرف ان کی یہ ترقی ان کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیے وبال بن گئی اور غلطی سے کرسٹلز کی توانائی نے زیرِ زمین آتش فشاؤں کے کسی سلسلے کو چھیڑ دیا اور آتش فشاں پھٹ پڑے۔ ان کے پھٹنے سے پیدا ہونے والے زیرِ زمین خلا نے اس پورے جزیرے کو اپنے اندر سمو لیا اور پورا جزیرہ یکا یک غرق ہو گیا۔

سونامی کس طرح پیدا ہوتا ہے اس کی وضاحت پیچھے کی جا چکی ہے۔ جب اٹلانٹس یکا یک غرق ہوا تو یقیناً بہت زیادہ تباہ کن سونامی پیدا ہوا ہوگا۔ اس کی شدت چند سال پہلے آنے والے سونامی سے کئی سو گنا زیادہ ہوگی کیونکہ یہ سونامی زمین کے صرف آٹھ انچ دھنس جانے سے پیدا ہوا تھا لیکن اس نے اپنی جائے پیدائش سے ہزاروں میل دور بے شمار ساحلوں کو غرقاب کر دیا تھا اور اس سونامی میں مارے جانے والوں کی تعداد کم سے کم تین لاکھ تھی کیونکہ اس کے اطراف میں تمام ممالک گنجان آباد ہیں اور ان کی اکثر آبادی ساحل کے ساتھ ہی رہتی ہے۔ جب کہ اٹلانٹس دھنسنے سے زمین کئی سو فٹ اور کہیں کہیں سے ہزار فٹ تک بھی نیچے چلی گئی تھی۔ اس سے پیدا ہونے والے سونامی کی طاقت اور رسائی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بحری علوم اور خاص طور سے سونامی کے ماہر ڈاکٹر برنارڈ کارمن نے اس بارے میں کہا ہے۔

''اکثر زلزلے کی شدت دس سے اوپر ہو اور اس کے آنے سے زیرِ آب زمین دو فٹ تک اوپر نیچے ہو جائے اور سمندر کی گہرائی دو سے تین ہزار فٹ تک ہو تو اس سے سونامی کی پچاس فٹ تک اونچی لہر پیدا ہوگی جو دو سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے چاروں طرف پھیل جائے گی۔ اس کی زد میں براہِ راست آنے والے ساحلوں کا تہس نہس ہو جانا یقینی ہے لیکن وہ ساحل جو براہِ راست اس کی زد میں نہ ہوں ان کو بھی شدید نقصان ہو سکتا ہے۔''

اٹلانٹس کے دھنسنے سے آنے والا زلزلہ یقیناً اس سے بھی زیادہ شدید تھا اور ممکن ہے آج کے ریکٹر اسکیل اس کی شدت ناپنے سے قاصر ہوں۔ پھر یہ بحرالکاہل جیسے بڑے سمندر میں آیا ہوگا جس میں پانی کی مقدار بہت زیادہ ہے۔ سمندر میں پانی جتنا زیادہ ہوگا سونامی کی لہر اتنی ہی تباہ کن ہوگی۔ اگر ایسے زلزلے سے چھ سو فٹ اونچی لہر پیدا ہو جس کی رفتار آواز کی رفتار سے کچھ ہی کم ہو تو یقیناً ایسی لہر پورے افریقا، یورپ اور وسط ایشیا کو تہ و بالا کرنے کے لیے کافی ثابت ہوگی۔ پانی کی یہ لہر بحیرۂ روم سے ہو کر ترکی کو غرقاب کرتی یقیناً میسوپوٹیمیا کی سرزمین تک پہنچ گئی ہوگی جہاں حضرت نوحؑ کی قوم آباد تھی۔ دوسری طرف یہ لہر مصر کی وادی میں آباد لوگوں کو ختم کرنے کے لیے بھی کافی ثابت ہوئی ہوگی۔ راس امید سے گھوم کر یہ لہر جب بحیرہ ہند میں داخل ہوئی ہوگی تو اس کی شدت کم ہو گئی ہوگی لیکن اس کے باوجود یہ دریائے سندھ، گنگا اور یانگ سی کیانگ کی وادیوں کو تباہ کرنے کے لیے کافی ثابت ہوئی ہوگی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ نہ صرف اٹلانٹس کی سلطنت تباہ ہوئی بلکہ اس وقت دنیا کی تمام متمدن آبادیاں بھی اس زلزلے کی نظر ہو گئی ہوں اور براعظموں میں دور دراز موجود انسانوں کو پھر سے تمدن کا آغاز کرنا پڑا ہوگا۔

ممکن ہے آنے والے دنوں میں اٹلانٹس کے واضح آثار مل جائیں اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اٹلانٹین کتنے ترقی یافتہ تھے اور انہوں نے اٹلانٹس پر کیا کچھ بنا رکھا تھا۔ وہ وقت زیادہ دور بھی نہیں ہے کیونکہ حال ہی میں زیرِ آب ایک چھوٹا سا پتھریلا اہرام برآمد ہوا ہے جو دیکھنے میں بالکل یوکاٹان کے اہرام جیسا ہے۔ یہ اہرام ایک اور ثبوت ہے کہ قدیم زمانے میں اٹلانٹین ہی اہرام سازی کے ماہر تھے اور انہوں نے ہی ساری دنیا کو اہرام بنانے کا فن دیا۔ ممکن ہے کہ مصر اور چین میں پائے جانے والے عظیم الشان اہرام اٹلانٹس کے بچ جانے والے باسیوں نے ہی بنائے ہوں تاکہ جب وہ فنا ہو جائیں تب بھی ان کی یادگاریں دنیا کو بتانے کے لیے کافی ہوں کہ ایک زمانے میں زمین پر کتنی ترقی یافتہ قوم آباد تھی۔

ماہرین کے مطابق جہاں کسی زمانے میں اٹلانٹس تھا آج وہاں برمودہ ٹرائی اینگل ہے۔ اس پُراسرار سمندر اور اس کے عجوبات کا سرگزشت کے صفحات پر پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے اس شمارے میں بھی مختصراً ہے اس لیے اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے لیکن کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اس علاقے میں ہونے والے عجیب و غریب واقعات اور پُراسرار گم شدگیوں کا تعلق اصل میں اٹلانٹس سے ہی ہے، ممکن ہے آنے والا وقت اس بات کو ثابت بھی کر دے۔

اس تحریر کی تیاری میں وکی پیڈیا، اٹلانٹین اور دیگر ویب سائٹس سے مدد لی گئی ہے۔

❖❖❖

جاپانی جوگی

الطاف شیخ/ترجمہ: ابراہیم جمالی

صرف پاک و ہند میں ہی نہیں، ہر ترقی یافتہ و ترقی پذیر ملک میں ڈھونگی بہ افراط ملتے ہیں۔ جاپان جیسے ترقی یافتہ ملک میں اس شخص نے شعبدوں کا سہارا لے کر پورے ملک کو بے وقوف بنا رکھا تھا، اس کے حواریوں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ سائنس داں بھی تھے اور اعلیٰ عہدے دار بھی۔ تبھی تو اس کے چیلوں نے ایسی خطرناک گیس کے سلنڈر تیار کر لیے تھے جس نے زمین دوز ریلوے اسٹیشن پر قیامت برپا کر دی تھی۔

شعبدوں کا سہارا لے کر خود کو مقدس ہستی منوانے والے کی کتھا

سرگزشت کے پُراسراریت نمبر کا سنا تو مجھے جاپان کے ایک مشہور عامل کی یاد آ گئی۔ اس کے کارنامے من و عن بیان کر رہا ہوں۔ اس کے بارے میں مفصل باتیں میں نے اس دن سنیں جب میں بچوں کو لینے اسکول پہنچا، وہاں موجود بچوں کی تمام مائیں ایک ہی موضوع پر گفتگو کر رہی تھیں اور وہ موضوع تھا ''سوکو اساہارا'' کا کورٹ میں زیرِ سماعت کیس! میں نے بھی رات کو ٹی وی پر اور صبح کے مقامی انگریزی اخبار ''جاپان ٹائمز'' میں اس کے بارے میں پڑھا تھا۔ خبروں میں بتایا گیا تھا کہ کل اساہارا کے کیس کی 253 ویں پیشی تھی۔ ''اوجیسان! اوم شن ریکیو نو سوکو اساہارا او کاری ماسکا؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایمان کی ایک کلاس میٹ لڑکی کی ماں نے ایمان کے اسٹائل میں مجھے ''نانا'' کہتے ہوئے مخاطب کیا اور پوچھا کہ کیا میں ٹوکیو ریلوے اسٹیشن پر گیس سے حملہ کرنے والے مذکورہ جاپانی عامل ''اساہارا'' کے بارے میں جانتا ہوں؟''

''ہاں، میں اس کے بارے میں جانتا ہوں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور بارش میں بھیگی ہوئی چھتری ایک طرف لگا کر اس کے قریب بیٹھ گیا اور اس پیرفروت کے بارے میں دوسروں کے خیالات سننے لگا۔ اتنے عرصے تک میں اس واقعے کے بارے میں، دوسرے ملکوں میں ٹھہرنے کے دوران غیر جاپانیوں کے تبصرے پڑھتا اور سنتا رہا تھا لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ میں اس جاپانی شخص کے بارے میں اسی کے ہم وطنوں کی رائے سن رہا تھا۔ وہ شخص، جو کسی کے لیے پیرومرشد کی حیثیت رکھتا ہے تو بعض اسے خونی اور راہزن سمجھتے ہیں۔ اس دن میں بھی قصداً وقت سے کچھ پہلے وہاں پہنچ گیا تھا تاکہ ان درجن بھر عام اور گھریلو خواتین کے بے باک تبصرے سن سکوں جو دیگر راہ گیر جاپانیوں کی طرح کسی بات کا جواب دینے میں اپنے خیالات کو سات پردوں میں چھپا کر نہیں رکھتیں۔

48 سالہ باریش اساہارا 1995ء سے مقامی اور بین الاقوامی اخبارات و رسائل اور ٹی وی پر خبروں کا موضوع بنا ہوا ہے۔ اس کے خلاف زیرِ سماعت کیس کو خوب شہرت ملی ہے۔ جاپان جیسے ملک میں جہاں راستے میں کوئی بلی بھی مر جائے تو اسے بڑا جرم سمجھا جاتا ہے، وہاں اس پُرامن ملک کے ٹوکیو جیسے شہر کے مرکز میں جہاں سرکاری دفاتر ہیں، وہاں صبح کے رش کے اوقات میں ٹرین اور اسٹیشن پر Sarin جیسی خطرناک گیس کے حملے نے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اس حملے کا الزام اساہارا پر تقریباً ثابت ہو چکا ہے۔ اس حملے میں شریک اس کے چیلوں میں سے ایک درجن کے لگ بھگ لوگوں کو پھانسی یا عمر قید کی سزا مل چکی ہے۔ بعض افراد پر ابھی تک کیس چل رہا ہے۔

یہ واقعہ 20 مارچ 1995ء کو ٹوکیو میں چلنے والی زمین دوز ٹرین میں پیش آیا تھا۔ یہ بہ یک وقت پانچ چھ مقامات پر ''سارن'' گیس چھوڑی گئی تھی۔ جس سے بارہ افراد موقع پر ہی ہلاک ہو گئے تھے اور 3794 افراد زخمی ہوئے تھے۔

اس واقعے سے 9 ماہ قبل 27 جون 1994ء میں بھی اسی گیس کے ذریعے ''ماتسوموتو'' نامی شہر میں حملہ کیا گیا تھا جس میں سات افراد مارے گئے تھے اور 144 زخمی ہوئے تھے۔ حکومت اس وقت سے سخت پریشان تھی کہ اس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔ انتظامیہ کو شبہ ہوا تھا کہ یہ ان مذہبی جنونیوں کا کام ہو سکتا ہے، جن کا تعلق ''اوم شن ریکیو دھرم'' سے ہے۔ ٹوکیو والے واقعے کے بعد پولیس ہاتھ دھو کر اس معاملے کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ آخرکار دو ماہ کی مسلسل کوششوں کے بعد پولیس نے مذکورہ دھرم کے گرو کو فیوجی پہاڑ کے قریب ایک تنگ و تاریک ہیڈ کوارٹر سے ڈھونڈ نکالا۔ وہ تین میٹر طویل صندوق میں بند تھا اور یہ صندوق نما ڈبا ایک دیوار کے اندر چھپا ہوا تھا۔ پولیس کو دیواریں چیک کرتے ہوئے ایک جگہ کھوکھلے پن کا احساس ہوا تو الیکٹرک آری کے ذریعے دیوار کو کاٹنے کی کوشش کی گئی۔ دیوار کٹنے پر گرو اساہارا ان کے سامنے آیا۔

''خبردار! اس صندوق میں قدم نہ رکھنا۔'' اس نے پولیس والوں کو ڈانٹنے کے سے انداز میں کہا ''یہاں میرے پیروکاروں کو بھی داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ ذرا صبر کرو، میں خود ہی باہر آ جاتا ہوں۔''

صندوق سے باہر آ کر اس نے پولیس والوں سے اپنا جرم پوچھا۔

''تم پر الزام ہے کہ تم نے ٹوکیو اسٹیشن پر گیس کے ذریعے مسافروں پر حملہ کرا کر کئی لوگ ہلاک اور زخمی کیے ہیں۔''

''کیا مجھ جیسا اندھا اتنی طاقت رکھتا ہے کہ ایسا کر سکے؟'' اساہارا نے انتہائی سکون سے، نرم لہجے میں کہا۔

بہرحال اسے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اس کی گرفتاری پر ملک کے کچھ لوگوں نے سکون کا سانس لیا تھا کیونکہ لوگوں کی اکثریت اس حد تک خوف زدہ تھی کہ انہیں ہر وقت یہ خدشہ لاحق رہتا تھا کہ حکومت انہیں اس جنونی قاتل سے تحفظ فراہم کرنے میں ناکام رہے گی۔ اساہارا کہیں بھی ان پر حملہ کر سکتا ہے۔ اس کا خوف کئی لوگوں کے دلوں پر آج بھی قائم ہے۔

اساہارا کی پسندیدہ ترین شخصیت ہٹلر ہے۔ وہ واشگاف الفاظ میں دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اپنے مریدوں کو نہ صرف سکھ اور سکون مہیا کر سکتا ہے بلکہ انہیں ایسی قوت بھی عطا کر سکتا ہے جو انسانی ذات سے بلند تر ہے۔

اساہارا کے بارے میں یہاں کی ایک معروف مصنفہ ''شوکو ایگاوا'' نے ایک کتاب لکھی ہے جس کے مطالعے سے اساہارا کے بارے میں خاصی معلومات حاصل ہوتی ہے۔ مصنفہ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔

''اساہارا 1959ء میں کیوشو کے مقام پر پیدا ہوا تھا۔ اس کا اصل نام چیزوؤ (Chizuo Matsumoto) ہے۔ پیدائش کے وقت وہ ایک آنکھ سے بالکل اندھا تھا۔ دوسری آنکھ سے بھی بہت کم دیکھ سکتا تھا لہٰذا اس کے والد نے اسے ''کماموتو'' شہر کے اندھوں کے ایک اسکول میں داخل کرا دیا تاکہ اس کی اسکول فیس معاف ہو جائے۔ اس کا والد غریب اور محنت کش تھا جو چٹائیاں بنا کر گزر اوقات کرتا تھا۔ اندھوں کے اسکول میں ایک ایسا بچہ جو کم سے کم ایک آنکھ سے سہی، کچھ نہ کچھ دیکھ سکتا تھا، خاصی اہمیت اختیار کر گیا۔ وہ دوسرے بچوں کو چوری چھپے شہر کے ہوٹلوں میں لے جاتا جس کے عوض وہ خاصی رقم کما لیتا تھا۔

گریجویشن کرنے کے بعد اس نے اکوپنکچر کی دکان کھول لی۔ پہلے کماموتو میں، اس کے بعد ٹوکیو میں بھی کچھ عرصہ دکان چلائی۔ پھر وہ ایک دوسرے شہر فوناباشی چلا گیا۔ 1978ء میں اس نے ''تومو کو'' نامی ایک کالج کی طالبہ سے شادی کر لی۔ اس کے بعد اس نے چینی دواؤں کی دکان کھول لی۔ وہ مختلف قسم کی جڑی بوٹیاں رکھ کر لوگوں کو بتانے لگا کہ وہ ان چیزوں کے ذریعے پرانی بیماریوں کا بھی علاج کر سکتا ہے۔

1982ء میں وہ جعل سازی کے جرم میں پکڑا گیا اور پولیس نے اس کی دکان کو مسمار کر کے اسے بیس دنوں کے لیے جیل میں بند کر دیا۔ اس پر دو لاکھ ین جرمانہ بھی عائد کیا گیا تھا۔ اس واقعے کے بعد اساہارا بالکل مفلس ہو گیا۔ اس کا ''کاروبار'' بھی ختم ہو چکا تھا۔ یہ خیال بھی اس کے لیے پریشانی کا سبب تھا کہ اب وہ اپنے جاننے والوں سے کس طرح سامنا کر سکے گا۔ لہٰذا اس شرمندگی سے بچنے کے لیے اس نے اپنا بچا کھچا سامان فروخت کیا اور چند ضروری چیزیں خرید کر دوسرے شہر چلا گیا۔

1984ء میں اس نے اپنی بیوی کے ساتھ مل کر ایک یوگا اسکول کھول لیا جس نے خاصی کامیابی حاصل کی۔ یہ وہ دور تھا جب جاپان میں مختلف مذاہب شہرت پا رہے تھے۔ ان ہی دنوں میں اساہارا زیارت کی غرض سے ہمالیہ پہاڑ کی جانب روانہ ہو گیا۔ جب دو ماہ کے بعد واپس لوٹا تو اس نے آتے ہی اعلان کر دیا کہ اسے ''ساتوری'' حاصل ہو گئی ہے۔ ساتوری دراصل ''نروان'' کا جاپانی لفظ ہے۔ یعنی اب اسے علم کا نور حاصل ہو گیا تھا۔

1987ء میں اس نے ایک نئے مذہب کی ابتدا کی جس کا نام ''اوم شن ریکیو'' تھا۔ جس کا مطلب ''عظیم سوچ'' ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس کے کئی پیروکار پیدا ہو گئے۔ پھر اساہارا اپنے آپ کو مختلف القابات سے نوازتا رہا۔ وہ ''آج کا مسیح'' اور ''رواں صدی کا محافظ'' کہلانے لگا۔ اس کے مرید نہ صرف جاپان بلکہ امریکا، جرمنی اور خاص طور پر روس میں پھیلنے لگے۔ اس کے پیروکاروں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ایک مرتبہ اس نے ماسکو کے اسٹیڈیم میں پندرہ ہزار افراد کے اجتماع سے خطاب کیا تھا۔ مریدوں کے اضافے اور بے پناہ دولت کی آمد سے اسے ہر سرکاری ادارے سے خوف محسوس ہونے لگا۔ اس نے پیش گوئی کرتے ہوئے اعلان کیا کہ دنیا کا اختتام ہونے والا ہے اور 1997ء تا 2000ء تک کی درمیانی مدت میں کسی بھی وقت یہ ملک زہریلی گیس کے ذریعے تباہ ہو جائے گا۔

صرف روس میں اس کے تقریباً تیس ہزار مرید موجود ہیں۔ وہ خود کو ''زندہ گوتم'' کہلانا پسند کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ مریدوں کی سطح سے قدرے بلندی پر بیٹھتا تھا۔ مرید اس کے پاؤں چومتے تھے۔

اس پر چلنے والے کیس کو آٹھ برس گزر چکے ہیں۔ ابتدائی دنوں میں وہ کیے جانے والے سوالات کے الٹے سیدھے جوابات دیتا رہا تھا لیکن اب کیس کی سماعت کے دوران میں وہ بالکل خاموش رہا ہے۔ اس پر زہریلی گیس تیار کرنے، لوگوں کو ہلاک کرنے اور ہلاک کرنے کی کوشش کرنے کے الزامات عائد کیے گئے ہیں۔ اس کے کئی ساتھیوں نے اقرارِ جرم کر لیا ہے جن میں سے نو افراد کو پھانسی دے دی گئی ہے۔ چھ افراد کو عمر قید کی سزا سنائی گئی ہے۔ لوگوں کو توقع ہے کہ عنقریب اساہارا کے خلاف بھی فیصلہ سنایا جانے والا ہے، اسے پھانسی یا عمر قید کی سزا ضرور ہو گی۔

☆☆☆

جاپان کے ''اوم شن ری کیو'' دھرم نے ٹوکیو جیسے شہر میں جو دہشت گردی پھیلائی تھی، اس کی مثال جاپان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ دنیا کے خاتمے کا پرچار کرنے والے اس دھرم کے ممبروں نے 20 مارچ 1995ء کی صبح ٹوکیو کے مرکز میں تین ٹرینوں میں سرن جیسی زہریلی گیس چھوڑ کر تباہی لانے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت آفس ٹائم ہونے کے سبب ٹرینوں اور اسٹیشنوں میں بے انتہا رش تھا۔ یہ حملہ اس جگہ ہوا تھا جہاں جاپان کی کئی وزارتوں کے دفاتر بھی قائم ہیں۔

اتفاق سے گیس کے تمام سلنڈر پھٹ نہیں سکے تھے اور جو سلنڈر بلاسٹ ہوئے ان میں ''ناقص'' گیس ہونے کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈاکٹر ریمنڈ موڈی نے ایسے ڈیڑھ سو افراد کے جو مر کر زندہ ہو گئے تھے، کے بیانات ایک کتاب کی شکل میں چھاپے ہیں۔ ڈاکٹر ریمنڈ موڈی لکھتے ہیں کہ پچھلے بارہ سال میں ایسے بہت سے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا جو موت کی وادی سے پلٹ آئے ہیں۔ ایسے پہلے آدمی سے میری ملاقات 65ء میں ہوئی جب میں ورجینیا یونیورسٹی میں فلسفہ کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ یہ صاحب طبی اسکولوں میں نفسیاتی امراض کے معالج اور معلم تھے۔ ان کی باتیں میرے دل میں ترازو ہو گئیں۔ چونکہ مجھے ایسے تجربات کو جانچنے اور پرکھنے کا پہلے موقع نہ ملا تھا۔ اس لیے میں نے ان کے بیانات کو ٹیپ ریکارڈر میں محفوظ کر لیا۔ چند سال بعد جب میں فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی سند لے کر مشرقی نارتھ کیرولینا یونیورسٹی میں فلسفہ کی تعلیم دیتا تھا تو ایک طالب علم نے تجویز پیش کی کہ آیئے ''حیات ابد'' پر گفتگو کریں۔ اس طالب علم کو حیات ابدی سے اس لیے دلچسپی تھی کہ اس کی دادی جان ایک آپریشن کے دوران بظاہر فوت ہو گئی تھیں کہ ڈاکٹروں نے مریضہ کو بچا لیا۔ مریضہ نے دوبارہ جسمانی زندگی حاصل کرنے کے بعد وہی تجربہ بیان کیا جو کئی سال قبل استاد نفسیات نے سنایا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے فلسفے کے نصاب میں حیاتیاتی موت کے بعد بقائے انسانی کے مطالعہ کو بھی شامل کر لیا۔ 1972ء کا ذکر ہے کہ میں کالج میں طبی تعلیم کے لیے داخل ہوا۔ اس وقت تک میں نے تجربہ مرگ کے کافی واقعات جمع کر لیے تھے۔ میرے ایک دوست نے کہا کہ میں اسے رپورٹ کی شکل میں میڈیکل سوسائٹی کے سامنے پیش کروں۔ ان واقعات کو تین نمایاں قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ الف: ایسے لوگوں کے تجربات جن کے متعلق ڈاکٹروں نے اعلان کر دیا کہ وہ طبی نقطہ نظر سے مر چکے ہیں۔ لیکن اس کے بعد انہیں بچا لیا گیا۔ ب: ایسے لوگوں کے تجربات جو مختلف حادثات میں شدید ضرب یا بیماری کے دوران طبی موت کے قریب پہنچ گئے تھے۔ ج: ایسے لوگوں کے تجربات سبب زیادہ نقصان نہیں ہوا تھا لیکن اس کے باوجود بارہ افراد ہلاک ہو گئے اور ہزاروں بیمار ہو گئے تھے۔ سیکڑوں افراد بھگدڑ کے سبب روندے گئے تھے۔ دو ماہ کے بعد ''سوکو اساہارا'' اور اس کے ساتھ دو سو کے قریب چیلے پکڑے گئے تھے۔ ان میں سے کئی جاپان کی اہم یونیورسٹیوں کے گریجویٹ تھے۔ ان میں سے ایک 53 سالہ ''ہساکو'' نامی عورت بھی تھی جو اس سے قبل کسی آفس میں کلرک تھی لیکن بعد میں ملازمت چھوڑ کر دھرم کے آفس میں کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ جس کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ ''گرو'' کی قریبی اور اہم ساتھیوں میں سے ایک تھی۔ وہ اس کی اندرونی حکومت کی ''وزیر خزانہ'' تھی۔ اب وہ مجرموں کی مدد کرنا، قتل کیے جانے والے لوگوں کی لاشیں غائب کرنا وغیرہ کے جرم کی سزا بھگت رہی ہے۔

ٹوکیو کی واردات کے تین سال بعد ''نیوز ویک'' رسالے کے جاپانی نمائندے نے وکیلوں کے ذریعے اس پُراسرار مذہب کے بانی کی خاص مریدنی میڈم ہساکو سے جیل میں انٹرویو لیا تھا جن میں سے کچھ باتیں دلچسپ اور حیرت انگیز ہیں۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے پیش ہے۔

''آپ ایک باعزت ادارے ''ٹوکیو انشورنس کمپنی'' کی آفس کلرک تھیں۔ آپ کی اساہارا سے ملاقات کیسے ہوئی؟ آپ نے اس کی مریدنی بننے کا فیصلہ کیوں کیا؟''

نیو ویک کے نمائندے نے سوال کیا۔

1984ء میں جب میں گرو (اساہارا) سے ملی تو اس وقت ''اوم شن ری کیو'' کوئی مذہبی گرو نہیں بلکہ ایک یوگا اسکول تھا۔'' میڈم ہساکو نے جواب دیا ''میں یوگا اور قدرتی رازوں کے بارے میں جاننے میں دلچسپی لیتی تھی، گرو اساہارا ان دنوں یوگا میں محو تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا یا شاید مجھے کسی طرح یہ باور کرایا گیا کہ گرو کو الہام ہوتا ہے اور وہ صاحب کشف و کرامات ہے۔ میری بھی یہی تمنا تھی کہ کاش مجھے بھی پوشیدہ باتوں کا علم اور کشف کی روشنی حاصل ہو سکے۔''

''گرو اساہارا کے چیلوں میں آپ جیسے دوسرے بھی کئی تعلیم یافتہ اور بہتر ملازمتیں کرنے والے اور اعلیٰ سوسائٹی سے تعلق رکھنے والے افراد ہیں۔ ایسے لوگوں کی اس دھرم میں شمولیت کا سبب کیا ہو سکتا ہے؟''

''گرو کے چیلوں میں بلاشبہ بڑی تعداد خوشحال گھرانوں کے لوگوں کی ہے۔ وہ تعلیم اور ملازمت کے لحاظ سے بھی بڑے آدمی کہلائے جا سکتے ہیں اور دولت کے حوالے سے بھی وہ تمام لوگ بہرحال ملک کے اہم افراد ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ سب کچھ ہونے کے باوجود وہ اپنے آپ کو اندر سے خالی اور کھوکھلا محسوس کرتے ہیں۔ وہ روحانی غذا کی تلاش میں تھے۔ انہیں اس گرو میں ایک قسم کی روحانی کشش

جنہوں نے نزع میں اپنی کیفیت بیان کی، بتایا کہ موت کی وادی سے وہ کس طرح گزرے۔ اگرچہ وہ لوگ جو ان تجربات سے دو چار ہوئے، زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے تھے اور جس وقت پیام مرگ آیا تو اس وقت ان کے گرد و پیش کے حالات بھی ایک دوسرے سے قطعاً مختلف تھے۔ تاہم ان کے تاثرات و تجربات میں حیرت انگیز مشابہت پائی جاتی ہے۔ ان یکساں نکات کی بنا پر میں ذیل میں ایک تجربہ بیان کرتا ہوں۔ ایک آدمی مر رہا ہے، جب جسمانی تکلیف نقطۂ آخر تک پہنچ جاتی ہے تو مرنے والا ڈاکٹر کو کہتے ہوئے سنتا ہے کہ ''یہ شخص مر گیا'' (اس کے بعد مرنے والے کا بیان ہے کہ) مجھے ایک پریشان کن شور سنائی دیا۔ بلند گونج یا بھنبھناہٹ سی۔ اسی شور کے ساتھ یہ احساس ہوا کہ میں ایک طویل و تاریک سرنگ سے گزر رہا ہوں۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ میں اپنے جسم سے باہر ہوں۔ عجیب بات ہے کہ میرا جسم میرے سامنے تھا اور میں ایک دوسرے جسم میں ملبوس تھا۔ البتہ اس جسم کی صلاحیتیں اور نوعیت مختلف تھی۔ ان کا بیان یہ بھی ہے کہ جب وہ موت سے ہمکنار ایک اجنبی دنیا میں حیرت زدہ اور خاموش کھڑے تھے تو مرحوم اعزا اقربا اور احباب سے ان کی ملاقات ہوئی۔ وہ اجنبی مسافر عدم کے استقبال کے لیے آئے تھے۔ ناگہاں ایک محبت و خلوص سے معمور پُرنور ہستی رونما ہوتی ہے۔ یہ مجسمۂ نور پراسرار وجود قلبی زبان کے توسط کے بغیر آنے والے سے سوال جواب کرتا ہے اور ہدایت دیتا ہے۔ کہ وہ اپنی زندگی کا جائزہ لے پھر وہ فرشتۂ غیب ایک طرف اشارہ کرتا ہے۔ جب مبہوت و متاثر مسافر عدم ادھر دیکھتا ہے تو اسے اپنی زندگی فلم تمام جزئیات کے ساتھ رواں نظر آتی ہے۔

اقتباس Life after Death by Dr, Remond Modi

مرسلہ: طاہر ارشد، شیخوپورہ

اور قوت نظر آئی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ گرو کے احکامات کی پابندی کر کے دلی سکون حاصل کر سکتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنی اصلیت کو سمجھ کر خود کو شناخت کر سکتے ہیں۔''

''کورٹ میں کیس چلنے کے دوران آپ نے اپنے گرو کا دفاع کرنے یا اس کے حق میں بیان دینے کے بجائے اس کے خلاف بیان دیا، ایک وقت وہ تھا جب آپ اس دھرم کی وزیر خزانہ کہلاتی تھیں اور آپ کو گرو اساہارا کا قریبی ساتھی سمجھا جاتا تھا، اچانک اس تبدیلی کا سبب کیا ہے؟''

''میں دھرم کے دفتر میں محض حساب کتاب کو درست رکھتی تھی۔ آپ مجھے اکاؤنٹنٹ کہہ سکتے ہیں۔ مجھے تو کیس کی سماعت کے دوران معلوم ہوا تھا کہ اس دھرم کو بہت زیادہ دولت حاصل ہو رہی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گرو ہمارے لیے ایک حاکم کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو اس مقام پر فائز کر دیا تھا جہاں اس کی یہ خواہش تھی کہ تمام لوگوں کو بغیر کسی بحث کے اس کی ہر بات کو تسلیم کرنا چاہیے، ہمارے لیے باہر کی دنیا کے تمام دروازے بند کر دیے گئے تھے اور ہمیں اس بات پر یقین کرنا پڑتا جو ہمیں بتائی اور پڑھائی جاتی تھی۔ پولیس کی تحویل میں آنے کے بعد میں نے اس نام نہاد گرو کی تبلیغ اور اس دھرم کی تعلیم پر پہلی مرتبہ غور کیا۔ میں اس نتیجے پر پہنچی کہ یہ گرو سراسر فراڈ ہے اور یہ بدھ مت کی تعلیمات کو توڑ مروڑ کر پیش کر رہا ہے۔ یہ جس روشن خیالی اور رواداری کی بات کرتا ہے، وہ سراسر جھوٹ اور دھوکے پر مبنی ہے۔ اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ میں گزشتہ دس برسوں سے جن باتوں پر اندھا اعتماد کرتی تھی، وہ فریب کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میری نظروں کے سامنے اعتماد کی وہ عمارت لمحے بھر میں زمین بوس ہو گئی تھی، میں کس قدر غلط فہمی میں مبتلا تھی اور کیسے کیسے غلط خیالات میں جکڑی ہوئی تھی۔''

''آپ کو معلوم تھا کہ آپ کے دھرم سے تعلق رکھنے والے سائنس دان ممبر سرن نامی زہریلی گیس اسی کمپاؤنڈ میں تیار کر رہے ہیں جس میں آپ رہائش پذیر تھیں؟''

''مجھے یہ ضرور معلوم تھا کہ ہمارے دھرم میں گرو کے کئی ایسے چیلے بھی شامل ہیں جو ملک کے بہترین سائنس دان اور علم کیمیا کے عالم ہیں لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ سرن جیسی گیس تیار کر رہے ہیں جسے ٹوکیو کے مرکزی زمین دوز ریلوے اسٹیشن میں چھوڑا جائے گا۔ ہمارا گرو اس ملک کے ہزاروں اہم افراد کو ہلاک کرنا چاہتا ہے۔ ایسے لوگوں کو جن کا تعلق خاص سرکاری اداروں سے ہے۔ کئی لوگ شاید میری اس بات پر یقین نہ کریں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے ظالم اور خونی دھرموں کا طریقۂ واردات یہی ہوتا ہے۔ دھرم کے گرو اپنے قریبی دوستوں اور اہم کارکنوں سے بھی کئی باتیں چھپا کر رکھتے ہیں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اگر مذہب کا مقصد دکھی انسانیت کی خدمت کرنا ہے تو آپ کے اس دھرم "اوم شین ری کیو" کا مقصد کیا تھا؟"

"ابتدا میں ہمیں یہ باور کرایا گیا تھا کہ اس دھرم کا کام انسانوں کو روحانی اذیت سے نجات دلانا اور نروان عطا کرنا ہے۔ ہم گوتم بدھ کی تعلیمات پر عمل کرنا چاہتے تھے لیکن بعد میں ہمارے گرو اساہارا نے اپنے آپ کو یسوع مسیح کہلانا شروع کر دیا۔ اس وقت ہم الجھن کا شکار ہو گئے تھے۔ جن لوگوں نے اساہارا کے احکامات کی آنکھیں بند کر کے بجا آوری کی، ان کے لیے عیش و عشرت کی زندگی مہیا کی گئی۔ جو لوگ اس کی پیروی کرنے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتے تھے، میرا خیال ہے ان لوگوں کو قتل کر دیا جاتا تھا اور ان کے قتل کے بعد یہ اعلان کیا جاتا تھا کہ ان کی روحوں کی مکتی دلائی گئی ہے۔"

"آپ کو ٹوکیو اسٹیشن پر زہریلی گیس چھوڑنے کا علم تھا یا نہیں؟"

"نہیں! مجھے اس کا پیشگی علم نہیں تھا۔ میں نے یہ خبر ٹی وی اور اخبارات میں دیکھی اور پڑھی تھی۔ مجھے یقین ہی نہیں آیا تھا کہ ہمارے دھرم کے ایسے کام بھی ہو سکتے ہیں۔ مجھے اس وقت بے حد پچھتاوا اور احساسِ جرم ہو رہا تھا۔ تعجب کی بات ہے کہ میں نے گرو کی تعلیمات پر نہ صرف اعتبار کیا تھا بلکہ اس کے پرچار میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ شاید میں حد سے زیادہ انجان اور عقل سے عاری تھی جو اس قسم کے دھوکے باز گرو کی پیروی کرنے لگی تھی۔ میں اس کے اشارے پر ہر کام کرتی رہی اور اب میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے۔"

"اس وقت آپ کے اپنے سابق گرو کے لیے کیا جذبات اور خیالات ہیں؟"

"میں اس کو ایک ایسا شخص سمجھتی ہوں جس نے بہت بڑے جرائم کا ارتکاب کیا ہے۔ اس نے سب کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ وہ بہت بڑا اور باکرامت پیر ہے اور اس نے نروان حاصل کر لیا ہے جبکہ وہ اس منزل سے بہت دور تھا۔ آج وہ جیل میں ہے لیکن اس کے باوجود حقائق سے آنکھیں چرا رہا ہے۔ ایک سابق مرید، پیروکار یا کارکن کی حیثیت سے میں اسے یہی مشورہ دوں گی کہ اس نے جو جرائم کیے ہیں بلکہ عظیم گناہ کر کے انسانی ذات کو نقصان پہنچایا ہے وہ اسے قبول کر کے خود کو سزا بھگتنے کے لیے تیار کر لے۔"

☆☆☆

جاپان میں پیدا ہونے والے "اوم" جیسے تخریب کار دھرم، سوسائٹیاں اور کلب چھوٹے پیمانے پر ہر وقت جنم لیتے رہے ہیں۔ یہ لوگ ابتدا میں دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ یوگ کے ماہر ہیں، نروان کے حامل ہیں، ان کے پاس پراسرار قوت ہے۔ مستقبل میں جھانک سکتے ہیں، بھگوان سے متقارب کر سکتے ہیں مگر جب راز کھلتا ہے تو یہ لوگ جرائم پیشہ نکلتے ہیں۔ ان کے سربراہ، لیڈر اور اعلیٰ ممبرز مختلف کارروائیوں میں ملوث ہوتے ہیں۔ اگر یہ عوام کے لیے بُرے ثابت ہوتے ہیں تو حکومت کی جانب سے ان پر پابندی عائد کی جاتی ہے یا یہ تنظیمیں اور گروپس اپنی موت آپ مر جاتے ہیں۔ "اوم" دھرم کا بانی "اساہارا" پولیس کی نظروں سے بچا رہا اور وہ کافی حد تک تباہی برپا کرنے میں کامیاب بھی ہو گیا لیکن اس سے بھی کہیں خوفناک اور خطرناک "یاکوزا" ہے۔ یہ تنظیم ایسی ہی ہے جیسے امریکا میں مافیا! جس سے امن و امان قائم رکھنے والی ایجنسیاں بھی خائف رہتی ہیں۔

جس شہر "کوکورا" میں، میں رہتا ہوں اور میں جہاں سے یہ مضمون لکھ رہا ہوں، یہ گویا "یاکوزا" والوں کا گڑھ ہے اس لیے علاقے کے باسی جاپان کے دیگر شہروں سے زیادہ فکرمند رہتے ہیں۔ اسکول میں آنے والی ماؤں کی گفتگو میں عام طور پر موضوع "یاکوزا" اور ان کی وارداتیں ہوتی ہیں۔

"فلاں علاقے میں ہم تنہا نہیں جا سکتے کیونکہ وہاں یاکوزا والوں کا اثر رسوخ زیادہ ہے۔"

"فلاں اسکول میں پڑھنے والے زیادہ تر بچے یاکوزا کے ممبران کے ہیں۔ اس لیے ہم اس اسکول میں اپنے بچوں کو بھیجنا نہیں چاہتے، کہیں ہمارے بچوں کو بھی غلط کاموں میں ملوث نہ کر دیا جائے۔"

ان کے درمیان اس قسم کی گفتگو ہوتی تھی۔ یاد رہے کہ یاکوزا کے غنڈے جرائم کے کام بچوں سے لیتے ہیں۔ تاکہ اگر وہ پکڑے بھی جائیں تو انہیں سزا نہ مل سکے یا کم سے کم ملے۔ ایک مرتبہ ایسٹرن اکانومک ریویو میں یاکوزا کے متعلق تبصرہ شائع ہوا تھا۔

"یاکوزا جرائم پیشہ افراد کا ایک ایسا گینگ ہے جس کے وجود سے جاپان انکار نہیں کر سکتا۔"

جاپان کی سرکاری گائیڈ بک میں اور عام معلومات میں بھی اس کے متعلق ضرور لکھا ہوا ملے گا۔ ان کے جرائم کا طریقۂ کار اس قدر آرگنائزڈ ہے کہ انہیں مجرم ثابت کرنا

دشوار ہے۔ وہ کھلے عام پریس کانفرنسیں کرتے ہیں اور عوام اور حکومت کے سامنے اپنا امیج بہتر اور نیک نام گروپ کے طور پر ظاہر کرتے ہیں۔ نئے ممبران کو سنڈیکیٹ میں شامل کرنے کے لیے فنکشن منعقد کرتے ہیں اور باقاعدہ اس کے کارڈ چھپوا کر تقسیم کیے جاتے ہیں۔ ہفتہ وار رسالے "اکانومسٹ" کے مطابق جاپان میں یاکوزا (جرائم) ایک آسان پیشہ ہے۔

مختلف شہروں میں یاکوزا والوں کے ہیڈ کوارٹر موجود ہیں اور ان کے باہر جلی حروف میں اس کا نام بھی لکھا ہے۔ اس سنڈیکیٹ میں شمولیت اختیار کرنے کے لیے رکنیت کا اشتہار اخبارات میں شائع ہوتا ہے۔ یاکوزا والوں کے بیان کے مطابق ان کے نوے ہزار ممبر ہیں۔ یاکوزا کے ممبران کی شرلاک ہوم کی طرح ایک خاص "Look" ہوتی ہے۔ ان کے جسموں پر Tatoo کے نشان گدے ہوئے ہوتے ہیں۔ کسی زمانے میں یاکوزا کے ممبران کی پنجابی فلم کے ہیرو کی طرح مثبت ناموس تھی۔ ان کا کام محلے کی "ماؤں بہنوں" کی عزت بچانا اور غریبوں کی جائداد کی حفاظت کرنا تھا لیکن اب ان کا ایک ہی کام ہے، ڈاکے ڈالنا، لوٹ مار کرنا اور امیر لوگوں کو اغوا کر کے تاوان کی صورت میں دولت بٹورنا۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد امریکی فلمیں دیکھ کر اور ناول پڑھ کر یاکوزا کے ممبرز بھی خود کو امریکی غنڈوں جیسا ظاہر کرنے لگے۔ آج ان کی شناخت سیاہ پتلون اور کوٹ، سفید قمیص، سیاہ چشمہ اور فوجیوں جیسا ہیئر کٹ ہے۔ یاکوزا آرگنائزیشن کی رکنیت حاصل کرنے کے لیے کوئی خاص شرط نہیں ہے۔ کسی بھی ملک یا شہر سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی شخص ان کا ممبر ہو سکتا ہے۔ خواہ کوئی کم عمر بچہ ہی کیوں نہ ہو، جسے اس کے ماں باپ نے گھر سے نکال دیا ہو یا ایسے بچے جن کے پاس تعلیم حاصل کرنے کے ذرائع نہ ہوں یا کوئی کام شروع کرنے کے لیے رقم نہ ہو یا چین اور کوریا سے آنے والے رفیوجی ہوں۔ یاکوزا کے دروازے سب کے لیے ہر وقت کھلے ہوئے ہیں۔ وہ ایسے افراد کی "ذمے داری" قبول کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں جو خود کو تنہا، بیکار اور نکما محسوس کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے جو خود کو معاشرے میں "مس فٹ" سمجھتے ہیں۔

یاکوزا کے لفظی معنی آٹھ، نو، تین ہے۔ جاپان میں "Ya" یعنی آٹھ، "Ku" بمعنی نو اور "Za" کا مطلب ہے تین! ان تمام اعداد کی جمع "بیس" (20) بنتی ہے جو جاپانی تاش کے کھیل Oicho-kabu میں بے کار عدد ہے۔ اسی عدد 20 سے اس گینگ کو "یاکوزا" نام دیا گیا تھا یعنی بے کار لوگ۔ ایسے لوگ جن کی سوسائٹی میں کوئی قدر و اہمیت نہ ہو۔

کہا جاتا ہے کہ یاکوزا کی ابتدا 1612ء میں ہوئی تھی۔ اس زمانے میں چند ایسے لوگ پائے جاتے تھے جو Kabuki Mono یعنی "مست، پاگل" کہلاتے تھے۔ وہ عجیب پاگلوں جیسے حلیے، میلے کچیلے اور پھٹے پرانے لباس میں ملبوس ہوتے تھے۔ ان کے بال لمبے ہوتے تھے اور وہ ہاتھ میں ننگی تلوار لیے پھرتے تھے۔ ان سے ہر شریف اور امن پسند شخص ڈرتا تھا۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر مرنے مارنے پر تل جاتے تھے۔ ان کی آپس میں اس قدر وفاداری اور اتحاد تھا کہ اپنے ساتھی کو بچانے کے لیے اپنے کسی عزیز اور رشتے دار کو بھی ہلاک کرنے سے نہیں ہچکچاتے تھے۔

بہرحال اب یاکوزا والے اپنا تعلق ان قدیم "پاگل اور مست" لوگوں سے جوڑنے کے بجائے Machi Yakko سے جوڑنا پسند کرتے ہیں۔ "ماچی یاکو" کا مطلب ہے "شہری خادم" یعنی شہریوں کی خدمت کرنے والے اور امن و امان قائم کرنے والے افسر۔ ان کے اپنے کاروبار اور دکانیں تھیں۔ "کابوکی مونو" جیسے غیر مہذب اور مست لوگوں نے لوفروں اور بدقماشوں کو مار پیٹ کر اپنے علاقوں سے نکال دیا تھا اور شہری قدرے سکون محسوس کرتے تھے لیکن ان "ماچی یاکو" والوں نے خود کو انگلینڈ کا رابن ہڈ سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ جس نے شہزادہ جان اور نائٹنگ ہام کی پولیس سے مقابلہ کر کے عوام کو خوش رکھا تھا۔ بہ الفاظ دیگر طاقتور اور بدمعاشوں کو لوٹ کر غریب اور مفلس لوگوں میں لوٹ کا مال تقسیم کر کے ان کا دل جیت لیا تھا۔

یاکوزا میں شمولیت اختیار کرنے کے بعد ہر ممبر کو گینگ لیڈر کا حکم ماننا پڑتا ہے۔ لیڈر کی حکم عدولی پر اسے معافی کے لیے اپنے ہاتھ کی ایک انگلی کاٹ کر لیڈر کی خدمت میں پیش کرنی پڑتی ہے۔ اسی طرح دوسری مرتبہ کوئی "جرم" کرنے پر اسے اپنی دوسری انگلی کاٹ کر لیڈر کی خدمت میں پیش کرنی پڑتی ہے۔ کسی بڑے جرم یا آرگنائزیشن کے خلاف کام کرنے پر اسے قتل کر دیا جاتا ہے۔

یاکوزا کے گینگ لیڈر کو باپ کے برابر سمجھا جاتا ہے اور اسے Oyabun کہا جاتا ہے یعنی "گاڈ فادر"۔ اس کے ماتحت Wakashu یعنی "بچے" اور Kyodai یعنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھائی کہلاتے ہیں۔ ہر ممبر کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے ''باپ'' کا حکم بے چون و چرا بجالائے۔ اس کے عوض وہ اسے ہر قسم کا تحفظ فراہم کرتا ہے۔ ''اویابون'' اپنے علاقے کے ممبران کے لیے دیوتا کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کا ہر لفظ قانون کی حیثیت رکھتا ہے، ہر ممبر کو اس کا ہر حکم ماننا ہے خواہ اسے اپنے سامنے موت ہی کیوں نہ نظر آئے۔ اویابون کے ماتحت مشاورتی ٹیم بھی کام کرتی ہے جس میں کئی وکیل، اکاؤنٹنٹ اور سیکریٹری شامل ہیں۔

پولیس کے اعداد و شمار کے مطابق یاکوزا کے ہر چار ممبروں میں سے کم سے کم تین اہم ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اسکولوں سے نکالے گئے ہوتے ہیں یا امتحانوں میں فیل ہو چکے ہوتے ہیں۔ وہ ملک جہاں سب سے زیادہ تعلیم کی اہمیت پر زور دیا جاتا ہے حتیٰ کہ خاکروب اور عمارات کے شیشے صاف کرنے والے کے لیے بھی اس وقت ملازمت فراہم کی جاتی ہے جب وہ اپنی تعلیمی اسناد پیش کرتا ہے وہاں اسکول سے بھگوڑوں اور امتحان میں فیل ہونے والے نالائقوں کو یاکوزا تحفظ فراہم کرتی ہے اور شناختی کارڈ جاری کر کے انہیں اچھی خاصی تنخواہ بھی دیتی ہے تاکہ وہ آسانی سے گزر اوقات کر سکیں۔ یاکوزا کے جرائم اور غلط کاریوں پر فلم بھی بن چکی ہے اور اس پر کتابیں تو کئی لکھی جا چکی ہیں۔ میں نے تین چار برس قبل ایسی ہی ایک کتاب کا مطالعہ کیا تھا۔ مذکورہ کتاب ڈیوڈ کا پلان اور الیک ڈبرو کی مشترکہ کاوش ہے اور امریکا سے شائع شدہ ہے۔ اس کتاب کا عنوان تھا۔

"Yakuza, the explosive account of Japan`s under World

یاکوزا کے متعلق ایک اور اہم بات..... وہ یہ کہ اس کے تمام ممبرز مرد ہیں۔ صرف ایک عورت جو یاکوزا کے کاموں میں حصہ لے سکتی ہے وہ اویابون یعنی ''گاڈ فادر'' کی بیوی ہوتی ہے۔ خواتین کے بارے میں یاکوزا کی یہ رائے ہے کہ وہ جسمانی طور پر کمزور ہوتی ہیں، وہ کسی بات کو راز میں نہیں رکھ سکتیں لہٰذا انہیں یاکوزا کے اہم اور پوشیدہ معاملات سے دور رکھنا چاہیے۔ بہرحال، اب آپ کو اندازہ ہو ہی چکا ہوگا کہ جاپانی سوسائٹی میں ''بے چاری'' عورت کی کیا حیثیت ہے؟

☆☆☆

جاپان میں موجود امریکی مافیا ٹائپ گینگ ''یاکوزا'' اور جعلی پیر ''سوکو اساہارا'' کے متعلق میں تفصیل سے تحریر کر چکا ہوں۔ خاص طور پر پیر فرتوت اساہارا کے بارے میں، جس نے ایک خود ساختہ دھرم ایجاد کر کے خود کو اس کا گرو، پُراسرار شخصیت اور پہنچی ہوئی ہستی ظاہر کیا اور لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ وہ اپنے پیروکاروں اور چیلوں کو دلی سکون، باطن کی روشنی اور نروان عطا کر سکتا ہے۔

سندھ یا پنجاب کے دیہی علاقوں میں اگر کوئی جعلی پیر یا نقلی مرشد پیدا ہوتا ہے تو کچھ دیہاتی، اَن پڑھ اور سادہ لوح غریب اس کی باتوں میں آ کر اپنا سب کچھ لٹا بیٹھتے ہیں، اس پر ہمیں کچھ زیادہ تعجب نہیں ہوتا لیکن جاپانیوں کے بارے میں ایسی باتیں پڑھ کر آپ کو بھی میری طرح ضرور حیرت ہوگی کہ ایسے تعلیم یافتہ اور ہوشیار لوگ بھی ایک عام آدمی کے چنگل میں کیسے پھنس جاتے ہیں؟ اور وہ بھی ایک یا دو دن کے لیے نہیں، دو یا چار افراد نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں برسوں تک ایک جعلی پیر کو پوجتے رہے۔ اس کے کرتوت سامنے آنے کے باوجود کئی لوگ اب بھی اساہارا کو بے قصور سمجھتے ہیں۔ جبکہ کافی تعداد میں لوگ اس کے کردار سے واقف ہو کر تائب ہو چکے ہیں اور اس پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ ایک فراڈ کی تقلید کر کے غلط راہ پر چل نکلے تھے۔

مجھے ایک طویل عرصے تک جاپان میں رہنے، یہاں کے لوگوں، ان کے رسوم و رواج اور کلچر کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ میں اپنے مشاہدے سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انہیں زندگی کی ہر آسائش حاصل ہونے کے بعد اب ذہنی سکون کی طلب شدت سے محسوس ہونے لگی ہے جس کے حصول کے لیے وہ اپنی عبادت گاہوں اور مندروں کا رخ کرتے ہیں۔ اس دوران میں اگر انہیں کوئی ایسا شخص مل جاتا ہے جو باطنی روشنی اور نروان کی بات کرتا ہے تو یہ آنکھیں بند کر کے اس کی بات کو تسلیم کر لیتے ہیں کیونکہ جاپانی فطرتاً روبوٹ کی مثل ہیں، بلکہ انہوں نے خود اپنی زندگی کو ایسا بنا لیا ہے۔ جاپانی صبح سے شام تک روبوٹ کی طرح ایسے کام کرتے ہیں جیسا ان کے ذہن میں طے ہوتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر جس طرح ان کا دماغ Programmed ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جاپانی لوگ انڈیا، نیپال اور ہمالیہ پہاڑ کو ایسی جگہ سمجھتے ہیں جہاں پہنچنے سے انسان کا باطن منور ہو جاتا ہے۔ جب بھی یہ شور شرابے اور زندگی کے ہنگاموں سے نجات چاہتے ہیں، فوراً اپنے مندروں کی جانب رخ کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ مذہبی بننے کے لیے انڈیا اور

ہمالیہ کے پہاڑوں، نیپال، بھوٹان، سکم وغیرہ کی عبادت گاہوں کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ وہاں سے واپس آنے والا شخص ''عالم فاضل'' تصور کیا جاتا ہے۔ شاید اس لیے کہ جاپان میں رائج ''بدھ مذہب'' وہیں سے آیا تھا۔ لہٰذا یہ لوگ بھی ذہنی سکون اور مذہبی ارتکاز حاصل کرنے کے لیے وہیں جاتے ہیں۔

جاپانی جہاں ٹیکنالوجی میں ماہر اور ذہین ہیں وہاں کچھ باتوں میں سادہ لوح بھی ہیں۔ مجھے یاد ہے، ستر کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں ہمارے جہاز پر دو بوڑھے اور لمبی ڈاڑھیوں والے پٹھان خلاصی تھے۔ وہ کوبے اور یکوہاما کی بندرگاہوں کے قریب واقع پارکوں میں جا کر بیٹھتے تھے۔ وہاں کئی جاپانی، خاص طور پر لڑکیاں اپنا ہاتھ دکھانے کے لیے ان دونوں کے سامنے بیٹھ جاتی تھیں اور معاوضے کے طور پر خاصی رقوم دے جاتی تھیں۔ یہ دونوں خلاصی، جو کسی بھی طرح پامسٹ نہیں تھے..... لیکن جاپان پہنچ کر ایسے ہوشیار ہو گئے تھے کہ لڑکی کا ہاتھ تھامتے ہی ناراض محبوب کے راضی ہونے اور جلد ہی بہتر ملازمت ملنے کی خوشخبری سناتے تھے۔ اسی طرح ہمارے ہاں کی درگاہوں اور مقابر کی زیارتوں پر موجود نذرانے کی اتنی پیٹیاں نہیں بھرتیں، جتنی جاپان کے مندروں اور درگاہوں پر رکھی ہوئی چوبی پیٹیاں کرنسی نوٹوں سے بھر جاتی ہیں۔

جن دنوں ٹوکیو کے ریلوے اسٹیشن پر زہریلی گیس والا واقعہ ہوا تھا، اس کے بعد ''اوم'' نامی یہ تخریبی دھرم کے جاپانی پیر کے پکڑے جانے کے ساتھ ساتھ اس کے سیکڑوں چیلے بھی گرفتار ہوئے تھے جن میں سے کئی افراد کو سزائیں ملیں اور کئی بے قصور اور معصوم بھی ثابت ہوئے تھے۔ انہیں باعزت طور پر رہا کر دیا گیا تھا۔ ان میں سے ایک ''ماساتو'' نامی نوجوان بھی تھا جسے پولیس اسٹیشن پر آ کر یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ جسے وہ پیر سمجھتا تھا، وہ درحقیقت بہت بڑا جعل ساز تھا۔ اب وہ اپنے کیے پر نادم ہے جبکہ اس سے قبل وہ اپنے پیر اور گرو اساہارا پر اس قدر اعتقاد رکھتا تھا کہ اس نے کئی لوگوں کی موجودگی میں اساہارا کے سامنے جھک کر اپنی وفاداری کا وچن دیا تھا۔ اس موقع کی تصویر اخبارات میں بھی شائع ہوئی تھی لیکن اب وہ اس پر ندامت محسوس کرتا ہے اور اسے سخت افسوس ہوتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی کے کتنے قیمتی سال ایک جعلی پیر کے چنگل میں پھنس کر برباد کر دیے تھے۔ اس کے متعلق کچھ باتیں آپ بھی پڑھیں، مجھے یقین ہے کہ آپ کو بھی حیرت ہوگی کہ جاپان جیسے ملک میں اور اس کی سوسائٹی میں ایسا بھی ہوتا ہے!

ماساتو ان ڈیڑھ ہزار چیلوں میں سے ایک تھا جو گرو اساہارا کے ساتھ دھرم کے کمپاؤنڈ میں رہائش پذیر تھے۔ ٹوکیو میں زہریلی گیس چھوڑنے والے واقعے کے بعد ماساتو کو پولیس نے گرفتار کر کے اس سے دو ہفتے تک تفتیش کی تھی۔ اس تفتیش سے یہ بات سامنے آئی کہ گرو کے غلط کاموں میں ہر شخص ملوث نہیں ہوتا تھا، بلکہ انہیں اس سلسلے میں کچھ معلومات بھی نہیں ہوتی تھیں۔ چند خاص چیلوں کو اس راز میں شامل کیا جاتا تھا۔ بہرحال ماساتو کو رہا کر دیا گیا لیکن جیل میں اپنے گرو کے کرتوتوں کا سن کر اسے بہت پچھتاوے کا احساس ہوتا ہے۔

''میں نے اپنے گرو سوکو اساہارا کو اس دھرتی کا خدا سمجھ کر پوجا تھا۔'' اس نے بتایا۔

اس گرو نے ایک خاص قسم کے ہیلمٹ نما ٹوپیاں بنوائی تھیں جن پر اینٹینا بھی نصب تھا۔ اس کے ''پکے مرید'' یہ ٹوپیاں پہن کر چلتے تھے۔ گرو نے انہیں بتایا تھا کہ یہ ٹوپیاں پہننے سے اس کے دماغ کی لہریں ان کے دماغ میں پہنچ کر عقل اور روشنی پیدا کرتی ہیں۔ ماساتو اب سوٹ ٹائی میں نظر آتا ہے جبکہ اس سے قبل یعنی جیل جانے سے پہلے تک وہ بھی ہمیشہ یہی ٹوپی پہن کر چلتا تھا۔

''اوم دھرم سے تعلق رکھنے والے ہم چیلوں میں سے زیادہ تر بے قصور تھے۔'' ماساتو نے بتایا۔ ''بلکہ ہم لوگوں نے تو اپنی ہر چیز یہاں تک کہ اپنے پاس موجود تمام نقدی بھی گرو کے حوالے کر دی تھی۔ اور گرو کے کہنے کے مطابق دن بھر میں ہم صرف ایک وقت کھانا کھاتے تھے۔ جاپانی معاشرہ مجھے بیمار معاشرہ محسوس ہوتا تھا، جس میں اخلاق کی رمق تک باقی نہیں رہی تھی۔ میں نے دل و جان سے یہ تسلیم کیا تھا کہ ہر غم اور دکھ کی بنیاد خواہشات ہیں۔''

ماساتو نے مزید کہا کہ ''اوم، دھرم کی زیادہ تر تعلیمات وہی تھیں جو بدھ دھرم کی تھیں اور وہ انہیں پسند کرتا تھا لیکن مصیبت تب شروع ہوئی جب گرو نے کچھ ظالمانہ روایات کو اس میں شامل کر دیا جنہیں وہ ''پاک ہونا'' کہتا تھا۔ ایک چیلے کو پاک کرنے کے لیے اسے انتہائی سرد پانی کے حوض میں ڈبکیاں دی جاتی تھیں۔ اسے زیادہ سے زیادہ پانی پلا کر پھر الٹیاں کرائی جاتی تھیں۔ اس کے بعد اسے رسی کا ایک ٹکڑا نگلنا پڑتا تھا۔

ماساتو 1986ء میں اس دھرم میں شامل ہوا تھا۔ اس وقت وہ کالج میں زیر تعلیم تھا۔ اس نے بتایا۔ ''میں اساہارا کی تصویر دیکھ کر اس سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر لمبی سی ڈاڑھی تھی اور چہرے پر پدرانہ شفقت نظر آتی تھی۔ وہ ہم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جاپانیوں سے بالکل مختلف لگ رہا تھا۔"

تین سال بعد جب ماساتو ٹوکیو کی واسیدا یونیورسٹی میں Law کر رہا تھا تو ایک دن وہ اپنی ماں کو روتا ہوا چھوڑ کر اوم دھرم کے کمپاؤنڈ میں پہنچ گیا۔ اب اس کے لیے نئی فیملی اوم دھرم کے چیلے تھے جن کے ساتھ وہ رہنے لگا۔

"اوم دھرم کے کمپاؤنڈ میں رہنا آسان نہ تھا۔ جبکہ گرو ہم سے چھپ کر "مال" کھاتا تھا لیکن ہمارے لیے دن بھر میں ایک وقت کا کھانا اور نیند کے لیے دو یا تین گھنٹے مقرر تھے۔ گرو ہم چیلوں کو شادی اور سیکس سے منع کرتا تھا اور خود جوان اور خوبصورت لڑکیوں سے دل بہلاتا تھا۔ اس حوالے سے وہ جواب میں کہتا تھا کہ ایسا کرنے سے اس کے نئے چیلوں کے اندر روحانیت اور روشنی کا اثر جلد پہنچتا ہے، اوم دھرم اختیار کرنے والے نئے چیلوں کو ایک خاص قسم کی چائے پلائی جاتی تھی جو گرم پانی میں انہی کے بال ڈال کر تیار کی جاتی تھی۔ مجھے چھ مہینے ایک یا دو میٹر کی مختصر سی کوٹھی میں رکھا گیا تھا۔ حکم یہ تھا کہ میں دن بھر گرو کی نصیحتوں کو دُہراتا رہوں اور غور و فکر کروں۔ پورے دن میں ایک مرتبہ دروازے کے سامنے کھانا رکھا جاتا تھا۔ ضروریات سے فارغ ہونے کے لیے مجھے ایک آہنی ڈبا دیا گیا تھا۔ چھ ماہ تک نہانے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ باغی چیلوں کو مار پیٹ کے ذریعے سدھارا جاتا تھا۔ اس کے بعد بھی "سیدھی راہ" پر نہ آنے والے کی گردن میں رسی کا پھندا ڈال کر گھسیٹا جاتا تھا۔ داد فریاد سننے والا کوئی نہ تھا۔"

"ہم پر سب سے بڑا ظلم Mediation کے نام پر کیا جاتا تھا۔" ماساتو نے مزید تفصیل بتاتے ہوئے کہا "اس میں پورا مہینا ایک جگہ آلتی پالتی مار کر بیٹھنا پڑتا تھا۔ چوبیس گھنٹوں میں ایک منٹ بھی سونے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ میں نے سنا تھا کہ ایک ہفتے تک نہ سونے والے کی موت واقع ہو سکتی ہے۔ لیکن میں شاید بیٹھے بیٹھے تھوڑی سی نیند لے کر بچ گیا تھا۔ آخری دنوں میں ٹانگوں میں اس قدر شدید درد ہوتا ہے کہ ہر ایک وہاں سے بھاگنے کی سوچنے لگتا تھا۔ اس کی سزا اسا ہارا زنبور سے جسم کو نوچ کر دیتا تھا۔ میرے جسم پر آج بھی نوچے جانے کے نشان اور مار پیٹ کے زخم موجود ہیں۔"

ماساتو کو جب پولیس نے آزاد کر دیا تو اس کے ماں باپ اس سے ملنے آئے تھے۔ وہ گھر چھوڑ جانے کے بعد پہلی بار ان سے ملا تھا۔ انہوں نے ماساتو کی گرفتاری اور پھر آزادی کی خبر ٹی وی پر سنی تھی۔ اس کے دو مہینے کے بعد ماساتو نے اس تخریبی دھرم سے علیحدگی کا اعلان کر دیا "میں آئندہ کبھی بھی اس دھرم کا چیلا نہیں بنوں گا۔ مجھے اس دھرم اور اس کے گرو کی اصلیت اب معلوم ہوئی ہے۔ کئی لوگ اپنے ماضی کی بے وقوفیاں اور غلطیاں چھپاتے ہیں لیکن میں سب کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں کس قدر بے وقوف ہوں کہ اپنی ملازمت، مال ملکیت اور اپنے عزیز و اقارب کو چھوڑ کر ایک ایسے گرو کے پیچھے چل پڑا تھا جو انسان نہیں وحشی ہے جو اَب بھی یہی سمجھتا ہے کہ اس نے جو کچھ کیا وہ درست تھا۔"

یاد رہے کہ اس اوم مذہب کے گرو اساہارا کو لوگوں کی اموات کا کوئی افسوس نہیں۔ اس کا موقف ہے کہ اس نے جو خونریزی کی تھی، وہ ایک نیک مقصد کا حصہ ہے۔ اس طرح کرنے سے وہ مرنے والوں کی ارواح کو فوراً جنت میں پہنچا دیتا ہے۔

ماساتو جیسے سیکڑوں چیلے اب بھی اس کمپاؤنڈ میں ٹھہرے ہوئے ہیں جو اس دھرم کا مرکز ہے۔ وہ اپنے گرو کو معصوم سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اسے جھوٹے الزامات میں پھنسا کر قید کیا گیا ہے۔ البتہ کافی تعداد میں چیلے کمپاؤنڈ چھوڑ کر اپنے ماں باپ کے گھر چلے گئے ہیں۔ کچھ نے مختلف شہروں کے مندروں میں ٹھکانے بنا لیے ہیں۔ بہرحال ماساتو اب تک اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکا ہے۔ وہ اس سوچ میں ہے کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟" ماساتو نے کہا۔ "شاید مجھے بدھ دھرم کی صحیح تعلیمات کے لیے تبت جانا پڑے۔"

بہرحال، ماساتو کی یہ کہانی پاکستانیوں کے لیے ضرور دلچسپ ثابت ہوگی کہ اس سائنسی دور میں اور جاپان جیسے ماڈرن اور تعلیم یافتہ ملک میں بھی پُراسراریت اور روحانیت کا نام استعمال کرنے والے اس قسم کے جعل ساز اور ٹھگ موجود ہیں۔ یہ کہانی صرف ایک ماساتو کی نہیں بلکہ اس قسم کی ملتی جلتی کہانیاں ہزاروں جاپانیوں کی ہیں جن کی تفصیلات نہ صرف مقامی بلکہ دنیا کے دیگر ملکوں کے اخبارات اور ٹی وی پر اکثر آتی رہتی ہیں۔ درج بالا کہانی کے بارے میں مجھے نہ صرف یہاں آ کر تفصیل سے معلوم ہوا بلکہ بانگ کانگ کے ایک رسالے میں بھی پڑھا تھا۔ جس میں تمام کرداروں کی تصاویر بھی شائع ہوئی تھیں۔

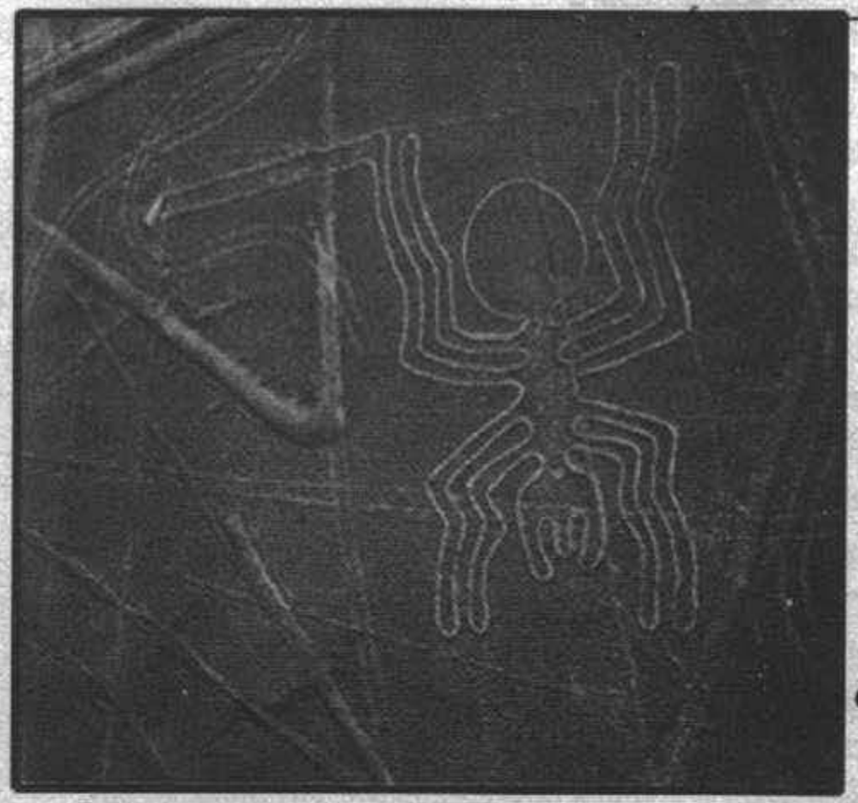

ناسکا لکیریں

ابن کبیر

جنوبی امریکا کی ریاست پیرو کے اس میدان میں بنی عجیب وغریب تصاویر جو صدیوں سے وہاں موجود ہیں، انہیں کس نے بنایا؟ ان تصاویر میں ایسا کیا راز ہے کہ انہیں لوگ منحوس خیال کرتے ہیں، خصوصاً ایک بندر کی شبیہ سے لوگ کیوں ڈرتے ہیں؟ وہ تصاویر زمین سے نامکمل مگر ہوائی جہاز سے مکمل کیوں نظر آتی ہیں؟

خوف و اسرار کے پردے میں چھپے ایک وسیع میدان میں بنی لکیروں کا قصہ

اسرار کی دھند سے برآمد ہونے والے واقعات میں اکثر و بیش تر مافوق الفطرت قوتوں کی کارفرمائی نظر آتی ہے، اُن کے کردار بھی عجیب اور پُراسرار ہوتے ہیں، تاہم کبھی کبھار کسی نامعلوم طریق سے محبت نامی جذبہ بھی اِن کتھاؤں میں در آتا ہے اور ان کی پُراسراریت کو مہمیز کر دیتا ہے۔

جارج گیری کا المیہ یہ تھا کہ اُسے بچپن ہی سے مافوق الفطرت معاملات میں دلچسپی تھی اور اِسی دلچسپی نے اسے موت کے منہ میں دھکیل دیا۔

اس کی ناگہانی موت اُس کے اہلِ خانہ کے لیے ایک معما بنی رہتی، اگر اداس آنکھوں والی خوب رُو لیلینا فرانسس سامنے نہ آتی۔

لیلینا اور جارج کی پہلی ملاقات لندن کے ایک کافی ہاؤس میں ہوئی۔ "برمودا ٹرائی اینگل" کے موضوع پر لکھی جانے والی ایک کتاب میں گم جارج میں کچھ ایسا ضرور تھا جس نے لیلینا کو متوجہ کیا۔ کسی خاموش قوت کے زیرِ اثر وہ کافی کا مگ لیے اُسی میز پر جا بیٹھی جہاں جارج دنیا و مافیہا سے بے نیاز بیٹھا ایک ضخیم کتاب سے حاصل ہونے والی معلومات اپنے ذہن میں محفوظ کر رہا تھا۔

اِس دوران کبھی کبھار وہ چند ساعت کے لیے کتاب بند کر کے خلاؤں میں گھورنے لگتا، کچھ سوچتا، پھر اپنے سامنے پڑی ڈائری پر قلم چلانے لگتا۔

اچانک ایک خوب رُو لڑکی کو یوں اپنے سامنے بیٹھا دیکھ کر جارج گھبرا گیا لیکن لندن اسکول آف آرٹس کی اُس طالبہ نے بہت ہی دوستانہ انداز میں باتوں کا آغاز کیا، جس نے اکنامکس کے اس طالب علم کی گھبراہٹ کو کم کر دیا، یوں اُن کے درمیان دوستی پروان چڑھی۔

لیلینا نے جو طریقہ اپنایا وہ سادہ تھا، اُس نے جارج سے اُسی موضوع کی بابت گفتگو کی جس میں وہ دلچسپی رکھتا تھا یعنی پُراسرار تصور کیے جانے والے نکون برمودا ٹرائی اینگل کا ذکر چھیڑ دیا، جس نے کم گو جارج میں توانائی بھر دی اور وہ کتاب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بند کر کے سنہرے بالوں والی اُس حسینہ کو اِس موضوع پر اپنی چار سالہ غیر رسمی تحقیق کی بابت بتانے لگا۔

اُنہیں ایک دوسرے کو سمجھنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ دراصل دونوں ہی روایت شکن تھے۔ اُن کے اجداد کا تعلق جرمنی سے تھا جنہوں نے جنگِ عظیم دوم سے کئی برس قبل برطانیہ کا رخ کیا اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ایلینا فرانسس کے والد ایک قدامت پسند آدمی تھے۔ اُس کے خاندان میں مذہبی روایات کو کلیدی حیثیت حاصل تھی۔ خاندان کا ہر فرد باقاعدگی سے چرچ جاتا اور بچوں کی سیر گرمیوں پر خصوصی نظر رکھی جاتی۔ ایلینا کے والدین کی خواہش تھی کہ وہ شعبۂ تدریس کا حصہ بنے لیکن اُس نے مصوّری کو منتخب کیا، یعنی ایک طرح سے ماحول سے بغاوت کی۔

دوسری طرف جارج تھا جس کی رگوں میں امریکی خون بھی شامل تھا کہ اُس کی والدہ کا تعلق امریکا کے شہر نیویارک سے تھا جو ایک انگریز انجینئر کو دل دے بیٹھیں اور پھر لندن میں بس گئیں۔ جارج کے والدین چاہتے تھے کہ وہ اکنامکس کے مضمون میں مہارت حاصل کرے اور اپنا کیریئر بنائے لیکن اوائل عمری ہی سے وہ معموں کے پیچھے بھاگنے لگا۔

ٹیلی پیتھی، ہپناٹزم، کالے جادو جیسے معاملات سے اوپر اٹھا تو برمودا ٹرائی اینگل، اہرامِ مصر، اڑن طشتریوں نے اسے جکڑ لیا۔ طویل عرصے تک وہ اِن موضوعات میں سر کھپاتا رہا اور جب اُس کی ایلینا سے ملاقات ہوئی تو اُس کی زندگی پُراسرار اور عجیب و غریب ''ناسکا لکیروں'' میں الجھ گئی جنہیں عالمی ورثہ تصور کیا جاتا ہے اور جن کے معمے کو حل کرنے کی کوششیں تاحال جاری ہیں۔

ابتدا میں تو ایلینا فقط جارج سے جڑے رہنے کی غرض سے ان مافوق الفطرت معاملات میں دلچسپی لیتی تھی لیکن خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ دھیرے دھیرے اسے بھی اس شعبے میں دلچسپی پیدا ہونے لگی۔

اور پھر ایک روز وہ دونوں لندن کے علاقے ''سٹی ہال'' کے نزدیک غیر رسمی علوم کی ایک درس گاہ میں ہونے والے سیمینار میں شریک ہوئے جس کا بنیادی موضوع ریاست پیرو کے ایک علاقے میں موجود معما تھا جو آج بھی محققین کے لیے دردِ سر بنا ہوا ہے۔

☆☆☆

ہال میں تاریکی تھی اور ائر کنڈیشنر کی ٹھنڈی ہوا گردش میں تھی۔ مقررین کے پیچھے ایک پردہ تھا جس پر پراجیکٹر مختلف اور عجیب و غریب شبیہیں بکھیر رہا تھا۔ بیش تر تصاویر ہوائی جہاز سے لی گئی تھیں جن میں سطحِ زمین پر بنی لکیروں سے جھلکتی پُراسرار اشکال پر فوکس کیا گیا تھا۔ مقرر کی آواز گونج رہی تھی۔ ''حاضرین، جنوبی امریکا کی ریاست پیرو کے دو قصبوں ناسکا اور پلاپا کے درمیانی علاقے میں 80 کلومیٹر کے رقبے پر کچھ ایسا کندہ ہے جو ایک طویل عرصے سے ماہرینِ آثاریات کے لیے چیستان بنی ہوئی ہے۔ اِس معمے کو ناسکا لکیریں (Nazca Lines) کہا جاتا ہے۔''

پردے پر عجیب و غریب اشکال دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک مختصر سے وقفے کے بعد مقرر کی آواز گونجی:

''آپ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ جغرافیائی اشکال ہیں۔ صحرائے ناسکا میں موجود اِن اشکال کا مشاہدہ فقط اُسی وقت ممکن ہے جب محقق کو ہوائی جائزے کی سہولت میسر ہو اور بغیر کسی شبے کے دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ یہ نظارہ، ناظر کو حیرت کی اتھاہ گہرائی میں لے جانے کی قوت سے مالا مال ہے۔''

مقرر نے ایک نظر حاضرین کے چہروں پر ڈالی، جن سے دلچسپی جھلک رہی تھی۔ وہ پھر گویا ہوا۔ ''دوستو! اندازوں کے مطابق یہ جغرافیائی اشکال 200 قبل مسیح سے 700 عیسوی کے درمیانی عرصے میں تشکیل دی گئیں اور یہ امر انتہائی حیران کن ہے۔ سوچیے، کیا اُس وقت یہ ممکن تھا کہ ٹیکنالوجی کے بغیر آپ اس قسم کا کارنامہ انجام دے سکیں؟ خیر، اس خطۂ زمین پر سیکڑوں عجوبہ اشکال ہیں جن میں کچھ انتہائی پیچیدہ ہیں۔ کہیں ان لکیروں میں بندر کا عکس دکھائی دیتا ہے، تو کہیں مچھلی کا، کبھی ان میں سے چھپکلی جھلکتی ہے تو کبھی مکڑی!''

پردے پر لکیروں سے جھلکتی بندر، چھپکلی اور مچھلی سے مشابہ معلوم ہونے والی شبیہیں دھیرے دھیرے حرکت کر رہی تھیں۔

ارلیانو سگنڈو نامی مقرر اپنی تقریر مکمل کر چکا تھا اور اب ایک ادھیڑ عمر خاتون اسٹیج کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ ارسلا امرانتا نامی ان صاحبہ کا تعلق پیرو ہی سے تھا۔ اب اس خاموش اور تاریک ہال میں ارسلا کی آواز گونجنے لگی۔ ''لندن میں آپ دوستوں سے رُوبرو ہونا ایک خوش گوار لمحہ ہے۔ ماہرین کے مطابق پہلی صدی عیسوی سے آٹھویں صدی تک کا عرصہ ناسکا تہذیب کے عروج کا دور تھا۔ یہ تہذیب پیرو کے جنوبی خشک حصے کی دریائی وادی میں آباد تھی۔ اندازوں کے مطابق یہاں کے باسیوں پر Paracas تہذیب جس کا زمانہ 600 قبل مسیح سے 175 قبل مسیح ہے، کے کافی گہرے اثرات پائے

جاتے تھے، جن کی وجہ شہرت پیچیدہ کپڑا سازی کی تکنیک اور ترقی یافتہ زرعی نظام تھا۔ اِس تہذیب کا تعلق جنوبی امریکا کے طویل پہاڑی سلسلے کوہ اینڈیز سے تھا۔''

اب پردے پر زمین پر کندہ ان لکیروں کی قریب سے لی گئی تصویریں سجی تھیں، جو نالیوں کے مانند معلوم ہوتی تھیں۔

ارسلا کہہ رہی تھی۔ ''ناسکا تہذیب کی وجہ شہرت دستکاری، کوزہ گری اور کپڑا سازی تھی۔ اُنہیں زیرِ زمین آب راہ بنانے میں بھی مہارت حاصل تھی، اور اِس علاقے میں موجود کئی نالیاں آج بھی قابلِ استعمال ہیں، تاہم اصل شہرت و شناخت اِس تہذیب کو اپنی اِن جغرافیائی اشکال ہی کے باعث حاصل ہوئی۔ یہ زمین پر موجود گہرے یا اتھلے ڈیزائنز ہیں۔ اشکال تشکیل دینے والوں نے سطحِ زمین پر پھیلے سرخ کنکروں کو ہٹا دیا جس سے نیچے کا سفید حصہ جھلکنے لگا۔ اِن میں سو سے زائد اشکال جیومیٹریکل ہیں، جب کہ ستّر کے قریب انسانی شبیہہ سے مشابہت رکھتی ہیں۔ چند سادہ اشکال بھی ہیں۔ ان لکیروں سے تشکیل پانے والی سب سے بڑی شکل 200 میٹر کے علاقے پر پھیلی ہوئی ہے جو انسانی ذہن میں یہ پُراسرار سوال پیدا کرتی ہے کہ آخر اسے کیسے تخلیق کیا گیا؟''

ایلینا نے واضح طور پر محسوس کیا کہ اُس وقت جارج اپنے اندر ایک قوت محسوس کر رہا ہے۔

☆☆☆

اس سیمینار میں شرکت کے بعد جارج نے تمام معاملات کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے ان پُراسرار اشکال کو اپنی کلی توجہ کا مرکز بنا لیا اور اس پر لکھی گئی کتابیں ڈھونڈنے لگا۔

ایلینا کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ اب اسے یہ موضوع لطف دینے لگا تھا۔ گو کہ وہ اس میدان میں ابھی نو وارد تھی لیکن تخیلاتی وسعت کی بنیاد پر سوچنے سمجھنے کی خاص صلاحیت رکھتی تھی۔ اس نے انٹرنیٹ پر اس بارے میں تحقیق شروع کر دی۔ مواد سے زیادہ اُس کی دلچسپی ان قدیم پُراسرار لکیروں کی تصاویر میں تھی۔ اس نے کئی تصویروں کا بہ غور جائزہ لیا اور پھر کسی نامعلوم جذبے کے تحت رنگ اور برش لے کر کینوس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ وہ کسی نامعلوم قوت کے زیرِ اثر تھی!

دوسری جانب جارج کا وقت بھی لائبریریوں میں صَرف ہو رہا تھا۔ اس نے انٹرنیٹ کے بجائے کتب خانوں پر انحصار کیا۔ دراصل اس کے نزدیک انٹرنیٹ اس معاملے میں فقط سطحی معلومات دے سکتا ہے۔ گہرائی تک حصول کے لیے کتابیں ضروری ہیں۔

اور یوں اُس کا تعلق امریکی فوٹو جرنلسٹ، میرلن بریجز سے پیدا ہوا جس کا ذکر ناسکا اشکال پر بات کرتے ہوئے از حد ضروری ہے۔

معلومات کے مطابق اِس خاتون صحافی نے قدیم اور جدید دور کے ارضی شاہکار کی فضائی عکاسی کے باعث شہرت حاصل کی تھی جن میں سے بیش تر مذہبی حیثیت کے حامل تھے۔ میرلن نے 1970ء میں ایک میگزین سے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ 76ء میں ناسکا اشکال کی تصاویر بنانے کے بعد اُس نے فضائی عکاسی کے شعبے میں خصوصی دلچسپی لی۔ ان تصاویر کی مدد سے ماہرین کو اِس علاقے کا نیا رخ دکھائی دیا اور تحقیق کی مزید جہتیں سامنے آئیں۔

جارج نے اپنی ڈائری میں نوٹس لیے اور ایلینا کے اپارٹمنٹ کا رخ کیا جہاں وہ دوشیزہ رنگوں سے کھیل رہی تھی۔

جب جارج نے دروازے پر دستک دی، ایلینا اپنا شاہ کار مکمل کر چکی تھی جس پر نظر پڑتے ہی جارج کے ذہن سے ہر خیال محو ہو گیا۔

وہ پینٹنگ بے حد عجیب تھی۔ دراصل ایلینا نے ناسکا اشکال کی انٹرنیٹ پر دستیاب تصاویر کا بہت گہرائی سے جائزہ لیا تھا اور پھر ایک پُراسرار جذبے کے تحت اُس نے لکیروں کا ''پیٹرن'' سامنے رکھتے ہوئے ایک پینٹنگ بنائی، جس میں زمین پر بنی لکیروں سے ایک شکل، ایک چہرہ ابھر رہا تھا، جو اُس کے محبوب کا تھا۔

کم گو جارج ناسکا اشکال کی طرز پر بنی پینٹنگ میں جھلکتا اپنا چہرہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ایلینا اس کی پشت پر کھڑی مسکرا رہی تھی۔

محبت انجانی راہوں پر سفر کرنے کی تیاری مکمل کر چکی تھی!

☆☆☆

''اسکالرز کے درمیان اِن اشکال کی تشکیل کے سبب اختلاف پایا جاتا ہے، پھر بھی اکثریت کے نزدیک یہ اشکال مذہبی علامات ہیں اور بنانے والوں کے عقائد اور عقیدت کی عکاسی کرتی ہیں۔'' ارسلا امرانتا نے سگریٹ کا کش لیا اور گفتگو میں وقفہ آ گیا۔

جارج اور ایلینا اس کے سامنے بیٹھے تھے۔ جارج اپنے جوڑی دار کے منع کرنے کے باوجود وہ پینٹنگ ساتھ لے آیا تھا جو اس وقت ارسلا کے سامنے میز پر سجی تھی۔

ارسلا کی نظریں دلچسپی سے اس پینٹنگ کا جائزہ لے رہی تھیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"لیلینا، شاید تمہیں یقین نہ آئے، کسی زمانے میں مجھے بھی مصوری میں دلچسپی تھی۔"

"واقعی؟" لیلینا کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ اُسے سخت خدوخال والی اُس عورت کے بارے میں یہ جان کر حیرت ہوئی کہ کسی زمانے میں وہ رنگوں سے کھیلتی تھی۔

"ہاں!" ارسلا نے سگریٹ کا کش لیا اور پھر یادوں میں کھو گئی۔ چند ساعتیں یونہی گزریں۔ پھر اُس کے لب وا ہوئے۔ "میں ہر قسم کے رنگ استعمال کیا کرتی تھی۔ پینسل کلر، واٹر کلر، آئل پینٹ اور کبھی کبھار آئل پیسٹل بھی، تاہم....." سگریٹ کے ایک کش نے درمیان میں وقفہ پیدا کر دیا۔ جارج اور لیلینا دلچسپی سے سن رہے تھے۔

ارسلا نے پھر بات کا سرا جوڑا۔ "مگر میری تصویروں میں وہ حسن، وہ قوت کبھی بھی پیدا نہیں ہوئی، جو تمہاری پینٹنگ میں ہے۔ جانتی ہو کیوں؟"

لیلینا خاموش رہی۔

"وہ اس لیے....." ارسلا نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "کیوں کہ میں کبھی وہ رنگ استعمال نہیں کر سکی جو تمہاری اس پینٹنگ میں حاوی ہے۔ اور وہ ہے، محبت کا رنگ!"

لیلینا شرما گئی، جارج بھی جھینپ گیا۔

"خیر، ہم ناسکا اشکال کے بارے میں بات کر رہے تھے۔" ارسلا نے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا دی۔ "تو ماہرین کی اکثریت ان اشکال کی تشکیل کے پیچھے مذہبی محرک کارفرما دیکھتی ہے۔ یہ عام خیال ہے کہ ناسکا تہذیب ایک مضبوط مذہبی تشخص کی حامل تھی اور یہ اشکال اُن کے اسی جذبے کی عکاسی کرتی ہیں۔ شاید اِن اشکال کا مقصد آسمانی خدا کو اپنی موجودگی کا احساس دلانا اور یہ ثابت کرنا تھا کہ ناسکا کے باسی اپنے خدا کے وفادار ہیں۔"

مذہب ہر دور میں ایک قوت کی حیثیت سے ہماری زندگیوں میں کارفرما رہا ہے۔" لیلینا نے دل میں سوچا۔

ارسلا نے اپنی بات جاری رکھی۔ "ایک مفروضے کے مطابق یہ اشکال علاقے میں پانی کی فراہمی ممکن بنانے کے لیے تخلیق کی گئی تھیں۔ یعنی یہ ایک طرح کا زرعی نظام ہے۔ سچ کہوں تو یہ مفروضہ کئی پہلوؤں سے خاصا مضبوط ہے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ اِن کا تعلق بارش کے لیے ادا کی جانے والی مذہبی رسومات سے رہا ہوگا۔ اس مفروضے کے مطابق یہاں موجود پرندوں، مکڑیوں اور جانوروں کی اشکال زرخیزی کے دیوتا کو متوجہ کرنے والی علامت ہیں۔ چند اشکال تباہی کے دیوتا کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔"

ارسلا نے ایک اور سگریٹ سلگا لیا۔ "چند محققین اِسے قدیم کیلینڈر تصور کرتے ہیں، جب کہ چند کا خیال ہے کہ یہ اڑن طشتریوں کے لیے بنایا جانے والا قدیم ائرپورٹ ہے۔"

"اڑن طشتریوں کا ذکر برمودا ٹرائی اینگل کے بارے میں ہونے والے مباحث میں بھی بارہا کیا جاتا ہے۔" جارج نے کہا۔

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔" ارسلا نے گہرا سانس لیا۔ "لیکن پیرو کا یہ معمابرمودا ٹرائی اینگل سے یک سر مختلف ہے۔ یہاں تحقیق کے لیے واضح زمین ہے، پھر اس کا باقاعدہ جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ آپ وہاں اتر سکتے ہیں۔ ساتھ ہی خوش قسمتی سے اب تک یہاں کوئی غائب بھی نہیں ہوا!" یہ کہتے ہوئے ارسلا مسکرائی۔

"ان اشکال کا اڑن طشتریوں سے کیا تعلق بنتا ہے؟" لیلینا نے سوال کیا۔ وہ اِس معاملے میں خاصی دلچسپی لے رہی تھی۔

جواب میں ارسلا کے لب وا ہوئے۔ "اس حوالے سے ایک حلقہ یہ خیال پیش کرتا ہے کہ اِن اشکال کا بنیادی مقصد دوسرے سیاروں کی مخلوق سے رابطہ تھا۔ واضح رہے کہ اِس موضوع میں دلچسپی لینے والوں کی بڑی تعداد اسی خیال کی حامی ہے۔ کچھ غیر رسمی اور شوقیہ محققین نے تو یہ خیال بھی پیش کیا کہ انہیں بہ ذاتِ خود دوسرے سیاروں سے آنے والی مخلوق نے بنایا ہے۔"

"یہاں ناسکا لکیروں کی کڑی اُس مفروضے سے جڑتی دکھائی دیتی ہے جس کے مطابق اہرام مصر دراصل دوسرے سیاروں سے آنے والی مخلوق کے ترقی یافتہ ذہن کی کاوش ہیں۔" جارج نے بات اچک لی۔

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ اہرامِ مصر، برمودا ٹرائی اینگل اور ناسکا اشکال کے بارے میں یہی رائے پائی جاتی ہے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ ناسکا تہذیب ہماری توقع سے زیادہ ترقی یافتہ اور ذہین تھی، اُنہیں مستقبل بینی کی صلاحیت بھی حاصل تھی اور اُن کی بنائی ہوئی یہ اشکال دراصل موجودہ دور کی تہذیب کو مستقبل کے بڑے خطروں سے متنبہ کرنے کی ایک کوشش ہے۔"

"یہاں تو کڑیاں مایا تہذیب سے ملتی معلوم ہوتی ہیں جن کے کیلنڈر کے مطابق دنیا 2012ء میں تباہ ہو جائے گی۔" جارج نے کہا۔

"ہاں، کڑیاں ملتی تو ہیں لیکن میرے بچے، میں مایا تہذیب کے بارے میں مہارت نہیں رکھتی، کسی اور ماہر سے رابطہ کرو!" ارسلا کے چہرے پر مشفقانہ مسکراہٹ پھیلی تھی۔

☆☆☆

سیمینار ہال کے قریب ہی ایک ایشیائی کافی ہاؤس تھا۔ ارسلا سے گفتگو کرنے کے بعد وہ دونوں وہاں جا بیٹھے۔ اتفاق سے وہاں جارج اور لیلینا کی ملاقات ناسکا اشکال پر تحقیق کرنے والے کولمبیا کے ماہر ارلیانو سگندو سے ہوگئی۔

"ہیلو سر۔" جارج کی آواز میں خوشی تھی۔ دراصل وہ اس معمے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

"ہیلو ہیلو، نوجوانو کیسے ہو؟" ارلیانو کے لہجے سے لاطینی امریکی لہجہ جھلکتا تھا جو سننے میں دل کش معلوم ہوتا تھا۔

"سر، ناسکا اشکال کے بارے میں ہونے والے سیمینار میں ہم دونوں بھی شریک تھے۔ میرا نام جارج ہے اور یہ میری دوست لیلینا ہے۔" اس نے ارلیانو سے اپنا تعارف کروایا۔

"ہیلو جارج، ہیلو لیلینا۔" ارلیانو خوش دلی سے مسکرایا۔

"کیا ہم یہاں بیٹھ سکتے ہیں؟" جارج نے تہذیبی اطوار کے مطابق دریافت کیا۔

"ضرور ضرور۔" ارلیانو نے انہیں دعوت دی۔

اب تینوں میز پر بیٹھے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے جس میں ایشیائی ذائقہ غالب تھا۔

"یہ چائے خوب ہے۔ لندن میں ایسی چائے پینا ایک خوشگوار تجربہ رہا۔" ارلیانو نے کہا۔

"بالکل!" لیلینا مسکرائی۔

"سر، کیا ہم آپ سے ناسکا اشکال کے بارے میں گفتگو کر سکتے ہیں؟" جارج نے سوال کیا۔

"بالکل، اس پُراسرار خطۂ زمین میں مجھے بہت دلچسپی ہے، اس کے بارے میں، میں گھنٹوں گفتگو کر سکتا ہوں۔ پوچھیں، پوچھیں۔" ارلیانو نے چائے کی چسکی لی۔

"سر، اِن پُراسرار اشکال کو دیکھنے کے بعد جو پہلا سوال ذہن میں آتا ہے، وہ یہ ہے کہ آخر صدیوں پرانا یہ شاہکار وقت کے بے رحم ہاتھوں سے کیسے محفوظ رہا؟ یہ اہرامِ مصر کے مانند کسی طور مضبوط نہیں، پھر یہ کیسے ممکن ہوا؟" جارج نے سوال کیا۔ لیلینا کی آنکھوں میں بھی اشتیاق تھا۔

"اچھا سوال ہے نوجوان، خوب! کولمبیا کے کسی نوجوان نے بھی یہ سوال نہیں کیا۔ خیر سنو، ماہرین کے مطابق اس علاقے کے خشک، متوازن اور صدیوں سے بے بدل موسم نے سطح مرتفع پر موجود اِن اشکال کے بڑے حصے کو تباہی سے بچائے رکھا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ عجائب، قدرت کے سب سے طاقت ور عامل یعنی موسم کے ہاتھوں سے محفوظ رہے۔"

لیکن موسم تو وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے؟" لیلینا نے سوال اٹھایا۔

"بالکل ٹھیک، یہی تو پُراسراریت ہے۔ بات حیران کن لیکن حقیقی ہے کہ صدیوں سے اِس علاقے کے موسم میں کوئی خاص بدلاؤ نہیں آیا ہے، اِس خطے کا شمار دنیا کے خشک ترین علاقوں میں ہوتا ہے۔ یہاں کا اوسط درجہ حرارت 25 سینٹی گریڈ ہے اور اس موسم میں کئی سو سال سے بڑی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ چند قدیم باشندوں کا خیال ہے کہ کوئی مافوق الفطرت قوت ان کی حفاظت کر رہی ہے۔"

"یہ تو حیران کن ہے۔" جارج اپنی تخیلاتی جست کے طفیل پیرو پہنچ چکا تھا۔

"بالکل، بالکل۔" ارلیانو نے چائے کا کپ پرچ میں رکھتے ہوئے کہا۔

لیلینا کے ذہن میں پھر ایک سوال کلبلا رہا تھا۔ "سر، اس شاہ کار کو دیکھنے والے کے دل میں یہ خیال بھی جنم لیتا ہے کہ اُس دور کے انسانوں نے جدید ٹیکنالوجی اور فضائی جائزے جیسی سہولت کے بغیر آخر انہیں کس طرح بنایا ہوگا؟ یہ تو حیران کن ہے!"

"ہاں تم نے ٹھیک کہا۔" ارلیانو نے ویٹر کو اشارہ کیا اور گفتگو جاری رکھی۔ "یہیں سے مافوق الفطرت اور ماورائے عقل مفروضوں کو تقویت ملتی ہے۔ خیر، چند محققین اس مسئلے کا جائزہ حقیقت پسندانہ اور منطقی انداز میں لیتے ہیں۔ ان کے مطابق ان اشکال کو کھدائی کرنے والے سادہ اوزاروں کی مدد سے بنایا گیا۔ سطح زمین پر لکڑی کے نوکیلے بانس گاڑ کر لمبائی چوڑائی کا محتاط اندازہ لگایا گیا اور پھر کھدائی کی گئی۔ اس قسم کا صدیوں پرانا ایک بانس اس علاقے سے دریافت بھی ہوا ہے جس سے اس مفروضے کو تقویت ملتی ہے۔"

"کیا اس تعلق سے کوئی عملی تجربہ بھی کیا گیا؟" جارج کے چہرے پر اشتیاق کے تمام رنگ بکھرے تھے۔

"ہاں۔" ارلیانو نے پرس سے پیسے نکال کو ویٹر کو دیتے ہوئے کہا۔ "یونیورسٹی آف کینٹیکی سے تعلق رکھنے والے محقق... جوٹنگیل اس مفروضے پر کامل یقین رکھتے ہیں۔ اسے ثابت کرنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے لیے انہوں نے عملی مظاہرہ بھی کیا اور اپنے گروپ کے ساتھ بغیر فضائی جائزے کی سہولت کے اِس قسم کی اشکال تشکیل دیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے اس کارروائی میں فقط اُنہی اوزاروں کا استعمال کیا جو ماہرین کے اندازوں کے مطابق ناسکا تہذیب کو میسر تھے۔ محتاط منصوبہ بندی اور سادہ ٹیکنالوجی کی مدد سے اُن کے گروہ نے چند ہی دنوں میں ایسی اشکال بھی بنالیں جو ناسکا اشکال کے چند بڑے نمونوں سے زیادہ بڑی اور واضح تھیں۔ ماہرین کے مطابق ناسکا صحرا کی سطح پر موجود سرخ اور کتھئی بجری اور کنکریوں کو ہٹا کر یہ اشکال تشکیل دی گئی ہیں۔ جونکیل نے بھی اپنے مظاہرے کے دوران اسی طریقے پر عمل کیا۔"

"ارے، اگر جونکیل نے ایسا کرلیا تو ان اشکال کے گرد جو پُراسراریت کا کُہرا ہے، اس کی بھلا کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟" لیلینا نے سوال کیا۔

"لڑکی، یہاں بیٹھ کر ناسکا اشکال کی پُراسرار حیثیت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ اس زمین پر پاؤں رکھنے کے بعد ہی تم اُس کا گہرائی سے جائزہ لے سکو گی۔ خیر دوستو، اب میں چلتا ہوں۔ زندگی رہی تو پھر ملیں گے!"

یہ کہہ کر ارلیانو اٹھ کھڑا ہوا لیکن جاتے جاتے وہ ایک پُرقوت خیال جارج کے لیے چھوڑ گیا جس نے اُس کے ذہن میں ہیجان برپا کردیا تھا۔ پیر وجانے کا خیال!

☆☆☆

لیلینا اپنے اپارٹمنٹ میں بیٹھی، اپنی تخلیق کردہ پینٹنگ کو تک رہی تھی۔ ناسکا اشکال کی تصاویر سے مماثلت رکھنے والی اس پینٹنگ سے جارج کا عکس جھلکتا تھا۔ ست وقت گزرتا جارہا تھا مگر وہ وقت سے ماورا تھی۔ اس کا تخیل آزاد تھا اور نامعلوم دنیاؤں کا رخ کررہا تھا اور پھر اُس کی تخیلاتی جست نے پینٹنگ کے رنگوں کو گڈمڈ کردیا اور اچانک ہی اس پینٹنگ پر خون کا غلیظ رنگ غالب آگیا۔

اس نے گھبرا کر نظریں ہٹالیں۔ وہ ڈر گئی تھی اور اندیشوں نے اسے ہراساں کردیا۔

عین اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ ڈری ہوئی لیلینا نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے جارج کھڑا تھا۔ وہ بے اختیار اس سے لپٹ گئی۔ "اوہ جارج....."

تم گو جارج جھینپ گیا۔ "ارے کیا ہوا.....؟"

لیلینا ہچکیاں لینے لگی۔ نمکین آنسو اس کی دلکش آنکھوں سے برآمد ہوکر جارج کی قمیص میں جذب ہورہے تھے۔ لندن کے اس متوسط علاقے کے ایک متوسط اپارٹمنٹ میں اعلیٰ معیار کی محبت پنپ رہی تھی۔

"کیا ہوا لیلینا ڈیئر، مجھے کچھ بتاؤ بھی!" جارج اسے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگا۔ سامنے ہی کینوس پر لیلینا کی بنائی ہوئی پینٹنگ تھی جس میں ناسکا اشکال سے مشابہ معلوم ہونے والی لکیروں سے جارج کا عکس جھلک رہا تھا۔

بالآخر لیلینا کے آنسو تھم گئے۔ اب وہ سنبھل چکی تھی۔

"کیا ہوا تھا؟" جارج کے ہاتھ اُس کے شانوں پر تھے۔ چند ساعت وہ اُس شخص کو خاموشی سے تکتی رہی، جس سے وہ محبت کرنے لگی تھی پھر اس کے لب وا ہوئے۔ "میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔" وہ اپنی محبت کا اظہار کرنے والی تھی۔

"ہاں ہاں کہو، میں بھی تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" جارج نے سرشاری کے عالم میں کہا۔

"اوہ.....تم بتاؤ، کیا بات ہے؟" عورت میں موجود فطری شرم نے لیلینا کو اظہارِ محبت سے باز رکھا۔

"نہیں پہلے تم!" جارج نے ضد کی، اس کی آنکھیں روشن تھیں۔

"نہیں جارج، پہلے تم بتاؤ۔" لیلینا کی آواز دھیمی تھی۔

"ایسا ہے تو پھر سنو۔" جارج نے یہ کہا اور دھیرے دھیرے آگے بڑھتے ہوئے لیلینا کی پینٹنگ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ چند ساعت خاموشی چھائی رہی پھر وہ مڑا۔ اس کی آنکھیں فرطِ جذبات سے چمک رہی تھیں۔

"لیلینا ہم دونوں پرسوں پیرو جارہے ہیں۔ یہ رہے ہمارے ٹکٹ!" اس نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ٹکٹ لیلینا کی آنکھوں کے سامنے لہرائے۔

"اوہ!" اچانک لیلینا چپ سی ہوگئی۔ وہ توقع کررہی تھی کہ جارج اُس خاص لمحے میں اپنے جذبات کا اظہار کرے گا لیکن اس کے سر پر تو ناسکا اشکال کا بھوت سوار تھا۔ یوں یہ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا اور جارج سامان پیک کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے رخصت ہوگیا۔

☆☆☆

وہ پیرو کے دارالحکومت لیما کے ائرپورٹ پر اترے تو مرطوب دوپہر اُن کے انتظار میں تھی۔

اس وقت وہ دونوں مغربی جنوبی امریکا کی جس ریاست میں تھے اُس کی سرحدیں کولمبیا، برازیل اور ایکوڈور سے ملتی تھیں۔ یہ خطہ دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں کا مرکز تصور کیا جاتا تھا۔

ائرپورٹ پر ٹام پیٹ اُن کا منتظر تھا جو امریکی سفارت خانے کا اہل کار اور جارج کا خاندانی دوست تھا۔ اس نے اُنہیں خوش آمدید کہا۔ اب وہ ایک کار میں سوار ٹام کے گھر کی جانب محوِ سفر تھے جہاں وہ نوجوان سفارتی اہل کار تنہا رہتا تھا۔

جارج اُسے اپنی آمد کے مقاصد سے آگاہ کرچکا تھا۔ وہ خود بھی ناسکا اشکال میں دلچسپی رکھتا تھا۔ یوں پھر وہی موضوع چھیڑ گیا جو لندن میں گزشتہ چند دنوں سے زیرِ بحث تھا۔

لیلینا کی نظریں کار کی کھڑکی کے باہر پھیلی نئی دنیا پر ٹکی تھیں جہاں تاحال قدیم تصورات کا رنگ موجود تھا۔ تعمیرات، کاروباری مراکز، لباس، الغرض ہر شے اس تعلق کی جانب اشارہ کرتی تھی جو پیرو کے عوام نے اپنے ماضی کے ساتھ قائم کر رکھا تھا۔ پھر وہ ٹام اور جارج کی جانب متوجہ ہوئی، جو ایک خاص جذبے کے تحت محوِ گفتگو تھے۔ پُراسرار اشکال کے تعلق سے پائے جانے والے مفروضوں کا ذکر ان کی گفتگو پر پوری طرح غالب تھا۔ ٹام پیٹ کہہ رہا تھا۔

"برادر، ممتاز امریکی محقق پال کوسوک کی تحقیق بھی اس ضمن میں پیش کردہ قدیم ترین مفروضے کو تقویت پہنچاتی ہے جس کے مطابق یہ اشکال دورِ بعید کے اُن مقامات کی نشان دہی کرتی ہیں جہاں ناسکا باسیوں کے عقائد کے مطابق سورج اور دیگر بہشتی یا مقدس اجسام طلوع و غروب ہوتے ہیں۔ یعنی ناسکا لکیریں مذہبی تناظر میں تشکیل کردہ فلکیاتی نقشہ ہے۔ چند دیگر نامور ماہرین نے بھی اِس نظریے کے حوالے سے ملنے والے شواہد کو مستند اور دلائل کو منطقی اور مضبوط قرار دیا ہے۔"

"میں نے بھی تھوڑی تحقیق کی ہے۔" جارج کہہ رہا تھا۔ "1985ء میں ماہر آثارِ قدیمہ جون رین ہارڈ نے تاریخی جائزوں اور اپنی تحقیق پر مبنی مواد شائع کیا تھا جس میں یہ خیال پیش کیا گیا کہ ناسکا تہذیب میں پہاڑوں اور پانی فراہم کرنے والے دیگر ذرائع کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ وہاں بسنے والوں کی معیشت کا انحصار بھی پانی ہی پر تھا۔ اس محقق کے مطابق یہ اشکال دراصل اُن مذہبی رسومات کی عکاس ہیں جن کا براہِ راست تعلق پانی کی دست یابی، زمین کی زرخیزی اور فصلوں سے ہے۔ ساتھ ہی یہ اُن راستوں کی بھی نشان دہی کرتی ہیں جہاں قدیم دور میں کسی 'برتر قوت' کی پرستش کی جاتی تھی۔ دوسری جانب جانوروں اور انسانوں کی واضح اشکال برتر ہستی سے مدد کے تقاضے کا ایک ثقافتی اظہار ہے۔"

"مذہب انسان کو تحریک دینے والا پُرقوت آلہ ہے۔"

علم جفر

ایک عددی علم، اس میں احوالِ غیب کا علم معلوم کرنے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس علم میں مخفی معانی کی مدد سے واقعات، خصوصاً آنے والے واقعات کی تعبیر یا ان کی اطلاع حاصل کی جاتی ہے۔ اس علم کی بنیاد نیرنجی و مرولوجی یعنی یونانیوں کے قدیم علم الاعداد پر ہے۔ سب سے پہلے عبرانیوں نے اپنی ابجد کے بائیس حروف کو اعداد میں منتقل کرکے ان سے طرح طرح کی تاویلات اخذ کرنے کا طریقہ رائج کیا۔ عربوں نے اس ابجد میں چھ حروف کا اضافہ کیا۔ اس طرح عربی ابجد کے کل اٹھائیس حروف وضع ہوئے جن کے مساوی اعداد مقرر کرکے عربوں نے ان اعداد کی گنتی کو ہزار تک پورا کرلیا۔

ان اٹھائیس حروف ابجد کو چاند کی اٹھائیس منازل پر منطبق کرکے ہر منزل کا ایک الگ حرف مقرر ہوا اور ہر حرف کی ایک خاص تاثیر متعین کی گئی۔

انہی تاثیرات کے علم پر جفر کی مشہور و معروف شاخ علم الآثار کو استوار کیا گیا۔ اور اوفتوش علم الآثار کے اصول و قواعد کے مطابق ہی ترتیب پاتے ہیں۔

اور اس میں وہ وظائف بھی شامل ہیں جو کلام پاک کی آیات سے لے کر علم الآثار کے مطابق مختلف تاثیرات پیدا کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح بعض آیات قرآنی کے حروف کی ابجدی قدریں مجمل کرکے نقوش ترتیب دیے جاتے ہیں اور مختلف مطالب کے حصول اور اخذ کرنے کے کام آتے ہیں۔ انہیں عموماً تعویذات کے نام سے جانا جاتا ہے۔

علم الاخبار علم جفر کی دوسری بڑی اور مشہور شاخ ہے۔ اس علم کے اصول و قواعد کے مطابق حروف سوال سے حروف جواب پیدا کرلیے جاتے ہیں اور اس طرح ماضی، حال اور مستقبل میں ہونے والے واقعات کی خبریں حاصل کی جاتی ہیں۔

علم جفر کے بارے میں جو تحقیق کی گئی ہے، اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس کی ابتدا عبرانیوں سے ہوئی ہے۔ وہی اس علم کے موجد تھے۔ لیکن جس نوعیت میں یہ موجودہ دور میں رائج ہیں، اس کے بانی عرب ہیں اور سیدنا امام جعفر صادقؒ سے منسوب کیا جاتا ہے۔

اقتباس: اسلامی انسائیکلوپیڈیا از قاسم محمود

مرسلہ: آمنہ سلیم، وہاڑی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیلینا نے دل میں سوچا پھر ٹام کے بلند آہنگ نے اس کے خیالات کو اچک لیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”برادر یہ مفروضہ بڑی حد تک قابلِ قبول ہے لیکن تاحال اس علاقے میں موجود چند اشکال کی تشکیل کے مقاصد اسرار کے پردوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ چند افراد تو یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ اشکال انسانی قربانیوں کے لیے مختص تھیں۔“

چند ساعت پُراسرار خاموشی چھائی رہی۔ اس دوران جارج کاغذات پلٹتا رہا، شاید وہ کچھ تلاش کر رہا تھا۔ بالآخر اس کے چہرے پر روشنی پھیل گئی، جیسے اس نے وہ پالیا ہو جسے وہ کھوج رہا تھا۔ اب ایک کاغذ اس کے ہاتھ میں تھا جس پر لکھے الفاظ کو وہ بلند آواز میں پڑھ رہا تھا:

”یہ دیکھو، ایک محقق Henri Stierlin نے 1983ء میں منظرِ عام پر آنے والی اپنی کتاب میں ناسکا اشکال کا تعلق قدیم دور میں تیار ہونے والے دھاگوں سے جوڑا ہے جو Paracas تہذیب کی ممیز یعنی مردہ اجسام کو محفوظ رکھنے یا انہیں لپیٹنے کے لیے استعمال ہوتے تھیں۔ اس کتاب میں یہ خیال بھی پیش کیا گیا کہ یہ لکیریں اس دور میں لوم (کپڑا تیار کرنے والی مشین) کے طور پر استعمال کی جاتی تھی جہاں طویل دھاگے تیار اور علیحدہ کیے جاتے تھے اور یہی اس علاقے کی وجہِ شہرت بھی تھی۔ اس نظریے میں لکیروں میں سے جھلکتے انسانوں اور جانوروں کے عکس کو وہاں کی ثقافت کا حصہ قرار دیا گیا ہے۔“

”چند محققین اس کا جائزہ مختلف انداز میں لیتے ہیں۔“ ٹام نے گفتگو اچک لی۔ ”ایک ماہر جم وڈمین نے یہ خیال پیش کیا تھا کہ ناسکا اشکال اُس دور میں موجود کسی انسان بردار اڑنے والے تختے یا مشین کی نشان دہی کرتی ہیں۔ کیونکہ ان لکیروں سے جھلکتی انسانی وحیوانی اشکال کا مشاہدہ فقط ہوائی جائزے کے ذریعے ہی ممکن ہے اور زمینی جائزے سے ان کا کوئی مطلب سمجھ میں نہیں آتا یعنی یہ اپنی معنویت کھو دیتی ہیں۔ جم کے مطابق ہوا میں اڑنے والا غبارا اُس دور میں دستیاب واحد ٹیکنالوجی ہوسکتی ہے۔ اس نظریے کو دیگر ماہرین کی جانب سے شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ جم کے مخالفین نے یہ موقف اختیار کیا کہ اُس دور میں اس قسم کی کوئی ٹیکنالوجی انسانی دسترس میں نہیں تھی۔ اپنے نظریے کو ثابت کرنے کے لیے جم نے ہوا میں پرواز کرنے والا غبارا بھی تیار کیا اور فقط وہ مواد اور تکنیک استعمال کرنے کا دعویٰ کیا جو اُس کے نزدیک ناسکا کے باسیوں کو دستیاب رہی ہوں گی۔“

”کیا وہ غبارا کبھی فضا میں بلند ہوا؟“ جارج نے دریافت کیا۔

”ہاں بالکل برادر، غبارا تیار ہوا اور اُس نے اڑان بھی بھری، تاہم اس سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ ناسکا تہذیب کے پاس اس قسم کی کوئی ٹیکنالوجی تھی۔“

☆☆☆

طویل سفر نے انہیں تھکا دیا تھا۔ ٹام کے گھر پہنچنے کے بعد ہلکا سا لنچ کر کے لیلینا اور جارج سو گئے۔ شام کے وقت وہ بیدار ہوئے۔ انہیں پیش کی جانے والی پیرو کی مخصوص کافی نے تھکن اتار دی۔ اب وہ ہشاش بشاش تھے اور ڈرائنگ روم میں بیٹھے ٹام کا انتظار کر رہے تھے جس نے انہیں ایک خاص مہمان سے ملانے کا وعدہ کیا تھا۔

کافی کا گھونٹ بھرنے کے بعد لیلینا نے جارج کی جانب دیکھا جو کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ چند ساعت وہ خاموش رہی پھر ہمت مجتمع کی اور خود کو بولنے کے لیے تیار کیا۔ ”جارج!“

”یس ڈیئر۔“ جارج نے چونکتے ہوئے کہا جیسے کسی گہری سوچ سے باہر نکلا ہو۔

”تم نے اِس سفر کے لیے خاصی رقم خرچ کی ہے ناں؟“ لیلینا نے سوال کیا۔

”اوہ نہیں، ایسی بات نہیں۔ بس میں یہاں آنے کا خواہش مند تھا۔ اور.....“ وہ جھجک رہا تھا ”اور میں چاہتا تھا کہ جب میں اس پُراسرار شاہ کار کا مشاہدہ کروں تو تم میرے ساتھ ہو۔ جہاں تک خرچے کا تعلق ہے اُس کی پروا مت کرو۔ ٹام کی موجودگی میں ہمیں خاصا آرام رہے گا۔“

”ہوں۔“ لیلینا نے کچھ سوچتے ہوئے کڑوی کافی کا ایک اور گھونٹ لیا۔ پھر اُس کے لب وا ہوئے۔ ”تو کیا تمہارے بینک بیلنس میں اتنی رقم باقی ہے کہ تم دو انگوٹھیاں خرید سکو!“

”کیا مطلب؟“ جارج چونکا اسی اثنا میں ٹام ایک مقامی شخص کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا جس کی وجہ سے دونوں کے درمیان گفتگو کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

”ہیلو دوستو، اِن سے ملو یہ ہیں مارکیز بوئندا! یہ لیما میوزیم کے اہل کار ہیں اور میرے بڑے اچھے دوست ہیں۔“ ٹام نے بلند آواز میں کہا۔

”ہیلو۔“ لیلینا نے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا، جبکہ جارج تاحال انگوٹھیوں کے معمے میں الجھا تھا۔

”ہیلو مسٹر جارج۔“ مارکیز نے خود ہی ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

”اوہ، ہیلو مارکیز۔“

اب وہ چاروں صوفوں پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد ٹام اور مارکیز کے ہاتھوں میں بھی کافی کے مگ تھے۔

مارکیز ایک ماہر آثاریات تھا اور عالمی ورثہ تصور کی جانے والی ناسکا اشکال میں خصوصی دلچسپی رکھتا تھا۔ ٹام اُسے اسی مقصد کے لیے وہاں لایا تھا کہ وہ اُس کے دوستوں کو مزید معلومات فراہم کر سکے۔

”تو مارکیز یہ بتائیں کہ اب تک ان اشکال کے بارے میں کوئی حتمی رائے کیوں سامنے نہیں آسکی؟“ لیلینا نے سوال کیا۔

”دیکھیں محترمہ۔“ مارکیز نے کافی کا گھونٹ بھرا۔ ”ہر معمے کے ساتھ یہی ہوتا ہے، ورنہ وہ معما ہی کیوں کہلائے۔ خیر، جن افراد نے مفروضے پیش کیے وہ انہیں حتمی جانتے ہیں۔ یعنی اپنے تئیں وہ یہ معما حل کر چکے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ باقی افراد یہ بات تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس لیے تحقیق کا عمل جاری ہے۔“

”اب تو نئے پہلوؤں پر بھی تحقیق ہو رہی ہے۔“ ٹام نے کہا۔

”ہاں بالکل۔“ مارکیز نے آگے جھکتے ہوئے کہا۔ ”دو برطانوی ماہرِ آثاریات اس ”الجھاؤ“ کو سلجھانے میں مصروف ہیں۔ ان میں سے ایک پروفیسر کلوروگلس کا تعلق برطانیہ کی University of Leicester سے ہے، جب کہ دوسرے ڈاکٹر نک سینڈرس Bristol University سے منسلک ہیں۔ توقع کی جارہی ہے کہ ان کی تحقیق اس راز سے پردہ اٹھانے میں مددگار ثابت ہوگی۔ جاری تحقیق میں اس بات کا خاص خیال رکھا جارہا ہے کہ تمام مفروضات کا علمِ بشریات اور علمِ آثاریات کے مروجہ اصولوں کے مطابق ہی جائزہ لیا جائے۔“

”اور ماضی میں جو نظریات پیش کیے گئے ہیں ان کی کیا حیثیت رہ جائے گی؟“ لیلینا نے سوال کیا۔

”دیکھیں، اس تحقیق کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ دورانِ تحقیق ماضی میں پیش کردہ تمام نظریات کو رد اور نظر انداز کر دیا جائے گا۔ ماہرین اس بات سے بڑی حد تک متفق ہیں کہ اس علاقے میں موجود چند لکیریں دراصل راہ گزر ہیں، جب کہ چند کا تشخص مذہبی ہے۔ وہ اس بات سے بھی متفق ہیں کہ چند اشکال کا تعلق کسی نہ کسی صورت فراہمی آب کے کسی نظام سے ہے۔ البتہ ان سے جڑی توہم پرستی اور ماورائے عقل کہانیاں، خصوصاً انسانی قربانی والا مفروضہ کسی صورت قابلِ قبول نہیں، کیونکہ یہاں کی مٹی سے خون یا گوشت سمیت کسی عضو کے اجزاء نہیں ملے۔“

”کیا آپ کی ان برطانوی ماہرین سے ملاقات ہوئی ہے۔“ پہلی بار جارج نے گفتگو میں حصہ لیا۔

”جی ہاں۔ مارکیز نے جواب دیا۔ ”میری ان دونوں صاحبان سے تفصیلی بات ہوئی ہے۔ ڈاکٹر سینڈرس کا کہنا ہے کہ یہ اندازہ لگانا کسی طور آسان نہیں کہ ان اشکال میں کون سی پہلے تشکیل دی گئیں اور انہیں کن مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا رہا۔ اُن کے نزدیک یہ خزانہ، یعنی ناسکا اشکال اگرچہ سونے اور بیش قیمت جواہرات پر مبنی نہیں لیکن وجدان کی ترقی یافتہ شکل ضرور ہیں۔ یہ کسی طور خارج الارض یا مافوق الفطرت نہیں۔ یہ کلی طور پر ایک تہذیبی راز ہے اور اس کا جائزہ اسی پیرائے میں لیا جانا چاہیے۔“

”میں تو اس مقام تک جانے کے لیے بے چین ہوں۔“ لیلینا نے کہا۔

”بالکل!“ ٹام نے اس کی تائید کی۔ ”کل ہم روانہ ہوں گے۔ میرے عزیز دوست مارکیز بوئندا ہمارے ساتھ ہوں گے۔“

انہوں نے ساتھ لنچ کیا۔ مارکیز نے ان سے رخصت چاہی پھر لیلینا گھر سے ملحقہ پارک میں چہل قدمی کرنے چلی گئی۔ اس دوران اس کے اور جارج کے درمیان کوئی مکالمہ نہیں ہوا۔ جب وہ واپس گھر میں داخل ہوئی تو ملازم نے بتایا کہ جارج اور ٹام کسی کام سے قریبی بازار گئے ہیں اور کہہ کر گئے ہیں کہ شاید انہیں لوٹنے میں دیر ہو جائے۔

”ٹھیک ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور اپنے بیگ سے رنگ نکال کر ایک چھوٹے سے کینوس پر بکھیرنے لگی۔

رات گہری ہوتی جارہی تھی۔

☆☆☆

ان کی جیپ دھول اڑاتی ہوئی، ناسکا نامی قصبے کی جانب بڑھ رہی تھی جہاں 80 کلومیٹر کے رقبے پر کچھ ایسا کندہ تھا جو ایک طویل عرصے سے ماہرینِ آثاریات کے لیے چیستان بنی ہوئی ہے۔

لیلینا کی توقعات کے برعکس جارج انتہائی خاموش تھا۔ حالانکہ وہ اس مقام تک پہنچنے ہی والے تھے جس کی پُراسرار کشش انہیں پیرو لائی تھی، تاہم نہ جانے کیوں آج صبح سے جارج زبان پر تالا ڈالے بیٹھا تھا۔

اس نے اگلی سیٹ پر بیٹھے مارکیز سے دریافت کیا۔ ”ہماری منزل کون سی ہے؟“

”ہم ماریا ریچی سینٹر جائیں گے پھر ان عجیب وغریب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اشکال کی جانب پیش قدمی کریں گے۔"

"ماریا رچی سینئر؟" ایلینا کا لہجہ سوالیہ تھا۔ اس نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ جارج بھی دلچسپی لے رہا ہے۔

"جی محترمہ۔" مارکیز مسکرا رہا تھا۔ "ماریا رچی کے بغیر تو ناسکا اشکال ادھوری ہیں۔"

"اوہ، کیا یہ اتنی اہم شخصیت ہیں، مجھے افسوس ہے کہ میں ان کے بارے میں نہیں جانتی۔ کیا آپ مجھے کچھ معلومات فراہم کریں گے۔" ایلینا کی آواز جیپ میں گونجی۔

"کیوں نہیں۔" مارکیز نے مڑ کر اپنا چہرہ اُن کی جانب کر لیا۔ "ابھی سفر باقی ہے، گفتگو میں راستہ کٹ جائے گا۔ دراصل پیرو کی ناسکا اشکال کا ذکر 1903ء میں پیدا ہونے والی جرمن ماہرِ ریاضی ماریا رچی کے بغیر ادھورا معلوم ہوتا ہے، جنہوں نے اپنی زندگی کے پچاس سال اس پُراسرار وادی میں تحقیق کرتے گزارے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اُنہوں نے 1932ء میں عملی زندگی میں قدم رکھا اور شعبۂ تدریس سے وابستہ ہوگئیں۔"

جیپ دھول اڑاتے راستوں پر دوڑتی رہی اور مارکیز کے لب حرکت کرتے رہے "1940ء میں وہ ممتاز امریکی ماہرِ آثاریات پال کوسوک کی نائب بن گئیں۔ واضح رہے کہ ناسکا اشکال کو دنیا کے سامنے لانے کا سہرا پال کوسوک ہی کے سر باندھا جاتا ہے۔ 46ء میں وہ اس علاقے کی نقشہ سازی کے کام میں جٹ گئیں اور بعد کی زندگی اسی کے لیے وقف کر دی۔ ناسکا اشکال کے حوالے سے اُن کے نظریات کو علمی حلقوں میں خصوصی اہمیت دی جاتی ہے۔ اُن کے نظریے کے مطابق ان اشکال کے خالق انہیں بہ طور شمسی کیلنڈر اور بعض اوقات فلکیاتی مشاہدے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ چونکہ ان لکیروں کو فقط فضائی جائزے کے ذریعے دیکھا جاسکتا تھا، اس لیے اُنہوں نے سروے کے دوران پیرو کی ائرفورس سے بھی مدد حاصل کی مگر زندگی کا بڑا حصہ ناسکا میں واقع اپنے گھر میں تنہا گزارہ۔"

"یعنی اُن کی تحقیق کو مستند ترین کہا جاسکتا ہے؟" ٹام نے سوال کیا۔

"جی ہاں!" مارکیز نے کہا۔ "اپنی کتاب The Mystery of the Desert میں اُنہوں نے اپنے نظریات کی وضاحت کی اور کتاب سے حاصل ہونے والی آمدنی اِن آثار کی حفاظت کے لیے چلائی جانے والی مہم کے لیے وقف کر دی۔ یہ علاقہ پین امریکی شاہراہ اور کئی حکومتی اسکیموں کے کافی نزدیک ہے، وہ اپنی زندگی میں اِس ضمن میں کافی فکر مند رہیں۔ آثار کو بڑھتی ہوئی ٹریفک اور آلودگی سے محفوظ رکھنے کے لیے اُنہوں نے حکومت کو راضی کر لیا کہ وہ عام لوگوں اور سیاحوں پر پابندی لگا دیں۔ ایسے قوانین بنا دیں کہ وہ علاقے میں داخل نہ ہوسکیں۔ اِس حوالے سے علاقے کے قریب ایک ٹاور تعمیر کیا گیا، جہاں سے لوگ اس شاہ کار کا مشاہدہ کر سکتے تھے۔"

"تو کیا ہم بھی اسی ٹاور سے اس معمے کا مشاہدہ کریں گے؟" ایلینا نے سوال کیا۔

"جی ہاں۔" مارکیز نے پانی کی بوتل سے ایک گھونٹ اپنے حلق میں اتارا اور ماریا رچی کے بارے میں گفتگو جاری رکھی۔ "اس باہمت خاتون ہی کی کوششوں کے باعث 95ء میں یونیسکو نے ناسکا اشکال کو عالمی ورثہ قرار دیا۔ اس لیے اہلِ پیرو ان کے احساس مند ہیں۔ اُنہیں ناسکا اشکال کے مضمون پر مکمل عبور حاصل تھا۔ وہ تمام اشکال کو پہچانتی تھیں اور اُن میں تفریق کر سکتی تھیں۔"

"یہ صلاحیت تو کمیاب ہوگی؟" جارج پہلی بار گفتگو کا حصہ بنا۔

"کمیاب نہیں جناب، یہ نایاب ہے۔ میں بھی زمین سے ان کا جائزہ لیتے ہوئے ان میں تفریق نہیں کر سکتا۔ وہ اس معاملے میں یکتا تھیں۔" مارکیز کی آنکھوں میں احترام تھا۔ "زندگی کے آخری حصے میں وہ مختلف امراض میں مبتلا رہیں۔ اُن کی موت کینسر کے سبب ہوئی۔ انہیں حکومتی اعزاز کے ساتھ علاقے کے قریب ہی دفنایا گیا۔ اس علاقے میں ماریا کے نام پر ایک ریسرچ سینٹر بھی قائم کیا گیا جہاں سے اُن کی زندگی اور علمی خدمات کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ ساتھ ہی وہاں ناسکا اشکال کے بارے میں کی جانے والی قدیم اور جدید تحقیقات کے حوالے سے وافر مقدار میں مواد موجود ہے۔"

"اس عظیم خاتون نے ایک کارنامہ انجام دیا۔" جارج نے احتراماً سر جھکا لیا۔ باقی افراد نے بھی اس باہمت عورت کے لیے اپنے دل میں محبت محسوس کی۔

"اب ہم منزل کے قریب ہیں۔" مارکیز نے انہیں مطلع کیا۔

انہیں دور سے وہ ٹاور نظر آرہا تھا جہاں سے ان اشکال کا مشاہدہ کیا جاسکتا تھا۔ یہ بھی ماریا رچی ہی کا کارنامہ تھا۔ نزدیک ہی ماریا رچی سینئر تھا۔

تھکا دینے والا سفر تمام ہوا۔ وہ جیپ سے اتر کر سینٹر میں داخل ہوئے جہاں کا موسم باہر کی نسبت خاصا خوش گوار تھا۔

خوبصورتی خوبصورت جلد سے جبکہ خوبصورت جلد سکن ٹونر سے وہ بھی چند سیکنڈز میں

جلد کی خوبصورتی کیلئے سب سے بہتر سکن ٹونر — آج آزمائیں فائدہ نہ ہو تو قیمت واپس

یوں تو اپنے آپ کو خوبصورت بنانے کیلئے انسان صدیوں سے مختلف جتن کرتا چلا آرہا ہے۔ خاص طور پر چہرہ تو ہر کوئی خوبصورت چاہتا ہے اس سلسلے میں بعض چہرے کی کچھ مخصوص ورزشیں کر کے چہرے کے عضلات کو مضبوط بناتے ہیں تاکہ وہ چاک چوبند اور جوان نظر آئیں۔ خاص طور پر مرد۔ جبکہ بعض چہرے پر کچھ لگا کر جلد کو گورا، نرم، ملائم اور چمکدار بناتے ہیں کہ وہ خوبصورت نظر آئیں خاص طور پر خواتین۔ ہم نے بھی اپنی تحقیقات کو اس مقصد کے حصول پر مرکوز کیا۔ یعنی جلد کی خوبصورتی کیلئے کہ جلد گوری نرم ملائم اور چمکدار ہو۔ طویل تحقیق کے بعد ہم ان نتائج کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ جو کہ لگتے ہی دو چار سیکنڈ میں اپنا اثر دکھاتا ہے۔ یعنی جلد نرم ملائم گوری اور چمکدار ہو جاتی ہے۔ دانے اور خارش ختم ہو جاتی ہے۔ ایسا ہماری دن رات تھکا دینے والی طویل تحقیق اور محنت سے ہی ممکن ہوسکا۔ رنگ گورا کرنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ کسی بھی بلیچ کریم سے آسانی سے رنگ گورا ہو جاتا ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ رنگ بھی گورا ہو۔ اور مضر اثرات بھی نہ ہو۔ اگر استعمال چھوڑ دیا جائے تو چہرہ بھی خراب نہ ہو اثر بھی دیرپا ہو اس وقت مارکیٹ میں مختلف ناموں سے مہنگی سستی کریمیں دستیاب ہیں جن کے اثرات سے آپ بخوبی واقف ہیں کہ استعمال کرتے رہیں تو ٹھیک چھوڑ دیں تو چہرہ ایک دم خراب لہٰذا ہم نے اپنی تحقیق میں سب سے زیادہ توجہ اس پر دی کے روزانہ کا استعمال بھی نہ ہو استعمال چھوڑ دیں تو چہرہ خراب بھی نہ ہو اثر دیر تک رہے سو ہم اس میں کامیاب ہوئے سکن ٹونر استعمال کرنے سے جلد 5 سیکنڈ میں ہی نرم ملائم گوری اور چمکدار ایک دفعہ استعمال کا اثر مہینوں تک اپنی ہی جلد پر ہاتھ پھیر کر یاد دلائے سکن ٹونر ہماری اب تک کی ایجادات میں ایک بڑی ہی اہم ایجاد ثابت ہوئی جس کا طریقہ استعمال بھی نہایت آسان اور فوری موثر ہے حتیٰ کہ لگائیں اور فوراً دھو دیں تو بھی اپنا اثر دکھاتا ہے کہ دیکھنے والے بھی کہیں اور خود کو بھی محسوس ہو

سکن ٹونر کے استعمال فوائد:

تھوڑا سا سکن ٹونر دونوں ہاتھوں پر مل کر چہرے پر لگائیں 5 سیکنڈ بعد بغیر صابن تازہ پانی سے اتنا مل مل کر دھوئیں کہ چکناہٹ باقی نہ رہے اور اب چہرہ خشک ہونے پر ہاتھ پھیر کر دیکھیں خود ہی پر پیار آجائے گا اور آئینہ دیکھیں تو حیرانگی ہوگی کہ سیکنڈ میں ہی اتنا اثر اور اب یہ اثر کم از کم ایک مہینے تک رہے گا لہٰذا سکن ٹونر کا ایک بار کا استعمال ایک مہینے کیلئے کافی ہے پھر بھی زیادہ سے زیادہ ایک مہینے میں دوبارہ استعمال کر سکتے ہیں اسی طرح چہرہ، ہاتھ، پاؤں اور گردن پر بھی سکن ٹونر لگائیں اور 5 سیکنڈ بعد بغیر صابن تازہ پانی سے اتنا مل مل کر دھوئیں کہ چکناہٹ باقی نہ رہے تو ہاتھ، پاؤں بھی نرم ملائم گورے اور چمکدار ہو جائیں گے پھٹی ایڑیاں ٹھیک ہو جائے گی اور یہ اثر ایک ماہ تک رہے گا پھر سکن ٹونر ایک ماہ میں دوبارہ استعمال ہوسکتا ہے اور اگر پورے جسم کو نرم و ملائم اور چمکدار بنانا ہو تو پورے جسم پر سکن ٹونر لگا کر 5 سیکنڈ بعد بغیر صابن تازہ پانی سے اتنا مل مل کر دھوئیں کہ چکناہٹ باقی نہ رہے آپ حیران ہوں گے کہ اپنے ہی جسم پر ہاتھ پھیر کر یاد دلا کر خود ہی پیار آجائے گا کہ جسم نرم و ملائم گورا اور چمکدار ہو جائے گا دانے اور خارش ختم ہوگی سکن ٹونر پورے جسم پر ہر مہینے ضرور لگائیں حسب ضرورت مہینے میں دوبار بھی استعمال کر سکتے ہیں

تیار کردہ: اے۔کے۔کاسکو پانڈ، مینگورہ (سوات)

042-37666818
0300-9486848

نوٹ: سکن ٹونر حقوق (پیکنگ، ڈیزائن، بروشر، مونوگرام، کیلی گرافی، ٹریڈ مارک وغیرہ بحق رفیق شاکر محفوظ ہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہاں ان کی وکٹوریا نلکنزی سے ملاقات ہوئی۔

مارکیز نے ان کا تعارف کروانے کے بعد بتایا کہ وکٹوریا نلکنزی ناسکا اشکال کے تحفظ کے لیے کام کرنے والے اس ادارے سے تعلق رکھتی ہیں اور آج کل خاصی مصروف ہیں۔

''آپ نے ٹھیک کہا محترم مارکیز!'' وکٹوریا نے انگریزی میں کہا۔ ''آج کل ہم خاصے پریشان ہیں۔ درختوں کی کٹائی کی وجہ سے جنم لینے والی آلودگی اور بردگی، یعنی ارضیاتی کٹاؤ کے عمل سے ان اشکال کو شدید خطرات لاحق ہیں۔''

اس اثنا میں مشروبات ان کے سامنے رکھے جا چکے تھے۔

''ہمیں مزید کچھ بتائیں۔'' لیلینا نے ٹھنڈے مشروب کا گھونٹ لیا۔

''یہ لکیریں زیادہ گہری نہیں۔ ان کی گہرائی فقط دس سے تیس سینٹی میٹر ہے، جو بہ آسانی ماحولیاتی خطرات کے باعث ختم ہوسکتی ہیں۔ اگرچہ گزشتہ کئی صدیوں سے اس علاقے میں زیادہ بارش نہیں ہوئی، لیکن عالمی موسم میں آنے والی خوف ناک تبدیلیوں کے باعث خدشہ ہے کہ مستقبل میں یہ علاقہ بھی بھاری برسات کی زد میں آسکتا ہے۔ بدقسمتی سے یہ ورثہ طوفانی بارشوں کو سہنے کے قابل نہیں۔''

''جی ہاں!'' مارکیز نے بات آگے بڑھائی۔ ''پیرو کے 'نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف کلچر ان ناسکا' سے تعلق رکھنے والے Mario Olaechea اور اُن کی ٹیم نے فروری 2007ء میں آنے والے سیلاب کے بعد اس علاقے کا دورہ کیا تھا اور باریک بینی سے جائزہ لینے کے بعد انہوں نے یہ اعلان کیا تھا کہ تیز بارش سے بہ ظاہر ان اشکال کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا ہے، البتہ اس کے بے حد قریب سے گزرنے والی 'پین امریکی شاہراہ' ضرور متاثر ہوئی ہے۔ ماہرین کے مطابق سڑک کو پہنچنے والا نقصان ہمیں ان اشکال کی حفاظت کے حوالے سے متنبہ کرتا ہے۔ اقوامِ متحدہ کے ذیلی ادارے یونیسکو نے طوفانی بارشوں کے بعد اس قدیم ورثے کی حفاظت کی غرض سے پچاس ہزار ڈالر کی امداد دی تھی جس کا بنیادی مقصد ان آثار کی حفاظت کے لیے طویل المدتی منصوبے تشکیل دینا ہے۔''

''کیوں نہ ہم ٹاور کا رخ کریں؟'' جارج جو بہت خاموشی سے ان کی گفتگو سن رہا تھا، اچانک بول پڑا۔

''اوہ کیوں نہیں۔'' وکٹوریا مسکرائی۔ ''بالکل، میں سمجھ سکتی ہوں۔ پُراسرار اشکال کے بارے میں آپ بہت پُرتجسس ہیں۔''

وہ سب سینٹر سے باہر نکلے جہاں مرطوب دوپہر ان کی منتظر تھی اور ٹاور کی جانب بڑھنے لگے۔ اس دوران ماحول پر قدیم خاموشی طاری تھی جسے بالآخر لیلینا نے توڑا۔ ''اس سفر کے دوران ان اشکال کے بارے میں ہم کافی معلومات اکٹھی کر چکے ہیں جو اس اسرار کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوں گی۔''

''یہ اچھی بات ہے کہ آپ لوگوں کے پاس معلومات ہے۔ خیر، اس بارے میں چند مافوق الفطرت قصے بھی مشہور ہیں۔ چند افراد نے دعویٰ کیا ہے کہ انہوں نے یہاں قدیم زمانے کی ارواح سے ملاقات کی۔'' وکٹوریا نے ٹاور کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

''بھئی، پُراسراریت تو ہمیشہ ہی مافوق الفطرت واقعات کو جنم دیتی ہے۔'' مارکیز مسکرایا۔

''جی ہاں، اڑن طشتریوں اور خلائی مخلوق کا ذکر بھی خوب آتا ہے۔'' لیلینا نے کہا۔ اب وہ ٹاور میں داخل ہو رہے تھے۔

''آپ لوگوں نے ڈاکٹر انتھونی ایونی کا تجزیہ بھی سنا ہوگا؟'' وکٹوریا نے سوال کیا۔

''نہیں۔'' لیلینا نے کہا۔ ''گو کہ ہمارے پاس خاصی معلومات ہے، لیکن مکمل معلومات نہیں۔ کیا تم نے ان کے بارے میں سنا ہے جارج؟''

''اوہ نہیں۔'' جارج چونکا۔

''کہاں کھوئے ہوئے ہو دوست؟'' ٹام نے اسے ٹہوکا دیا۔

''کچھ نہیں، بس..... آپ ڈاکٹر انتھونی کے بارے میں بتا رہی تھیں۔'' جارج کھسیا گیا۔

''جی ہاں۔'' وکٹوریا نے کہا۔ ''ڈاکٹر انتھونی علم فلکیات اور علم بشریات کے استاد ہیں۔ وہ 1963ء سے نیویارک کی مشہور نجی درس گاہ کولگیٹ یونیورسٹی سے منسلک ہیں۔ انہیں قدیم میکسیکو کی مایا تہذیب کی فلکیاتی تاریخ پر تحقیق کے حوالے سے شہرت حاصل ہے۔''

اب وہ ٹاور کی اوپری منزل تک رسائی کے لیے سیڑھیاں طے کر رہے تھے۔ قدمچے پھلانگنے کے دوران وکٹوریا کی آواز اُن کی معلومات میں اضافہ کرتی رہی۔ ''وہ فلکیاتی موضوعات پر دو درجن سے زائد کتابیں لکھ چکے ہیں۔ آرکیالوجی انسٹی ٹیوٹ آف امریکا سے شائع ہونے والے رسالے 'آرکیالوجی' کے 2000ء کے ایک شمارے میں ڈاکٹر انتھونی کا ایک مضمون شائع ہوا تھا، جس میں انہوں ناسکا اشکال کے موضوع پر طویل بحث کی۔''

''وہ بحث ضرور دلچسپ رہی ہوگی۔'' لیلینا نے کہا، اور کن

انکھیوں سے جارج کی جانب دیکھا، جو نہ جانے کن سوچوں میں گم تھا۔

''جی ہاں۔'' وکٹوریا نے کہا۔ ''اپنے مضمون میں انہوں نے سوال اٹھایا کہ کیا یہ جانور کی اشکال قدیم دیوتاؤں کی جانب اشارہ کرتی ہیں، یا یہ فقط تاروں کے جھرمٹ کا عکس ہے؟ کہیں یہ لکیریں ستاروں کے راستوں کی نشان دہی تو نہیں کرتیں؟ اور کیا یہ ایک بڑا نقشہ نہیں ہوسکتا؟''

''دلچسپ!'' ٹام نے کہا۔

وکٹوریا کہتی رہی۔ ''اُن کے نزدیک اہم سوال یہ ہے کہ دو ہزار سال قبل، اس خطے میں بسنے والے جدید ٹیکنالوجی سے محروم باسیوں نے آخر یہ اشکال کس طرح تشکیل دیں؟ کیا انہیں اڑن کھٹولے کی سہولت میسر تھی؟ یہ بات ہضم نہیں ہوتی، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اِن اشکال کی معنویت فقط فضا سے دیکھنے ہی پر سامنے آتی ہے اور زمین پر چہل قدمی کرتے ہوئے یہ لایعنی ہوجاتی ہیں؟ وہ اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہاں پانی کے بہاؤ، فلکیات، صفائی ستھرائی اور عبادت جیسی پیچیدہ انسانی سرگرمیوں کے نشانات ہیں۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ چند اشکال ایک قسم کی راہگزر ہیں جو مذہبی حیثیت کی بھی حامل ہیں۔''

''اِن کے خیالات خاصے پیچیدہ معلوم ہوتے ہیں۔'' لیلینا نے کہا۔

''دراصل.....'' مارکیز نے اب معلومات فراہم کرنے کی ذمے داری سنبھال لی۔ ''اُن کے مطابق لکیروں کی ترتیب انہیں بنانے والے انسانوں اور فلک شناسی کے علم کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ اِن کا تعلق سورج کے طلوع اور غروب ہونے اور وادی میں پانی کی آمد سے رہا ہوگا۔ ان کے نزدیک ہمارے لیے فقط وہی نظریہ قابلِ قبول ہے جس کا جائزہ ہم شمالی امریکا کے پہاڑی سلسلے کوہ اینڈیز کے بارے میں موجود عمومی اور ناسکا تہذیب کے بارے میں موجود خصوصی معلومات کی روشنی میں لے سکیں۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہم ناسکا اشکال کو مزید مافوق الفطرت (سُپر نیچرل) انسانوں کی مصنوعات کے طور پر نہیں دیکھ سکتے کیونکہ شواہد بتاتے ہیں کہ اُن کے پاس جدید ریاضی اور علم ہندسہ کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھی۔ انہوں نے برتن سازی اور دھات سازی کے لیے بھی زیادہ جدید اور پیچیدہ تکنیک استعمال نہیں کیں۔ وہ اپنے تجربے کی بنیاد پر کہتے ہیں کہ ناسکا اشکال کو سمجھنے کے لیے ہمیں اپنے بحث و مباحثے کی 'ہاتھ باندھ دینے والی محدود تکنیک' سے راہِ فرار اختیار کرنی ہوگی۔''

''دراصل اُن کا کہنا ہے کہ.....'' وکٹوریا کہہ رہی تھی۔ ''صحرا کے سینے پر کندہ ان لکیروں کا گورکھ دھندا نہ تو پریشان کن ہے اور نہ ہی بدنظم! ان میں ترتیب پائی جاتی ہے، جو قابلِ توجہ اور قابلِ غور ہے۔ یہ ترتیب ہمیں اُن افراد کے بارے میں بتاتی ہے، جو کبھی یہاں بستے تھے۔''

''خوب، اُنہوں نے اس موضوع پر بہت سنجیدگی سے تحقیق کی ہے۔'' ٹام نے کہا۔

اب وہ ٹاور کے اوپری حصے تک پہنچ چکے تھے۔ تھکن بہت تھی لیکن تجسس ہر کیفیت پر طاری تھا۔ اُنہوں نے فوراً دیوار میں بنی جہازی سائز کی کھڑکی میں نظریں لگا دیں جہاں سے اِس پریشان کن علاقے کا نسبتاً کم اونچا منظر اُن کے سامنے تھا جو انتہائی پُراثر تھا، توقع سے کئی گنا زیادہ!

یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اُن کے سامنے سناٹے میں ڈوبا ایک پُراسرار صحرا پھیلا ہو جہاں نشیب و فراز خاموشی سے ساتھ ساتھ چلتے ہوں اور انہیں اپنی جانب بلاتے ہوں۔

انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ عجوبہ صحرا کے سینے پر انتہائی چیستانی لکیریں کندہ ہیں جن سے مختلف اشکال جھلکتی ہیں اور یہ اشکال انسانی ذہن میں سوالات جنم دینے کی قوت سے مالا مال ہیں۔ وہ اتنی پُراثر ہیں کہ انسان ششدر رہ جائے۔

لیلینا مبہوت سی کھڑکی سے باہر کی عجوبہ دنیا کو تک رہی تھی۔ وہ منظر نظریات بدل دینے والا تھا، جو کچھ اس کے سامنے تھا، وہ ان تصاویر سے زیادہ پُراثر تھا، جو اس نے انٹرنیٹ پر یا سیمینار میں دیکھی تھیں۔

''حیران کن!'' اس کے منہ سے نکلا۔

''ہاں، یہ پُراسرار ہونے کے باوجود انتہائی خوب صورت منظر ہے۔'' مارکیز نے کہا۔

''یہ اسرار ہمارا تاریخی ورثہ ہے۔'' وکٹوریا کے لہجے میں فخر تھا۔ ''یہ ماریا ریچی مرحوم کی کوششوں کا ثمر ہے کہ آج ہم یہاں موجود ہیں۔''

''بے شک!'' ٹام نے کہا۔ گو کہ وہ پہلے بھی اس پُراسرار مقام تک کا سفر طے کر چکا تھا لیکن تجسس نے اسے بھی اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ اس کی نظریں کھڑکی کے باہر پھیلے صحرا پر ٹکی تھیں جہاں اونچے نیچے چھوٹے چھوٹے ٹیلے تھے جن کے درمیان کرشماتی لکیریں کندہ تھیں جو معما معلوم ہونے والی اشکال کو جنم دے رہی تھیں۔

''وہ..... وہ کون ہے؟'' جارج کی تحیر زدہ آواز نے اُنہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چونکا دیا۔

باقی افراد نے حیران ہو کر جارج کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں حیرت اور خوف تھا اور وہ دور کسی جانب اشارہ کر رہا تھا۔ سب نے اُس کی انگلی کا تعاقب کیا اور اُن کی نظریں صحرا کے آخری حصے کی جانب دوڑ گئیں، جہاں ویرانی اُن کا منہ چڑا رہی تھی۔

''کیا ہوا دوست؟'' ٹام نے سوال کیا۔

''وہ..... وہاں..... کوئی ہے۔'' جارج کے لہجے میں خوف تھا۔

وکٹوریا ذرا آگے بڑھی اور کھڑکی کے قریب ہو گئی۔

''جارج صاحب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، وہاں کوئی نہیں ہے۔'' اُس کی آواز میں ٹھہراؤ تھا۔

''لیکن میں نے..... میں نے وہاں کسی کو دیکھا تھا۔'' جارج تھکا تھکا لگ رہا تھا۔

''وہاں کوئی نہیں ہے برادر، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔'' یہ مارکیز کے الفاظ تھے۔

سب خاموش ہو گئے کیونکہ جارج تاحال سکتے میں تھا۔ ایسے میں ایلینا آگے بڑھی اور جارج کا بازو تھام لیا۔

''وہ ماریا رپکی کی روح تھی جارج!'' اس نے دھیرے سے کہا۔ ''اور وہ خوش تھیں کہ ہم ان کی کاوش کو سراہنے کے لیے یہاں موجود ہیں!''

باقی افراد خاموش رہے۔ انہوں نے اپنے دل میں اس عظیم عورت کے لیے احترام محسوس کیا۔

وہ وہاں کھڑے رہے، تاایں کہ سورج غروب نہیں ہو گیا۔

☆☆☆

جیپ شہر کی جانب دوڑ رہی تھی۔ صحرائے ناسکا اُن سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ روشنی تیزی سے اندھیرے میں گم ہو رہی تھی اور وہ ناسکا لکیروں سے بچھڑتے جا رہے تھے۔

ایلینا اور جارج کی خواہش تھی کہ وہ زمین پر اتر کر ان لکیروں کا قریب سے جائزہ لیں لیکن وکٹوریا نے اس کی اجازت نہیں دی کیونکہ حکومتی احکامات کے مطابق سیاحوں کو ایک حد سے زیادہ آگے جانے کی ممانعت تھی اسی لیے وکٹوریا نے انہیں باز رکھا۔ انہوں نے اپنے مقصد کے لیے جدوجہد کرنے والی خاتون کی بات کا احترام کیا۔ البتہ انہوں نے چند تصویریں اتارنے کی اجازت طلب کر لی۔

جارج اس دوران بھی خاموش رہا۔ اس نے حکومت کی طے کردہ حد کے آخری سرے تک جانے کی کوشش کی۔

یوں اُس نے اُن پُراسرار لکیروں کو قریب سے دیکھا۔ ایلینا بھی اُس کے ساتھ تھی اور اُس نے اپنے ساتھی کا بازو تھام رکھا تھا۔

جب جارج کی نظریں ان لکیروں پر تھیں، وہ بڑبڑایا۔ ''یہ تو انسانی ہاتھوں کی لکیروں سے مماثل ہیں اور کسی دست شناس کی منتظر ہیں۔''

جواب میں ایلینا مسکرا دی۔ انہوں نے وکٹوریا سے رخصت لی اور واپسی کے لیے جیپ میں سوار ہو گئے جو ہر گزرتے لمحے پُراسرار اشکال سے دور ہوتی جا رہی تھی۔

پھر وہ ایک پیٹرول پمپ پر رکے۔ اندھیرا روشنی پر غالب آ گیا تھا۔

اس دوران ٹام قریب کے ریسٹورنٹ سے کافی لینے چلا گیا۔ مارکیز بھی سفر کی تھکن سے نجات حاصل کرنے کے لیے جیپ سے اتر کر انگڑائی لینے لگا۔ ایلینا بھی اتر گئی، لیکن جارج نے نیچے اترنے کے بجائے اُس تاریک وقت کو ڈائری کے ورق سیاہ کرنے میں صَرف کرنے کا فیصلہ کیا۔

ٹام ابھی نہیں لوٹا تھا۔ ایلینا چہل قدمی کرتے ہوئے جیپ سے کچھ دور نکل گئی۔

اُس کی نظریں پیٹرول پمپ کے پیچھے پھیلے وسیع و عریض میدان پر ٹکی تھیں جہاں چند جھونپڑی تھیں جن سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ وہ غالباً خانہ بدوشوں کی بستی تھی جو طاقتور اسٹریٹ لائٹس سے جنم لینے والی روشنی کے باوجود تاریکی کی لپیٹ میں تھی۔ ایلینا کے قدم اس جانب بڑھنے لگے۔

قریب جانے پر اسے احساس ہوا کہ وہاں چند ہی جھونپڑیاں ہیں جن میں قدیم علاقائی لباس میں ملبوس خواتین اور بچے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ بستی میں اُسے کوئی مرد دکھائی نہیں دیا۔

ایک جھونپڑی کے باہر ایک مقامی ضعیف عورت چھوٹے سے اسٹال پر مٹی کے خوب صورت شوپیس فروخت کر رہی تھی۔ ایلینا اُس کے قریب گئی۔ گو کہ وہ اس کی زبان نہیں جانتی تھی لیکن محبت نامی آفاقی زبان سے واقف تھی۔ اُس نے سر کے اشارے سے ہیلو کہا۔

''ہیلو یو امریکن!'' اُس مقامی عورت نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا تو ایلینا حیران رہ گئی۔

''نو برنش!'' اس نے جواب دیا۔

''ویلکم، ویلکم!''

اب وہ حیرت اور مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اسٹال پر موجود شوپیس کو تک رہی تھی اور پھر اسے ایک جھٹکا لگا۔

وہ شوپیس درحقیقت مٹی کی خوب صورت پلیٹیں تھیں، جن پر سادہ لکیریں کندہ تھیں جو دراصل ناسکا اشکال کی نقل تھیں۔

اندھیرے کے باعث دُور سے جنہیں وہ برتن سمجھ رہی تھی وہ درحقیقت سادہ رنگین پلیٹیں تھیں جن پر ناسکا اشکال نامی عجوبے کا عکس تھا۔ اُس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

اس نے انگریزی میں قیمت دریافت کی لیکن مقامی عورت جواب دینے کے بجائے نہ جانے کیوں اُسے تکتی رہی۔ اس نے پھر قیمت دریافت کی، لیکن پُراسرار خاموشی قائم رہی۔

ایلینا نے واپس جانے کا فیصلہ کیا لیکن جونہی وہ پلٹی مقامی عورت کے لب وا ہوئے۔ ''فری فار یو!''

''واٹ، مگر کیوں؟'' ایلینا کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

مقامی عورت پُراسرار انداز میں مسکرائی۔ اس کے دانتوں پر پینسل کے خول چڑھے تھے۔ پھر اُس کے لب وا ہوئے۔

''فری فار لو!''

''لو؟'' ایلینا بڑبڑائی۔ اسی اثنا میں بوڑھی عورت ایک پلیٹ اس کے ہاتھ میں تھما چکی تھی جس پر بندر سے مشابہ شکل کندہ تھی۔

ایلینا میں اشتیاق پیدا ہوا۔ اُس نے بوڑھی عورت سے سوال کیا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''موت کا دیوتا!'' بوڑھی عورت نے مختصر سا جواب دیا اور یک دم انتہائی سنجیدہ دکھائی دینے لگی۔

ایلینا کے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ وہ مزید کچھ پوچھنا چاہتی تھی کہ اُسے تیز ہارن کی آواز سنائی دی۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ مارکیز جیپ کا ہارن بجا کر اسے متوجہ کر رہا تھا۔ اس نے گردن موڑ کر اس عورت کی جانب دیکھا جو اَب انتہائی لاتعلقی سے ایک بوسیدہ تھیلے میں کچھ کھنگال رہی تھی۔

وہ دھیرے دھیرے پیچھے ہٹتی گئی۔ مٹی کی پلیٹ اس کے ہاتھ میں تھی۔ بالآخر وہ جیپ میں جا بیٹھی۔ اس دوران اس کی نظریں بوڑھی عورت پر ٹکی رہیں۔

''محترمہ کیا خریدا آپ نے؟'' مارکیز نے سوال کیا تو اس نے پلیٹ اُس کی جانب بڑھا دی۔

''خوب!'' مارکیز نے پلیٹ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ جارج بھی دلچسپی لے رہا تھا۔ ایلینا نے ایک نظر بستی کی طرف دیکھا جو انتہائی خاموش اور تاریک معلوم ہوتی تھی۔ جیپ دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگی۔

''محترمہ!'' جیپ میں مارکیز کی آواز گونج رہی تھی۔ ''آپ نے موت کے دیوتا کا کیوں انتخاب کیا؟''

''موت کا دیوتا؟'' ایلینا کے چہرے پر اندیشوں اور تحیر کا سایہ تھا۔

''جی ہاں! یہ قدیم باشندے بندر کے اس عکس کو موت کا دیوتا خیال کرتے ہیں۔ یہ ناسکا اشکال میں سے ایک ہے۔''

''اوہ!'' ایلینا کے منہ سے اتنا ہی نکل سکا۔

''میں تو ان لکیروں کا بہ ذریعہ ہوائی جہاز جائزہ لینا چاہوں گا۔'' جارج نے کہا۔ اب پلیٹ اس کے ہاتھ میں تھی۔

''اوپر سے دیکھتے ہیں کہ موت کا دیوتا کیسا دکھتا ہے!''

''کیوں نہیں۔'' ٹام نے کہا۔ ''میں نے ائرفورس کے انچارج سے بات کی ہے۔ ''کل ہم یہ مرحلہ بھی طے کر لیں گے۔ مجھے کچھ کام ہے، شاید میں تمہارے ساتھ نہ ہوں!''

☆☆☆

شہر پہنچنے کے بعد اچانک یاسیت نے ایلینا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اُسے ہلکا سا بخار محسوس ہوا۔ ٹام نے فوراً ڈاکٹر سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا تاہم ایلینا نے اس کیفیت کو سفر کی تھکن قرار دیتے ہوئے ڈاکٹر کو بلوانے سے منع کر دیا اور ڈنر کرنے کے بجائے بیڈروم میں گھس گئی۔

شاور لینے کے بعد حیرت انگیز طور پر تھکن مزید بڑھ گئی۔ وہ بستر پر لیٹ گئی، ملازمہ اُس کے لیے جوس اور سینڈوچ لے آئی جنہیں اُس سے نے بہ مشکل حلق سے اتارا۔

سائیڈ ٹیبل پر وہ پُراسرار پلیٹ پڑی تھی۔ اُس نے ہاتھ میں لے کر اُسے غور سے دیکھا۔ نہ جانے کیوں اسے لگا کہ پلیٹ پر کندہ شکل اس کی کسی پینٹنگ کا موضوع ہو۔ وہ بہت دیر تک لکیروں کے زاویوں پر غور کرتی رہی، پھر تھک کر سو گئی۔

کچھ دیر بعد جارج خاموشی سے کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کی مٹھی میں کچھ تھا۔ وہ چند ساعت تک یونہی کھڑا رہا پھر فیصلہ کیا کہ ایلینا کو آرام کرنے دے۔ اس نے سائیڈ ٹیبل پر دھری پُراسرار پلیٹ کے اوپر ہاتھ رکھ کر مٹھی کھول دی اور باہر نکل گیا۔ اب موت کے دیوتا پر دو خوش نما انگوٹھیاں چمک رہی تھیں۔ ساتھ میں ایک ورق بھی تھا جس پر جارج نے اپنے جذبات رقم کیے تھے۔

یہ اُس کی آخری تحریر ثابت ہوئی۔

☆☆☆

''صحرائے ناسکا میں ایک ہیلی کاپٹر گر کر تباہ، پائلٹ اور ایک غیر ملکی ہلاک!''

یہ مختصر سی خبر اپنے اندر کس قدر المیے سموئے تھی اس کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جو المیوں کا کرب سہہ چکا ہو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ٹام کے چہرے پر وحشت کے گہرے سائے تھے۔ مارکیز خاموش بیٹھا تھا اور ایلینا، وہ خود اپنی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھی۔

ذرائع ابلاغ کے نمائندے امریکی سفارت خانے سے بنیادی معلومات اکٹھی کر چکے تھے، جنہیں سامنے رکھتے ہوئے انھوں نے خبر تیار کی:

''ہلاک ہونے والے غیر ملکی کا نام جارج گیری ہے۔ لندن سے تعلق رکھنے والا یہ نوجوان اکنامکس کا طالب علم تھا اور ناسکا لکیروں میں خصوصی دلچسپی رکھتا تھا۔ وہ دو روز قبل پیرو آیا تھا اور امریکی سفارت کار کے گھر ٹھہرا ہوا تھا۔''

سنسنی پھیلانے والے ایک نیوز چینل نے خبر بریک کی۔ ''جارج ناسکا اشکال کے فضائی جائزے کے ارادے سے ہیلی کاپٹر میں سوار ہوا تھا۔ ماہرین کے مطابق ہیلی کاپٹر کی تکنیکی خرابی اس افسوس ناک حادثے کا سبب بنی، ایندھن کا ٹینک پھٹنے کی وجہ سے ہیلی کاپٹر زمین پر گرنے کے فوراً بعد تباہ ہو گیا۔ چند مقامی افراد کے مطابق حادثے کے وقت ہیلی کاپٹر ایسی اشکال کے اوپر محوِ پرواز تھا جو موت کی علامات تصور کی جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں ہم نے پُراسرار علوم میں دلچسپی رکھنے والے ایک ماہر سے بھی بات کی ہے جن کے مطابق ماضی میں بھی اس قسم کے واقعات پیش آ چکے ہیں، تاہم حکومتی ذرائع اس خیال کو رد کرتے ہیں۔''

ایک چینل کا رپورٹر چیخ رہا تھا۔ ''کالے جادو کے ماہر ارکیدو جوزے کے مطابق یہ انسانی قربانی کی ایک شکل تھی، تاہم سنجیدہ محققین اس خیال کو احمقانہ قرار دیتے ہیں اور.....''

ٹی وی چینلز پر اس قسم کی خبروں کی بھرمار تھی اور ایلینا یہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ کیا کہے۔

''موت کا دیوتا!'' مارکیز دھیرے سے بڑبڑایا۔

''نہیں!'' جیسے اچانک ایلینا دنیا میں واپس آ گئی۔ ''وہ ایک فضائی حادثہ تھا بس!''

اُس کی مٹھی میں دو خوش نما انگوٹھیاں تھیں جو انسانی انگلی کا حصہ بننے کی آرزومند تھیں، پر اب یہ ممکن نہیں تھا۔

اداس دوشیزہ کے دوسرے ہاتھ میں ایک ورق بھی تھا جس پر سرخ روشنائی سے تحریر کردہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ سے جارج کی آخری تحریر جھلک رہی تھی۔

''ڈیئر ایلینا، میں نے زندگی کا بڑا حصہ اسراروں کو سمجھنے میں صرف کیا، مجھے ہر پُراسرار شے خوب صورت معلوم ہوتی ہے لیکن سچ کہوں، دنیا میں کوئی شے تم سے زیادہ حسین نہیں۔ تم پُراسرار ناسکا اشکال سے بھی زیادہ حسین ہو۔ جان، کل فضائی جائزے سے لوٹنے کے بعد ہم شادی کے بندھن میں بندھ جائیں گے۔ ٹام نے انتظام کر لیا ہے۔ ہم اپنے والدین کو منا لیں گے امیری پیاری ایلینا، میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں!''

☆☆☆

جارج گیری کے والدین کے لیے اُن کے بیٹے کی موت ایک الم ناک حادثے کی یاد بن کر رہ جاتی، اگر خوب رُو، سنہرے بالوں اور اداس آنکھوں والی ایلینا سامنے نہیں آتی۔

جارج کی آخری تحریر پڑھنے کے بعد ممتا کے جذبے سے لبریز جارج کی امریکی ماں نے جرمن نسل کی اُس اداس لڑکی کو گلے لگا لیا۔ اُس عجیب و غریب لمحے میں بھی ایلینا کی مٹھی میں وہ انگوٹھیاں تھیں۔

''کیا ناسکا اشکال ہمارے لیے منحوس ثابت ہوئیں؟'' جارج کے باپ نے اُس بدقسمت لڑکی سے دریافت کیا جو اگر بدقسمتی آڑے نہیں آتی، تو یقینی طور پر اُس کی بہو ہوتی۔

''نہیں!'' ایلینا نے قطعیت کے ساتھ کہا۔ ''یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ روزمرہ پیش آنے والے بہ ظاہر عام فہم معاملات اور واقعات کو مافوق الفطرت تصور کرتا ہے اور اُن میں کسی نہ کسی صورت پُراسراریت ڈھونڈ نکالتا ہے۔ البتہ ناسکا اشکال کا معاملہ مختلف ہے۔ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ اشکال دو ہزار سال پرانی ہیں، اُن کی موجودگی کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔''

وہ چند ساعت خاموش رہی۔ پھر اس کے اداس لب وا ہوئے۔ ''جارج سچ کا متلاشی تھا اور میں بھی حقیقت تک رسائی کی آرزومند ہوں۔ جارج جیسے اور بھی کئی لوگ موجود ہیں۔ امید کی جا سکتی ہے کہ مستقبل کسی ایسے خیال کو ضرور سامنے لائے گا جو زیادہ واضح اور علمی حلقوں کے لیے قابلِ قبول ہوگا۔''

اِس مکالمے کے بعد ایلینا وہاں سے رخصت ہوئی اور اپنے اپارٹمنٹ پہنچ گئی۔ اس نے اپنی زندگی ناسکا اشکال پر تحقیق کرنے اور ان کی حفاظت کے لیے وقف کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس ضمن میں اسے مارکیز، وکٹوریا اور ٹام کا بھرپور تعاون حاصل تھا جو اسرار میں دلچسپی لینے والے جارج گیری سے محبت رکھتے تھے۔ اس نے سامان پیک کرنا شروع کیا۔

جو ضروری اشیا وہ ساتھ لے جا رہی تھی اُن میں ایک عجیب و غریب پینٹنگ اور مٹی کی پلیٹ بھی شامل تھی، اور وہ انگوٹھیاں بھی جو اُس نے مٹھی میں دبا رکھی تھیں!!

پیش گو

ظفر سعید یوسفی

دنیا بھر میں جتنے بھی منجّم ہیں، پیش گو ہیں، تقویم ساز ہیں۔ ان میں سب سے مقبول نام اسی شخص کا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کی پیش گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوتی رہی ہے۔ کیا یہ واقعی غیب کی معلومات رکھتا تھا؟ کیا اس کے پاس ایسا علم تھا کہ وہ آنے والے وقت کی باتیں صحیح صحیح بتا دیتا تھا؟

ایک پُراسرار شخص کا زندگی نامہ جو ماہر پیش گو کہلاتا ہے

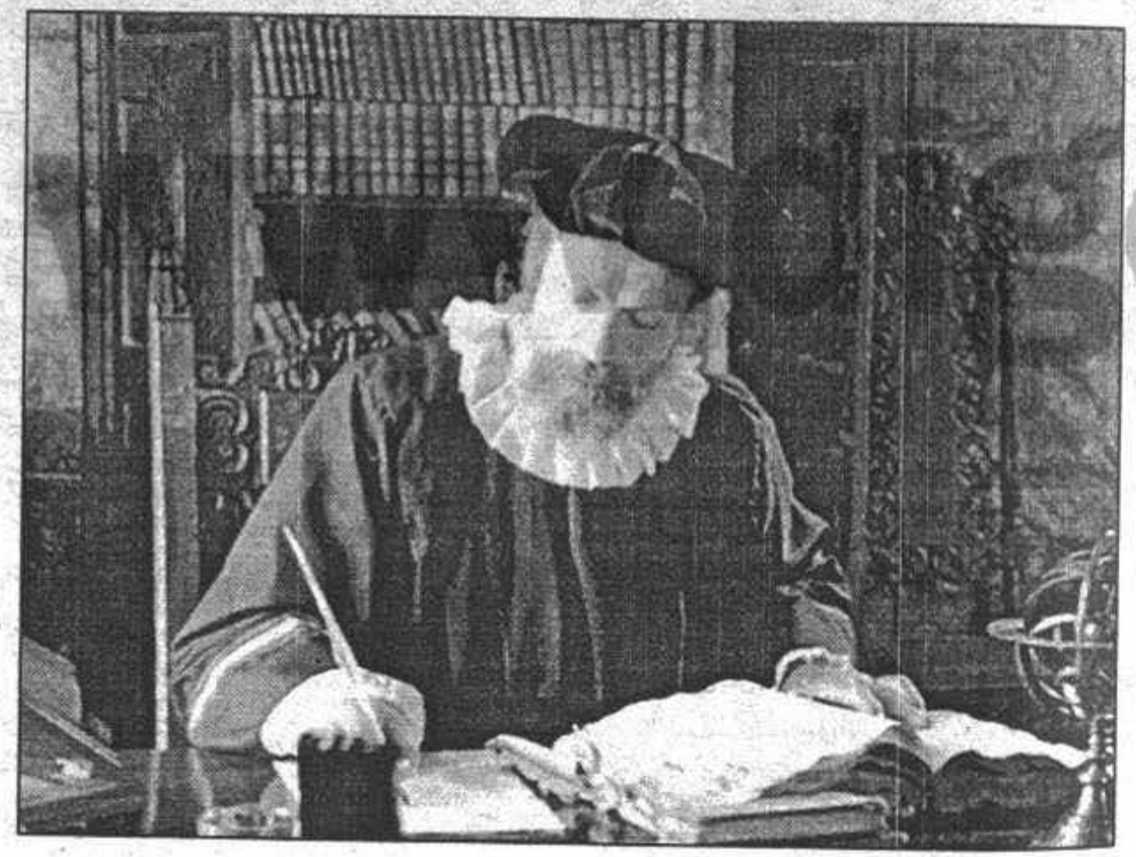

تیرھویں صدی عیسوی میں ایک تاجر یہودی خاندان وسطی فرانس کے علاقے پروونس کے شہر سینٹ ریے میں داخل ہوا اور یہاں آباد ہو گیا۔ اس خاندان کا دعویٰ تھا کہ وہ تاجر ہیں مگر یہاں آباد ہونے کے بعد انہوں نے تجارتی سرگرمیوں میں بہت کم حصہ لیا۔ اس کے بجائے خاندان کے زیادہ تر لوگ ملازمت کرتے تھے۔ امکان ہے یہ خاندان اسپین سے ہجرت کر کے یہاں آیا تھا کیونکہ مسلم حکومت کے زوال کے ساتھ ہی جن علاقوں پر عیسائی قابض ہوئے تھے وہاں انہوں نے یہودیوں کو بھی اپنا نشانہ بنانا شروع کر دیا تھا۔ اس وقت اٹلی، اسپین، جنوبی یورپ کی ساحلی ریاستیں اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وسطی یورپ یہودیوں کے قید خانوں میں بدل گئے تھے جہاں وہ چھپ چھپ کر زندگی گزارتے تھے۔

اس کے باوجود آئے دن ان پر کلیسا کا عذاب نازل ہوتا تھا۔ کبھی ان کا قتلِ عام کیا جاتا تھا اور کبھی ان کی آبادیوں کو محصور کر کے ان کا کھانا پانی بند کر دیا جاتا تھا۔ کبھی ان کے پانی کے کنوؤں اور تالابوں میں زہر ملا دیا جاتا تھا۔ کبھی ان کی آبادیوں میں طاعون کی بیماری والے چوہے چھوڑ دیے جاتے تھے۔ مذہبی اور معاشرتی پابندیوں کا تو کوئی حساب نہیں تھا لیکن سخت جان یہودی پھر بھی زندہ رہے۔ بہتر اور آسان زندگی کی تلاش میں وہ مغربی یورپ کا رخ کرنے لگے جہاں کے وحشی باشندے حال ہی میں دائرۂ عیسائیت میں داخل ہوئے تھے اور ان میں مذہبی تعصب پرانے عیسائیوں کے مقابلے میں کم تھا۔ یہ ممالک جرمنی، فرانس اور انگلینڈ تھے۔ آج بھی یورپ میں یہودیوں کی اکثریت ان تین ممالک میں پائی جاتی ہے۔

اس یہودی خاندان کا کوئی مخصوص نام نہیں تھا لیکن آج اسے اپنے ایک فرزند کے نام پر ناسٹرڈیمس کہا جاتا ہے۔ اس خاندان کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ یہودیوں کے گم شدہ قبیلے ایزاشر سے تعلق رکھتا تھا۔ اس قبیلے کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کے یہودی جادوٹونے اور پُراسرار علوم کے ماہر ہوتے تھے۔ اپنی کہانت کا سکہ جمانے کے لیے انہوں نے سفلی علوم کا سہارا لیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ کالا جادو کرتے تھے جس کا تعلق سراسر شیطان سے ہوتا ہے۔ یہ اپنی طاقت بڑھانے کے لیے شیطان سے مدد طلب کرتے تھے۔ اس وجہ سے خود یہودیوں میں ان لوگوں کو پسند نہیں کیا جاتا تھا اور یہ اپنی شناخت چھپا کر رکھتے تھے اور ایسا بھی ہوتا تھا کہ جہاں رہتے تھے بہ ظاہر وہاں کے مقامی لوگوں کا مذہب اختیار کر لیتے تھے۔ مسلمانوں میں مسلمان بن جاتے تھے اور عیسائیوں میں عیسائی۔

عجیب بات ہے تقریباً یہی ساری باتیں فری میسن تحریک یا گروہ کے بارے میں کی جاتی ہیں۔ بہ ظاہر فری میسن آزاد خیال لوگوں کی ایک تحریک ہے لیکن پسِ پردہ یہ جادوگری اور پُراسرار رسومات کی حامل مانی جاتی ہے اور اس تحریک کا تعلق شیطان سے جوڑا جاتا ہے۔ بہ ظاہر اس کے پسِ پشت یہودی کہے جاتے ہیں لیکن یہودی مذہب میں جادوگری کو اتنا ہی برا سمجھا جاتا ہے جتنا کہ دوسرے الہامی مذاہب میں سمجھا جاتا ہے۔ اصل میں اس کی مخصوص جادوگری کی رسومات کا تعلق مصری سرزمین سے جا ملتا ہے۔ جب فرعون کے جادوگر حضرت موسیٰؑ سے شکست کھا گئے اور ایمان لے آئے۔ باقی بچنے والے جادوگر بہ ظاہر یہودی ہو کر بنی اسرائیل میں شامل ہو گئے لیکن اندرونِ خانہ وہ اپنے عقائد پر قائم رہے اور اپنی تعداد خفیہ طور پر بڑھاتے رہے۔ انہوں نے بعد میں اہلِ یورپ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے فری میسن تحریک شروع کی۔ اسی تحریک کے بطن سے صیہونیت نکلی اور بالآخر اسرائیل قائم ہوا۔ اسرائیل کی تحریک کے تمام بانی فری میسنر تھے۔ آج دنیا کے جس ملک کے سب سے زیادہ اسکالر ناسٹرڈیمس پر کام کر رہے ہیں اور جس ملک میں ناسٹرڈیمس پر سب سے زیادہ پی ایچ ڈی کی ڈگریاں دی گئی ہیں وہ اسرائیل ہے۔

اس خاندان کا کوئی مخصوص نام نہ ہونا لوگوں کے نزدیک اسے مشکوک کرتا تھا۔ اگرچہ سینٹ ریمے کے عیسائی اس معاملے میں متعصب نہیں تھے لیکن ان کے ہاں جادوٹونا شیطانی افعال تھے اور وہ کسی صورت انہیں برداشت نہیں کرتے تھے۔ جس شخص کے بارے میں ان کو یقین ہو جاتا کہ وہ جادو یا کسی قسم کے شیطانی فعل میں ملوث ہے وہ اسے زندہ جلا دیتے تھے۔ فرانس کی اتنا سنگین الزام تھا کہ جو شخص ایک بار اس الزام میں کلیسائی عدالت تک پہنچ جاتا ننانوے فیصد اسے سزا سنا دی جاتی تھی۔ چاہے اس کے خلاف کوئی ثبوت یا گواہ ہو یا نہ ہو۔ ظاہر ہے ایسے ماحول میں کوئی جادو یا سفلی علوم کا ماہر ہونے کا اقرار نہیں کر سکتا تھا۔

یہ یہودی خاندان بھی لوگوں کے بڑھتے شکوک سے خطرہ محسوس کرنے لگا تھا۔ ان کو یہاں آباد ہوئے کئی نسلیں گزر چکی تھیں۔ اس کے باوجود وہ مقامی لوگوں سے گھلنے ملنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ اس کی وجہ ان کا اپنا رویہ تھا۔ وہ اپنے خول میں بند تھے اور مقامی لوگوں سے ملنے جلنے سے گریز کرتے تھے۔ ان کی تقاریب میں کوئی غیر خاندان کا فرد شریک نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ہی وہ کسی اور تقریب میں شریک ہوتے تھے۔ اپنے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد بھی وہ اپنے گھروں میں رہتے اور اپنے مذہبی امور بھی گھروں میں انجام دیتے تھے کیونکہ ان کو عبادت گاہیں بنانے کی اجازت نہیں تھی۔ مقامی عیسائیوں میں ان کے خلاف شکوک وشبہات بڑھ رہے تھے اور ان شبہات کو وہ پادری شہ دے رہے تھے جو مقامی مذہبی عدالتوں کے کرتا دھرتا تھے اور ان کی آمدنی کا بڑا انحصار ان مقدمات پر ہوتا تھا جو ان کی عدالتوں میں پیش

کیے جاتے تھے۔ ان کو حکومت کی طرف سے ان مقدمات کی سماعت پر باقاعدہ فیس ادا کی جاتی تھی۔

14 دسمبر 1503ء کو اسی خاندان میں ایک بچے نے جنم لیا۔ جب اس بچے کا زائچہ بنایا گیا تو خاندان کے بزرگ مزید فکر مند ہو گئے۔ بچے کا نام مائیکل ڈی ناسٹر ڈیم رکھا گیا۔ اس کے لفظی معنی ہیں ''ہماری خاتون کا مائیکل'' ظاہر ہے یہ نام ننھیال کی طرف سے رکھا گیا تھا اور مائیکل کو اپنی بیٹی کی اولاد قرار دیا گیا تھا۔ اگرچہ یہ ایک ہی خاندان تھا اور یہ لوگ آپس میں ہی شادیاں کرتے تھے لیکن بچے کے ننھیال کے لوگ زیادہ پڑھے لکھے اور اثر والے تھے۔ بعد میں بچہ ناسٹرڈیمس کے نام سے مشہور ہوا۔ بچہ خوب صورت اور مخصوص یورپی خدوخال لیے ہوئے تھا۔ وہ سنہری بالوں اور کھڑے نقوش کا حامل تھا اور بچپن سے اس کی وجاہت نمایاں تھی۔ لیکن خاندان کے ان بزرگوں نے جو قدیم علوم کے حامل تھے اس کی کشادہ پیشانی میں کچھ اور ہی دیکھا اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ وہ مقامی عقیدہ اپنا لیں۔ ورنہ یہ بچہ جب بڑا ہوگا اور اس کی باتیں عام ہوں گی تو اس کے ساتھ اس خاندان کی شامت بھی آ جائے گی۔

مائیکل کے لیے فیصلہ ہوا کہ اسے کسی اسکول میں داخل نہیں کرایا جائے گا اور نہ ہی اسے گھر سے اکیلے باہر جانے کی اجازت ہوگی۔ اس کے لیے طے ہوا کہ وہ ابتدائی تعلیم گھر میں اپنے نانا جین سے حاصل کرے گا جو یہودیوں کے مذہبی علم تالمود، عبرانی، ریاضی اور آسٹرولوجی کا ماہر تھا۔ اصل میں اس تعلیم کا مقصد مائیکل کی بنیاد کو مضبوط کرنا اور اسے آنے والے دنوں میں ایک کٹر عیسائی معاشرے کا سامنا کرنے کے قابل بنانا تھا۔ فرانس میں کیتھولک مذہب رائج تھا جو عیسائیوں میں بنیاد پرست شمار ہوتے ہیں۔ اگرچہ جرمنی اور انگلینڈ کے آزاد خیال معاشروں سے متاثر فرانس میں اتنی مذہبی شدت پسندی نہیں تھی اور خاص طور سے صلیبی جنگوں کے انجام سے عبرت پکڑ کر انہوں نے کلیسا کو خاصی حد تک معاشرے سے بے دخل کر دیا تھا لیکن پھر بھی کیتھولک چرچ کے اثرات موجود تھے۔ خاص طور سے فرانس کا شاہی خاندان ان کے زیرِ اثر تھا۔ اکثر فرانسیسی شاہوں کو کالے کرتوت کے بعد آخرت کی یاد آتی تو وہ مذہبی بن جاتے تھے اور مذہبی بننے کا طریقہ یہ تھا کہ کلیسا کے سامنے جھک جایا جائے۔ فرانس کے کلیسا اور پادریوں نے شاہی قرب سے دل کھول کر فائدے اٹھائے۔ انہوں نے بڑی بڑی جاگیریں حاصل کیں۔

کلیسا نے اپنی برتری کو قائم رکھنے کے لیے تمام مذہبی اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھے تھے اور ایسے معاملات جن میں کسی پر مذہبی قوانین کی خلاف ورزی کی صورت میں مقدمہ چلتا تھا تو یہ مقدمہ عام عدالت میں نہیں بلکہ مذہبی عدالت میں چلتا تھا جس کا جج کوئی پادری ہوتا تھا جسے قانون کی ابجد کا بھی پتا نہیں ہوتا تھا۔ ثبوت اور گواہوں کے بجائے یہ دیکھا جاتا تھا کہ الزام کس پر لگ رہا ہے اور پھر اسے سزا سنا دی جاتی تھی۔ صرف وہی ملزم بری ہوتے تھے جن کا تعلق اوپری طبقے سے ہوتا تھا۔ اگر ملزم کوئی غریب ہوتا تو اسے سزا ہونا لازمی ہوتی اور اگر وہ یہودی ہوتا تب بھی اس کے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

مائیکل کے بزرگ جان گئے تھے کہ اس میں مستقبل کو جاننے کی صلاحیت ہے اور یہ صلاحیت پیدائشی تھی۔ اگر وہ اس کا سرِعام اظہار کرتا تو عین ممکن ہے اس پر جادو کا الزام لگا کر اسے زندہ آگ میں جلا دیا جاتا۔ پورا خاندان بہرصورت اس بچے کو بچانا چاہتا تھا اور اس کے لیے وہ اپنا مذہب تک بدلنے کو تیار تھے۔ یہ بہت بڑی قربانی تھی کیونکہ عیسائیوں اور یہودیوں میں بنیادی تنازع مذہب کا تھا۔

آخر اس بچے میں ایسی کیا بات تھی کہ اسے بچانے کے لیے یہودیوں کا ایک بہت بڑا خاندان اپنا مذہب تبدیل کرنے کو تیار ہو گیا تھا؟ یہ کوئی عام یہودی نہیں تھے بلکہ اس خاندان کے اکثر افراد یہودی عالم تھے اور تقریباً سارا خاندان اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔ اس وقت فرانسیسی عیسائیوں کا یہ حال تھا کہ سو میں دس افراد اپنا نام لکھ سکتے تھے۔ ان کے عالم کا مطلب صرف بائبل پڑھنے والا کہلاتا تھا۔ اس وقت ہر عیسائی بائبل بھی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ تمام اختیارات پادریوں کے ہاتھ میں تھے خصوصاً تعلیم کے معاملے میں انہوں نے عیسائیوں پر سخت پابندیاں لگا رکھی تھیں۔ معاشرتی اور سائنسی مضامین پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور اگر کوئی ایسا کرتا تو اس پر ملحد ہونے کا ٹھپا لگا دیا جاتا تھا۔ تمام تر تعلیم اعلیٰ طبقے کے لیے مخصوص تھی۔

مائیکل تین یا چار سال کی عمر سے اپنے نانا جین سے پڑھنے لگا تھا۔ جین ایک مخصوص زرنگار کرسی پر بیٹھ کر مائیکل کو عہدنامہ قدیم، عبرانی زبان، فلسفہ، فلکیات اور قدیم مذہبی علوم کی تعلیم دیتا تھا۔ مائیکل اس کے سامنے دست بستہ کھڑا ہوتا اور پوری توجہ سے اس کا کہا ایک ایک لفظ سنتا تھا۔ جین اپنے

www.digestpk.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نواسے کی ذہانت اور یادداشت پر حیران تھا۔ وہ اسے ایک بار جو بتا دیتا وہ اس کی یادداشت میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتا تھا۔ یہی نہیں جب جین اس سے کسی مضمون کے بارے میں بحث کرتا تو مائیکل پورے اعتماد اور دلائل کے ساتھ اسے جواب دیتا تھا۔

ایک تو نصابی تعلیم تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ جین اسے آسٹرولوجی اور خاص طور سے فلکیات کا سبق بھی پڑھاتا تھا۔ وہ مائیکل پر زور دیتا تھا کہ دنیا کی تعلیم اپنی جگہ لیکن اسے اپنے اندر کی خفیہ صلاحیتوں کو بیدار کرنا ہوگا تب ہی وہ کامیابی حاصل کر سکے گا۔ وہ اسے کچھ مشقیں کراتا تھا ساتھ ہی وہ اسے ان قدیم نقوش کو سمجھنے کی تعلیم دیتا تھا جو اصل میں تمام پُراسرار علوم کا ماخذ تھے اور مختلف کتابوں اور مخطوطوں میں ان کے خاندان میں ہزاروں سال سے محفوظ چلے آ رہے تھے۔ بعد میں مائیکل نے ان نقوش کو اپنی پیش گوئیوں کی کتاب میں بھی استعمال کیا لیکن اس نے ان کی وضاحت کرنے سے گریز کیا تھا۔ وہ ان کے اسرار عام نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ابھی مائیکل دس سال کا ہوا تھا کہ جین نے محسوس کیا کہ وہ اسے جو پڑھا سکتا تھا پڑھا چکا ہے۔ اب مائیکل کو باہر نکل کر تعلیم حاصل کرنی ہوگی۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ وہ مذہب تبدیل کر لیں۔ ریسے ڈی پروونس کے چرچ نے خوشی اور فخر سے اعلان کیا کہ اس قدیم یہودی خاندان نے اجتماعی طور پر عیسائیت قبول کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ یہودی خاندان ان کو دھوکا دے رہا ہے۔ اگر اس کے ایک دو افراد یا ایک گھر عیسائیت قبول کرتا تو بات سمجھ میں آنے والی تھی لیکن سارے خاندان کا عیسائیت قبول کرنا سوائے منافقت کے اور کچھ نہیں تھا۔

دس سال کی عمر میں مائیکل اس قابل ہو گیا تھا کہ اپنے طور پر مطالعہ کر سکتا تھا اور اس کی دلچسپی کا محور آسٹرولوجی اور فلکیات کی کتابیں تھیں۔ اس نے چن چن کر اس موضوع پر ملنے والی ہر کتاب پڑھ ڈالی تھی اور پندرہ سولہ سال کی عمر میں وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ کسی بھی فرد کے مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کر سکتا تھا۔ دس سال کی عمر کے بعد اسے گھر سے باہر جانے اور دوست بنانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ یعنی اس کے بزرگوں کو اعتماد تھا کہ وہ منہ سے ایسی کوئی بات نہیں نکالے گا جس سے وہ خود یا اس کا خاندان مشکل میں پڑ جائے۔ مائیکل نے دوست بنائے اور نوجوانوں والی سرگرمیاں شروع کیں۔ دوستوں کے اس حلقے میں کبھی کبھی اس کے منہ سے نہ چاہتے ہوئے بھی کسی کے بارے میں ایسی بات نکل جاتی جو بعد میں پوری ہوتی تھی لیکن بچہ ہونے کی وجہ سے کوئی اس چیز کو اہمیت نہیں دیتا تھا۔

لیکن جب وہ بارہ سال کا تھا تو اس کی ایک پیش گوئی کی وجہ سے اس کا خاندان مشکل میں پڑتے پڑتے رہ گیا۔ مائیکل کا گھر جس گلی میں تھا اس میں ایک ناجین فلار نامی خاتون رہتی تھی۔ اگرچہ اس کا شوہر بھی تھا لیکن وہ دوسروں سے تعلقات رکھنے کے لیے بدنام تھی اور اس کے گھر پر ہمہ وقت غیر مردوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی۔ محلے کے لوگ اسے اچھا نہیں سمجھتے تھے اور اس سے دور رہتے تھے۔ خاص طور سے عورتیں اس سے گریز کرتی تھیں۔ اس خاتون کا ایک لڑکا جولین تھا جو عمر میں مائیکل سے ذرا چھوٹا تھا۔ جس طرح بڑوں نے اس گھر کا بائیکاٹ کر رکھا تھا اسی طرح بچے بھی جولین کے ساتھ کھیلنے سے گریز کرتے تھے۔ ایک دن جولین گلی میں آیا اور مائیکل اور اس کے دوستوں کے ساتھ زبردستی کھیل میں شامل ہو گیا۔ جب بچوں نے احتجاج کیا تو اس نے انہیں مارا اور ایک لڑکے کا سر پھاڑ دیا۔ مائیکل کو اس پر غصہ آ گیا اور اس نے بددعا دینے کے انداز میں جولین سے کہا۔

”تم جلد گھوڑے کی ٹاپوں تلے کچلے جاؤ گے اور تمہاری ماں تمہارے تابوت پر بین کرے گی۔“

مائیکل کے الفاظ نے جولین کو خوف زدہ کر دیا تھا۔ وہ خوف کے عالم میں گھر بھاگ گیا اور اس نے مائیکل کی بات اپنی ماں کو بتا دی۔ ناجین فلار چراغ پا ہو گئی اور لڑنے کے لیے مائیکل کے گھر پہنچ گئی۔ وہ چیخنے چلانے لگی تو محلے والے جمع ہو گئے اور ناجین نے ان کے سامنے بتایا کہ مائیکل نے اس کے بیٹے کے بارے میں کیا کہا ہے۔ لوگوں نے ناجین کو سمجھایا کہ کھیل میں لڑائی ہو جائے تو بچے اس قسم کی باتیں کر جاتے ہیں اس کو سنجیدہ لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ناجین نے دیکھا کہ لوگ اس کی بات سننے کے موڈ میں نہیں ہیں تو وہ بکتے جھکتے رخصت ہو گئی۔

اس کے ایک مہینے بعد ہی جولین سڑک سے گزرتے ہوئے ایک بے قابو گھوڑی کی زد میں آ گیا اور گھوڑے کی ٹاپوں سے کچل کر شدید زخمی ہو گیا اور دو دن بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ غم و غصے سے پاگل ناجین نے اس کی شکایت ایک مقامی مذہبی عدالت میں کی اور مائیکل کو جادوگری کا مرتکب قرار دینے کی درخواست کی۔ لیکن عدالت نے تین وجوہات پر درخواست مسترد کر دی۔ ایک تو مائیکل بچہ تھا، دوسرے

جولین حادثے کا شکار ہوا تھا یہ اس کی اپنی غلطی سے ہوا تھا۔ تیسرے جولین جس بگھی کے نیچے آیا تھا اسے ایک مقامی امیر زادہ چلا رہا تھا۔ اصل وجہ یہی تھی، اگر مائیکل کو عدالت بلایا جاتا تو لازمی بات ہے امیر زادے کو بھی عدالت کا سامنا کرنا پڑتا۔ یوں مائیکل کی بچت ہو گئی اور اس کے بعد وہ پیش گوئیوں کے معاملے میں بہت محتاط ہو گیا تھا۔

جیسے جیسے مائیکل نوجوانی کی طرف بڑھ رہا تھا اس کی پیش گوئی کی صلاحیت بھی بڑھ رہی تھی۔ پہلے وہ یہ کام بے ساختہ کرتا تھا لیکن اب وہ ذرا سی کوشش کے بعد کسی شخص کے بارے میں پیش گوئی کرنے کا اہل ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی پہلی اہم پیش گوئی اسی دور میں کی تھی۔ سترہ سال کی عمر تک مائیکل کا رجحان مذہب کی طرف بہت زیادہ ہو گیا تھا اور اس کا اکثر فارغ وقت چرچ میں گزرتا تھا۔ وہ ایک موقع پر مقامی چرچ میں موجود تھا اور اپنے ایک دوست سے بات کر رہا تھا کہ اس کی نظر چرچ کے کنویں سے پانی نکالتے ایک راہب پر گئی اور وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے اپنے دوست سے اس کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہ مقامی نوجوان راہب چرچ کے خدمت گاروں میں شامل ہے۔ مائیکل ڈی ناسٹرڈیمس اس کی طرف بڑھا اور اس نے پانی پیتے راہب کا جھک کر دامن چوم لیا۔ وہ ناسٹرڈیمس کی اس حرکت سے حیران ہوا تھا اور اس نے پوچھا۔ ”نوجوان تم نے ایسا کیوں کیا ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”میں نے پوپ کے دامن کو بوسہ دیا ہے۔“

فلجی پریتی نامی یہ راہب ناسٹرڈیمس کے اس جواب پر مزید حیران ہوا تھا کیونکہ وہ صرف بائیس سال کا اور مقامی چرچ کا ایک معمولی خدمت گار تھا پوپ بننا تو بہت دور کی بات ہے، اس نے کبھی مقامی چرچ کا پادری بننے کا بھی نہیں سوچا تھا۔ لیکن برسوں بعد جب ناسٹرڈیمس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا تو فلجی پریتی نامی اس راہب نے ویٹیکن میں چھپن ویں پوپ کی حیثیت سے قدم رکھا تھا۔ ناسٹرڈیمس کی یہ حیرت انگیز پیش گوئی نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد پوری ہوئی تھی اس لیے اس وقت اس نے کوئی اہمیت حاصل نہیں کی تھی معاملہ صرف پوپ اور ناسٹرڈیمس یا اس کے چند جاننے والوں تک محدود رہا تھا۔

اس وقت نوجوان ناسٹرڈیمس زبانیں پڑھ رہا تھا۔ عبرانی پر اسے دس سال کی عمر میں عبور حاصل ہو گیا تھا اور پھر اس نے لاطینی اور یونانی زبانیں سیکھیں کیونکہ یورپ میں پائی جانے والی تمام کتابیں ان دو زبانوں میں تھیں۔ فرانسیسی زبان اگرچہ دل کشی میں ان زبانوں پر فوقیت رکھتی تھی لیکن ابھی اس میں ذخیرۂ علوم منتقل نہیں ہوا تھا۔ اس لیے کسی باقاعدہ درس گاہ میں داخل ہونے سے پہلے ان زبانوں پر عبور حاصل کرنا لازمی تھا۔ انیس سال کی عمر میں وہ ان مشکل ترین زبانوں پر مکمل عبور حاصل کر چکا تھا۔ بعد میں اس نے ان زبانوں کو اپنی پیش گوئیوں میں شاعرانہ انداز میں استعمال کیا۔ اس سے زبانوں پر قدرت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اس وقت تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے دو ہی شعبے تھے۔ ایک تو وہ فوج میں بھرتی ہو جائیں اور اپنی صلاحیت کی بنیاد پر اونچے مقام تک پہنچ جائیں یا پھر میڈیکل کی تعلیم حاصل کریں۔ اس وقت یورپ میں صرف میڈیکل کی تعلیم باقاعدہ طور پر دی جا رہی تھی۔ یہودی عام طور سے جنگ کو پیشہ بنانے سے گریز کرتے ہیں اور عیسائی ہونے کے بعد اس خاندان نے جنگوں سے گریز کی پالیسی برقرار رکھی تھی۔ اس لیے مائیکل کو طبی تعلیم کے لیے فرانس کی مشہور طبی درس گاہ ایوگ نون بھیجنے کا فیصلہ ہوا۔ ابھی مائیکل انیس برس کا نہیں ہوا تھا لیکن جہاں تک اس کی علمی قابلیت کا تعلق تھا تو وہ اس وقت اس ادارے میں پڑھانے والے اساتذہ سے بھی زیادہ تھی۔ خاص طور سے زبانوں پر عبور نے مائیکل کے اساتذہ کو بھی حیران کر دیا تھا۔ اس وقت طبی تعلیم لاطینی زبان میں دی جاتی تھی اور آج بھی میڈیکل کی تمام اصطلاحیں لاطینی زبان کی ہیں۔

لیکن ایوگ نون میں مائیکل کا دل نہیں لگا اور اس نے بعد میں ماؤنٹ پیلیر کے اسکول آف میڈیسن میں داخلہ لے لیا اور یہیں سے تین سال بعد اس نے میڈیکل کی ابتدائی ڈگری حاصل کی۔ یہ ڈگری حاصل کرنے والا طبی پریکٹس کر سکتا تھا۔ یعنی ڈاکٹر بننے سے پہلے جو عملی تجربہ درکار ہوتا ہے وہ حاصل کر سکتا تھا۔ اسے آج کے دور میں ہاؤس جاب سمجھ لیں۔ عام طور سے ابتدائی ڈگری لینے والے طلبا کسی شہر کا رخ کرتے تھے اور آگے تعلیم حاصل کرنے سے پہلے امراء کا علاج کر کے دولت کماتے تھے۔ اس کے بعد واپس آ کر اپنی ڈاکٹریٹ کی ڈگری وصول کرتے تھے اس کے بعد ان کو کمانے کا لائسنس مل جاتا تھا۔

لیکن اپنے ساتھیوں کے برعکس مائیکل ڈی ناسٹر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈیمس نے فرانس کے ان غریب ترین دیہات کا رخ کیا جہاں ان دنوں طاعون کی وبا عام تھی اور خاص طور سے سیاہ طاعون لوگوں کو موت کے منہ میں دھکیل رہا تھا۔

ناسٹرڈیمس نے ان غریب اور بیمار دیہاتیوں کا اتنی دل جمعی سے علاج کیا کہ وہ ان علاقوں میں ولی مشہور ہو گیا۔ اس موذی مرض کے علاج کے لیے ناسٹرڈیمس نے اپنی فطری ذہانت استعمال کی اور خاص طور سے سیاہ طاعون کے علاج میں کچھ ایسے طریقے استعمال کیے جس سے بہت سارے مریض بچ گئے جبکہ سیاہ طاعون کو یقینی موت کہا جاتا تھا۔ اس نے سب سے پہلے علاقے میں موجود چوہوں کے خلاف مہم چلائی پھر اس نے دیہاتیوں کی مدد سے ایسے گھر تعمیر کرائے جہاں طاعون کے مریضوں کو رکھا جاتا تھا۔ جیسے ہی کوئی فرد طاعون کا شکار ہوتا اسے ان مخصوص گھروں میں منتقل کر دیا جاتا تھا۔ یوں مرض پھیلنے کی شدت میں کمی آئی تھی۔ آنے والے تین سال تک ناسٹرڈیمس وہیں رہا اور اس دوران میں اس نے اپنے علاقے میں اس وبا پر خاصی حد تک قابو پا لیا تھا۔ وہ واپس آیا تو ڈاکٹر کی ڈگری اس کا انتظار کر رہی تھی۔

سیاہ طاعون کے علاج میں اس کی وضع کی ہوئی ترکیبیں بہت کارآمد ثابت ہوئی تھیں اور اس کی واپسی سے پہلے یہ خبر ماؤنٹ پیلیر کے اسکول آف میڈیسن تک پہنچ گئی تھی۔ اس کا پُرجوش استقبال کیا گیا اور اسے پورے اعزاز کے ساتھ ڈاکٹر کی ڈگری سے نوازا گیا۔ یہاں بھی ناسٹرڈیمس نے اپنے وضع کیے ہوئے طریقہ علاج کا کامیاب مظاہرہ کیا اور طاعون کے کئی مریضوں کی جان بچائی۔ اس وقت طاعون کے مریض کا واحد علاج اس کے پھوڑوں سے خون نکالنا ہوتا تھا حالانکہ یہ پھوڑے ہی بیماری کے جراثیم سے بھرے ہوتے تھے اور ان کو کاٹنے سے بیماری کے بڑھنے کا امکان ہوتا تھا، کم ہونے کا نہیں۔ ناسٹرڈیمس نے اس طریقہ علاج کو مسترد کر دیا تھا اور اس نے جڑی بوٹیوں اور کچھ عناصر کی مدد سے تیار کردہ دواؤں سے علاج ایجاد کیا تھا جو موثر بھی رہا تھا۔ اگرچہ حالیہ دور میں ماہرین نے ناسٹرڈیمس کے فارمولے کو بے کار قرار دیا ہے، ان کا کہنا ہے طاعون کے جراثیم پر اس کا کوئی اثر ممکن نہیں ہے۔ ممکن ہے مریض کو اس سے نفسیاتی سہارا ملتا ہو اور وہ بیماری پر قابو پا لیتا ہو۔ بہرحال اس وقت یہ فارمولا کامیاب رہا تھا۔ میڈیکل اسکول کی انتظامیہ نے اس سے درخواست کی کہ ایک سال کے لیے اسکول میں لیکچرر کے طور پر کام کرے اور اپنا ایجاد کیا ہوا طریقہ علاج نئے ڈاکٹروں کو سکھائے۔

ناسٹرڈیمس نے یہ درخواست قبول کر لی اور اسکول آف میڈیسن میں ایک سال تک نئے طلبا کو پڑھاتا رہا۔ یہ اس کے لیے کامیابیوں اور خوشیوں کا دور تھا۔ اس نے نہ صرف ہزاروں افراد کی جان بچائی تھی بلکہ دوسروں کو بھی اس موذی مرض سے محفوظ رکھنے کے طریقے بتائے۔ یہاں اسے عزت اور مقام ملا جبکہ ابھی اس کی عمر صرف چھبیس سال تھی۔ انتظامیہ اس سے متاثر تھی اور اس کے طلبا اس سے عقیدت رکھتے تھے۔ ایک سال بعد وہ واپس جا رہا تھا تو پورا اسکول اسے رخصت کرنے آیا تھا۔ الوداعی تقریب میں اسے اسکول کے اعزازی فیلو کا سرٹیفکیٹ پیش کیا گیا تھا اور یہ اعزاز بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتا تھا۔ آج بھی اسکول کے ہال میں ناسٹرڈیمس کی تصویر کے ساتھ اس کی ڈگری اور اعزازی سرٹیفکیٹ کا نقش آویزاں ہے۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ ناسٹرڈیمس کب باقاعدہ پیش گو بنا کیونکہ وہ اب تک غیر سنجیدہ تھا۔ اس نے جو اکا دکا پیش گوئیاں کی تھیں وہ بھی بنا سوچے سمجھے اور بے اختیار کی تھیں۔ جیسے فلپی پریتی کے پوپ بننے کی پیش گوئی۔ اسی طرح اس نے ماؤنٹ پیلیر میں ایک استاد جان گریفتی کے بارے میں پیش گوئی کی کہ وہ جلد نااہل ہونے کی وجہ سے اسکول سے نکال دیا جائے گا۔ ناسٹرڈیمس کی پیش گوئی پر چراغ پا جان گریفتی نے انتظامیہ سے اس کی شکایت کر دی اور جب انکوائری ہوئی تو پتا چلا کہ اس نے اپنی تعلیمی قابلیت کے بارے میں جھوٹ بولا تھا اور وہ اتنی استعداد نہیں رکھتا کہ اسکول میں طلبا کو پڑھا سکے۔ جان گریفتی کو نااہل قرار دے کر اسکول سے نکال دیا گیا۔ یوں ناسٹرڈیمس کی یہ پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔

بیس سے چھبیس سال کی عمر تک ناسٹرڈیمس کا دھیان مکمل طور پر اپنی تعلیم اور مریضوں کے علاج پر رہا تھا۔ اس دوران میں اس نے اپنی پیش گوئی کی صلاحیت کی طرف خاص توجہ نہیں دی تھی۔ ماؤنٹ پیلیر سے ٹولوسی واپس آنے کے بعد ناسٹرڈیمس نے بہ طور ڈاکٹر پریکٹس شروع کی اور یہیں اس کی ملاقات ایک نوجوان خاتون سے ہوئی۔ ممکن ہے وہ مریض کی حیثیت سے اس کے پاس آئی ہو اور پھر ان میں تعلق اتنی تیزی سے بڑھا کہ انہوں نے جلد شادی کر لی۔ حیرت انگیز بات ہے کہ آج اس خاتون کا نام کوئی نہیں جانتا ہے۔ خود ناسٹرڈیمس نے اپنی تحریروں میں کہیں اس کا نام

نہیں لکھا ہے۔ بس اس نے اتنا ہی لکھا ہے کہ وہ بہت خوب صورت اور دل کش خاتون تھی۔ اس نے ناسٹرڈیمس کے دو بیٹوں کو جنم دیا اور بدقسمتی سے مختصر سے عرصے میں ناسٹرڈیمس کی یہ بیوی اور دونوں بیٹے سیاہ طاعون کا شکار ہو گئے۔

ناسٹرڈیمس کے بیوی بچے کس طرح اس بیماری کا شکار ہوئے تھے اس کی کوئی وضاحت موجود نہیں ہے۔ کیونکہ ناسٹرڈیمس اس مرض کے علاج کا ماہر تھا اور سیکڑوں نہیں ہزاروں مریضوں کو بچا چکا تھا مگر وہ اپنے بیوی بچوں کو نہیں بچا سکا۔

ایک روایت ہے کہ ماؤنٹ پیلیر سے ابتدائی تعلیم کے بعد جب ناسٹرڈیمس نے دیہاتیوں کا علاج شروع کیا تو اس نے علاج میں وہ قدیم جادوئی طریقے اور دوائیاں بھی استعمال کیں جو اس نے اپنے نانا جین سے سیکھا تھا۔ کیونکہ ان طریقوں اور دواؤں کا تعلق شیطان سے بنتا تھا اس لیے ناسٹرڈیمس کو بعد میں اس کی قیمت ادا کرنی پڑی اور یہ قیمت اس کے بیوی اور بچوں کی جان کی صورت میں ادا ہوئی تھی۔ وہ سیاہ طاعون کا شکار ہوئے جس کے علاج کا ناسٹرڈیمس ماہر تھا۔ بہرحال ناسٹرڈیمس کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا۔ اس کا کل اثاثہ اس کے یہی بیوی بچے تھے۔ کہا جاتا ہے اس کے بعد ہی وہ دنیا سے دل برداشتہ ہو گیا تھا اور اس نے اپنی توجہ باطنی دنیا کی طرف کر لی تھی اور اس وقت اس کی پیش گوئی کی صلاحیت ابھر کر سامنے آئی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کا اصل کام دنیا اور لوگوں کو آنے والے کل کے بارے میں بتانا ہے۔ ساتھ ہی اس نے محسوس کیا کہ کسی کے بارے میں کچھ جان لینا کہ آنے والے وقت میں اس کے ساتھ کیا ہوگا ایک اتفاقی امر ہے اور مستقبل کے بارے میں باقاعدہ پیش گوئی کرنا ایک الگ علم ہے۔

مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کرنے کے لیے کئی عوامل کا یکجا ہونا ضروری ہے۔ ایک تو علم کہ اس میں ظاہری اور باطنی دونوں طرح کے علوم کی ضرورت پڑتی ہے اور پیش گو کو ان میں ماہر ہونا چاہیے۔ دوسرے اسے معاشرتی علوم اور خاص طور سے سیاسیات کا ماہر ہونا چاہیے۔ تیسرے اسے اپنی پیش گوئی کو پیش کرنے کا ڈھنگ آنا چاہیے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پیش گو ناکام ہو جائے گا چاہے وہ مستقبل کے بارے میں کتنی اچھی پیش گوئی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ ناسٹرڈیمس کی خوش قسمتی کہ قدرت اس کے لیے یہ سارے لوازمات مہیا کر رہی تھی۔ اس نے زبانوں اور قدیم پُراسرار علوم کی تعلیم اپنے نانا سے حاصل کی تھی۔ پھر دنیاوی تعلیم بھی یورپ کی بہترین درسگاہ سے حاصل کی۔ اسے ان تمام زبانوں کی نثر اور نظم دونوں پر مکمل عبور حاصل تھا جو اس نے سیکھیں۔

ناسٹرڈیمس کو شاعری سے بھی شغف تھا اور دورانِ تعلیم اس کی ملاقات انگلینڈ سے پڑھنے کے لیے آنے والے ڈاکٹر جان ڈی سے ہوئی اور اس کے توسط سے وہ انگریز شاعر رون سرڈ کی شاعری سے متعارف ہوا۔ ناسٹرڈیمس اس کی شاعری کا دیوانہ ہو گیا تھا اور بعد میں جب اس نے پیش گوئیوں کا آغاز کیا تو انہیں نثر میں لکھنے کے بجائے اس نے رون کی شاعری کے انداز میں تحریر کیا۔ رون کو یورپی شاعری میں چھ مصرعوں کے بند کا بانی کہا جاتا ہے۔ اپنی اولین پیش گوئیاں جنہیں پروفیسیز کہتے ہیں ناسٹرڈیمس نے اپنی پہلی بیوی اور بچوں کی موت کے بعد تحریر کی تھیں۔ وہ اس وقت اتنا دل برداشتہ تھا کہ اس نے لوگوں سے تعلق ختم کر لیا اور گھر میں بند ہو کر بیٹھ گیا۔ لیکن اس کے سسرال والوں نے کوشش کی اور بالآخر اس کے دوست جولیس سیزر کالیگر کی مدد سے اسے پھر سے معمولاتِ زندگی کی طرف لانے میں کامیاب رہے تھے۔

ناسٹرڈیمس اپنی بیوی بچوں کی موت کا سلسلہ اپنے چند برس قبل 1538ء کے ایک سفر سے جوڑتا ہے جب اسے دورانِ سفر ایک مجسمہ ساز نے کانسی کا بنا ہوا مجسمہ دکھایا۔ اس نے وضاحت نہیں کی کہ وہ کس قسم کا مجسمہ تھا لیکن اس نے تحریر کیا کہ اس قسم کے مجسمے شیطان سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ اسے چھوڑ کر آ گیا تھا اس نے مجسمہ ساز کے اصرار کے باوجود اسے لینے سے انکار کر دیا تھا۔ کیا ناسٹرڈیمس کے لیے یہ کوئی اشارہ تھا کہ اسے اپنے کیے کی قیمت ادا کرنی ہوگی اور اس کے کچھ عرصے بعد ہی اس کی بیوی اور بچے مر گئے۔

اس کی پریشانی کا آغاز تھا کیونکہ بیوی اور بچوں کے مرنے کے بعد اس پر الزام لگا کہ وہ چرچ کے اصول و قوانین کی خلاف ورزی کر رہا ہے اور یہ کام اس نے مریضوں کے علاج کے دوران کیا۔ اس نے چرچ کے بارے میں کچھ نازیبا کلمات اپنے مریضوں کے سامنے کہے تھے اور یہ بات چرچ تک پہنچ گئی تھی۔ ناسٹرڈیمس مشکل میں پڑ گیا تھا کیونکہ وہ ایسے خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو کنورٹیڈ تھا اور اس کے بارے میں بڑی آسانی سے شک کیا جا سکتا تھا کہ وہ ابھی تک اپنے قدیم عقائد پر قائم ہے۔ ناسٹرڈیمس کسی صورت مذہبی عدالت کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا ایک بار اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے عدالت کا سامنا کرلیا تو اسے سزا ہو جائے گی اور اس کی بچت کا امکان بہت کم ہوگا۔ اس لیے جب اس کے خلاف تحقیقات کا آغاز ہوا تو وہ فوری طور پر ٹولوسی سے روانہ ہوگیا اور اس نے مشرقی فرانس کا رخ کیا۔ جانے سے پہلے اس نے اپنا مکان فروخت کر دیا تھا اور اپنی ساری جمع پونجی بھی اپنے ساتھ لے لی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ طویل عرصے تک واپس نہ آنے کے ارادے سے نکلا تھا۔

اس دور میں ناسٹر ڈیمس کے بارے میں معلومات بہت کم ہیں۔ آنے والے چھ برسوں تک وہ اپنے آبائی علاقے سے دور رہا تھا۔ اس کی کچھ تحریروں سے پتا چلتا ہے کہ اس دوران میں وہ سفر کرتا رہا تھا۔ اس نے زمینی راستے سے اٹلی کے معروف شہروں اور مقامات کا سفر کیا۔ وہ لارنس، سسلی اور وینس گیا تھا۔ وہاں وہ مختلف علوم کے ماہرین سے ملا اور خاص طور سے اس نے علمِ فلکیات پر معلومات حاصل کیں ساتھ ہی اس نے اطالوی زبان سیکھی اور اس میں بھی ایسی مہارت حاصل کر لی جیسے کسی اطالوی کے پاس ہو سکتی ہے۔ اس نے فلکیات کے ساتھ اٹلی کے آرٹ کا مطالعہ بھی کیا، مجسمہ سازی اور مصوری سے اسے ان ہی دنوں دلچسپی ہوئی تھی۔ بعد میں اس نے اپنی پیش گوئیوں کے ساتھ کچھ خاکے بھی بنائے تھے۔ وہ ویٹیکن بھی گیا اور اس نے وہاں مختلف مذاہب پر قدیم ترین کتابیں بھی دیکھی تھیں۔ ایسی ہی ایک کتاب کے بارے میں اس نے لکھا ہے۔

''میں اس کتاب کو ویٹیکن کی لائبریری میں موجود پا کر حیران رہ گیا تھا کیونکہ اس کا تعلق یسوع مسیح ؑ کے دور سے تھا اور اس میں بہت ساری ایسی باتیں تھیں جو موجودہ بائبل میں نہیں ہیں۔ صرف بائبل ہی نہیں بلکہ دنیا کی کسی کتاب میں یہ باتیں نہیں ہیں جو میں نے اس کتاب میں دیکھیں، اگر میں ان کو بیان کر دوں تو اتنا بڑا فتنہ کھڑا ہو جائے جسے روکنا ناممکن ہوگا۔ شاید مستقبل میں یہ کتاب یا اس کے کچھ حصے منظرِ عام پر آجائیں یا شاید ایسا کبھی نہ ہو اور اس کتاب کو ہمیشہ کے لیے غائب کر دیا جائے۔''

ناسٹر ڈیمس کی پیش گوئیوں کی طرح اس کی یہ تحریر بھی کم پُراسرار نہیں ہے۔ وہ کون سی کتاب تھی۔ کیا وہ کوئی ایسی بائبل تھی جسے حضرت عیسیٰ ؑ کے کسی حواری نے لکھا تھا اور اس میں عیسائیت کی درست تعلیمات پیش کی گئی تھیں یا دنیا کے مستقبل کے بارے میں ایسی باتیں تھیں جن کے سامنے آنے سے دنیا اور خاص طور سے عیسائی دنیا میں شدید قسم کا انتشار پھیل جاتا جیسا کہ ناسٹر ڈیمس نے نشان دہی کی ہے۔ افسوس کہ ناسٹر ڈیمس نے اس کتاب کے بارے میں مزید کچھ بیان نہیں کیا ہے اور نہ ہی اس نے اپنی پیش گوئیوں میں اس کا ذکر کیا ہے۔

ناسٹر ڈیمس چھ سال وطن سے دور رہا اور اس دوران اسے کہیں ٹک کر بیٹھنے کا موقع نہیں ملا۔ لازمی بات ہے اس کے پاس موجود جمع پونجی بھی رفتہ رفتہ ختم ہوگئی ہوگی اور وہ پہلے بھی وہ دولت مند نہیں تھا۔ جب اس کے پاس موجود رقم ختم ہونے لگی تو وہ روزگار کے لیے فلکی نقشے بنا بنا کر بیچتا رہا تھا۔ یہ نقشے عام طور سے جہاز راں منہ مانگے داموں خرید لیتے تھے کیونکہ کھلے سمندر میں ستاروں کا تعین کرنے کے لیے ان کو نقشوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ یوں اس کی مالی مشکلات آسان ہوتی رہیں۔ نقشے بنانے میں اس کا بہت کم وقت لگتا تھا اس کا مطلب تھا کہ اس کے پاس سفر کے دوران دنیا کو جاننے اور مزید علوم حاصل کرنے کا بہت وقت تھا۔

اس دوران میں وہ اپنے دوستوں اور جاننے والوں سے مکمل طور پر کٹ کر نہیں رہا تھا بلکہ خط و کتابت کے ذریعے اس کا گھر والوں اور دوستوں سے رابطہ رہتا تھا۔ ان سے اسے علم ہوا کہ.... بالآخر چھ سال بعد چرچ کی عدالت نے ناسٹر ڈیمس کے خلاف الزامات کی تحقیقات مکمل کر لی ہیں اور اسے بے قصور قرار دے دیا ہے۔ یہ جانتے ہی وہ واپس لوٹ آیا تھا۔ کہتے ہیں اس سفر کے دوران ہی ناسٹر ڈیمس میں مستقبل دیکھ لینے کی صلاحیت بیدار ہوئی تھی۔ اس سفر سے واپسی پر ناسٹر ڈیمس ایک بالکل بدلا ہوا شخص تھا۔

1546ء میں فرانس سے واپسی کے بعد اس نے آنگس شہر میں سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ اگرچہ ملازمت کی وضاحت نہیں کی گئی ہے لیکن امکان ہے کہ اس کا تقرر بہ حیثیت ڈاکٹر کیا گیا ہو۔ سیاہ طاعون کی وبا ابھی فرانس سے ختم نہیں ہوئی تھی۔ آنگس میں قیام کے دوران وہ طاعون کے مریضوں کا علاج کرتا رہا اور اس بار بھی اس کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا تھا۔ مسلسل کام کر کے وہ تھک گیا تھا اور اس نے سیلون ڈی کروکس منتقل ہونے کا فیصلہ کیا اور وہاں اس نے ایک بار پھر شادی کی۔ ان دنوں اس نے ایک کتاب تحریر کی جس کا نام ''ٹرائٹ ڈیس فرڈیمانز'' ہے۔ اس کا مطلب ہے دنیا کی پہلی طبی ماہرین کی ڈائریکٹری۔ اس ڈائریکٹری میں ناسٹر ڈیمس نے یورپ کے نامور ماہرین طب کے نام، پتے اور ان کے کارناموں کا مختصر احوال بیان

کیا تھا۔

سیلون وہ جگہ ہے جہاں ناسٹر ڈیمس نے اپنی پیش گوئیوں پر کام شروع کیا۔ اگرچہ یہ علم نہیں ہے کہ اس نے کب پیش گوئیوں کو باقاعدہ لکھنا شروع کیا اور ان کو جمع کرتا رہا لیکن 1550ء میں اس نے اپنی پیش گوئیوں کی پہلی المانک شائع کی۔ شائع ہوتے ہی اس کتاب نے سب کی توجہ حاصل کر لی اور اس کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گیا تھا۔ اس کے بعد ناسٹر ڈیمس سالانہ بنیادوں پر اپنی پیش گوئیاں شائع کرتا رہا۔

دوسری شادی کے بعد ناسٹر ڈیمس نے اپنی بیرونِ خانہ سرگرمیاں کم کر دیں اور اس کا زیادہ وقت گھر میں گزرنے لگا تھا۔ وہ اپنے کام کے کمرے میں اکیلا ہوتا تھا اور اس دوران میں وہاں کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ یہاں ناسٹر ڈیمس کی لائبریری بھی تھی جس میں کئی سو کتابیں تھیں۔ کہا جاتا ہے ان دنوں اس نے پھر قدیم پُراسرار علوم کی کتابوں سے رجوع کیا تھا جو اس کے خاندان میں صدیوں سے چلی آرہی تھیں اور جن کی جان سے بڑھ کر حفاظت کی جاتی تھی۔ اب یہ کتابیں ناسٹر ڈیمس کے پاس تھیں اور وہ اپنی مستقبل بینی کی صلاحیتوں کو جِلا دینے کے لیے انہیں استعمال کر رہا تھا۔

1555ء میں ناسٹر ڈیمس نے اپنی پیش گوئیوں پر مبنی پہلی کتاب مکمل کر لی اور اسی سال یہ شائع بھی ہوگئی۔ اس وقت یہ بہت انوکھی چیز تھی۔ عیسائیوں میں پیش گوئی کا کوئی تصور نہیں تھا اور اگر ایسا کرنے والا مخصوص مذہبی پس منظر کا حامل نہ ہوتا تو اس پر جادوگری اور کہانت کے الزامات لگتے تھے اور یہ نہایت سنگین الزامات تھے۔ ثابت ہونے پر کم سے کم سزا بھی موت ہوتی تھی اس لیے ناسٹر ڈیمس کا یہ اقدام جرات مندانہ کہا جا سکتا تھا۔ مگر اس کی خوش قسمتی کہ اس کی کتاب کو بے پناہ پذیرائی ملی اور فرانس کے شاہی خاندان نے بھی اسے سراہا تھا اس لیے اگر کسی کے دل میں ناسٹر ڈیمس کو مذہبی عدالت میں کھینچنے کا خیال بھی آیا تھا تو وہ دل میں رہ گیا اور ایک سال کے اندر ناسٹر ڈیمس کی کتاب پورے یورپ میں مقبولیت کے جھنڈے گاڑ چکی تھی۔

یہ اولین کتاب ساڑھے تین سو پیش گوئیوں پر مبنی تھی جن میں زیادہ تر قریبی زمانے کے بارے میں تھیں اور ان میں سے سب اہم پیش گوئی شاہ فرانس ہیری دوم کی حادثاتی موت کے بارے میں تھی۔ شاید اسی پیش گوئی کی وجہ سے ملکہ فرانس کیتھرائن ڈی میڈیسی نے ناسٹر ڈیمس کو ملاقات کے لیے پیرس بلایا۔ اس وقت وہ مارسلز میں مقیم تھا۔ ملکہ کیتھرائن کے بلاوے پر ناسٹر ڈیمس پیرس پہنچا تو اس کے دل میں بجا طور پر خدشات تھے کہ کہیں ملکہ یا شاہ اس کی پیش گوئی سے ناراض نہ ہو جائیں اور اسے شاہی عتاب کا سامنا کرنا پڑے۔ شاہ اپنے تاج و تخت اور اس کے خلاف کی جانے والی سازشوں کے بارے میں ہمیشہ بہت حساس ہوتے ہیں۔ ناسٹر ڈیمس کو خوف تھا کہ کہیں اس کی پیش گوئی کو شاہی خاندان کے خلاف سازش نہ سمجھ لیا جائے۔

لیکن حیرت انگیز طور پر ایوانِ شاہی میں اس کا شاندار استقبال ہوا اور ملکہ و شاہ فرانس نے اپنے پورے دربار کے ہمراہ اس سے ملاقات کی تھی اور پھر اس کے اعزاز میں ایک شاندار تقریب کا انتظام کیا گیا تھا۔ وہ کئی مہینے تک پیرس میں شاہی مہمان رہا اور اس دوران میں اس کی ملکہ کیتھرائن سے مسلسل ملاقاتیں جاری رہی تھیں۔ ملکہ کیتھرائن اس کی علمیت اور پیش گوئیوں سے اتنی متاثر ہوئی تھی کہ اس نے ناسٹر ڈیمس کو اپنا دوست قرار دے دیا اور وہ روایتی پروٹوکول سے آزاد ہوگیا تھا اب وہ جب چاہتا ملکہ کیتھرائن سے ملاقات کر سکتا تھا۔ ملکہ اس پر اتنی مہربان ہوئی کہ اسے شاہ ہیری دوم کا ذاتی معالج اور مشیر مقرر کرا دیا۔ اگرچہ یہ عہدہ محض نمائشی تھا اور ہیری دوم نے شاید ہی کبھی ناسٹر ڈیمس سے علاج کرایا ہو یا اس سے کوئی مشورہ کیا ہو۔ البتہ اس کا سارا فائدہ ناسٹر ڈیمس کو ہوا۔ اسے کچھ کیے بغیر شاہی خزانے سے بھاری تنخواہ ملنے لگی تھی۔

دوسری طرف وہ مارسلز میں اپنی خدمات انجام دے رہا تھا۔ 1557ء میں فرانس کے اس علاقے کو تاریخ کے بد ترین سیلاب کا سامنا کرنا پڑا اور سیلاب کے بعد پانی سے طاعون کی وبا بے پناہ تیزی سے پھیلی تھی۔ روزانہ ہزاروں افراد لقمۂ اجل بننے لگے تھے اور گاؤں کے گاؤں اس وبا کی نذر ہو گئے تھے۔ بعض علاقوں میں تو میلوں تک ایک فرد بھی زندہ نہیں بچا تھا۔ ان دنوں ناسٹر ڈیمس اپنے کام کو بھول کر ایک بار پھر معالج کے روپ میں لوگوں کو بچانے کی جدوجہد میں لگ گیا تھا۔ یہ بے پناہ مصروفیت کا دور تھا اور وہ چوبیس گھنٹے میں سے بہ مشکل دو تین گھنٹے سو پاتا تھا۔ یہ ساری جدوجہد اور کوشش وہ بغیر کسی صلے کے کر رہا تھا کیونکہ اسے کام کرنے کے عوض صرف تنخواہ ملتی تھی اور وہ اپنے مریضوں سے کسی قسم کی کوئی فیس نہیں لیتا تھا۔ حالانکہ وہ چاہتا تو اس دور میں دوسرے ڈاکٹروں کی طرح بہت زیادہ دولت کما سکتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ طاعون سے دہشت زدہ لوگ اس کے علاج کے لیے اپنا سب کچھ دینے کو تیار ہو جاتے تھے۔ اسے شہرت کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس کی کتاب نے پہلے ہی اسے پورے یورپ میں مشہور کر دیا تھا اور اس کے پاس عام لوگوں، آسٹرولوجی اور فلکیات کے ماہرین کے خطوط آنے لگے تھے، وہ اس سے اس کے علم کے بارے میں سوال کرتے تھے۔

خاص طور سے آسٹرولوجی کے ماہرین جاننا چاہتے تھے کہ وہ کس طرح پیش گوئی کرتا ہے۔ کیونکہ اس کی پیش گوئی کرنے کا انداز بہت منفرد تھا۔ وہ بنا کسی ہیر پھیر کے بہت سادہ سے انداز میں اشعار میں پیش گوئی کرتا تھا اور اس کی پیش گوئی اتنی واضح اور آسان ہوتی کہ ایک عام اور معمولی ذہانت والا آدمی بھی سمجھ جاتا تھا کہ وہ کس کے بارے میں یا کس واقعے کے بارے میں پیش گوئی کر رہا ہے۔ بہ شرط کہ وہ واقعہ ابھی دور ہو۔ جیسے شاہ فرانس ہیری دوم کی حادثاتی موت کی پیش گوئی تھی۔ اس کی کتاب میں پڑھنے والا ہر فرد جان گیا تھا کہ یہ شاہ فرانس کے بارے میں ہے۔ اس کی بعض پیش گوئیاں جو نا قابلِ فہم تھیں بعد میں بدلتے حالات اور واقعات کے ساتھ قابلِ فہم ہو گئی تھیں۔

اس نے اپنی کتاب میں اس چیز کا حوالہ نہیں دیا تھا کہ وہ یہ پیش گوئیاں کس علم کے سہارے اور کن اصولوں کی بنیاد پر کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسے علمِ نجوم کی تمام شاخوں پر مکمل عبور حاصل تھا۔ پھر وہ فلکیات کا ماہر تھا لیکن اس کی پیش گوئیوں کا انداز اس میں سے کسی علم سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ اس کا انداز علمی سے الہامی ہوتا تھا ایسا لگتا جیسے اس کی آنکھیں مستقبل میں ہونے والے واقعے کو بالکل اسی طرح دیکھتی تھیں جیسے اسے ہونا ہوتا تھا اور پھر وہ اسے مصرعوں کی صورت میں بیان کر دیتا تھا لیکن اس میں بھی وہ ہیر پھیر سے کام نہیں لیتا تھا بلکہ سادہ ترین الفاظ استعمال کرتا تھا۔ اس کے باوجود اس کے فقروں میں شعری شان و شوکت ملتی تھی اور وہ فنِ شاعری کی تمام نزاکتوں پر پورا اترتے تھے۔

ناسٹرڈیمس کو شاہی خاندان کا جو قرب حاصل ہوا تھا اگر وہ کسی اور فرانسیسی کو حاصل ہوتا تو وہ اس کے بعد ساری عمر پیرس سے باہر نہ جاتا لیکن ناسٹرڈیمس صرف اس وقت پیرس جاتا تھا جب اسے وہاں طلب کیا جاتا تھا۔ مارسلز کی بحالی میں اس نے دن رات کام کیا اور جب سیلاب اور اس کے ساتھ آنے والے طاعون کی وبا پھیل گئی تو اس نے پیرس جانے کے بجائے سیلون کا رخ کیا۔ چند سال پہلے اس نے وہاں ایک قصبہ دیکھا تھا تو اسے لگا تھا جیسے یہی وہ جگہ ہے جہاں وہ زندگی کے باقی ایام گزار سکتا ہے۔ پوائزنری نامی اس قصبے میں وہ گھر آج بھی موجود ہے جس میں ناسٹرڈیمس نے اپنی زندگی کے باقی دن گزارے اور یہیں اس نے اپنی پیش گوئیوں کا بڑا حصہ تحریر کیا جو اس کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے سیزر نے شائع کرایا۔

ناسٹرڈیمس کی دوسری بیوی ایک دولت مند بیوہ تھی، اپنے پونسارٹ گیملے نہ صرف دولت مند بلکہ بے حد خوب صورت تھی۔ ناسٹرڈیمس حسن پرست آدمی تھا اور اس نے پہلی شادی بھی ایک بہت خوب صورت لڑکی سے کی تھی۔ اپنے سے ناسٹرڈیمس کے چھ بچے ہوئے۔ پوائزنری منتقل ہونے کے بعد ناسٹرڈیمس دل جمعی سے پیش گوئیوں کے کام کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے پیش گوئیوں کی سالانہ المانک شائع کرنا شروع کی۔ اس کی المانک نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی اور اس کی اشاعت سے ناسٹرڈیمس کو خاصی آمدنی ہوئی تھی۔ مگر اس کا مقصد پیش گوئیوں سے کمانا نہیں تھا۔ اس نے 1550ء سے اپنی پیش گوئیوں کو سالانہ بنیادوں پر ترتیب دینا شروع کر دیا۔ وہ ہر سال کی پیش گوئیوں کی ایک المانک شائع کرتا تھا اور درحقیقت یہی المانک اس کی پہلی کتاب کی بنیاد تھی۔

اس گھر میں ناسٹرڈیمس نے سب سے اوپر والے حصے میں اپنا مخصوص کمرا بنوایا جو چاروں طرف سے کھلا تھا اور اس تک آنے کے لیے گول زینوں والی سیڑھی بنائی گئی تھی۔ اس کمرے کی مخصوص کھڑکیاں چاروں ستوں میں کھلتی تھیں لیکن ناسٹرڈیمس نے شاذ ہی انہیں کھولا ہو۔ وہ دن کی تیز روشنی میں بھی کھڑکیوں پر دبیز پردے ڈال کر رکھتا تھا اور نیم تاریک کمرے میں اپنی میز پر ایک موم بتی جلا کر اس کی روشنی میں کام کرتا تھا۔ اسی کمرے میں اس کی وہ کتابیں تھیں جو کام میں اس کی مددگار ہوتی تھیں۔ اس کا کہنا ہے کہ پیش گوئیوں کے کاموں میں جس کتاب نے سب سے زیادہ مدد کی اس کا نام ''ڈی مسٹریز ایچٹورم'' ہے۔ یعنی مصر کی پُر اسراریات۔

ناسٹرڈیمس کے پاس صرف یہی نہیں بلکہ قدیم مصری علوم سے تعلق رکھنے والی بے شمار کتابیں تھیں۔ واضح رہے کہ یہودیوں میں جادوگری مصر سے آئی تھی کیونکہ جب تک یہ مصر نہیں گئے تھے تو بنی اسرائیل سادہ قوم تھے اور اللہ کی عبادت

کرنے کے ساتھ یہ انبیائے کرامؑ کی لائی شریعت کی پیروی کرتے تھے اور ظاہر ہے کسی قسم کے جادو ٹونے سے دور تھے۔ لیکن جب یہ مصر پہنچے اور وہاں جادوگروں کو دیکھا تو عہدِ غلامی میں یہ ان سے متاثر ہوئے اور خود بھی جادوگری کرنے لگے تھے۔ جب یہ مصر سے نکالے گئے تو ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو بہ ظاہر بنی اسرائیلی تھے اور ایک خدا کو مانتے تھے لیکن اندر سے ان کے عقائد مصریوں جیسے تھے۔ یہی لوگ اپنے ساتھ جادو ٹونے کے طریقے لائے اور ان کو تحریر کر کے کتابی صورت دی۔ یہ کتابیں ان لوگوں کے پاس نسل در نسل چلی آئی تھیں اور یہ سوائے اپنے خاندان کے مخصوص لوگوں کے کسی کو ان کتابوں یا جادوگری کے طریقوں کی بھنک بھی نہیں لگنے دیتے تھے۔

پھر بخت نصر نے بیت المقدس پر حملہ کیا۔ ہیکل سلیمانی تباہ کر دیا اور پورے شہر کو آگ لگا کر پیوندِ زمین کر دیا۔ اس نے بنی اسرائیل کا قتلِ عام کیا اور بچ جانے والوں کو غلام بنا کر ساتھ لے گیا۔ یہ وہی بخت نصر ہے جس نے ہیکل سلیمانی کے مقدس برتن بھی لوٹ لیے تھے اور اس کے بعد آنے والے شاہ بابل نے ان مقدس برتنوں میں شراب نوشی کی تھی جس پر اس کے دربار کی دیوار پر ایک غیبی ہاتھ نے اس کی تباہی کے الفاظ لکھ دیے تھے اور بعد میں یہ الفاظ پورے ہوئے، نوشتہ دیوار کا لفظ اسی واقعے سے نکلا ہے۔ مصر کی طرح بابل بھی اس وقت دیوی دیوتاؤں اور کاہنوں و جادوگروں کی سرزمین سمجھا جاتا تھا۔ بنی اسرائیل یہاں بھی غلام بنا کر لائے گئے تھے اس لیے یہاں بھی وہ کمزور اور مرعوب تھے۔ دوسرے بخت نصر نے توریت کے تمام نسخے تباہ کر دیے تھے اور چن چن کر علما کو قتل کرا دیا تھا اس لیے عام بنی اسرائیلی توریت اور اپنا مذہب بھول گئے تھے۔ وہ جادوگروں اور کاہنوں کے چکر میں پڑ گئے۔ بعد میں حضرت دانیالؑ نے ان کو توریت لکھوائی اور یاد کرائی اور کوروش اعظم کے زمانے میں ان کو بیت المقدس واپسی کی اجازت ملی۔ تب واپس آنے والے بہت سارے یہودی جادوگری کے طریقے سیکھ کر آئے اور انہوں نے ان طریقوں کو قلم بند بھی کیا۔

جب رومنوں نے ایک بار پھر بیت المقدس کو تباہ کیا اور یہودیوں کو جلاوطن کر کے ساری دنیا میں منتشر کر دیا۔ تب بہت سارے یہودی یورپ چلے گئے۔ لیکن وہ خاص یہودی جو جادوگری کرتے تھے، جزیرہ نما عرب میں چلے آئے اور مدینہ کے آس پاس آباد ہو گئے جہاں ان کی کتابوں اور انبیائے کرامؑ کی پیش گوئیوں کے مطابق آخری نبی ﷺ کو تشریف لانا تھا۔ یورپ جانے والے زیادہ تر اٹلی میں آباد ہوئے لیکن یہ ملک ان کے لیے عذاب گھر بن گیا اس لیے یہ اٹلی سے بھی آگے نکلے۔ اسپین میں مسلمانوں کے زیرِ سایہ سکون سے زندگی گزارنے کے باوجود یہ سازشوں سے باز نہیں آئے اور اکثر عیسائی فوج کا خرچ یہی یہودی برداشت کرتے تھے تاکہ مسلم حکومت کا خاتمہ کیا جا سکے۔ جب اسپین میں مسلمانوں کی حکومت ختم ہوئی اور پھر مسلمان بھی باقی نہ رہے تو عیسائیوں کا رخ یہودیوں کی طرف ہوا اور ان پر ظلم و ستم ڈھائے جانے لگے۔ خاص طور سے ان یہودیوں کو نشانہ بنایا جانے لگا جو کسی طور علمی یا مذہبی حیثیت کے حامل تھے۔ یہودیوں کی کتابیں تلاش کر کے نذرِ آتش کی جانے لگیں تو انہیں خطرہ ہوا کہ ان کی قدیم مذہبی کتب اور خاص طور سے پُر اسرار علوم کی کتابیں ناپید نہ ہو جائیں اس لیے اسپین کے یہودی مغربی یورپ کے دوسرے ممالک کا رخ کرنے لگے۔ ان میں ایک ناسٹرڈیمس کا خاندان بھی تھا۔

یہودی، عیسائی ہو جانے والے ہم مذہبوں سے کتنی نفرت کرتے ہیں اس کا اندازہ قرونِ وسطیٰ کے ان کنورٹیڈ عیسائیوں کی حالتِ زار سے لگایا جا سکتا ہے جو کسی یہودی مملکت میں رہتے تھے۔ کون سا ایسا ظلم تھا جو ان پر نہیں کیا جاتا تھا۔ پھر ایسی کیا وجہ ہے کہ یہودی سے عیسائی ہو جانے والا ناسٹرڈیمس آج تک یہودیوں کا چہیتا ہے اور اسرائیل میں اس کی پیش گوئیوں پر باقاعدہ یونیورسٹیز کی سطح پر کام ہو رہا ہے۔ یہودی فلم ساز اور میڈیا مین اس پر فلمیں اور پروگرام بناتے ہیں اور یہودی اسکالر اس پر کتابیں اور مضامین لکھتے ہیں۔ ناسٹرڈیمس اور اس کے خاندان کے ساتھ اسرائیل کا تعلق وہی ہے جو بوسنیا کے یہودی سے مسلم ہو جانے والے قبیلے کے ساتھ ہے۔ جب تک ترکی پر اس قبیلے کے جنرلوں اور صدور کی حکومت رہی ترکی اور اسرائیل کے تعلقات بھی مثالی رہے اور جیسے ہی اس قبیلے کی سیادت کا خاتمہ ہوا ترکی اسرائیل کے لیے ایک دشمن ملک بن گیا۔ جیسے کمال اتاترک یہودیوں کا چہیتا تھا بالکل اسی طرح ناسٹرڈیمس آج یہودیوں کا پسندیدہ شخص ہے۔ کیونکہ اس کی پیش گوئیوں میں اسرائیل کے قیام اور یہودیوں کے دنیا پر غلبے کا واضح ذکر موجود ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہودیوں کے منصوبہ ساز مستقبل کے منصوبے ناسٹرڈیمس کی پیش گوئیوں کو سامنے رکھ کر بناتے ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

☆☆☆

ناسٹرڈیمس یورپ اور فرانس میں ایک پیش گو کے طور پر مشہور ہو چکا تھا۔ اگرچہ کتاب کے اولین حصے میں اس وقت سے لے کر دنیا کے خاتمے کے وقت تک کی پیش گوئیاں تھیں لیکن ناسٹرڈیمس نے بعد میں اپنی پیش گوئیوں کو منظم کیا اور آنے والے سالوں کے حساب سے ان کو ترتیب دیا۔ اس نے سو سو پیش گوئیوں کو جمع کیا اور ان کو سنچری یا صدی کا نام دیا۔ لیکن اس سے مراد سو سال والی صدی نہیں ہے کیونکہ خود ناسٹرڈیمس سولہویں صدی میں تھا اور اس نے اپنی پیش گوئیوں میں اکیسویں صدی کو دنیا کے خاتمے کی صدی قرار دیا ہے یعنی اس کی وفات کے پانچ سو سال کے اندر دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اصل میں سنچری سے مراد سو پیش گوئیاں ہیں۔ اس نے دس سنچریاں ترتیب دیں جن میں دنیا سے متعلق ایک ہزار پیش گوئیاں ہیں اور ان میں سے اکثر پوری ہو چکی ہیں۔ جیسے پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کی پیش گوئیاں، ہٹلر اور مسولینی کی صورت میں یورپ میں دو خوف ناک آمروں کی پیش گوئی، صدر کینیڈی اور اس کے بھائی رابرٹ کینیڈی کے قتل کی پیش گوئی، اس سے پہلے ابراہام لنکن کے قتل کی پیش گوئی وغیرہ۔

ناسٹرڈیمس کیونکہ فرانسیسی، لاطینی، یونانی اور اطالوی زبانوں کا ماہر تھا اس لیے اس نے اپنی پیش گوئیوں میں ان زبانوں کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ شاعری اور زبان کے لحاظ سے اس کی پیش گوئیاں مشکل نہیں ہیں اور نہ ہی اس نے روایتی پیش گوؤں کی طرح مبہم الفاظ استعمال کیے ہیں البتہ اس نے اپنی پیش گوئیوں میں وقت کا ابہام برقرار رکھا ہے اور اس کی بہت کم پیش گوئیوں میں وقت کی نشان دہی کی گئی ہے۔ اس کی اولین کتاب میں اس کی ساری پیش گوئیاں نہیں تھیں بلکہ اس میں صرف تین سنچریوں اور چوتھی سنچری کی آدھی پیش گوئیاں تھیں۔ لیکن ان پیش گوئیوں نے غیر معمولی تیزی سے ناسٹرڈیمس کو فرانس اور یورپ میں مقبولیت بخشی تھی۔

مگر اس کی شہرت اور پیش گوئیوں نے اسے کچھ مشکلات کا شکار بھی کیا تھا۔ جب وہ پہلی بار فرانس گیا اور ملکہ کیتھرائن نے اس سے اکیلے میں ملاقات کی تو اس کا کوئی عینی شاہد موجود نہیں ہے کہ ملکہ اور ناسٹرڈیمس دو گھنٹے تک کیا بات کرتے رہے لیکن امکان یہی ہے کہ ملکہ کیتھرائن اس کی ان پیش گوئیوں کے بارے میں بات کرنا چاہتی تھی جو اس نے شاہی خاندان کے بارے میں کی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ ملکہ کیتھرائن جاننا چاہتی تھی کہ کیا وہ واقعی مستقبل کو دیکھ لیتا ہے یا اس کی پیش گوئیوں کے پس پشت کوئی اور معاملہ ہے۔ اس ملاقات میں ناسٹرڈیمس نے نہ صرف ملکہ کو مطمئن کر دیا بلکہ وہ اس سے اتنی متاثر ہوئی کہ اسے شاہ کا معالج اور مشیر بھی مقرر کر دیا۔ اس کی یہ حیثیت فرانس کے آنے والے مزید دو شاہوں فرانسس دوم اور چارلس چہارم کے دور میں بھی برقرار رہی تھی۔

دوسری بار ملکہ کیتھرائن نے اسے پیرس طلب کیا۔ اس بار ملکہ اس سے اپنے سات بچوں کے زائچے بنوانا چاہتی تھی کیونکہ وہ ان کے بارے میں بھی ناسٹرڈیمس کی پیش گوئیوں سے پریشان تھی۔ ناسٹرڈیمس نے ان کے بارے میں بھی پیش گوئی کی تھی کہ ان میں اکثر پریشانیوں میں مبتلا رہیں گے اور کئی حادثاتی موت کا شکار ہوں گے۔ البتہ اس نے ایک پیش گوئی کی کہ ملکہ کیتھرائن کے تمام لڑکے بادشاہ بنیں گے۔ یہ پیش گوئی یوں غلط ثابت ہوئی کہ ایک شہزادہ مارکوئیس بادشاہ بننے سے پہلے مر گیا تھا۔ ناسٹرڈیمس نے جو زائچے بنائے تھے انہوں نے شاہی خاندان اور اس کے حامیوں کو مضطرب کر دیا تھا اور اچانک ہی ناسٹرڈیمس کو اطلاع ملی کہ پیرس کی عدالت اس کے خلاف جادوگری کے الزام میں تحقیقات کا حکم دینے والی ہے۔ یہ سنتے ہی ناسٹرڈیمس نے واپسی کا سفر اختیار کیا اور سیلون آ گیا۔

اس دوران میں اسے پھیپھڑوں کی سوزش اور سانس کی بیماری ہوئی تھی اور وہ بستر پر دراز ہو گیا لیکن اس کیفیت میں بھی اس نے اپنا کام نہیں چھوڑا تھا۔ وہ ملنے کے لیے آنے والوں کے زائچے بناتا رہا اور اس دوران میں اس نے متعدد نامور شخصیات کے زائچے بنائے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی پیش گوئیوں کا سلسلہ بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔ اس کی بعض پیش گوئیاں حتمی ہونے سے پہلے بعض رسائل میں شائع ہوئی تھیں۔ بعد میں جب ان کو مکمل صورت میں 1568ء میں شائع کیا گیا تو ان پیش گوئیوں کو کسی قدر تبدیل کیا گیا تھا۔ ناسٹرڈیمس کی تمام پیش گوئیوں کی حتمی کتاب اس کی موت کے دو سال بعد شائع ہوئی۔

شاہی خاندان کے بارے میں اس کی پیش گوئیاں اس کی عمر کے آخری دور میں یکے بعد دیگرے درست ثابت ہونے لگیں۔ پہلے 1559ء شاہ ہیری کا انتقال ہوا اور اگلے ہی برس 1560ء میں فرانسس دوم کا بھی انتقال ہو گیا۔ ان حادثات نے ناسٹرڈیمس کو ایک بار پھر سب کی توجہ کا مرکز بنا

دیا اور ایک موقع پر اس بات کا امکان بھی پیدا ہو چلا تھا کہ اسے اپنی پیش گوئیوں کے حوالے سے عدالت میں پیش ہونا پڑے لیکن اس کی خراب صحت اور شاید شہرت کی وجہ سے عدالت نے اسے زحمت نہیں دی تھی۔ ناسٹرڈیمس کے ماننے والے اسے اس کی روحانی صلاحیتوں کی دلیل کہتے ہیں۔ حالانکہ اس نے شاہی خاندان اور فرانس میں بادشاہت کے بارے میں بڑی خوفناک پیش گوئیاں کی تھیں جن میں انقلاب فرانس کی پیش گوئی بھی شامل تھی اور اس نے اس انقلاب کا بڑا تفصیلی نقشہ کھینچا ہے۔ جس میں فرانس کا اوپری طبقہ مکمل طور پر نیست و نابود ہو جائے گا اور فرانس کلیسا کی گرفت سے نکل جائے گا۔ ظاہر ہے اس کی یہ پیش گوئیاں اعلیٰ طبقے اور خاص طور سے کلیسائی حکام کو کسی صورت ہضم نہیں ہونی چاہیے تھیں۔ مگر ناسٹرڈیمس کی خوش قسمتی کہ اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی تھی۔ شاید ایک وجہ تو یہ تھی کہ ناسٹرڈیمس اور ملکہ کیتھرائن کی دوستی بہت مضبوط تھی۔ اس کا ثبوت اس کے خلاف ہونے والی عدالتی کارروائی... بالآخر بے نتیجہ ثابت ہوئی تھی۔ ورنہ عام طور سے جس کے خلاف جادوگری کے الزام میں عدالتی کارروائی شروع ہو جاتی تھی وہ مجرم قرار پاتا تھا اور اسی خوف سے ناسٹرڈیمس پیرس سے بھاگ نکلا تھا۔ وہ اس وقت تک دوبارہ پیرس نہیں گیا جب تک عدالتی کارروائی ختم نہیں ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے وہ چھ سال تک گھر اور ملک سے دور رہا تھا۔ گویا اس کے دل میں کہیں یہ بات موجود تھی کہ اس کے خلاف جادوگری کا الزام ثابت ہو سکتا ہے۔

ملکہ کیتھرائن پر ناسٹرڈیمس کا اثر اتنا زیادہ تھا کہ ایک طرف تو شاہی خاندان کے بارے میں اس کی پیش گوئیاں پوری ہو رہی تھیں اور دو شاہ فرانس یکے بعد دیگرے موت کی نیند سو چکے تھے اور دوسری طرف ملکہ اسی طرح اس کی عقیدت مند تھی۔ 1564ء میں ملکہ کیتھرائن نے جو اَب ریجنٹ ملکہ تھی ملک بھر کے دورے کا فیصلہ کیا۔ وہ جہاں بھی گئی وہاں کے حکام اور لوگ اس سے ملنے آئے لیکن جب وہ سیلون آئی تو خود ناسٹرڈیمس سے ملنے اس کی رہائش گاہ پہنچی۔ ناسٹرڈیمس بیمار تھا۔ ملکہ نے اس کی عیادت کی اور اسے ملک کے جنرل فزیشن کا خطاب دیا۔ اس خطاب کے ساتھ بھاری بھرکم تنخواہ اور جاگیر بھی تھی۔ اب ناسٹرڈیمس ملک کا سب سے بڑا ڈاکٹر تھا۔

اس کے مرض کی شدت بڑھتی جا رہی تھی اور 1566ء کے آغاز میں اس کے ڈاکٹر نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ اب زیادہ دن زندہ نہیں رہے گا۔ جون کے مہینے کے آغاز میں وہ زیادہ تر بستر پر رہنے لگا تھا کیونکہ اب اس کے لیے اٹھنا بیٹھنا بھی محال ہو گیا تھا۔ اس حالت میں بھی اس نے پیش گوئیوں کا کام جاری رکھا تھا لیکن ان کو تحریر کی صورت میں لانے کا کام بہت سست تھا۔ کیونکہ وہ لکھنا خود پسند کرتا تھا اور اپنی بات کسی اور کی تحریر میں محفوظ کرنا اسے پسند نہیں تھا۔ ممکن ہے اس وجہ سے اس کی کئی پیش گوئیاں تحریر میں نہ آ سکی ہوں اور آج ان کا کوئی وجود باقی نہیں ہے۔ بہرحال اس کی جتنی بھی پیش گوئیاں اس وقت دنیا میں موجود ہیں وہی ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ ناسٹرڈیمس سچ مچ مستقبل میں جھانکنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

17 جون کے دن اس نے اٹھنے اور چلنے پھرنے کی کوشش کی تو اس کی طبیعت بگڑ گئی اور اس کے منہ سے بہت سارا خون نکلا تھا۔ اس وقت ناسٹرڈیمس کو یقین ہو گیا کہ وہ اب زندہ نہیں رہے گا۔ پہلی جولائی کو اس نے مقامی پادری کو بلا بھیجا کہ وہ آ کر اس کے لیے آخری دعا کرے۔ یہ پادری اس کا واقف کار اور اچھے دوستوں میں سے تھا جب وہ دعا کر کے واپس جانے لگا تھا تو ناسٹرڈیمس نے اس سے کہا۔ ”دوست تم مجھے دوبارہ زندہ نہیں دیکھو گے۔ کل صبح کا سورج طلوع ہو گا تو میں اس دنیا میں نہیں ہوں گا۔“

اپنے بارے میں اس کی یہ پیش گوئی اس کی آخری پیش گوئی بھی ثابت ہوئی۔ اگلی صبح وہ اپنے بستر اور ایک بینچ کے درمیان مردہ حالت میں پایا گیا۔ رات کسی وقت اس کا انتقال ہو گیا تھا شاید اس کی طبیعت خراب ہوئی تو وہ مدد لینے کے لیے بستر سے اٹھا اور پھر فرش پر گر پڑا اسی حالت میں اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ ناسٹرڈیمس کے مرنے کی خبر آگ کی طرح پورے فرانس میں پھیل گئی اور لوگ اس کی تعزیت اور آخری رسوم میں شرکت کے لیے سیلون آنے لگے تھے۔ اسے اس کی وصیت کے مطابق مقامی چرچ کی چار دیواری کے اندر ایک بلند جگہ دفن کیا گیا تھا۔ اس کی بیوہ اینے نے اس کی قبر پر سنگ مرمر سے بنی یادگار تعمیر کرائی تھی جو اَب بھی برقرار ہے۔ اینے نے اس یادگار کتبے پر جو الفاظ لاطینی زبان میں لکھوائے تھے ان کا ترجمہ کچھ یوں ہے۔

”یہاں اس ناسٹرڈیمس کی ہڈیاں دفن ہیں جو اپنی روحانی صلاحیتوں اور شرافت میں یکتا تھا۔ اس نے اپنی صلاحیتوں اور ستاروں کی رہنمائی میں مستقبل کے واقعات کے بارے میں جو جانا، جو واقعات ساری دنیا میں ہونے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

والے ہیں انہیں پوری ایمانداری سے بیان کر دیا۔ وہ باسٹھ برس چھ مہینے اور سترہ دن زندہ رہا اور 1566ء میں سیلون میں انتقال کر گیا۔ اب کوئی اسے تنگ نہ کرے۔ اپنے پونسارٹ کیملے چاہتی ہے اس کا شوہر ہمیشہ خوش رہے۔''

یہ عام قسم کے الفاظ ہیں اور ممکن ہے خود اپنے نے لکھوائے ہوں۔ ناسٹر ڈیمس کے مرنے کے بعد اس کے بارے میں کئی کہانیاں مشہور ہونے لگیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اس کے تابوت میں لاش پر ایک عدد خفیہ دستاویز رکھی گئی ہے جو اس کی پیش گوئیوں کو ڈی کوڈ کر سکتی ہے۔ ناسٹر ڈیمس نے اسے اپنے تابوت میں رکھنے کی وصیت کی تھی۔ یہ بات اتنی زیادہ مشہور ہوئی کہ اس کی وفات کے کوئی چونتیس سال بعد 1600ء میں اس کے تابوت کو قبر سے نکال کر چرچ میں لے جایا گیا اور اسے بہت احتیاط سے کھولا گیا لیکن تابوت کے اندر سے ایسی کوئی دستاویز برآمد نہیں ہوئی تھی۔ اس میں بس ناسٹر ڈیمس کا ڈھانچا تھا۔ تابوت کو دوبارہ بند کر کے قبر میں ڈال دیا گیا۔ یہ کام مقامی حکام نے کیا تھا اس لیے ناسٹر ڈیمس کے اہلِ خانہ میں سے کسی کو اعتراض کی جرات نہیں ہوئی تھی۔

انقلاب فرانس کے دوران 1789ء میں انقلابیوں کے ایک دستے نے اس چرچ پر حملہ کیا اور اندر گھس کر انہوں نے وہاں موجود ان تمام افراد کی قبروں کو کھود ڈالا جن کا تعلق کسی طرح بھی شاہی خاندان یا طبقہ امراء سے بنتا تھا ظاہر ہے ان کا اولین نشانہ ناسٹر ڈیمس کی قبر تھی کیونکہ وہ شاہی خاندان کے بہت قریب تھا۔ سپاہیوں نے اس کی قبر کھود ڈالی اور اس کا ڈھانچا باہر نکال لیا۔ پھر ایک سپاہی نے اعلان کیا کہ وہ ناسٹر ڈیمس کی کھوپڑی میں شراب پیے گا اور انقلاب کا جشن منائے گا۔ اس نے ناسٹر ڈیمس کی کھوپڑی میں شراب ڈالی اور ابھی اسے پی رہا تھا کہ کسی طرف سے گولی چلی اور وہ سپاہی وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کے باقی ساتھی خوف زدہ ہو کر وہاں سے بھاگ نکلے تھے۔ کچھ دیر میں سرکاری فوجی دستہ وہاں آ گیا اور اس نے بچے کھچے باغیوں کو بھی مار بھگایا اور جن قبروں کو کھود دیا گیا تھا ان کو دوبارہ بند کیا۔ لیکن اس بار ناسٹر ڈیمس کو ایک اور جگہ لے جا کر دفنایا گیا تھا۔ یہ جگہ اب چرچ کی دیوار کے باہر بنتی ہے۔

ناسٹر ڈیمس نے باسٹھ برس چھ ماہ کی عمر پائی، اس دور کے لحاظ سے یہ بڑی معقول عمر تھی خاص طور سے اس لیے بھی کہ صحت عامہ تو خراب تھی ہی، اوپر سے طاعون نے قیامت مچا رکھی تھی اور نصف صدی کے دوران ہر تیسرے فرانسیسی کی موت طاعون سے ہوئی تھی۔ کم و بیش ایک کروڑ فرانسیسی اس وبا کی نظر ہو گئے تھے۔ جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ خود ناسٹر ڈیمس کی پہلی بیوی اور اس سے دو لڑکے طاعون کے مرض کے ہاتھوں زندگی ہار گئے۔ اس کے دوستوں اور جاننے والوں کی ایک بڑی تعداد طاعون کا شکار ہوئی تھی اور ڈاکٹر ہونے کے ناتے ناسٹر ڈیمس صبح سے شام تک طاعون کے مریضوں میں گھرا رہتا تھا۔ وہ ان کو چھوتا اور ان کا علاج کرتا تھا اس کے باوجود وہ اس موذی مرض سے محفوظ رہا۔ قدرت نے اسے کسی اور کام کے لیے پیدا کیا تھا اور اسی وجہ سے اسے طویل عمر دی۔ شاید اسے بھی معلوم تھا کہ وہ اتنی جلدی نہیں مرے گا اس لیے دوسرے ڈاکٹروں کی نسبت جو طاعون کے مریضوں کا علاج کرنے اور ان کے پاس جانے سے گھبراتے تھے وہ بلا جھجک ان کے پاس چلا جاتا اور ان سے میل ملاقات بھی کرتا تھا۔

☆☆☆

ناسٹر ڈیمس کی پیش گوئیوں پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس نے اکثر واقعات کی تاریخوں پر روشنی نہیں ڈالی ہے۔ اس کی پیش گوئیوں میں واقعات و شخصیات بڑی وضاحت سے موجود ہیں لیکن اس کا کوئی ذکر نہیں تھا کہ ان واقعات یا شخصیات کا ظہور کب ہو گا۔ لیکن اگر ہم اس وقت دستیاب کلینڈرز پر نظر ڈالتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ یورپ میں ابھی تک جولین کلینڈر جاری تھا جو جولیس سیزر نے ترتیب دیا تھا اور اس میں شدید قسم کی کمزوریاں تھیں اور یہ شمسی معیار پر پورا نہیں اترتا تھا۔ اسلامی دنیا میں ہجری کلینڈر رائج تھا جو چاند کی تاریخوں پر مبنی ہوتا ہے اور اس کا بھی شمسی درستگی سے تعلق نہیں بنتا ہے۔ اس وقت دستیاب سب سے بہترین کلینڈر عمر خیام کا بنایا ہوا تھا لیکن یہ کلینڈر بدقسمتی سے دنیا میں کہیں رائج نہیں تھا ورنہ درستگی کے لحاظ سے یہ گریگورین کلینڈر سے بھی بہتر ہے اور اس میں پونے چھ ہزار سال میں جا کر ایک دن کا فرق آتا ہے۔ جب کہ گریگورین کلینڈر میں یہ فرق چند سو سال میں آ جاتا ہے جسے ایک دن بڑھا کر درست کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ناسٹر ڈیمس صرف جولین کلینڈر سے واقف تھا اور اس کی مستقبل کی پیش بینی نے شاید اسے بتا دیا تھا کہ کچھ عرصے بعد یہ کلینڈر یورپ میں ترک کر دیا جائے گا۔ اس لیے اس نے جولین کلینڈر استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی۔ سوائے چند پیش گوئیوں کے کسی پیش گوئی میں سن کا ذکر نہیں ہے۔

جولین کلینڈر کی خامیوں کی وجہ سے ناسٹر ڈیمس مجبور ہو گیا تھا کہ وہ سال کا حوالہ نہیں دے سکتا تھا کیونکہ اس سے غلطی کا امکان ہو سکتا تھا۔ مہینوں کا حوالہ بھی دینا دشوار تھا کیونکہ مہینے کئی سالوں بعد مختلف دن کے ہو جاتے تھے۔ اس لیے اس نے عام طور سے ابتدائی تاریخوں کا حوالہ دیا ہے۔ اس نے مہینے کے پہلے دن کے لیے کلینڈ کا لفظ استعمال کیا ہے جس کے معنی بھی یہی ہیں۔ اس کے علاوہ اس نے ہفتوں کا حوالہ دیا ہے جیسے مہینے کا پہلا ہفتہ یا دوسرا ہفتہ۔

ناسٹر ڈیمس کی وفات کے سولہ سال بعد پاپ گریگری ہشتم نے جولین کلینڈر میں اصلاح کی اور اپنا گریگری کلینڈر ترتیب دیا۔ جسے وسطی یورپ اور مشرقی یورپ کے ان ممالک نے فوراً اپنا لیا جو کیتھولک کلیسا کے ماتحت تھے۔ ان میں فرانس بھی شامل تھا لیکن کئی مغربی یورپی ممالک اور آرتھوڈوکس چرچ کے ماتحت یورپی ممالک نے اس کلینڈر کو اپنانے سے انکار کر دیا کیونکہ اس میں بھی خامیاں موجود تھیں۔ جولین کلینڈر تو خیر خامیوں سے بھرپور تھا اس لیے ناسٹر ڈیمس گوتھک کلینڈر کا سہارا لینے پر مجبور ہوا اور اس کی وقت کے بارے بیشتر اصطلاحات گوتھک کلینڈر سے لی گئی ہیں۔ مگر خامیاں تو اس میں بھی ہیں۔ جب ناسٹر ڈیمس لکھتا ہے اپریل کی دسویں تو اس سے مراد اپریل کی دس تاریخ نہیں ہوتی ہے۔ کلینڈر کی عدم موجودگی اور مہینوں اور دنوں میں ابہام نے اس کی پیش گوئیوں کو مشکل بنا دیا تھا۔ اسے خود بھی اس بات کا احساس تھا لیکن اس مشکل کا اس کے پاس کوئی علاج بھی نہیں تھا۔

فلکیات کے میدان میں ترقی کے ساتھ ہی اہلِ یورپ نے محسوس کر لیا تھا کہ جولین کلینڈر سست ہے اور لیپ ایئر استعمال کرنے کے باوجود اس میں دس دن کی غلطی آ گئی تھی اور یہ درست شمسی کلینڈر سے دس دن پیچھے رہ گیا تھا۔ اس لیے اس میں اصلاح کی اشد ضرورت تھی اور اسی وجہ سے پاپ گریگری دوم نے اس میں درستگی کا بیڑا اٹھایا لیکن ماہرینِ فلکیات سے مدد نہ لینے کے باعث اس میں بھی غلطیاں باقی رہ گئیں۔ اس کے باوجود یہ جولین کلینڈر سے کہیں بہتر ہے جسے قبل مسیح میں جولیس سیزر نے ترتیب دیا تھا اور اپنے نام سے سال میں جولائی کے مہینے کا آغاز کیا تھا اس وقت ہر مہینا تیس دن کا ہوتا تھا اور ہر کچھ سال بعد اضافی دنوں سے ایک مہینا اور بنا لیا جاتا تھا لیکن اس سے حساب کتاب میں شدید مشکلات پیش آتی تھیں اور واقعات کی درست تاریخوں کا تعین تقریباً ناممکن ہو جاتا تھا۔

پاپ گریگری نے کلینڈر میں دس دن کا اضافہ کیا اور لیپ ایئر کو اختیاری کے بجائے لازمی قرار دے دیا۔ پہلے جب لوگ محسوس کرتے تھے کہ سال اصل شمسی سال سے پیچھے رہ گیا ہے تو وہ لیپ ایئر کرتے تھے اس میں غلطی کی گنجائش کہیں زیادہ تھی۔ اب ہر چار سال بعد لیپ ایئر آنے سے کلینڈر میں درستگی پیدا ہوئی۔ مگر بعد میں ماہرینِ فلکیات نے حساب لگایا تو سال پھر بھی پیچھے جا رہا تھا اس لیے سو سال میں ایک بار فروری کا مہینا اٹھائیس یا انتیس دن کے بجائے تیس دن کا قرار دیا یوں کلینڈر میں درستگی پیدا ہوئی۔ اس اصلاح کے باوجود گریگری کلینڈر عمر خیام کے کلینڈر سے بہتر نہیں ہے۔

لیکن دنیا میں گریگری کلینڈر بہت سارے ممالک میں بیسویں صدی میں جا کر رائج ہوا۔ مغربی یورپ کے اہم ممالک جرمنی اور انگلینڈ نے اس کلینڈر کو بہت بعد میں قبول کیا۔ اسی طرح یونانی چرچ کے زیرِ اثر مشرقی یورپ اور روس نے اسے بیسویں صدی میں اس وقت قبول کیا جب روس میں 1917ء میں بالشویک انقلاب آیا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ناسٹر ڈیمس کا خدشہ درست تھا کہ اگر اس نے اپنی پیش گوئیوں میں جولین کلینڈر استعمال کیا تو اس کی بہت ساری پیش گوئیاں غلط ثابت ہو جائیں گی کیونکہ وہ وقت سے مطابقت نہیں رکھیں گی۔

ناسٹر ڈیمس کے اس عمل نے اس کی اکثر پیش گوئیوں کو مشکل بھی بنا دیا کیونکہ اس کا بالکل نہیں پتا چلتا کہ وہ کب پوری ہوں گی۔ جیسا کہ اس کی آخر وقت کے بارے میں جو پیش گوئیاں ہیں ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ 2000ء سے 2050ء تک کے درمیان میں وقوع پذیر ہوں گی اور بعض پیش گوئیوں سے لگتا ہے کہ یہ تیسرے ملینیم کے خاتمے پر جا کر پوری ہوں گی۔ یعنی 3000 عیسوی تک۔ مزے کی بات ہے کہ ناسٹر ڈیمس نے جولین کلینڈر کے خاتمے اور ایک پوپ کی جانب سے نئے کلینڈر کے اجراء کی پیش گوئی بھی کی تھی۔ لیکن اس نے نہ تو اس پوپ کا نام بتایا اور نہ یہ بتایا کہ یہ کام کب ہو گا۔ مزید مزے کی بات ہے کہ ناسٹر ڈیمس کی پیش گوئی کے برعکس جولین کلینڈر ابھی تک مکمل طور پر ترک نہیں ہوا ہے۔ یونانی چرچ اور مونوفسائٹ چرچ ابھی تک اسی کلینڈر کو استعمال کر رہا ہے۔ وہ اپنے سارے امور اسی کلینڈر کی زیرِ نگرانی انجام دیتے ہیں۔

اسی طرح ناسٹر ڈیمس نے اپنی بعض پیش گوئیوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نام بھی استعمال کیے ہیں لیکن وہ نام ابھی تک پُراسراریت کی لپیٹ میں ہیں جیسے نویں صدی کی سولہویں پیش گوئی میں وہ کہتا ہے۔

"فرانکو اسمبلی سے باہر نکل آئے گا

سفیر اس سے متفق نہیں ہوں گے اور ممالک اس کے خلاف ہو جائیں گے

رئیرا کے لوگ اس کے گرد ہجوم کی صورت میں ہوں گے

عظیم آدمی کو خلیج میں داخلے سے روک دیا جائے گا۔"

اس پیش گوئی میں جو 1940ء میں پوری ہوئی۔ اسپین کے آمر جنرل فرانکو اور ایڈولف ہٹلر کے درمیان معاہدہ نہ ہو سکا۔ کیونکہ اسپین کی اسمبلی اس کے خلاف تھی۔ ہٹلر کا مقصد کسی طرح بھی جبرالٹر کی خلیج پر قبضہ کر کے اتحادیوں کو بحیرہ روم میں داخل ہونے سے روکنا تھا اور اسی لیے وہ اسپین کے جنرل فرانکو سے دوستی کرنے کو تیار ہو گیا تھا۔ اس سارے قصے میں کہیں بھی رئیرا کا کوئی پتا نہیں چلتا ہے کہ یہ شخص کون تھا اور اس کا کیا کردار تھا۔ صرف ایک وضاحت ہے کہ جنرل فرانکو کا قاتل جوزے پراموڈی رائیویرا وہ شخص ہے جس کا ذکر ناسٹرڈیمس نے کیا ہے اور ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ لفظ رئیرا اسی کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہ شخص اور اس کے ساتھی فالانگا پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ پارٹی جنرل فرانکو کے خلاف تھی۔ یہ ہٹلر اور اس کی فوج کے اسپین میں داخلے کے بھی خلاف تھے کیونکہ اس سے اسپین کی غیر جانبداری مجروح ہوتی۔ اس وقت پورے یورپ میں بس دو ہی ملک دوسری جنگِ عظیم سے الگ رہے تھے ایک اسپین اور دوسرا سوئٹزرلینڈ تھا۔

ناسٹرڈیمس انسانی تاریخ کے پیش گوؤں میں حیرت انگیز انفرادیت رکھتا ہے کیونکہ اس کی اکثر پیش گوئیاں بڑے لوگوں اور بڑے واقعات کے بارے میں تھیں اور پیش گوئیاں درست ثابت ہوئیں۔ اس کی پیش گوئیاں اپنے دور سے شروع ہوئیں۔ جیسا کہ بتایا ہے کہ اولین پیش گوئی جس نے شہرت حاصل کی وہ شاہ ہیری کی حادثاتی موت کی تھی جو بالکل درست ثابت ہوئی۔ اس سے پہلے اس نے فلیجی پریتی نامی راہب کے پاپائے روم بننے کی پیش گوئی کی تھی یہ بھی درست ثابت ہوئی تھی اگرچہ اس وقت اسے شہرت نہیں ملی تھی کیونکہ پریتی ناسٹرڈیمس کے مرنے کے بعد پاپائے روم بنا تھا۔

ناسٹرڈیمس نے فرانس کے دو شاہوں کے یکے بعد دیگرے مرنے کی پیش گوئی کی اور یہ اس کی زندگی میں درست ثابت ہوئی۔ اس کے بعد انقلابِ فرانس اور نپولین کی آمد کی پیش گوئی، نپولین کی کامیابیاں اور پھر اس کے زوال کی پیش گوئی بھی موجود ہے جو روس پر حملے سے شروع ہوتی ہے۔ آخر میں نپولین کی واٹرلو میں شکست اور سینٹ ہیلینا کے جزیرے پر اس کی جلاوطنی کی پیش گوئی بھی موجود ہے۔ یہ تمام پیش گوئیاں حرف بہ حرف درست ثابت ہوئیں اور انقلابِ فرانس نے فرانس اور دنیا بھر میں جمہوریت کی داغ بیل ڈال دی جو اب تناور درخت بن چکی ہے۔ اسی طرح ناسٹرڈیمس نے آنے والی دو صدیوں کے بارے میں بھی پیش گوئیاں کی ہیں لیکن جب ہم اس کی سنچریز کو دیکھتے ہیں تو واضح محسوس ہوتا ہے کہ اس نے سب سے زیادہ توجہ اپنی آخری چار سنچریز کی پیش گوئیوں کو دی ہے۔

ان پیش گوئیوں میں دنیا کے بڑے حادثات، جنگوں اور خاص طور سے اینٹی کرائسٹ کے آنے کی پیش گوئیاں نمایاں ہیں۔ اس کی آمد سے پہلے دنیا میں زلزلے اور دوسری قدرتی آفات کثرت سے آئیں گی۔ جنگوں میں انسانی جانوں کا زیاں ہو گا اور دنیا اتھل پتھل کر رہ جائے گی۔ مذاہب کے درمیان اختلافات بڑھیں گے، عرب اور مغرب آپس میں الجھ جائیں گے اور ان جنگوں میں لاکھوں کروڑوں انسان لقمۂ اجل بن جائیں گے۔ ان میں سے بہت ساری پیش گوئیاں درست ثابت ہو چکی ہیں۔ جیسے پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کی پیش گوئی۔ اسی طرح نوے کی دہائی میں عرب اور مغرب کی جنگ بھی ہو چکی ہے جس کا دائرہ اب پھیل رہا ہے۔ عراق اور لبنان کے بعد یہ دوسرے عرب ممالک تک وسیع ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔

اس کی ایک پیش گوئی میں واضح 1999ء کا ذکر ہے۔ اس کے مطابق اس سال دنیا میں دہشت کا بادشاہ نمودار ہو گا جس کا تعلق خطہ عرب سے ہو گا وہ ساری مغربی دنیا کو ہلا کر رکھ دے گا۔ یہ مغرب پر حملہ کرے گا اور نئے شہر کو تباہ کر دے گا۔ کیا یہ پیش گوئی واضح طور پر حالیہ صورتِ حال کی عکاسی نہیں کرتی ہے۔ اس بات کا امکان بھی ہے کہ مغربی پالیسی سازوں نے تہذیب کی جنگ چھیڑنے کے لیے ناسٹرڈیمس کی اس پیش گوئی کو استعمال کیا۔ کیونکہ نائن الیون کے واقعے میں نیا شہر یعنی نیویارک تباہ نہیں ہوا تھا بلکہ اس کا ایک بہت چھوٹا سا حصہ تباہ ہوا۔ یعنی ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے دونوں ٹاورز مسافر بردار طیاروں کے ٹکرانے سے تباہ ہوئے۔ اس حادثے کے بارے میں شکوک و شبہات ماضی سے زیادہ ہو گئے ہیں اور خود امریکی ماہرین کہہ رہے ہیں کہ یہ ٹاورز اصل

میں خود امریکا نے تباہ کیے تاکہ مسلم دنیا پر حملے کا جواز پیدا کیا جا سکے۔ کیونکہ اس طرح ان عمارتوں سے طیارے ٹکرانا ممکن ہی نہیں ہے جس طرح سے یہ طیارے ٹکرائے۔ امریکی سراسر جھوٹ کہہ رہے ہیں کہ طیارے ریڈار سے بچنے کے لیے بہت نیچی پرواز کرتے ہوئے ورلڈ ٹریڈ سینٹر تک آئے تھے۔ اگر واقعی ایسا ہی تھا تب بھی امریکی اپنے ایک دفاعی نظام کو بھول گئے تھے جو ہمہ وقت پورے امریکا اور اس کے آس پاس کے سمندروں کی نگرانی کرتا ہے۔ یہ نظام چھتیس اواکس طیارے ہیں جو ہر وقت امریکا کی فضاؤں میں رہتے ہیں اور مسافر بردار طیارے تو بہت بڑی چیز ہیں۔ ان کے ریڈار سے ایک چھوٹا سے میزائل بھی نہیں بچ سکتا چاہے وہ بالکل زمین کے ساتھ لگ کر کیوں نہ اڑ رہا ہو۔

کیا آج کی دنیا کے وہ ممالک جو اپنی چودھراہٹ قائم کرنے کے لیے کچھ کرنے سے دریغ نہیں کرتے کیا ممکن نہیں ہے کہ وہ ناسٹرڈیمس کی پیش گوئیوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہے ہوں۔ ایسا بالکل ممکن ہے لیکن ایسا کرتے ہوئے وہ فراموش کر دیتے ہیں کہ اس طرح وہ ناسٹرڈیمس کی پیش گوئیوں کی صداقت پر مہر ثبت کر رہے ہیں۔ دوسرے وہ اس کی ان پیش گوئیوں کو نظر انداز کر رہے ہیں جن کا تعلق آخر وقت میں آنے والی کثرت سے قدرتی آفات سے ہے۔ زلزلے، سونامی، آتش فشاں، سیلاب اور خشک سالی کی آفتیں ماضی کے مقابلے میں کہیں زیادہ دنیا کو اپنا نشانہ بنا رہی ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ دنیا کے انجام کی پروا کیے بغیر اپنی مرضی کر رہے ہیں۔ آج آفاتِ ارضی ماضی کے مقابلے میں کہیں زیادہ ملکوں اور قوموں کو اپنا نشانہ بنا رہی ہیں۔

ناسٹرڈیمس نے دو جڑواں میناروں کی تباہی کی پیش گوئی بھی کی تھی جو نئے شہر میں ہوں گے۔ اس کا کہنا ہے جب یہ واقعہ ہو گا تو دنیا میں بہت زیادہ تبدیلیاں نمودار ہوں گی۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے حادثے کے بعد دنیا کی سیاسی، معاشی اور فوجی صورتِ حال یکسر بدل کر رہ گئی ہے۔ ناسٹرڈیمس نے تین مسیح دشمنوں کا ذکر کیا ہے جنہیں انگریزی میں اینٹی کرائسٹ کہتے ہیں۔ ناسٹرڈیمس کی پیش گوئیوں پر کام کرنے والے ماہرین کہتے ہیں کہ تین میں سے دو مسیح دشمن آ چکے ہیں۔ یہ نپولین بونا پارٹ اور ایڈولف ہٹلر ہیں۔ البتہ تیسرا مسیح دشمن ابھی نمودار نہیں ہوا ہے۔ اینٹی کرائسٹ سے مراد یقیناً حضرت عیسیٰؑ کا دشمن نہیں ہے کیونکہ نپولین اور ہٹلر دونوں ہی مذہبی شخصیات نہیں تھیں اور ان کا مقصد فتوحات حاصل کرنا تھا۔ لیکن ان دونوں نے دیگر دنیا کی نسبت خود یورپ اور مسیحی ملکوں کو نشانہ بنایا۔ اس لیے ان کو اینٹی کرائسٹ قرار دے دیا گیا۔ دوسرے معنوں میں ماہرین ناسٹرڈیمس کی پیش گوئیوں کو اپنے مطلب کے لیے توڑ مروڑ کر بیان کر رہے ہیں۔ کلیسا کی اصطلاح میں اینٹی کرائسٹ شخص وہ ہے جو مسیحؑ کا روحانی دشمن ہو اور ان کے لائے مذہبی نظام کو نقصان پہنچانا چاہتا ہو جو خدا کے بجائے شیطان کی حکمرانی چاہتا ہو۔

اپنے نقطہ نظر سے یہ ماہرین جن میں یقیناً اسرائیل اور امریکا کے ماہرین سرفہرست ہیں۔ تیسرا اینٹی کرائسٹ مڈل ایسٹ میں تلاش کر رہے ہیں۔ انہوں نے پہلے صدام حسین کو تیسرا اینٹی کرائسٹ قرار دیا لیکن بعد میں اسے رد کر دیا۔ اب ان کا کہنا ہے کہ تیسرا اینٹی کرائسٹ ابھی آئے گا۔ اس کا تعلق مڈل ایسٹ یا ایشیا سے ہو گا۔ ممکن ہے وہ چین، منگولیا یا کوریا سے اٹھے۔ حیرت انگیز بات ہے کہ ان شخصیات نے صلاح الدین ایوبی یا یوسف بن تاشفین کو اینٹی کرائسٹ قرار نہیں دیا۔ یہ درست ہے کہ ناسٹرڈیمس کی بہت ساری پیش گوئیاں پوری ہوئی ہیں لیکن اس کی کچھ پیش گوئیوں کو جس طرح سیاسی طور پر استعمال کیا گیا ہے اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ یہی نہیں ان پیش گوئیوں کو بنیاد بنا کر عالمی جنگیں چھیڑی گئیں۔ بلکہ اسرائیل کے قیام کی تحریک شروع کی گئی۔ حالانکہ اسرائیل کا قیام خود یہودیوں کی مذہبی تعلیمات کے خلاف ہے جس میں ان کو منع کیا گیا ہے کہ وہ ایک ملک بنا کر نہ رہیں بلکہ ساری دنیا میں پھیل کر رہیں کہ اسی میں ان کی بقا ہے۔ جب انہوں نے ایک ملک بنایا اسی دن سے ان کے خاتمے کا آغاز ہو جائے گا۔ واضح رہے کہ یہ سب یہودیوں کی اپنی کتابوں میں لکھا ہے اور آج سے سوا سو سال پہلے تک یہودی اس پر پوری طرح ایمان بھی رکھتے تھے۔ لیکن ایک ٹولا جو ہمیشہ سے مذہبی تعلیمات کے خلاف تھا اور اس کا اصل مذہب خود یہودیوں سے بھی چھپا ہوا تھا وہ یہودیوں کو ایک ملک میں جمع کرنے کے لیے کوشاں تھا۔ یہ گروہ فری میسن کا تھا۔ اسے عیسائیوں کے مذہب بیزار طبقات کی مکمل حمایت حاصل تھی یہی وجہ ہے فری میسن مغربی یورپ میں خوب پھولے پھلے۔ ان ممالک کا شاید ہی کوئی حکمران یا طاقت ور شخص ایسا ہو جو فری میسن نہ ہو، معاشی اور سیاسی ماہرین، حد یہ کہ ادیب تک اس تحریک کے پُرجوش حامی بن گئے تھے۔ انہوں نے اسرائیل کے قیام میں ان لوگوں کی پوری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مدد کی۔ جب عام یہودیوں نے اسرائیل کا رخ کرنے سے انکار کیا تو ان پر دوسری جنگِ عظیم کی صورت میں عذاب نازل کیا گیا اور ہٹلر نے ان کو بے دریغ مارا کاٹا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرقی یورپ اور خاص طور سے روس میں آباد یہودی ترکِ وطن کر کے اسرائیل آنے پر مجبور ہو گئے کیونکہ حیرت انگیز طور پر کسی بھی مغربی ملک نے ان یہودیوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ مغربی یورپ اور امریکا میں آباد یہودیوں نے اسرائیل کی معاشی اور سیاسی حمایت تو خوب کی لیکن انہوں نے اسرائیل آنے سے گریز کیا۔

ناسٹرڈیمس کی پیش گوئی کے عین مطابق یہودی ایک بار پھر ارضِ مقدس میں جمع ہوئے۔ لیکن یہاں سارے یہودی نہیں آئے اب یہودیوں میں ایک بڑا طبقہ اسرائیل کا مخالف ہے اور اسے یہودیوں کے لیے نقصان دہ سمجھتا ہے۔ یوں وہ خفیہ تحریک جو اسرائیل کو تمام یہودیوں کا مرکز بنانا چاہتی تھی کامیاب نہیں ہو سکی ہے۔ سوویت یونین کے زوال تک امریکا اور یورپ کے لبرل طبقے اسرائیل کی حمایت میں پیش پیش تھے لیکن جب انہوں نے مظلوم فلسطینیوں پر اسرائیل کے مظالم دیکھے تو وہ رفتہ رفتہ اسرائیل کی حمایت سے پیچھے ہٹ گئے۔ ایسے موقع پر ایک نیا طبقہ سامنے آیا اور اس نے اسرائیل کی اندھی حمایت شروع کر دی۔ یہ امریکا اور یورپ کے وہ قدامت پرست عیسائی فرقے تھے جو یہودیوں سے ہمیشہ سے شدید نفرت کرتے آئے تھے اور ان کا عقیدہ ہے کہ عیسیٰ" پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص نجات حاصل نہیں کر سکتا..... ان کا عقیدہ ہے کہ تمام یہودی مسیح" کے دشمن ہیں۔ اس کے باوجود آج یہی لوگ اسرائیل کے سب سے بڑے سرپرست ہیں۔ ان میں نیوکان فرقہ سب سے زیادہ سرگرم ہے۔ اس فرقے نے فضا میں نجات کا نظریہ اپنایا جسے انگریزی میں راپچر کہتے ہیں۔ عجیب بات ہے یہی نام امریکا کے جدید ترین لڑاکا بمبار طیارے کا ہے۔ یہ لوگ عقیدہ رکھتے ہیں کہ عیسیٰ" اس وقت تک دنیا میں دوبارہ نہیں آئیں گے جب تک تمام یہودی ارضِ فلسطین میں جمع نہیں ہو جاتے اور حضرت عیسیٰ" آ کر ان تمام عیسائیوں کو براہِ راست جنت میں لے جائیں گے جو اُن کی دوبارہ آمد اور فضا میں نجات کے نظریے پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ عیسائی بھی نجات حاصل نہیں کر سکیں گے جو اس عقیدے پر یقین نہیں رکھتے۔ نیوکان میں امریکی صدر بش سینئر اور جونیئر، کونڈولیزا رائس، رامس فیلڈ شامل ہیں۔ امریکی صدر ریگن بھی نیوکان تھا اور اسے یقین تھا دنیا بہت جلد تباہ ہونے والی ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ عقیدہ عیسائیوں میں کہاں سے آیا اور اس سے بھی زیادہ اہم سوال ہے کہ یہودیوں کو کافر اور دوزخی سمجھنے والے نیوکان عیسائی ان کی اندھی حمایت کیوں کر رہے ہیں بلکہ ان کا رویہ مدعی سست اور گواہ چست والا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ تمام یہودی جلد از جلد اسرائیل میں جمع ہو جائیں اور اس کے لیے وہ ناسٹرڈیمس کی پیش گوئی کا سہارا بھی لیتے ہیں، وہ کہتے ہیں ایسا ہونا ناگزیر ہے۔ وہ ایسا اس لیے چاہتے ہیں کہ جب تک تمام یہودی اسرائیل میں جمع نہیں ہوں گے حضرت عیسیٰ" اس دنیا میں نہیں آئیں گے۔ نہایت تعجب کی بات ہے کیتھولک قدامت پرست چرچ نے آج سے سو سال پہلے تک ایسا کوئی عقیدہ نہیں رکھا تھا کہ حضرت عیسیٰ" واپس آئیں گے اور عیسائیوں کو براہِ راست جنت میں لے جائیں گے، صرف ان عیسائیوں کو جو نئی پیدائش اور فضا میں نجات کے نظریے پر یقین رکھتے ہیں۔ کیا قدامت پرست عیسائیوں میں یہ عقیدہ کہیں سے داخل کیا گیا ہے؟

خیر یہ ایک الگ اور طویل موضوع ہے۔ ناسٹرڈیمس کے بارے میں ایک گروہ کی رائے ہے کہ وہ اصل میں فری میسن گروپ سے تعلق رکھتا تھا اور یہ اس گروپ کا ابتدائی دور تھا۔ وہ آنے والے دنوں کے لیے صیہونی منصوبوں کی نقشہ گری کر رہا تھا۔ لیکن ناسٹرڈیمس نے جس طرح تقریباً ساری دنیا کے بارے میں پیش گوئیاں کی ہیں وہ اس نظریے سے میل نہیں کھاتی ہیں۔ دوسرا گروہ جو ناسٹرڈیمس کو ایک مقدس حیثیت دیتا ہے وہ اسے پیغمبر مانتا ہے اور اس کی پیش گوئیوں پر اسی طرح یقین رکھتا ہے جیسے الہامی کتابوں پر یقین رکھا جاتا ہے۔ حالانکہ اس کی بہت ساری پیش گوئیاں غلط بھی ثابت ہوئیں اور بہت ساری کا کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا ہے۔

راقم کے خیال میں ناسٹرڈیمس کا تعلق کسی خفیہ جماعت سے تو نہیں تھا یا اگر تھا تب بھی یہ بہت خفیف سا تھا۔ فری میسن گروپ سولہویں صدی عیسوی میں کھل کر سامنے آیا تھا۔ ناسٹرڈیمس کے علم اور آسٹرولوجی میں اس کی مہارت میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے۔ البتہ اس کا پورا امکان ہے کہ اس کی پیش گوئیوں کو گزشتہ تین صدیوں سے مغربی سیاست کے کار پرداز اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ ہمیں اس چیز پر ضرور غور کرنا چاہیے۔ کیونکہ صرف وہی قومیں زندہ رہتی ہیں اور ترقی کرتی ہیں جو غور و فکر سے کام لیتی ہیں۔

قسط نمبر 199

فلمی چیلنج

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

علی سفیان آفاقی کی یاداشتیں

ایسے نادر روزگار کمال کمال ہی نظر آتے ہیں۔ جو نصف صدی سے علم و ادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل ہوں اور اپنے روزاول کی طرح تازہ دم بھی۔ ان کے ذہن رسا کی پروازمیں کوئی کمی واقع ہو، نہ ان کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آئے۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جواں فکر و بلند حوصلہ بزرگ ہیں، وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے، اپنی نمایاں حیثیت کی نشان اس کی پیشانی پر ثبت کر دیے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں انہیں اپنے عہد کی پر قابل ذکر شخصیت سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دید و شنید اور میل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل رشک ہے۔ آیئے ہم بھی ان کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے۔

ادب و صحافت سے فلمی دنیا تک دراز ایک داستاں در داستاں سرگزشت

جب سے دنیا میں فلم سازی شروع ہوئی ہے، ہر موضوع پر فلمیں بنتی رہی ہیں۔ فلم سازی کا باوا آدم تو امریکا (ہالی وڈ) ہی کو کہا جاتا ہے۔ اگرچہ روسی ہدایت کاروں نے بھی بہت عمدہ فلمیں بنائی تھیں مگر روسی ہدایت کاروں اور فلم سازوں کے سامنے ہمیشہ "نظریہ" رہتا تھا جبکہ ہالی وڈ نے تفریح فراہم کرنے پر زور دیا تھا۔

خاموش فلموں کے زمانے میں عموماً مزاحیہ فلمیں بنائی جاتی تھیں اس کی وجہ یہ تھی کہ کامیڈی ایک ایسا ذریعہ ہے جس میں مکالمات کے بغیر دیکھنے والوں کو ہنسایا جاتا ہے۔ چنانچہ چارلی چپلن کی فلموں میں مزاح کا عنصر غالب رہا یہاں تک کہ جب انہوں نے انتہائی سنجیدہ اور سنگین عالمی موضوعات پر بھی فلمیں بنائیں تو مزاحیہ پیرایہ ہی اپنایا۔ بعض سچویشنز کی وضاحت کے لیے خاموش فلموں میں مختصر فقرے بھی لکھ دیے جاتے تھے۔ اس طریقے کو سب ٹائٹلنگ (Sub Titling) کہا جاتا ہے۔ یہ آج بھی استعمال کیا جاتا ہے جب ایک زبان کی فلم کی دوسرے ملک میں نمائش کی جاتی ہے تو مکالمے اور سچویشنز کی وضاحت کے لیے سب ٹائٹل درج کر دیے جاتے ہیں۔

بولتی فلموں کا زمانہ آیا تو فلم سازوں کو موضوعات منتخب کرنے کے لیے بہت آزادی حاصل ہو گئی۔ ہالی وڈ میں سوشل، رومانٹک، سیاسی اور جنگی پس منظر کے ساتھ رومانی اور ایکشن فلمیں بھی بننے لگیں۔ مزاحیہ اور میوزیکل فلمیں بھی بنائی جاتی تھیں۔ ہالی وڈ میں عموماً ساری فلم محض ایک مرکزی کہانی اور مرکزی کرداروں کے گرد ہی گھومتی ہے۔ پاکستان اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہندوستان کی طرح وہاں ایک فلم کو بہت سی چیزوں کا ملغوبا نہیں بنایا جاتا، ان میں رومان، ڈانس، گانے، کامیڈی، ٹریجڈی اور ضرورت پیش آئے تو ایکشن بھی شامل کردیا جاتا ہے۔

جب موضوعات کا میدان وسیع ہوا تو ہالی وڈ میں سسپنس اور ڈراؤنی فلمیں بھی بننے لگیں۔ سسپنس فلم اور ڈراؤنی فلم میں کافی فرق ہوتا ہے۔ سسپنس فلم میں فلم دیکھنے والوں کو قدم قدم پر چونکا دینے والے واقعات پیش کیے جاتے ہیں اور ان کا خاتمہ بالکل خلافِ توقع ہوتا ہے جس کو دیکھ کر فلم بین چونک کر رہ جاتا ہے۔ یوں تو ہالی وڈ میں سسپنس فلمیں کئی ہدایت کاروں نے بنائی ہیں لیکن الفریڈ ہچکاک کو ہمیشہ ''ماسٹر آف سسپنس'' تسلیم کیا گیا ہے۔ ان کی فلموں میں ہلکا پھلکا رومان بھی ہوتا ہے لیکن زیادہ زور سسپنس پر دیا جاتا ہے۔ سسپنس کے ساتھ ہی وہ فلم میں خوف زدہ کرنے والے مناظر اور واقعات بھی شامل کردیا کرتے تھے۔ پر اُن کی مشہور فلم ''دی برڈ' (The Bird) اس کی ناقابلِ فراموش مثال ہے۔ اس فلم کا مرکزی خیال یہ ہے کہ اگرچہ پرندے بہت بے ضرر اور دل بہلانے والے ہوتے ہیں لیکن ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ یہ بے ضرر پرندے انسانوں کے لیے وبالِ جان اور عظیم ترین خطرہ بن جائیں۔ ''دی برڈ'' ہچکاک کی مہارت اور ہنرمندی کا کمال ہے۔ وہ ہمیشہ نت نئے موضوعات سوچتے تھے اور انہیں اس خوبصورتی اور سسپنس کے ساتھ پیش کرتے تھے کہ فلم بین حیران ہوکر دیکھتا ہی رہ جاتا تھا لیکن ان فلموں کا خاتمہ بالکل غیر متوقع اور چونکا دینے والا ہوتا تھا اور سنیما گھر سے لوگ اس کے بارے میں تبادلۂ خیالات کرتے ہوئے باہر نکلتے تھے۔ اس طرح ہچکاک کی ہر فلم میں کوئی نیا پن، نیا موضوع ضرور ہوتا تھا۔ ان کی پیشکش کا انداز ایسا تھا کہ کسی سین میں کافی دیر تک بالکل خاموشی رہتی ہے کہ اچانک بیک گراؤنڈ میوزک کے ذریعے وہ فلم دیکھنے والے کو چونکنے اور کرسی سے اچھلنے پر مجبور کردیتے تھے۔ ہالی وڈ میں دیگر فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے بھی سسپنس فلمیں بنائیں مگر کوئی ہچکاک پر بازی نہ لے جاسکا اور ''ماسٹر آف سسپنس'' کا لقب ان سے نہ چھین سکا۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ ہچکاک نے ہر اعتبار سے بے حد خوبصورت اور معنی خیز فلمیں بنائیں مگر انہیں کبھی بہترین ڈائریکٹر کے طور پر آسکر ایوارڈ نہ مل سکا۔ ان کی وفات کے بعد ان کی فلموں پر بہت کام کیا گیا اور بالآخر یہ فیصلہ کیا گیا کہ الفریڈ ہچکاک صحیح معنوں میں ایک عظیم ہدایت کار اور تخلیق کار تھا۔ اس کی فلمیں سنیما فوٹوگرافی کے طالب علموں کے لیے سیکھنے کا بہت زیادہ مواد فراہم کرتی ہیں۔ لہٰذا ہچکاک کو ان کی وفات کے کئی سال بعد، بعد از مرگ آسکر ایوارڈ دیا گیا اور ان کی عظمت کو تسلیم کیا گیا۔

سسپنس فلمیں دیکھنے والوں کو چونکا دینے اور حیران کرنے کے لیے بنائی جاتی ہیں اور اچھا ہدایت کار کہانی کو اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ دیکھنے والا ایک لمحے کے لیے بھی اسکرین سے نظر نہیں ہٹا سکتا۔

ہالی وڈ نے ڈراؤنی اور خوف ناک فلمیں بنانے کے بھی کامیاب تجربات کیے۔ ہماری نوعمری کے زمانے میں ہالی وڈ میں ڈراؤنی فلمیں بنائی جاتی تھیں جن کی دیکھا دیکھی ہندوستانی فلم سازوں نے بھی ڈراؤنی اور جادوئی فلمیں بنانی شروع کردیں۔ نوعمری میں ہم نے دہلی میں ایک ایسی ہی ڈراؤنی فلم دیکھی تھی جس کا نام ''بھاگتا بھوت'' تھا۔ ہم تو خیر نوعمر تھے لیکن بڑی عمر کے لوگ بھی فلم دیکھ کر خوف زدہ ہوگئے تھے۔ سردیوں کے دن تھے اور فلم کا آخری شو تھا اس لیے سنیما سے گھر تک جانا مشکل ہوگیا حالانکہ بمشکل دو سو گز کا فاصلہ تھا۔

ہالی وڈ میں ڈراؤنی فلموں کا آغاز تصوراتی فلموں سے ہوا تھا۔ بدروحیں، کسی بچے یا عورت میں کسی بدروح کا حلول کرجانا اور انسانوں کو نقصان پہنچانا۔ ان فلموں کا موضوع ہوتا تھا۔ لیکن ڈراؤنی فلموں کا ایک بہت موثر آغاز فلم ''ڈریکولا'' سے ہوا تھا۔ ''ڈریکولا'' کے بارے میں عام طور پر خیال ہے کہ یہ ایک خیالی داستان ہے لیکن جب انگریزی میں ناول ''کاؤنٹ آف ڈریکولا'' شائع ہوا تو ساری دنیا میں بہت مقبول ہوا۔ اس کے مختلف زبانوں میں ترجمے بھی کیے گئے۔ یہ ایک پہاڑی علاقے میں ایک شاندار قلعے میں رہنے والے ایک رئیس زادے کی کہانی ہے جو کسی آسیبی قوت کے زیرِ اثر غیر مرئی طاقت کا مالک بن جاتا ہے۔ اس کے اندر خود کو چمگادڑ کا روپ دھارنے کی خصوصیت پیدا ہوجاتی ہے۔ دراصل وہ مرچکا ہے لیکن ..... اس کو زندگی کا رشتہ قائم رکھنے کے لیے انسانی خون پینے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

کاؤنٹ ڈریکولا کی لاش کا تابوت محفوظ ہے۔ رات ہوتے ہی اس کے اندر زندگی کی حرارت پیدا ہوجاتی ہے اور

وہ تابوت سے نکل کر انسانی خون پینے کے لیے نکل کھڑا ہوتا ہے۔ وہ چمگادڑ بن کر لوگوں کو ڈراتا ہے اور ان پر قابو پانے کے بعد اپنے لمبے لمبے باہر نکل آنے والے دانتوں کو اپنے شکار کے نرخرے میں گاڑ کر اس کا خون پی جاتا ہے۔ وہ جس کا خون پیتا ہے، وہ بے ہوشی کے عالم میں ہر چیز سے بے خبر ہوجاتا ہے۔ اس کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ اس کا خون پیا جارہا ہے۔ داستان کے مطابق ڈریکولا کو روحانی طاقت کے ذریعے زیر کیا جاتا ہے اور ایک دن جب وہ تابوت میں مردہ لیٹا ہوا ہے، مقدس پادری صلیب نما تلوار اس کے سینے میں اتار دیتا ہے اور اس طرح ڈریکولا سے دنیا کو نجات مل جاتی ہے کیونکہ وہ سچ مچ مرچکا ہے۔

بعد میں کچھ لکھنے والوں نے تحقیق کرنے کے بعد ہنگری میں ایک ایسا قلعہ بھی دریافت کرلیا جو واقعی کاؤنٹ ڈریکولا کا مسکن تھا۔ ناول نویسوں نے خوب خیال آرائیاں کیں اور کہانیاں گھڑیں۔ اس کی دیکھا دیکھی دوسرے ناول نگاروں نے بھی اپنے اپنے انداز میں خوب قیاس آرائیاں کیں۔

فلم سازوں کو تو ایسے موضوع کی تلاش رہتی ہے۔ بس پھر کیا تھا فلم والوں نے ڈریکولا کو مرکزی کردار بنا کر کئی فلمیں بنا ڈالیں یہاں تک کہ عورتوں کو بھی ڈریکولا بنا کر پیش کردیا۔ ڈریکولا کی کہانیوں میں چاشنی اور جنسی رنگ آمیزی کرنے کے لیے عورتوں کو ڈریکولا کے روپ میں ڈریکولا بنا کر پیش کیا گیا۔ اس قسم کی فلمیں ڈراؤنی تو ہوتی ہی تھیں لیکن ان میں رنگ آمیزی کے ذریعے جنس کی آمیزش بھی کردی جاتی تھی۔

ڈریکولا کے کردار کو ہالی وڈ سے بالی وڈ میں بھی اپنا لیا گیا اور عجب اوٹ پٹانگ فلمیں بنائی گئیں جن میں دوسرے مسالوں کے علاوہ خوف زدہ کرنے والے مناظر بھی ہوتے تھے۔

''ڈریکولا'' درحقیقت ایک بے حد ڈراؤنا ناول ہے جس کو پڑھ کر کوئی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہم نے جب پہلی بار رات کے وقت یہ ناول پڑھا تو خوف سے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اگر ناول بند کرتے تو تنہائی میں بہت ڈر لگتا تھا اس لیے ہم ڈرتے بھی رہے اور ناول پڑھتے بھی رہے۔ ناول ختم کرتے ہی ہم چادر میں منہ لپیٹ کر دعائیں پڑھنے لگے لیکن جب تک سورج کی کرنیں نمودار نہ ہوئیں، ہم کو نیند نہیں آئی۔

ہندوستان میں جادوئی فلمیں بھی بنا کرتی تھیں۔ ان میں کچھ تو دھارمک یعنی ہندو مذہب سے تعلق رکھنے والی ہوتی تھیں جن میں آگ برساتے ہوئے تیر، دہاڑتے ہوئے شیر اور دوسرے ڈراؤنے مناظر دکھائے جاتے تھے۔

جادوئی فلموں کی دوسری قسم دھارمک تو نہیں ہوتی تھی لیکن ان میں جادوگروں کی باہمی لڑائیاں اور قسم قسم کے عجیب وغریب جادوئی واقعات پیش کیے جاتے تھے۔ ایسی فلموں میں نامور سپر اسٹار کام نہیں کرتے تھے۔ ان میں دوسرے اور تیسرے درجے کے اداکار پیش کیے جاتے تھے چونکہ کوئی معروف سپر اسٹار اس قسم کی بے سروپا فلموں میں کام کرنے پر آمادہ نہ ہوتا تھا۔ یہ فلمیں چھوٹے بجٹ سے بنائی جاتی تھیں۔ ان کو دیکھنے والوں میں بچے، عورتیں اور نچلے طبقے کے لوگ ہوتے تھے اس لیے یہ اپنی لاگت پوری کرلیتی تھیں۔

قیامِ پاکستان سے پہلے کئی ہدایت کار ایسی فلمیں بھی بناتے تھے جن میں انسان اور جانور دونوں کام کرتے تھے۔ دراصل بات یہ تھی کہ ہدایت کار کو ہر اداکار تنگ کرتا تھا، وہ اس کو فلم سے کٹ کرکے اس کو طوطا یا کوئی پرندہ، کتا یا بلی بنادیتا تھا اور فلم دیکھنے والوں کو احساس بھی نہیں ہوتا تھا کہ یہ سب مجبوراً یا مصلحتاً کیا جارہا ہے۔ وہ اس کو کہانی کا ایک حصہ سمجھ کر ہی اس سے لطف اندوز ہوتے رہتے تھے۔ اس معاملے میں ایک ہدایت کار مرزا صاحب بہت مشہور تھے اور ان کی فلم میں کام کرنے والے اداکار ڈر کے مارے انہیں ناراضی کا موقع نہیں دیتے تھے کیونکہ وہ انہیں طوطا، کتا یا بلی بنادیتے تھے۔

بالی وڈ میں سسپنس اور ڈراؤنی فلموں میں مزید بہتری پیدا ہوئی جب تعلیم یافتہ اور ذہین ہدایت کاروں نے اس طرف توجہ دی۔ 1972ء سے 1999ء تک بھارت میں جو سسپنس اور خوفناک فلمیں بنائی گئیں ان کی تفصیل یوں ہے۔

دو گز زمین سے نیچے (1972ء) یہ ایک ڈراؤنی فلم تھی جس میں سسپنس بھی شامل تھا۔ اندھیرا (1975ء) دروازہ (1978ء) گیسٹ ہاؤس (1980ء) ہوٹل (1981ء) پرانا مندر (1984ء) ویرانہ (1988ء) بنگلا (1987ء) شکار (1987ء) پرانی حویلی (1988ء) بند دروازہ (1990ء)

سن 2000 کے آغاز میں چند بہت معیاری ڈراؤنی اور سسپنس فلمیں بنائی گئیں۔ ان میں ''ہوا'' 2003ء میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بنائی گئی تھی۔ تبو نے اس میں مرکزی کردار کیا تھا جو دو کمسن بچوں کی ماں بھی ہیں۔ وہ شہر سے دور ایک جنگلات میں گھرے ہوئے بنگلے میں رہتی ہیں، یکا یک اس گھر میں حیرت انگیز اور خوفناک واقعات رونما ہونے لگے جن کا آغاز ہیروئن سے ہوا۔ ایک ان دیکھی شے ہیروئن پر عاشق ہوگئی تھی۔ یہاں تک کہ غسل خانے اور بیڈ روم میں بھی وہ اس آسیب نما چیز سے محفوظ نہ تھیں۔ ''ہوا'' کے کچھ مناظر میں نظر نہ آنے والے انسان اور ہیروئن کے جنسی مناظر بھی دکھائے گئے ہیں۔ تبو ایک تعلیم یافتہ کام کرنے والی خاتون تھیں۔ انہوں نے ماہرین نفسیات اور دوسرے ڈاکٹروں سے مشورہ کیا مگر سب کا خیال تھا کہ یہ ان کا وہم ہے۔

فلم کا نام ''ہوا'' اس لیے رکھا گیا تھا کہ وہ شے جب گھر میں داخل ہوتی تھی تو زور سے ہوا چلنے لگتی تھی۔ دروازے اور کھڑکیاں ہلنے لگتے تھے۔

بالآخر ایک روحانی شخصیت نے ان کے مسئلے کا حل تلاش کیا۔ جب وہ ان کے گھر پہنچا تو ان دیکھی شے یا آسیب نے اس کو تنگ کرنے کی کوشش کی مگر اس نے اپنے عمل سے اس اثر کو زائل کر دیا۔ عامل کے جاتے ہی گھر میں ہوا کا طوفان آ گیا۔ فرنیچر اور دوسرا سامان ہوا کے زور سے اڑ کر گھر سے باہر جانے لگا۔ تبو نے خود کو ہوا کے زور سے بچانے کی بہت کوشش کی مگر ان کی دونوں کمسن بچیاں ان کی آنکھوں کے سامنے ہوا کے زور سے اڑتے ہوئے باہر نکل گئیں اور وہ بے بسی سے دیکھتی رہیں۔

اس طرح آسیبی مصائب سے وہ دوچار ہوتی رہیں یہاں تک کہ عامل نے آسیب کو جلا کر راکھ کر دیا اور انہیں اس بلا سے نجات مل گئی۔ بعد میں عامل کی مدد سے وہ اپنی دونوں بچیوں کو حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہوگئیں۔

''ہوا'' ایک مختلف فلم تھی۔ اس میں کوئی گانا نہیں تھا مگر کہانی اور مناظر کی دلچسپی کے باعث گانوں کی کمی کا احساس تک نہیں ہوا۔ ہدایت کار اور کہانی نویس نے بہت مہارت سے یہ موضوع پیش کیا تھا۔ تبو کی اداکاری قابلِ تعریف تھی۔ گانے نہ ہونے کے باوجود اس فلم نے بہت کامیابی حاصل کی تھی کیونکہ ہدایت کار اور کہانی نویس نے اس میں کچھ فلم بینوں کی دلچسپی کے مناظر بھی شامل کر دیے تھے۔

''ویرانہ'' بھی ایک سسپنس اور ڈراؤنی فلم تھی (اگر فلم کے نام میں غلطی ہو تو یہ حافظے کی غلطی ہوگی) اس فلم کا مرکزی خیال یہ ہے کہ ایک بدروح (خاتون) ایک شادی شدہ شخص پر فریفتہ ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی شکلیں بدلنے پر قادر ہے۔ وہ ہیرو کے گھر میں، کسی سنسان سڑک پر، کسی ویران جنگل میں ہیرو کا راستہ روک لیتی ہے۔ ہیرو کو اس سے نجات دلانے کی کوششوں کو وہ ناکام بنا دیتی ہے لیکن بالآخر ایک انتہائی سسپنس کے منظر میں اس کو جلا کر راکھ کر دیا جاتا ہے۔ اور ہیرو کو اس بلا سے نجات مل جاتی ہے۔ اس فلم کا معیار قابلِ تعریف تھا اگرچہ اداکار غیر معروف تھے۔

اس کے بعد اس موضوع پر مزید فلمیں بنائی گئیں۔ ''بھوت'' 2003ء میں بنائی گئی تھی۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ ایک بھوت کی خوفناک کہانی تھی۔ کچھ اور کامیاب فلموں کے نام یہ ہیں۔

مینار، وہ کون تھی، راز، ڈرنا منع ہے، راستو شامترا، کال، ڈرنا ضروری ہے۔

یہ تمام فلمیں نو آموز اور نووارد لوگوں نے بڑی کاسٹ کے بغیر بنائی تھیں لیکن بالی وڈ کے بڑے اور معروف ہدایت کار اور فلم ساز بھی ایسی بہت کامیاب فلمیں بناتے رہے ہیں۔ ''کہرا'' ایک ایسی ہی سسپنس فلم تھی جو ایک ذہین ہدایت کار راج مہرہ نے بنائی تھی۔ اس کی کاسٹ میں معروف اداکار تھے اور یہ ایک بہت اچھی فلم تھی۔

لیکن جن فلموں نے بہت زیادہ شہرت حاصل کی ان کا تذکرہ نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ بی آر چوپڑا جو لاہور میں ایک انگریزی فلم میگزین کے ایڈیٹر تھے، بمبئی جا کر فلم ساز اور ہدایت کار بن گئے، انہوں نے بہت اچھی اور نت نئے موضوعات پر فلمیں بنا کر شہرت حاصل کی۔

ان کی پہلی سسپنس فلم ''افسانہ'' تھی جس میں مرکزی کردار اشوک کمار نے ادا کیا تھا۔ یہ ایک ویران محل کی کہانی تھی اور اس میں دوسرے جنم کے موضوع کو فلمایا گیا تھا۔ یہ فلم بہت معیاری تھی لیکن کاروباری طور پر کامیاب نہ ہو سکی۔

ایک سسپنس فلم جس نے بے حد کامیابی اور شہرت حاصل کی بمبئی ٹاکیز کی فلم ''محل'' تھی۔ معروف کہانی نویس اور مکالمہ نگار کمال امروہوی اس کے مصنف اور ہدایت کار تھے۔ جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے، یہ کہانی ایک غیر آباد ''محل'' سے تعلق رکھتی تھی۔ محل میں اشوک کمار اور مدھو بالا نے مرکزی کردار کیے تھے۔ مدھو بالا اس فلم کے آغاز میں ایک خیالی تصور یا بھٹکی ہوئی روح کے طور پر پیش کی گئی تھیں۔ انہوں نے اور اشوک کمار نے بہت اچھی اداکاری کی تھی لیکن اس فلم کی مقبولیت اور کامیابی کا سہرا مصنف و ہدایت کار کمال

امروہوی، موسیقار کھیم چندر پرکاش اور نغمہ نگار نخشب جارچوی کے سر پر باندھنا چاہیے۔ کمال امروہوی نے اپنی کہانی کو نہایت ہنرمندی اور خوبصورتی سے پیش کیا تھا۔ کھیم چندر پرکاش نے نخشب صاحب کے نغمات کی ایسی دلکش دھنیں بنائی تھیں جو امر ہوگئیں اور آج بھی ناقابلِ فراموش ہیں۔ اس فلم کا ایک گانا۔

آئے گا آئے گا آنے والا
آئے گا

ایک یادگار نغمہ ہے۔ اس فلم کی نغمہ نگاری نے فلم سے وابستہ تمام لوگوں کو بہت شہرت اور کامیابی بخشی تھی لیکن اس فلم کے بعد نخشب جارچوی نے بہت نام پیدا کیا۔ وہ فلم ساز بھی بنے اور ہدایت کاری بھی کی۔

''محل'' کی کہانی کے ابتدائی حصے میں ہدایت کار نے کیمرا مین کی مدد سے مدھو بالا کو واقعی ایک روح کے طور پر پیش کیا تھا جس کی وجہ سے فلم کے ہیرو اشوک کمار کے علاوہ فلم بین بھی سسپنس میں مبتلا ہو گئے تھے۔ آخر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مدھو بالا کوئی روح نہیں حقیقت تھیں اور ہیرو کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے انہوں نے یہ کھیل کھیلا تھا۔

ایک اور بہت کامیاب فلم جو سسپنس سے بھرپور تھی، اس کے گانے بھی بہت مقبول ہوئے تھے، وہ تھی ''بیس سال بعد''۔

ان کے علاوہ بھی بالی وڈ میں سسپنس اور ڈراؤنی فلمیں بنائی گئیں۔ وہاں دوسرے تیسرے درجے کی فلموں میں آج کل بھی دھارمک (مذہبی) اور سسپنس فلمیں بنائی جا رہی ہیں لیکن ان کی شہرت اور مقبولیت ایک محدود حلقے تک ہی رہتی ہے۔ بالی وڈ میں آج کل بڑے فلم ساز ادارے سسپنس اور ڈراؤنی فلمیں نہیں بنا رہے۔ ان کی جگہ رومانٹک ایکشن فلموں نے لے لی ہے۔

یا پھر نئے موضوعات پر بہت کامیاب اور معیاری فلمیں بنائی جا رہی ہیں۔ کچھ عرصے پہلے ''روبوٹ'' کے نام سے ایک نیم سائنسی فلم بنائی گئی تھی جس میں تامل ناڈو کے سپر اسٹار رجنی کانت اور ایشور یا رائے نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ رجنی کانت نے اس فلم میں روبوٹ کا کردار ادا کیا تھا اور یہ بہت زیادہ کامیاب فلم تھی لیکن عامر خان اور شاہ رخ خان نے پچھلے دنوں بہت اہم اور بنیادی موضوعات پر فلمیں بنائیں مثلاً تارے زمین پر، تھری ایڈیٹس، رنگ دے بسنتی اور پیپلی لو قابلِ ذکر ہیں۔ اسی طرح شاہ رخ خان نے مائی نیم از خان بنا کر عالمگیر شہرت حاصل کی۔ کرن جوہر اس کے ہدایت کار تھے۔ یہ ایک نہایت اہم موضوع پر بنائی گئی تھی جو خاص طور پر مسلمانوں سے تعلق رکھتا تھا۔ شعیب منصور نے بھی پاکستان میں ''خدا کے لیے'' جیسی فلم بنا کر مسلمانوں کے بارے میں مغرب کے غلط تاثرات ختم کرنے کے لیے عمدہ موضوع پر بہت معیاری اور کامیاب فلم بنائی تھی، شاہ رخ خان کی فلم مائی نیم از خان اسی سلسلے کی ایک نہایت موثر فلم تھی جس میں مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی بہت خوبی سے وکالت کی گئی تھی۔ عامر خان اور شاہ رخ خان ان دنوں انوکھے موضوعات پر فلمیں بنا رہے ہیں۔ ''اوم شانتی اوم'' بھی اسی قسم کی ایک فلم تھی۔ مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ سسپنس فلموں کی طرف آج کل بالی وڈ کے فلم سازوں اور ہدایت کاروں کی توجہ نہیں ہے۔

پاکستان میں بھی سسپنس اور ڈرامائی فلمیں بنائی جاتی رہی ہیں۔ فلم ''دیوانہ'' ایک بہت اچھی فلم تھی جس کے ہدایت کار اور ہیرو ظہور راجا تھے۔ اس میں خوف کا عنصر بھی شامل تھا۔ حبیب اور دیبا اس کے مرکزی کردار تھے۔ اداکار حبیب نے ''زندہ لاش'' کے نام سے ایک اسی قسم کی فلم بنائی تھی جس کے ہدایت کار خواجہ سرفراز تھے۔ حبیب اور دیبا نے اس فلم میں مرکزی کردار کیے تھے۔ یہ فلم کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ زندہ لاش کا کردار ریحان نے ادا کیا تھا۔ یہ فلم ''ڈریکولا'' سے متاثر ہو کر بنائی گئی تھی۔

سعید رضوی کی فلم ''سرکٹا انسان'' ایک ڈراؤنی فلم تھی۔ اس فلم میں انہوں نے کیمراٹرکس کے ذریعے ایک دلچسپ فلم بنائی تھی جو اپنے موضوع اور پیشکش کے اعتبار سے ایک قابلِ ذکر فلم تھی۔

سسپنس کے موضوع پر ایک بہت اچھی فلم، فلم ساز و ہدایت کار ہمایوں مرزا کی فلم ''راز'' تھی۔ اس فلم کی کہانی طفیل احمد جمالی نے اور مکالمے ریاض شاہد نے لکھے تھے۔ اس فلم کے مرکزی کردار علاؤالدین اور مسرت نذیر تھے۔ علاؤالدین اس فلم میں دہرے کردار کے مالک ہیں۔ وہ مافیا سے بھی تعلق رکھتے ہیں لیکن لوگ انہیں پیروں سے معذور ایک نیک انسان سمجھتے ہیں۔ فلم کی کہانی میں کافی سسپنس تھا۔ ریاض شاہد نے سچویشنز کے مطابق بہت اچھے مکالمے لکھے تھے۔ درحقیقت راز ہی پاکستان کی پہلی سسپنس فلم قرار دی جا سکتی ہے۔ ہمایوں مرزا نے کراچی کو خیرباد کہہ کر لاہور میں یہ فلم بنائی تھی جو بہت کامیاب اور مقبول ہوئی۔ ہمایوں مرزا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے اس کے بعد سسپنس کی طرف توجہ نہیں دی اور دیگر مختلف موضوعات فلماتے رہے۔ ڈاکو کی لڑکی کے علاوہ انہوں نے ڈاکوؤں کی زندگی کے بارے میں ایک بہت معیاری اور موثر فلم بنائی تھی جس کا نام ''آگ کا دریا'' تھا۔ آگ کا دریا پاکستان کی یادگار فلموں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس میں بعض خصوصیات دوسری فلموں سے مختلف تھیں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس فلم کے لیے نغمات جوش ملیح آبادی نے لکھے تھے جن کی دلکش طرزیں بنائی تھیں۔ آج بھی سامعین وناظرین کو متوجہ کرلیتی ہیں۔

ہمایوں مرزا نے ایک اور تجربہ یہ کیا تھا کہ تمام فلم اصلی لوکیشنز پر سندھ میں بنائی تھی اور فلم کی تمام ضروریات پوری کی تھیں۔ محمد علی اور شمیم آرا اس فلم کے مرکزی کردار تھے اور دونوں نے اپنے کردار بہت خوبصورتی اور مہارت سے نبھائے تھے۔ ریاض شاہد نے اس فلم کے بہت پُراثر مکالمے لکھے تھے۔

فلم کی کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ محمد علی ڈاکو ہیں اور ایک طوائف کی محبت میں گرفتار ہوجاتے ہیں۔ وہ ایک نامی گرامی ڈاکو ہیں جن کی تلاش میں پولیس لگی ہوئی ہے۔ ہیرو اور ہیروئن دونوں کا تعلق دو ناپسندیدہ طبقات سے ہے۔ محمد علی، شمیم آرا کو شادی کرنے پر مجبور کرتے ہیں اور دونوں کی شادی ہوجاتی ہے۔ کچھ عرصے بعد وہ ایک بیٹے کے والدین بھی بن جاتے ہیں۔

بیٹے کی پیدائش کے بعد شمیم آرا کو اپنے بیٹے کے مستقبل کی فکر پڑ جاتی ہے۔ وہ اپنے شوہر سے کہتی ہے کہ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارا بیٹا بھی بڑا ہوکر تمہاری طرح ڈاکو بنے؟ تمام زندگی جرائم میں ملوث رہے اور پولیس سے چھپتا پھرے۔ تم جس راستے پر چل رہے ہو، اس کی آخری منزل پھانسی یا موت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ وہ شوہر کی منت کرتی ہیں کہ ڈاکو کی زندگی چھوڑ کر ایک شریف شہری کی زندگی اختیار کریں تاکہ ان کا بیٹا بھی ایک محبِ وطن اور اچھا شہری بن سکے۔

محمد علی کی سمجھ میں یہ بات آجاتی ہے اور وہ اپنے گروہ کو اپنے فیصلے سے مطلع کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں ڈاکو کی زندگی ترک کررہا ہوں۔ تم لوگ بھی اگر یہی راستہ اختیار کرلو تو بہتر ہوگا ورنہ تم سب اپنی مرضی کی زندگی بسر کرنے کے لیے آزاد ہو۔ محمد علی کا ایک باغی ساتھی ان سے اتفاق نہیں کرتا اور دوسرے ڈاکوؤں کو بھی سردار کے خلاف بھڑکاتا ہے۔ بہرحال اپنے اور اپنے بیوی بچوں کے اچھے مستقبل کی خاطر کوشش کرتے ہوئے سردار موت کے منہ میں پہنچ جاتا ہے۔

''آگ کا دریا'' ایک بامقصد اور اصلاحی فلم تھی اس لیے جوش ملیح آبادی جیسے عظیم انقلابی شاعر نے اس کے نغمات لکھنے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ فلم کے سبھی گانے مقبول ہوئے تھے اور فلم ساز وہدایت کار کے علاوہ محمد علی اور شمیم آرا نے بھی ایوارڈ حاصل کیے تھے۔ گزشتہ پچیس سالوں میں پاکستان میں کوئی سسپنس فلم نہیں بنائی گئی کیونکہ فلمی صنعت پر ان پڑھ بدمعاشوں اور اسمگلروں کے قبضہ گروپ کا راج تھا۔ اب تو فلمی صنعت نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔ توقع ہے کہ ---- ذہین اور تعلیم یافتہ لوگ پاکستان کی فلمی صنعت کو ازسرِنو مضبوط اور صحت مند بنیادوں پر استوار کریں گے۔ انشاء اللہ! اور ملک میں ایک نئی اور تعظیم فلمی صنعت جنم لے گی۔

☆☆☆

مزید آگے بڑھنے سے قبل قارئین کے خطوط پر بھی بات ہوجائے۔

جاوید محمد خان نے گاؤں بری زئی ضلع اٹک سے چند اعتراضات کیے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اول تو حضرت آدم اور اماں حوا کا تذکرہ فلمی الف لیلہ میں بے محل ہے۔ دوسرے یہ میں نے انہیں جنت کا باسی لکھا ہے حالانکہ وہ جنت میں مقیم تھے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ قرآن شریف میں کہیں نہیں فرمایا گیا کہ شوہر بیوی کا مجازی خدا ہے۔ جاوید محمد صاحب کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ فلمی الف لیلہ کے نام سے یہ مقصود نہیں ہے کہ اس میں کوئی اور موضوع زیرِ بحث نہ آئے۔ بنیادی طور پر یہ میری یادداشتیں ہیں جن میں ادبی، علمی، صحافتی، ثقافتی اور دیگر شعبوں سے متعلق شخصیات کا بھی تذکرہ آتا رہا ہے۔ اگر وہ باقاعدگی سے مطالعہ کرتے ہیں تو انہیں علم ہوگا کہ اس میں بے شمار مختلف شعبوں سے متعلق افراد کا تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس لیے فلمی الف لیلہ سے یہ مراد نہ لی جائے کہ اس میں صرف فلمی تذکرے ہوں گے۔ اس میں ہر قسم کے مباحث زیرِ بحث آتے رہے ہیں۔ حضرت آدم اور اماں حوا کے بارے میں یہ بحث کہ وہ جنت کے باسی تھے یا مقیم تھے، غیر متعلق ہے۔ باسی اس کو کہتے ہیں جو کسی جگہ بس جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ مقیم ہوتا ہے۔ شوہر کے مجازی خدا ہونے کو قرآن سے کبھی متعلق نہیں کہا گیا۔ یہ ایک روزمرہ استعمال ہونے والا فقرہ ہے۔ امام مالک کے نام کی انہوں نے درست تصحیح فرمائی ہے۔ میں نے انہیں

عبدالمالک لکھ دیا ہے حالانکہ ان کا نام مالک بن انس تھا۔ یہ قلم کی غلطی ہے، حافظے کی نہیں۔ اس کے بعد انہوں نے آشا پوسلے کے درست نام کی تصحیح کی ہے۔ میں نے ان کا اصلی نام رفعت عائشہ ہی پڑھا اور سنا ہے۔ ضیاء سرحدی ہمارے نہایت قریبی محترم دوست تھے۔ ہر ایک کا اصلی نام، وفات کا مقام اور تدفین کے مقام کا لکھنا بھی غیر ضروری ہے۔ ایک عام قاری کو ان تفصیلات سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ آشا پوسلے کی تمام بہنوں کے بارے میں پہلے کئی بار بیان کیا جاچکا ہے۔ اعجاز حسین حضروی کے بارے میں بھی انہوں نے لکھنے کی فرمائش کی ہے۔ اس کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

مانسہرہ سے محمد عارف قریشی نے فرمائش کی ہے کہ متحدہ ہندوستان کی اداکارہ شکیلہ کے بارے میں معلومات فراہم کی جائے۔ اداکارہ شکیلہ کبھی صف اول کی ہیروئن نہ بن سکیں۔ انہوں نے چند فلموں میں کام کیا اور پھر شادی کرکے فلمی دنیا سے غائب ہوگئیں۔ ان کے بارے میں ابتدائی اطلاعات کے سوا مجھے کچھ علم نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ ان کی بہن نور نے کامیڈین جانی واکر سے شادی کی تھی مگر وہ خود کبھی فلموں میں جلوہ گر نہیں ہوئیں۔ ابھی ہندوستان اور پاکستان کی بے شمار نامور ہستیاں ہیں جن کے بارے میں تذکرہ نہیں کیا جاسکا ہے۔ یہ تو فن کاروں کا ایک گھنا اور وسیع جنگل ہے جس میں سے کچھ پھول اور کانٹے چننے کی کوشش کی گئی ہے۔

اسلام آباد سے محمد عرفان صاحب کا مکتوب پڑھ کر خوشی ہوئی کہ فلمی الف لیلہ کو... اتنے غور سے پڑھا جاتا ہے اور عرفان صاحب جیسے مطالعہ رکھنے والے افراد بھی اس میں دلچسپی لیتے ہیں۔ انہوں نے ''ابن بطوطہ'' کے بارے میں مراکش کے دارالحکومت کے نام کے بارے میں شبہ ظاہر کیا ہے۔ اول تو وقت کے ساتھ ناموں اور جائے مقام میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں دوسرے چونکہ یہ عربی نام ہے اس لیے جس کی سمجھ میں جیسا آتا ہے، وہ استعمال کرتا ہے۔

الحمرا اور قرطبہ کے بارے میں کئی بار پہلے بھی بیان کیا جاچکا ہے، میں نے اسپین کا سفرنامہ بھی لکھا ہے۔ قرطبہ اس ملک کا بہت اہم شہر رہا ہے۔ الحمرا، واقعی غرناطہ میں ہے۔ میں نے جب شائع شدہ مضمون پڑھا تھا تو اس غلطی کا احساس ہوگیا تھا۔

خوارزم شاہ کے بارے میں انہوں نے لکھا کہ وہ دریائے سندھ سے آگے نہ جاسکا تھا اور دریا کی وسیع طغیانی میں اس نے گھوڑا ڈال دیا تھا جس پر چنگیز خان نے اس کا پیچھا کرنے سے اپنے فوجیوں کو روک دیا تھا اور کہا تھا ''قابلِ فخر ہے وہ ماں جس نے ایسے بیٹے کو جنم دیا۔''

پشاور سے شوکت رحمن خٹک نے اپنی کچھ فلمی یادیں ارسال کی ہیں۔ آج کل وہ خود بھی ''شوگر'' کے باعث علیل ہیں اور قارئین سے دعا کے طالب ہیں۔

''ڈائریکٹر باقر رضوی مرحوم نے کافی فلمیں بنائیں جن میں سے زیادہ تر ناکام ہوئیں، کچھ کامیاب ہوئیں مگر انہوں نے پاکستان فلم انڈسٹری کو دیبا جیسی باصلاحیت اداکارہ دی۔ باقر رضوی اداکارہ دیبا کی سوتیلی پھوپی کے داماد تھے۔ ان دنوں دیبا کی مالی حالت بے حد خراب تھی، وہ جھونپڑی میں رہائش پذیر تھی۔

1953ء میں دیبا کی عمر پانچ سال تھی جب اس نے پہلی فلم ''دعا'' میں کام کیا جس کی ہیروئن مینا شوری تھیں۔ اس کو مختصر کردار دیا گیا تھا۔ دیبا کی تیسری فلم ''واہ رے زمانے'' تھی مگر شہرت اسے فضلی صاحب کی فلم ''چراغ جلتا رہا'' سے ملی۔ اس فلم میں زیبا، کمال ایرانی، محمد علی نے بھی پہلی بار کام کیا تھا۔ چراغ جلتا رہا اگرچہ کاروباری لحاظ سے کامیاب فلم نہ تھی مگر بطور اداکار ان چاروں اداکاروں کو کامیابی کی منزل کی طرف گامزن کردیا۔ فلم چراغ جلتا رہا کے پہلے شو میں مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح مہمانِ خصوصی تھیں۔ محترمہ فاطمہ جناح صاحبہ کی شخصیت بہت دل آویز تھی۔ انہوں نے دیبا کی کامیابی کے لیے دعا کی تھی۔ چراغ جلتا رہا میں دیبا کو پانچ سو روپے معاوضہ ملا تھا۔ بعد میں اداکار وحید مراد نے اسے اپنی ذاتی فلم میں بطور ہیروئن اداکاری کا چانس دیا۔ فلم کامیاب ہوئی پھر چل سو چل والی بات تھی۔ دیبا بعد میں لاہور شفٹ ہوگئیں۔ پاکستان میں اداکار ندیم کے ساتھ پہلی بار دیبا کو فلم ''سنگدل'' میں بطور ہیروئن کام کرنے کا موقع ملا۔ فلم کامیاب ثابت ہوئی۔ ڈھاکا کے اداکار رحمان کی ذاتی فلم ''درشن'' میں دیبا نے معاوضہ نہیں لیا تھا۔ اداکار رحمان ایک حادثے میں اپنی ایک ٹانگ کھو چکے تھے۔ یہ فلم سب فن کاروں نے ان کی امداد کے لیے بلامعاوضہ بنائی تھی۔ اداکارہ دیبا کی کامیاب فلموں کی ایک طویل فہرست ہے۔ شادی کے حوالے سے مختلف اداکاروں کے ساتھ دیبا کا نام لیا گیا جن میں مرسلین، طارق عزیز بھی شامل ہیں مگر ان کی شادی کیمرامین نعیم رضوی سے ہوئی جو کامیاب شادی ثابت ہوئی۔ دیبا اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ خوش خرم زندگی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گزار رہی ہیں۔

☆☆☆

معین اختر کے جنازے میں اداکار لہری کو جس حالت میں دیکھا، بے حد افسوس ہوا۔ لہری بہت باہمت اور باصلاحیت فنکار ہیں۔ روتے ہوئے چہروں کو ہنسانا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ آغاز میں وہ اپنے دوستوں کے کہنے پر اسلامیہ کالج کراچی کے اسٹیج شو ''مریضِ عشق'' میں آئے تھے۔ یہ ایک مزاحیہ خاکہ تھا جس میں لہری نے بوڑھے کا کردار کیا تھا۔ یہ کردار کامیاب ہوا اور لہری نے اسٹیج پر مزاحیہ اداکاری شروع کردی۔ لہری کی پہلی فلم ''انوکھی'' تھی جس کی ہیروئن انڈیا کی اداکارہ شیلا رومانی تھی۔ انوکھی 21 جنوری 1956ء کو ریلیز ہوئی اور کامیاب رہی۔ 1958ء میں مرتضیٰ چنگیزی کی فلم ''دل میں تو'' میں لہری نے ایک مزاحیہ کردار ادا کیا۔ اس میں صبیحہ خانم ہیروئن اور اعجاز ہیرو تھے۔ 1959ء میں جعفر بخاری کی فلم ''فیصلہ'' میں کام کیا اور رفیق رضوی کی فلم ''سویرا'' میں اداکاری کے جوہر دکھائے۔ لہری کی کامیاب فلموں کی طویل فہرست ہے، ان فلموں میں ''انصاف، انسان بدلتا ہے، زمانہ کیا کہے گا'' شامل ہیں۔ لہری نے 13 نگار ایوارڈز حاصل کیے۔ حکومت پاکستان نے انہیں حسنِ کارکردگی کا ایوارڈ دیا۔ انہوں نے اپنی آخری فلم ''بابر'' 2001ء میں مکمل کی۔ اب تک لہری نے 220 فلموں میں کام کیا ہے۔ لہری نے تین پنجابی فلموں میں بھی کام کیا جن میں ''یار دوست، وہٹی اور دلی کے ٹھگ'' شامل ہیں۔ لہری نے پاکستانی فلموں میں مکالماتی مزاح کی بنیاد رکھی۔ ان کے چھینکنے کا انداز ناظرین میں بہت مقبول ہوا۔ ہدایت کار دلجیت مرزا کی پنجابی فلم واردات میں لہری کے مکالمے اردو میں تھے۔

لہری آج کل بے حد علیل ہیں، شوگر کی وجہ سے ان کی ایک ٹانگ کاٹ دی گئی ہے۔ وہ بہت باہمت انسان ہیں۔ وہ فالج اور دل کے مرض میں بھی مبتلا ہیں مگر بیماریوں کا مردانہ وار مقابلہ کررہے ہیں۔ معین اختر کی وفات پر انہیں بے حد صدمہ ہوا کیونکہ وہ لہری کے بہت قریبی دوستوں میں تھے۔ لہری اس بات سے خوش ہیں کہ بیماری کی وجہ سے ان کے گناہ دھل رہے ہیں۔''

☆☆☆

شمیم آرا پاکستان کی دوسری صفِ اول کی اداکاراؤں کے مقابلے میں اس اعتبار سے منفرد ہیں کہ نہ صرف انہوں نے اداکاری میں صفِ اول میں جگہ بنائی بلکہ دوسرے شعبوں میں بھی نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ صبیحہ خانم ہمیشہ پاکستانی فلموں کی خاتونِ اول کے مرتبے پر فائز رہیں گی۔ انہوں نے فلمسازی بھی کی لیکن عملی طور پر وہ فلم ساز نہ تھیں۔ شمیم آرا اچھی رقاصہ نہیں تھیں لیکن فلم ''لاکھوں میں ایک'' میں انہوں نے ایک کلاسیکی رقص پیش کیا تھا۔ وہ محنت سے کبھی نہیں گھبراتی تھیں۔ اس رقص کے لیے انہوں نے ایک ماہ سے زیادہ عرصے روزانہ باقاعدگی سے رقص کی مشق کی اور بہت اچھا رقص پیش کیا۔

شمیم آرا کی ذہانت اور ہر چیز کے بارے میں جاننے کی کوشش نے ہی انہیں ایک کامیاب فلم ساز اور ہدایت کارہ بنانے میں مدد کی۔ انہوں نے فلم سازی کا آغاز کیا تو باقاعدہ فلم ساز کی تمام ذمّے داریاں ادا کیں۔ اسی طرح ہدایت کاری کے لیے بھی انہوں نے معروف ہدایت کاروں سے معلومات حاصل کیں اور بہت اچھی فلموں کی ہدایت کاری کی۔ عموماً ہدایت کار اور خاص طور پر خاتون ہدایت کارائیں آؤٹ ڈور شوٹنگ سے گریز کرتی ہیں کیونکہ سرد و گرم موسم میں سفر کر کے مختلف لوکیشنز پر شوٹنگ کرنا ایک تھکا دینے والا اور مشکل کام ہوتا ہے لیکن شمیم آرا نے نہ صرف پاکستان میں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی اپنی فلموں کی شوٹنگ کی اور راہ میں حائل مشکلات کو خاطر میں نہ لائیں۔ انہوں نے مختلف ملکوں کی ''مس'' کے نام سے جو فلمیں بنائیں وہ ان کی ان تھک محنت اور کام میں دلچسپی کا عملی ثبوت ہے۔

فلم ساز اور ہدایت کارہ کے طور پر بھی وہ ایک نرم دل خاتون تھیں۔ بڑی سے بڑی غلطی پر بھی برہمی سے اظہارِ ناراضی کرنے کے سوا انہوں نے کبھی یونٹ کے کسی شخص کو نہ تو ڈانٹا اور نہ ہی سزا دی۔ چھوٹی موٹی غلطیوں کو تو وہ اکثر نظر انداز ہی کردیا کرتی تھیں لیکن اس کا نتیجہ یونٹ کے افراد کی مزید توجہ اور محنت کی صورت میں برآمد ہوتا تھا۔ فلم ساز کی حیثیت سے بھی انہوں نے بلاوجہ بچت کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی اور فلم کی ضرورت کے مطابق خرچ کرنے سے کبھی پرہیز نہیں کیا۔ اس اعتبار سے وہ ایک اچھی فلم ساز ثابت ہوئیں۔

شمیم آرا کی زندگی کو ہم نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ نہ تکلیف دی سوائے خود اپنی ذات کے۔ اپنے رشتے داروں کے علاوہ انہوں نے دوسرے ضرورت مندوں کی بھی

حتی الامکان امداد کی۔ کبھی دانستہ طور پر کسی کا دل نہیں دکھایا۔ لیکن ناقابلِ فہم بات یہ ہے کہ اتنی ذاتی خوبیوں کے باوجود انہیں کبھی نجی زندگی میں خوشیاں اور اطمینان حاصل نہ ہوسکا۔

شمیم آرا ایک سمجھ دار اور ذہین خاتون ہیں لیکن خود اپنی زندگی کے بارے میں انہوں نے جو فیصلے کیے وہ ناکام ثابت ہوئے۔ جب تک ''ماں جی'' زندہ رہیں، وہ ان کے فیصلوں اور احکام کی پابند تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ذاتی زندگی میں فیصلے کرنے کے سلسلے میں ان میں کبھی خود اعتمادی پیدا نہ ہوسکی اور جب ''نانی اماں'' کے بعد انہیں اپنے بارے میں بذاتِ خود فیصلے کرنے پڑے تو انہوں نے ہمیشہ ٹھوکر کھائی۔ شمیم آرا کی ایک عادت یہ ہے کہ وہ ہر ایک کی بات غور اور توجہ سے سنتی ہیں مگر فیصلہ اپنے دل و دماغ سے کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نجی اور ازدواجی زندگی میں انہیں کبھی خوشیاں نہ مل سکیں۔

نانی اماں کی زندگی میں انہیں دو بار رومانس کرنے کا موقع ملا۔ ایک بار جب وہ سید کمال میں دلچسپی لینے لگیں یہاں تک کہ ان کی خاطر گھر چھوڑنے پر بھی آمادہ ہوگئیں اور دوسری بار انہیں محمد علی کے قریب آنے کا موقع ملا۔ مگر یہ نانی اماں کی مرضی اور منشا کے مطابق تھا کیونکہ ایک کٹھ پتلی کے مانند ڈوریں ہمیشہ نانی اماں کے ہاتھوں میں رہیں۔ یہ ہم نہیں جان سکے کہ کیا ماں جی واقعی محمد علی سے شمیم آرا کی شادی کے حق میں تھیں یا انہوں نے انہیں ایک حد تک ڈھیل دے رکھی تھی؟

محمد علی اپنی شخصی وجاہت، رکھ رکھاؤ، وضع داری اور شرافت کے باعث ماں جی کو پسند تو تھے لیکن شمیم آرا کے دورِ عروج میں وہ ان کی شادی کرنے کے حق میں نہ تھیں۔ اگر محمد علی کی زندگی میں زیبا اور ایرانی کی اداکارہ شہ پارہ نہ داخل ہوتیں تو اس کہانی کا کیا انجام ہوتا؟ یہ ہم خود بھی نہ جان سکے۔

اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے کے مطابق ہم یہ وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ فلمی ماحول میں زندگی بسر کرنے کے باوجود شمیم آرا ایک شرمیلی لڑکی تھیں۔ جن لوگوں نے ان سے بے تکلف اور قریب ہونے کی کوشش کی، شمیم آرا نے کسی تلخی یا ناراضی کے بغیر انہیں ایک خاص حد تک محدود رہنے کا احساس دلا دیا۔ ہمارے ایک اداکار دوست نے جو اُن کے ساتھ کئی فلموں میں کام کرچکے تھے اور خاصے قریب تھے، ایک بار ہم سے کہا ''یار، یہ شمیم تو عجیب مردہ دل اور ٹھنڈے مزاج کی لڑکی ہے۔ بات چیت اور ہنسی مذاق تو کرلیتی ہے مگر ایک بار

معروف اداکارہ شمیم آرا

میں نے بے تکلفی سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تو اس نے ناراضی کے بغیر کہا ''اس کا کوئی فائدہ نہیں۔'' اور میں نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا۔

شمیم آرا کی فطری شرافت کا ایک سبب غالباً ان کے والد کے خون کا اثر بھی تھا۔ ان کے والد آگرہ کے ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے شریف آدمی تھے۔ بیوی کی وفات کے بعد ان کی بچیوں کی پرورش کی ذمّے داری ان کی نانی کے سپرد کردی گئی جنہوں نے شمیم آرا کو ناچ گانے کی تربیت دینی شروع کردی۔ ان کے والد اس بات کے حق میں نہ تھے لیکن مجبور تھے اس لیے انہوں نے ان لوگوں سے قطع تعلق کرلیا۔ پاکستان آنے کے بعد شمیم آرا نے اپنے والد سے کبھی ملاقات نہیں کی بلکہ انہیں دیکھا تک نہیں۔ جب وہ معروف اداکارہ بن گئیں تب بھی ان کے والد اس بات سے ناخوش تھے۔

ہم نے ان سے پوچھا ''تم اپنے والد سے کبھی نہیں ملیں؟''

''نہیں، ہاں ایک بار جب میں کراچی گئی تو مجھے معلوم ہوا کہ میرے والد مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے انہیں بچپن میں دیکھا تھا اس لیے ان کے چہرے مہرے کے بارے میں مجھے کچھ یاد نہیں تھا۔ میں نے جواب دیا کہ وہ جب چاہیں مجھ سے مل سکتے ہیں۔

چند دن کے بعد ایک ادھیڑ عمر کے باریش اور شکل صورت سے نہایت شریف اور بُردبار نظر آنے والے بزرگ مجھ سے ملنے کے لیے آئے۔ میں نے سر پر دوپٹا اوڑھ کر انہیں سلام کیا۔ انہوں نے سر کی جنبش سے سلام کا جواب دیا اور صوفے پر بیٹھ گئے۔ میں نے انہیں غور سے دیکھنے کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کوشش کی مگر ان کی نظریں فرش پر گڑی رہیں۔ شاید انہوں نے ایک بار بھی مجھے نظر بھر کر نہیں دیکھا۔ ہم دونوں کے پاس بات کرنے کے لیے کوئی موضوع نہ تھا۔ میں یہی سوچتی رہی کہ اپنے والد سے کیا بات کروں؟ غالباً وہ بھی اسی سوچ میں کھوئے ہوئے تھے۔

میں نے ان سے چائے کے لیے پوچھا مگر انہوں نے انکار کردیا۔ ہم دونوں چپ چاپ ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے رہے۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ ''اچھا، خدا حافظ۔ میں چلتا ہوں۔'' کہہ کر وہ رخصت ہوگئے۔ میں خاموشی سے انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ ان کے جانے کے بعد میں کافی دیر تک اداس اور الجھن میں رہی کہ مجھے ان سے باتیں کرنا چاہیے تھیں۔ یہ ہم باپ بیٹی کی پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں رہتے ہیں؟ کیا کرتے ہیں اور کیا انہوں نے دوسری شادی کرلی ہے یا نہیں؟

شمیم آرا کی زبانی یہ واقعہ سن کر ہم بھی سوچتے رہے کہ یہ تو کسی فلم کا منظر معلوم ہوتا ہے مگر یہ ایک حقیقی واقعہ تھا۔

وقت نے شمیم آرا کو ذہنی طور پر اتنا مضبوط بنا دیا تھا کہ وہ اپنے کسی ردِعمل یا تاثر کا اپنے چہرے سے اظہار نہیں کرتی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے انہوں نے اپنے چہرے پر ایک نقاب پہن رکھا ہے جس کی وجہ سے ان کا اصلی چہرہ اور تاثرات نگاہوں سے اوجھل ہیں۔

شمیم آرا کو سچی خوشی کبھی ملی یا نہیں؟ اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ ماں جی کی وفات کے بعد انہیں خودمختاری حاصل ہوگئی مگر وہ فیصلہ کرنے کی قوت سے محروم تھیں اس لیے اپنی نجی زندگی اور شادیوں کے بارے میں انہوں نے ہمیشہ غلط فیصلے کیے جن کا نقصان بھی اٹھایا۔

ماں جی کی زندگی میں ایک بلوچ قبیلے کے سردار سے ان کا نام منسوب کیا گیا۔ ان کا نام سردار رند تھا۔ وہ بلوچ سردار اور نوجوان تھے۔ فلم ایکٹریسوں میں دلچسپی رکھتے تھے۔ ماں جی نے ان کا اثر و رسوخ اور دولت مندی کے باعث ان کی حوصلہ افزائی بھی کی یہاں تک کہ انہوں نے اس زمانے میں ایک قیمتی مرسیڈیز کار شمیم آرا کی نذر کردی۔ ایک بار شمیم آرا اینڈ فیملی کو بذریعہ کار لاہور سے کراچی جانا تھا۔ سردار رند بھی اپنی کار میں شریکِ سفر ہوگئے۔ سیہون شریف میں ان لوگوں کو قیام کرنا تھا۔ قیام کا بندوبست سردار رند نے کیا تھا۔ بعد میں سردار رند نے اعلان کیا کہ سیہون شریف میں ان کی اور شمیم آرا کی شادی ہوچکی ہے۔ شمیم اپنی مرسیڈیز میں سوار ہوکر ماموں کے ساتھ کراچی پہنچنے میں کامیاب ہوگئیں کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اگر انہوں نے سیہون شریف میں قیام کیا تو بہت مشکل پیدا ہوجائے گی۔

اخبارات میں سردار رند کے ساتھ شمیم آرا کی شادی کی خبریں شائع ہوئیں تو ہمیں بھی بہت حیرت ہوئی مگر شمیم آرا نے اس شادی کی تردید کردی۔ جب ہم سے ملاقات ہوئی تو دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا کہ ان کی مرضی کے بغیر یہ نکاح ''گن پوائنٹ'' پر زبردستی ہوا تھا اور وہ اس کو تسلیم نہیں کرتیں۔ انہوں نے سردار رند سے طلاق حاصل کرنے کی کوشش کی مگر وہ کسی طرح آمادہ نہ ہوتے۔ یہ دور شمیم آرا کے لیے بہت پریشان کن تھا۔ اتفاق سے سردار رند ایک ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہوگئے۔ اس طرح شمیم آرا کو اس نکاح سے آزادی حاصل ہوگئی۔ اگر وہ زندہ رہتے تو خدا جانے حالات کیا صورت اختیار کرتے۔ سردار رند ایک مہذب اور تعلیم یافتہ نوجوان رئیس زادے تھے۔ ان کی خاندانی شادی ہوچکی تھی مگر سرداروں کے لیے یہ ایک معمول ہے۔

شمیم آرا کراچی سے لاہور آئیں تو ہم نے ان سے مل کر پوچھا کہ اصل واقعہ کیا ہے؟ انہوں نے ہمیں اعتماد میں لے کر اپنی گن پوائنٹ والی کہانی سنادی اور کہا کہ اگر میری رضامندی شامل ہوتی تو میں شادی کی تردید کیوں کرتی؟

ہم نے کہا ''مگر وہ ایک مہذب اور دولت مند بااثر نوجوان ہیں۔ ان سے شادی پر تمہیں کیا اعتراض ہے؟''

انہوں نے کہا ''آفاقی صاحب، ایک تو وہ بلوچ سردار ہیں۔ شہر میں ان سرداروں کا رویہ اور ہوتا ہے لیکن اپنے علاقے میں وہ خالص سردار ہوتے ہیں۔ ان کی ایک شادی ہوچکی ہے اور مجھ سے شادی کرنے کے بعد وہ مجھے بھی گھر میں محبوس کردیں گے۔ گھر سے باہر نکلنے پر پابندیاں لگادیں گے۔ ظاہر ہے کہ میں ان کے علاقے میں ان کی مرضی کی پابند ہوں گی۔ جبکہ انہوں نے خاندان میں بھی ایک شادی کر رکھی ہے۔ ان حالات میں ایک ایکٹریس بیوی کی کیا اہمیت ہوگی؟''

ان کے دلائل معقول تھے۔ ہم نے صرف اتنا کہا کہ انہیں چاہیے تھا کہ یہ نوبت ہی نہ آنے دیتیں تو بہتر تھا۔

''میں کیا کرتی، ماں جی کی مرضی کے خلاف میں کیا کرسکتی ہوں؟''

''مگر تم نے ماں جی کی مرضی کے خلاف فیصلہ کیسے کرلیا؟''

''میں نے ماں جی کو سمجھایا اور دولھا بھائی (ماموں) نے بھی میرا ساتھ دیا اس لیے ماں جی مجبوراً خاموش ہوگئیں۔''

شمیم آرا کی شادی کا مسئلہ گمبھیر ہوتا جارہا تھا۔ ہر روز کوئی نیا اسکینڈل یا کہانی سامنے آجاتی تھی۔ ان سے شادی کے کئی امیدوار تھے جن میں ڈبلیو زیڈ احمد کے صاحب زادے ہدایت کار فرید احمد بھی شامل تھے اور یہ حقیقت ہے کہ فرید احمد شمیم آرا سے واقعی عشق کرتے تھے۔

سردیوں کا موسم تھا۔ ایک شام ہم اسٹوڈیو سے ان کے ساتھ ان کے گھر گئے تو ائرپورٹ پر جاکر کافی پینے کا پروگرام بنایا گیا۔ ماں جی نے بھی انہیں ہمارے ساتھ تنہا جانے کی اجازت دے دی۔

کار میں بیٹھتے ہی انہوں نے پوچھا ''ہم کافی پینے کے لیے اتنی دور کیوں جارہے ہیں؟''

ہم نے کہا ''دراصل ہم کچھ سیریس معاملات پر بات کرنا چاہتے ہیں۔''

وہ مسکرائیں ''ایسے کیا معاملات ہیں؟''

ہم نے کہا ''یہ ائرپورٹ جاکر بتائیں گے۔''

ائرپورٹ پر ریستوران کے باہر ہم نے کار روک کر کافی کا آرڈر دیا۔ شمیم آرا نے بے تابی سے پوچھا ''اب بتائیے، کیا بات کرنی ہے؟''

''تمہاری شادی کے بارے میں تفصیل سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے تو یہ بتاؤ کہ کون کون لوگ ہیں جو تم سے شادی کے خواہش مند ہیں؟''

انہوں نے ایک سرد آہ بھری اور کہا ''آفاقی صاحب، بہت لمبی فہرست ہے۔ کم از کم بائیس امیدوار ہیں اس لیے فیصلہ کرنا مشکل ہورہا ہے۔''

''ہمیں بتاؤ، شاید ہم کوئی اچھی رائے دے سکیں؟''

انہوں نے شرارت سے کہا ''اس فہرست میں آپ بھی شامل ہیں۔''

ہم نے کہا ''مہربانی سے ہمیں تو اس فہرست سے خارج ہی کردو۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ یہ ناممکن ہے۔''

''مگر کیوں؟''

''اس کی بہت سی وجوہات ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ ہم خود اور ہمارے گھر والے کسی اداکارہ سے ہماری

اداکار وحید مراد اور زیبا

شادی کے حامی نہیں ہیں۔ ہم بہت گھریلو سادہ زندگی بسر کرنے والے لوگ ہیں۔ گلیمر کا یہ بوجھ برداشت نہ کرسکیں گے۔ بہرحال، اس باب کو ختم کرکے آگے بتاؤ۔''

انہوں نے ہمیں مختلف امیدواروں کے بارے میں بتایا۔ ان میں ایک کراچی کے نوجوان جوہری تھے جن کے گھر والے بھی اس شادی پر رضامند تھے۔

''تو پھر رکاوٹ کہاں ہے؟''

''وہ لوگ بہت پرانے، دقیانوسی خیالات کے ہیں۔ سب عورتیں برقع پہنتی ہیں۔ ان کے گھر کا ماحول میری سوچ کے مطابق نہیں ہے۔''

''اوکے، آگے؟''

''لاہور کے ایک سینما اونر ہیں۔'' انہوں نے ان کا نام بھی ہمیں بتایا۔

ہم نے کہا ''مگر وہ کافی عمر کے شادی شدہ اور صاحبِ اولاد ہیں۔ ان کے گھر کا ماحول بھی بہت گھٹا ہوا ہے۔''

''ٹھیک ہے..... اور.....؟''

ایک ایک کرکے انہوں نے کئی نام بتائے اور ان کی خامیاں بتا کر انہیں مسترد کردیا۔

ہم نے کہا ''شمیم، فرید بہت موزوں شخص ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ، خاندانی۔ سنا ہے اب تو احمد صاحب بھی اس شادی کی رضامندی دے چکے ہیں۔''

انہوں نے کہا ''آفاقی صاحب، فرید احمد تیسرے اخراجات نہیں برداشت کرسکتے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہم نے کہا ''دیکھو، وہ ایک دولت منداور بااثر باپ کے بیٹے ہیں اور ایک بڑی جائداد ان کے حصے میں آئے گی۔ اس کے علاوہ ان کی ایک فلم ''عندلیب'' آج کل زیر تکمیل ہے۔ اگر یہ فلم ہٹ ہوگئی تو فرید احمد بہت بڑے ڈائریکٹر بن جائیں گے اور پھر یہ بھی خیال کرو کہ وہ تم سے سچی محبت کرتے ہیں۔''

شمیم آرا خاموش ہوگئیں۔

ہم نے کہا ''بھئی کچھ تو بولو۔''

کہنے لگیں ''بس، آفاقی صاحب جی نہیں چاہتا۔''

اس کے بعد کسی اور دلیل کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

شمیم آرا نے اس کے بعد اگفا گیورٹ کے پاکستان میں ڈسٹری بیوٹر اور ایک کاروباری گھرانے کے فرد مجید کریم سے شادی کرلی۔ اس کی اطلاع بھی ہمیں اخبار کے ذریعے ہی ملی۔ مجید کریم ایک تعلیم یافتہ اور خوش شکل نوجوان تھے مگر شادی شدہ تھے اور ان کی شادی اپنی برادری ہی میں ہوئی تھی۔ میمن گھرانوں میں عموماً کاروبار اور سرمایہ کاری بھی سانجھی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے شمیم سے کہا کہ... فی الحال خاندانی مصلحتوں کی خاطر ہم اس شادی کو خفیہ رکھیں گے۔

ہماری شمیم سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ کسی شریف اور تعلیم یافتہ آدمی سے شادی کرنا۔''

اخبارات میں مصلحتاً دونوں اس شادی کی تردید ہی کرتے رہے۔ اپنے پہلے بچے کی پیدائش کے موقعے پر شمیم آرا لندن چلی گئیں جہاں ان کا اکلوتا بیٹا سلمان کریم پیدا ہوا۔ اس طرح وہ پیدائشی برطانوی شہری بن گیا۔ سلمان بچپن ہی سے ایک ہونہار، سعادت منداور ذہین بچہ تھا۔ اس نے کبھی دولت مندی یا ماں کی شہرت سے فائدہ نہیں اٹھایا۔

اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گیا اور آج کل وہاں بہت اچھی ملازمت کررہا ہے۔ اس کو اپنی ماں سے بے انتہا محبت ہے۔ شمیم آرا پر جب پہلی بار فالج کا حملہ ہوا تھا تو سلمان سارے کام چھوڑ کر لاہور میں رہا۔ پھر انہیں اپنے ساتھ لندن لے گیا۔ سلمان کی ایک پاکستانی لڑکی سے شادی ہوئی تھی جو ناکام ہوئی۔ اس نے دوسری شادی ایک انگریز خاتون سے کی۔ شمیم بیٹے کے اصرار پر اس کے پاس جاکر رہتی تو تھیں مگر وہاں اکیلے رہ کر پردیسی ماحول میں ان کا دل نہیں لگتا تھا اور وہ پاکستان چلی آتی تھیں۔ کچھ عرصے بعد جب ان پر فالج کا دوسرا شدید حملہ ہوا تو وہ پاکستان ہی میں تھیں۔ سلمان فوراً لاہور پہنچ گیا اور دن رات ماں کی تیمارداری میں مصروف رہا۔ ان کی حالت نہ سنبھل سکی اور لاہور میں دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا اس لیے وہ اپنی والدہ کو اپنے ساتھ ہی لے گیا ہے اور تادم تحریر (جون 2011ء) وہ بدستور کوما ہی میں ہیں۔

جہاں تک مجید کریم سے شادی کا تعلق ہے اس شادی کی خبر ان کے خاندان سے بھی چھپی نہ رہ سکی اور گھر والوں نے زور دیا کہ وہ اس شادی کو ختم کریں ورنہ ان کا حقہ پانی بند کردیا جائے گا یعنی سرمایہ چھین لیا جائے گا۔ اس طرح مجبوراً انہوں نے یہ شادی ختم کرنے کا فیصلہ کیا اور شمیم آرا ایک بار پھر تنہا رہ گئیں۔

اس دوران میں جب وہ کراچی گئی ہوئی تھیں تو ایک دن خبر آئی کہ انہوں نے فرید احمد سے شادی کرلی ہے مگر تین دن بعد ہی علیحدگی بھی ہوگئی۔ اس کی وجوہات فرید احمد نے کبھی نہیں بیان کیں اور شمیم آرا بھی اس موضوع کو ٹال جاتی ہیں۔

شمیم آرا نے فلم سازی اور ہدایت کاری شروع کی تو فلم ساز و تقسیم کار شمی ملک سے پہلے ان کے کاروباری تعلقات قائم ہوئے اور پھر ان میں گہرائی پیدا ہوگئی۔ شمی ملک ایک صاحب حیثیت اور بااثر آدمی تھے لیکن شادی شدہ اور صاحب اولاد۔ وہ شمیم آرا کی فلموں کے تقسیم کار تھے اس طرح دونوں کا باہمی میل جول بہت زیادہ ہوگیا۔

شمیم آرا کا مطالبہ تھا کہ میں دوسری بیوی بننا پسند نہیں کرتی۔ آپ اپنی موجودہ بیگم کو طلاق دیں گے تو یہ شادی ہوسکتی ہے۔ ملک صاحب کے لیے یہ ایک مشکل مرحلہ تھا کیونکہ انہیں اپنے بیوی بچے عزیز تھے اور ان کے خاندان ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ کشمکش کئی سال تک چلتی رہی، اس دوران میں شمیم آرا فلمیں بناتی رہیں جن کے تقسیم کار شمی ملک ہی تھے۔

کچھ عرصہ اسی طرح گزر گیا اور فلم والوں نے باتیں بنانی شروع کردیں تو یہ مسئلہ سنگین ہوگیا یہاں تک کہ تعلق ہی ختم ہوگیا۔ شمی ملک اور شمیم آرا دونوں کو اس کا بہت افسوس تھا مگر دونوں کی مجبوریاں راہ میں حائل تھیں۔

شمیم آرا میں ایک خوبی یہ ہے کہ ذاتی معاملات کو انہوں نے کبھی فلمی سرگرمیوں پر اثرانداز نہیں ہونے دیا اور فلمیں بناتی رہیں۔ انہوں نے اتنے مختلف ملکوں میں اپنی فلموں کی شوٹنگ کی کہ ہم نے ان کا نام ''ابن بطوطہ'' رکھ دیا۔ پہلے

انہوں نے لندن میں ''پلے بوائے'' بنائی جو بہت کامیاب رہی۔ ہم مصنف کی حیثیت سے یونٹ کے ساتھ گئے تھے۔ بابرہ شریف اور ندیم اس میں مرکزی کردار تھے۔ آصف رضا میر اور ایک صحافی کی بیٹی شمسی شیخ کو بھی اس فلم میں پہلی بار متعارف کرایا گیا تھا۔ شمسی شیخ کے والد بہت نامور صحافی تھے۔ ان کی والدہ انگریز تھیں اور شوہر کی وفات کے بعد بھی وہ پاکستان ہی میں رہیں اور بچی کی تعلیم و تربیت بھی خود ہی کی۔ آخر وقت تک وہ پاکستان ہی میں رہیں۔ شمسی شیخ فلموں میں کامیاب نہ ہوسکیں اور کچھ عرصے بعد انہوں نے شادی کرلی۔ آصف رضا میر نے شمیم آرا کی اگلی فلم ''مس ہانگ کانگ'' میں بابرہ شریف کے ساتھ مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ اس فلم میں عثمان پیرزادہ نے بھی پہلی بار فلم میں کام کیا تھا۔

پلے بوائے کے بعد ''مس ہانگ کانگ'' بھی بہت کامیاب فلم تھی۔ اس کے بعد انہوں نے مس فلاں اور مس فلاں کا طویل سلسلہ شروع کردیا۔ کبھی انہوں نے منیلا میں فلم بنائی۔ کبھی سری لنکا میں، کبھی بنکاک میں، کبھی استنبول میں۔ اور یہ سب فلمیں بہت کامیاب ہوئی تھیں۔ اس زمانے میں ان کا ستارہ عروج پر تھا اور وہ جو فلم بناتی تھیں، وہ سپرہٹ ہوجاتی تھی۔

ہم نے بتایا کہ شمیم آرا کی نجی اور ازدواجی زندگی کبھی کامیاب نہ رہی۔ انہیں سچی گھریلو خوشی کبھی نہ مل سکی۔ وہ اپنے رشتے داروں کی پرورش کرتی رہیں۔ ہر ایک کو مکان بنادیا۔ وقتاً فوقتاً ہر طرح سے امداد بھی کرتی رہیں۔

ہم نے جب شمیم آرا کو فرید احمد سے شادی کرنے پر زور دیا تھا تو یہ دلیل بھی دی تھی کہ اگر وہ آج دولت مند نہیں ہیں تو کیا ہوا، بیوی تو اپنی قسمت ساتھ لے کر آتی ہے، وہ کبھی کنگال شوہر کو دولت منداور کبھی دولت منداور کامیاب شوہر کو ناکام اور کنگال کردیتی ہیں۔

یہی اصول شوہروں کے معاملے میں بھی درست ثابت ہوا ہے۔ بعض شوہر اپنی بیویوں کے لیے خوش نصیب نہیں ہوتے۔ یہی معاملہ شمیم آرا کے ساتھ بھی پیش آیا۔

ایک زمانے میں جب سارے ملک میں فنانس کمپنیوں کا ... تھا تو کراچی کی ایک فنانس کمپنی کے مالک اپنے پارٹنر کے ساتھ لاہور آئے۔ ان دونوں کی بہت آؤ بھگت کی گئی کیونکہ فلم سازوں کو امید تھی کہ وہ فلموں میں بھی سرمایہ کاری کریں گے۔ ان میں سے ایک پارٹنر دبیر الحسن بھی تھے۔ وہ

اداکار وحید مراد ہیرا اور پتھر میں

ایک اچھی شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا بیان تھا کہ وہ ہر قسم کے کاروبار کا تجربہ رکھتے ہیں۔ وہ شادی شدہ تھے اور ان کے بیوی بچے کراچی رہا کرتے تھے۔ جب فنانس کمپنیوں کا ستارہ گردش میں آیا اور پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو دبیر صاحب اور ان کے پارٹنر، جن کا نام یاد نہیں آرہا، بھی احتساب کی زد میں آگئے۔ اس مشکل وقت میں شمیم آرا نے دبیر الحسن صاحب کی ہر طرح مدد کی اور انہیں اس مصیبت سے چھٹکارا دلایا لیکن انہیں معلوم نہ تھا کہ دبیر صاحب کو ایک مصیبت سے چھٹکارا دلانے کے بعد وہ بذاتِ خود مصائب کو دعوت دے رہی ہیں۔

ایک دن کسی نے بتایا کہ شمیم آرا نے دبیر الحسن صاحب سے شادی کرلی ہے۔ شمیم کی ہمیشہ یہ عادت رہی ہے کہ ہمارے مشورے کے بغیر جو فلمی یا ذاتی کام کرتی تھیں اور پھنس جاتی تھیں تو ہم سے رجوع کیا جاتا تھا۔ سلمان اس زمانے میں نوعمر تھا۔ وہ بھی اپنی ماں سے کہتا تھا کہ جب بھی کوئی مشکل پڑتی ہے تو آپ کو آفاقی انکل یاد آجاتے ہیں۔

اس شادی کے بارے میں شمیم آرا نے ہم سے کوئی مشورہ لینا یا تذکرہ کیا۔ ایک دن شام کے وقت ایک ہونڈا کار ہماری کوٹھی میں داخل ہوئی اور اس میں سے شمیم آرا اور دبیر الحسن برآمد ہوئے۔ ہم لان میں ہی بیٹھے تھے۔ علیک سلیک کے بعد شمیم نے کہا ''آفاقی صاحب! میں دبیر صاحب سے شادی کرنے کے سلسلے میں آپ سے منظوری لینے آئی ہوں۔''

ہم نے کہا ''شادی تو ہوچکی، اب منظوری کیسی؟''

وہ کچھ شرمندہ ہوگئیں ''آپ کی رائے بھی تو ضروری ہے۔''

ہم نے کہا ''اگر ہم نے مخالف رائے دی تو کیا یہ شادی ختم ہوجائے گی؟''

دبیر صاحب ہنسنے لگے، بولے ''دراصل شمیم تو پہلے ہی آپ سے مشورہ لینے کے لیے کہہ رہی تھیں مگر یہ سب کچھ اتنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جلدی میں ہوا کہ وقت ہی نہ مل سکا۔"

ہم نے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر انہیں کافی پلائی اور لبنیٰ سے دبیر صاحب کا تعارف کرایا۔ شمیم ہمیں دوسرے کمرے میں لے گئیں اور پوچھنے لگیں "کیوں آفاقی صاحب، آپ کو دبیر صاحب کیسے لگے؟"

ہم نے کہا "بھئی ہماری پسند ناپسند کا کیا سوال ہے۔ آپ دونوں ایک دوسرے کو اچھے لگے اور شادی ہوگئی۔ دعا ہے کہ یہ شادی بہت کامیاب ہو۔"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ دبیر صاحب کے اور شمیم آرا کے ستارے کبھی نہیں مل سکے بلکہ معاملہ برعکس نکلا۔ دبیر صاحب نے اپنی گفتگو کے ذریعے شمیم آرا پر ایسا جادو کیا تھا کہ وہ ان کی ہر بات پر یقین کر لیتی تھیں۔ ان کے مشورے پر انہوں نے ایک "رائس مل" خرید لی۔ پھر ایک شاندار عمارت میں ایڈورٹائزنگ کمپنی قائم کر لی۔ ہم نے پوچھا کہ کیا انہیں ان دونوں کاموں کا تجربہ ہے؟

بولیں "یہ تو کراچی میں ایڈورٹائزنگ کرتے رہے ہیں اور رائس مل چلانا تو ایسا مشکل کام نہیں ہے۔"

وہ ہمیں لاہور کے گردونواح میں یہ رائس مل دکھانے بھی لے گئیں۔ ہم نے پوچھا "آپ نے یہ معلوم کیا کہ اس مل میں مشینیں کتنی پرانی ہیں اور کیا ان کی مرمت پر کچھ خرچ تو نہیں کرنا پڑے گا؟"

کہنے لگیں "دبیر صاحب نے سب کچھ دیکھ لیا ہے۔"

"مگر آپ کو اس مل کو چلانے کے لیے لاکھوں روپے کے چاول کا ذخیرہ کرنا ہوگا اور یہ کام فصل کے شروع میں ہی کر لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد چاول مہنگے ہو جاتے ہیں۔"

انہوں نے کہا "مجھے کچھ پتا نہیں، دبیر صاحب سب جانتے ہیں۔"

دبیر صاحب نے ایک دن اعلان کیا کہ وہ اسکرپٹ رائٹنگ میں ہمارے شاگرد ہو گئے ہیں اور شمیم آرا کی اگلی فلم کی کہانی ہماری منظوری سے وہی لکھ رہے ہیں۔

یہ اعلان انہوں نے ایک خصوصی تقریب میں کیا تھا۔ ہم حیران رہ گئے مگر خاموش رہے۔ ان کے ایک دو فلم اسکرپٹ پر تو شمیم آرا نے ہم سے نظر ثانی کرائی اور یہ فلمیں بھی کامیاب ہوئیں مگر بعد میں یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ فلمیں فلاپ ہونے لگیں تو دبیر صاحب کے مشورے پر ایک ڈراما سیریل شروع کر دی گئی جو آج تک ریلیز نہیں ہو سکی ہے۔ ایڈورٹائزنگ کمپنی فیل ہوگئی اور لاکھوں کے قرضے شمیم آرا کو اتارنے پڑے۔ "رائس مل" کے منصوبے میں بھی بھاری نقصان ہوا۔

بدقسمتی یہ ہوئی کہ گلبرگ لاہور میں شمیم آرا کا تعمیر کرایا ہوا بے حد خوبصورت اور شاندار گھر بھاری کرائے پر دے دیا گیا اور شمیم آرا کرائے کے مکانوں میں رہنے لگیں، کچھ عرصہ بعد ایک دن سنا کہ کرائے دار نہ تو کرایہ دے رہے ہیں اور نہ ہی کوٹھی خالی کر رہے ہیں اس لیے ان پر مقدمہ کر دیا گیا ہے۔ ہم سے .... مشورہ ہی نہیں لیا گیا۔ ہم کہتے کہ وکیل سے ہم کو بھی تو ملواؤ، آخر مقدمے کی کیفیت کیا ہے؟"

جواب میں شمیم کہتیں "دبیر صاحب وکیل کو اچھی طرح جانتے ہیں۔"

قصہ مختصر یہ کہ نہ تو کوٹھی خالی ہوئی نہ اس کا کرایہ مل سکا۔ یہاں تک کہ شمیم آرا مفلوج ہو کر بے ہوشی کے عالم میں لاہور سے رخصت ہوگئیں۔ آج کل اس کوٹھی کی قیمت چھ سات کروڑ روپے ہے لیکن شمیم آرا کے لیے یہ شجرِ ممنوعہ ہے۔ بدقسمتی سے شمیم آرا نے فلمسازی اور ہدایت کاری ترک کرنے کے بعد ہر کام میں نقصان ہی اٹھایا، وہ جس چیز کو ہاتھ لگاتی تھیں، وہ مٹی بن جاتی تھی حالانکہ پہلے معاملہ اس کے برعکس تھا۔

شمیم آرا نے بہت اچھے دن دیکھے، بہت شہرت، مقبولیت اور دولت کمائی۔ فن کارہ کی حیثیت سے بھی اپنا لوہا منوایا اور فلم ساز و ہدایت کارہ کی حیثیت سے بھی بہت کامیابیاں حاصل کیں۔ لیکن قسمت پلٹا کھالے تو سونا بھی مٹی بن جاتی ہے۔ یہی معاملہ شمیم آرا کے ساتھ بھی پیش آیا۔

بچپن میں ہم نے ایک کہانی سنی تھی۔ ایک ریاست کا راجا نل بے حد کامیاب اور طاقتور راجا تھا مگر جوتشیوں نے بتایا تھا کہ اس کے ستارے گردش میں آنے والے ہیں۔ راجا نل کو جوا کھیلنے کا شوق دیوانگی کی حد تک تھا۔ ایک رات وہ جوا کھیلنے بیٹھا تو دوسرے راجا سے مسلسل ہارتا رہا یہاں تک اپنی رانی دمینتی کو بھی داؤ پر لگا کر ہار گیا، اس کے بعد وہ اپنی سلطنت بھی ہار گیا اور اسی لباس میں کپڑے جھاڑ کر کھڑا ہوگیا۔

اپنے دارالحکومت کو آنسو بھری نظروں سے دیکھتا ہوا وہ خاموشی سے رخصت ہوگیا اور جنگل کی راہ لی۔ اس کو یاد آیا کہ جنگل میں اس نے کچھ اشرفیاں ایک غار میں برے دنوں کے لیے رکھ دی تھیں۔ جب اس نے پوٹلی کھولی تو دیکھا کہ

اشرفیوں کی جگہ کوئلے پڑے ہیں۔

راجا نے مایوس ہو کر تنہا سفر جاری رکھا۔ بھوک نے ستایا تو خیال آیا کہ جب شکار پر جاتا تھا تو مختلف مقامات پر کھانے پینے کا سامان چھوڑ دیا جاتا تھا۔ راجا نے روٹیاں تلاش کیں، ان کی جگہ ریت ہاتھ لگی۔ راجا نے صبر کر لیا اور مصیبت کے دن جنگلوں میں گزارنے لگا یہاں تک کہ اس کی قسمت کے ستارے بدل گئے۔ اس کی ریاست میں اس کے وفاداروں نے بغاوت کر دی اور ریاست پر قابض راجا کو تخت و تاج چھوڑ کر فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔

اس کے بعد انہیں اپنے محبوب راجا نل کی جستجو ہوئی اور وہ اس کی تلاش میں جنگل جنگل مارے پھرے۔ آخر ایک ویران جگہ پر انہوں نے اپنے راجا کو دیکھا جس کا لباس بوسیدہ اور تار تار ہو چکا تھا۔ جنگل کی رہائش کی وجہ سے وہ بھی ایک جنگلی ہی لگتا تھا جس کے بال اور ڈاڑھی بے تحاشا بڑھی ہوئی تھی۔

راجا کی وفادار فوج نے راجا کو تسلیمات کیں اور پھر خوش خبری سنائی کہ اس کی ریاست پر قابض راجا فرار ہو چکا ہے۔ انہوں نے راجا سے درخواست کی کہ آپ واپس چل کر اپنا تخت و تاج سنبھالیں۔ راجا کو نہلا دھلا کر لباس فاخرہ پہنایا گیا جو اس کے فوجی اپنے ہمراہ لائے تھے۔ اس طرح پوری شان و شوکت کے ساتھ راجا کا قافلہ واپس اپنی ریاست کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں راجا نے غار میں ان روٹیوں کو دیکھا جو ریت بن چکی تھیں مگر اب جو دیکھا تو وہاں سوکھی ہوئی روٹیاں پڑی تھیں اسی طرح جب اس نے اشرفیوں کی پوٹلی کو دیکھا، جس میں اشرفیاں کوئلوں میں تبدیل ہو چکی تھیں لیکن اب وہ دوبارہ اشرفیوں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔

راجا پورے جاہ و جلال کے ساتھ اپنے دارالحکومت میں داخل ہوا تو رعایا نے اپنے بچھڑے ہوئے راجا کا جوش و خروش کے ساتھ استقبال کیا۔ راجا نے بھی رعایا کو انعام و اکرام سے نوازا۔

جب وہ محل میں پہنچا تو اس کی رانی دمینتی اس کی منتظر تھی۔ یہ داستان راجا نل اور دمینتی کی کہانی کے نام سے مشہور ہے۔

اس کہانی میں ایک سبق تو یہ ہے کہ انسان کی اپنی تقدیر پر کوئی اختیار نہیں ہے۔ جب اس کی قسمت خراب ہو جائے تو ہر کام الٹا ہو جاتا ہے اور انسان کو جوئے جیسی بری عادتیں اختیار نہیں کرنی چاہئیں چونکہ جو شخص جوئے کا عادی ہو جاتا ہے وہ جیتنے کی دھن میں اپنا سب کچھ ہار دیتا ہے۔

ہم جب کسی کے بگڑے ہوئے حالات دیکھتے ہیں تو ہمیں راجا نل دمینتی کی یہ کہانی یاد آ جاتی ہے۔ ایک زمانے میں جب ہم سری لنکا اور کولمبو کے دوروں پر اکثر جایا کرتے تھے اور کولمبو میں عموماً ہالی ڈے ان ہوٹل میں قیام کرتے تھے تو رفتہ رفتہ وہاں سب سے شناسائی ہوگئی۔ استقبالیہ پر ایک دھان پان خوش شکل لڑکی دن کے وقت ڈیوٹی پر ہوتی تھی اور اس سے بھی ہماری اچھی خاصی بے تکلفی ہوگئی تھی۔ ہم نے ایک بار اس سے اس کا نام پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس کا نام دمینتی ہے۔

ہم نے کہا "یہ تو بہت افسانوی نام ہے۔ تم راجا نل اور دمینتی کی کہانی سے واقف ہو؟"

اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ ہم نے اس کو راجا نل اور دمینتی کا قصہ سنایا اور کہا کہ گھر جا کر اپنے والدین سے اس کہانی کے بارے میں دریافت کرنا۔ اگلے روز اس نے بتایا کہ اس کے باپ کو بھی یہ کہانی معلوم ہے۔ ہم نے پوچھا۔ "تمہاری شادی ہوگئی ہے؟"

بولی "نہیں۔"

ہم نے کہا "یاد رکھو، راجا نل جیسے جواری سے ہرگز شادی نہ کرنا۔" وہ ہنسنے لگی۔

پاکستانی فلم پروڈیوسر ایسوسی ایشن کے جنرل سیکریٹری عزیز احمد بھی ہمارے ساتھ تھے۔ عزیز صاحب کئی بار کولمبو جا چکے تھے اور ان کے مقامی فلم والوں سے کافی گہرے تعلقات تھے اس لیے انہیں اپنے ساتھ لے جانا پڑا اور ان کی وجہ سے وہاں کی اہم شخصیات سے تعارف ہوگیا۔

شمیم آرا نے اپنی فلموں کے علاوہ پاکستان کے فلمی وفد کی رکن کی حیثیت سے بھی بہت سے بیرونی سفر کیے۔ اسی لیے ان کا مشاہدہ بہت گہرا تھا جو فلم سازی میں ان کے بہت کام آیا۔

فلم ساز کی حیثیت سے وہ ایک بہت اچھی فلم ساز تھیں اور فلم کی ضرورت کے مطابق پیسا خرچ کرنے سے گریز نہیں کرتی تھیں، خواہ ان کے اپنے منافع میں ہی کمی کیوں نہ ہو جائے۔ وہ ہمیشہ سے ایک نرم دل، ہمدرد اور فیاض ہستی رہی ہیں۔ جب تک ماں جی کی حکمرانی تھی، وہ مجبور تھیں مگر جب انہیں خود مختاری ملی تو انہوں نے ہمیشہ فیاضی کا مظاہرہ کیا۔ جہاں تک حقوق العباد کا تعلق ہے، جہاں تک ہمارے علم میں ہے، انہوں نے یہ حقوق پوری طرح ادا کیے۔ اگر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نادانستہ کسی کا دل دکھایا ہو تو بات الگ ہے لیکن جان بوجھ کر انہوں نے کبھی کسی کی دل شکنی نہیں کی۔ بلکہ ہر ضرورت مند کے کام آئیں۔

ہاں، ایک بات جو اکثر ہمیں یاد آتی ہے وہ فرید احمد کا واقعہ ہے۔ یہاں تک تو شمیم آرا حق بجانب تھیں کہ فرید احمد سے شادی کرنے کے لیے ان کا دل گواہی نہیں دیتا تھا لیکن جب فرید احمد کینیڈا چلے گئے اور کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر پاکستان آئے تو کینیڈا کے ڈاکٹروں نے انہیں بتایا تھا کہ تمہاری زندگی زیادہ سے زیادہ مزید تین ماہ کی ہے، اب تمہیں کسی قسم کا پرہیز کرنے کی ضرورت نہیں ہے، جو چاہے کھاؤ پیو۔ جس طرح خوشی حاصل ہوتی ہے حاصل کرو اور زندگی کے باقی ماندہ ایام کو بہتر سے بہتر انداز سے گزارو۔

فرید احمد کینیڈا سے واپس آئے تو وحدت روڈ پر اپنے والد ڈبلیو زیڈ احمد کے پاس قیام کیا۔ احمد صاحب نے انہیں اپنا ذاتی بیڈ روم دے دیا تھا۔ وہ خود ہر وقت نمازیں پڑھ کر اور قرآن کی تلاوت کر کے ان کے لیے دعا کرتے رہتے تھے۔ احمد صاحب کی دو بیگمات سے دو بیٹے تھے۔ ان میں سے ایک طارق ان کے پاس بہت کم رہے پھر کینیڈا چلے گئے۔ فرید احمد والدین میں علیحدگی کے بعد احمد صاحب ہی کے پاس رہے۔ ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں احمد صاحب نے بھی کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ گورنمنٹ کالج میں تعلیم دلائی اور ہر طرح کی آسائش فراہم کی۔

ایسے جوان بیٹے کو اگر ''سزائے موت'' سنا دی گئی ہو تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ احمد صاحب کے دل پر کیا گزرتی ہوگی مگر وہ بہت صابر و شاکر انسان تھے۔

فرید احمد جس روز پاکستان پہنچے ہم اسی دن ان سے ملنے کے لیے گئے۔ وہ کمزور نظر آتے تھے مگر چہرے پر بیماری کا تاثر نہیں تھا۔ بہت پیار اور خلوص سے ملے اور پاکستان کے دوستوں اور فلم والوں کے بارے میں پوچھتے رہے۔ دراصل وہ شمیم آرا کے بارے میں دریافت کرنا چاہتے تھے مگر جھجک رہے تھے۔ جب نہ رہا گیا تو انہوں نے سرسری انداز میں پوچھا ''شمیم کا کیا حال ہے؟ سنا ہے کہ وہ تو بہت بڑی ڈائریکٹر بن گئی ہیں۔''

ہم نے کہا ''یہ تو سچ ہے۔ وہ پہلے جتنی کاہل تھیں، اب اتنی ہی پھرتیلی ہو گئی ہیں۔ فلموں پر فلمیں بنا رہی ہیں۔ اکثر شوٹنگ کے سلسلے میں دوسرے ملکوں کے سفر پر ہی رہتی ہیں۔''

فرید احمد مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

ہماری ان دنوں میں شمیم آرا سے ملاقات نہیں ہو رہی تھی۔ میں اور لبنیٰ قریب قریب ہر شام فرید احمد کے پاس جاتے تھے۔ دوسرے رشتے دار، دوست احباب اور ملاقاتی بھی آتے رہتے تھے۔ فرید احمد سب سے مسکرا کر باتیں کرتے۔ ہر ایک کا حال پوچھتے۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ وہ شخص ہے جس کی موت کی پیش گوئی کی جا چکی ہے بلکہ موت کا وقت بھی مقرر کر دیا گیا ہے۔

وہ رات گئے تک سگریٹ نوشی کرتے اور گپ شپ لگاتے رہتے۔ بظاہر ان کے چہرے سے تکلیف کا اظہار نہیں ہوتا تھا مگر احمد صاحب نے بتایا کہ تمام رات تکلیف کی وجہ سے بے چین رہتے ہیں اور سو نہیں سکتے۔ ہم نے ایک ہومیو پیتھک اور اکوپنکچر جاننے والے ڈاکٹر کو لا کر انہیں دکھایا۔ انہوں نے دوائیں تو دیں مگر ہم سے کہا کہ ان کا مرض بہت بڑھ چکا ہے۔ اب فائدے کا کوئی امکان نہیں ہے لیکن ان کی تکلیف میں ضرور کمی ہو جائے گی اور ایسا ہی ہوا۔

ایک دن احمد صاحب نے بتایا کہ پہلے تو وہ رات رات بھر درد سے بے تاب رہتے تھے۔ ان کی گردن اور شانوں میں اتنی ناقابلِ برداشت تکلیف ہوتی تھی کہ وہ بے اختیار تکلیف کا اظہار کرتے تھے اور احمد صاحب سے کہتے تھے ''میری گردن کٹوا دیں۔ گردن کی تکلیف برداشت نہیں ہوتی۔'' مگر اس دوائی اور علاج کے بعد درد میں بہت کمی ہو گئی تھی اور وہ رات کو آرام سے سو جاتے تھے۔ ہم نے اپنے ڈاکٹر دوست کا بہت شکریہ ادا کیا۔ یہ ان کی کرم فرمائی تھی کہ ہر شام نہیں تو دوسرے دن ضرور انہیں دیکھنے کے لیے آ جاتے تھے۔

فرید احمد سے ملنے کے لیے ان کے قریبی دوستوں کے علاوہ فلمی دنیا کے بھی لوگ آتے تھے۔ ان کی بیگم شمینہ احمد بھی باقاعدگی سے آیا کرتی تھیں۔ دراصل فرید احمد اس وقت ہر ایک کی توجہ، ہمدردی اور دعاؤں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔

آمد کے چند دن بعد انہوں نے ایک بار پھر سرسری طور پر پوچھا ''آفاقی صاحب، شمیم کا کیا حال ہے؟''

ہم کیا جواب دیتے؟

انہوں نے پوچھا ''کیا وہ آج کل لاہور میں نہیں ہیں؟''

ہم نے کہا ''آج کل تو لاہور ہی میں ہیں مگر فلم کی ایڈیٹنگ اور دوسرے کاموں میں بہت زیادہ مصروف

ہیں۔''

ہم جانتے تھے کہ یہ ایک بھونڈا سا عذر تھا اور فرید احمد بھی بخوبی جانتے تھے۔ مگر اپنی خودداری اور وضع داری سے مجبور تھے۔ اس لیے کھل کر بات نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ہمارے پاس بھی کوئی معقول بہانہ نہیں تھا۔ شمیم آرا کا یہ رویہ ہمارے لیے بھی بہت تکلیف دہ تھا مگر ہم نے اس سلسلے میں ان سے فون پر بھی کوئی بات نہیں کی۔ نہ ہی ان دنوں ہماری ان سے ملاقات ہوئی۔

فرید احمد کی زندگی کی میعاد کے دن کم ہوتے جا رہے تھے مگر اطمینان کی بات صرف یہ تھی کہ انہیں ناقابلِ برداشت تکلیف سے نجات مل گئی تھی۔

ایک صبح ڈبلیو زیڈ احمد صاحب کا فون آیا۔ ان کی آواز میں قابو پانے کے باوجود لرزش تھی۔ انہوں نے کہا ''آفاقی صاحب، سمیع چلا گیا۔''

گھر میں فرید احمد کو سمیع کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ احمد صاحب بہت باہمت اور حوصلہ مند انسان تھے مگر جوان بیٹے کی اس طرح جوانی میں موت نے انہیں کھوکھلا کر دیا تھا۔

ہم لبنیٰ کے ساتھ فوراً ان کے گھر پہنچ گئے۔ ابھی لوگ آنے شروع نہیں ہوئے تھے۔ احمد صاحب فرید کے بیڈ کے پاس ایک صوفے پر بیٹھے قرآن شریف کی تلاوت کر رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر انہوں نے قرآن شریف بند کر کے رکھ دیا۔ وہ اپنے جذبات پر قابو پا چکے تھے اور بالکل نارمل نظر آ رہے تھے۔ سامنے بیڈ پر ایک چادر سے ڈھکی ہوئی فرید احمد کی میت پڑی ہوئی تھی۔ ہم ان سے کیا کہتے۔ ہاتھ ملا کر خاموش بیٹھ گئے۔ کچھ دیر کمرے میں خاموشی رہی پھر ہم نے پوچھا۔

''احمد صاحب، کس وقت انتقال ہوا؟''

انہوں نے کہا ''رات کو ڈنر کھانے کے بعد کچھ ملنے والے آ گئے جنہیں سمیع کے پاس چھوڑ کر میں دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ وہ لوگ کافی پیتے اور باتیں کرتے رہے۔ سمیع نے سگریٹ بھی زیادہ پینے شروع کر دیے تھے مگر میرے سامنے گریز کرتے تھے اس لیے میں خود ہی موقع دینے کے لیے اٹھ کر چلا جاتا تھا۔

میں رات گئے کمرے میں آیا تو سمیع سونے کے لیے لیٹ گئے تھے۔ ایک دو باتیں کرنے کے بعد وہ کروٹ لے کر اور کمبل اوڑھ کر لیٹ گئے۔ میں صوفے پر بیٹھ کر پڑھتا رہا اور پھر سو گیا۔

صبح اٹھا اور منہ ہاتھ دھو کر تیار ہوا تو سمیع اس وقت تک سو رہے تھے۔ ملازمہ ناشتا لے کر آئی تو میں نے سمیع کو جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ میں ناشتے کے بعد اخبار پڑھتا رہا۔ جب ساڑھے دس بج گئے اور سمیع بیدار نہ ہوئے تو میں نے ملازم سے کافی لانے کو کہا اور کہا کہ سمیع صاحب سے بھی پوچھ لو اور ان کو بھی کافی دے دو۔

ملازم نے بیڈ کے پاس جا کر انہیں کئی بار آواز دی۔ جواب نہ ملنے پر وہ پریشان ہو کر میرے پاس آیا ''بڑے صاحب، چھوٹے صاحب تو بولتے ہی نہیں ہیں۔''

میں نے بیڈ کے پاس جا کر سمیع کو پکارا۔ جواب نہ ملا تو ان کے چہرے پر سے کمبل ہٹا کر دیکھا۔ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ سو رہے ہیں حالانکہ رات کو خدا جانے کس وقت ان کا انتقال ہو چکا تھا۔''

پھر ٹھنڈی آہ بھر کر کہا ''اللہ کا شکر ہے کہ وہ آرام سے دنیا سے رخصت ہوئے۔''

احمد صاحب ایک تھکے ماندے انسان نظر آ رہے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے ان کی شریکِ حیات کا بھی انتقال ہو چکا تھا اور اب یہ دوسرا صدمہ۔ مگر وہ اپنے جذبات پر مکمل قابو پا چکے تھے۔

ہم نے فرید احمد کے خاموش چہرے کو دیکھا۔ لگتا تھا جیسے آرام سے سو رہے ہیں۔ اس وقت معاً ایک خیال آیا کہ یہ شخص زندگی کے آخری لمحے تک صرف ایک ہستی کا منتظر تھا۔ شمیم آرا کا۔ مگر وہ نہ تو ملاقات کے لیے آئیں، نہ ہی فون کر کے مزاج پرسی کی۔ ان کی وفات پر تو نہیں مگر ان کی بے بسی اور محرومی پر ہماری آنکھیں نم ہو گئیں۔

شام کو ماڈل ٹاؤن کے قبرستان میں فرید احمد کو دفن کر دیا گیا۔ احمد صاحب بظاہر بالکل نارمل نظر آ رہے تھے مگر ان کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی، یہ وہی جانتے تھے۔

تدفین کے بعد گھر آ کر ہم نے شمیم کو فون کیا۔

''ہیلو، آفاقی صاحب، آپ کہاں ہیں۔ کتنے دنوں سے نہ ملاقات، نہ ٹیلی فون!''

ہم نے کہا ''اور آپ کہاں ہیں؟''

''میں تو یہیں لاہور میں ہوں مگر آپ کو فرصت ہی کب ہے؟''

ہم نے کہا ''اور آپ کو تو آج کل بہت فرصت ہے؟''

بولیں ''ہاں، آج کل شوٹنگ وغیرہ نہیں ہو رہی، آپ کسی دن آئیے نا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہم نے کہا ''شمیم، تمہیں معلوم ہے کہ فرید احمد کا انتقال ہوگیا ہے؟ ابھی انہیں دفن کر کے آرہے ہیں۔''

''ہاں، مجھے معلوم ہے۔ بہت افسوس ہوا۔''

''صرف افسوس!''

وہ چپ رہیں۔

ہم نے کہا ''شمیم، کتنے افسوس کی بات ہے کہ تم نے ایک مرنے والے شخص کی مزاج پرسی تک نہیں کی۔ نہ ہی اس سے ملنے گئیں حالانکہ ساری فلم انڈسٹری کے لوگ آتے جاتے رہے۔''

وہ بولیں ''آفاقی صاحب، میں تو یہ سوچ کر نہ گئی کہ نہ جانے احمد صاحب اور ان کے گھر والے کیا سوچیں گے؟ ہوسکتا ہے برا آنا پسند نہ کریں۔''

ہم نے کہا ''ثمینہ احمد ہر روز آتی رہیں مگر کسی نے انہیں کچھ نہ کہا۔ اگر تم وہاں چلی جاتیں تو کیا وہ لوگ تمہیں گھر سے نکال دیتے؟''

''نہیں، میرا مطلب یہ نہیں ہے۔ دیکھیے نا، اگر آپ مجھ سے کہتے اور مجھے ساتھ لے جاتے تو میں ضرور جاتی۔''

ہم نے کہا ''ساری دنیا میں تو تم ہمارے بغیر ہی پھرتی رہتی ہو۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔ ہمیں تو بہت دکھ ہوا۔ انسان کو اتنا بے حس بھی نہیں ہونا چاہیے۔''

وہ خاموش رہیں۔

سچ پوچھیے تو ہمیں واقعی ان پر بہت غصہ تھا۔

اس وقت تک دبیر الحسن صاحب سے ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔

اب ہم سوچتے ہیں کہ شمیم آرا کو جن حالات سے دو چار ہونا پڑا انہی کی بنا پر خیال آیا کہ کہیں یہ فرید احمد کے دل توڑنے کا سبب تو نہیں ہے؟

شمیم آرا تادم تحریر لندن میں نیم بے ہوشی کے عالم میں ہیں۔ ان کی صحت اور خوشیوں کے لیے دعا کرتے ہیں۔ اللہ انہیں صحت دے۔ انہوں نے بہت کامیابیاں دیکھی ہیں۔ بہت سی خوشیوں سے ہم کنار ہوئی ہیں مگر پھر جب قسمت نامہربان ہوئی تو کچھ بھی نہ رہا۔

اب لے دے کر ان کا ایک بیٹا ہے جو کہ ان کے دکھ سکھ کا ساتھی ہے۔ بہت سے دعا کرنے والے دوست بھی ہیں مگر وہ بھی زندگی کی سچی خوشی سے ہمیشہ محروم رہیں۔ شمیم آرا جیسی ہستی جس سے شادی کرنے کے امیدواروں میں بڑے بڑے لوگ شامل تھے، ازدواجی زندگی کی خوشیاں نہ پاسکیں۔ وہ ہمیشہ اپنی سہیلیوں کو شادی شدہ لوگوں سے شادی کرنے سے منع کرتی تھیں مگر قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ ان کے حصے میں ہمیشہ شادی شدہ مرد ہی آئے جو کہ درحقیقت ان کی شان کے شایان نہ تھے۔ تقدیر کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے؟

☆☆☆

مرزا غالب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اتنا عظیم شاعر نہ تو ان سے پہلے ہندوستان کی سرزمین نے پیدا کیا اور نہ ہی ان کے بعد ان کا ہم پایہ کوئی شاعر پیدا ہوگا۔ موجودہ زمانہ تو ویسے بھی ''عہد زوال'' ہے۔ ہر شعبے میں زوال کی نشانیاں واضح طور پر نظر آتی ہیں۔ اب غالب تو کیا پچھلی دو صدی میں مختلف شعبوں میں جیسے لوگ نمودار ہوئے اب تو ایسی قد آور شخصیات کے پیدا ہونے کا کوئی امکان ہی نظر نہیں آتا بشرطیکہ وقت کا پہیا الٹا گھوم جائے۔ اس بات کے امکانات ہیں اور ایسا ہونا بظاہر ناممکن نظر آتا ہے۔

غالب کے بارے میں ہندوستان اور پاکستان میں جتنا بھی لکھا گیا ہے شاید ہی کسی اور شاعر یا فن کار کے بارے میں لکھا گیا ہو۔ کلام غالب کی شرحیں بے شمار ہیں اور برصغیر کے عالم فاضل اور غالب کے مداحوں نے اپنے اپنے طور پر ان کے اشعار کی تشریح اور تفسیر بیان کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس گہرائی تک ابھی تک کوئی نہ پہنچ سکا کہ غالب کے ذہن میں شعر لکھتے ہوئے جو مقصد اور خیال تھا ان کی اس تک رسائی ہوسکی ہے یا نہیں۔ غالب مستقبل کا شاعر تھا۔ آج کے زمانے میں بھی اس کی شاعری اتنی ہی زندہ و پائندہ ہے جتنی کہ پچھلی صدی میں تھی۔ انہیں ان کی زندگی میں بھی کافی اہمیت اور مقبولیت حاصل ہوگئی تھی لیکن شاعرانہ چشمک اور درباری سیاست کے باعث وہ اپنی زندگی میں وہ مقام حاصل نہ کرسکے جس کے وہ مستحق تھے لیکن دو صدی کے بعد غالب کے ہم عصروں میں سے بہت کم ہی نام لوگوں کو یاد رہ سکے ہیں مگر غالب کی عظمت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

پاکستان کے علاوہ ہندوستان میں بھی غالب کے بارے میں بہت کام ہو رہا ہے۔ ان کی زندگی اور شاعری کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں تحقیق کی جارہی ہے۔ بے شمار کتابیں شائع کی جارہی ہیں۔ ہندوستان کے دور دراز گوشوں میں بھی غالب کے بارے میں سیمینار ہوتے رہتے ہیں۔ ہندو مداح ان کو کالی داس اور کبیر کا ہم پلہ تصور کرتے ہیں۔ اس بارے میں غالب کے ایک نقاد اور اردو کے عظیم المرتبت

نقاد عبدالرحمن بجنوری کا یہ فقرہ تو عام ہو چکا ہے کہ ''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ ایک وید مقدس اور دوسرا دیوان غالب۔'' غالب کے کلام پر بھی بعض اوقات الہام کا گمان گزرتا ہے۔ انہوں نے خود بھی لکھا ہے کہ

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

یا پھر خود ہی کہتے ہیں

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

غالب کو اپنی ذات کا بھی پوری طرح ادراک تھا اسی لیے انہوں نے کہا تھا

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں

بات کہیں سے کہیں نکل گئی۔ دراصل تذکرہ غالب کے حالاتِ زندگی کا کرنا تھا۔ غالب نے بچپن، نوعمری اور نوجوانی کا زمانہ بہت ناز و نعم اور عیش و عشرت میں گزارہ تھا لیکن اس کے بعد وہ مالی اعتبار سے مختلف مسائل کا شکار ہوگئے۔ دہلی کے دربار سے وظیفہ بند ہوگیا۔ انگریزی حکومت کا مقرر کردہ وظیفہ بھی ختم ہوگیا۔ وہ اپنی وسیع جائداد میں اپنے حصے کے حصول کے لیے لکھنؤ، بنارس اور کلکتہ تک گئے۔ کلکتہ اس وقت وائسرائے کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ بہت کوششیں کیں، قرضے لیے۔ تکالیف اٹھائیں کیونکہ اس زمانے میں سفر آسان نہ تھا لیکن گوہرِ مقصود ہاتھ نہ آیا۔ اس مفلسی کے دور میں بھی رئیسانہ مزاج ایسا تھا کہ چار ملازم ہمراہ تھے۔

لکھنؤ کے نواب سے وظیفے کے حصول کے لیے گئے مگر وہاں معلوم ہوا کہ جس وزیر کے ذریعے نواب تک رسائی ہوسکتی ہے، پہلے اس کے دربار میں حاضر ہو کر نذر پیش کرنی ہوگی۔ غالب کی انا نے یہ گوارا نہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ میں وزیر موصوف کے دربار میں حاضر تو ہوسکتا ہوں لیکن نذر پیش نہیں کرسکتا کیونکہ نذر صرف بادشاہوں کو پیش کی جاتی ہے۔ اس طرح وہ نواب صاحب کے دربار تک نہ پہنچ سکے۔

اس کے بعد کا زمانہ غالب کی مالی پریشانیوں کا دور ہے۔ قرضے لے کر گزارہ کرتے تھے۔ جو تھوڑی بہت آمدنی وظائف یا دوستوں سے حاصل ہوجاتی تھی وہ ان کے رئیسانہ طرزِ زندگی کے لیے کافی نہ تھی اس لیے ہمیشہ پریشان حال رہے۔ اپنا ذاتی خاندانی مکان پہلے ہی فروخت کر چکے تھے اس لیے بیشتر زندگی کرائے کے مکانوں میں بسر کی۔ جن کا حال وہ خود اپنے خطوط میں بیان کر چکے ہیں کہ بارش کے زمانے میں دیواریں گر چکی تھیں، چھت ٹپکتی تھی اس طرح کہ اگر بارش چار گھنٹے ہوتی ہے تو چھت آٹھ گھنٹے تک ٹپکتی رہتی ہے۔ جا بہ جا ٹپکتے ہوئے پانی کو روکنے کے لیے برتن رکھ دیے جاتے تھے۔ غرضیکہ زندگی کی کوئی آسائش حاصل نہ تھی لیکن رئیسانہ وضع داری میں کبھی فرق نہ آنے دیا۔ زندگی کے آخری چند سال انہوں نے شدید ذہنی اور مالی پریشانیوں میں گزارے تھے۔ 1857ء کی بغاوت یا غدر میں ان کا اپنا تمام کلام ضائع ہو چکا تھا اس لیے کہ وہ اپنے پاس اپنا کلام رکھنے کے عادی نہ تھے۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں کے پاس ان کے کلام کا ذخیرہ تھا۔ غدر میں ان کا گھر لٹا تو کتب خانہ بھی برباد ہوگیا اور غالب کا کلام ضائع ہوگیا۔ بعد میں دوستوں اور شاگردوں کی تحقیق و تلاش کے بعد جو کلام دستیاب ہوا اس پر مشتمل مختصر دیوان آج موجود ہے۔ مگر یہ مختصر دیوان بھی دوسرے شعرا کے کئی دیوانوں اور کلیات پر حاوی ہے۔

غدر نے انہیں کئی دوستوں اور شاگردوں سے محروم کر دیا تھا۔ دہلی کا شاہی دربار اجڑ چکا تھا۔ بادشاہ اور اس کے خاندان کے ساتھ انگریزوں نے جو وحشیانہ سلوک کیا اس کا تذکرہ ان کے خطوط میں موجود ہے اور ان پر وہ آنسو بہاتے رہتے تھے۔

نقادوں کا کہنا ہے کہ غدر کے بعد غالب کا دل شاعری سے پھر چکا تھا۔ اشعار ذہن میں نہیں آتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے خطوط نویسی کا سلسلہ شروع کیا جنہیں اردو نثر میں انفرادی اور خصوصی حیثیت حاصل ہے۔ غالب کے خطوط کو دراصل اردو افسانہ نگاری کا آغاز بھی کہا جاتا ہے۔ آخری عمر میں بھی حالات نہ سدھرے بلکہ اور بدتر ہوگئے۔ بیماری کا زمانہ انہوں نے بے حد تکلیف میں گزارہ۔ ایک طرف پیسے کی کمی، قرض داروں کے تقاضے، اس پر بیماری۔ لیکن آخر دم تک غالب کی فطری خوش مزاجی اور لطیفہ بازی نے ساتھ نہ چھوڑا۔ جب 72 سال کی عمر میں وہ دنیا سے رخصت ہوئے تو بیوی کے لیے رہنے کو ذاتی مکان بھی نہ تھا۔ نہ نقدی تھی، نہ جائداد۔ ایک سال بعد وہ بھی انتقال کر گئیں۔

غالب نے تیس سال کی عمر کے بعد کبھی فراغت نہیں دیکھی لیکن ان کی خوش بیانی اور خوش کلامی میں فرق نہ آیا۔ یہ ان کی بلند حوصلگی کا ثبوت ہے۔

غالب کا یہ احوال پڑھ رہے تھے تو خیال آیا کہ اردو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور انگریزی کے اور بھی کئی کلاسیکی ادیب اور شاعر ایسے گزرے ہیں جنہیں کبھی سکھ کا سانس لینا نصیب نہ ہوا۔ اردو شاعری میں میر تقی میر اس کی زندہ مثال ہیں۔ اس قدر عظیم شاعر جس کا کلام اس کی زندگی ہی میں لوگ ایک شہر سے دوسرے شہر، تبرک کے طور پر لے جایا کرتے تھے، زندگی بھر عزتِ نفس، خودداری اور انا کے باعث پریشان حال ہی رہا۔ اردو کے بہت کم قدیم شاعروں کو فراغت نصیب ہوئی ورنہ اکثریت کا حال برا رہا۔ فانی بدایونی بھی اسی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ مستقبل قریب میں منیر نیازی، ناصر کاظمی، فیض احمد فیض، احمد فراز، کس نے خوش حال اور مطمئن زندگی گزاری؟

آج کل تو انگریزی کے ادیب اور شاعر دولت میں کھیلتے ہیں لیکن قریباً دو سو سال پہلے حالات مختلف تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا بھر میں ایسے شاعروں اور ادیبوں کا غلبہ تھا جنہیں آج کلاسیکی فن کاروں اور تخلیق کاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان لوگوں کے حالاتِ زندگی کو دیکھیے تو چند کے سوا سبھی نے تکالیف اٹھائیں۔ صدمے جھیلے، بدنامیاں مول لیں اور مالی لحاظ سے ہمیشہ تنگ دست ہی رہے۔ اس کے باوجود انہوں نے جو شاعری اور ادب تخلیق کیا وہ آج شاہ پارے اور شاہکار تصور کیے جاتے ہیں۔

مثلاً انگریزی شاعروں میں جان کیٹس کو آج ایک کلاسیکی مقام حاصل ہے لیکن اس کی زندگی مصائب، غم و آلام اور تکالیف سے بھرپور تھی۔ اس نے طویل بیماری بھی اٹھائی۔ تنگدستی کے باوجود اس کو زندگی سے پیار تھا۔ غالباً متواتر غموں ہی نے اسے ایک بے مثال شاعر بنا دیا تھا۔ اس نے ایک لڑکی سے عشق بھی کیا۔ وہ بھی اس کو پسند کرتی تھی۔ کیٹس نے اپنی محبوبہ فنی کے نام جو محبت نامے لکھے ہیں وہ آج ادبی شاہ پارے شمار کیے جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے غالب اور کیٹس میں یہ بات مشترک ہے کہ دونوں نے شاعری کے علاوہ اپنے خطوط کے حوالے سے بھی بہت شہرت پائی۔ غالب نے ابتدائی زندگی بلکہ تیس سال کی عمر تک کا زمانہ عیش و آرام میں گزارہ تھا جس کے بعد غموں اور مصائب نے زندگی بھر انہیں اپنا نشانہ بنائے رکھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ تکلیف اور مصیبت میں بھی مزاح کا پہلو نکال لیا کرتے تھے۔ ان کے اشعار اور خطوط کو پڑھیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہر طرح کے صدمات اور مصائب میں گھرے ہونے کے باوجود اپنی زندہ دلی، حسِ مزاح اور بلند خیالی کا دامن انہوں نے کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

کیٹس اور غالب میں چند اور باتیں بھی مشترک ہیں۔ غالب بھی ابتدائی عمر (بچپن) ہی میں ماں باپ کے سائے سے محروم ہو گئے تھے۔ ان پر بھی زندگی کے آخری نصف حصے میں زندگی کبھی مہربان نہ ہوئی۔ تمام عمر انہوں نے مشکلات سے مقابلہ کرتے ہوئے گزاری اور 72 سال کی عمر پائی۔ انہیں اولاد کی خوشیاں کبھی نصیب نہ ہوئیں۔ ایک بھانجے کو گود لیا تھا مگر وہ بھی جوانی ہی میں انتقال کر گئے۔ ساری عمر قرض دار رہے اور عزت سے زندگی بسر کرنے کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ جوا کھیلتے ہوئے قید میں بھی رہے۔ شہر شہر کی خاک چھانی مگر اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ بیشتر زندگی کرائے کے ایسے مکانوں میں گزری جو کہ ان کی شان کے شایان نہ تھے لیکن رئیسانہ وضع اور رکھ رکھاؤ میں فرق نہ آنے دیا۔

جان کیٹس کی زندگی چند مشترکہ باتوں کے علاوہ غالب سے مختلف تھی۔ غالب ایک عالی نسب انسان تھے اور انہیں اس پر ہمیشہ فخر رہا لیکن جان کیٹس نے ایک غریب گھرانے میں جنم لیا تھا۔ ان کے والد لندن کے ایک شراب خانے میں بار مین تھے۔ کیٹس 31 اکتوبر 1793ء کو پیدا ہوا تھا۔ اس کے تین بھائی اور ایک بہن تھی۔ اپنی بہن فینی سے اس کو بہت محبت تھی اور ان دونوں میں ذہنی ہم آہنگی بھی تھی۔

مالی حالات ایسے خراب تھے کہ کیٹس کو کبھی اچھے اسکول میں پڑھنا نصیب نہ ہوا۔ باپ نے ایک معمولی سے سستے اسکول میں اس کو داخل کرا دیا۔ اسکول میں کیٹس کو ایک ادبی ذوق رکھنے والا اور مہربان استاد مل گیا۔ دراصل کیٹس کو شاعر بنانے والا یہی شخص تھا جس کا نام جان کلارک تھا۔ اس نے کیٹس کے مزاج کو بھانپ کر اس کے اندر علم و ادب اور شاعری کا ذوق پیدا کیا تھا۔ اگر یہ استاد نہ ملتا تو شاید جان کیٹس کی شاعری بھی نہ ہوتی اور انگریزی ادب اس عظیم رومانی شاعر سے محروم رہ جاتا۔

ابھی وہ چھوٹا ہی تھا کہ اس کا باپ گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ اس کے بعد اس کی ماں نے دوسری شادی کر لی لیکن یہ کوئی اچھا شوہر اور انسان ثابت نہ ہوا۔ کیٹس کی ماں نے دوسرے شوہر سے طلاق لے لی اور اپنے بچوں کو لے کر اپنی سسرال چلی گئی لیکن چند ماہ بعد ماں کا بھی انتقال ہو گیا اور یہ بچے یتیم و یسیر ہو گئے۔ اس وقت جان کیٹس کی عمر 14 سال تھی۔ ان کے دادا دادی کے حالات بھی اچھے نہ تھے اس

انگریزی زبان کا معروف شاعر جان کیٹس

اس زمانے کے مستند کلاسیکی شاعروں ... کی صف میں اس کا شمار ہونے لگے۔

کیٹس نے نوجوانی میں دو بار محبت کی۔ اس کو پہلی محبت ازابیلا نامی ایک خاتون سے ہوئی جو عمر میں اس سے بڑی تھی۔ اس کو شاعری سے زیادہ لگاؤ نہ تھا۔ دونوں کے مزاجوں میں بھی بہت فرق تھا مگر پہلی محبت نے کیٹس کی شاعری میں زیادہ رومانی انداز پیدا کر دیا۔ ان دونوں نے کچھ عرصہ ساتھ گزارہ لیکن جب اس کی زندگی میں ایک لڑکی فنی داخل ہوئی تو کیٹس کو احساس ہوا کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ یہ محض جسمانی ملاپ کا نام نہیں ہے بلکہ ایک عظیم اور انوکھا جذبہ ہے۔

فنی اس کے پڑوس میں ہی رہتی تھی۔ ان دونوں کی محبت مشرقی انداز کی تھی۔ کیٹس کو محسوس ہوا کہ وہ رفتہ رفتہ فنی کے عشق میں گرفتار ہو چکا ہے۔ ان دونوں میں بات چیت اور زبانی اظہارِ محبت کی نوبت نہیں آتی کیونکہ دونوں میں شرمیلا پن اور جھجک تھی۔ اظہارِ محبت کے لیے انہوں نے ایک انوکھا طریقہ نکالا۔ پہلے تو دور دور سے آنکھوں آنکھوں میں باتیں ہوئیں پھر کیٹس نے خطوط کے ذریعے اظہارِ محبت کیا۔ وہ محبت نامہ لکھ کر اس کو دے دیا کرتا تھا جس کا جواب وہ چپکے سے اس کے سرہانے رکھ جاتی تھی۔ اس عشق نے نہ صرف کیٹس کی شاعری میں شدید رومانیت پیدا کر دی بلکہ شاعر کے ساتھ ساتھ اس کو نثر نگار بھی بنا دیا۔ کیٹس کے یہ محبت نامے یا خطوط

کیٹس کو اسکول چھوڑنا پڑا۔ گھر والوں نے اس کو ایک ڈینٹل سرجن کے پاس تربیت حاصل کرنے کو بھیج دیا۔ ظاہر ہے کہ اس کے ادبی ذوق کے لیے یہ ایک ناپسندیدہ کام تھا لیکن اس کو دو سال تک ڈینٹل سرجری کی تعلیم حاصل کرنی پڑی۔ کیٹس نے اپنی زندگی کے ان دو سالوں کو انتہائی تکلیف دہ اور ناقابلِ برداشت قرار دیا ہے مگر مجبوری تھی۔ دادا دادی کے سامنے وہ کچھ بول بھی نہیں سکتا تھا۔ اسپتال میں تعلیم کے دوران میں اس کو ایک معمولی ملازمت بھی مل گئی تھی۔

لیکن سارے دن سرجری کی تعلیم حاصل کرنا اور رات کو وہیں سو جانا۔ کیٹس کو شاعری کی صلاحیت قدرت کی طرف سے ملی تھی۔ رات کو سارے کاموں سے فارغ ہو کر وہ شاعری کرتا اور اشعار لکھتا تھا۔ جب اس کو اسپتال سے سرجری کی ڈگری ملی تو اس نے گھر والوں سے صاف کہہ دیا کہ میں ڈاکٹری نہیں کروں گا۔

"تو پھر کیا کرو گے؟"

"میں شاعری کروں گا۔"

اس کے اس ارادے پر گھر والے بہت پریشان ہوئے۔ اس کو بہت سمجھایا بجھایا مگر وہ باز نہ آیا۔ لیکن بہن بھائی کا بھی خیال تھا اس لیے اس نے گزارے کے لیے سرجری جاری رکھی لیکن اس کا زیادہ وقت پڑھنے اور شعر لکھنے میں صرف ہوتا تھا۔ اسی زمانے میں کیٹس کے ایک دوست نے کیٹس کے اصرار پر اس کا تعارف ایک ادبی رسالے کے ایڈیٹر کوڈن کلارک سے کرایا جو اس زمانے کے معروف شاعر شیلے کا بھی دوست تھا۔ اس رسالے کا نام The Examine تھا۔ اگرچہ کیٹس نوعمر تھا لیکن اس کی شاعری کا معیار بہت بلند تھا۔ رسالے کے ایڈیٹر کی کوششوں سے اس کے اشعار کا پہلا مجموعہ شائع ہوا جس نے نقادوں کو چونکا دیا۔ اس کا اندازِ بیان مختلف اور پُراثر تھا جس کی وجہ سے اس کو شاعر کی حیثیت سے بہت شہرت حاصل ہوئی۔ اس واقعے نے کیٹس کی زندگی کو بدل کر رکھ دیا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ آئندہ شاعری کے سوا کچھ نہیں کرے گا۔ ہمارے ملک کی طرح انگلستان میں بھی شاعروں کے مختلف گروہ تھے۔ ایک ادبی گروہ نے اس کی بہت مخالفت کی اور کہا کہ اس کی زبان مشکل اور غیر معیاری ہے جس میں دیہاتی پن پایا جاتا ہے لیکن کیٹس کی مقبولیت اور شہرت پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ شعر لکھتا رہا اور شہرت حاصل کرتا رہا۔ یہاں تک کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی انگریزی ادب میں بلند درجے کے حامل ہیں۔

اس طرح غالب کی مانند کیٹس کو شاعری کے علاوہ اپنے خطوط کے باعث بھی نثر نگاری میں شہرت حاصل ہوئی۔ بلکہ یہی ان رومانی خطوط کا باعث بنے جن کی وجہ سے کیٹس کے خطوط کو نثر کا ایک بہترین نمونہ سمجھا جاتا ہے۔

اسی زمانے میں ایک اور المناک واقعہ پیش آیا۔ اس کے بھائی ٹام کیٹس کو ٹی بی کا جان لیوا مرض لاحق ہوگیا۔ اس زمانے میں ٹی بی کو لاعلاج مرض سمجھا جاتا تھا لیکن پھر بھی علاج تو کرانا پڑتا تھا۔ کیٹس کو اپنے بھائی سے بہت محبت تھی۔ وہ سارے کام چھوڑ کر اس کی تیمارداری میں مصروف ہوگیا۔ چھوت چھات سے بچنے کی کوئی صورت نہ تھی اس لیے یہ بیماری جان کیٹس کو بھی لگ گئی۔ ٹام تو علاج معالجے اور دیکھ بھال کے باوجود فوت ہوگیا لیکن ٹی بی کی ''سوغات'' اپنے بھائی کو دے گیا۔

جان کیٹس نے بہت علاج معالجہ کرایا۔ دوستوں کے ساتھ تبدیلی آب وہوا کی خاطر گھومنے پھرنے بھی گیا لیکن ایک تو مالی پریشانیاں اس پر یہ جان لیوا بیماری۔ جب تک حوصلہ رہا، وہ مقابلہ کرتا رہا۔ جن دنوں اس کو ٹی بی نے بے بس کردیا تھا انہی دنوں اس کو فنی سے عشق ہوگیا۔ یہ بے ضرر قسم کی محبت بڑھ کر عشق کی صورت اختیار کرگئی اور دونوں کا ایک دوسرے کے بغیر رہنا مشکل ہوگیا۔ کیٹس کے ایسے حالات نہ تھے کہ فنی کو اپنا سکتا لیکن وہ اپنے عشق کا اظہار خطوط کے ذریعے کرتا رہا۔ ان دنوں اس کے صرف دو کام تھے، شاعری اور عشق عشق کے سلسلے میں اس نے جو رومانی خطوط اپنی محبوبہ کو لکھے وہ انگریزی ادب کا قیمتی سرمایہ خیال کیے جاتے ہیں۔ کیٹس مناظرِ فطرت سے متاثر ہوکر شعر لکھتا تھا۔ پرندوں کی چہچہاہٹ اور کوئل کی آوازیں اور خوشنما منظر اس کو شاعری پر اکساتے تھے۔ عشق کرنے کے بعد یہ بھی اس کی شاعری کو تحریک دینے کا ایک سبب بن گیا۔ انگریزی ادب میں کیٹس کے خطوط کو بھی اس کی شاعری کی طرح اہمیت حاصل ہے۔ کیٹس کے مرنے کے بعد فنی کے لکھے ہوئے خطوط تو ضائع کردیے گئے مگر جان کیٹس کے محبت نامے شائع کردیے گئے جنہیں جان ایلیٹ کی رائے میں انگریزی ادب کی نثر میں ایک بلند حیثیت حاصل ہے۔

کیٹس کو یہ بھی احساس تھا کہ وہ لحہ بہ لحہ موت کی جانب بڑھ رہا ہے لیکن دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے وہ اپنی محبوبہ اور دوسرے لوگوں اور دوستوں سے جو کچھ کہنا چاہتا تھا اس نے ان خطوط میں ان جذبات کا اظہار کردیا۔

انگریزی ادب کی ممتاز ہستیاں ہنٹ، بائرن اور شیلے اس کی شاعری کے بہت قائل تھے۔ شیلے نے تو اس کو اٹلی بلا کر علاج کرانے کی دعوت بھی دی تھی۔ اس دعوت کو تو کیٹس نے قبول نہیں کیا لیکن زندگی کے آخری دنوں میں اس نے اٹلی کا سفر کیا اور وہیں ایک دن اس کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت کیٹس کی عمر صرف 25 سال تھی۔ اس نے اس مختصر زندگی میں بہت دکھ سہے۔ ماں باپ کی موت اور جدائی کا صدمہ سہا۔ پھر بھائی کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارا۔ لاعلاج بیماری کا مقابلہ کیا۔ ایک ایسی محبت کی جس کا انجام اس کو بخوبی معلوم تھا۔ فنی نے اس کی بیماری کے باوجود اس سے منگنی کرلی تھی مگر جب کیٹس نے اٹلی میں آخری سانسیں لیں تو وہ فنی سے بہت دور تھا۔ اس کی قبر پر جو کتبہ لگا ہے اس پر اس کا اپنا ایک جملہ کندہ ہے۔

"Here Lies One
Whose name was writ in Water

ترجمہ: ''یہاں وہ شخص محوِ خواب ہے جس کا نام پانی میں لکھا گیا تھا۔''

اس طرح انگریزی زبان کے اس صاحبِ طرز اور عظیم رومانی شاعر نے صرف 25 سال کی عمر پائی۔ اگر اس کے حالات کچھ بہتر ہوتے اور زندگی اسے موقع دیتی تو وہ انگریزی شاعری اور ادب میں ایک عظیم ذخیرہ چھوڑ جاتا۔ پھر بھی اس مختصر دکھ بھری زندگی میں اس نے نظم ونثر میں جو پھول کھلائے ہیں، وہ کبھی نہیں مرجھائیں گے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس کی شاعری کا زمانہ صرف چھ سال ہے۔ اس نے 19 سال کی عمر میں شاعری شروع کی تھی اور 25 سال کی عمر میں موت اس کو اٹھا کر لے گئی لیکن وہ ان چھ سالوں میں شدید بیماری اور تکلیف کے باوجود انگریزی ادب کے لیے ایک قیمتی سرمایہ چھوڑ گیا۔

فنی کے نام لکھے گئے چند خطوط ذیل میں درج کیے جارہے ہیں۔

''پیاری فنی!

میں تین دن بعد خواب سے جاگا ہوں اور پھر خواب دیکھنا چاہتا ہوں۔ گزشتہ رات میں نے بہت تکلیف سے گزاری۔ کہنے کو میرے پاس بہت کچھ ہے، میں ہمیشہ تمہارے میں رہنا چاہتا ہوں اور اپنے آپ کو زنجیروں میں جکڑنا

پاکستان کی فلمی صنعت میں (یا صحیح طور پر کہا جائے تو سابقہ فلمی صنعت میں) فن کاروں اور ہنرمندوں کے چل چلاؤ کا سلسلہ کچھ تیز ہی ہوگیا ہے۔ پچھلے دو مہینوں میں نصف درجن سے زائد فن کار دنیا سے رخصت ہوچکے ہیں۔ جمیل فخری اور نغمہ نگار ومصنف خواجہ پرویز تو بس آگے پیچھے ہی گئے۔

جمیل فخری کو دراصل ان کے جوان بیٹے کی گمشدگی اور پھر قتل کا غم لے بیٹھا۔ ان کا بڑا بیٹا علی اپاز فخری جو امریکا میں برسرِروزگار تھا، ڈھائی سال پہلے گم ہوگیا تھا۔ انہوں نے اسے تلاش کرنے کی سرتوڑ کوشش کی مگر پاکستانی سفارت خانے کے حکام کی بے حسی کے باعث کچھ پتا نہ چل سکا۔ جب لاہور میں میڈیا نے شور مچایا تو وزارتِ خارجہ کے کانوں تک آواز پہنچی اور عملے نے علی فخری کی تلاش شروع کردی۔ ڈیڑھ ہفتے بعد ان کی میت لاہور پہنچی۔ بوڑھے باپ کے کاندھے جوان بیٹے کے جنازے کو کاندھا دیتے ہوئے جھک گئے اور وہ تقریباً گوشہ نشین ہوگئے۔ وہ رو رو کر پاکستانیوں سے کہتے تھے کہ ''خدا کے لیے یہیں روکھی سوکھی کھالو مگر اپنے جوان بیٹوں کو غیر ملکوں میں نہ بھیجو۔''

چھ ماہ تک وہ غم والم کی کیفیت میں دنیا ومافیہا سے بے خبر رہے۔ یہاں تک کہ فالج کے حملے نے انہیں گھر سے باہر نکلنے پر مجبور کردیا۔ ایک ہفتے اسپتال میں رہنے کے بعد وہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

جمیل فخری اسٹیج اور ٹی وی کے صفِ اول کے اداکاروں میں شمار کیے جاتے تھے۔ لیکن ڈراما سیریل ''اندھیرا اجالا'' نے انہیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچادیا۔ اس ڈرامے میں قوی بھی تھے لیکن جمیل فخری اور عرفان کھوسٹ نے پولیس والوں کے کردار میں لازوال شہرت اور مقبولیت حاصل کی تھی۔ عرفان کھوسٹ میٹرک پاس حوالدار تھے اور جمیل فخری سب انسپکٹر تھے جو ہروقت اپنی پتلون کی پیٹی ہی سنبھالتے رہتے تھے۔ ان دونوں کے کردار کبھی بھلائے نہ جاسکیں گے۔

جمیل فخری کو اداکاری کا شوق بینک کی ملازمت سے استعفیٰ دے کر اسٹیج پر لے گیا تھا۔ اندھیرا اجالا میں انہوں نے پولیس انسپکٹر جعفر حسین کا جو کردار ادا کیا وہ کبھی بھلایا نہ جاسکے گا اور نہ ہی کوئی دوسرا فنکار ایسا کردار اس خوبصورتی سے ادا کرسکے گا۔ ان کے مشہور ٹی وی ڈراموں میں ایک محبت سوافسانے، الف نون، ذخیرہ اندوزی، الف لیلہ، آئینہ اور چہرے، آج کا کھیل، صحرا تیری پیاس اور دیگر بہترین ڈرامے شامل ہیں۔ انہوں نے ریڈیو پر بھی اپنی آواز کا جادو جگایا اور کئی کرداروں کو لازوال بنادیا۔

فلمی دنیا میں ان کی وفات کا سوگ کئی ہفتے منایا گیا۔ وہ ایک ممتاز اداکار ہی نہیں بہترین انسان بھی تھے۔ لطیفہ بازی اور الفاظ کی پھلجھڑیاں چھوڑتے تھے مگر بیٹے کی موت نے ان پھلجھڑیوں کو سرد کردیا۔ اس سے پہلے اداکار علاؤالدین کو اپنے نوجوان بیٹے کی اچانک ہلاکت پر اسی طرح گھل گھل کر مرتے دیکھا تھا۔ اب جمیل فخری بھی ان کی صف میں شامل ہوکر ان کے پاس چلے گئے۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

چاہتا ہوں۔ میں بہت بے صبرا ہوگیا ہوں۔ میرا دماغ کانپ رہا ہے۔ نہ جانے میں کیا لکھ رہا ہوں۔''

.....☆.....

''پیاری فنی!

میں آج گزشتہ کل کی یادوں میں زندہ ہوں۔ میں تمہارے رحم وکرم پر ہوں۔ وعدہ کرو اور مجھے لکھو کہ تم مجھ پر کبھی گزشتہ روز سے کم مہربان نہ ہوگی۔ ہم دونوں ایک ساتھ کب پورا دن گزاریں گے۔ میری محبت سے سرشار روح نے تمہارے لیے ہزاروں بوسے سنبھال کر رکھے ہیں۔''

.....☆.....

''پیاری فنی!

تمہاری محبت نے مجھے خودغرض بنادیا ہے۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں تمہارے سوا ہر چیز فراموش کرچکا ہوں۔ میرے ذہن میں بس تم سے ملنے کا جنون ہے۔ تم سے جدائی کا خوف مجھے ہروقت پریشان رکھتا ہے۔ دیکھو، تم کبھی بھولے سے بھی بچھڑنے کی بات نہ کرنا۔ جو لوگ مذہب کے لیے جان دیتے ہیں وہ شہید کہلاتے ہیں۔ میرا مذہب تو تمہاری محبت ہے۔ میں تمہارے لیے جان دے کر شہید کہلانا چاہتا ہوں۔ یقین کرو، تمہارے بغیر تو میں سانس بھی نہیں لے سکتا۔ میرے دل ودماغ پر صرف تمہارا قبضہ ہے۔''

.....☆.....

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو آٹھ سال کی عمر میں باپ کے سائے سے محروم ہوگیا تھا۔ 14 سال کی عمر میں اس کی ماں بھی دنیا میں نہیں رہی۔ جوئی بی میں مبتلا بھائی کی تیمارداری میں خود بھی اس موذی مرض میں مبتلا ہوکر بال آخر اسی بیماری کے باعث صرف 25 سال کی عمر میں دنیا کو خیرباد کہہ گیا مگر انگریزی ادب اور شاعری کو اپنے رومانی کلام سے مالا مال کرگیا۔ اسے زندگی میں کوئی خوشی، کوئی راحت نہ مل سکی۔ بیماری نے اس کا جینا دوبھر کردیا تھا۔ عشق ہی اس کے زندہ رہنے کا سہارا تھا مگر زندگی نے عشق کرنے کی بھی مہلت نہیں دی۔ وہ اپنی محبوبہ کی زلفوں کے سائے میں زندگی کے آخری لمحات بسر کرنا چاہتا تھا لیکن موت نے اس کو یہ موقع بھی نہیں دیا۔ وہ آب وہوا کی تبدیلی کی غرض سے اٹلی گیا اور وہیں دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگیا۔ معروف شاعر شیلے نے اس کی موت پر بہت خوبصورت اور دردبھرا مضمون لکھا تھا۔ بائرن بھی اس کی شاعری کا مداح تھا۔ ایک 25 سال کا نوجوان جس نے صرف چھ سال شاعری کی، اس مختصر عرصہ میں ہی لافانی شہرت کا مالک بن گیا۔

☆☆☆

ادبی شخصیات اور ان کے دکھوں کا ذکر چل نکلا ہے تو سعادت حسن منٹو کا تذکرہ نہ کرنا قرین انصاف نہ ہوگا۔

انہیں وفات پائے کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ وہ نوجوانی میں نہیں تو جوانی ہی میں دنیا سے رخصت ہوگئے تھے۔ اس مختصر سی زندگی میں انہوں نے زندگی کے ہر پہلو کو بہت قریب سے دیکھا، برتا، محسوس کیا اور دوسروں کو بھی اپنے تجربات اور احساسات میں شامل کیا۔ ابتدائی عمر میں انہیں لکھنے پڑھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن ادبی شخصیات کی صحبت میں بیٹھنا انہیں پسند تھا۔ تعلیم میں ان کا دل نہیں لگتا تھا۔ میٹرک میں وہ تین بار فیل ہوئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ اردو کے مضمون میں بھی فیل ہوئے۔ ایک ایسا شخص چند سال بعد ہی نہ صرف برصغیر پاک وہند بلکہ دنیا کے عظیم ترین افسانہ نگاروں میں شمار کیا جانے لگا۔

ان کی اپنی زندگی کی طرح ان کے ادب میں بھی زندگی کے تجربات کا نچوڑ اور نشیب وفراز موجود ہیں۔ انہیں معاشرے نے کبھی اچھی نظروں سے نہیں دیکھا۔ ان کے افسانوں پر مقدمات چلائے گئے۔ انہیں بے انتہا مالی پریشانیوں میں مبتلا ہونا پڑا۔ ادبی دنیا میں انہیں عزت و احترام سے نہیں، ڈر اور خوف سے دیکھا جاتا تھا کیونکہ وہ ایک نڈر، بے خوف اور منہ پھٹ انسان تھے۔ اپنی تحریروں کی طرح زبانی گفتگو میں بھی سچ بولتے ہوئے مطلق نہیں ڈرتے تھے۔ ادب میں ان کا کوئی گروپ نہیں تھا۔ اس میدان میں بھی وہ اکیلے تھے۔ ان کی حیثیت ایک ایسے جنگجو کی طرح تھی جو میدانِ کارزار میں دشمنوں کے ایک بہت بڑے لشکر کے سامنے تن تنہا تلوار سونتے کھڑا ہے اور سامنے صف آرا عظیم لشکر کو للکار رہا ہے مگر کسی میں ہمت نہیں ہے کہ اس اکیلے اور کمزور، جنگجو کے مقابلے کے لیے صفوں کے باہر نکلے۔ زندگی کی بے وفائیوں اور تلخیوں کے باوجود نہ جانے کیوں منٹو کو یہ احساس تھا کہ مرنے کے بعد بھی وہ زندہ رہے گا۔ اگرچہ اس کی کوئی لابی نہیں ہے۔ کوئی ایسی ادبی انجمن نہیں ہے جو ہر سال دھوم دھام سے اس کی سالگرہ اور برسی منائے۔ ساری زندگی اس کو وہ مقام حاصل نہ ہوسکا جس کا وہ مستحق تھا۔ اس کے افسانوں پر مقدمات چلائے گئے۔ اس کی تحریروں پر پابندی لگائی گئی۔ اس کو دولت تو کیا کبھی اپنی محنت کا پورا معاوضہ بھی نہیں ملا، اس شخص کو نہ جانے کیوں یقین تھا کہ زمانہ کبھی اس کو بھلا نہیں سکے گا۔ اس کا کام اس کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھے گا اور منٹو اس بار بھی سچا ثابت ہوا۔ منٹو کو آج بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اس کی تحریروں کو پڑھا جاتا ہے۔ ان پر تحقیق کی جاتی ہے، ان کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ آج لوگوں کو احساس ہورہا ہے کہ انہوں نے کتنا قیمتی اور مایہ ناز سرمایہ ضائع کردیا۔ زندگی میں اس کی قدر نہ کی۔ آج بھی منٹو کو ادب میں وہ مقام حاصل نہیں ہے جس کا وہ حق دار ہے لیکن منٹو کو اس ناقدری کی پروا نہ تھی۔

سعادت حسن منٹو کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ مسلمان بھی تھا مگر دوسرے مذہب کے مظلوموں کے ساتھ بھی اسے ہمدردی تھی۔ دراصل وہ ایک انسانیت دوست آدمی تھا۔ وہ ہر قسم کے تعصب سے بالاتر تھا اس لیے اس کے افسانوں کے کرداروں میں ہر مذہب کے نہایت بھرپور اور جاندار کردار نظر آتے ہیں۔ ہندو، مسلم، کرسچین، پارسی، سکھ سبھی کو وہ انسان کی نظر سے دیکھتا تھا۔ کسی کے ساتھ بھی ناانصافی اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔

اپنی زندگی میں سعادت حسن منٹو ایک برائی کی علامت تھا۔ اس کی شہرت یا بدنامی نے اس کو ان لوگوں کے نزدیک بھی برا آدمی بنادیا تھا جنہوں نے نہ تو کبھی اس کے افسانے پڑھے اور نہ ہی اس سے ملاقات کی تھی۔

اس کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعے سے لگایا جاسکتا ہے۔

معروف افسانہ نگار سعادت حسن منٹو

معظم شیخ اس زمانے میں ایک ابھرتے ہوئے قلم کار تھے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ایک دن میری ملاقات اپنے اسکول کے پرانے دوست سے ہوئی جو سڑک پر ایک ٹھیلے کے سامنے کھڑا نان اور حلیم کھا رہا تھا۔

دوست نے معظم شیخ سے پوچھا ''یار، یہ منٹو کا داخلہ شریف گھرانوں میں بند کیوں ہے؟''

معظم شیخ نے جواب میں کئی دلائل پیش کیے جس کا ٹیپ کا بند یہ تھا کہ معاشرہ منافقت، جھوٹ اور فریبی لوگوں سے بھرا پڑا ہے اس لیے لوگ اس کے ''سچ'' سے گھبراتے ہیں۔

دوست کے یہ الفاظ کافی عرصے تک معظم شیخ کے ذہن میں گونجتے رہے، وہ سوچتے رہے کہ آخر منٹو کیا چیز ہے؟ کیا وہ ایک فنکار ہے؟ ایک اچھا کہانی نویس ہے، ایک مفکر ہے، ایک باغی ہے، ایک شرابی ہے، ایک منفرد اسٹائل کا مالک ہے۔ ایک بصیرت رکھنے والا انسان ہے، ایک خیال ہے، ایک نظریہ ہے؟ آخر کیا بلا ہے؟

اس کے لیے ہمیں منٹو کی زندگی کا جائزہ لینا پڑے گا۔ شروع سے آخر تک اس کا تجزیہ کرنا ہوگا۔ منٹو نے باقاعدہ نصابی تعلیم کبھی حاصل نہیں کی۔ اس کو پڑھنے لکھنے کا کوئی شوق بھی نہیں تھا۔ تعلیم کے نام سے وہ دور بھاگتا تھا۔ ایف اے پاس کیے بغیر اس نے تعلیم کو خیرباد کہہ دیا۔ خوش قسمتی سے اس زمانے میں اسے باری علیگ مل گئے۔ انہوں نے منٹو کی پوشیدہ صلاحیتوں کا اندازہ لگانے کے بعد منٹو کو فرنچ اور روسی زبان کے معروف کہانی نویسوں کی کہانیاں پڑھنے کو دیں اور کہا کہ وہ ان کا اردو میں ترجمہ کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ کتابیں انگریزی میں تھیں اور انگریزی زبان میں منٹو کی استعداد بہت اچھی تھی۔ اس نے جب ان کہانیوں کو پڑھا تو اس کو ان میں دلچسپی پیدا ہوگئی۔ موپساں، اوہنری اور چیخوف اس کے پسندیدہ لکھنے والے تھے۔ منٹو صاحب کی ایک کمزوری یہ تھی کہ وہ بہت بے صبرے اور جلد باز تھے۔ نہ تو وہ طویل کہانی پڑھ سکتے تھے اور نہ ہی طویل ناول لکھ سکتے تھے۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ ایک ہی نشست میں کہانی ختم کردی جائے۔ وہ بقایا رکھنے کے قائل نہ تھے۔

منٹو کو سیاست سے کبھی دلچسپی نہیں رہی مگر وہ ملکی اور قومی سیاست سے پوری طرح باخبر رہے۔ ان کی بصیرت کا اندازہ ان خطوط سے لگایا جاسکتا ہے جو انہوں نے ''چچا سام'' یعنی امریکا کے نام لکھے تھے۔

اسی زمانے میں امریکا سے مالی اور فوجی امداد لینے کی باتیں ہورہی تھیں۔ افسوس کہ ہمارے حکمراں اور سیاست داں بصیرت اور دانش سے عاری تھے۔ ان کے پاس وہ نظر بھی نہ تھی جو ایک افسانہ نگار کے پاس تھی جس کو سیاست اور حکومت سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا لیکن ان کی دور بینی اور بصیرت انگریزی کا اندازہ ''چچا سام'' کے نام ان کے کھلے خطوط سے لگایا جاسکتا ہے۔ جس زمانے میں انہوں نے یہ خطوط لکھے تھے، اس وقت دنیا میں صرف دو سپر پاورز تھیں۔ ایک امریکا اور دوسرا سوویت یونین۔ امریکا ایک سرمایہ پرست ملک تھا جبکہ سوویت یونین غریبوں کو ان کے حقوق دلانے کا دعوے دار تھا۔ امریکا کمیونزم کے تیزی سے پھیلتے ہوئے اثرات سے بہت خوف زدہ تھا اسی لیے اس نے کمیونزم کو روکنے اور ختم کرنے کے لیے ہر قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرنے شروع کردیے تھے۔

ابھی روس نے افغانستان پر حملہ نہیں کیا تھا۔ یہ واقعہ منٹو کی وفات کے بہت عرصے بعد پیش آیا تھا۔ لیکن منٹو صاحب کو یہ ادراک تھا کہ امریکا کے نزدیک کمیونزم کے نظریے کو روکنے کے لیے سب سے بڑی قوت اسلام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اسلام ازم کی سرپرستی شروع کردی تھی۔ امریکا کو احساس ہوچکا تھا کہ محض سائنس، ٹیکنالوجی اور فوجی طاقت کے ساتھ وہ تیزی سے پھیلتے ہوئے کمیونزم کو نہیں روک سکتا۔ کمیونزم کے آگے بند باندھنے کے لیے اس نے اسلام اور مُلّاؤں کا استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت اگرچہ پاکستان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نیا نیا بنا تھا۔ مگر اس کو دنیا کی سب سے بڑی اور بااثر اسلامی مملکت تصور کیا جاتا تھا چنانچہ امریکا نے پاکستان کو بہلا پھسلا کر اور لالچ دے کر اپنا حمایتی بنانے کا مشن اپنایا۔

منٹو صاحب نے ''چچا سام'' کے نام خط میں لکھا تھا۔

(نوٹ: یہ انگریزی سے ترجمہ کیا گیا ہے)

''چچا جان! ہندوستان کی چیخ وپکار اور احتجاج کی بالکل پروا نہ کیجئے۔ آپ پاکستان کے ساتھ فوجی معاہدہ سائن کر لیجئے کیونکہ آپ کو دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کی بہت فکر رہتی ہے اور کیوں نہ ہو، ہمارا مُلّا روسی کمیونزم کے مقابلے کے لیے سب سے موثر ہتھیار ہے۔ جیسے ہی فوجی امداد کا سلسلہ شروع ہو آپ کو سب سے پہلے مُلّاؤں کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ انہیں بھی امریکی تسبیحوں اور جانمازوں کی ضرورت ہوگی۔ استرے اور قینچیاں بھی آپ کی امداد میں سرفہرست ہونی چاہئیں، اس کے ساتھ ہی بال کالے کرنے کے کلر بھی انہیں درکار ہوں گے۔ آپ کی سیاست کے انداز سے داؤ پیچ سیکھ کر ہر شخص اب ہوشیار ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ فوجی امداد دینے کا سب سے بڑا مقصد ان مُلّاؤں کو مسلح کرنا ہے جیسے ہی یہ مُلّا امریکی اسلحہ سے لیس ہو گئے، سوویت یونین کو اپنا کمیونزم کا پراپیگنڈا سمیٹ کر لے جانا پڑے گا۔ پھر یہ مُلّا اپنے خطابات اور وعظ میں آپ ہی کا نام لیا کریں گے۔''

دیکھیے، سوویت روس نے 1980ء میں افغانستان پر قبضہ کرنے کے لیے چڑھائی کی تھی جس میں اسے مقامی کمیونسٹوں کی حمایت بھی حاصل تھی۔ مگر اس طویل جنگ کا جو انجام ہوا، وہ آج سب جانتے ہیں۔ جنرل ضیاء الحق نے اس حملے کو پاکستان پر قبضہ کرنے کی مہم قرار دے کر سوویت روس کے خلاف اعلانِ جہاد کر دیا۔ مدرسوں کے مُلّاؤں نے امریکی اسلحہ اور دولت سے مسلح ہو کر اسلام کے خلاف اس جنگ کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔ دنیا بھر سے مسلمان عسکری پسند اسلام کی حفاظت کرنے کے لیے جہاد کرنے اور ملحد کمیونسٹوں کا مقابلہ کرنے کے لیے افغانستان پہنچ گئے۔ سعودی عرب کے پیسے اور امریکا کے جدید ترین ہتھیاروں سے لیس مسلح جہادیوں نے دنیا کی دوسری سب سے بڑی سپر پاور کا نہ صرف راستہ روکا بلکہ تاریخ میں پہلی بار روس کو شکست اور پسپائی سے دوچار کیا۔ یہ مسلمان جہادی جو اس وقت امریکا کے نزدیک قابلِ احترام مجاہد تھے، کچھ عرصے بعد انتہا پسند، عسکریت پسند طالبان اور القاعدہ بن گئے۔ یہ امریکا اور کرسچین دنیا کے لیے سب سے بڑا خطرہ قرار دیے گئے۔ انہیں دہشت گرد قرار دے دیا گیا اور امریکا نے دوسری مغربی اور اسلام دشمن طاقتوں کے ساتھ مل کر دنیا بھر میں دہشت گردی کے خلاف جنگ کا آغاز کر دیا جس میں ہمارے بہادر کمانڈو صدر نے پاکستان کو بھی اتحادی بنا دیا۔ آج کمیونزم کا فتنہ ختم ہو چکا ہے۔ سوویت روس ٹکڑوں میں بٹ چکا ہے۔ اب امریکا یعنی ''چچا سام'' کے نزدیک مہذب مغربی دنیا کے لیے سب سے بڑا خطرہ دہشت گرد ہیں جو سب کے سب مسلمان ہیں، یا پھر سب مسلمان دہشت گرد ہیں۔ افغانستان کے مدرسے میں تعلیم دینے والا مُلّا عمر سوویت روس کے خلاف جنگ میں بہت بڑا مجاہد تھا۔ اسامہ بن لادن کمیونزم کے خلاف سب سے موثر ہتھیار تھا مگر ان کا انجام کیا ہوا؟ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر امریکا نے دو مسلمان ملکوں عراق اور افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ تیس لاکھ کے قریب مسلمان شہید ہو چکے ہیں۔ یہ ملک اب سالہا سال تک ترقی کرنے کے قابل نہ ہو سکیں گے۔

امریکا نے نہایت چالاکی اور ہوشیاری سے دہشت گردی کے خلاف اپنی جنگ کو اب پاکستان کے گلے کا ہار بنا دیا ہے۔ پاکستان کے خلاف امریکا، اسرائیل اور بھارت سازشوں کا جال بچھانے اور اس ملک کو ہر لحاظ سے غیر مستحکم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

اب ذرا دیکھیے کہ ایک افسانہ نگار سعادت حسن منٹو نے آنے والے حالات کو کتنے عرصے پہلے بھانپ لیا تھا۔ ایک قابلِ اعتماد نجومی کی طرح اس کی پیش گوئیاں حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی ہیں۔

اس منٹو کو ہم آج فحش نگار، شرابی، طوائفوں اور ان کے دلالوں کی حمایت کرنے والا اور معاشرے کو غلاظت میں ڈبو دینے والا کہانی نویس کہتے ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟ کیا سعادت حسن منٹو کی تحریروں کے اس پہلو پر بھی کبھی غور کیا گیا ہے؟ وہ ہمیں آنے والے خطرات سے آگاہ کرنے والا، مستقبل میں بہت دور تک دیکھنے والا انسان تھا۔ کاش ہم نے اس وقت اس کی قدر کی ہوتی۔ عزت سے زندہ رہنے کے لیے اس کی عظیم کہانیوں کا پورا صلہ دیا ہوتا۔ اس کو معاشی بے فکری دی ہوتی۔ اس کو اپنی بیوی اور پیاری پیاری بچیوں کے مستقبل کی فکروں سے آزاد کر دیا ہوتا تو وہ شرابی نہ بنتا اور دنیا کے آلام سے محفوظ رہنے کے لیے خود کو ہمہ وقت مدہوش نہ رکھتا۔ وہ شراب لطف اندوز ہونے کے لیے نہیں اپنے غموں کو بھلانے کے لیے پیتا تھا۔ غالب نے شاید اسی کے لیے کہا تھا۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو

اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

بالآخر یہ اک گونہ بے خودی کی تلاش ہی اس کی جوان المرگی کا سبب بن گئی۔

سعادت حسن منٹو نے قلم کے حوالے سے ہی سب کچھ حاصل کیا تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ شخص جو اردو کے مضمون میں فیل ہو گیا تھا۔ جسے نہ پڑھنے سے دلچسپی تھی، نہ لکھنے سے، آخر وہ اردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار کیسے بن گیا؟

دراصل ہر چیز کا ایک بہانہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو زندگی میں کم سے کم ایک اور زیادہ سے زیادہ تین چار مواقع ضرور دیتا ہے، جو شخص ان سے فائدہ اٹھا لیتا ہے، وہ کامیاب کہلاتا ہے اور جو انہیں کھو دیتا ہے، وہ کامیابی سے محروم رہتا ہے اور پھر تقدیر کو، معاشرے کو، نظام کو یا دوسرے لوگوں کو اپنی ناکامی کا ذمے دار ٹھہرا دیتا ہے۔ منٹو صاحب کی زندگی میں باری علیگ خضرِ راہ کی صورت بن کر داخل ہوئے تھے۔ منٹو نے اس موقعے کو ہاتھ سے نہیں گنوایا۔ وہ باری علیگ کی باتوں پر عمل کرتے رہے اور ان کی انگلی پکڑ کر چلتے رہے۔ پہلے انہوں نے ترجموں سے آغاز کیا اور پھر طبع زاد تحریریں لکھنے لگے۔ منٹو کی اردو پر اہلِ زبان کو اعتراض تھا مگر انہوں نے کبھی اس کی پروا نہیں کی۔ وہ عام فہم، روزمرہ کی زبان لکھتے تھے لیکن ایسی ایسی اصطلاحیں اور فقرے ایجاد کرتے تھے جو اردو ادب کا حصہ بن گئے۔ وہ پنجابی الفاظ بھی بے تکلفی سے استعمال کر لیتے تھے اور سوائے سکہ بند نقادوں کے کبھی کسی نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔ زبان و بیان پر اعتراض کرنے والے یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ اردو کا تو خمیر ہی مختلف ہندوستانی اور بیرونی زبانوں کو گوندھ کر بنایا گیا ہے۔ محمد حسین آزاد مرحوم نے اپنی فقید المثال کتاب ''آبِ حیات'' میں اردو کی تشکیل پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس زبان میں ترکی، عربی، فارسی، یونانی، انگریزی، فرنچ کے علاوہ ہندوستان کی علاقائی زبانوں کا بھی امتزاج ہے اور یہی اردو زبان کی خوبصورتی اور انفرادیت ہے البتہ تحریر میں قواعد سے انحراف کرنا کسی بھی زبان کے ساتھ ناانصافی کے مترادف ہے۔

منٹو صاحب کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ خود ان صفحات میں بھی مختلف اوقات میں ان کی شخصیت اور افسانوی صلاحیتوں کے بارے میں بیان کیا جا چکا ہے اس لیے بظاہر کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جس کے بارے میں مزید بیان کیا جائے۔ لیکن پھر بھی سعادت حسن منٹو ایک ایسی شخصیت ہے جس کے بارے میں ہمیشہ لکھا جاتا رہے گا۔

منٹو صاحب بمبئی ٹاکیز سے وابستگی کے زمانے کے علاوہ کبھی مالی طور پر خوش حال اور مطمئن نہیں رہے۔ بمبئی ٹاکیز چھوڑنے کے بعد جب اشوک کمار اور ان کے بہنوئی ایس کے مکرجی نے نیا فلم ساز ادارہ ''فلستان'' بنایا تو منٹو صاحب کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ اشوک کمار سے ان کی گہری دوستی تھی اور ایس مکرجی ان کی صلاحیتوں سے بہت متاثر تھے۔ ان دونوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ منٹو بمبئی ہی میں رہیں۔ منٹو بعض معاملات میں پکے مسلمان تھے لیکن مذہبی تعصب کے معاملے میں بالکل کورے تھے بلکہ ان کے کچھ قریبی دوست تو انہیں سیکولر بھی کہا کرتے تھے۔ ان کے قریب ترین دوستوں میں زیادہ تعداد ہندوؤں کی تھی۔ ان کا خود بھی بمبئی چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن جب وہاں اچانک خونی فسادات پھوٹ پڑے اور چند واقعات سے ان کا بھی واسطہ پڑا تو انہوں نے بددل ہو کر پاکستان آنے کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے عام ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کا خون بہاتے دیکھا تھا جو کہ ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔

پھر ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے ان کے ارادے کو پختہ کر دیا۔ انہوں نے یہ واقعہ خود لکھا ہے۔ بمبئی میں ہندو مسلم فسادات پھوٹ پڑے اور دونوں مذاہب کے لوگوں نے ایک دوسرے کو قتل کرنا اور گھروں کو جلانا شروع کر دیا۔ منٹو کا قیام ایک ایسے علاقے میں تھا جو مذہبی جنون سے محفوظ تھا۔ ایک بار جب انہوں نے اپنے گھر جانے کا ارادہ کیا تو اشوک کمار اپنی کار میں بٹھا کر انہیں گھر پہنچانے کے لیے چل پڑے۔ منٹو صاحب نے انہیں بہت روکا کہ راستے میں خالص ہندو اور مسلمان علاقوں سے گزرنا پڑے گا۔ اس لیے اشوک کمار یہ خطرہ مول نہ لیں۔

اشوک کمار نے ہنس کر کہا۔ ''ارے یہ لوگ آرٹسٹوں کو کچھ نہیں کہتے۔''

جب کار ایک خالص مسلم محلے میں داخل ہوئی تو سامنے ایک بپھرا ہوا مشتعل ہجوم نظر آیا۔ واپسی کا بھی راستہ نہ تھا۔ منٹو کو یہ سوچ کر پسینا آ گیا کہ ان کی خاطر ان کے عزیز ترین دوست اشوک کمار کی جان خطرے میں پڑ گئی ہے۔ اشوک کمار مطمئن ہو کر کار چلاتے رہے یہاں تک کہ ہجوم نے کار کو گھیر لیا۔ اس سے پہلے کہ کچھ ہوتا کسی نے کار میں جھانک کر دیکھا اور کہا۔

''ارے، یہ تو اشوک کمار ہے۔''

ہجوم نے کار کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ ایک شخص کار کی کھڑکی کے نزدیک آیا اور اشوک کمار سے بولا۔ ''آگے کٹر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مسلمانوں کا علاقہ ہے۔ آپ باجووالی گلی سے ہو کر نکل جائیں۔"

منٹو نے خیریت سے گھر پہنچ کر حالات کا جائزہ لیا اور بقول خود ان کے "باجووالی گلی" سے نکل کر چپ چاپ پاکستان چلے آئے۔ بعد میں اشوک کمار نے انہیں واپس بلانے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہ گئے۔ لیکن ان فسادات اور قتل وخون اور لوٹ مار کا منٹو کے حساس ذہن پر گہرا اثر ہوا۔ پاکستان آ کر انہوں نے فسادات کے پس منظر میں بہت سے یادگار افسانے لکھے۔ ان میں بیشتر کردار ان کے جانے بوجھے تھے۔

جو افسانے لکھنے کے "جرم" میں ان پر مقدمات چلائے گئے، منٹو کو اس پر کوئی پچھتاوا نہ تھا۔ انہوں نے ڈٹ کر ان مقدمات کا مقابلہ کیا اور مقدمے جیت گئے۔ کالی شلوار، کھول دو، ٹوبہ ٹیک سنگھ، مختصر افسانچے، سیاہ حاشیے، اسی تاثر کی یادگار ہیں۔

دراصل منٹو ایک انسانیت پسند شخص تھا۔ اسے انسانوں سے محبت تھی۔ دکھی، مجبور اور بے بس انسانوں کی حالت دیکھ کر اس کا دل کڑھتا تھا اور وہ خاموش تماشائی بن کر نہیں رہ سکتا تھا۔

لوگ کہتے ہیں کہ منٹو کو طوائفوں سے بہت ہمدردی تھی لیکن وہ یہ نہیں دیکھتے کہ منٹو کے افسانوں میں طوائفوں کو تفریح اور دل بستگی کے لیے نہیں بلکہ ان کی مجبوریوں کو اجاگر کرنے کے لیے موضوع بنایا گیا ہے۔ منٹو کا مشاہدہ بہت گہرا تھا۔ اس نے نوعمری کے زمانے سے ہی دنیا کے رنگ ڈھنگ کو دیکھنا اور کرداروں کو اپنے ذہن میں محفوظ کرنا شروع کر دیا تھا۔ انہی کرداروں کو وہ ذہن کی الماری سے باہر نکال کر، جھاڑ پونچھ کر اپنے افسانوں میں پیش کر دیتا تھا اور وہ یادگار بن جاتے تھے۔

منٹو کے ساتھ معاشرے اور سرمایہ دارانہ نظام نے بہت ظلم کیے۔ منٹو نے بہت لکھا۔ اتنے افسانے شاید ہی کسی دوسرے افسانہ نگار نے لکھے ہوں۔ مگر ناشروں نے اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر پانچ اور دس روپے میں ان ادبی شاہکاروں کو خرید لیا اور اس کی کتابوں سے لاکھوں کمائے جن میں منٹو یا اس کے بیوی بچوں کا کوئی حصہ نہ تھا۔ انہوں نے بعض اوقات دن میں دو افسانے بھی لکھے ہیں مگر قاری اندازہ نہیں لگا سکتا کہ یہ ادب پارہ ایک ہی نشست میں چلتے پھرتے چند منٹوں میں لکھا گیا ہے جس کا معاوضہ پانچ یا دس روپے دیا گیا تھا۔

منٹو کا ذہن بہت زرخیز تھا جس میں روپے پیسے کی کھاد ڈالنے کی بھی حاجت نہ تھی۔ وہ نئے نئے موضوع، کردار اور واقعات بیان کرتا رہتا تھا اور کبھی منٹو کا ذہنی سرمایہ کم نہ ہوتا تھا۔

اس کو افسانہ لکھنے کے لیے کسی خاص ماحول اور تحریک کی ضرورت بھی نہ تھی۔ جب وہ قلم یا پنسل ہاتھ میں اٹھاتا تھا تو اس کا ذہن خود بخود افسانہ اگلنے لگتا تھا۔

افسوس کہ ایسے بے بہا داستان گو کو جوان العمری میں ہی دنیا سے رخصت ہونا پڑا۔ اگر وہ تمام عمر محض افسانے ہی تخلیق کرتا رہتا تو ان کی تعداد لاکھوں نہیں تو ہزاروں میں ضرور ہوتی۔ اس نے ہر صنف پر قلم اٹھایا۔ افسانے، ریڈیو ڈرامے، فلمی کہانی، خاکہ نویسی، طنز و مزاح، فلم، غرضیکہ اردو ادب کا کوئی ایک شعبہ بھی ایسا نہ تھا جس میں اس نے قلمکاری کے جوہر نہ دکھائے ہوں۔ یہ سچ ہے کہ وہ ایک پیدائشی افسانہ نگار تھا۔ غالب کی طرح اس کو بھی ناقدریٔ زمانہ اور حالات کی مسلسل خرابی کے باوجود یہ احساس تھا کہ وہ ایک عظیم افسانہ نگار ہے۔

غالب نے کہا تھا

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

جب آخری عمر میں صحت نے ساتھ چھوڑ دیا تھا اور سب جانتے تھے کہ منٹو آہستہ آہستہ موت کی طرف بڑھ رہا ہے، منٹو نے لکھا تھا۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سعادت حسن مر جائے اور منٹو نہ مرے۔"

منٹو صاحب نے قیام پاکستان سے قبل احمد ندیم قاسمی کے ساتھ خط و کتابت کی تھی۔ یہ خط و کتابت اردو ادب کے لیے ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ حیرت ہے کہ کتابی صورت میں آج تک اس کو شائع نہیں کیا گیا۔ ان خطوط میں منٹو نے اپنی ذاتی زندگی، مسائل اور محسوسات کے بارے میں بہت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

ان خطوط کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ منٹو عمر کے کسی حصے میں احساسِ کمتری کا شکار نہ ہوئے اور انہوں نے کبھی زمانے اور حالات کی شکایت نہیں کی۔ کبھی ان کا کسی سے تذکرہ نہیں کیا۔ شاید وہ اس کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ انہیں اپنے بچوں اور بیوی سے بہت محبت تھی مگر ان کے لیے کچھ نہ کرنے کا بھی شدت سے احساس تھا۔ بالآخر یہی احساس انہیں مے نوشی، بلانوشی اور ایک لحاظ سے خودکشی کی طرف لے گیا۔

ان خطوط سے پہلی بار یہ انکشاف ہوتا ہے، جن دنوں وہ الف اے میں تعلیم حاصل کر رہے تھے انہوں نے شعر کہنے کی کوشش بھی کی تھی مگر پھر اس کو بھاری پتھر سمجھ کر چھوڑ دیا۔ یہ تو

سب جانتے ہیں کہ منٹو ایف اے کے امتحان میں فیل ہو گئے تھے۔ مگر بالآخر تھرڈ ڈویژن میں انٹر پاس کر کے تعلیم کا سلسلہ ختم کر دیا۔ اس زمانے میں وہ دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی کرتے تھے۔ ان کے ساتھ مل کر انہوں نے طرح طرح کے نشے بھی کیے مگر طبیعت کی بے کلی اور بے چینی سے نجات حاصل نہ کر سکے اور ہمیشہ ذہنی انتشار میں مبتلا رہے۔

ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ 1935ء میں ان کے مالی حالات بہت خراب تھے۔ صحت بھی تیزی سے گر رہی تھی۔ انہیں سینے میں درد کی شکایت تھی۔ بعض اوقات یہ تکلیف حد سے زیادہ بڑھ جاتی تھی اور اندیشہ تھا کہ وہ تپ دق کے مرض میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹروں نے انہیں کسی صحت افزا مقام پر جا کر آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ انہوں نے اس مقصد کے لیے کشمیر جنت نظیر کا رخ کیا۔ وہاں وہ آرام کرتے، گھومتے پھرتے اور ہر طرح کی فکر سے آزاد رہنے کی کوشش کرتے تھے۔

وہاں انہیں ایک کشمیری چرواہی سے محبت ہو گئی جس کا نام "بیگو" تھا۔ یہ ان کی زندگی کا خوبصورت ترین زمانہ تھا مگر یہ محبت کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہو گئی۔

منٹو صاحب نے بے تکلف دوستوں کے علاوہ اس محبت کا کسی اور سے ذکر نہیں کیا تھا۔

شادی کے بعد منٹو کی محبت کا مرکز اس کی بیوی اور بچیاں تھیں جن کے مستقبل کی فکر نے منٹو کو موت کی منزل تک پہنچا دیا۔ منٹو کو اس بے بسی، مجبوری اور محرومی کا شدت سے احساس تھا۔ انہیں اس وقت بے حد ذہنی کوفت برداشت کرنی پڑی جب بیٹی کی سالگرہ کے موقعے پر ان کی جیب میں ایک پیسا تک نہ تھا۔

ان کی بیگم صفیہ بھابی ایک سمجھ دار اور قناعت کرنے والی بیوی تھیں۔ وہ ہر حال میں خوش رہیں لیکن منٹو کی بڑھتی ہوئی مے نوشی کی عادت ان کے لیے بہت تکلیف دہ تھی۔ وہ ایسی بیوی تھیں جنہوں نے کبھی اپنے شوہر سے کوئی فرمائش نہیں کی۔ منٹو کو اس بات کا بھی احساس اور صدمہ تھا۔

ایک خط میں انہوں نے قاسمی صاحب کو لکھا تھا۔

"میں ہر وقت خود کو نامکمل سمجھتا ہوں۔ محسوس ہوتا ہے کہ جو کچھ بھی ہوں اس کی وجہ کچھ اور بھی ہونی چاہیے۔"

منٹو ایک عجیب و غریب شخص تھا۔ وہ دوسروں کے لیے تو ایک معما تھا ہی لیکن خود اپنے لیے بھی ایک معما تھا۔ یہ معما آج تک لاینحل ہے اور شاید ہمیشہ یوں ہی ناقابلِ حل رہے گا۔

☆☆☆

اللہ تعالیٰ نے انسان کے مستقبل کا احوال اپنے قبضۂ قدرت میں رکھا ہے۔ ذرا سوچیے کہ اگر یہ نہ ہوتا تو آنے والے حادثات اور خوفناک واقعات کے بارے میں سوچ سوچ کر ہی انسان حال کی دلچسپیوں اور خوشیوں سے بھی لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی اللہ کی مہربانی ہے کہ اس نے ہمارا اور آپ کا "کل" ہم سے پوشیدہ رکھا ہے۔

زندگی میں بعض افراد ایسے ہوتے ہیں جن کے بارے میں کسی زمانے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ خوبرو چہرہ بھی جھریوں سے پُر ہوگا۔ یہ کسرتی اور خوبصورت جسم سکڑ کر ہڈیوں کا ڈھانچا بن جائے گا۔ وہ خود بھی نوجوانی اور جوانی کی جولانیوں میں مست اور خوش و خرم رہتا ہے۔ کل اس کی قسمت میں کیا ہے یہ وہ نہیں جانتا اور یہی اس کے لیے بہت بڑی نعمت ہے۔

تذکرہ اردو کے منفرد اور بہت خوبصورت مزاح نگار شفیق الرحمٰن کا مقصود ہے۔ ہم نوعمری میں ان کی کہانیوں اور تحریروں کے شیدائی تھے۔ اس زمانے میں کیسے کیسے مزاح نگار اردو ادب کی پھلواری میں اپنی تحریروں کے شگفتہ پھول کھلا رہے تھے۔ ملا رموزی، حاجی لق لق، فرحت اللہ بیگ، عظیم بیگ چغتائی، پروفیسر رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، شوکت تھانوی غرضیکہ ایک طویل فہرست ہے۔ یہ لوگ سکہ بند مزاح نگار تھے۔ ہر ایک کا اپنا انداز اور اسلوب تھا۔ ہر ایک کے کردار مختلف ہوتے تھے۔ اس کے باوجود جب شفیق الرحمٰن کے نام سے ایک مزاح نگار سامنے آیا تو نوجوان نسل کو تو اس نے دیوانہ بنا کر رکھ دیا۔

ہمیں کافی عرصے تک یہ معلوم ہی نہ ہوا کہ وہ ڈاکٹر بھی ہیں اور فوج میں بھی ملازم ہیں۔ اس زمانے میں تصویریں تو شائع نہیں ہوتی تھیں بس اپنے تخیل کی بنیاد پر لکھنے والے کی شکل صورت کا ایک خاکہ پڑھنے والوں کے ذہن میں بن جاتا تھا۔ شفیق الرحمٰن کی شوخ و شنگ رومانی اور رواں تحریروں کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا تھا کہ ہر شخص ایک اسپورٹس مین ہے۔ ایک دراز قد اور خوبصورت انسان ہے۔ بے حد کشش کا حامل ہے۔ بہت خوش مزاج اور لطیفہ گو ہے۔ زندہ دل ہے، صنفِ نازک میں بہت مقبول ہے (اصلی زندگی میں) وغیرہ وغیرہ۔

آہستہ آہستہ شخصیت کے پرت اترنے لگے تو معلوم ہوا کہ شفیق الرحمٰن ان میں سے بیشتر خوبیوں کے حامل ہیں۔ انہیں پڑھتے رہتے، ہنستے رہتے، خوش ہوتے رہتے۔ ان کی تحریروں

www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں ایسی دلکشی تھی کہ نوجوان خود کو اسی ماحول میں گم پاتے تھے۔ پر کوئی نہیں جانتا تھا کہ پڑھنے والوں کو خوشیاں عطا کرنے والا یہ شخص زندگی کے آخری دنوں میں (بلکہ درمیانہ عمر میں بھی) کتنی تکالیف اور غموں کو برداشت کرتا رہا۔

شفیق الرحمن کا اندازِ تحریر سب سے الگ تھا۔ آسان، عام فہم، شگفتہ فقرے، دلچسپ کردار، پُرکشش واقعات اور ایسا مزاح جو بچے سے بوڑھے تک سب کو ہنسنے پر مجبور کردے لیکن یہ بھی ظاہر ہوجاتا تھا کہ اس شخص کا مطالعہ بہت زیادہ اور مشاہدہ بہت گہرا ہے۔ ان کے شوخ مزاح کے پس منظر میں سوچنے کا مواد بھی موجود ہوتا تھا۔ ان کے ہر لطیفے سے کوئی سبق نکلتا تھا۔

ایک زمانے میں ان پر اعتراض کیا گیا کہ وہ لطیفے اکٹھے کرکے مضمون بنادیتے ہیں۔ یہ درست نہ تھا۔ ان کی تحریروں میں برمحل اور نت نئے لطیفے ضرور شامل ہوتے تھے لیکن وہ عام لطیفے نہیں ہوتے تھے۔ وہ خدا جانے کہاں کہاں سے نئے نئے لطیفے تلاش کرتے اور انہیں اپنے مضامین میں جا بجا ایسے سجاتے کہ مضمون کی چمک دمک اور خوبصورتی میں اضافہ ہوجاتا تھا۔ انہوں نے تاریخی کرداروں کی بے حد خوبصورت پیروڈیز بھی لکھی ہیں۔ طبع زاد کہانیاں اور تاثرات پر مشتمل رومانی داستانیں بھی لکھی ہیں۔ ان کی تحریر میں گدگدی پیدا کرنے والی شوخی تھی اور شائستہ رومانی واقعات اور کردار ان کو مزید سجادیتے تھے۔ آیئے، پہلے تو یہ بتاتے ہیں کہ شفیق الرحمن کون تھے؟

شفیق الرحمن ایک خوش حال متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد انجینئر تھے۔ والدہ بھی تعلیم یافتہ تھیں۔ والدین کو مطالعے کا بہت شوق تھا۔ پڑھنے کا یہ شوق شفیق الرحمن کو ورثے میں اپنے ماں باپ سے ملا تھا۔ ان کی تعلیم وتربیت بہت ہی اچھے اور شائستہ تعلیم یافتہ ماحول میں ہوئی تھی جس کا اثر تمام عمر ان کی زندگی میں اور تحریروں میں نمایاں رہا۔

وہ بہت ذہین اور محنتی طالب علم تھے اس کے ساتھ ہی بہت اچھے اسپورٹس مین بھی تھے جس کا اظہار ان کے افسانوں میں بھی نمایاں ہے۔ ایف ایس سی انہوں نے رہتک کے گورنمنٹ کالج سے پاس کیا تھا پھر میڈیکل تعلیم کے لیے لاہور کے تاریخی کنگ ایڈورڈ کالج میں داخلہ لے لیا اور یہیں سے ڈاکٹر بن کر نکلے۔ وہ کھیلوں میں بھی نمایاں رہتے تھے۔ خصوصاً کرکٹ ان کا پسندیدہ کھیل تھا جس کا اندازہ ان کے افسانے ''فاسٹ بالر'' کو پڑھ کر ہوسکتا ہے۔ بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں وہ اسٹیج ڈراموں میں ایکٹنگ بھی کرتے رہے لیکن ان کا سب سے پسندیدہ مشغلہ ''مطالعہ'' تھا۔ اسی وجہ سے انہوں نے لکھنا شروع کیا۔ نوعمری میں انہوں نے جو پہلا مضمون لکھا تھا اس کا عنوان ''چاکلیٹ'' تھا۔

انہوں نے طالب علمی کا جو زمانہ لاہور میں گزارہ، اس زمانے کا لاہور ادیبوں اور شاعروں کا مرکز تھا۔ یہ ہندوستان کا بہت بڑا ثقافتی مرکز تھا۔ انہیں فیض احمد فیض، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، ساحر لدھیانوی اور اس دور کے بڑے نامور اہلِ قلم کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع ملا۔ اس کی وجہ سے ان کی تحریروں میں مزید پختگی اور حسن پیدا ہوگیا۔

شفیق الرحمن کی کہانیوں میں ہیرو دراصل وہ خود ہی ہوتے ہیں۔ دراز قد، متناسب جسم، مناسب قدوقامت، خوبرو، کھیلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والے کردار ہی ان کی کہانیوں کے ہیرو ہوتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو انہوں نے خود اپنے آپ کو مرکزی کردار بنا کر ہی کہانیاں لکھیں۔ ظاہر ہے کہ ان خوبیوں کی وجہ سے وہ صنفِ مخالف میں بے حد مقبول تھے۔ ان کی کہانی ''فاسٹ بالر'' کے ہیرو دراصل خود شفیق الرحمن ہی ہیں۔

1942ء میں انہوں نے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی۔ اسی سال ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ''کرنیں'' شائع ہوا تھا۔ صرف 22 سال کی عمر میں وہ ایک صاحبِ کتاب مصنف اور ایک اچھے ڈاکٹر بن گئے تھے۔ ان کا نام ادبی حلقوں میں جانا پہچانا تھا۔

کچھ عرصے بعد انہوں نے ڈاکٹر کے طور پر آرمی میں شمولیت کرلی اور لیفٹیننٹ بن گئے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے زمانے میں انہیں برما، انگلستان، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور یورپ کے علاوہ کئی افریقی ممالک کا دورہ کرنے کا موقع بھی ملا جس نے ان کے مشاہدے کو مزید صیقل کردیا۔ ایک کورس کے سلسلے میں وہ انگلستان گئے تو امتحان سے فارغ ہوکر سارے یورپ میں گھومتے رہے۔ ان کا ناولٹ ''برساتی'' انہی تاثرات پر مشتمل ہے۔

شادی کے بعد ان کی زندگی میں ویسی ہی تبدیلیاں ہوئیں جیسی کہ کافی عرصے کنوارے رہنے کے بعد ایک شادی شدہ شخص میں پیدا ہوجاتی ہیں۔

معروف مزاح نگار شفیق الرحمٰن

زندگی خوشیوں اور آسائشوں میں گزر رہی تھی کہ اچانک ان کی زندگی میں ایک ایسا حادثہ پیش آیا جس نے ان کی شخصیت کو گہنا کر رکھ دیا اور وہ ایک خوبصورت خواب سے بیدار ہوگئے۔ ان کے دو نوجوان بیٹوں نے خودکشی کرلی۔ اس کا سبب تو معلوم نہ ہوسکا مگر اس حادثے نے ان کی زندگی کو بدل کر رکھ دیا۔ ان کے دل سے ترنگیں، امنگیں اور شوخیاں رخصت ہوگئیں۔

انہیں اپنے بیٹوں سے بے حد محبت تھی۔ والد اور بیٹوں سے زیادہ ان میں دوستی کا تعلق تھا۔ شفیق الرحمن انہیں کامیاب انسان بنانے کے لیے پوری کوشش کررہے تھے۔ آج تک یہ معلوم نہ ہوسکا کہ ان دونوں بیٹوں نے خودکشی کیوں کی؟ یہ ایک معما ہی رہا اور اب تک معما ہی ہے۔ ان کا دل مردہ ہوگیا۔ مزاح نگاری کو انہوں نے خدا حافظ کہہ دیا۔ انہوں نے 1980ء سے 1991ء تک ذاتی دوستوں کو جو خطوط لکھے ہیں ان کو بعد میں شائع بھی کردیا گیا۔ ان خطوں کا ایک ایک لفظ غم والم، مایوسی اور دنیا سے بیزاری میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔

قدرت نے انہیں ایک اور صدمے سے دوچار کیا جب ان کے بھائی خلیل الرحمن کا انتقال ہوا۔ دکھوں اور غموں نے ان کی کمر توڑ دی۔ اب وہ ایک بالکل مختلف انسان تھے جو بیزاری سے زندگی کے دن گزار رہا تھا۔ ابھی یہ غم تازہ تھا کہ ان کی جوان بھتیجی نصرت کا انتقال ہوگیا۔ یہ دونوں وہ لوگ تھے جو شفیق الرحمن کو بے حد عزیز تھے اور ان کی وجہ سے بہت دلچسپی رہتی تھی۔

غموں نے ان کے دل کو اپنا مستقل ٹھکانا بنالیا اور وہ صدموں کی وجہ سے خود بھی بیمار ہوگئے۔ انہیں سانس اور دل کا عارضہ ہوگیا۔ جسم میں مزاحمت کی قوت باقی نہ رہی تھی اس لیے مرض مزید پیچیدہ ہوگیا اور وہ ایک بیماری میں مبتلا ہوگئے جس میں ضرورت سے زیادہ خون بننے لگتا ہے اور یہ خون جسم سے نکالنا پڑتا ہے۔

مگر ابھی مزید صدمات باقی تھے۔ ان کے سب سے چھوٹے بھائی عتیق الرحمن اچانک ہارٹ فیل ہونے کی وجہ سے وفات پاگئے۔ ان کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں مگر ''خاندان'' نہیں ہے جس کی وجہ سے سب ایک دوسرے سے بچھڑ گئے ہیں کیونکہ بدقسمتی سے ان کی اور بیگم کی طلاق ہوچکی تھی۔ اس عظیم زندگی اور خوشیوں سے بھرپور زندگی بسر کرنے والے انسان کو غموں اور صدمات نے چاٹ لیا۔ انہوں نے اپنے ایک خط میں لکھا تھا۔

''ہر شخص کو اپنی صلیب خود اپنے کاندھوں پر اٹھا کر چلنا پڑتا ہے۔''

بالآخر دس سال قبل (مارچ 2000ء) میں شفیق الرحمن تمام دکھوں اور تکلیفوں سے آزاد ہوگئے۔

وہ دنیا میں نہیں رہے مگر ان کی تحریریں ہمیشہ پڑھنے والوں کی زندگی میں خوشیاں بکھیرتی رہیں گی۔

پاکستان آکر 1950ء میں ہم نے اپنی چند مزاحیہ کہانیاں انہیں ارسال کی تھیں تاکہ وہ اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔ جواب میں چند سطری خط موصول ہوا جو ہم نے بہت سنبھال کر رکھا ہے۔

خوبصورت ہینڈ رائٹنگ میں لکھے ہوئے اس خط میں انہوں نے ہمیں مشورہ دیا تھا کہ لکھتے رہیے، مشق سے آپ اچھا لکھنے لگیں گے۔

یہ ہماری میٹرک سے پہلے لکھی ہوئی رومانی اور مزاحیہ تحریروں کی چند کاپیاں تھیں۔ ظاہر ہے ان میں ناپختگی اور اناڑی پن تھا۔ یہ کاپیاں ہم نے شوکت تھانوی صاحب کو بھی دکھائی تھیں، ان کی بھی کم وبیش یہی رائے تھی۔

ہم سوچتے ہیں کہ اپنے لڑکپن کی بچکانا کہانیاں اتنے بڑے اور نامور ادیبوں کو دکھانے کی ہمیں جرأت کیسے ہوئی؟

شاید اس لیے کہ ہمارے اندر دوسری بہت سی چیزوں کی کمی ہے لیکن جرأت کی کمی کبھی نہیں رہی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

محوِ حیرت ہوں

قارئین

اس دنیا میں پُراسرار شخصیتوں، مقامات کی تعداد کا شمار نہیں۔ ہر ملک و شہر میں کسی نہ کسی پُراسرار شخصیت، مقام کا تذکرہ ضرور سننے میں آجائے گا۔ مگر یہاں صرف ان پُراسرار مقامات، شخصیتوں کا ذکر ہے جن کے بارے میں ایک دنیا قیاس آرائی میں مصروف ہے، جن مقامات، شخصیات پر پردہ ہنوز برقرار ہے۔ حقیقت کیا ہے، اس بارے میں کسی کو کچھ پتا نہیں۔

اسرار کے پردے میں چھپے مقامات و افراد کا تذکرہ

یہ دنیا بہت خوبصورت، بہت رنگا رنگ، بہت دلچسپ اور اس کے ساتھ بہت پُراسرار بھی ہے۔

نہ جانے یہاں کیسے کیسے واقعات پیش آتے ہیں۔ کیسی کیسی حیرت انگیزیاں وابستہ ہیں۔

ایسا ہی ایک حیرت انگیز واقعہ سنگاپور کے سمندر میں پیش آیا تھا۔

ایک صبح سنگاپور کے باسیوں نے دیکھا کہ ساحل پر اَن گنت جہاز تیر رہے ہیں۔ یہ رپورٹ برطانوی اخبار Daily Britain نے دی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ جہازوں کی تعداد اتنی تھی جتنی امریکا اور برطانیہ کے مجموعی جہازوں کی ہوسکتی ہے۔ ان جہازوں میں نہ تو مسافر تھے اور نہ کسی قسم کا سامان تھا۔

ایک دوسرا واقعہ سنیں۔

اگست 2009ء میں ایک امریکی بچی کی موبائل کے ذریعے تصویر لی گئی۔ یہ تصویر بچی کے والد نے لی تھی اور اس نے دیکھا کہ اس تصویر میں اس بچی کے بالکل پیچھے ایک بوڑھی عورت کھڑی ہوئی ہے۔

اس نے بوکھلا کر بچی کی طرف دیکھا۔ اس کے پیچھے کچھ بھی نہیں تھا۔ کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے دوبارہ تصویر اتاری اور وہ بوڑھی عورت دوبارہ دکھائی دے گئی۔

سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس تصویر میں نظر آنے والی بوڑھی عورت اس بچی کی دادی یعنی اس کے باپ کی ماں تھی اور اس کا انتقال 1990ء میں ہی ہو چکا تھا۔

ایک اور حیرت انگیز تعمیر۔ یہ تعمیر 1102ء کی ہے۔ یہ ایک بہت بڑے گرجا گھر کی عمارت ہے۔ صدیوں قدیم اس گرجا گھر کی دیواروں اور ستونوں پر چھوٹے چھوٹے مجسمے تراشے گئے ہیں۔ اس زمانے میں یعنی 1102ء میں تراشے گئے مجسموں میں ایک مجسمہ چاند پر جانے والے پہلے خلا باز آرمسٹرنگ کا ہے۔

جی ہاں، وہی حلیہ، وہی قد، وہی خلائی لباس اور وہی خلائی خود۔ ہزاروں لاکھوں سیاح اس مجسمے کو دیکھنے آتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ آخر یہ کیا ہے، کیسے ممکن ہوسکا۔

تو یہ دنیا کچھ ایسی ہے۔

اور اب موت کی کرسی کی کہانی سن لیں۔

اس کا نام تھامس بس پائی تھا۔ یہ واقعہ نارتھ یارک شائر کے قریب ایک قصبے کا ہے۔

تھامس ایک بڑھئی تھا۔ قصبے والوں کو اس کی کاریگری اور ہنرمندی کا اعتراف تھا۔ وہ جانتے تھے کہ تھامس جس لکڑی کو استعمال کرنا چاہتا ہے وہ اس کے لیے موم ہو جاتی ہے اور وہ اس میں اپنی کاریگری اور ہنرمندی کے جوہر دکھا دیتا ہے۔

یہ زمانہ 1702ء کا تھا یعنی اندازہ کرلیں۔ تقریباً تین سو نو برس پہلے اور آج یعنی 2011ء تک وہ کہانی سننے والوں کو حیرت زدہ کرتی رہتی ہے۔

تھامس نے اپنے لیے ایک اونچی جھولنے والی کرسی بنائی تھی، اسے اس کرسی سے بہت محبت تھی۔

وہ یہ گوارا کر ہی نہیں سکتا تھا کہ کوئی دوسرا اس کرسی کے نزدیک بھی جائے۔ تھامس میں سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ وہ بلا کا شراب نوش تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک محنتی اور ایماندار انسان تھا لیکن اس کی شراب نوشی اس کی ہر خوبی پر پانی پھیر دیا کرتی۔ وہ شراب پی کر کنٹرول سے باہر ہو جاتا تھا۔

ایک بار اس کے کارخانے میں ایک باپ بیٹا آئے۔

باپ لکڑی کا کوئی کام کروانا چاہ رہا تھا۔ تھامس اور وہ باتیں کرنے لگے جبکہ وہ بچہ تھامس کی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا اور آرام سے جھولنے لگا۔

تھامس نے جب اس بچے کو اپنی کرسی استعمال کرتے ہوئے دیکھا تو اس کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ اس نے آگے بڑھ کر اس بچے کو نہ صرف تھپڑ رسید کر دیا بلکہ اسے کرسی سے اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا۔

بچے کے باپ نے ہنگامہ برپا کر دیا۔ آس پاس کے لوگ جمع ہو گئے۔ جب انہیں تھامس کی اس حرکت کے بارے میں پتا چلا تو سب اسے برا بھلا کہنے لگے تھے لیکن تھامس آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ ”میں یہ برداشت کر ہی نہیں سکتا کہ کوئی بھی میری کرسی کے پاس آئے، چاہے وہ جوان ہو، بوڑھا ہو یا کوئی بچہ۔“

ظاہر ہے اس پاگل پن کا کیا جواب ہوسکتا تھا۔ اس کے بعد یہ ضرور ہوا کہ لوگ تھامس سے کترانے لگے، لیکن تھامس کو ان باتوں کی پروا نہیں تھی۔

تھامس کی دوستی آلٹی نام کے ایک شخص سے ہو گئی۔ آلٹی پرلے درجے کا شرابی تھا۔ شاید یہی مشترکہ بات ان دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لے آئی تھی۔

آلٹی اس قصبے میں نائی کے طور پر کام کیا کرتا تھا۔ تھامس اور آلٹی کی دوستی اتنی زیادہ ہو گئی کہ دونوں رات گئے نشے میں دھت ایک ساتھ قصبے کی سڑکوں اور گلیوں میں آوارہ گردی کرتے پھرتے۔

ایک رات تھامس جب دیر سے واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ آلٹی اس کی پسندیدہ کرسی پر بیٹھا ہوا مزے سے جھول رہا تھا۔ تھامس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے لپک کر آلٹی کا گریبان پکڑ لیا۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔

اور دوسری صبح آلٹی غائب ہو چکا تھا۔ پورا قصبہ اس کی تلاش میں مصروف ہو گیا تھا لیکن اس کا کوئی پتا نہیں چل رہا تھا۔ ان تلاش کرنے والوں میں تھامس بھی شامل تھا۔

بہرحال تیسرے دن آلٹی کی لاش ایک نالے کے پاس مل گئی۔

اس کا حلیہ خراب ہو چکا تھا۔ اس کا قتل بہت بے رحمی سے ہوا تھا، ہتھوڑے مار مار کر۔ شبہ تھامس کی طرف تھا۔ بہرحال جب تھامس سے تفتیش ہوئی تو وہ انکار نہیں کرسکا۔ اس نے بتا دیا کہ اس نے آلٹی کو اس لیے مارا تھا کہ وہ اس کی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

قانون نے تھامس کو موت کی سزا دی۔ سزا سنتے ہی وہ چیخ چیخ کر کہنے لگا۔ ”یہ میری کرسی ہے، میری موت کے بعد بھی اگر کوئی اس کرسی پر بیٹھا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ماردوں گا اس کو۔“

تھامس کو موت کی سزا ہو گئی اور اس کے مرنے کے بعد اس کرسی کی وہ کہانی شروع ہوئی جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔

تھامس کی موت کے بعد اس کی کرسی قصبے کے ایک آدمی نے لے لی جس نے تھامس کو قرض کے طور پر کچھ رقم دے رکھی

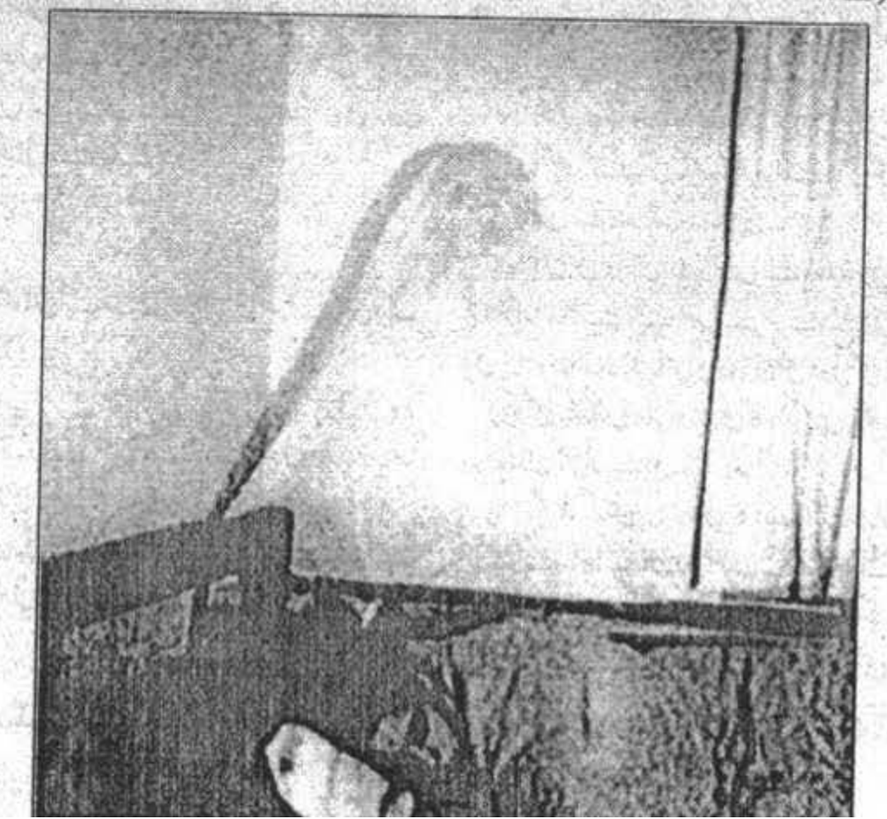

www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔

لیکن اس کرسی پر بیٹھنے کے دو گھنٹے بعد اس آدمی کا ایک حادثے میں انتقال ہوگیا۔ نہ جانے کس طرح اس کے گھر کی ایک دیوار اس آدمی پر گر پڑی تھی جس کے نتیجے میں وہ دب کر ہلاک ہوگیا۔

قصبے والوں کو یہ معلوم تھا کہ تھامس نے اپنی سزا کے وقت کرسی پر بیٹھنے والوں کو کیسی دھمکیاں دی تھیں اور کہا تھا کہ وہ بھوت بن کر اپنی کرسی کی حفاظت کرے گا۔

اس کے بعد کئی مہینوں تک اس کرسی پر کوئی نہیں بیٹھا۔ لوگ اس کے قریب جاتے ہوئے بھی خوفزدہ ہوتے تھے پھر ایک دن ایک شخص نے قصبے والوں کا وہم دور کرنے کے لیے اس کرسی پر بیٹھنے کا اعلان کردیا۔

قصبے والوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس نے سب کا مذاق اڑانا شروع کردیا اور ایک شام بہت سے لوگوں کی موجودگی میں کرسی پر بیٹھ گیا۔

اس وقت تو کچھ بھی نہیں ہوا لیکن دوسری صبح وہ آدمی اپنی چھت سے اس طرح گر کر ہلاک ہوا جیسے کسی نے اسے اوپر سے دھکا دے دیا ہو۔

اس کے بعد بھی کئی واقعات ہوئے۔ کئی عورتیں' بچے اور مرد اس کرسی کا شکار ہوئے۔ دو پائلٹ بھی اس کرسی کی بھینٹ چڑھ گئے۔

جب درجنوں وارداتیں ہوگئیں تو پھر اس کرسی کو انتہائی منحوس قرار دے دیا گیا اور 1976ء میں اس کرسی کو اس قصبے کے ایک میوزیم میں تھامس کی یادگار کے طور پر رکھ دیا گیا ہے۔

اب یہ حال ہے کہ دیکھنے والے اس کرسی کو اس امید پر دیکھنے آتے ہیں کہ شاید اس کے آس پاس تھامس کی روح منڈلاتی ہوئی دکھائی دے جائے۔

مرسلہ: نیاز ارشد، شادی وال

☆☆☆

1810ء میں ایک دولت مند امریکی گھرانے میں ایک بچی کی پیدائش ہوئی۔

اس کا باپ امریکی جبکہ ماں برطانوی تھی۔ چونکہ اس کا امیر باپ ایک کاروباری شخص تھا۔ اس لیے خیال کیا جارہا تھا کہ شاید یہ بچی بڑی ہوکر کاروبار وغیرہ میں دلچسپی لے گی۔

لیکن اس بچی کا رجحان بالکل مختلف تھا۔ اسے بچپن سے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا، اس کے علاوہ اس کے مزاج میں تجسس بھی انتہا کو تھا۔

وہ بلا کی قوتِ مشاہدہ رکھتی تھی اور جو کچھ بھی دیکھا کرتی اس کی ایک ایک تفصیل اپنی ڈائری میں درج کرلیا کرتی۔

اسی شوق اور اسی فطرت نے اسے آگے چل کر جاسوسی ادب کی سب سے بڑی رائٹر بنادیا۔

جی ہاں بات ہورہی ہے اگاتھا کرسٹی کی۔ پوری دنیا میں ہلچل مچادینے والی کتابوں کی خالق۔ جسے بلاشبہ جاسوسی ادب کی سب سے بڑی رائٹر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

All time best selling writer کہلاتی ہے۔ اس کے تخلیق کردہ کردار Harcola pairot اور بس مارپل کا پوری دنیا میں کوئی جواب نہیں ہے۔ اس کی کہانی mouse trade نہ جانے کتنے برسوں تک مسلسل اسٹیج کی جاتی رہی۔ وہ ایک باکمال رائٹر تھی۔ پڑھنے والے اس کے ناول کے پلاٹ کے الٹ پھیر میں گم ہوکر رہ جاتے۔

اور ایک دن وہ خود بھی گم ہوگئی۔

اگاتھا کرسٹی کی زندگی کا یہ سب سے پُراسرار واقعہ ہے۔

یہ واقعہ ہے جنوری 1976ء کا۔ وہ ہائیڈرونام کے ایک پُرسکون ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھی کہ اپنے کمرے سے پُراسرار طور پر غائب ہوگئی۔

وہ اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لے گئی تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں گئی ہے۔ اپنی مرضی سے گئی ہے یا کوئی اسے اپنے ساتھ لے گیا ہے۔

اس کے غائب ہونے کی کئی وجوہات بیان کی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنی ماں کی موت کے بعد شدید ڈپریشن کا شکار ہوکر کسی طرف نکل گئی تھی۔

لیکن یہ پہلو زیادہ غور طلب اس لیے نہیں ہے کہ وہ ایک انتہائی باشعور عورت تھی۔ پوری دنیا اسے جانتی تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ واپسی کے بعد سب کو بتادیتی۔

اس کی واپسی دو ہفتوں کے بعد ہوگئی تھی۔ وہ جس پُراسرار انداز سے اپنے ہوٹل کے کمرے سے غائب ہوئی تھی، اسی پُراسرار انداز میں اس کی واپسی بھی ہوئی تھی۔ لیکن اس نے کسی کو بھی کچھ نہیں بتایا اور نہ ہی کاؤنٹر گرل یا لفٹ بوائے نے اسے ہوٹل میں آتے ہوئے دیکھا تھا۔

اگاتھا کرسٹی کی زندگی کا ایک ایک پہلو نگاہوں کے سامنے ہے۔ سوائے ان دو ہفتوں کے کہ یہ دو ہفتے اس کی زندگی میں سے کہاں چلے گئے تھے۔ کئی سال بعد ایک اخبار نویس کے سوال پر اس نے صرف اتنا کہا تھا" کچھ اجنبی لباس والے،

اجنبی سواری پر سیدھے میرے کمرے میں مع سواری کے آگئے تھے اور مجھے زبردستی مہمان بنا کر ایک اجنبی علاقے میں لے گئے تھے۔"

مرسلہ: انم خورشید، دبئی، یو اے ای

☆☆☆

بھوتوں کا شہر۔

namibia کا ایک دور افتادہ مقام کوئی مانس کوپ جہاں ہر طرف ریت ہی ریت، دور دور تک کوئی آبادی نہیں۔

عام طور پر اس قسم کی دریافتیں اتفاق ہی کا نتیجہ ہوا کرتی ہیں۔ یعنی کوئی نہیں جانتا کہ وہ جو قدم اٹھا رہا ہے تو اگلا قدم اسے کن حیرتوں سے دوچار کردے گا۔

کیا دیکھنے کو ملے گا' کیسے حیرت انگیز واقعات اس کا مقدر بنیں گے۔ ایجاد اور دریافت میں یہی فرق ہے۔ ایجاد برسوں کی محنت اور غور کے نتیجے میں سامنے آتی ہے جبکہ دریافت کا کوئی اصول اور کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔

تو وہ دریافت اسی طرح ہوئی تھی۔

بے چارہ پیٹر ایک غریب آدمی تھا جسے یہ بتایا گیا کہ اس ریت کے میدان کو عبور کرنے کے بعد ایک شہر آئے گا جہاں اس کے لیے بہت مزدوریاں ہیں۔ وہ وہاں زندگی گزار سکتا ہے۔

اسے یہ معلوم تھا کہ یہ ریت کا میدان بہت بڑا ہے اور اس کو عبور کرتے ہوئے اسے ہفتوں لگ جائیں گے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس میدان کو پار کرتے ہوئے اسے موت آجائے۔

لیکن پیٹر بے چارہ اپنی زندگی سے ویسے ہی عاجز آیا ہوا تھا اسی لیے اس نے موت اور زندگی کی پروا نہیں کی اور اس صحرا میں داخل ہوگیا۔

وہ کئی گھنٹوں تک ریت میں چلتا رہا تھا پھر اسے احساس ہونے لگا کہ اس نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی حماقت کی ہے، وہ اس صحرا کو عبور نہیں کرسکتا اور بہتر یہی ہے کہ وہ واپس ہو جائے ورنہ موت تو ہوگی لیکن بہت بھیانک ہوگی۔

وہ واپس ہولیا اور اسی وقت اس نے ریت پر چمکتے ہوئے دو پتھر دیکھ لیے۔ یہ دونوں پتھر سورج کی روشنی میں دمک رہے تھے۔

اس نے دونوں پتھر اٹھالیے، اسے اندازہ تو ہوگیا تھا کہ اس نے کوئی چیز پالی ہے لیکن کیا ہے وہ اس کا اندازہ نہیں کر پارہا تھا۔

وہ اپنے شہر واپس آگیا۔ اس نے وہ دونوں پتھر ایک جوہری کو دکھائے۔ اس نے بتایا کہ یہ ہیرے ہیں اور بہت قیمتی۔

پیٹر نے اسی وقت وہ دونوں ہیرے فروخت کردیے۔ اس کی قسمت بدل گئی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد اس نے ایک ٹیم بنائی اور لوگوں کو لے کر اس صحرا میں پہنچ گیا۔

اس بار وہ اپنے ساتھ کچھ اوزار وغیرہ بھی لے کر آیا تھا۔ ان لوگوں نے وہاں ڈیرے ڈال لیے۔ پندرہ دنوں کی تلاش میں انہیں ویسے چھ پتھر اور مل گئے۔

اور جب شہر آکر انہیں فروخت کیا گیا تو اچھی خاصی رقم حاصل ہوگئی اور وہ رقم آپس میں تقسیم کردی گئی۔

اب وہ علاقہ ہیروں کے ذخیرے کے طور پر مشہور ہوگیا تھا۔

لوگوں نے وہاں جاکر رہنا شروع کردیا۔ مکان بن گئے' بازار بنادیے گئے۔ آنے جانے کے راستے بن گئے اور اچھا خاصا چھوٹا سا شہر آباد ہوگیا۔

یہ سب پیٹر کی اتفاقیہ دریافت کی وجہ سے ہوا تھا۔

نہ جانے کتنے لوگوں کو وہاں سے روزگار حاصل ہونے لگا۔ دھوبی' نائی' موچی' بڑھئی سبھی اس شہر میں آکر آباد ہوتے چلے گئے۔ ہیروں کی تلاش کرنے والے الگ تھے۔

پھر ایک رات اس قصبے میں عجیب واقعہ ہوا اور یہ واقعہ پیٹر ہی کے ساتھ ہوا تھا۔ اس نے بھی اس قصبے میں اپنا مکان بنوا لیا تھا۔ ویسے بھی اس علاقے پر سب سے زیادہ حق اسی کا تھا۔

اس نے اب شادی بھی کرلی تھی۔ وہ بیوی اور دو بچوں کے ساتھ مزے کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے دوسرے کاروبار بھی کرلیے تھے۔

اس کی ایک بڑی دکان تھی جو سویرے سویرے کھل جایا کرتی لیکن جب اس صبح اس کی دکان دیر تک نہیں کھلی تو کچھ لوگ اس کی خیریت معلوم کرنے اس کے گھر پہنچ گئے۔

اس کے گھر کے دروازے اور کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور سارے کمروں میں ریت کے ٹیلے جیسے کسی نے ساری رات ریت جمع کرکے اس کے کمروں میں پھینکی ہو۔

یہ ایک حیرت انگیز بات تھی۔ کیونکہ اس رات کسی قسم کا طوفان وغیرہ بھی نہیں آیا تھا جو یہ خیال کیا جاتا کہ شاید ہوا نے ریت کے ٹیلے بنادیے ہوں۔

فوری طور پر پیٹر اور اس کے گھر والوں کی تلاش شروع

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئی اور وہ سب مختلف کمروں میں ریت کے نیچے دبے ہوئے مل گئے۔

سب کی موت انتہائی دردناک ہوئی تھی۔ نہ جانے کس طرح دم گھٹ کر انہوں نے اپنی جانیں دی ہوں گی۔ کئی مہینوں تک پیٹر اور اس کے گھر والوں کی موت ایک حیرت انگیز سانحہ کا موضوع بنی رہی تھی۔

ایک رات پھر ایک گھر میں ایسا ہی ایک واقعہ ہوا۔

اس رات اس گھر میں رہنے والے پورے چھ آدمی ریت کے ٹیلوں کے نیچے دب کر مر گئے۔ یہ ٹیلے پُراسرار طور پر ان کے کمروں میں بن گئے تھے۔

جبکہ اس رات بھی موسم بالکل پُرسکون تھا۔ فرض کیا جائے اگر تیز ہوائیں بھی چلتی ہوتیں تو کم از کم اتنی ریت گھر میں تو نہیں آسکتی تھی کہ مکمل ٹیلے بنا کر رہنے والوں کو ہلاک کر دے۔

اب اس دوسرے واقعے کے بعد لوگوں نے خوفزدہ ہونا شروع کر دیا۔ یہ اتفاق تو نہیں ہوسکتا تھا پھر اس ہفتے ایک اور گھر میں ایسی واردات ہوگئی۔

اب تو ہر شخص انتہائی خوفزدہ ہوگیا تھا۔ نہ جانے کس قسم کی موت تھی جو اس بستی والوں کے تعاقب میں تھی۔

لوگوں نے آہستہ آہستہ اس بستی سے نکلنا شروع کر دیا۔ وہ اس طرح مرنا نہیں چاہتے تھے۔

لیکن بستی کے خالی ہونے میں بھی تین چار مہینے لگ گئے اور اس دوران تقریباً ایک درجن گھروں میں ایسے ہی واقعات رونما ہوگئے۔

لوگوں نے وہ بستی خالی کر دی۔

سب کچھ اسی طرح رہنے دیا گیا۔ بازار، دکانیں، مکانات۔ جو جتنا سامان لے جاسکتا تھا وہ اپنے ساتھ لے گیا۔ باقی سب کچھ اسی طرح پڑا رہ گیا۔

وہ بستی اب برسوں سے ویران پڑی ہے۔ سیاح دن کے وقت اس بستی کی سیر کے لیے جاتے ہیں اور ایک ایسی غیر آباد بستی کو دیکھ کر واپس آجاتے ہیں جس کے ہر گھر میں ریت کے انبار لگے ہوئے ہیں۔

اس بستی کا شمار بھی دنیا کے پُراسرار ترین مقامات میں ہوتا ہے۔

مرسلہ: عائشہ جونیجو، لاڑکانہ

☆☆☆

اسپین کا ایک چھوٹا سا خوبصورت سا گاؤں۔

اس گاؤں کا نام Balnez ہے۔ یہ بہت خوبصورت جگہ ہے۔ یہاں سے ہائی وے گزرتی ہے۔ سرسبز میدانوں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے گھر بنے ہوئے ہیں۔

اس گاؤں میں ہر طرح کی دکانیں ہیں۔ زندگی یہاں بہت ہی پُرسکون تھی۔ کوئی ہلچل نہیں، کوئی بڑا واقعہ نہیں، پھر ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے پوری دنیا کی توجہ اپنی طرف مرکوز کرا لی۔

ماریا پریرا ایک کسان پریرا کی بیوی تھی۔

دونوں میاں بیوی ایک عام سی زندگی گزار رہے تھے کہ ایک طوفان برپا ہوگیا۔ وہ دنیا کے چند حیرت انگیز ترین واقعات کا ایک کردار بن گئے۔

ماریا ایک دن اپنے باورچی خانے میں داخل ہوئی۔ یہ واقعہ ہے 21 اگست 1971ء کا۔ اس نے باورچی خانے کے فرش پر ایک چہرہ بنا ہوا دیکھا۔

فرش ٹائلز کا تھا اور ایک دھندلا سا چہرہ ان ہی ٹائلز میں اس طرح نمودار ہوگیا تھا جیسے کسی نے مبہم سی روغنی تصویر بنا دی ہو۔

یہ ایک حیرت انگیز بات تھی۔

ماریا نے اپنے طور پر پانی کے ذریعے اس چہرے کو دھونے کی کوشش کی لیکن وہ چہرہ جیسے ٹائلز میں جذب ہو کر رہ گیا تھا۔

پریرا جب گھر واپس آیا تو ماریا نے اسے صورتِ حال بتائی۔ پریرا نے اس کا وہم کہہ کر جب خود کچن میں جا کر دیکھا تو دنگ رہ گیا۔

کچن کے فرش پر ایک انسانی چہرہ بنا ہوا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ پریرا کے ذہن میں یہی بات آئی تھی کہ شاید کسی نے شرارت میں آکر اس کے کچن میں داخل ہو کر یہ حرکت کی ہے۔ لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

وہ چہرہ بنا ہوا تھا بھی اور نہیں بھی تھا۔ وہ چہرہ جیسے ٹائلز کے اندر سے ابھر کر سامنے آگیا تھا۔ اب دونوں میاں بیوی خوفزدہ ہو کر گھر سے باہر آگئے۔

انہوں نے اپنے آس پاس والوں کو یہ صورتِ حال بتا دی۔ لوگوں نے اس کے گھر میں جا کر دیکھنا شروع کر دیا۔

پورے علاقے میں ایک شور سا مچ گیا تھا۔ ہر ایک کی زبان پر پریرا کے کچن کی تصویر کی کہانی سنا رہی تھی۔ خود دونوں میاں بیوی اتنے خوفزدہ تھے کہ انہوں نے وہ رات اپنے گھر میں نہیں گزاری تھی بلکہ اپنے ایک جاننے والے کے یہاں

گزاری تھی۔

دوسرے دن کچھ لوگوں نے پریرا کو مشورہ دیا کہ وہ اس جگہ پلاستر پھیر دے جہاں وہ تصویر نمودار ہوئی ہے۔

پریرا نے ایسا ہی کیا۔ محلے ہی کے ایک کاریگر نے اس جگہ کو پلاستر کر دیا۔ دونوں مطمئن ہو گئے تھے کہ شاید اب یہ قصہ ختم ہوگیا۔

لیکن یہ قصہ ختم نہیں ہوا تھا۔ ابھی تو ان لوگوں کو اور بھی بہت کچھ دیکھنا تھا۔

تیسری صبح ٹھیک اسی جگہ ایک اور چہرہ نمودار ہوگیا جہاں پلاستر کیا گیا تھا۔ اس بار جو انسانی چہرہ تھا وہ بہت واضح تھا۔

فوراً ہی محلے کو خبر ہوگئی۔ ایک بار پھر اس کے گھر پر لوگوں کا ہجوم ہوگیا۔

صورتِ حال کا اندازہ کرنے کے لیے پولیس والے بھی آئے اور انجینئرز وغیرہ کو بھی بلا لیا گیا۔ ان کے علاوہ آثارِ قدیمہ اور تعمیراتی ماہرین بھی آگئے۔

بہت ہی باریک بینی سے ایک ایک انچ کا جائزہ لیا گیا کہ شاید کہیں سے کوئی سراغ مل جائے لیکن کوئی سراغ نہیں مل سکا۔

سائنس دانوں کے لیے انتہائی حیرت کی بات تھی کہ زمین کے اندر سے چہروں کی تصویریں کس طرح نمودار ہو رہی ہیں۔ اس بار ماہرین کے مشورے پر وہ ٹائلز اس جگہ سے کاٹ کر الگ کر لیے گئے جہاں وہ تصویر بنی ہوئی تھی اور اس تصویر کو ایک مضبوط فریم میں محفوظ کر لیا گیا۔

خالی جگہ کو دوبارہ سیمنٹ اور پتھروں سے بھر دیا گیا۔

سوچا گیا کہ شاید اب کوئی تصویر سامنے نہیں آئے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔

تیسرے دن اسی جگہ پھر ایک تصویر ابھر آئی۔

اس بار یہ تصویر ایک عورت کی تھی جو انتہائی واضح تھی۔

ایک بار پھر سائنس دانوں اور ماہرین نے ان کے گھر کا رخ کیا۔

دونوں میاں بیوی کی زندگی عذاب ہو کر رہ گئی تھی۔ ان کا سکون غارت ہوتا جا رہا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر یہ سب کیا اور کیوں ہو رہا ہے۔

اس بار پولیس کی اجازت سے اس جگہ کھدائی شروع ہوئی کہ شاید کوئی سراغ مل سکے۔ 270 میٹر کی گہری کھدائی کے بعد کچھ انسانی ہڈیاں مل گئیں۔

ایک عجیب سا سسپنس پیدا ہوگیا کہ یہ ہڈیاں کس کی ہو سکتی ہیں لیکن یہ معما اس طرح حل ہوگیا کہ جس جگہ پریرا کا مکان تھا وہاں کسی زمانے میں قبرستان ہوا کرتا تھا اس لیے ہڈیوں کا ملنا کوئی ایسی حیرت انگیز بات نہیں تھی۔

جو جگہ کھودی گئی تھی اسے دوبارہ بھر دیا گیا لیکن اس کے بعد بھی تصویروں کے ابھرنے کا سلسلہ بند نہیں ہوا۔

اس کے بعد بھی تصویریں اس فرش پر ابھرتی رہیں اور ان تصویروں کے ٹائلز کو اکھاڑ کر فریم میں لگایا جاتا رہا۔

اس طرح تصویروں کا یہ سلسلہ اپریل 1972ء تک جاری رہا یعنی اس دوران سترہ اٹھارہ تصویریں زمین سے ابھر کر سامنے آئیں۔

دونوں میاں بیوی کو وہ مکان چھوڑ دینا پڑا کیونکہ وہ آسیب زدہ مشہور ہوگیا تھا۔ صرف اسپین ہی نہیں بلکہ فرانس، جرمنی وغیرہ سے بھی لوگ ان تصویروں کو دیکھنے کے لیے آتے رہے۔

سائنس دان، ماہرینِ ارضیات، ماہرینِ تعمیرات وغیرہ ابھی تک اس بات پر حیران ہیں کہ ایسا کیوں ہوا۔

اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود اس مکان کی تصویریں ایک نہ سمجھ میں آنے والے راز کی طرح ہیں۔

وہ تصویریں آج تک اسی طرح محفوظ ہیں۔

اسپین جانے والے سیاح ان تصویروں کو دیکھنے کے لیے ضرور جایا کرتے ہیں۔ پریرا کے اس مکان کو حکومت نے سیل کر دیا ہے۔

یہ اور اسی طرح کے واقعات جو اس حیرت انگیز دنیا کی پُراسراریت میں اور اضافہ کر رہے ہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس دنیا میں اور کتنے واقعات پیش آئے ہوں گے۔

کوئی ضروری نہیں کہ انسانی عقل ان ..... واقعات کا احاطہ کر سکے۔ دیکھنے اور سمجھنے کے لیے اور بھی بہت کچھ ہے۔

مرسلہ: ارشد خان، لاہور

☆☆☆

ڈونی ڈیکر نام تھا اس نوجوان کا۔

مارچ 1983ء سے پہلے اس کے ساتھ ایسی کوئی کہانی نہیں تھی۔ وہ ایک عام سا نوجوان تھا جس طرح دوسرے نوجوان ہوا کرتے ہیں۔

موسیقی اور رقص کا دلدادہ۔ کبھی کبھی ریگی بھی کھیل لیا کرتا۔ اس کی صورت شکل بھی بہت مناسب تھی۔ اس کے دو گہرے دوست تھے جینی اور باب جن کے اپارٹمنٹ میں وہ ہر ہفتے کی رات کو جایا کرتا۔ یہ تینوں دوست رات میں ہلا گلا

www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

احسان دانش

کیرانہ کے لوگ نسلاً شریف اور عملاً لڑاکے ہوتے ہیں۔ نہایت خوش مزاج اور وفادار بھی پائے گئے ہیں۔ ہم چائے پیتے رہے اور گپ لگتی رہی۔ شام ہونے کو آئی تو میں نے شجاعت سے اجازت چاہی، اس نے کہا۔ ''میاں، میں نے گھر کھانے کے لیے کہہ دیا ہے۔ اب تو آپ کھانا کھا کر جا سکیں گے۔''

میں نے کہا ''رات ہو جائے گی، پھر کہاں جانے کا وقت رہے گا۔ دو گھنٹے خاموشی سے سفر کرنا میرے بس کی بات نہیں۔''

اس پر شجاعت نے کہا ''میں ساتھ چلوں گا، اب تو ٹھیک ہے نا؟''

میں مطمئن ہو گیا کہ شجاعت میرے ساتھ جائے گا، اب کیا فکر ہے۔ چنانچہ ہم رات کا کھانا کھا کر گیارہ بجے کے قریب کیرانہ سے کاندھلہ کو چل دیے۔ چاند ہم دونوں کے سروں پر ساتھ ساتھ چل رہا تھا اور جنگل کی خموشی چاندنی میں گھل مل کر پھیل رہی تھی۔ ہم دونوں آپس میں باتیں کرتے ایک دوسرے کو اپنے انتخاب کے اشعار سناتے جا رہے تھے۔ اونچے گاؤں کے سامنے میں نے بابو رام کو آواز دی، وہ شاید دن بھر کی مشقت سے تھک..... کر بے خبر سو رہا تھا۔ اس طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے دوبارہ آواز دی تو باغ کا چوکیدار نمودار ہوا۔ اس نے کہا کہ وہ سارا دن سفیدے کے بچے کی پود لگا تا رہا اس لیے تھک ہار کر سو رہا ہے۔ ہم آگے بڑھ گئے اور چوکیدار سے کہہ دیا کہ صبح اسے بتا دینا کہ رات احسان آیا تھا۔ دیر ہو گئی تھی اس لیے تمہیں جگانا مناسب نہ سمجھا۔ اونچے گاؤں اور جڈانہ کے درمیان شیخ سلیم چشتیؒ کے مزار کے سامنے ایک برساتی نالے کی پُلیا کی بلندی دو ڈھلوان بناتی ہے۔ سڑک کی دونوں طرف جمولیوں کے درخت خاموش تھے جیسے جنازہ گاہ کے صحن میں متقیوں نے نماز کی نیت باندھ رکھی ہو۔ درختوں سے ذرا فاصلے پر دور تک بیوہ زمین کے صحن میں آخری حاشیے پر تھوڑے تھوڑے بے کٹے کھیتوں کے تابوت سے باقی تھے۔ اس سونی اور بے حس رات میں جب ہم پُلیا پر پہنچے تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا رمقی میں پُلیا پر

ستانے لگا۔ شجاعت نے کہا کہ چلو یہ ستانے کا وقت نہیں ہے۔ گھر چل کر آرام کریں گے۔ میں نے کہا، ٹھہرو۔ ذرا اس نعمت سے محظوظ تو ہونے دو جو ہمارے اردگرد پھیلی پڑی ہے۔ شجاعت خاموش ہو کر میرے قریب بیٹھ گیا اور ہم دونوں چاندنی اور خاموشی کے آمیزے میں کھو گئے۔ ابھی ہم دونوں میں سے کسی کی خاموشی میں درز نہیں کھلی تھی کہ سڑک کے ذرا پرے ایک اونچے درخت کی چوٹی سے کوئی بھاری چیز پتوں اور شاخوں میں کھڑ بڑ کھڑ بڑ کرتی دھم سے زمین پر گری جیسے کوئی اناج کی بوری پھینک دے۔ میں نے شجاعت سے کہا، یہ کیا ہے؟

''جو کچھ بھی ہو، بس یہاں سے چل دو۔'' شجاعت نے جواب دیا۔

''دیکھیں تو سہی، آخر یہ ہے کیا؟''

''کیا ہوگا دیکھ کر، بس اٹھ چلو۔''

''چلیں گے تو سہی، مگر یہ معاملہ تو کھلے کہ یہ ہے کیا؟''

''یہی بات ہے تو آؤ اٹھو۔''

ہم دونوں اٹھ تانے اس کی طرف بڑھے۔ جب قریب پہنچے تو تقریباً دس فٹ کے فاصلے سے معلوم ہوا کہ کوئی چیز ہے جو کمہار کے چاک کی طرح گھوم رہی ہے اور رفتار کے باعث اس کی ساخت اور خدوخال معلوم نہیں ہوتے۔ ہم وہیں رک گئے اور برابر نظریں گاڑے دیکھتے رہے۔ وہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے کم ہونے لگی اور رفتہ رفتہ غائب ہو گئی۔ جیسے ایک بگولا چکرا کر گم ہو جائے۔ ہم دونوں دھڑکتے ہوئے دلوں سے واپس آئے۔ اب ہمارا یہ عالم تھا کہ پتا بھی کھڑکتا تو شبہ ہوتا تھا کہ وہی بلا تعاقب کر رہی ہے۔

اقتباس: جنات از رئیس امروہوی — مرسلہ: محمد عفان عثمان، لاہور

www.pkstuk.com

کرتے رہتے۔

یعنی سب کچھ نارمل ہی تھا پھر مارچ 1983ء کی ایک شام سب کچھ بدل گیا۔ ایک ایسی بات ہو گئی جس کا کوئی جواز آج تک نہیں دیا جا سکا ہے۔

ڈونی معمول کے مطابق اپنے دوستوں جینی اور باب کے اپارٹمنٹ میں ان کے ساتھ ہفتے کی رات بسر کرنے آیا تھا۔

دونوں دوست کچن میں تھے۔ ڈونی ڈرائنگ روم میں بیٹھا موسیقی سے دل بہلا رہا تھا کہ اچانک بارش شروع ہو گئی۔

یہ بارش باہر نہیں ہو رہی تھی بلکہ ڈرائنگ روم میں ہو رہی تھی اور جس جگہ ڈونی بیٹھا تھا وہیں ہو رہی تھی۔ ڈونی نے جلدی سے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا، باہر بھی بارش ہو رہی تھی لیکن ڈرائنگ روم کے اندر بارش کے پانی آنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

شور سن کر اس کے دونوں دوست بھی کچن سے ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ وہ بھی یہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ آخر یہ پانی کہاں سے آ رہا تھا چھت کیسے ٹپکنے لگی تھی اور وہ بھی اس بری طرح۔

انہوں نے فوری طور پر اپارٹمنٹ کے مالک کو فون کر کے بلوا لیا۔ وہ اپنے ساتھ پلمبر وغیرہ کو بھی لیتا آیا تھا لیکن کسی کی سمجھ میں نہیں آ سکا کہ چھت کیوں ٹپکنے لگی ہے۔

جینی اور باب نے اپارٹمنٹ کے مالک سے جھگڑا شروع کر دیا کہ اپارٹمنٹ کی کمزور خراب چھت کی وجہ سے ان کا سارا سامان تباہ ہو گیا ہے اس کا ہرجانہ دیا جائے۔

معاملہ اتنا بڑھا کہ پولیس بھی آ گئی۔ پولیس کے چیف بول پرٹ نے معائنہ کرنے کے بعد کہا کہ اس میں کسی کا قصور نہیں ہے بلکہ یہ معاملہ کچھ اور ہے۔

اور یہ معاملہ کیا تھا۔ اس کی تشریح وہ خود نہیں کر پا رہا تھا۔

بہرحال ان تینوں دوستوں کی وہ رات برباد ہو گئی۔ ساری رات وہ صفائی میں لگے رہے تھے۔ دوسری صبح ڈونی ڈیکرا اپنے گھر واپس چلا گیا تھا۔

دوسرے دن جب وہ اپنے ایک انکل سے ملنے ان کے گھر گیا تو وہاں بھی یہی سلسلہ شروع ہو گیا۔

حیرت انگیز طور پر اس وقت بارش بھی نہیں ہو رہی تھی لیکن چھت بری طرح ٹپک رہی تھی، پانی مسلسل گر رہا تھا۔ ڈونی ڈیکر سوچ میں پڑ گیا تھا آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟

اس کے انکل نے بھی اسی وقت پلمبر اور دوسرے لوگوں کو بلا لیا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا، کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یہ پانی کہاں سے گر رہا ہے۔

ڈونی کے اس گھر سے باہر جاتے ہی پانی گرنے کا یہ سلسلہ اچانک ختم ہو گیا۔ اس وقت بھی کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسا کیوں ہے اور کسی کا دھیان بھی ڈونی کی طرف نہیں گیا تھا۔

ڈونی اپنے اپارٹمنٹ واپس آ گیا۔ ساری رات اسے اندیشہ لاحق رہا تھا کہ شاید پانی گرنا شروع ہو لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔

ایک دن وہ ایک اسٹور میں کچھ خریدنے کے لیے گیا۔ ابھی وہ قیمت ادا ہی کر رہا تھا کہ اسٹور کی چھت سے پانی بہنا شروع ہو گیا جیسے اچانک بارش شروع ہو گئی ہو اور اسٹور کی چھت پھٹ گئی ہو، جبکہ اسٹور کے باہر بارش کا نام و نشان بھی نہیں تھا، صرف اسٹور ہی کی چھت پر نالا بنی ہوئی تھی۔

یہ اتفاق تھا کہ اس وقت اس طرف سے وہی پولیس آفیسر بول پرٹ گزر رہا تھا جو جینی اور باب کے اپارٹمنٹ میں آیا تھا۔

اس نے جب ڈونی کو وہاں دیکھا تو سوچ میں پڑ گیا لیکن اس کے پاس ڈونی کو الزام دینے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

آخر وہ کہتا تو کیا کہتا کہ تمہاری وجہ سے چھتیں ٹپکنے لگتی ہیں۔ یہ ایک احمقانہ سی بات ہوتی اسی لیے اس نے کہا تو کچھ نہیں لیکن ڈونی کو اپنی نگاہوں میں رکھ لیا۔

ایک اور واقعہ اس وقت ہوا جب ڈونی ڈیکرا اپنے دونوں پرانے دوستوں باب اور جینی کے ساتھ ایک ہوٹل میں گیا تھا۔ ابھی انہیں بیٹھے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ چھت سے پانی بہنے لگا۔

اسی زور و شور کے ساتھ جس طرح پہلے بہا کرتا تھا۔ ہوٹل میں بھگدڑ سی مچ گئی۔ اس وقت باب نے پہلی بار ڈونی سے کہا۔

''یار یہ کیا چکر ہے، جہاں تم بیٹھتے ہو وہاں چھت سے پانی گرنے لگتا ہے۔''

''ہاں بھئی میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کیونکہ تمہارے یہاں سے آنے کے بعد ایسا ہی واقعہ دو بار اور بھی ہو چکا ہے۔''

''اوہ گاڈ! کیسا واقعہ؟'' جینی نے پوچھا۔

ڈونی نے اپنے انکل کے گھر اور اسٹور کی کہانی سنا دی، اس دوران وہ ہوٹل ہی میں تھے اور چھت سے پانی گرنے کا سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا۔

''پھر تو بارش کا بھوت تمہارے پیچھے پڑ گیا ہے۔''

پولیس آفیسر بول پرٹ کو آتے ہوئے دیر نہیں لگی۔ اس نے ہوٹل کی تباہی اپنی آنکھوں سے دیکھ لی تھی اور ڈونی کو دیکھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرکھنک گیا تھا۔ ''لڑکے کیا بات ہے تمہارے ساتھ۔ تم جہاں جاتے ہو یہ سلسلہ کیوں شروع ہو جاتا ہے؟''

''اب آپ ہی بتائیں میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔''

''تمہاری وجہ سے ہوٹل کا اچھا خاصا نقصان ہو گیا ہے۔''

''وہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ اس میں میرا کیا قصور ہے۔''

ظاہر ہے ڈونی کا کوئی قصور نہیں تھا، جو کچھ بھی ہو رہا تھا وہ کوئی اور ہی سلسلہ تھا اسی لیے ڈونی کو جانے کی اجازت دے دی گئی۔

اس واقعے کے بعد ڈونی کو ہر جگہ عجیب نگاہوں سے دیکھا جانے لگا تھا کیونکہ پورے علاقے میں یہ بات پھیل گئی تھی کہ یہ نوجوان جہاں بھی جاتا ہے بارش ہو یا نہ ہو چھت سے پانی گرنے لگتا ہے۔''

اس کے بعد اور بھی کئی ایسے واقعات ہوئے۔

ڈونی اب سمجھ چکا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی غیبی قوت ہے جس کا کوئی جواز سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ اس نے یہ بھی جان لیا تھا کہ جب وہ خود اپنے فلیٹ میں ہوتا ہے اس وقت کچھ بھی نہیں ہوتا لیکن جہاں وہ کسی اور کی چھت کے نیچے گیا وہاں تباہی پھیل جاتی ہے۔

اب کوئی بھی شخص اسے اپنے گھر بلانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ جس ہوٹل میں بھی جاتا ہوٹل والے اسے دیکھ کر ہاتھ جوڑ لیتے۔ ''خدا کے لیے بھائی تم ہمارے ہوٹل سے چلے جاؤ۔''

وہ تنہا ہوتا جا رہا تھا۔ دوستوں نے خوفزدہ ہو کر اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ ایک بار اس کے لیے ایک عامل کو بلایا گیا جو اپنے ساتھ ایک چھوٹی سی صلیب لے کر آیا تھا۔

اس نے وہ صلیب ڈونی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تم صلیب اپنے ہاتھ میں رکھو اور میرے ساتھ ساتھ دعائیں مانگو۔''

ڈونی نے وہ صلیب اپنے ہاتھ میں پکڑی ہی تھی کہ اس کے پورے جسم کو جھٹکے لگنے لگے، اتنا ہی نہیں بلکہ اس کے پورے جسم پر اس طرح چھالے نمودار ہونے لگے جیسے اسے جلا دیا گیا ہو۔

اس نے بوکھلا کر صلیب ہاتھ سے چھوڑ دی اور عامل کے ہاتھ کو پکڑ لیا۔ عامل کے ہاتھ کو پکڑنا تھا کہ خود بے چارے عامل کی بھی یہی حالت ہو گئی۔

اس کے بدن پر بھی چھالے نمودار ہونے لگے تھے۔

اس کے بعد ڈونی ڈیکر کو اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا تھا۔

قصبے والوں نے یہ جان لیا تھا کہ اس کے ساتھ جو بھی قوت ہے وہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔

ڈونی چھالوں سے تو نجات پا گیا لیکن پانی کا گرنا اس کے ساتھ لگا رہا تھا۔

وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کی بھی کیا زندگی ہو کر رہ گئی تھی۔ لڑکیاں اس سے دور بھاگا کرتیں کیونکہ وہ قصبے میں خوف کی علامت بن کر رہ گیا تھا۔

ایک بار جب وہ ایک اسٹور میں خریداری کرنے گیا تو اسٹور والے نے اسے اندر نہیں آنے دیا۔ اس نے بڑی رکھائی کے ساتھ ڈونی کو اسٹور سے باہر ہی روک لیا تھا۔

ڈونی کو اس کا یہ عمل بہت ہی برا لگا تھا۔ اس نے سوچا کاش اس کے اسٹور کی چھت سے پانی گرنے لگے۔ ابھی اس نے سوچا ہی تھا کہ اسٹور کی چھت سے پانی کی بوچھاڑ شروع ہو گئی اور پورا اسٹور تباہ ہو کر رہ گیا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ ڈونی کی خود اپنی خواہش پر ایسا ہوا تھا۔

اس کے ہاتھ ایک نئی طاقت آ گئی تھی۔ وہ جس پر چاہتا پانی برسا دیا کرتا۔ لوگ اب اس کے سائے سے بھی کترانے لگے تھے۔ اس نے اپنے بہت سے مخالفین کو اسی طرح خوفزدہ کر کے قصبے سے بھگا دیا تھا۔

جب اس کی حرکتیں بہت بڑھ گئیں تو امنِ عامہ کے تحت اسے جیل بھیج دیا گیا۔ جیل میں بھی اس کا یہی حال رہا تھا۔ جیل کے ہر کمرے کی چھت سے پانی گرنا شروع ہو گیا تھا۔ وارڈن کا کمرا بھی ایسا ہی ہو گیا۔

بالآخر اسے جیل سے رہا کر دیا گیا کیونکہ اس نے بظاہر تو کوئی جرم نہیں کیا تھا۔

ڈونی ڈیکر کے ساتھ اب یہ معاملہ نہیں ہوتا یا شاید ہوتا ہو لیکن اب اس کا کوئی پتا نہیں ہے کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔

بارشوں یا پانی کے ساتھ ایسا رابطہ شاید ہی کسی اور کے سامنے آیا ہو اور یہ راز ہی ہے کہ ڈونی کے ساتھ ایسا کیوں ہوتا تھا۔

مرسلہ: انوار الحق، نوشہرہ

دنیا کے پُراسرار ترین حصے کا تذکرہ

دنیا کا سب سے پُراسرار خطہ جس کے اسرار سے پردہ ہٹانے کی کوشش ہنوز جاری ہے لیکن آج تک اس راز سے پردہ ہٹ نہ سکا کہ اس علاقے میں پہنچنے والے لوگ، بڑے بڑے بحری جہاز، فضا میں اڑتے دیوہیکل طیارے اور سمندر کے نیچے تیرتی آب دوزیں کہاں غائب ہو جاتی ہیں؟ کیا واقعی اس علاقے میں ان دیکھی ہستیاں رہتی ہیں؟

برمودا تکون

منظر امام

www.clipe

نہ جانے اس کائنات میں کیسے کیسے بھید پوشیدہ ہیں۔ قدرت کے بھی ایسے ایسے عجائبات ہیں کہ عقل دنگ ہو کر رہ جاتی ہے کہ آخر یہ سب کیسے ممکن ہے! ان بے شمار عجائبات میں ایک برمودا تکون یا ٹرائی اینگل بھی ہے۔

بلاشبہ یہ اس زمین کا سب سے بڑا بھید ہے کہ نہ جانے کتنے سائنس داں، محقق اور مہم جو اس کا راز معلوم کرنے کی کوشش میں اپنی جانیں گنوا بیٹھے ہیں لیکن راز، راز ہی رہا ہے۔

اس مضمون میں برمودا ٹرائی اینگل کے بارے میں مختلف انداز سے جاننے کی کوشش کی گئی ہے۔ آئیں، پہلے یہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیکھتے ہیں کہ یہ مثلث آخر ہے کہاں؟ اس کا محلِ وقوع کیا ہے؟

مثلث برمودا بحراوقیانوس کے مغرب، فلوریڈا کے مشرق، جزائر آنسیں کے شمال اور جزائر برمودا کے جنوب میں واقع ہے۔ اس مثلث کے ایک طرف جزائر برمودا، دوسری طرف میامی اور تیسری طرف سن شائن ہے۔

یہ نام اس سلسلے کے محققین میں سب سے پہلے مصنف وینسینٹ گاڈیس نے تجویز کیا ہے۔ اس نے نادیدہ افق نامی ایک کتاب لکھی تھی۔ آج تک یہ خطۂ اراضی اسی نام سے معروف ہے۔

بحرِاوقیانوس کے مغربی سرے پر کم وبیش تین سو ساٹھ چھوٹے بڑے جزیرے ہیں اور انہی کو جزائر برمودا کہا جاتا ہے۔

ان تمام جزائر میں سے پانچ جزیرے خاصے بڑے ہیں جن کے نام ہیں۔ سینٹ جارج، سینٹ ڈیوڈ، گافر، سومرسٹ اور لانگ آئی لینڈ۔

اگر انتظامی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ جزائر برمودا کا ایک ضلع ہوں گے جبکہ دوسرے دو اضلاع میامی اور سن شائن ہیں۔

میامی کا مرکزی شہر فلوریڈا ہے اور ایک حیرت انگیز بات اس سلسلے میں یہ بتاتے چلیں کہ فلوریڈا کا مطلب ہے ''اس خدا کا شہر جس کا انتظار کیا جارہا ہے۔''

یہ برمودا مثلث کے بھید کا ایک دوسرا پہلو ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ ٹرائی اینگل تو ہمیشہ سے موجود رہا ہے پھر اسے ایسی شہرت کب ملی؟

ظاہر ہے کہ جب اس مثلث میں گھرے ہوئے جہازوں کو اس دور میں حادثات پیش آرہے ہیں تو پہلے بھی حادثات ہوتے ہوں گے لیکن دنیا ان کے بارے میں اس لیے نہیں جانتی کہ اس زمانے میں ذرائع ابلاغ اتنے وسیع نہیں تھے۔ نہ ہی اس موضوع پر کتابیں تھیں، نہ مضامین لکھے جاتے تھے۔ نہ کسی قسم کی ڈاکومینٹری بنتی تھی اسی لیے موجودہ دنیا کو اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔

برمودا جزائر کو سب سے پہلے ایک ہسپانوی سیاح شان ڈوبرمونے 1519ء میں دریافت کیا مگر اسے عالمی پیمانے پر شہرت 1609ء میں ملی۔ جارج سومرس کی کشتی غرقاب ہوئی اور یہ حادثہ دنیا کے سامنے آ گیا۔

برمودا مثلث سمندر میں نہیں ہے بلکہ اس کا ایک بڑا حصہ دریائے سارگاسو پر محیط ہے۔ یہ ایک عظیم دریا ہے اور مثلث میں پیش آنے والے پُراسرار واقعات اسی دریا میں پیش آتے ہیں۔

برمودا تکون کو برمودا تکون کا نام 1945ء کی ایک پریس کانفرنس میں دیا گیا۔

کرسٹوفر کولمبس (1506-1451ء) جب اس علاقے سے گزرا تو اس نے بھی یہاں کچھ عجیب وغریب مشاہدات کیے۔ جیسے آگ کے گولوں کا سمندر میں داخل ہونا۔ اس علاقے میں پہنچ کر کمپاس میں بغیر کسی ظاہری سبب کے خرابی پیدا ہونا وغیرہ۔

لیکن اس سے پہلے کہ ہم برمودا ٹرائی اینگل میں پیش آنے والے واقعات بیان کریں۔ اسی طرح کے ایک اور علاقے کا ذکر بھی کریں گے جس کی طرف بہت کم دھیان دیا گیا ہے لیکن اس میں پیش آنے والے واقعات بھی برمودا مثلث ہی جیسے ہیں۔

اب یہ محققین کا کام ہے کہ وہ یہ دیکھیں کہ ان دونوں میں اتنی مماثلت کیوں ہے۔

ڈریگن تکون یا Devil Dragon`s Triangle Sea۔

محلِ وقوع:

یہ علاقہ بحرالکاہل (Pacific Ocean) میں جاپان اور فلپائن کے علاقے میں ہے۔ یہ تکون جاپان کے ساحلی شہر یوکوہاما سے فلپائن کے جزیرے گوام تک اور گوام سے پھر جاپان کے ماریانا تک پھر ماریانا سے یوکوہاما تک بنتی ہے۔

اس سمندر کو جاپانی لوگ مانواوسی کہتے ہیں یعنی شیطان کا سمندر۔

برمودا تکون اور شیطانی سمندر پر ریسرچ کرنے والوں میں ایک مشہور نام چارلس برلٹز کا ہے۔ وہ اپنی کتاب ''دی ڈریگن ٹرائی اینگل'' میں لکھتے ہیں۔

''1952ء تا 1954ء جاپان نے اپنے پانچ بڑے فوجی جہاز اس علاقے میں کھوئے ہیں۔ افراد کی تعداد 700 سے زیادہ ہے۔ اس معمے کا راز جاننے کے لیے جاپانی حکومت نے ایک جہاز پر سو سے زائد سائنس دانوں کو سوار کیا لیکن شیطانی سمندر کا معما حل کرنے والے خود معما بن گئے۔ اس کے بعد جاپان نے اس علاقے کو خطرناک قرار دے دیا۔''

اب اس شیطانی تکون کی تباہ کاریوں پر ایک نظر ڈال لیں۔

1۔ جاپانی پیٹرول بردار جہاز کا یومارو 5۔ اس پر پانچ سو ٹن پیٹرول تھا۔ عملہ 31 افراد کا تھا جبکہ 9 سائنس دان بھی تھے۔ آخری رابطہ 24 دسمبر 1952ء کو ہوا تھا، اس کے بعد پتا نہیں چل سکا۔

2۔ جاپانی جہاز (مال بردار) کوروشیو مارو 2۔ اس پر 525 ٹن مال لدا ہوا تھا۔ اس کا آخری رابطہ 22 اپریل 1949ء کو ہوا تھا۔

3۔ فرانسیسی جہاز جیرانیو، 24 نومبر 1974ء کو اسی علاقے میں غائب ہوا اور آج تک اس کا پتا نہیں چل سکا۔ اس پر 29 افراد پر مشتمل عملہ تھا۔

4۔ لائبیریا کا مال بردار جہاز ''بانالونا'' پر 13616 ٹن وزنی اسباب تھے اور عملے کی تعداد 35 تھی۔ نومبر 1971ء میں غائب ہوا۔

5۔ لائبیریا ہی کا ایک دوسرا جہاز ماجوسار۔ عینی شاہدین کے مطابق یہ جہاز سمندر میں تھا کہ اچانک آگ بھڑک اٹھی لیکن یہ آگ جہاز کے اندر سے نہیں بلکہ پانی سے جہاز کی طرف بڑھی تھی۔ اس کی تصویریں بھی اتاری گئی تھیں۔ یہ واقعہ مارچ 1978ء کا ہے۔

6۔ مال بردار جہاز صوفیا باباس، اس سمندر میں پہنچتے ہی دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔

7۔ یونانی جہاز ''اجیوس جیورجیس'' اس پر 16565 ٹن وزن لدا ہوا تھا۔ 29 افراد کے عملے کے ساتھ یکا یک غائب ہو گیا تھا۔

چلیں جہازوں کے بارے میں تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ جہاز ڈوب گئے تھے لیکن جدید آب دوزیں جن میں جدید وائرلیس نظام موجود ہو، وہ اگر اس علاقے سے غائب ہو جائیں تو آپ کیا کہیں گے؟ پھر آب دوزیں بھی کوئی عام نہیں بلکہ ایٹمی۔

ہے نا حیرت کی بات۔ اور اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان آب دوزوں کے غائب ہونے پر ان ممالک کی طرف سے کوئی خاص ردِعمل ظاہر نہیں کیا گیا، آخر کیوں؟

ذرا ان ایٹمی آب دوزوں پر ایک نظر ڈال لیں۔

1۔ روسی آب دوز وکٹر 1۔ جدید ایٹمی آب دوز، مارچ 1984ء میں شیطانی سمندر کی خفیہ قوت کے پاس مع عملے کے چلی گئی۔

2۔ روسی آب دوز ایکو 1۔ پہلی آب دوز کے غائب ہونے کے صرف پانچ مہینے بعد اسی علاقے میں غائب ہوئی۔

3۔ روسی آب دوز ایکو 2۔ جنوری 1986ء کو یہ بھی اسی علاقے کی نذر ہو گئی۔

4۔ روسی آب دوز جولف 1۔ اس پر 800 کلوگرام ایٹمی وار ہیڈز لدے ہوئے تھے۔ عملے کی تعداد 86 تھی۔

5۔ فرانسیسی آب دوز چارلی، ایٹمی آب دوز ستمبر 1984ء میں 90 سواروں کے ساتھ غائب ہو گئی۔

6۔ برطانوی آب دوز ''فوکسٹرول'' نومبر 1986ء میں عملے سمیت غائب ہوئی۔

اتنا ہی نہیں بلکہ برمودا ٹرائی اینگل کی طرح اس شیطانی تکون میں طیارے بھی غائب ہو چکے ہیں جن کی کچھ تفصیل یہ ہے۔

1957ء میں دس دنوں کے اندر امریکا کے تین جنگی طیارے اسی علاقے میں اپنے تمام عملے سمیت اس طرح غائب ہوئے کہ کوئی نام ونشان نہیں مل سکا۔ ان کے علاوہ جاپان کا جنگی طیارہ P-2J بھی اسی طرح غائب ہوا۔

پھر 27 اپریل 1971ء کو جاپان ہی کا ایک اور جنگی طیارہ P2v-7 غائب ہوا۔ اس کے دو مہینے بعد جاپان ہی کے ایک اور طیارے IM-1 کا بھی یہی حشر ہوا۔

ایک امریکی مال بردار جہاز کیلی فورنیا مارو اسی علاقے میں غائب ہوا۔ اس کی چھان بین کے لیے JA-341 مسافر بردار طیارے سے صحافیوں کو بھیجا گیا اور یہ طیارہ بھی ایسا غائب ہوا کہ نہ طیارے کا پتا چل سکا نہ صحافیوں کا۔

یہ سب کیا ہے؟

برمودا تکون اور شیطانی تکون کے درمیان ایسی مماثلت کس طرف اشارہ کررہی ہے؟

کیا یہ محض اتفاق ہے؟ ہرگز نہیں۔ اس سلسلے میں مشہور محقق چارلس برلٹز کہتے ہیں۔ ''برمودا اور شیطانی سمندر میں پراسرار طور پر غائب ہو جانا اتفاقی نہیں ہو سکتا جبکہ دونوں علاقوں میں مماثلت پائی جارہی ہے۔ جہازوں اور طیاروں کے غائب ہونے میں دونوں جگہ ایک ہی نظریہ کارفرما ہے۔''

اب آجائیں برمودا ٹرائی اینگل کی طرف جو ہمارا اصل موضوع ہے۔

اس علاقے میں پیش آنے والے واقعات کی تاریخ

www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بہت قدیم ہے۔

پہلا حادثہ کریسٹف کی کشتی کو پیش آیا۔ اس کا قطب نما ناکارہ ہوگیا تھا اور یہ کشتی بھٹک کر دریائے گارسو پہنچ گئی۔ ہم اصطلاحاً اسے آبِ سفید کے نام سے لکھ رہے ہیں۔

اس آبِ سفید میں آنے کے بعد سارے آلات بے کار ہوکر رہ جاتے ہیں۔ مثلث برمودا آج تک بیسیوں جدید کوہ پیکر جہازوں کو نگل چکی ہے اور ان کا سراغ تک نہیں مل سکا ہے۔

اس علاقے سے گزرنے والے جہاز رانوں میں ایک جملہ بہت عام ہے۔ وہ ایک دوسرے کو بتاتے ہیں کہ وہاں پانی کی گہرائیوں میں خوف اور شیطانی راز پوشیدہ ہیں۔

کولمبس کا ذکر آچکا ہے کہ جب وہ ادھر سے گزرا تو اس نے بھی یہاں کچھ عجیب وغریب مشاہدات کیے۔

کولمبس کے امریکی سفر کو اب پانچ صدیاں گزر چکی ہیں لیکن یہ سوال آج بھی برقرار ہے کہ اس علاقے میں پانی کی گہرائیوں میں، پانی کے اوپر اور اس کی فضاؤں میں ایسی کیا چیز ہے کہ آج کے جدید دور کی ٹیکنالوجی بھی اس کا سراغ نہیں لگا سکی ہے۔

برمودا مثلث کے حوالے سے نہ جانے کتنی کتابیں اور کتنے مقالات سامنے آچکے ہیں۔ نہ جانے ایسے کتنے لوگ ہیں جنہوں نے وہاں کا سفر کیا، تحقیقات کیں اور اپنے مشاہدات اور مطالعے کو ضبطِ تحریر میں لے آئے۔

ان میں سے چند نام حسب ذیل ہیں۔

1۔ وینسینٹ گاڈیس۔ کتاب کا نام ''نادیدہ افق''

2۔ جان گاڈین۔ کتاب کا نام ''دنیائے پُرپیچ''

3۔ جان ولاس۔ کتاب کا نام ''گم شدہ برزخ''

اسی طرح کے اور درجنوں نام ہیں لیکن ان سب میں سب سے اہم ترین، مفصل ترین اور دلچسپ ترین کتاب امریکی محقق چارلس برلٹز کی برمودا ٹرائی اینگل ہی ہے۔

اسلامی اسکالرز نے بھی اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے۔ جیسے محمد عیسیٰ داؤد کی کتاب ''المسیح الدجال یعز والعالم من مثلث برمودا'' اور اردو کی ایک کتاب برمودا ٹرائی اینگل، حقیقتیں اور افسانے جس کے مولف راجپوت اقبال احمد ہیں۔

اب یہ دیکھیں کہ برمودا ٹرائی اینگل میں ہوتا کیا ہے لیکن اس سے پہلے اس علاقے میں رونما ہونے والے حادثات کا جائزہ لے لیں۔

برمودا تکون میں غائب ہونے والے مشہور جہاز۔

1۔ اگست 1800ء میں امریکی کشتی انسرجنٹ بغیر کسی حادثے کے غائب ہوگئی۔ اس پر 340 مسافر سوار تھے۔

2۔ جنوری 1880ء میں اٹلانٹا نامی برٹش جہاز غائب ہوا۔ اس پر 290 افراد تھے۔

3۔ اکتوبر 1902ء میں فیریا نامی جرمن جہاز غائب ہوا۔ اس کا عملہ اغوا کرلیا گیا جبکہ جہاز مل گیا۔

4۔ مارچ 1918ء امریکی مال بردار جہاز سائیکلوپ اپنے تمام عملے سمیت غائب ہوگیا۔ عملے کی تعداد 309 تھی۔

5۔ مال بردار جاپانی کشتی رائی نو کو غائب ہوئی۔

6۔ 1931ء میں مال بردار جہاز اسٹائفجر غائب ہوا۔ اپریل 1931ء ہی میں جون اینڈ میری نامی امریکی جہاز غائب ہوا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد جنوبی برمودا سے پچاس میل دور پانی میں تیرتا ہوا ملا۔

7۔ مارچ 1938ء میں برطانوی آسٹریلوی جہاز اینگلو آسٹریلینز غائب ہوا۔

8۔ فروری 1940ء میں گلوریا کولڈ نامی تفریحی کشتی غائب ہوئی پھر کچھ عرصے کے بعد غائب ہونے کی جگہ سے دوسو میل دور پائی گئی لیکن سواروں سے خالی۔

9۔ 22 اکتوبر 1944ء کو کیوبا کا ریڈ پیکون نامی جہاز غائب ہوا۔ پھر کچھ عرصے کے بعد فلوریڈا کے ساحل کے قریب سواروں سے خالی پانی پر تیرتا ہوا پایا گیا۔

10۔ 1948ء میں فرانسیسی روزالی نامی جہاز کا عملہ اس پر سے اغوا کرلیا گیا اور جہاز بعد میں اسی علاقے سے مل گیا۔

11۔ جون 1950ء میں Sandra نامی جہاز غائب ہوا۔

12۔ 1955ء میں کوئن میریو نامی تفریحی کشتی غائب ہوئی۔

13۔ 2 فروری 1963ء کو میرین سلفر کوئن نامی امریکی جہاز اسی علاقے سے غائب ہوا۔ اس پر 38 جہاز راں سوار تھے۔

14۔ یکم جولائی 1963ء کو اسنوبوائے نامی کشتی غائب ہوئی۔

15۔ دسمبر 1967ء میں وچ کرافٹ نامی جہاز غائب ہوا۔ اس کا وزن بیس ہزار ٹن تھا اور عملے کی تعداد 32 تھی۔

16۔ مئی 1968ء مشہور امریکی آب دوز اسکورپین 99 فوجیوں سمیت غائب ہوگئی۔

17۔ اپریل 1970ء امریکی مال بردار جہاز ملٹن ٹریڈ غائب ہوا۔

18۔ مارچ 1973ء میں جرمنی کا مال بردار جہاز Aneta غائب ہوا۔

یہ تو وہ واقعات اور حادثات ہیں جن کے بارے میں معلوم ہو چکا ہے جبکہ غائب ہونے والے جہازوں کی فہرست انتہائی طویل ہے۔

اب یہاں کئی جواز دیے جاسکتے ہیں کہ سمندر میں جہازوں کا غرق ہونا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ جہاز تو ڈوبتے ہی رہتے ہیں چاہے اس کا سبب کچھ بھی ہو۔

لیکن اس کو کیا کہا جائے گا کہ برمودا کی انہی فضاؤں میں اڑتے ہوئے ہوائی جہاز بھی غائب ہوجاتے ہیں۔

برمودا تکون میں بڑے بڑے جہازوں کا غائب ہوجانا ہی کیا کم اسرار تھا کہ فضا میں اڑتے ہوئے طیارے بھی نامعلوم منزلوں کی طرف روانہ ہونے لگے اور کبھی واپس نہ آسکے۔

جنگی اور مسافر بردار طیارے اڑتے اڑتے اچانک غائب ہوجائیں جبکہ موسم بھی بالکل صاف ہو تو آپ کیا کہیں گے، کیا آسمان ان کو نگل گیا یا برمودا کے پانی میں موجود کسی پُراسرار طاقت نے انہیں اپنی طرف کھینچ لیا۔

اس سے پہلے کہ ہم آپ کو ان غائب ہونے والے طیاروں کے اور ان کے ساتھ پیش آنے والے حیرت انگیز واقعات کے بارے میں کچھ بتائیں، اس تکون کے کچھ نام سن لیں جو جہاز رانوں نے اس علاقے کی کیفیت اور پُراسراریت کے حوالے سے رکھے ہیں۔

• مثلث موت • ہولناک علاقہ • بحرِ اوقیانوس کا قبرستان • گم شدہ جہازوں کا سمندر • دریائے وحشت • کشتیوں کی آرام گاہ۔

ان ناموں سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جہاز راں اس خطے کے بارے میں کیا سوچتے ہیں اور ان پر کتنا خوف طاری ہے۔

برمودا تکون میں غائب ہونے والے مشہور طیارے۔

1۔ 5 دسمبر 1945ء کو پانچ امریکی بمبار طیارے ایک ساتھ برمودا کی فضاؤں میں غائب ہوگئے۔ پھر ان کی تلاش میں ایک اور طیارہ بھیجا گیا اور وہ بھی کبھی نہ مل سکا۔

2۔ 3 جولائی 1947ء کو امریکی فضائیہ کا C54 برمودا کی فضاؤں میں ہمیشہ کے لیے لاپتا ہوگیا۔

3۔ 29 جنوری 1948ء چار انجنوں والا اسٹار ٹائیگر نامی طیارہ اپنے 31 سواروں کو لے کر غائب ہوگیا۔

4۔ 28 دسمبر 1948ء کو DC3 نامی طیارہ 27 مسافروں کو لے کر برمودا کے آسمان میں غائب ہوگیا یا پانی میں چلا گیا، کچھ نہیں معلوم۔

5۔ 17 جنوری 1949ء اسٹار ایریل نامی طیارہ برمودا تکون کا شکار ہوا۔

6۔ مارچ 1950ء گلوب ماسٹر نامی امریکی طیارہ مسافروں کو لے کر یہاں سے گزرا اور غائب ہوگیا۔

7۔ 2 فروری 1952ء یورک ٹرانسپورٹ نامی برطانوی طیارہ غائب ہوا۔

8۔ 30 اکتوبر 1954ء امریکی بحریہ کا ایک طیارہ ہمیشہ کے لیے اوجھل ہوگیا۔

9۔ 5 اپریل 1956ء امریکی مال بردار طیارہ غائب ہوگیا۔

10۔ 8 اگست 1962ء امریکی فضائیہ کا K.B نامی طیارہ لاپتا ہوا۔

11۔ 28 اگست 1963ء امریکی فضائیہ کے KCB.5 ٹائپ دو طیارے غائب ہوئے۔

12۔ 22 ستمبر 1963ء C132 طیارہ لاپتا ہوا۔

13۔ 5 جون 1965ء C119 غائب ہوا مع دس سوار کے۔

14۔ گیارہ جنوری 1967ء کو YC122 طرز کا طیارہ 14 افراد سمیت لاپتا ہوا۔

15۔ 17 جنوری 1947ء امریکی جنگی طیارہ غائب ہوا۔

تو یہ چند مشہور حادثات ہیں جو برمودا کے سمندر اور فضائی حدود میں پیش آئے۔ ورنہ ان کے علاوہ اور بہت سے حادثات رونما ہو چکے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ان غائب ہونے والے بحری جہازوں اور پرواز کرتے ہوئے طیاروں کے ساتھ کیا ہوا؟ وہ کہاں چلے گئے، کس قوت نے انہیں اپنی طرف بلا لیا؟

کیا جو کچھ ہوا، انہیں عام حادثات سمجھا جاسکتا ہے؟

ہرگز نہیں، یہ عام حادثات نہیں ہیں بلکہ بہت پُراسرار حادثات ہیں۔ آیئے اب ذرا دیکھتے ہیں کہ ان جہازوں اور طیاروں کے ساتھ کیا ہوا ہے؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

• وقت کی رفتار رک جاتی ہے۔
• مسافروں کی گھڑیاں ساکت ہوجاتی ہیں۔
• قطب نما اور تمام لاسلکی نظام بے کار ہوکر رہ جاتا ہے۔
• جہازوں کے تمام اطلاعاتی آلات و وسائل درہم برہم ہوجاتے ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ دنیا میں دو جگہیں ایسی ہیں جہاں کمپاس کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ ایک برمودا تکون اور دوسرا جاپان کا شیطانی سمندر۔

کمپاس کے ناکارہ ہوجانے کا مطلب یہ ہے کہ سمت کا تعین نہیں ہوسکتا اور جہاز یا طیارے فضا میں یا سمندر میں بھٹکتے رہتے ہیں۔

اس سلسلے میں چند متاثرین کے تاثرات کچھ یوں تھے۔

روزنامہ جمہوریت بغداد 15 دسمبر 1976ء میں معروف زمانہ امریکی سائنس داں سینڈرسن کا ایک واقعہ نقل کرتا ہے۔

''چند سال پہلے نیشنل ائرلائنز کا ایک ہوائی جہاز 127 مسافروں کو لے کر میامی یعنی فلوریڈا کے ہوائی اڈے کے ریڈار پر شمال مشرقی سمت سے ظاہر ہوا اور ریڈیو کے ذریعے پیغام دیا کہ میں فلاں وقت پر اتر رہا ہوں لیکن اچانک ہوائی جہاز ریڈار سے گم ہوگیا۔

دس منٹ کے بعد پھر ہوائی جہاز ہوائی اڈے کے آسمان پر نظر آیا اور معمول کے مطابق اتر گیا لیکن تمام مسافر اور عملے کے افراد نامعلوم وحشت کا شکار تھے۔

خصوصاً یہ وحشت اس وقت اور بڑھ گئی جب انہوں نے اپنی اپنی گھڑیوں پر وقت دیکھا تو انہیں معلوم ہوا کہ ان کی گھڑیاں ہوائی اڈے کی گھڑیوں سے دس منٹ پیچھے ہیں۔

تمام مسافر حیرت سے ایک دوسرے سے پوچھتے پھرتے تھے کہ یہ دس منٹ ہم کہاں تھے۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ دس منٹ کے لیے رفتارِ زمانہ ہی تھم گئی ہو۔

آخر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تیز رفتار ہوائی جہاز اور کوہ پیکر بحری جہاز جب اس علاقے میں پہنچتے ہیں تو ہمیشہ کے لیے ان کا رابطہ پوری دنیا سے ایک آن میں کٹ جاتا ہے اور ان کی کوئی اطلاع کوئی علامت تک ہاتھ نہیں آتی۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ بعض ملاح غائب ہوجاتے ہیں اور کشتی خالی واپس آجاتی ہے اور اس پر کسی قسم کے بیرونی یا اندرونی حادثے کی کوئی علامت تک نہیں ہوتی۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ کبھی کبھی ملاحوں کو مُردہ حالت میں واپس کردیا جاتا ہے اور ان کے مُردہ چہروں پر انتہائی خوف و حیرت کے اثرات منجمد ہوجاتے ہیں۔

اور یہ بھی ہوا ہے کہ کچھ طیارے اور جہاز اس علاقے سے گزرنے کے باوجود حادثات سے محفوظ رہ گئے۔ کیوں، کیا کوئی جواب ہے؟

میری سلیٹ نامی کشتی کی داستان مزید حیرت انگیز ہے۔

مثلث برمودا کو عبور کرنے والی یہ کشتی کئی ماہ پہلے گم ہوگئی تھی (یہ واقعہ 1972ء کا ہے) ہر لحاظ سے کشتی بے نقص اور بے عیب تھی۔ تمام آلات اور انجن ٹھیک کام کررہے تھے۔ ایندھن کا وافر ذخیرہ تھا۔ پانی کی ٹنکی میں اتنا پانی تھا جو چھ ماہ تک چل سکتا تھا۔

سب کچھ موجود تھا لیکن مسافر غائب تھے۔ یہ کشتی کئی مہینے پہلے غائب ہوگئی تھی پھر اچانک بغیر مسافروں کے تیرتے ہوئے مل گئی۔

کپتان کے کیبن میں اندراجات کا رجسٹر کھلا ہوا تھا اور مثلث برمودا کے قریبی جزائر کو عبور کرنے تک کے تمام حالات تفصیل سے درج تھے۔

کشتی کے سیف میں رقم، قیمتی جواہرات اور انتہائی بیش بہا کاغذات جوں کے توں رکھے ہوئے تھے۔ سلائی مشین میں ایک کُرتہ سینے کو لگا یا گیا تھا۔

مسافروں کا کھانا ان کی میزوں پر تھا۔ برتن اور پانی سے بھرے ہوئے جگ میزوں پر سجے تھے۔ سب کچھ اپنی اپنی جگہ بالکل درست تھا سوائے مسافروں کے۔

سوال یہ تھا کہ یہ مسافر کہاں چلے گئے؟ کون سی طاقت انہیں اپنے ساتھ اغوا کرکے لے گئی؟

پرتگال کی سنیٹا میری نامی کشتی کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

یہ کشتی تو غائب ہوجانے کے کئی برسوں کے بعد سمندر میں تیرتی ہوئی ملی۔ سب مسافر اور عملے کے افراد خشک لاشوں کی صورت میں موجود تھے۔ آج تک کچھ پتا نہیں چل سکا کہ اس کشتی کو وہ کون سا حادثہ پیش آیا کہ کشتی صحیح و سالم حالت میں گم ہونے کے برسوں بعد از خود باہر آگئی۔

ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے، یہ کیسے بھید ہیں؟

25 دسمبر 1977ء کو برمودا ٹرائی اینگل کی فضاؤں میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے بے مثال اور انتہائی حیرت انگیز ہے۔

برانیف ائرلائن کے DC-8 ہوائی جہاز نے نیویارک سے پاناما کے لیے پرواز کی۔ پروگرام کے مطابق اسے

نیویارک سے پاناما تک دو گھنٹے میں پہنچنا تھا۔ ہوائی جہاز جزائر پاناما کے قریب سے قریب تر ہوتا جارہا تھا کہ اچانک ہوائی جہاز کو ایک جھٹکا لگا اور ہوائی جہاز ایک جگہ رک کر چکر لگانے لگا۔

ہواباز اور عملے کے دیگر افراد اِدھر اُدھر دوڑنے اور گرنے لگے کہ ہوائی جہاز نے از خود بلند ہونا شروع کردیا اور بلندی کی آخری حد تک پہنچ کر گم گشتہ راہ ہوگیا۔

مسافر اور عملہ دہشت زدہ ہوگئے۔ دنیا ان کی آنکھوں میں تاریک ہوگئی۔ تمام مسافر اپنی اپنی کرسیوں پر بیلٹس کسے ہوئے دونوں ہاتھوں سے کرسیوں کے دستے مضبوطی سے پکڑے ہوئے ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ آخر یہ کیا ہورہا ہے؟

جہاز کو کیا ہوگیا ہے۔ مسافر انتہائی دہشت زدہ بھی تھے اور بوکھلاہٹ کا شکار بھی۔ حالانکہ جہاز اب صاف و شفاف نیلے نیلے آسمان کے نیچے پرواز کررہا تھا۔

ہواباز کے کیبن میں موجود تمام آلات اب ٹھیک کام کررہے تھے۔ خطرے کی سوئی سے کوئی خطرہ ظاہر نہیں ہورہا تھا۔ اس کے باوجود بہت بڑا خطرہ تھا۔

کیونکہ جہاز کے آلات ہواباز کے کنٹرول میں نہیں تھے۔ جہاز اب پستی کی طرف آرہا تھا۔ بہت تیزی کے ساتھ۔ سمندر کی موجیں قریب سے قریب تر ہوتی جارہی تھیں کہ اچانک ایک معجزہ رونما ہوا اور جہاز ہواباز کے قبضے میں آگیا۔

جہاز کو ہنگامی حالت میں میامی میں اتارنا پڑا تھا۔ کسی بھی ماہر کو جہاز میں کوئی فنی خرابی دکھائی نہیں دی۔ تو پھر یہ سب کیا تھا؟

برمودا تکون کی فضاؤں میں غائب ہونے والے مختلف طیاروں کے ہوابازوں نے جو پیغامات کنٹرول ٹاورز کو بھیجے، ان کی نوعیت تقریباً ایک جیسی ہے۔

5 دسمبر 1945ء کو تقریباً دو بج کر دس منٹ پر امریکی ریاست فلوریڈا کے فورٹ لاڈرڈیل ائربیس سے فلائٹ 19 کے پانچ ایونجر طیارے اڑے اور اپنے مقررہ روٹ پر چند چکر لگائے۔ اس کے بعد تقریباً 4 بجے ائربیس کو ان پانچ میں سے ایک طیارے کے پائلٹ کی جانب سے یہ پیغام موصول ہوا۔

پائلٹ: ''ہمیں عجیب و غریب صورتِ حال کا سامنا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہم اپنے روٹ سے بالکل ہٹ چکے ہیں۔ میں زمین نہیں دیکھ پارہا ہوں۔ میں زمین نہیں دیکھ پارہا۔''

ائربیس: ''آپ کس جگہ پر ہیں؟''

پائلٹ: ''میں اپنی جگہ کا تعین نہیں کرپارہا ہوں۔ مجھے بالکل پتا نہیں کہ ہم کہاں ہیں؟ میرا خیال ہے کہ ہم فضا ہی میں کہیں گم ہوگئے ہیں۔''

ائربیس: ''مغرب کی سمت میں اڑان جاری رکھو۔''

پائلٹ: ''مجھے نہیں پتا چل رہا ہے کہ مغربی سمت کس طرف ہے؟ ہر چیز عجیب و غریب نظر آرہی ہے۔ میں کسی سمت کا اندازہ نہیں کرسکتا۔ یہاں تک کہ ہمارے سامنے موجود سمندر بھی عجیب شکل کا نظر آرہا ہے۔''

اس کے بعد پائلٹ اور ائربیس کے درمیان رابطہ ٹوٹ جاتا ہے۔ پھر تھوڑی دیر بعد پائلٹ کی آواز آتی ہے: ''ایسا لگ رہا ہے جیسے ہم سفید پانی میں داخل ہورہے ہیں۔''

اس کے بعد یہ طیارے ہمیشہ کے لیے اس سمندر کے پانیوں میں ہی کھو کر رہ گئے۔

ان پانچ طیاروں کو تلاش کرنے کے لیے مارٹن میرینز نامی طیارہ روانہ کیا گیا لیکن وہ بھی قابلِ تلاش بن گیا۔ آج تک اس کا بھی سراغ نہیں لگ سکا ہے۔

برمودا میں غائب ہونے والے جہازوں اور کشتیوں سے بھی کچھ اسی قسم کے پیغامات سنے گئے ہیں جیسے ایک مسافر کی آواز آتی ہے: ''کشتی کا کپتان اور دوسرے تمام مسافر سو چکے ہیں۔ اس وقت صرف میں ہوں جو زندہ ہوں۔''

پھر کچھ دیر بعد دوبارہ آواز آتی ہے: ''افسوس اب تو میں بھی مر رہا ہوں۔''

آئیں، اب دیکھتے ہیں کہ اس مثلث کے حوالے سے سائنس دانوں اور ریسرچ کرنے والوں نے کیسے نظریات پیش کیے ہیں اور ان کی تھیوریز کیا کہتی ہیں۔

امریکی سائنس داں چارلس اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ برمودا کے زیرِ آب اہرامِ مصر جیسے اہرام پوشیدہ ہیں جو ان حادثات کو جنم دے رہے ہیں۔

اس کے خیال میں زیرِ آب موجود اس ہرم کی بلندی ایک سو پچاس فٹ اور بنیاد کا طول تین سو فٹ ہے۔

کسی نامعلوم مقناطیسی قوت کا نظریہ

بعض سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اس علاقے میں ایک ایسی غیر طبعی مقناطیسی قوت موجود ہے جو ہر ہوائی اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بحری جہاز میں نصب شدہ قطب نما اور بلندی پیما آلات کو بے کار کر کے جہازوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔

اگر اس مفروضے کو مان لیا جائے تو چند سوالات کے جواب بھی درکار ہوں گے۔

اگر ایسا ہے تو یہ مقناطیسی قوت ہر جہاز اور طیارے پر اثر انداز کیوں نہیں ہوتی، صرف بعض ہوائی اور بحری جہازوں کو کیوں اپنی گرفت میں لیتی ہے؟

بعض بحری کشتیاں اس قوت کے قابو میں آنے کے بعد آزاد ہو کر سطح آب پر کیوں آ جاتی ہیں؟

اس قوت نے بعض کشتیوں کے صرف مسافروں ہی کو کیوں غائب کر دیا؟

بعض کشتیوں کے مسافر اپنے کیبنوں مین مُردہ کیوں پائے گئے؟

جب حادثے کا سبب ایک ہی ہے تو پھر نتائج میں تضاد کیوں ہوتا ہے؟

ہوائی گڑھے:

بعض سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اس پوشیدہ مقناطیسی قوت کے نتیجے میں قوتِ جاذب کی بدولت فضا میں گڑھے پڑ گئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ دیگر تمام علاقوں کی نسبت اس علاقے میں مقناطیسی قوت ہزاروں گنا زیادہ ہے جس کی وجہ سے مثلث برمودا کی پوری فضا میں گہرے گڑھے پیدا ہو چکے ہیں۔

جب اس مثلث کی فضا میں اڑنے والا کوئی بدنصیب جہاز کسی فضائی گڑھے میں جا پڑتا ہے تو فضا سے ماورا دھکیل دیا جاتا ہے جس کے بعد اس کے واپس پلٹنے کی کوئی امید نہیں رہتی۔

فضا کی طرح اس مقناطیسی قوت نے سمندر میں بھی گڑھے بنا دیے ہیں اور جو بحری جہاز بدقسمتی سے اس گڑھے میں آتا ہے تو پھر گڑھے کی گہرائی میں نیچے سے نیچے چلا جاتا ہے اور اس کی واپسی کی امید نہیں رہتی۔

اس نظریے نے بھی کئی سوالات کو جنم دیا ہے، جیسے.....

وہ کون سی وجہ ہے کہ بعض کشتیاں ان گڑھوں سے کبھی نکل نہیں پاتیں؟

اس کی کیا وجہ ہے کہ بعض کشتیاں مع اپنے مُردہ مسافروں کے سمندر میں تیرتی ہوئی مل جاتی ہیں اور ان میں کوئی فنی خرابی بھی نہیں ہوتی۔ صرف قطب نما اور کشتی کے کاغذات گم ہوتے ہیں۔

یہ مقناطیسی قوت کشتیوں کو قابو میں کرنے کے بعد کس طرح کشتیوں اور کچھ مسافروں کو واپس بھیج دیتی ہے؟

ان سوالوں کے جواب اس نظریے کے تحت نہیں مل سکتے۔

ہسٹائی شعاعیں:

بعض سائنس دانوں کا خیال ہے کہ مثلث برمودا میں ہسٹائی شعاعوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ یہ شعاعیں بھی اثرات میں لیزر شعاعوں کی طرح ہوتی ہیں۔

جب مطلع صاف اور موسم معتدل ہوتا ہے تو سورج ایسے زاویے پر چمکتا ہے جس سے ہسٹائی شعاعیں پیدا ہوتی ہیں اور جب یہ شعاعیں سمندر پر پڑتی ہیں تو پلٹ کر فضا میں بکھر جاتی ہیں اور گزرنے والے جہاز پر پڑ کر اسے پگھلا دیتی ہیں جس کے نتیجے میں جہاز نابود ہو جاتا ہے اور اس کی کوئی علامت باقی نہیں رہتی۔

لیکن اس تھیوری کو سائنس دانوں نے مذاق قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایسا خیال کرنے والے لیزر شعاعوں ہی کو نہیں جانتے۔

اس نظریے کے حوالے سے بھی کئی سوالات ذہن میں آتے ہیں۔

اگر ہسٹائی شعاعیں حادثات کا سبب ہیں تو پھر تمام کشتیاں کیوں نہیں پگھل جاتیں؟

بعض کشتیاں صحیح وسالم کیوں مل جاتی ہیں؟

بعض کشتیوں کے مسافر صرف مردہ کیوں ہوتے ہیں، وہ کیوں نہیں پگھل جاتے؟

مافوق الفطرت موجوں کا نظریہ:

مثلث برمودا کے سلسلے میں شولمن اکیڈمی کی طرف سے جو نظریہ دیا گیا ہے کہ اس علاقے میں ایسی امواج دریافت ہوئی ہیں جن کی رفتار تین سو تیس میٹر فی سیکنڈ ہوتی ہے۔ اتنی تیز رفتاری کے ساتھ اگر کوئی دوسری وجہ نہ بھی ہو تو بھی یہ تیز رفتاری میں باعثِ موت بن سکتی ہے۔

انسانی زندگی کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ ان لہروں کی کمزور سے کمزور قسم بھی مختلف جان لیوا امراض کا سبب بن جاتی ہے۔ جیسے اچانک نابینا پن، دورۂ دل وغیرہ۔

ان کے خیال میں یہی لہریں مسافروں کے دورۂ دل یا شریانوں کے پھٹ جانے کا سبب بن جاتی ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ان لہروں کے اثرات سے مسافروں پر وحشت طاری ہو جاتی ہو۔

اس نظریے کا بودا پن بھی ظاہر ہے۔

اگر یہی نظریہ درست ہے تو پھر اس کا کیا سبب ہے کہ جب کشتی کا عملہ اور مسافر دل کے دورے اور شریانوں کے پھٹنے سے دوچار ہوتے ہیں تو اپنی اپنی کرسیوں ہی پر جمے رہتے ہیں۔ نہ تڑپتے ہیں، نہ پھڑکتے ہیں، نہ گرتے ہیں۔ نہ سامان درہم برہم ہوتا ہے۔ شریانیں پھٹتی ہیں لیکن ناک یا منہ سے خون کا اخراج بھی نہیں ہوتا، آخر کیوں؟

دریائی آبشاروں کا نظریہ:

بعض روسی سائنس دانوں کا یہ خیال ہے کہ مثلث برمودا میں رونما ہونے والے ان تمام حادثات کا سبب سمندر کی طوفانی موجوں سے پیدا ہونے والی آبشاریں ہیں جن کی بلندی بعض اوقات کئی کلومیٹر تک پہنچ جاتی ہے۔ اور یہی طوفانی موجیں کوہ پیکر جہازوں کو غرقاب کرنے کا سبب بن جاتی ہیں۔

اگر اس نظریے کو قبول کر لیا جائے تب بھی یہ معما حل نہیں ہوتا۔ اس نظریے کے مطابق تو صرف بحری جہاز ہی غرق ہونے چاہئیں۔ طیاروں کو کچھ نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن طیاروں کے ساتھ کیا ہوا؟

سمندروں کی تہ میں شگاف:

ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ سمندر کی تہ میں بعض اوقات شگاف پڑ جاتے ہیں جس کے نتیجے میں بڑے بڑے دیوہیکل جہاز بھی پانی کے ساتھ شگاف کی نذر ہو جاتے ہیں۔

لیکن اس نظریے کو رد اس لیے کر دیا گیا ہے کہ جب سمندر میں شگاف پڑتے ہیں تو یہ شگاف شدید قسم کے زلزلوں کی وجہ سے ہوتے ہوں گے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آج تک اس علاقے میں برپا ہونے والے کسی زلزلے کی نشان دہی کوئی بھی زلزلہ مرکز نہیں کر سکا۔

اب اس حوالے سے ایک اور دلچسپ اور حیرت انگیز بات جو صرف اطلاع کے لیے بتا رہے ہیں، وہ یہ ہے کہ اکثر بحری جہازوں، کشتیوں اور طیاروں کا تعلق امریکا اور برطانیہ سے رہا ہے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ان دونوں حکومتوں نے نہ تو کبھی اس معاملے کو سنجیدگی سے لیا ہے اور نہ ہی اپنی پروازوں کو اس علاقے پر سے گزرنے پر پابندی لگائی ہے۔

کچھ طاقتیں ایسی بھی ہیں جو برمودا تکون سے لوگوں کی توجہ ہٹانا چاہتی ہیں (سبب نامعلوم) ان کی جانب سے یہ کہا جاتا ہے کہ اس قسم کے واقعات پوری دنیا میں پیش آتے ہیں۔ اگر برمودا میں ہو گئے تو کون سی قیامت آ گئی۔

قدامت پسند عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ برمودا تکون جہنم کا دروازہ ہے۔

برمودا تکون کے بارے میں تحقیق کرنے والے ایک محقق چارلس برلٹز کا خیال ہے کہ برمودا تکون کے اندر مقناطیسی بھنور (Magnetic Vortex) ہیں جو اپنے شکار کو کھینچ لیتے ہیں۔

ایک نظریہ یہ ہے کہ برمودا تکون کے اندر اڑن طشتریاں (Flying Saucers) جاتی دیکھی گئی ہیں۔ چنانچہ وہاں ان میں سوار خفیہ قوتوں کے ٹھکانے ہیں جو اپنے مخصوص مقاصد کے لیے طیاروں، جہازوں اور افراد کو اغوا کر لیتے ہیں۔

امریکا میں ایک فرقہ برمودا تکون کی حقیقت روحانیت سے جوڑتا ہے۔

یہاں قدیم تہذیب اٹلانٹس کا مدفن ہے جو انتہائی ترقی یافتہ تھی اور سمندر میں زلزلوں کے سبب پانی کے اندر ڈوب گئی۔

ایک تھیوری میتھین گیس تھیوری کے نام سے مشہور ہے۔

لیڈس یونیورسٹی کے ڈاکٹر بین مکینل نے یہ نظریہ متعارف کروایا کہ تکون کے اندر سمندر کے نیچے میتھین گیس ہے جو کہ سمندر کی تہ میں تلچھٹ میں موجود ہے۔

یہ آبیدے (Gas Hydrates) سمندر کی تہوں سے نکل کر موٹے موٹے بلبلوں کی صورت میں پانی کی سطح پر آ جاتے ہیں۔ یہ بلبلے چھونے سے یا آواز سے پھٹ جاتے ہیں اور ان میں موجود گیس باہر نکل جاتی ہے جس کی وجہ سے وہاں پانی کی کثافت (Density) کم ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں جہاز وغیرہ ڈوب جاتے ہیں۔ اور چونکہ یہ گیس انتہائی سریع الاشتعال ہے لہٰذا اگر یہ گیس فضا میں پھیل جائے تو طیارے کے انجن کو ایک دھماکے سے اڑا سکتی ہے۔

مصری محقق محمد عیسیٰ داؤد کے مطابق شیطانی سمندر اور برمودا تکون کا نے دجال کے زیر استعمال ہیں۔ اس نے باقاعدہ قلعہ نما محل بنایا ہوا ہے جو تکون کی شکل کا ہے۔

برمودا تکون کے حوالے سے یہ مختلف نظریات ہیں۔ لیکن ابھی تک صحیح طور پر اندازہ نہیں ہو سکا ہے کہ آخر وہاں ہے کیا؟

محمد عیسیٰ داؤد نے دجال کے موضوع پر بہت محنت کی ہے اور کئی کتابیں لکھی ہیں۔ محمد عیسیٰ داؤد ان تمام جگہوں پر خود

www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گئے ہیں جہاں سے دجال یا یہودی تنظیم فری میسن کا کوئی تعلق رہا ہے۔

مثلاً سوئیڈن، مصر، فلسطین، امریکا، برمودا یا شام وغیرہ۔

برمودا کے حوالے سے واضح طور پر دو گروپ سامنے آئے ہیں۔ ایک وہ جن کا یہ کہنا ہے کہ اس علاقے میں ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے جس پر دھیان دیا جائے۔

اور دوسرے وہ ہیں جنہوں نے اس علاقے کو انتہائی خطرناک قرار دیا ہے اور ان کے دلائل بہت وزنی ہیں۔

برمودا تکون میں ایک طاقت ور قوت کے ہونے پر اکثر محققین متفق ہیں لیکن وہ قوت کیا ہے، کہاں سے آئی ہے اور اس علاقے میں کب سے ہے، اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

مشہور جیوفزکس سائنس داں جان کیر سٹوئی کہتے ہیں کہ اس پانی کے اندر اور پانی کے باہر ایک خاص قسم کی قوت کشش موجود ہے۔ یہ قوتِ کشش اس قوتِ کشش سے مختلف ہے جس کو ہم جانتے ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ اگر کوئی سائنس داں توانائی کے طور پر اس قوتِ کشش کو استعمال کرنے میں کامیاب ہوجائے تو پھر اس توانائی سے چلنے والی کار ہماری موجودہ توانائی سے چلنے والی کار سے لاکھوں گنا تیز رفتاری سے دوڑے گی۔

مشینری صدیوں کا کام انجام دے گی۔ ذرا تصور کریں، قوتِ کشش سے چلنے والے طیارے کس رفتار سے پرواز کیا کریں گے؟ ایسی اڑنے والی سواریاں جو آپ کے دیکھتے ہی دیکھتے نگاہوں سے اوجھل ہوجائیں، فضا میں معلق ہوجائیں، سمندر کے اندر غار بنالیں۔ جس کو چاہیں دور ہی سے اپنی طرف کھینچ لیں۔ بجلی سے چلنے والے تمام آلات اور انجن بند کردیں۔ حتیٰ کہ اس کشش کے ذریعے زمین کی حرکت کو متاثر کردیں اور دن کو عام دن کے بجائے سال کے برابر کردیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا زیرِ سمندر ایسے سائنس داں موجود ہیں جنہوں نے یہ قوت حاصل کرلی ہے؟

ایک اہم بات یہ بھی یاد رکھنی چاہیے کہ برمودا تکون اور شیطانی سمندر میں اکثر غائب ہونے والے مال بردار جہازوں میں عسکری نوعیت کا سامان یا خام مال بھرا ہوا تھا۔

جو افراد اغوا کیے گئے، وہ بھی اپنے فن کے ماہر لوگ تھے۔ چنانچہ ہمارے پاس اس بات کو تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ اس علاقے میں کوئی خفیہ قوت ہے جو اس مقناطیسی کشش کو منظم انداز سے استعمال کررہی ہے اور اس پر اس کو مکمل کنٹرول حاصل ہے۔

کون ہوسکتا ہے؟

اس قوتِ کشش کو اتنے منظم انداز میں استعمال کرنے والا کون ہوسکتا ہے؟ وہ کون سی قوت ہے جس نے اس کو اتنا موثر بنالیا کہ جس کے ذریعے فضا میں اڑتے طیارے غائب ہوجائیں۔ جدید طیاروں کی جدید ٹیکنالوجی کو جام کردیا جائے۔

اس علاقے کے اوپر سیٹلائٹ اور موسمی سیارے جو اس علاقے کی تصویریں اتارنے کی کوششیں کریں اور تصویریں کھینچ لی جائیں لیکن کیمرے کی فلم غائب۔

یعنی برمودا تکون میں موجود ''خفیہ قوت'' اتنی جدید ٹیکنالوجی کی مالک ہے کہ دنیا کے جدید ترین سمجھے جانے والے سیٹلائٹ اور ان کے کیمروں میں موجود فلموں کو ہزاروں کلومیٹر دور سے صاف کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

کیا ہماری اس معلوم دنیا اور موجودہ سائنس دانوں کے علاوہ اس دنیا کی کوئی خفیہ طاقت سائنس اور ٹیکنالوجی میں بہت آگے جاچکی ہے؟ دو سو یا تین سو سال آگے، اور کیا وہ طاقت برمودا تکون میں سمندر کے نیچے موجود ہے؟

اور وہ طاقت کیا چاہتی ہے؟

آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ جب کسی جہاز کو برمودا تکون سے قبضے کے بعد واپس کیا جاتا ہے تو جہاز کے بے قیمت کاغذات اور سمت بتانے والے معمولی آلات کے علاوہ قیمتی مال ومتاع اور زر وجواہر کو واپس کردیا جاتا ہے۔ انہیں ہاتھ تک نہیں لگایا جاتا۔

کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ آبِ سفید کی حدود کے اندر ایک ایسی طاقت موجود ہے کہ جو لوگ اس علاقے میں تحقیقات کی نیت اور ارادے سے جاتے ہیں، انہیں معاف نہیں کرتی اور ان کی کوئی اطلاع بھی نہیں ملتی اور جو لوگ غلطی یا اتفاق سے چلے جاتے ہیں، انہیں معمولی سی تنبیہ کے بعد چھوڑ دیا جاتا ہے۔

آقائی ناجی النجار نے برمودا اور حضرت مہدی کے حوالے سے ایک زبردست کتاب لکھی ہے جس کا فارسی ترجمہ آقائی علی اکبر مہدی پور نے کیا تھا۔

اس کتاب میں انہوں نے برمودا ٹرائی اینگل کے اسرار کے حوالے سے لکھا ہے کہ ہوسکتا ہے ایک دن کوئی مفکر محقق مثلث برمودا میں رونما ہونے والے حادثات کے اصلی

سبب سے آشنا ہوجائے۔

لیکن اس امید کے ساتھ ہم بھی یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ مستقبل میں مثلث برمودا میں تحقیق کرنے والے ہمارے اس نظریے کی تصدیق کردیں کہ اس علاقے میں ایک الٰہی طاقت کا قیام ہے۔

اگرچہ ہمارے اس نظریے کا بُری طرح مذاق اڑایا جاتا ہے۔ لیکن اگر ایسا ہوگیا تو مذاق اڑانے والے خود مذاق بن جائیں گے۔

کیونکہ ایک وقت تھا کہ جب اسلام نے روح کو جسم سے علیٰحدہ بتایا تھا اور کہا تھا کہ روح کبھی فنا نہیں ہوتی اور یہی نظریہ عقیدۂ قیامت کی بنیاد ہے۔ تو اس وقت کے لوگ اس اسلامی نظریے کا مذاق اڑاتے تھے لیکن آج قائل ہوگئے ہیں۔ اسی طرح اور بھی بہت سے اسلامی نظریے آج کے دور میں سچ ثابت ہوتے چلے جارہے ہیں۔

اب یہاں ان حیرت انگیز واقعات اور مشاہدات کا ذکر مناسب ہوگا جو اس علاقے سے گزرنے والوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اپنی دنیا میں واپس آکر حیرت کے ساتھ بیان کیے۔

ان واقعات اور مشاہدات کی تفصیل بھی بہت طویل ہے لیکن ہم چند خاص خاص واقعات بتارہے ہیں جس سے اندازہ ہوجائے گا کہ اس علاقے میں کیا ہورہا ہے؟

مثلث برمودا میں تحقیق کرنے والوں نے دسیوں مرتبہ اپنی آنکھوں سے غیر معمولی نور کی چمک کا مشاہدہ کیا ہے۔

امریکی فضائیہ کے ایک انسٹرکٹر نے اپنا مشاہدہ کچھ یوں بیان کیا ہے۔ ''غروبِ آفتاب سے تھوڑی دیر بعد میں نے جزائر باہاما کے دارالحکومت ناساؤ سے پرواز کی۔ موسم بالکل صاف تھا اور ستارے چمک رہے تھے۔

''تقریباً ساڑھے نو بجے میں انڈروس کے انتہائی شمالی حصے سے گزرا۔ میرا جہاز کم وبیش آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر تھا کہ اچانک کسی غیر معمولی اور غیر مادی شے سے سابقہ پڑ گیا۔

ہوا یوں کہ میرے ہوائی جہاز کے دونوں پَر ایک دم سبز ہوگئے۔ یوں معلوم ہوا کہ تمام پَر ریڈیم سے بنائے گئے ہوں۔ میں نے حیرت سے دائیں بائیں دیکھا، کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ چنانچہ جو پہلے میں نے خیال کیا وُہ یہ تھا کہ پائلٹ کے کمرے کی روشنی کا عکس ہے جو رنگ شدہ پلاسٹک پر پڑ کر کیبن کے اندر آرہا ہے۔

''میں اسی فکر میں تھا کہ چند منٹ کے اندر ہوائی جہاز کے پُرا تنے گہرے سبز ہوگئے کہ مجھے کسی میٹر کی کوئی سوئی تک نظر نہیں آتی تھی۔ ہوائی جہاز کے تمام الیکٹرونک آلات میرے قابو سے باہر ہوگئے۔ اب میرے ذہن میں دو ہی باتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ میرا جہاز زمین کے مدار سے نکل کر کسی اور سیارے کے مدار میں پہنچ گیا ہے، یا پھر یہ میرا وہم ہے۔

''پھر اچانک پورا جہاز منور ہوگیا۔ اتنا تو مجھے یقین ہے کہ یہ روشنی انعکاسی نہیں تھی بلکہ ہوائی جہاز کی پیدا کردہ تھی۔ میں نے شیشے سے جھانک کر ہوائی جہاز کی بیرونی سطح کو دیکھا تو جہاں تک مجھے پُر نظر آسکتے تھے، وہ بھی اندرونی منظر کی طرح اس قدر روشن اور منور تھے کہ میری آنکھیں خیرہ ہونے لگیں۔

''یہ سلسلہ تقریباً پانچ منٹ تک رہا۔ پھر آہستہ آہستہ روشنی مدھم ہوتے ہوتے ختم ہوگئی اور جوں ہی روشنی ختم ہوئی، ہوائی جہاز کے تمام آلات نارمل ہوگئے۔

''جب منزلِ مقصود پر پہنچ کر میں نے اپنے مشاہدے سے دوسروں کو آگاہ کیا تو وہ کہنے لگے کہ ہمارے لیے یہ نئی اطلاع نہیں ہے۔ ہم بھی بارہا ایسے مشاہدے سے گزر چکے ہیں۔''

کوئن الزبتھ اول کے جون سینڈر کا بیان۔ ''میں کوئن الزبتھ اول پر ناساسے نیویارک براستہ برمودا تکون جارہا تھا۔ موسم صاف اور سمندر پُرسکون تھا۔ میں صبح کے وقت عرشے پر کھڑا اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ کافی پی رہا تھا۔

''ہم نے ایک چھوٹا سا طیارہ دیکھا۔ طیارہ ہم سے دو سو گز کے فاصلے پر دو سو فٹ کی بلندی پر پرواز کرتا ہوا سیدھا ہماری طرف آرہا تھا۔

''میں نے اپنے ساتھی سڈنی کو اس طرف متوجہ کیا۔ پھر طیارہ ہم سے 75 گز دور جہاز کے قریب بڑی خاموشی سے سمندر کے اندر چلا گیا۔

نہ کوئی طیارہ گرنے کی آواز تھی اور نہ کوئی پانی کا چھپاکا ہوا تھا۔ بس یوں لگتا تھا کہ جیسے سمندر نے اس طیارے ہی کے لیے اپنا منہ کھولا تھا۔

''تلاش کے لیے ایک کشتی بھی پانی میں اتاری گئی لیکن وہاں نہ تو کوئی ملبا تھا اور نہ تیل کا نشان جس سے یہ بات یقینی تھی کہ طیارے کو کوئی حادثہ پیش نہیں آیا ہے۔ سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ جب طیارہ پانی میں گرا تو پانی میں چھپاکا کیوں نہیں ہوا، پانی اچھلا کیوں نہیں؟''

اس سے زیادہ مستند واقعہ فلوریڈا کے ساحل ڈیٹن بیچ کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے جس کو 27 فروری 1953ء کی صبح بے شمار لوگوں نے دیکھا۔

طیارہ ساحل سے صرف سو گز کے فاصلے پر گرا تھا۔ فوراً ہی کوسٹ گارڈ اور وہاں موجود انتظامیہ نے وہ جگہ کھنگال ڈالی لیکن طیارے کا کوئی سراغ نہ ملا۔ حتیٰ کہ تیل کا بھی نام و نشان نہیں تھا۔

حیرت کی بات ہے کہ آس پاس کے تمام ائرپورٹس سے رابطہ کیا تو کہیں سے بھی طیارہ گم ہونے کی اطلاع نہیں ملی۔

آخر یہ طیارہ کس کا تھا؟ کہاں سے آیا اور اتنی خاموشی کے ساتھ برمودا تکون کے سمندر میں کس کے پاس چلا گیا؟

آپ نے اڑن طشتریوں کی کہانیاں پڑھی ہوں گی۔

(UFO)

Unidentified Flying Objects۔ نہ جانے اس پر کتنی فلمیں بن چکی ہیں۔ ہزاروں افراد نے ان کا مشاہدہ کیا ہے لیکن ابھی تک سراغ نہیں لگ سکا ہے کہ یہ برق رفتار سواریاں کہاں سے آتی ہیں اور کس کے کنٹرول میں ہیں۔

جس شخص نے پہلی مرتبہ کرۂ ارض کی فضا میں ایک نورانی کشتی کو دیکھا تو اس نے حیرت سے کہا "ارے اڑن طشتری کو دیکھو۔"

اس دن سے کرۂ ارض پر ان نورانی اشیا کا نام ہی اڑن طشتری پڑ گیا۔ ان میں سے بعض کی شکل ستون نما ہوتی ہے اور بالعموم ان کا حجم جمبو جیٹ طیارے کے برابر ہی ہوتا ہے لیکن بے پناہ چمک ہوتی ہے۔

یہ اڑن طشتریاں جب بھی دیکھی جاتی ہیں اور جس علاقے میں بھی دیکھی جاتی ہیں، حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جب تک اس علاقے سے دور نہیں ہو جاتیں، اس وقت تک اس علاقے کا تمام مواصلاتی نظام معطل اور بے کار رہتا ہے۔ حتیٰ کہ ٹیلی فون اور وائرلیس سیٹ بھی کام نہیں کرتے۔

روزنامہ الوطن العربی 30 نومبر 1978ء کے مطابق یہ اڑن طشتریاں جب چاہتی ہیں ایک لمحے میں ایک علاقے سے دور ہو کر نظروں سے غائب ہو جاتی ہیں۔

..... 1 مئی 1979ء کے مطابق ان اڑن طشتریوں کی رفتار کو جو آج تک ریکارڈ کیا جا سکا ہے، وہ سات سو کلومیٹر فی سیکنڈ ہے۔ انتہائی بلندی پر بھی یہ اڑن طشتریاں بڑی آسانی سے اپنی رفتار کم کر کے رک سکتی ہیں اور لمحہ بہ لمحہ مختلف شکلوں میں بدلتی بھی رہتی ہیں۔

ان اڑن طشتریوں کی حقیقت کا راز پانا بھی ہماری آج کی ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کے لیے نہ صرف ایک معما ہے بلکہ بہت بڑا چیلنج بنا ہوا ہے۔

اور ان اڑن طشتریوں کا تعلق برمودا ٹرائی اینگل ہی سے ہے۔ اسی علاقے میں یہ اڑن طشتریاں بار بار دکھائی دی ہیں۔

اڑن طشتریوں کے حوالے سے بھی بے شمار نظریات ہیں۔

مشہور فزیالوجسٹ رابرٹ اینسٹاس کہتا ہے "بلاشک وتر دید اڑن طشتریاں موجود ہیں اور یہ جن ہاتھوں کے کنٹرول میں ہیں، وہ بھی انسان ہی ہیں۔ لیکن ایسے انسان جو آج سے بیس ہزار سال پہلے اس کرۂ ارض سے ترک وطن کر کے کسی اور سیارے میں جا کر آباد ہو گئے ہیں۔"

علامہ مصطفیٰ محمود اپنے ایک مضمون "دجال اڑن طشتری میں آئے گا" میں لکھتے ہیں کہ یہ اڑن طشتریاں جو کبھی کبھار فضا میں دیکھی جاتی ہیں، ان کا وجود اب ایک مسلمہ حقیقت ہے جس سے انکار ناممکن ہے۔

اب سے چالیس سال پہلے اقوام متحدہ کے مرکزی دفتر نے اپنے تمام رکن ممالک سے یہ درخواست کی تھی کہ ہر ملک اپنے اپنے مناسب علاقے میں اڑن طشتریوں کو دریافت کرنے والے آلات نصب کرے۔ تاکہ اگر کبھی کوئی اڑن طشتری ان کے علاقے میں دکھائی دے تو اس کی حرکات وسکنات کو ان آلات کے ذریعے ریکارڈ کیا جا سکے۔

یہ تو بے شمار شواہد کے سامنے آنے سے معلوم ہو گیا کہ اڑن طشتریوں کا وجود ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ برمودا ٹرائی اینگل سے ان کا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟

اب ہم پھر ان حیرت انگیز مشاہدات کی طرف آتے ہیں جو برمودا مثلث میں سامنے آئے ہیں۔ برمودا میں صرف اڑن طشتریاں ہی نہیں بلکہ آگ کے گولے، سفید چمک دار بادل اور کہر وغیرہ بھی دکھائی دیتے ہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ اڑن طشتری کو چھپانے کے لیے یہ بادل اور کہر مصنوعی طور پر کیمیائی عمل سے پیدا کیے جاتے ہیں۔ برمودا کے اندر آگ کے گولوں کا داخل ہونا بھی ایک معروف حقیقت ہے۔

ڈبلیو جی مورس جو ایک ملاح تھا، وہ ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار ہو چکا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ 1955ء میں وہ "اٹلانٹک سٹی" نامی جہاز پر کام کر رہا تھا۔ صبح کا وقت تھا۔ واچ آفیسر میرے پاس آ کر کھڑا ہوا۔ تھوڑی دیر بعد اس

نے چیخ ماری کیونکہ جہاز پاگلوں کی طرح ایک دائرے میں چکر لگانے لگا تھا۔

تب ہم نے دیکھا کہ آگ کا ایک گولا بڑی تیزی کے ساتھ جہاز کی طرف آ رہا ہے۔ میں خوف زدہ ہو کر عرشے پر رک گیا۔ میرے ایک ساتھی نے مجھے دھکا دے کر اپنے ساتھ گرا لیا۔

وہ آگ کا گولا ہمارے اوپر سے گزر کر سمندر میں داخل ہو گیا۔

برمودا تکون کے اوپر اکثر انتہائی چمک دار بادل اور سفید کہر بھی دیکھے جاتے رہے ہیں۔ کولمبس نے اپنی لاگ بک میں لکھا تھا "آگ کا ایک جناتی گولا اور سطح سمندر پر سفید چمک دار لکیریں۔"

اکثر ہوابازوں نے سفید چمک دار پانی کا ذکر کیا ہے کہ وہ سفید پانی میں داخل ہو رہے ہیں۔ یہ سفید پانی دراصل سفید چمک دار بادل ہو سکتے ہیں۔

اس میں داخل ہونے کے بعد پائلٹ کو خلا، زمین اور پانی سب گڈمڈ نظر آنے لگتا ہے۔

کئی کشتیاں اور جہاز بھی ان چمک دار چکر میں پھنس کر ہمیشہ کے لیے غائب ہو چکے ہیں۔ کیپٹن ڈان ہنری بھی ایک بار اس چمک دار کہر میں گھر گیا تھا۔

اب ایک اور حیرت انگیز واقعہ۔ ایک سفید گہرے بادل نے سیسنا 72 نامی طیارے کا تعاقب کیا۔ ذرا سوچیے کیا کوئی بادل کسی طیارے کا تعاقب کرتا ہے؟ اس طیارے کے آلات ناکارہ ہو گئے اور طیارہ اپنا راستہ بھول گیا۔

ایک اور حیرت انگیز واقعہ جو پہلی عالمی جنگ کے دوران 28 اگست 1915ء کو پیش آیا۔ اس جنگ کے دوران گیلی پولی کی مہم کئی وجہ سے بہت مشہور ہوئی۔ برطانوی فوج اور ترک فوج آمنے سامنے تھی۔ گھمسان کی جنگ جاری تھی۔

گیلی پولی میں شکست کا مطلب تھا ترکی پر برطانیہ کا قبضہ۔ برطانوی فوجیں فتوحات کرتی آگے بڑھتی جا رہی تھیں۔ قریب تھا کہ وہ میدان مار لیں۔ موسم بالکل صاف تھا۔ اچانک میدان جنگ کے اوپر بادل کے کچھ ٹکڑے ظاہر ہوئے۔ ان ٹکڑوں سے نیچے ایک اور بادل کا بہت بڑا ٹکڑا زمین تک ایک سڑک پر جھکا ہوا تھا۔ بادل کا یہ ٹکڑا 800 فٹ لمبا اور دو سو فٹ چوڑا تھا۔

ہوا کے باوجود یہ بادل اپنی جگہ کھڑے ہوئے تھے۔ اس سڑک سے آگے ایک پہاڑی تھی جس پر برطانوی فوج ترک فوج سے برسرِ پیکار تھی۔

برطانیہ کی ایک رجمنٹ "دی فرسٹ فورتھ نارفوک" اس پہاڑی پر موجود دستے کی کمک کے لیے اس سڑک پر آگے بڑھی اور اس بادل میں داخل ہو گئی۔

چونکہ دھند تھی اس لیے پیچھے والے فوجیوں کو بادل میں

جن اور مٹھائیاں

حیدرآباد دکن میں مٹھائیوں اور پھولوں کی دکانیں اکثر رات بھر کھلی رہتی ہیں۔ حلوائی اور گل فروش چاہیں بھی تو دکانیں بند نہیں کر سکتے۔ قارئین کو یہ جان کر حیرت ہو گی کہ وہاں یہ سب کچھ (دکانوں کا کھلا رہنا) جنوں اور دوسرے بزرگوں کے ایما سے ہوتا ہے جو وہاں راتوں کو انسانی بھیس بدل کر خریداری کے لیے آتے ہیں۔ میں نے خود کئی جنوں کو اپنی آنکھوں سے سودا سلف خریدتے دیکھا ہے۔ ہوا یوں کہ ایک رات میں بہت دیر سے گھر لوٹ رہا تھا۔ اتفاق سے میرا گزر مٹھائیوں اور پھولوں کی دکانوں کی طرف سے ہوا۔ وہاں رات کو بھی قابلِ دید چہل پہل تھی۔ مجھے یہ ہجوم دیکھ کر بہت حیرت ہوئی۔ سوچا کہ یہ لوگ اتنی رات گئے مٹھائیوں اور پھولوں کی خریداری کیوں کر رہے ہیں؟ خیر میں یہ سارا تماشا دیکھتا ہوا گھر کی طرف چلا گیا۔ دوسرے روز جب میں نے ایک بزرگ سے اس واقعے کا تذکرہ کیا تو انہوں نے بتایا کہ بیٹے اتنی دیر تک دکانوں کو کھلا رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ یہاں "اوپر والے" (جنات) خریداری کرتے ہیں۔ اگر تم میری بات کی تصدیق چاہتے ہو تو ایک سرسری نظر ان کے پیروں پر ڈال لینا۔ دوسرے روز جب میں تصدیق کی غرض سے ادھر سے گزرا تو واقعی بعض لوگوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا، ان کے پاؤں پیچھے کی طرف تھے۔ ہر چند کہ یہ صورت سے انسان معلوم ہوتے تھے، یہ حقیقت جاننے کے بعد میرا وہاں ٹھہرنا دشوار ہو گیا اور میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔

ہفت روزہ پیمان کراچی کے شمارے (13 اگست 73ء) میں شائع شدہ پاکستان کے مشہور روڈ ماسٹر اور سائیکلسٹ ایم اے مطیع کے ایک انٹرویو سے اقتباس۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

داخل ہونے والوں کا کچھ علم نہیں تھا۔ سو مکمل رجمنٹ آگے بڑھتی رہی لیکن ایک سپاہی بھی اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکا۔

ایک گھنٹے کے بعد جب آخری فوجی بھی اس بادل میں داخل ہوگیا تو پورا بادل خاموشی سے اٹھا اور اوپر والے بادل کے مختلف ٹکڑوں سے جا کر مل گیا۔

اس ٹکڑے کا دوسرے ٹکڑوں سے ملنا تھا کہ سارے بادل روانہ ہوگئے اور غائب ہوگئے۔

اس رجمنٹ کے بارے میں یہ سمجھا گیا کہ شاید جنگ میں ختم ہوگئی یا گرفتار ہوگئی لیکن بعد میں ترکی نے کہا کہ اسے تو ایسی کسی رجمنٹ کا علم ہی نہیں ہے۔

یہ رجمنٹ چار ہزار جوانوں پر مشتمل تھی۔ اتنی بڑی تعداد نام ونشان چھوڑے بغیر غائب ہوگئی۔ یہ واقعہ گرچہ برمودا کے علاقے سے باہر کا ہے لیکن ان پراسرار چمک دار بادلوں سے متعلق ہے جو بادل برمودا پر چھائے رہتے ہیں۔

برمودا ٹرائی اینگل کا ایک اور پہلو بھی قابلِ غور ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہاں آکر وقت یا تو تھم جاتا ہے یا کسی اور جہت میں چلا جاتا ہے۔

یہ کہر یا بادل بعض اوقات وقت میں گڑبڑ کا باعث بھی بن جاتے ہیں۔ کبھی وقت آگے پایا گیا کبھی پیچھے۔ مثلاً نیشنل ائرلائنز کا طیارہ دس منٹ تک ریڈار پر سے غائب رہا۔

پائلٹ نے بتایا کہ اس دوران وہ روشن کہر میں سے پرواز کررہا تھا۔ ہوائی اڈے پر اترنے کے بعد پتا چلا کہ وہ سب.... دس منٹ پیچھے چلے گئے تھے۔

جہاز کا کرونومیٹر اور مسافروں کی گھڑیاں دس منٹ پیچھے ہوگئی تھیں۔

وقت کا کسی اور جہت میں چلے جانے کا تصور البرٹ آئن اسٹائن نے پیش کیا تھا لیکن ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے بھی پہلے اشارہ فرمادیا ہے۔

دجال سے متعلق حدیث میں حضرت نواس ابن سمعانؓ والی حدیث میں دجال کے دنیا میں رہنے کی مدت بیان کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا۔ ''وہ (دجال) دنیا میں چالیس دن رہے گا۔ پہلا دن ایک سال کے برابر، دوسرا دن ایک مہینے کے برابر اور تیسرا دن ایک ہفتے کے برابر ہوگا۔ باقی دن عام دنوں کے برابر ہوں گے۔'' (مسلم شریف)

بہت سے عینی شاہدین اور غیر جانب دار محققین کی رائے یہ ہے کہ تجسس اور رازوں سے بھرے ان واقعات کا تعلق اڑن طشتریوں کے ساتھ ہے۔

وہ اڑن طشتریاں جنہیں برمودا کی فضاؤں میں کئی بار دیکھا گیا ہے۔

یہ اڑن طشتری کیا ہے؟ ان اڑن طشتریوں میں سفر کرنے والی مخلوق جس کو خلائی مخلوق کے طور پر مشہور کیا گیا، وہ خلائی مخلوق نہیں بلکہ ہماری اسی زمین کے لوگ ہیں اور ان لوگوں کا مستقر برمودا ٹرائی اینگل ہے۔

لیکن یہ کون لوگ ہیں؟

انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا میں ان اڑن طشتریوں کا تفصیلی ذکر ہے۔ اٹالین نامہ نگار برٹوفینولیو لکھتا ہے کہ 1960ء کے موسم گرما میں روسی میزائلوں کے دفاع میں اٹلی کے ایک ہوائی اڈے پر جدید ترین میزائل نصب کرنے کے دوران میڈر نامی ہوائی جہاز اچانک ایک اڑن طشتری کے روبرو ہوگیا۔

میڈر کے کپتان نے حکم دیا کہ اڑن طشتری پر میزائل داغ دیا جائے۔ اڑن طشتری کو میزائل کا نشانہ بنایا گیا لیکن حیرت کی انتہا نہ رہی کہ میزائل اڑن طشتری تک پہنچنے سے پہلے فضا میں پھٹ کر بے کار ہوچکا تھا۔

کپتان نے دوسری مرتبہ میزائل فائر کرنے کا حکم دیا۔ دوسری مرتبہ کے داغے گئے میزائل اڑن طشتری کے قریب جا کر بے کار ہوگئے۔

جبکہ تیسری مرتبہ میزائل اپنے مرکز میں سے نہ اڑے اور وہیں کے وہیں رہ گئے۔ جب میزائل داغنے والے آلات کا جائزہ لیا گیا تو پتا چلا کہ ہوائی جہاز کے تمام الیکٹرونک آلات بغیر کسی وجہ کے بے کار ہوچکے ہیں۔

اڑن طشتریوں کے حوالے سے ایک اور حیرت انگیز واقعہ پڑھ لیں۔ یہ ایسا واقعہ ہے جسے باقاعدہ پوشیدہ رکھا گیا تھا۔ اس کے باوجود کسی طرح یہ سامنے آہی گیا۔

9 جون 1969ء کو چاند کی سطح پر قدم رکھنے سے صرف ایک دن پہلے نیل آرم اسٹرانگ اور اس کے ساتھی آلڈرین نے جب وہ اپالو 11 میں بیٹھے چاند کی سرزمین کی تحقیقات میں مصروف چاند کے اردگرد چکر لگا رہے تھے تو انہوں نے اس کا مشاہدہ کیا تھا۔

انہوں نے دیکھا کہ دو اور ہوائی کشتیاں بھی کرۂ ماہ کے گرد چکر لگا کر تحقیقات میں مصروف ہیں۔ انہوں نے جب اپنی توجہ ان کشتیوں پر کی تو حیرت زدہ رہ گئے۔

بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ کشتیاں انسانی طاقت کی ایجاد نہیں ہیں کیونکہ یہ ناقابلِ بیان حد تک روشن اور منور

تھیں۔ ایک بڑی ایک قدرے چھوٹی تھی۔

آرم اسٹرانگ کہتا ہے ''سچی بات یہ ہے کہ میں ان کشتیوں کو دیکھ کر دم بخود رہ گیا تھا لیکن اس کے برعکس آلڈرین نے ان کشتیوں کو دیکھ کر کسی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔''

اس کے بقول اڑن طشتریوں کا یہ مشاہدہ نیا نہیں تھا بلکہ قبل ازیں کئی مرتبہ وہ ایسے مشاہدات سے گزر چکا تھا۔

بنیادی طور پر ہم برمودا ٹرائی اینگل پر گفتگو کررہے ہیں لیکن اڑن طشتریوں کا حوالہ اس لیے ضروری ہے کہ یہ اڑن طشتریاں ایک حقیقت ہیں اور ان کا تعلق برمودا ہی کے پانیوں سے ہے۔ درجنوں افراد نے ان اڑن طشتریوں کو سمندر سے نکلتے اور سمندر میں جاتے ہوئے دیکھا ہے۔

اب امریکا میں رونما ہونے والا ایک حیرت انگیز واقعہ بھی سن لیں۔

1951ء میں ایک اڑن طشتری امریکا کے ایک فوجی ائرپورٹ پر اتری۔ اس کے اندر سے تین آدمی نکلے جو روانی سے انگریزی بول رہے تھے۔

انہوں نے امریکی صدر آئزن ہاور سے ملاقات کے لیے کہا۔ وہاں موجود فوجی افسران نے امریکی صدر آئزن ہاور سے رابطہ کیا۔ چار گھنٹوں بعد امریکی صدر وہاں آیا اور اس نے اڑن طشتری والوں سے ملاقات کی۔ امریکی صدر کے ہمراہ تین فوجی تھے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ اس دن ائرپورٹ پر تمام کارروائیاں نامعلوم وجوہات کی بنا پر معطل رہیں۔ نہ تو کوئی فوجی اپنی جگہ سے ہلا، نہ کوئی طیارہ اڑا اور نہ کوئی کام ہوا۔ مکمل ایمرجنسی نافذ کردی گئی پھر اڑن طشتری غائب ہوگئی۔

مذکورہ دعویٰ ماہر امریکی پروفیسر لین نے ایک امریکی CIA کے اہلکار کے حوالے سے 1956ء میں کیا۔ لیکن اس ملاقات میں کیا بات چیت ہوئی، یہ کسی کو پتا نہیں چل سکا۔

1976ء میں پورٹوریکو (جو کہ برمودا تکون کی حد میں ہے) میں اتنی زیادہ اڑن طشتریاں نظر آئیں کہ ان کو دیکھنے کے لیے چلتی ہوئی ٹریفک جام ہوگئی۔ گاڑیوں کے انجن خود بخود ہی بند ہوگئے۔ ٹی وی، ریڈیو اور پریس کے بندے ان اڑن طشتریوں کے کرتب دیکھنے کے لیے جمع ہوگئے۔ یہ سلسلہ تین ماہ تک جاری رہا تھا۔

1952ء میں 13 جولائی سے 29 جولائی تک واشنگٹن ڈی سی پر اڑن طشتریاں دیکھی جاتی رہیں۔ ایک ہی رات میں 20 کی تعداد تک لوگوں نے اڑن طشتریاں دیکھیں۔

یہ 20 اڑن طشتریاں وائٹ ہاؤس کے اوپر چکر لگاتی رہیں۔ حقیقتِ حال جاننے کے لیے جیٹ طیارے اڑے لیکن اڑن طشتریاں ان کے ساتھ چوہے بلی کا کھیل کھیلتی رہیں۔

طیارے جب ان اڑن طشتریوں کے اتنے قریب پہنچ جاتے جہاں سے ان کی تصویر لی جاسکتی اور ان کا معائنہ کیا جاسکتا تھا تو اڑن طشتریاں ناقابلِ یقین تیزی کے ساتھ بہت دور چلی جاتیں۔

یہ سب کچھ ہوگیا لیکن جب اڑن طشتریوں کی تفتیش کرنے والے مشن ''پروجیکٹ بلیو بیک'' کے نگراں کیپٹن جے ریپلٹ سے امریکی ٹرومین نے دریافت کیا تو اس نے صاف انکار کردیا کہ ایسی کوئی چیز دیکھی ہی نہیں گئی۔

جب عوام اور صحافیوں کی جانب سے اس بارے میں زیادہ شور ہونے لگا تو 24 دسمبر 1952ء کو امریکی خفیہ ادارے سی آئی اے کے شعبہ سراغ رسانی برائے سائنسی امور کی جانب سے ایک میمورنڈم جاری کیا گیا جس میں اڑن طشتریوں کی خبروں پر تبصرے کرنے کو قومی سیکیورٹی کے لیے خطرہ قرار دے دیا گیا۔

ذرا غور فرمائیں، ایسا ان اڑن طشتریوں میں کیا ہے جس کو امریکی حکومت چھپانا چاہتی ہے اور اس پر تبصرے کو سیکیورٹی کے لیے خطرہ سمجھا جاتا ہے۔

ایسا ہی ایک اور واقعہ سابق امریکی صدر جمی کارٹر کا بھی ہے۔ اس نے ABC نیوز کو ایک انٹرویو میں بتایا۔

''میں ان لوگوں پر بالکل نہیں ہنستا جو یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اڑن طشتریاں دیکھی ہیں۔ کیونکہ میں خود ایک اڑن طشتری دیکھ چکا ہوں۔''

جمی کارٹر کے بقول جب وہ 1969ء میں جارجیا میں لائنز کلب کے ایک اجلاس میں شریک تھے، ان کے ساتھ ان کے اہلِ خانہ اور دیگر لوگ بھی اڑن طشتریوں کو دیکھنے والوں میں تھے۔

اس کے بعد جمی کارٹر نے یہ وعدہ کیا کہ وہ وائٹ ہاؤس پہنچنے پر اڑن طشتریوں کے واقعات کی تحقیق کے لیے ماہرین اور سائنس دانوں پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دیں گے تاکہ حقائق سامنے آسکیں۔

لیکن جمی کارٹر امریکا کی صدارت پر فائز ہونے کے باوجود اپنا وعدہ پورا نہیں کرسکے، کیوں؟ کیا امریکا میں کوئی اور بھی قوت ہے جو امریکی صدر سے زیادہ طاقت ور ہے؟

کیا اڑن طشتریوں کے مالک کے سامنے امریکی صدر بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بے بس ہے؟ یا جی کارٹر کو "خفیہ طاقت" نے دھمکی دی کہ اگر جان پیاری ہے تو اڑن طشتریوں کو بھول جاؤ۔

ایسے نہ جانے کتنے واقعات ہیں جن کی اگر تفصیل بیان کی جائے تو پوری کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

یہ اڑن طشتریاں دنیا کے ہر حصے میں دیکھی جاتی رہی ہیں۔

پاکستان میں بھی دیکھی گئی ہیں مثلاً۔

29 اگست 2000ء اتوار کی رات، ڈیرہ غازی خان میں اڑن طشتری دیکھی گئی۔ دو ہفتوں بعد یہ یورینیم سے مالا مال علاقے میں دوبارہ دیکھی گئی۔

روزنامہ ڈان کے مطابق یہ اڑن طشتری مغرب کی جانب سے آئی اور فورٹ منرو اور راکھی گنج کے اوپر سے اڑتی ہوئی باغ لچر اور روغین کے درمیان زمین پر اتر گئی۔ بورڈ ملٹری پولیس نے اخبار کو مقامی لوگوں کے حوالے سے یہ بات بتائی کہ اڑن طشتری سیدھی زمین کی طرف اتری۔ جبکہ اسلام آباد میں حکام نے اس بات کی تردید کر دی ہے۔ 15 اگست کو ایک اور اڑن طشتری ضلع راجن پور کے ایک ائربیس کے قریب دیکھی گئی تھی۔

اسی تاریخ کو بلوچستان میں ایسے ہی چھ روشن چھوٹے جسموں کو دیکھے جانے کی اطلاع بھی موصول ہوئی تھی۔

اٹک میں 1996ء میں دیکھی گئی۔

لاہور میں 18 اکتوبر 2008ء کی شام امان کریم صاحب نے آٹھ اڑن طشتریاں ایک ساتھ دیکھیں۔ پنڈی میں آصف اقبال صاحب نے فجر کے وقت دیکھیں۔ یہ واقعہ جنوری 1988ء کا ہے۔

پاکستان کی طرح بھارت میں بھی کئی مقامات پر دیکھی جاتی رہی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ یہ اڑن طشتریاں اپنے اڈے برمودا ٹرائی اینگل سے باہر آ کر پوری دنیا میں کیا کرتی پھر رہی ہیں؟

اڑن طشتریوں کے حوالے سے کہانیوں اور فلموں میں یہ بات دہرائی جاتی رہی ہے کہ ان پر سفر کرنے والے کسی اور سیارے کی مخلوق ہوتے ہیں جبکہ ایسا نہیں ہے۔ بے شمار لوگوں نے اڑن طشتریوں کے سواروں کو بھی دیکھا ہے۔ وہ عام انسان ہی ہیں۔ خود مشہور سائنس داں البرٹ آئن اسٹائن کا بھی یہی نظریہ ہے کہ ان کو کنٹرول کرنے والے انسان ہی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ وہ کون ہیں؟ اور یہ بات ہزاروں لوگوں نے بیان کی ہے کہ یہ اڑن طشتریاں پُراسرار برمودا کے سمندر سے پرواز کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر مائیکل پرنجر کا مقالہ بھی قابلِ غور ہے۔

ڈاکٹر موصوف نے خود سمندر کے اندر غوطہ خوری کر کے اڑن طشتریوں کے مادوں یعنی نیلے غاروں (BlueHoles) کا سراغ لگایا ہے جن میں یہ اڑن طشتریاں رکھی جاتی ہیں۔

اس سلسلے میں ایک اور حیرت انگیز اور خوفناک بات یہ ہے کہ جو بھی برمودا ٹرائی اینگل یا اڑن طشتریوں کے راز کے قریب پہنچا اسے مار دیا گیا۔

مثال کے طور پر ڈاکٹر جیسوب، جیمس ای سیکڈونلڈ، روب پالمر اور ان جیسے کتنے ذہین اور قابل سائنس داں اور محقق جنہوں نے اس راز کو جاننے کی کوشش کی، جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

ایک اور حیرت انگیز بات۔

کئی سائنس داں برمودا ٹرائی اینگل کے سمندر میں ڈوب گئے اور برسوں یا مہینوں کے بعد ان کی آوازیں سنی گئیں۔ انہوں نے یہ انکشاف کیا کہ وہ زندہ ہیں لیکن کہاں ہیں، وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں بتا سکتے۔

معروف مفکر ایم کے جوزف نے نظریہ پیش کیا ہے۔ اس نے کہا، مثلث برمودا میں کوئی ایسا عامل موجود ہے جو ہماری کیمسٹری سے ماورا ہے۔ (یہ عامل کون ہو سکتا ہے؟)

ہزاروں محققین کی ریسرچ کے بعد جو بات سامنے آئی ہے، وہ یہ ہے کہ اگر آپ ان تمام نظریات میں ایک قدر مشترک تلاش کرنا چاہیں تو وہ یہ ہے کہ مثلث برمودا تا حال ایک ناقابل فہم، ادراک و شعور سے ماورا، فکر و تدبر سے بالا اور دانش و بینش سے بلند ایک نہ حل شدہ معما ہے۔

☆☆☆

اس مضمون کی تیاری میں ان کتابوں کی مدد لی گئی ہے۔

جزیرۂ خضرا، آقائی ناجی النجار

برمودا تکون اور دجال، مولانا عاصم عمر

Qursar.Gian.I کی تین کتابیں۔

Srma

HelpShip

Distant Horizon

اور Charles Berlitz کی مشہور کتاب۔

Without a Trace

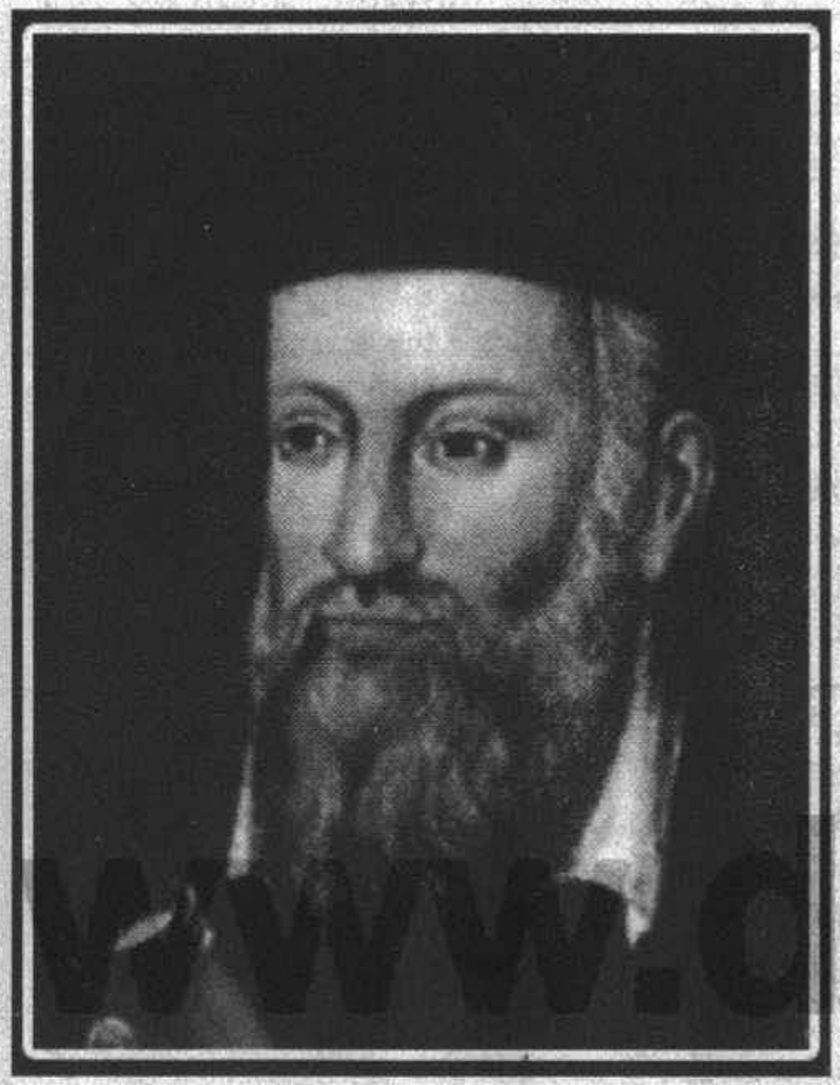

ڈیوڈ کوپر فیلڈ

میم الف

جادوگر زمانہ قدیم سے مذکور رہے ہیں۔ کچھ جادوگر شیطانی قوتوں کے ذریعے لوگوں کو مسحور کرتے ہیں اور کچھ شعبدوں کا سہارا لیتے ہیں۔ اس سائنسی دور میں بھی ایسے کئی جادوگر ہیں جن کے نام کا ڈنکا بجتا ہے۔ انہی میں سے ایک ڈیوڈ کوپر فیلڈ بھی ہے۔ بسے بارود سے اڑائی جانے والی عمارت میں ہاتھ پیر باندھ کر ڈال دیا جاتا ہے مگر وہ دھماکے سے چند سیکنڈ پہلے ہنستا ہوا عمارت سے باہر آجاتا ہے۔

اس کیپیوٹرائیج کے ایک مہان جادوگر کا مختصر سا تعارف

ڈیوڈ کوپر فیلڈ..... ایک حیرت انگیز انسان، جس کے کارنامے حیران کر کے رکھ دیتے ہیں، جس نے ایسے ایسے تماشے دکھائے ہیں کہ اس کا نام موجودہ دور کے شاید سب سے بڑے جادوگر میں ہوتا ہے۔

مصر کے ایک مشہور عالم عیسیٰ داؤد کے خیال میں ڈیوڈ کو پر دنیا میں دجال کا نمائندہ ہے۔

اس کے والدین بنیاد پرست یہودی تھے جو روس سے ہجرت کر کے امریکا آ کر آباد ہو گئے۔ "ڈیوڈ" کی پیدائش امریکا ہی میں ہوئی تھی۔

وہ نیو جرسی میں 16 ستمبر 1956ء کو پیدا ہوا تھا۔

ڈیوڈ ابتدا ہی سے ایک ذہین لڑکا رہا تھا۔ اس کا دلچسپ مشغلہ یہی تھا کہ وہ اپنے ہم عمروں کو جمع کر کے جادو جادو کھیلا کرتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور اس کے ہاتھ کی صفائی اور اس کی ایجاد کردہ ٹرکس دیکھ کر اس کے دوست حیران ہوجایا کرتے۔ اس کے محلے والوں نے اس کا نام چھوٹا جادوگر رکھ دیا تھا۔

اس کے والدین اس کے اس شوق پر اسے برا بھلا بھی کہتے رہتے۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ وہ ڈیوڈ کو یہودی مبلغ بنائیں گے لیکن وہ تو کچھ اور بننے جارہا تھا۔

بالآخر اس چھوٹے جادوگر کی شہرت نیوجرسی سے نکل کر پورے امریکا میں پھیل گئی۔ وہ پہلا جادوگر تھا جسے صرف 14 برس کی عمر میں Society of American Magician کا ممبر بننے کا اعزاز حاصل ہوا تھا ورنہ یہ وہ اعزاز ہے جس کے لیے لوگ ترستے رہتے ہیں۔

ڈیوڈ کا صرف ایک ہی شوق نہیں تھا بلکہ وہ رائٹر، ڈائریکٹر اور پروڈیوسر وغیرہ بھی بننا چاہتا تھا۔ اسے اداکاری کا بھی شوق تھا۔

بچپن میں بھی وہ دوستوں کے سامنے ڈائلاگس بول بول کر اور اداکاری دکھا دکھا کر انہیں مرعوب کیا کرتا۔

جب وہ اٹھارہ برس کا ہوا تو براڈوے تھیٹر نے ایک ڈراما اسٹیج کیا جس کا نام Magic Man تھا۔ ڈیوڈ نے اس ڈرامے میں اداکاری کا چانس حاصل کرنے کے لیے جان توڑ کوشش کی بالآخر اس ڈرامے میں اسے چانس مل ہی گیا۔

اس نے اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے اور یہ ثابت کردیا کہ وہ اچھا اداکار بھی بن سکتا ہے لیکن اس کی منزل تو کچھ اور تھی۔

مشہور ناول نگار چارلس ڈکنز کا ایک بہت مشہور ناول ہے ڈیوڈ کوپر فیلڈ۔ براڈوے میں اداکاری کے بعد ڈیوڈ نے اپنا نام اسی ناول کے کردار ڈیوڈ کوپر فیلڈ کے نام پر رکھ لیا۔

ڈیوڈ کوپر بننے کے بعد اس کی شہرت کو پر لگ گئے۔ پھر اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

اس زمانے میں ABC ٹی وی کا ایک شو ہو رہا تھا۔ وہ شو جادوگری کے کمالات کے حوالے سے تھا۔ اس کے لیے کسی مناسب میزبان کے انتخاب کا مرحلہ تھا۔

ڈیوڈ کوپر فیلڈ اس انتخاب میں حصہ لینے پہنچ گیا۔

ABC والوں نے اس کا نام تو سن رکھا تھا لیکن انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ شخص اتنا باکمال بھی ہوسکتا ہے۔ ڈیوڈ کوپر نے انہیں اپنے کرتب اور جادوگری کے کمالات دکھا کر حیران کردیا۔

اس میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ صرف ماہر شعبدہ باز ہی نہیں تھا بلکہ اس کی شخصیت بھی بہت متاثر کن تھی۔ وہ ایک خوبصورت، ہینڈسم نوجوان تھا۔

کالج ہی کے زمانے سے نہ جانے کتنی لڑکیوں نے اسے اپنے خوابوں اور دھڑکنوں میں آباد کررکھا تھا۔ اس کی ہر ادا خوبصورت تھی۔

اس کا قد، اس کا چہرہ، کسرتی بدن، حسِ مزاح اور باتیں کرنے کا انداز، یہ سب ظاہر کررہے تھے کہ وہ ایک مکمل ہوسٹ ہے۔

اور شاید کسی بھی شو کو ایک ایسا میزبان میسر نہیں ہوسکتا۔ ABC والوں نے دیر لگائے بغیر اس سے معاہدہ کرلیا۔

اس کے بعد ڈیوڈ کی شہرت کا سفر شروع ہوگیا۔ لوگ اس کے شوز کے پاسز یا کارڈز لینے کے لیے دیوانے ہوئے رہتے تھے۔

ABC میں اس نے کئی سال کام کیا اور یہ ثابت کردیا کہ بلاشبہ وہ اس دور کا سب سے بڑا شعبدہ باز ہے۔

وہ جب اپنے شعبدے دکھاتا تو دیکھنے والوں کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا تھا۔

ABC سے پھر وہ CBS چلا گیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس کے مشہور ترین جادوئی کمالات اسی دور کے ہیں تو غلط نہیں ہوگا۔

اس کا یہ دور 1978ء سے 1998ء تک کا ہے۔

اس کے بعد بھی اس کا سفر جاری رہا۔ پھر اس نے اسٹیج اور ٹی وی کی دنیا سے باہر آکر شوز کیے اور پوری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

اسی دوران میں اسے ایک فلم کی پیشکش ہوئی جس کا نام Tarror Trainc تھا۔ اداکاری تو اس کے مزاج میں شامل تھی اسی لیے اس نے فوراً رضامندی ظاہر کردی اور فلم میں بھی کام کرنے لگا۔

اس سے پہلے کہ ہم ڈیوڈ کوپر فیلڈ کے ان شعبدوں کی بات کریں جن کی بنا پر اسے بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی ہے، یہ دیکھیں کہ آخر جادو اور شعبدہ بازی ہے کیا؟

یہ صرف نظر کا دھوکا ہے یا اس کی کوئی حقیقت بھی ہے؟

جادو یعنی سحر، فریفتہ کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے۔

شرع میں سحر حرام ہے۔ جس ساحر کے سحر میں کفر نہ ہو تو اسے توبہ کرنے کے لیے کہا جائے۔ اگر اس کے سحر میں کفر ہو تو قتل کردیا جائے۔

ایک زمانہ تھا کہ یورپ میں لوگوں کو جادوگر کہہ کر قتل کردیا جاتا تھا۔

نہ جانے کتنی عورتوں اور مردوں کو اس شبہے میں زندہ جلا دیا گیا۔

جادو یا شعبدہ بازی دراصل قوتِ خیال اور قوتِ واہمہ پر براہِ راست اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کا تعلق انسان کی نفسیات سے ہے۔

جادوگر حضرات اعصاب پر کنٹرول کرلیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ جو کچھ دکھانا چاہتے ہیں، وہ دکھائی دینے لگتا ہے۔ سحر کا اکثر وقوع اہلِ فسق وفساد سے ہوتا ہے۔

اگر ناپاکی کی حالت میں ہو تو اس کی تاثیر کہیں زیادہ ہوتی ہے۔

بہتر ہے کہ اسلامی تاریخ سے ایک واقعہ بیان کردیا جائے۔ اس کا تعلق سامری نامی جادوگر سے ہے۔

قوم بنی اسرائیل یا قبیلہ سامرہ سے ایک شخص تھا، نام اس کا موسیٰ بن ظفر تھا۔

صنعت زرگری میں بڑا استاد تھا اور مجسمے بنانے میں بے مثال۔

جس دن فرعون غرق ہوا، حضرت جبرائیلؑ ایک اسپ مادہ پر سوار ہوکر سمندر کے کنارے پھر رہے تھے اور جس جگہ گھوڑے کا سُم پڑتا وہ جگہ سبز ہوجاتی۔

یہ شخص حضرت جبرئیلؑ کو پہچانتا تھا۔ اس نے قدرے خاک زیرِ سُم لے کر اپنے پاس رکھ لی۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ کے کوہِ طور پر جانے کے بعد جب قوم بنی اسرائیل نے حضرت ہارونؑ سے کہا کہ ہم قبطیوں سے زیورات لائے تھے، ان کا کیا، کیا جائے؟

حضرت ہارونؑ نے فرمایا کہ ان کو جلا کر خاک میں دفن کردو۔

سامری نے کہا کہ اگر زیورات مجھے دے دو تو میں ایک ایسی چیز بنادوں، جس سے تم لوگ موسیٰؑ کی برابری کرنے لگو۔ بنی اسرائیل اس کے بہکاوے میں آگئے۔

سامری نے زیورات سے ایک بچھڑا بنایا اور وہ خاک اس کے منہ میں بھر دی۔ پھر اس میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ بولنے لگا۔

سامری اور اس کے حواری بولے کہ موسیٰؑ تلاشِ حق میں پھرتے ہیں جبکہ حق یہاں ہے۔

تو یہ ہے سامری اور اس کی جادوگری۔

ہندو مائتھالوجی میں جادو کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ ان کی داستانیں جادو کے تذکروں سے بھری ہوئی ہیں۔ یہ کہا

کیا آپ
لبوب مُقوّی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مُقوّی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مُقوّی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مُقوّی اعصاب ٹیلیفون کرکے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں فون صبح 10 بجے تا رات 9 بجے تک

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی یونانی دواخانہ)
ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061
0301-6690383

آپ صرف فون کریں۔ آپ تک
لبوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جائے کہ جادو ہندو مذہب کا ایک حصہ بن گیا ہے تو غلط نہیں ہوگا۔

دنیا کے کئی ملکوں میں جادو سکھانے کے باقاعدہ ادارے موجود ہیں۔

آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ جادو کی تاریخ کتنی پرانی ہے۔

ہوسکتا ہے کہ یہ بزدلوں اور مکاروں کا ہتھیار رہا ہو، جو اپنے دشمن کو زیر نہ کرپاتے ہوں، ان کے لیے جادو ایک سہارے کا کام دیتا ہو۔

لوگ ہمیشہ سے اس کے مخالف رہے ہیں' 1273ء میں تھامس نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ جس طرح رحمانی قوتیں ہوا کرتی ہیں، اسی طرح شیطانی قوتیں بھی ہیں اور یہ جادوگر دراصل شیطان کے چیلے ہی ہوتے ہیں۔

1500 عیسوی سے لے کر 1660 عیسوی تک یورپ میں جادوگر ہونے کے شبے میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ افراد کو یا تو پھانسی دے دی گئی تھی یا پھر زندہ جلا دیا گیا تھا۔

1591ء میں کنگ جیمس نے جادوگروں پر تشدد کا باقاعدہ حکم جاری کردیا تھا۔

دنیا کے ہر حصے میں جادو کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ افریقہ میں ووڈو کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ووڈو میں بہت قوت ہوا کرتی ہے۔

لیکن جادو اور شعبدہ گری میں فرق ہے۔

شعبدے باز انسانی نفسیات کو سمجھنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ وہ توہم کا کارخانہ تعمیر کرکے دکھا دیتے ہیں۔ جبکہ ہوتا کچھ بھی نہیں ہے۔

ہمارے ایک شاعر نے بھی کہا تھا کہ "یہ توہم کا کارخانہ ہے، یاں وہی ہے جو اعتبار کیا۔"

ڈیوڈ کوپر فیلڈ نے اپنی بے پناہ ذہانت سے کام لیتے ہوئے ایسے ایسے واہمے (illusions) تخلیق کیے، جنہوں نے دیکھنے اور سننے والوں کو حیرت میں ڈال دیا۔

اس کا کہنا ہے کہ انسان اپنے ذہن کی ٹیوننگ کرسکتا ہے۔ یہ ٹیوننگ اسے اس خاص فیلڈ میں آگے بڑھنے کے راستے دکھاتی رہتی ہے۔

اگر کوئی اسٹیج کا کامیڈین ہے تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے لطیفوں، اپنے مذاق اور اپنے جملوں کی طرف دھیان دیتا رہے۔ اس طرح اس کے ذہن میں نئے نئے خیالات آتے رہیں گے اور وہ کامیاب ہوتا چلا جائے گا۔ اس میں ایک اور عنصر بھی بہت اہم ہے۔

اور وہ ہے قوتِ ارادی۔ یہ سارا کھیل قوتِ ارادی کا ہے۔ یعنی اس یقین کے ساتھ اپنے شعبدے دکھانا کہ دیکھنے والوں کو مغالطے میں رکھا جاسکتا ہے۔

اور جب یہ یقین حاصل ہوجائے تو انسان سب کچھ دکھا سکتا ہے۔

ڈیوڈ نے براڈوے میں Dreams and Night mares کے عنوانات سے کئی شوز کیے۔ ان شوز نے پوری دنیا میں دھوم مچادی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ ان شوز کے ٹکٹس کئی ہفتوں پہلے فروخت ہوجایا کرتے۔

ڈیوڈ کوپر فیلڈ نے بے شمار اعزازات بھی حاصل کیے ہیں۔ تاریخ میں وہ پہلا شعبدہ باز ہے جس کی آمدنی ریکارڈ حیثیت رکھتی ہے۔

یعنی اس سے زیادہ آج تک کسی شعبدے باز نے اتنی دولت حاصل نہیں کی۔ اسی سے اندازہ لگالیں کہ 2005ء میں اس کی آمدنی 57 ملین ڈالرز تھی۔

ڈیوڈ فلاحی کاموں میں دل کھول کر حصہ لیا کرتا ہے۔

امریکا میں نہ جانے کتنے ادارے اس کے پیسوں سے چل رہے ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر بھی ڈیوڈ کے کاموں کو سراہا گیا ہے۔

لائبریری آف کانگریس نے اسے Living Legend Award کے اعزاز سے نوازا۔ فرانس کی حکومت نے اسے Charalier of Arts and Latters کا اعلیٰ ترین اعزاز دیا۔

اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگالیں کہ اسے 38 مرتبہ ایمی ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا جبکہ 21 مرتبہ اس نے یہ اعزاز حاصل بھی کرلیا۔

دنیا بھر میں کسی بھی Entartainer کے لیے یہ بہت بڑے اعزاز کی بات ہوتی ہے کہ اسے ایک ہی بار ایمی ایوارڈ مل جائے۔ اس طرح پوری دنیا میں اس کی ساکھ قائم ہوجاتی ہے۔

والٹ ڈزنی اسٹوڈیو کے گیٹ پر اس کے ہاتھوں کے نشانات محفوظ کردیے گئے ہیں۔

بزرگ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ کسبِ کمال کُن کہ عزیزِ جہاں شوی۔ تو ڈیوڈ نے اس درجے کا کمال حاصل کیا کہ عزیزِ جہاں بن گیا۔

گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں نہ جانے کتنے ریکارڈز اس کے پاس ہیں۔

مثال کے طور پر میجک آرٹی کرافٹ کا دنیا بھر میں سب سے بڑا ذاتی ذخیرہ اسی کے پاس ہے۔

کسی ایک Solo Entertainment کا دنیا بھر میں ٹکٹس کے فروخت کا ریکارڈ بھی اسی کا ہے۔

شعبدہ بازی میں سب سے زیادہ آمدنی اسی کی ہے۔

پوری دنیا میں شعبدہ بازی کا شوٹی وی پر دیکھنے والے اسی کے ہوتے ہیں۔ اب ایک انسان کو اور کیا چاہیے؟

ڈیوڈ کا یہ کہنا ہے کہ انسان اگر خدا اور فطرت کی قوتوں کو صحیح انداز میں استعمال کرے تو وہ سب کچھ کرسکتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ Quantum فزکس نے یہ ثابت کردیا ہے کہ انسان چاہے تو ہوا میں بھی اڑسکتا ہے اور اس نے ہواؤں میں اڑکر یہ ثابت بھی کردیا۔

ویسے تو اس شعبدہ باز کے بے شمار کارنامے ہیں لیکن کچھ ایسے ہیں کہ جنہوں نے پوری دنیا کو حیرت زدہ کرکے رکھ دیا تھا۔

جیسے ہوا میں اڑنے والا شعبدہ۔

لیزر کے ذریعے مناظر دکھانے والا۔

دیوار چین کے درمیان سے گزرکر دوسری طرف نکل جانے والا۔ (واضح رہے کہ دیوار چین کی موٹائی اتنی ہے کہ اس پر بہ یک وقت بارہ گھوڑے دوڑ سکتے ہیں)

اور مجسمۂ آزادی Statue of Liberty کو غائب کردینے والا شعبدہ۔

یہ سارے شعبدے بے مثال ہیں۔

اسٹیج پر وہ اپنے جسم کو کئی ٹکڑوں میں تقسیم کرکے بھی دکھا چکا ہے۔

ڈیوڈ کوپر کی شخصیت اور اس کے کارناموں کے حوالے سے کئی کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔ ایک مشہور کتاب کوپر فیلڈ بی ہائنڈ دی امیجینیشن ہے۔

اس نے خود بھی کئی کتابیں لکھی ہیں۔ اس کے لکھے ہوئے مضامین اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے، یوں ہی نہیں کرتا بلکہ برسوں کی ریاضت کے بعد ایک شعبدہ تخلیق کرتا ہے۔

ڈیوڈ کوپر کئی بار شعبدے دکھاتے ہوئے موت کے منہ میں بھی جاچکا ہے۔

وہ ایک دل ہلا دینے والا شعبدہ دکھایا کرتا ہے اور وہ ہے بارود سے اڑائی جانے والی عمارت سے باہر نکل آنا۔

امریکا میں جب کسی بلڈنگ کو گرانا ہوتا ہے تو اسے ڈائنامائٹ لگا کر اڑا دیتے ہیں لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ آس پاس کی عمارتوں کو نقصان نہ پہنچے۔

ڈیوڈ ایسی ہی عمارت میں اپنا یہ دل دہلا دینے والا شعبدہ دکھایا کرتا ہے جس کو دیکھنے کے لیے ہزاروں افراد عمارت سے فاصلے پر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ڈیوڈ کو زنجیروں سے باندھ کر لکڑی کے ایک بڑے صندوق میں بند کردیا جاتا ہے۔

پھر اس صندوق کو بھی زنجیروں اور رسیوں سے باندھ دیا جاتا ہے، اس کے بعد اس صندوق کو اس عمارت کے کسی کمرے میں رکھ دیتے ہیں۔

صرف ایک منٹ بیس سیکنڈ کا وقت ہوتا ہے۔ جی ہاں، صرف ایک منٹ بیس سیکنڈ۔

اس انتہائی قلیل وقت میں اسے نہ صرف اپنے آپ کو زنجیروں اور رسیوں سے آزاد کرانا ہوتا ہے بلکہ اس صندوق سے بھی باہر آنا ہوتا ہے، اس کے بعد دوڑتے ہوئے اس عمارت سے باہر نکل جانا۔

اگر اس میں ذرا بھی کوتاہی یا دیر ہوئی تو پھر موت یقینی ہے کیونکہ وہ پوری عمارت بھک سے اڑ جانے والی ہوتی ہے اور وہ شخص یہ تماشا دیکھتا ہے۔

لیکن ایسے ہی ایک کھیل میں موت اس کے بہت قریب آگئی تھی۔ اس سے اپنی زنجیریں نہیں کھل سکیں اور ایک منٹ بیس سیکنڈ ہوگئے۔

عمارت بارود سے اڑادی گئی، اس کی زندگی تھی کہ وہ اس حادثے کے بعد زندہ رہا لیکن بہت بری طرح زخمی ہوگیا تھا جس کے نتیجے میں اسے کئی ماہ تک وہیل چیئر پر رہنا پڑا تھا۔

اس کے ساتھ ایسا ہی ایک حادثہ رسی کاٹتے ہوئے ہوا تھا۔ تیز دھار چاقو نے اس کی ایک انگلی اڑادی تھی۔ اسے فوراً اسپتال لے جایا گیا جہاں ایک سرجری کے ذریعے اس کی انگلی دوبارہ لگائی گئی۔

اس قسم کے نہ جانے کتنے واقعات اس کے ساتھ ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر میں ان حادثات سے گھبرا جاتا تو ڈیوڈ کوپر فیلڈ نہیں بن پاتا۔

پوری دنیا میں فنِ شعبدہ بازی میں اس کی حیثیت ایک استاد کی سی ہے۔ اس کا کمال ہے کہ اس نے بہت سے شعبدے دکھا کر اور لوگوں کو حیرت زدہ کرنے کے بعد یہ راز بھی بتادیے کہ اس نے یہ شعبدے کس طرح کیے تھے۔ بلاشک ڈیوڈ آج کا سب سے بڑا شعبدہ باز ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سراب

راوی : شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط:52

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب — ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر آسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے تاکہ میں بھی اپنے بھائیوں کی طرح آرمی جوائن کرسکوں جبکہ میں آرمی میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ بابا ایک روایتی باپ تھے، سخت اور اولاد کو اپنی ملکیت سمجھنے والے۔ میرے انکار کو انہوں نے انا کا مسئلہ بنالیا۔ وہ بہت مشکل دور تھا۔ اس دور میں میرے لیے واحد اچھی یاد سویرا ہے جو میرے دل کا حصہ تھی لیکن اس سے پہلے کہ میں اس کے لیے ماں جی کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا وہ میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی اور میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ یہاں سے زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ تعلیم مکمل کرکے میں نے کاروبار شروع کیا۔ سفیر، مونا اور ندیم جیسے دوست ملے اور زندگی ایک ڈھب سے گزرنے لگی لیکن ایک روز مری سے واپس آتے ہوئے ایک معمولی سے حادثے نے میری زندگی کا رخ بدل دیا۔ نادر علی کا اپنے اوباش دوستوں سمیت ہم سے ٹکراؤ ہوگیا تھا پھر یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ دشمنی اور دربدری کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو دراز ہوتا چلا گیا۔ کچھ کم ظرف گھٹیا لوگوں نے مجھ سے یہ پُرسکون زندگی بھی چھین لی۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے لوگ میرے دشمن ہورہے تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جان نثار دوست بھی تھے۔ راجا عمر دراز جیسا ذہین اور بااثر میرا مہربان بن گیا تھا اور اس کے بعد ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا جس کی کڑیاں سرحد پار کرکے دور تک چلی گئی تھیں۔ میں قسمت کے ہاتھ میں کھلونا بن گیا اور قسمت مجھے کسی منہ زور سمندری لہر کی طرح اپنے دوش پر لیے پھرتی رہی۔ میں دوبارہ اپنے وطن لوٹا تو فتح خان سے ٹکراؤ ہوگیا۔ اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرونِ ملک کی طرف بڑھ رہا تھا کہ فتح خان نے دوبارہ مجھے گھیرنے کی کوشش کی۔ میں اپنے ساتھی بیتو کے ساتھ ایک دوست کے یہاں پہنچا تو وہاں فتح خان پہلے سے موجود تھا۔ اس نے مجھے بے ہوش کردیا۔ جب آنکھ کھلی تو میں اپنے آبائی گھر میں تھا۔ میری بھانجی شمی اپنے دو عیال جارہی تھی کہ اس کی کار پر فائرنگ ہوئی۔ فائرنگ سے اس کا منگیتر بری طرح زخمی ہوگیا۔ میں نے عبداللہ کے ساتھیوں کو تحقیق کی حفاظت کے لیے بلالیا تھا۔ انہیں رفیق بھائی کے ساتھ کردیا تھا کہ وہ گھر کی حفاظت بھی کرتے رہیں پھر میں جیپ لے کر نکل پڑا۔ میں اسلام آباد آ گیا۔ عبداللہ نے بتایا کہ شہلا رضوی کی گیلری سے کوئی کود رہا تھا جسے اندر والوں نے پکڑلیا۔ مجھے شک ہوا کہ وہ بیتو ہے۔ میں شہلا رضوی کے بنگلے میں داخل ہوگیا۔ بیتو وہاں موجود تھا۔ فتح خان کو بے ہوش کرکے میں ساتھ لے آیا۔ اسے اور بیتو کو عبداللہ کے حوالے کیا اور اسپتال کے لیے نکل پڑا۔ تحقیق کے کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ایک لمبے بالوں والا شخص تحقیق کے آکسیجن ماسک کو کھول رہا ہے۔ میں نے للکارا تو وہ کھڑکی سے کود کر بھاگا۔ اس کے پیچھے میں بھی کود گیا مگر وہ نہ ملا پھر میں اپنی کار میں بیٹھا ہی تھا کہ پیچھے سے گردن پر پستول کی نال آ لگی۔ میں نے مڑ کر دیکھا، وہ شخص تھا جس کے تعاقب میں، میں کھڑکی سے کودا تھا۔ وہ مجھے گرفتار کرکے مرشد کے پاس لے گیا۔ کئی دن کے بعد میں اس کی قید سے فرار ہوا۔ میرے ساتھ زرین نامی وہ مظلوم لڑکی بھی تھی جس کی نگرانی میں مجھے رکھا گیا تھا۔ راستے میں عبداللہ سے رابطہ کرکے گاڑی منگوائی اور راجا صاحب کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ زرین کا علاج کرایا پھر ایک روز ہم سب تحقیق کو اسپتال سے لانے پہنچے تاکہ اس کا علاج حکیم قاؤس سے کرائیں۔ جب اسے لے کر آرہے تھے تو راستے میں دشمنوں نے اسے اغوا کرلیا۔ اسے فتح خان کے عوض رہا کرایا۔ حکیم قاؤس اس کا علاج کرنے لگا۔ زرین نے فرمائش کردی کہ میں یہاں بندوبست کرکے خود کو قیدی محسوس کررہی ہوں۔ میں اسے لے کر سیر کے لیے نکلا تھا کہ بارش شروع ہوگئی، ہم نے راستہ بھٹک کر ایک ایسے علاقے میں چلے گئے جو مری وغیرہ کی طرف جاتا تھا۔ ہماری گاڑی بھی خراب ہوگئی۔ ایک ڈاکٹر نے آبادی تک پہنچانے کا وعدہ کرلیا۔ ہم اس کے ساتھ اس کے بنگلے پر پہنچے تو احساس ہوا کہ ہم قید ہوچکے ہیں۔ زرین کی طبیعت بھی خراب ہوگئی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ اس نے ہم پر ایک خطرناک وائرس کا تجربہ کیا ہے۔ زرین جانبر نہ ہوسکی۔ ڈاکٹر کی آواز مائیک سے آرہی تھی کہ اب تمہارا نمبر ہے۔ تبھی ڈاکٹر کی حیرت بھری آواز سنائی دی ''سر آپ!'' جواب میں کوئی بولا ''ہاں، میں ہوں۔'' آواز سنتے ہی میں چونک گیا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ایسا لگا جیسے زرین کی موت کے صدمے اور مرض نے میرے جسم و ذہن پر قبضہ کرلیا تھا اور میری سماعت متاثر ہونے لگی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے ڈیوڈ شا کی آواز سنی ہو۔ اس ڈیوڈ شا کی آواز جو میرے پیچھے پڑ گیا تھا اور جس نے انڈیا میں بھی مجھے قابو کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کام کے لیے خاص طور سے اس نے پاکستان سے فتح خان کو انڈیا بلوایا تھا اور اسے بدمعاشوں کی ایک پوری ٹیم ہائر کرکے دی تھی، اس کے باوجود وہ مجھے پکڑنے میں ناکام رہا تھا۔ لیکن اس کے بعد اچانک ہی خاموش ہوگیا تھا۔ ممکن ہے راجا عمر دراز سے اس کا ٹاکرا چل رہا ہو لیکن وہ مجھے اپنے آس پاس محسوس نہیں ہورہا تھا۔ اس لیے اچانک ہی غیر متوقع طور پر اس کی آواز سن کر مجھے اپنی سماعت پر شک ہوا تھا۔ کیا وہ ڈیوڈ شا ہی تھا؟

''سر کام جاری ہے۔'' ڈاکٹر کی مودبانہ آواز آئی۔ ''ان دونوں پر تجربہ کیا ہے۔ لڑکی مرچکی ہے۔ وقت دو دن، دو گھنٹے اور چالیس منٹ رہا ہے۔ البتہ مرد ابھی زندہ ہے۔''

میں سر جھکائے بیٹھا تھا اس لیے آنے والا میری صورت نہیں دیکھ پارہا تھا اس نے پوچھا۔ ''ہوا زہی؟''

اس بار کوئی شک نہیں رہا تھا۔ وہ ڈیوڈ شا ہی تھا، میں نے اس کی آواز پوری توجہ سے سنی تھی اور میرے دماغ نے تصدیق کی تھی آواز ڈیوڈ شا کی ہی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ ''اس سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے تم خود دیکھ سکتے ہو میں کون ہوں اور تمہاری یادداشت کمزور نہیں ہے تو

مجھے پہچان بھی سکتے ہو۔''

''شہباز؟'' ڈیوڈ شا کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''تم ... یہاں؟''

''آپ اسے جانتے ہیں سر؟'' مجھے ڈاکٹر کے لہجے میں گھبراہٹ محسوس ہوئی تھی۔

''ہاں میں اسے جانتا ہوں۔'' ڈیوڈ شا کا لہجہ شاک سے گزرنے کے بعد دوبارہ سرد ہوگیا تھا، میں نے اسے ہمیشہ اسی لہجے میں بات کرتے سنا تھا' اس کے انداز میں شاذ ہی جذبات کی رمق آتی تھی۔ ''کیا یہ بھی انفیکٹڈ ہے؟''

''یس سر' یہ اور لڑکی مجھے ساتھ ہی ملے تھے اور میں نے ان کو ایک ساتھ انجکشن دیا ہے۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

''کہاں ملے تھے؟''

''راستے میں ... میں اسلام آباد سے آرہا تھا۔''

''یہ طریقہ بہت رسکی ہے۔''

''میں جانتا ہوں سر لیکن موقع ملا تو میں نے فائدہ اٹھا لیا۔''

ڈیوڈ شا کے ذہن میں کیا تھا اس کا اندازہ مجھے کیا اس کے سامنے موجود ڈاکٹر توفیق کو بھی نہیں تھا۔ ڈیوڈ شا نے مجھ سے پوچھا۔ ''شہباز تم کیسا محسوس کررہے ہو؟''

''اگر تمہاری مراد اس مرض کی علامات سے ہے تو تم خود بھی دیکھ سکتے ہو میں اندر سے بہتر محسوس نہیں کررہا ہوں۔''

''اس کی قوتِ برداشت حیرت انگیز ہے سر، دو دن گزرنے کے بعد بھی اس میں علامات نمودار نہیں ہوئی ہیں۔''

''میرا خیال ہے علامات نمودار بھی نہیں ہوں گی۔'' ڈیوڈ شا بولا۔

''یہ ممکن نہیں ہے سر ... وائرس اس کے جسم میں ہے۔ دیر سے لیکن اس پر بھی اثر...''

''تم اسے نہیں جانتے ہو۔'' ڈیوڈ شا نے اس کی بات کاٹی۔ ''یہ بتاؤ اسے چیمبر سے نکالا جاسکتا ہے؟''

''ہاں اگر احتیاط کے ساتھ نکالا جائے۔'' ڈاکٹر نے ہچکچا کر کہا۔ ''لیکن سر اس کی کیا ضرورت...''

''تب اسے باہر نکالو اور اس کا معائنہ کرو۔''

ڈاکٹر توفیق پریشان ہوگیا تھا۔ ''کیا ایسا کرنا مناسب ہوگا سر! میرا مطلب ہے اٹ از ٹو ڈینجرس اینڈ رسکی۔''

''ہاں یہ میرا حکم ہے اگر یہ بچ سکتا ہے تو اسے ہر قیمت پر بچانا ہے۔''

اس بار ڈاکٹر توفیق کی الرٹ آواز آئی۔ ''یس سر' آئی ٹرائی مائی بیسٹ فار ہم۔''

میں پیچھے ہٹ کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا اور میری نظر زرین پر مرکوز تھی۔ وہ زمین پر سیدھی دراز تھی۔ اس کے خون آلود ہاتھ پاؤں پھیلے ہوئے تھے، اس نے خواب دیکھا تھا کہ ایک دشمن میری جان بچائے گا تو کیا اس کا خواب سچ ثابت ہونے والا تھا۔ وہ خود جان سے گزر گئی تھی اور مجھے زندگی کی نوید سنا گئی تھی۔ اس کے ہونٹ سرخ ہورہے تھے اور مجھے لگا جیسے اس وقت اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی آئی تھی جیسے کہہ رہی ہو۔ 'دیکھا میں نے کیا کہا تھا، تمہیں کچھ نہیں ہوگا تم بچ جاؤ گے۔ میں نے غلط نہیں کہا تھا کیا ڈیوڈ شا تمہارا دشمن نہیں ہے، میں نے گہری سانس لے کر دل میں کہا۔ 'تم نے ٹھیک کہا تھا' میں نے ذرا آگے ہوکر اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

اچانک مجھے لگا کہ میرا سر چکرا رہا ہے تب میں نے آس پاس دیکھا۔ فرش سے دیوار کے پاس سے بخارات اٹھ رہے تھے۔ چیمبر میں یقیناً کوئی گیس چھوڑی گئی تھی۔ اس کے اثر سے میرا سر چکرانے لگا تھا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تھی لیکن اٹھ نہ سکا اور پھر اسی جگہ بیٹھے بیٹھے بے ہوش ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر نے ڈیوڈ شا کی ہدایت پر عمل شروع کردیا تھا۔ مجھے یہاں سے نکالا جانا تھا اور اس کے لیے سب سے آسان طریقہ یہ تھا کہ مجھے بے ہوش کردیا جائے۔ اتنا تو وہ بھی سمجھتا تھا کہ ہوش میں ہونے کی صورت میں' میں اندر آنے والے کسی آدمی کو نہیں چھوڑوں گا، چاہے وہ کتنا ہی مسلح ہوکر کیوں نہ آئے۔ اس لیے چیمبر سے نکالنے کا سب سے آسان طریقہ یہی تھا کہ پہلے مجھے بے ہوش کردیا جائے۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک بیڈ پر اس طرح لیٹا ہوا تھا کہ تختوں سے گردن تک میرا جسم چار مضبوط ترین بیلٹوں سے بندھا ہوا تھا۔ بیڈ کے چاروں طرف پلاسٹک کی نیم شفاف چادریں لٹک رہی تھیں جیسی کہ قرنطینہ میں رکھنے والے مریضوں کے بیڈ کے گرد لگائی جاتی ہیں تاکہ مرض کا چھوت باہر نہ جانے پائے۔ میرے جسم سے کچھ آلات منسلک تھے جو مانیٹر پر میرے دل کی دھڑکن، نبض اور بلڈ پریشر بتارہے تھے میرا جسم اور ذہن سکون والی کیفیت میں تھا ایسا لگ رہا تھا کہ بے ہوشی کے دوران مجھے کوئی ایسی دوا دی گئی تھی جس سے مجھے جسم کا درد محسوس نہیں ہورہا تھا ورنہ بے ہوش ہونے سے پہلے مجھے درد محسوس ہورہا تھا۔

درد کے ساتھ ہی بھوک اور پیاس کا بھی کوئی احساس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں تھا۔ میں نے ہاتھ پاؤں ہلانے کی کوشش کی لیکن بندشیں بہت سخت اور مضبوط تھیں۔ اس بار ڈاکٹر نے پہلے کی طرح ڈھیلا بندوبست نہیں کیا اگرچہ وہ بندوبست بھی اچھا تھا لیکن عام آدمیوں کے لیے، میرے جیسے آدمی نے اس کا توڑ نکال لیا تھا۔ اس لیے اس نے پہلے سے زیادہ محفوظ انتظام کیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ کون سی جگہ تھی، وہی تہ خانہ تھا یا مجھے کہیں اور منتقل کر دیا گیا تھا یا سرے سے اس کوٹھی سے کہیں اور لے جایا گیا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ یہ جگہ اسی تہ خانے میں تھی۔

اگر میں یہاں تھا تو زرین بھی یہیں موجود تھی۔ اس کا خیال آتے ہی میرا دل بوجھل ہونے لگا تھا۔ میں نے اس کی موت کی حقیقت کو قبول کر لیا تھا لیکن ساتھ ہی میں اس کے لیے شدید دکھ محسوس کر رہا تھا۔ وہ ان چند بدنصیب ترین افراد میں سے تھی جن سے میں ملا تھا۔ زندگی میں اسے کوئی خوشی کوئی رشتہ نہیں ملا اور اب ایک ظالم نے اس سے اس کی زندگی بھی چھین لی تھی۔ پتا نہیں ان لوگوں نے اس کی لاش کا کیا کیا ہوگا؟ امکان تو یہی تھا کہ اسے کسی طرح سے ضائع کر دیا ہوگا کیونکہ اس سے دوسروں کو انفیکشن کا پورا خطرہ ہوتا ہے۔ اس وائرس کی تباہ کاری میں دیکھ چکا تھا۔ اس نے صرف دو دن میں زرین کی جان لے لی تھی۔ میرے جسم میں بھی وائرس موجود تھا۔ اگرچہ اس نے ابھی تک مجھے متاثر نہیں کیا تھا ورنہ میرے مساموں سے بھی خون نکلنا شروع ہو چکا ہوتا۔ میں نہیں جانتا کہ میں وائرس سے متاثر کیوں نہیں ہوا تھا۔ وہاں مکمل خاموشی تھی اور پلاسٹک کے پردوں کے باہر کہیں کوئی ہلکی روشنی والا انرجی سیور روشن تھا اور اس کی روشنی پردوں سے چھن کر اندر آ رہی تھی۔ ماحول پُراسرار سا نیم تاریک تھا۔ یہاں بھی وقت کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ میں کچھ دیر خاموشی سے لیٹا رہا... پھر میں نے بلند آواز سے کہا۔ ''یہاں کوئی ہے؟''

کوئی جواب نہیں ملا اس لیے میں نے سوال کو ایک ناقابلِ اشاعت لفظ کے ساتھ دہرایا۔ اس کا مثبت ردِعمل ہوا تھا اور دروازہ کھلنے کی آواز آئی، چند لمحے بعد ایک طرف سے پردہ ہٹا اور ایک شخص اندر آیا۔ آنے والے نے سر سے پاؤں تک مخصوص قسم کا سفید لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر ماسک اور آنکھوں والی جگہ شیشہ تھا۔ اس کی شکل نہیں پہچانی جا رہی تھی۔ لیکن جب وہ بولا تو ڈاکٹر توفیق ثابت ہوا تھا۔

''شہباز ملک کیسا محسوس کر رہے ہو؟''

''یہ تو تم بہتر جانتے ہوگے، ڈاکٹر تم ہو۔ میں اس وقت وہ سکون محسوس کر رہا ہوں جو کسی دوا سے پیدا ہوتا ہے اس لیے اصل حالت کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

ماسک کے پیچھے سے اس کی آواز پُرشور سانسوں میں دب رہی تھی، شاید یہ کسی قسم کا فلٹر تھا اور اس سے ہوا کھینچنا پڑتی تھی۔ شور اسی وجہ سے پیدا ہو رہا تھا۔ ''حیرت انگیز تم انفیکٹڈ نہیں ہوئے ہو حالانکہ تم کو بھی اسی مقدار میں انجکشن دیا تھا جتنا اس لڑکی کو دیا تھا۔''

اس کی بات سن کر مجھے کوئی خوشی یا ردِعمل محسوس نہیں ہوا تھا، میں اندر سے پُرسکون رہا تھا۔ ''تم نے بھی سنا ہوگا جب اس نے مجھے اپنا خواب سنایا تھا کہ میرا ایک دشمن مجھے بچائے گا؟''

''ہاں مجھے حیرت ہے۔ اس نے درست کہا تھا، اب میں تمہاری جان بچانے پر مجبور ہوں۔''

میں ہنسا۔ ''اول تو تم میری جان نہیں بچا رہے ہو کیونکہ میں وائرس سے متاثر نہیں ہوا ہوں، دوسرے میرے دشمن تم نہیں ہو۔ وہ دشمن ڈیوڈ شا ہے اور وہ مجھے وائرس سے نہیں اصل میں تم سے بچا رہا ہے کیونکہ اگر میں انفیکٹڈ نہ بھی ہوتا تو تم مجھے نہیں چھوڑتے اور کسی دوسرے طریقے سے مار دیتے۔''

''وہ تمہارے دشمن ہیں؟'' اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''تب انہوں نے تم کو بچانے کا حکم کیوں دیا ہے؟''

''یہ بات تو تم اس سے جا کر پوچھو۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے کیا تم ڈیوڈ شا کے لیے کام کرتے ہو؟''

''میں تمہیں اس بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔'' اس نے انکار کر دیا۔

''مجھے جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ میں جانتا ہوں ڈیوڈ شا جہاں بھی ہوتا ہے کمانڈر وہی ہوتا ہے۔ اس لیے یہ سیٹ اپ یقینی طور پر اس کے لیے کام کر رہا ہے۔''

''تم جو چاہے سمجھتے رہو۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور مڑ کر عقب میں موجود ٹرالی سے ایک سرنج اٹھائی۔ اس میں دوا پہلے سے موجود تھی۔ اس نے سرنج سے ہوا نکالی اور میرے بندھے بازو پر انگلیاں مار مار کر نس ابھارنے لگا۔ اس کے ہاتھوں پر بھی دستانے تھے۔ وہ مکمل حفاظتی بندوبست کے ساتھ آیا تھا۔

''یہ کیسا انجکشن ہے؟''

''یہ وائرس کا توڑ ہے، اسے ختم کرتا ہے۔''

''لیکن تم تو کہہ رہے ہو کہ میں انفیکٹڈ نہیں ہوں۔''

''وائرس تمہارے جسم میں موجود ہے، اس نے تمہیں متاثر نہیں کیا ہے لیکن کسی دوسرے کو لگ گیا تو وہ ضرور جان سے جائے گا اس لیے اسے ختم کرنا ضروری ہے۔ یہ انجکشن وائرس کو ختم کرنے کے لیے ہے۔'' اس نے کہا اور سوئی میری نس میں اتار دی۔ اس نے ایسپرٹ لگی روئی سے جگہ کو صاف کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ انجکشن دینے کے بعد اس نے کچھ نہیں کیا اور خالی سرنج پلٹ کر ٹرالی پر رکھ دی۔ پھر گھوم کر میری طرف جھکا۔ ''تم حیرت انگیز آدمی ہو، اگر میرے بس میں ہوتا تو میں تمہیں قید میں رکھ کر اس وائرس کے مزید تجربات کرتا۔''

''لیکن یہ تمہارے بس میں نہیں ہے۔'' میں نے استہزائیہ انداز میں جواب دیا۔ ''ویسے تمہیں یاد ہے میں نے تم سے ایک وعدہ کیا تھا۔''

''مجھے یاد ہے لیکن مجھے امید نہیں ہے تم اسے پورا کر پاؤ گے۔'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''یہ امید تمہیں کیوں ہے؟'' میں نے غور کیا۔ ''تمہارے خیال میں اب بھی امکان ہے کہ میں اس وائرس کا شکار بن جاؤں؟''

''امکانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا.....'' وہ مسکرایا۔ ''ہاں اس کا امکان ہے کہ تم پر توڑ کام نہ کرے اور وائرس اگر ختم نہیں ہوا تو بھی نہ کبھی تم پر اثر کرے گا۔''

''لیکن اس صورت میں تم اپنے آقا کو کیا جواب دو گے جس نے مجھے بہرصورت بچانے کا حکم دیا ہے۔''

''میں خدا تو نہیں ہوں جو کسی کو مارنا یا بچانا میرے اختیار میں ہو۔'' وہ عیاری سے بولا۔ ''اگر میری کوشش کے باوجود تم نہ بچ سکے تو میرا قصور نہیں ہوگا۔''

''لیکن جب میں اور زرین ڈیتھ چیمبر میں تھے تب تو تم سمجھ رہے تھے کہ ہماری زندگی اور موت تمہارے اختیار میں ہے؟''

''اس وقت تھی اب نہیں ہے۔'' اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔ وہ جاننے کے لیے مرا تھا کہ میں نے اس سے سوال کیا۔

''کیا ایک انجکشن سے یہ وائرس میرے جسم سے ختم ہو جائے گا؟''

''نہیں اس کے لیے تمہیں مزید چار انجکشن اور دینا ہوں گے۔ ایک تمہیں بے ہوشی کے دوران دیا جا چکا ہے۔ ممکن ہے اس دوران میں تمہاری طبیعت خراب ہو لیکن تمہیں برداشت کرنا ہوگا کیونکہ تکلیف سے بچانے کے لیے تمہیں کوئی پین کلر نہیں دیا جا سکتا۔''

''لیکن ابھی تو مجھے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہو رہی ہے۔''

''تم اسی دوا کے زیر اثر ہو جو تمہیں چیمبر میں اور اس سے پہلے بلٹ کے ذریعے دی گئی تھی۔'' اس نے کسی قدر فخریہ انداز میں کہا۔ ''یہ خاص دوا میری اپنی ایجاد ہے۔ اسے کسی بھی طرح انسانی جسم میں داخل کیا جا سکتا ہے۔ ٹھوس صورت میں منہ سے کھلائی جا سکتی ہے۔ مائع صورت میں انجیکٹ کی جا سکتی ہے اور گیس کی صورت میں دی جا سکتی ہے اور اتفاق سے تمہیں تینوں صورتوں میں دی جا چکی ہے۔''

مجھے زرین کا خیال آ رہا تھا۔ ''تم نے میری ساتھی کی لاش کے ساتھ کیا کیا؟''

''جلا دیا۔'' اس نے نارمل انداز میں بتایا۔ ''اس قسم کی انفیکٹڈ ڈیڈ باڈیز کو جلا دیا جاتا ہے۔''

مجھے یہی خدشہ تھا۔ اس سے کچھ کہنا بے کار تھا کیونکہ وہ انسانی حس سے عاری شخص تھا وہ کسی کے جذبات کو کیا سمجھتا۔ وہ پردے سے باہر نکل رہا تھا کہ میں نے اسے روکا۔ ''ایک بات اور بتاتے جاؤ... ڈیوڈ شا سے ملاقات ہو سکتی ہے یا نہیں؟''

''میں ان سے کہہ دیتا ہوں۔ اب ان کی مرضی کہ وہ تم سے ملتے ہیں یا نہیں۔'' اس نے جاتے ہوئے کہا۔ وہ ٹرالی سمیت کمرے سے چلا گیا تھا۔ یہ کوئی ایسا کمرا تھا جسے شاید ائر ٹائٹ طریقے سے بند کیا گیا ہوگا تاکہ میرے جسم میں موجود ایبولا وائرس کسی صورت باہر نہ نکل سکے۔ ڈاکٹر توفیق نے کہا تھا کہ وائرس کے توڑ والے انجکشن سے مجھے تکلیف ہوگی۔ پھر مجھے اس کے لہجے سے شرارت کی بو آ رہی تھی۔ شاید میرے معاملے میں وہ ڈیوڈ شا کو بھی بے وقوف بنا رہا تھا اس کا مجھے چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا کیونکہ ایک بار میں اس کے قبضے سے نکل جاتا تو اس کی خیر نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا میں اسے کسی صورت نہیں بخشوں گا۔ فی الحال تو میں بے بسی سے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اپنی مرضی سے اپنا ہاتھ بھی نہیں ہلا سکتا تھا۔ مگر مجھے خدا پر بھروسا تھا میں فی الحال بے بس تھا آنے والا وقت میرا ہوگا اور تب میں اس وقت کا ازالہ کر سکوں گا۔ مجھے صبر و تحمل سے اس وقت کا انتظار کرنا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کچھ دیر بعد مجھے جسم میں بے چینی محسوس ہوئی۔ سکون والی کیفیت ختم ہو رہی تھی۔ شاید انجکشن کا اثر ہو رہا تھا۔ میں اس سے پوچھنا بھول گیا تھا کہ انجکشن کتنی دیر بعد لگے گا۔ کیونکہ اس کا کہنا تھا کہ بے ہوشی کے دوران میں ہی مجھے ایک انجکشن دیا جا چکا تھا اور ہوش میں آنے کے بعد دوسرا انجکشن دیا گیا تھا۔ شاید ہر چھ گھنٹے بعد انجکشن دیا جانا تھا۔ اس صورت میں مکمل کورس تیس گھنٹے میں ختم ہو جاتا جس میں سے شاید چودہ گھنٹے گزر چکے تھے۔ یعنی مزید سولہ گھنٹے بعد اس بات کا پتا چل جاتا کہ میرے جسم سے وائرس ختم ہوا ہے یا نہیں، اگر ڈاکٹر مجھے اس کے توڑ کا انجکشن ہی دے رہا تھا تو۔ کیونکہ اس سے کچھ بعید نہیں تھا۔ وہ اپنی جان بچانے کے لیے مجھے توڑ کے بجائے کچھ اور دے رہا ہو۔ ڈیوڈ شاہ بھلے ہی باس ہو لیکن وہ ان معاملات کا ماہر تو نہیں تھا.... دوسرے معاملات کی طرح میں اس معاملے میں بھی بے بس تھا۔ یعنی ڈاکٹر توفیق پر منحصر تھا وہ میرے ساتھ کچھ بھی کرنے کے لیے آزاد تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس بے چینی میں اضافہ ہوتا چلا گیا تھا اور ایسی ہی کیفیت محسوس ہونے لگی تھی جیسی ہوش میں آنے کے بعد ڈیتھ چیمبر میں محسوس ہوئی تھی۔ کیا ڈاکٹر نے مجھے دوبارہ وائرس لگایا تھا بجائے اس کا توڑ لگانے کے۔ جسم میں بھنچاؤ ہوا درد ہو رہا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی جسم کھینچ رہا ہو۔ کبھی کبھی موسم سرما کے آغاز میں جب موسم بدلتا تھا تو مجھے ہلکا سا بخار ہو جاتا تھا اور اس میں کچھ ایسی ہی کیفیت محسوس ہوتی تھی۔ جب حویلی میں تھا تو موڈ بہت خراب ہو جاتا تھا اور اس وقت میں کمرے میں پڑا رہتا تھا لیکن جب اسلام آباد میں اکیلا ہو گیا تو ایسے وقت میں کہیں ڈرائیو پر نکل جاتا۔ ایک بار مونا کے گھر چلا گیا اور اس نے مجھ سے کہا کہ آیندہ جب بھی مجھے ایسا محسوس ہو تو میں اس کے گھر چلا جایا کروں وہ میری دیکھ بھال کرے گی۔ لیکن میں نے اس کی پیش کش سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا۔ نہ جانے کیوں مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ شاید اس لیے کہ مونا اکیلی رہتی تھی اور میں تعلق میں رکھ رکھاؤ کا قائل ہوں۔ اس لیے میرے دل میں اس کے لیے کتنے ہی برادرانہ جذبات صحیح میں نے کبھی اس کے گھر بلا وجہ جانے یا وہاں دیر تک رکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ حالانکہ وہ پاگل لڑکی مجھے بالکل بھائیوں کی طرح چاہتی تھی۔ پھر بھی میرا اور اس کا خون کا رشتہ نہیں ہے اور جہاں تعلق منہ بولے رشتوں کا ہو وہاں آدمی کو رکھ رکھاؤ کا خیال رکھنا چاہیے ورنہ اس سے بہت سی خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

جسم میں بے چینی سے مجھے اپنا موسمی بخار اور اس سے مونا یاد آ گئی۔ پھر سب یاد آنے لگے۔ سفیر، وسیم، سادھنا اور بیتو یاد آئے۔ پھر وہ یاد آئی جس کی یاد دل میں ایسے رہتی تھی جیسے جسم میں روح رہتی ہے۔ میں اتنے دن سے غائب تھا نہ جانے ان سب پر کیا گزر رہی ہو گی۔ اگر سفیر اور وسیم آ گئے تھے تو وہ پاگلوں کی طرح مجھے تلاش کر رہے ہوں گے۔ بیتو تو سچ مچ پاگل ہو گیا ہو گا کیونکہ اس کا کہنا تھا اب اس دنیا میں اگر اس کا کوئی تھا تو وہ میں تھا۔ عبداللہ کے خلوص پر مجھے کوئی شبہ نہیں تھا وہ میرے لیے میرے ساتھیوں سے کم پریشان نہیں ہو گا لیکن وہ ایک ملازم تھا اور اس کے کندھے پر بہت ساری ذمے داریوں کا بوجھ تھا اسے میری فکر کے ساتھ ان سے بھی عہدہ برآ ہونا تھا۔

جب آدمی تنہا ہو اور کچھ کرنے کے لائق نہ ہو تو اپنے پیاروں کے بارے میں سوچنے سے بہتر کوئی کام وہ نہیں کر سکتا.... کیونکہ اس کے مقدر میں جو لکھا جا چکا ہے وہ تو ہونا ہوتا ہے۔ تقدیر کے آگے آدمی بے بس ہوتا ہے، اگر اس قید خانے میں میری موت لکھی تھی تو اسے آنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ اس لیے اس کے یا آنے والے وقت کے بارے میں سوچنا بے کار تھا۔ میں سوچتا رہا اور سب کو یاد کرتا رہا۔ اس یقین کے ساتھ کہ وہ بھی مجھے یاد کر رہے ہوں گے۔ میں اس وقت چونکا جب دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ مجھے حیرت ہوئی کیا تیسرے انجکشن کا وقت ہو گیا تھا؟ ابھی زیادہ وقت تو نہیں گزرا تھا۔ کم سے کم مجھے تو ایسا ہی لگ رہا تھا کہ ڈاکٹر کو گئے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی ہے۔ وہ ٹرالی سمیت آیا تھا یعنی انجکشن کا وقت ہو گیا تھا۔ اس نے پردہ ہٹا کر اندر جھانکا۔

''کیا حال ہیں؟''

''میرے جسم میں درد اور بے چینی ہو رہی ہے۔ کہیں تم نے پھر تو مجھے وائرس والا انجکشن نہیں لگا دیا؟''

''میرے بس میں ہوتا تو یہی کرتا۔'' اس نے میری طرف جھک کر آہستہ سے کہا۔ ''لیکن باس کا حکم ہے اس لیے مجبور ہوں۔''

''تم اپنے باس کو بے وقوف بھی تو بنا سکتے ہو۔ ڈیوڈ شاہ ان معاملات کا ماہر نہیں ہے۔ اگر تم اسے بے خبری میں رکھ کر مجھے توڑ کے بجائے کوئی اور انجکشن دے دو تو اسے کیا پتا چلے

گا؟''

اس نے سرنج تیار کی ہوئی تھی۔ ''تم نہیں جانتے، بھلے ہی باس ماہر نہیں لیکن اسے ان چیزوں کے بارے میں بہت زیادہ معلوم ہے۔ کوئی بھی اسے بے وقوف سمجھنے یا بنانے کی جرات نہیں کر سکتا۔''

میرے ذہن میں وائرس کے بارے میں ایک سوال دیر سے کلبلا رہا تھا موقع ملنے پر میں نے ڈاکٹر سے پوچھ لیا۔ ''ایبولا وائرس کس طرح پھیلتا ہے؟''

''یہ انسان سے انسان کو لگتا ہے۔ یعنی کوئی انفیکٹ شخص کے پاس جائے اور اسے چھوئے تب لگ سکتا ہے۔ مریض نے جس چیز کو چھوا ہو اس سے بھی لگ جاتا ہے۔ اس طرح انتقالِ خون سے بھی لگتا ہے۔''

''انسانی جسم میں یہ کہاں کہاں ہوتا ہے؟''

''سارے جسم میں ہوتا ہے۔ خون میں، تھوک میں اور حد یہ کہ جسم کی سطح پر بھی پایا جاتا ہے۔ کسی کو چھونے سے بھی لگ جاتا ہے۔'' اس نے کہا اور سرنج میری نس میں داخل کر دی۔ سرنج خالی کر کے اس نے واپس ٹرے میں رکھی۔ ''لیکن اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ تم سے یہ وائرس مجھے لگ سکتا ہے تو تم سو فیصد غلط سوچ رہے ہو کیونکہ اس لباس میں میں مکمل محفوظ ہوں اور یہاں سے باہر جانے کے بعد اوزون اسپرے سے اس لباس کو صاف کیا جاتا ہے۔ یعنی تم سے کسی کو انفیکشن لگنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔''

''اس وضاحت کا شکریہ ویسے مجھے کوئی خیال نہیں آیا کہ میں تمہیں انفیکشن لگا سکتا ہوں۔ یہ تمہارے اپنے دل کا چور ہے۔''

اس بار وہ زیادہ دیر نہیں رکا تھا اور میں نے بھی اس سے مزید سوال نہیں کیا تھا۔ وہ واپس چلا گیا۔ اب میرا جسم ایک شدید قسم کے بے چین کرنے والے درد کا شکار ہو گیا تھا۔ شاید یہ وائرس کے توڑ کا اثر تھا جو میرے جسم پر مرتب ہو رہا تھا۔ مجھے حیرت تھی جب اس وائرس کا توڑ تھا تو اسے مریضوں پر کیوں استعمال نہیں کیا جا رہا تھا۔ میں نے ایبولا وائرس کے بارے میں سنا ہے کہ عام طور سے اس کا علم اس وقت ہوتا ہے جب آدمی وائرس کا شکار ہو چکا ہوتا ہے۔ لیکن اس کا کوئی نہ کوئی ٹیسٹ بھی تو ہوتا ہو گا جس سے پتا چل جاتا ہو گا کہ آدمی کو وائرس لگ گیا ہے لیکن ابھی متحرک نہیں ہوا ہے۔ اس وقت اس توڑ سے علاج کیا جا سکتا ہے جیسا کہ ڈاکٹر توفیق اب مجھے انجکشن دے رہا تھا، اسی طرح کسی اور مریض کو بھی دیے جا سکتے تھے لیکن میں نے ایسی کوئی بات نہیں سنی تھی کہ ایبولا وائرس کا کوئی توڑ ایجاد ہو گیا ہے، ایڈز کے وائرس کی طرح اس سے بھی صرف احتیاط سے بچاؤ ممکن تھا۔ ایک بار یہ جسم میں داخل ہو گیا تو اس کا کوئی علاج نہیں۔ اگر قسمت میں مزید زندہ رہنا ہے تو مریض بچ جائے گا ورنہ اناللہ۔

درد اب جسم ٹوٹنے اور تڑخنے کی حد تک پہنچ گیا تھا اور میں ہلنا چاہتا تھا لیکن اتنی مضبوطی سے بندھا تھا کہ ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ کچھ دیر تو میں برداشت کرتا رہا پھر میں نے چلا کر کہا۔ ''ڈاکٹر حرامزادے مجھے کھولو... میرا جسم ٹوٹ رہا ہے۔''

ظاہر ہے کوئی جواب نہیں آیا اور میں نے بلند آواز سے گالیاں دینا شروع کر دیں۔ میں چلا رہا تھا اور سرنج رہا تھا کیونکہ تکلیف میری برداشت سے باہر ہوتی جا رہی تھی، مگر میری اس چیخ و پکار کا ڈاکٹر یا کسی اور پر کوئی اثر نہیں تھا۔ ان کے پاس میری اس تکلیف کا کوئی علاج نہیں تھا یا پھر ایک دشمن کی حیثیت سے وہ میری اس کیفیت سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ مجھے دونوں باتیں درست لگ رہی تھیں۔ مسلسل چیخنے سے میرا گلا بیٹھ گیا تھا اور اب بیٹھی بیٹھی سی بے سُری آواز نکل رہی تھی۔ پھر میں نے نڈھال ہو کر سر ڈال دیا تھا۔ ویسے تو پہلے بھی سر ہلانے کے قابل نہیں تھا۔ تکلیف تھی کہ اس کی شدت بڑھتی جا رہی تھی لیکن مجھ میں اب چیخنے کی سکت بھی باقی نہیں رہی تھی۔ جسم کے رگ پٹھے بالکل یوں کھنچ رہے تھے جیسے میں ہیروئن کا عادی ہوں اور مجھے بہت دیر سے نشہ نہ ملا ہو۔ میں یوں گہرے گہرے سانس لے رہا تھا جیسے ہوا میں آکسیجن کی کمی ہو گئی ہو اور مجھے ہوا سے آکسیجن کشید کرنے کے لیے اتنی جدوجہد کرنا پڑ رہی تھی۔

جیسے تکلیف بڑھی تھی اسی طرح اس میں رفتہ رفتہ کمی ہونے لگی تھی اور نہ جانے کس وقت جا کر اس میں اتنی کمی آ گئی کہ اب میں ذرا سکون میں تھا۔ شاید انجکشن کا اثر کم ہو گیا تھا اور اس خیال سے میں کانپ اٹھا تھا کہ کچھ دیر میں مجھے ایک اور انجکشن دیا جائے گا اور مجھے پھر اسی اذیت سے گزرنا پڑے گا۔ میں نے پہلے کبھی ایسی تکلیف برداشت نہیں کی تھی۔ جب تکلیف کم ہوئی تو مجھے اندازہ ہوا کہ میرا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا تھا اور میرا لباس اس سے بھیگا ہوا تھا۔ پسینا خارج ہونے سے جسم میں پانی کی کمی ہوئی تو گلا خشک ہو گیا اور وہ ویسے ہی چیخنے سے بیٹھا ہوا تھا اب خشک ہو کر زیادہ تکلیف دے رہا تھا۔ ان لوگوں نے گزشتہ تین چار دن سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے کھانے پینے کے لیے کچھ نہیں دیا تھا اور اس کی جگہ انجکشنوں اور شاید ڈرپ سے کام چلا رہے تھے۔ لیکن اب مجھے شدت سے پانی کی خواہش محسوس ہو رہی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ مجھے پانی ملنے کی کوئی امید نہیں تھی۔

اگرچہ یہاں سردی کی شدت نہیں تھی لیکن کمرے کو گرم بھی نہیں کہا جا سکتا تھا، ایک قسم کی خنکی تھی اور اس خنکی نے میرا جسم رفتہ رفتہ خشک کر دیا لیکن گلے کی خشکی برقرار رہی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ اس کیفیت میں، میں نے کئی گھنٹے گزار دیے تھے اور اگلے انجکشن کا وقت قریب آ گیا تھا۔ میرا اندازہ درست نکلا جب کچھ دیر بعد دروازہ ایک بار پھر کھلا تھا اور ڈاکٹر ٹرالی سمیت اندر آیا۔ اس نے پردہ ہٹایا اور اندر جھانک کر خوش مزاجی سے بولا۔ ''کیا حال ہیں دوست؟''

جواب میں، میں نے اسے وہ سب سنایا جو میں سنا سکتا تھا۔ حالانکہ میری آواز بیٹھی ہوئی تھی اور مجھ سے ٹھیک سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا لیکن میں نے دل کی بھڑاس نکال کر دم لیا تھا۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا تھا۔ پھر اس نے ٹرالی سے وہی بڑی سی سرنج اٹھائی اس میں طاقت کا انجکشن موجود تھا۔ اس نے وہ میرے بازو میں گھونپ دیا۔ یہ بہت سخت انجکشن تھا لیکن اس کی سختی اس تکلیف کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی جو کچھ دیر پہلے میں نے برداشت کی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اب وہ وہی انجکشن میرے جسم میں انجیکٹ کرے گا اور مجھے پھر اسی اذیت سے گزرنا پڑے گا۔

''مجھے انجکشن مت لگاؤ۔'' میں نے کسمسا کر کہا۔

''یہ ضروری ہے ورنہ وائرس ختم نہیں ہوگا۔'' اس کے لہجے میں ہمدردی بلکہ خباثت تھی۔

''بکواس مت کرو، تم اس طرح مجھے اذیت دے رہے ہو۔''

اس نے میری بات ان سنی کر دی اور خاموشی سے میری نس تلاش کرنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ وائرس سے بچنے کے لیے یہ انجکشن ضروری تھا اس کے باوجود میں انجکشن سے بچنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر مجھے جکڑنے والی بیلٹ اتنی سخت تھی کہ میں ہل بھی نہیں سکتا تھا اس لیے مزاحمت بیکار گئی اور اس نے بہ آسانی انجکشن میری نس میں لگا دیا۔ اب مجھے تکلیف برداشت کرنا ہی تھی۔ وہ مسکرایا۔ ''مجبوری ہے دوست۔''

میں نے اس کی مجبوری کو بھی سنا ئیں اور بولا۔ ''ذلیل آدمی تم مجھے پانی تو دے سکتے ہو؟''

''شاید میں دے دیتا لیکن تمہاری اس بدزبانی کی سزا یہ ہے کہ تمہارا پانی بند ہے۔ لیکن فکر مت کرو تم مرو گے نہیں البتہ پانی کی کمی سے اس انجکشن کی تکلیف یقیناً بڑھ جائے گی۔''

یہ سن کر میں لرز اٹھا تھا۔ ''ڈاکٹر... میری بات سنو'' میں نے جو کہا وہ غصے میں کہا۔''

''ہاں ورنہ تمہارا ایسا کہنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔'' اس نے طنز کیا۔ ''ٹھیک ہے میں مان لیتا ہوں کہ تم نے غصے میں کہا ہے لیکن کم سے کم اس انجکشن کی تکلیف تمہیں ایسے ہی برداشت کرنا ہوگی اور اگلی بار تمہارا رویہ بہتر رہا تو میں تمہیں پانی بھی دوں گا۔''

وہ بات مکمل کرتے ہی وہاں سے چلا گیا تھا اور میں اسے گالیاں دیتا رہ گیا۔ اس بار تکلیف کا آغاز تیزی سے ہوا تھا اور شاید انجکشن لگنے کے ایک گھنٹے کے اندر ہی مجھے تکلیف ہونے لگی تھی۔ ایک بار پھر میرا جسم اینٹھ رہا تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے ریشہ ریشہ الگ ہو جائے گا۔ جب جسم اینٹھتا تو لگتا کہ یا تو بیلٹ ٹوٹ جائے گی یا میری کھال پھٹ جائے گی۔ لیکن دونوں میں سے کوئی کام نہیں ہوا تھا۔ اس بار ایک اچھی بات ہوئی کہ تکلیف نے میرا دماغ ماؤف کر دیا تھا اور کچھ دیر کے لیے میں تکلیف سے غافل ہو گیا تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اس کی طرف سے مکمل غافل ہوا تھا بلکہ اس کا احساس باقی تھا۔ خاص طور پر جب اندر سے شدید اینٹھن ہوتی تو میں ایک دو لمحے کے لیے غفلت سے نکل آتا تھا اور یہ ایک دو لمحے ہی قیامت بن جاتے تھے۔

جب مجھے مکمل ہوش آیا تو اس بار بھی جسم پسینے میں شرابور تھا اور حلق میں کانٹے سے اگ آئے تھے۔ پیاس کی شدت ایسی تھی کہ اب تکلیف اس کے مقابلے میں کم ہو گئی تھی۔ بلکہ تکلیف سچ مچ کم ہو گئی تھی۔ شاید انجکشن کا اثر کم ہو رہا تھا۔ میں سانس لینے کی کوشش کر رہا تھا کیونکہ مجھے جتنی آکسیجن کی ضرورت تھی میرے پھیپھڑے اتنی آکسیجن ہوا سے کشید نہیں کر پا رہے تھے۔ رفتہ رفتہ میرا جسم ٹھنڈا پڑنے لگا۔ کمرے کی خنکی نے پسینا خشک کر دیا تھا لیکن پیاس کی شدت مزید بڑھ گئی تھی۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا میرے جسم میں پانی کم ہوتا جا رہا تھا اور شاید ڈی ہائیڈریشن کا آغاز ہو گیا تھا۔ نہ جانے کتنا وقت گزر گیا تھا لیکن کم ہوتی تکلیف بتا رہی تھی کہ انجکشن کا اثر ختم ہو رہا ہے اور پانچویں انجکشن کا وقت قریب آ رہا ہے۔

اس خیال سے میرا رُواں رُواں لرزنے لگا تھا اور اب مجھ میں ڈاکٹر کو گالیاں دینے کی سکت بھی نہیں تھی۔ اس لیے دل ہی دل میں ڈیوڈ شا کو سنا رہا تھا، اگر اسے مجھ کو بچانا تھا تو اس جلاد ڈاکٹر کے حوالے کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن یہ اس کی مجبوری تھی کیونکہ وائرس کا توڑ ڈاکٹر ہی کر سکتا تھا۔ میری سانس بھی اب معمول پر آتی جا رہی تھی اور مجھے ڈاکٹر کا انتظار تھا۔ تکلیف میں کمی ہوئی تھی لیکن کبھی کبھی جسم میں کھنچاؤ ہوتا تھا۔ اس وقت جھٹکا سا لگتا تھا، ایسا لگتا تھا کہ درد کا عفریت اندر چھپا بیٹھا تھا اور وہ جھٹکا دے کر مجھے یاد دلاتا تھا کہ وہ گیا نہیں بلکہ اندر موجود ہے اور نیا انجکشن لگنے کے بعد وہ نئے سرے سے مجھے چھٹی کا دودھ یاد دلائے گا۔

جب ڈاکٹر ٹرالی سمیت اندر آیا تو میرے جسم کو جھٹکے لگ رہے تھے۔ اس نے پردہ ہٹا کر مجھے دیکھا۔ پھر تیزی سے اندر آیا۔ اس نے میری کیفیت جاننے کے لیے مانیٹر کی طرف دیکھا۔ جس پر دل اور نبض کی کیفیت نارمل تھی۔ ''کیا ہو رہا ہے تمہیں؟'' اس نے جھک کر پوچھا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ درحقیقت مجھ میں جواب دینے کی ہمت ہی نہیں تھی۔ اس نے تشویش سے میری طرف دیکھا اور اگلا انجکشن لگانے کی تیاری کرنے لگا۔ اس نے ٹرالی سے سرنج اٹھائی اور میرے بازو پر نس ابھارنے لگا۔ اس بار پانی کی کمی کی وجہ سے اسے دشواری پیش آئی تھی ..... پانی کی کمی سے نسیں دب جاتی ہیں اور آسانی سے نہیں ملتی ہیں۔ لیکن اس نے انجکشن لگا دیا، اس کے بعد اس نے ٹرالی سے ایک بوتل اٹھائی اور اس نے سائفن آگے کیا تو میرا منہ بے اختیار کھل گیا تھا۔ اس نے سائفن سے میرے منہ میں پانی کی پھواریں مارنی شروع کر دیں۔ ٹھنڈے پانی کا ذائقہ میرے منہ میں آیا تو میں جیسے پھر سے جی اٹھا تھا۔ لیکن اس نے کوئی آدھا پون گلاس پانی دینے کے بعد بوتل واپس کھینچ لی۔

''بس اتنا کافی ہے ورنہ یورین کا مسئلہ ہو جائے گا اور فی الحال تم کو کھولنا ممکن نہیں ہے۔''

''تم اس کی فکر مت کرو مجھے پانی دو۔'' میں نے پہلی بار کچھ کہا۔

''سوری۔'' اس نے انکار میں سر ہلایا۔

''پانی دو۔'' میں نے پھٹی پھٹی آواز میں کہا۔ ''مجھے کچھ ہو رہا ہے... کمینے پانی دے...''

اچانک میرے جسم کو جھٹکے لگنے لگے اور میرا سر خود بہ خود اوپر اٹھنے لگا لیکن میرے گلے پر بھی بیلٹ بندھی تھی اور اس بیلٹ نے میرا سر مزید اوپر اٹھنے سے روک دیا تھا۔ اس کے باوجود میرا جسم اٹھنے کے لیے زور لگا رہا تھا اور نتیجے میں بیلٹ میرے لیے پھندا بن گئی تھی اور میری سانس رکنے لگی تھی۔ ڈاکٹر نے اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھ کر اسے واپس تکیے پر دبانے کی کوشش کی تھی لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ وہ مضبوط آدمی تھا اس کے باوجود وہ ایک ہاتھ سے زور لگا کر میرا سر واپس نیچے نہیں کر سکا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ میرا سر واپس نہیں جا رہا ہے اور میری سانس رک گئی ہے۔ یقیناً میرا چہرہ بھی سرخ ہو گیا ہوگا۔ اس لیے میری سانس بحال کرنے کے لیے مجبوراً اس نے دوسرا ہاتھ بھی میرے چہرے پر رکھ کر پوری قوت سے نیچے دبایا۔ اس کام کے لیے اس نے پوری قوت استعمال کی تھی اس لیے جب اچانک ہی میرا سر ڈھیلا پڑ گیا تو وہ بھی بے اختیار آگے جھکا تھا اور اسی وقت اس کا ایک ہاتھ میرے منہ کے پاس آیا تھا۔ میں نے منہ کھول کر اس کا ہاتھ دانتوں میں چبا لیا۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی تھی اور اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تھی لیکن میری گرفت اتنی ہلکی نہیں تھی، میرے دانت ربر کے دستانے سے گزر کر اس کی کھال میں اتر گئے تھے اور میں نے اپنے منہ میں خون کا ذائقہ محسوس کیا تھا۔ اس بار اس کے منہ سے زیادہ طویل چیخ نکلی تھی اور یہ تکلیف کی وجہ سے نہیں تھی کیونکہ اس میں اذیت سے زیادہ خوف تھا۔

اس نے پوری قوت سے اپنا ہاتھ میرے منہ سے واپس کھینچا اور میں نے اسے اچانک چھوڑ دیا۔ وہ سنبھل نہیں سکا تھا اور پلٹ کر پیچھے جا گرا تھا۔ میں نے منہ میں آیا اس کا خون تھوکا اور اپنا سانس بحال کرنے لگا۔ سچ مچ سانس رکنے سے میری حالت اچھی نہیں رہی تھی۔ میں لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ ڈاکٹر فرش سے اٹھا تو کم روشنی میں بھی اس کے چہرے پر دہشت صاف نظر آئی تھی۔ مارے خوف کے اس سے بولا نہیں جا رہا تھا ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے اس نے بہت تیزی سے جان لیا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا اور آگے کیا ہونے والا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ دبا رکھا تھا۔ اس سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ میں نے گہرے سانس لیتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ ''کیا خیال ہے ڈاکٹر میرے تھوک میں وائرس ہوگا یا نہیں؟''

''ذلیل شخص۔'' اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''تم نے ... مجھے انفیکٹ... کر دیا ہے۔''

''اچھا... محض کاٹنے سے تم انفیکٹڈ ہو گئے ہو؟'' میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے پھر تھوکا، خون کا ذائقہ ابھی تک آ رہا تھا۔ ''ہاں اگر میرے تھوک میں ایبولا وائرس کا باقی ہوگا تو وہ یقیناً تمہارے جسم میں داخل ہو چکا ہے۔ تم جانتے ہو میں نے جہاں کاٹا ہے وہ جگہ نس والی ہے اور اگر تم چاہو تو اپنا ہاتھ جسم سے الگ کر دو لیکن خون کی روانی کے ساتھ وائرس تمہارے جسم میں پھیل چکا ہوگا۔''

وہ کانپنے لگا تھا۔ ''بکواس کرتے ہو تم' اتنی جلدی یہ نہیں ہو سکتا۔''

''افسوس تم ڈاکٹر ہو کر اور جانتے بوجھتے ایسی بات کر رہے ہو۔'' میں ہنسا۔ ''اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے، اگر تھوک میں وائرس تھا تو تم اس کا شکار ہو چکے ہو۔''

یہ بات وہ لاشعور میں تسلیم کر چکا تھا لیکن اس کا شعور ماننے سے انکاری تھا۔ وہ اچانک ہی پاگلوں کی طرح گالیاں دینے لگا۔ ''...تو کیا... سمجھتا ہے... کے، تو بچ جائے گا... نہیں، تجھے ابھی جہنم رسید کرتا ہوں۔'' اس نے پلٹ کر ٹرالی سے وہی سرنج اٹھائی جس سے مجھے انجکشن لگایا تھا۔ شاید اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی چیز نہیں تھی۔ لیکن ایک بندھے ہوئے بے بس آدمی کو اس سے بھی قتل کیا جا سکتا تھا۔ وہ اسے میری آنکھ میں گھونپ دیتا تو اس کی سوئی دماغ تک پہنچ جاتی اور میں ایک لمحے میں مر جاتا۔ یہی شاید اس نے سوچا تھا۔ وہ میری طرف پلٹا تو اس کا چہرہ خوف و دہشت اور انتقام کے جذبے نے بگاڑ کر رکھ دیا تھا اور لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ وہی سوبر اور خوش شکل نظر آنے والا شخص تھا (کم سے کم ظاہری طور پر نظر آتا تھا) اب اس کا وہ نقاب بھی جیسے اتر گیا تھا اور اس کی اصل صورت سامنے آ گئی تھی۔ اس نے... غراتے ہوئے کہا۔ ''میں مروں نہ مروں لیکن تم اب نہیں بچو گے۔''

''اگر اللہ کی طرف سے میری موت کا وقت آ گیا ہے تو میں راضی بہ رضا ہوں۔'' میں نے سکون سے کہا۔

''تمہاری موت کا وقت آ گیا ہے۔'' وہ بولا اور اس نے سرنج ذرا بلند کی۔ اسے درست نشانہ لینا تھا۔ میں نے ڈر جانے والے انداز میں چہرہ اس کے ذرا پاس کیا اور اس نے پوری قوت سے سرنج میری آنکھ میں گھونپنے کی کوشش کی۔ میں نے چہرہ نہیں ہٹایا تھا۔ اور جب سوئی میرے چہرے سے چند انچ کے فاصلے پر تھی تو میرا سر کسی کھنچے اسپرنگ کی طرح مخالف سمت میں گیا اور سوئی میرے چہرے کو چھوتی تکیے میں اتر گئی۔ میں سیکنڈ کے سویں حصے کے فرق سے بچا تھا۔ اندازے کی ذرا سی غلطی مجھے کم سے کم میری آنکھ سے محروم کر دیتی۔ اس سے پہلے کہ وہ سرنج واپس کھینچتا میں نے دوبارہ سر واپس اس طرف کیا اور اس کے ہاتھ پر مارا۔ میں نے پوری قوت استعمال کی تھی سر پر چوٹ تو آئی لیکن اس ٹکر سے سرنج کی سوئی ٹوٹ کر تکیے میں رہ گئی تھی۔ اس نے چلا کر گالی دی اور اسی ہاتھ سے میرے سر پر مُکا مارا۔ چوٹ تو خاص نہیں تھی لیکن ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ وہ پیچھے ہٹ گیا اس نے بے کار ہو جانے والی سرنج پھینک دی اور خوں خوار لہجے میں بولا۔ ''تم کیا سمجھتے ہو کہ اس طرح بچ جاؤ گے؟''

''شاید نہیں... لیکن میں تمہیں اتنی آسانی سے اپنی جان لینے بھی نہیں دوں گا۔''

''میں بھی تمہیں اتنی آسانی سے نہیں ماروں گا۔'' اس نے کہا اور میرے سرہانے والی طرف بیڈ کے نیچے گھس کر کچھ کرنے لگا۔ مجھے اس وقت سمجھ میں آیا جب میرے گلے پر بندھی بیلٹ سخت ہونے لگی۔ اسے یقیناً کسی میکنزم سے سخت اور ڈھیلا کیا جاتا تھا کیونکہ یہ گرفت لحہ بہ لحہ سخت ہوتی جا رہی تھی۔ چند سیکنڈ میں یہ اتنی سخت ہو گئی تھی کہ میرا سر تکیے میں پیوست ہو گیا تھا اور گلے پر اس کی گرفت کی وجہ سے میرے لیے سانس لینا بھی محال ہو رہا تھا۔ وہ باہر آیا اور میرا معائنہ کر کے زہریلے لہجے میں بولا۔ ''کیسا محسوس ہو رہا ہے؟''

ظاہر ہے میں جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ میرے لیے سانس لینا محال ہو رہا تھا، بولنا تو بالکل ہی ممکن نہیں تھا۔ اس نے بیلٹ اس طرح سخت کی تھی کہ میری سانس بہت مشکل سے آ رہی تھی۔ میں بہت زور لگا کر ہوا کھینچ رہا تھا۔ ایک منٹ میں میرے پھیپھڑے ہوا کی کمی سے پھٹنے لگے تھے۔ وہ ہوا کھینچنے کے لیے پورا زور لگا رہے تھے اور اس زور میں میرا جسم بھی شامل ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر توفیق اب دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ آکسیجن کی کمی سے میرا سر چکرانے لگا تھا اور حواس جواب دے رہے تھے۔ دو منٹ بعد پھیپھڑے جیسے پھٹنے کے قریب آ گئے تھے اور منہ ہوا کے لیے کسی مچھلی کی طرح کھلا ہوا تھا۔

''تم زیادہ سے زیادہ چند منٹ زندہ رہ سکتے ہو۔'' اس نے میرے پاس آ کر کہا۔ ''لیکن مجھے یقین ہے مرنے سے پہلے تم بہت ساری اذیت برداشت کرو گے۔''

اذیت میں تو میں اس وقت بھی تھا اور اس سے پہلے بھی بہت تکلیف جھیل چکا تھا لیکن اس کی تسلی نہیں ہوئی۔ اس نے

اپنا زخمی ہو جانے والا ہاتھ دیکھا اور بولا۔ ''اس وقت تو تم نے ڈراما کیا تھا اب تم سچ مچ مر رہے ہو۔''

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ موت اب کچھ دور رہ گئی تھی۔ میرے کانوں نے شاید فرشتے کے قدموں کی چاپ سنی تھی۔ لیکن نہیں وہ فرشتہ نہیں تھا کیونکہ فرشتے انگریزی نہیں بولتے ہیں۔ میرے چکراتے ذہن نے زبان شناخت کی تھی لیکن بولنے والا کیا کہہ رہا تھا وہ نہیں سمجھ سکا تھا۔ مگر اس کے فوراً بعد ہی میری گردن پر سخت بیلٹ کی گرفت ڈھیلی پڑی اور میں دیوانہ وار سانس لینے لگا۔ میرے حواس بحال ہونے میں کچھ وقت لگا تھا۔ تب میں نے ڈاکٹر توفیق کو ساکت کھڑے دیکھا اور اس کے عقب میں کوئی شخص ویسا ہی حفاظتی لباس پہنے کھڑا تھا۔ وہ بولا تو اس بار میں نے پہچان لیا، وہ ڈیوڈ شا تھا اور ڈاکٹر توفیق سے کہہ رہا تھا۔ ''مجھے افسوس ہے لیکن تمہیں اب سب سے الگ کرنا ہوگا۔''

''نہیں سر۔'' ڈاکٹر گڑگڑایا۔ ''آپ مجھے بچا سکتے ہیں۔''

''اگر وائرس نے اتنی دیر میں تم پر اثر نہیں کیا ہے تو تم بچ جاؤ گے لیکن اتنا تو تم بھی جانتے ہو علاج کے لیے تمہیں الگ رکھنا لازمی ہے ورنہ یہ تم سے دوسروں کو بھی لگ سکتا ہے۔''

''پلیز سر۔'' ڈاکٹر چلایا۔ ''میں مرنا نہیں چاہتا۔''

''کوئی نہیں مرنا چاہتا ہے لیکن موت بہر حال آتی ہے۔ اب تم چل رہے ہو یا میں تمہیں شوٹ کر دوں۔'' ڈیوڈ شا نے اتنے آرام سے کہا جیسے اس سے کھانے کے بارے میں تبادلہ خیال کر رہا ہو۔ میں جانتا تھا وہ اتنے ہی ٹھنڈے دماغ کا آدمی تھا۔ ڈاکٹر توفیق کو سچ مچ گولی مار سکتا تھا۔ شاید یہ بات ڈاکٹر بھی جانتا تھا اس لیے وہ بلا چون و چرا کیے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ڈیوڈ شا نے پردے کے اندر آنے کی کوشش نہیں کی تھی، وہ باہر ہی رہا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''شہباز تم ٹھیک ہو؟''

''مہربانی ہے تمہاری۔'' میں نے طنزیہ آواز میں کہا۔ ''ویسے تم نے آتے آتے کچھ زیادہ ہی دیر نہیں کی؟''

''ہاں یہ لباس پہننے میں کچھ دیر لگی۔'' اس نے کہا اور ڈاکٹر سمیت رخصت ہو گیا تھا۔ مجھ سے بولا نہیں جا رہا تھا، گلے پر لگے بیلٹ کی سخت گرفت نے نرخرے کو بری طرح متاثر کیا تھا اور دوسرے انجکشن کی تکلیف کا آغاز ہو گیا تھا۔ میں ساکت لیٹ گیا۔ کئی بار کے تجربے کے بعد میں کسی حد تک اس تکلیف کا عادی ہو چلا تھا۔ لیکن جیسے جیسے یہ عروج پر جانے لگی ویسے ویسے تکلیف ایک بار پھر میری برداشت سے باہر ہونے لگی تھی اور کچھ دیر بعد میں کراہنے لگا تھا۔ اس تکلیف کی وجہ سے مجھے پتا نہیں چلا کہ کب دروازہ کھلا اور ڈیوڈ شا اندر آیا تھا اس نے مخصوص حفاظتی لباس پہن رکھا تھا۔ جب اس نے ٹرالی ہلائی تو میں چونکا تھا۔ وہ پردہ ہٹا کر اندر آ گیا اور اس نے ایک سرنج اٹھا رکھی تھی۔

''کیا... تم... مجھے زہر... دے رہے ہو؟'' میں نے رک رک کر کہا۔

''اگر زہر دینا ہوتا تو میں تم کو بچانے کی کوشش کیوں کرتا۔'' اس نے سرنج سے ہوا کے بلبلے خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے میں نے ڈاکٹر پر اعتماد کیا اور اس نے تم کو جان بوجھ کر اذیت دینے کے لیے پین کلر نہیں دیا۔''

میں چونکا اور پھر چلا کر کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ وہ مجھے وائرس کے توڑ والا انجکشن ہی دے رہا تھا مجھے شک ہوا تھا کہ وہ الٹا مجھے مزید وائرس انجیکٹ کر رہا ہے۔''

''نہیں وہ تمہیں اس کا توڑ ہی دے رہا تھا لیکن اس کے ساتھ پین کلر نہیں دے رہا تھا اس وجہ سے تمہیں اتنی تکلیف برداشت کرنا پڑی۔''

''تب تو میں نے اس کے ساتھ بہت کم کیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ایسی تکلیف میں نے کبھی نہیں برداشت کی ہے۔''

''میں تمہیں انجکشن دے رہا ہوں، تم سو جاؤ گے اور آخری انجکشن تمہیں نیند کے دوران میں دے دیا جائے گا اور ڈاکٹر اپنی حرکت کا شکار ہوا ہے اگر وہ تمہیں بے ہوشی کا انجکشن دے دیتا تو اس انجام کو نہ پہنچتا۔'' اس نے اطمینان سے کہا، ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے ڈاکٹر کے بارے میں کوئی فکر یا افسوس نہیں تھا حالانکہ وہ اس کے لیے کام کر رہا تھا۔ اس نے انجکشن میرے بازو میں داخل کر دیا۔ اسے نس میں لگانا ضروری نہیں تھا۔ میں نے خوش ہو کر پوچھا۔

''وہ وائرس کا شکار ہو چکا ہے؟''

''نانوے فی صد امکان ہے۔ اگرچہ اس کا توڑ ہے لیکن یہ بھی زیادہ کارآمد نہیں ہے۔''

''تب یہ مجھ پر کیسے اثر کرے گا؟''

ڈیوڈ شا کسی قدر جھک کر بولا۔ ''شہباز میں نے سوائے تمہارے اور کسی شخص کو اس موت کے وائرس سے بچتے نہیں دیکھا ہے۔ جنوبی افریقا میں اس توڑ کا تجربہ کیا جا چکا ہے اور جن سات افراد کے جسم میں وائرس پایا گیا تھا ان میں سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھیں جو یہاں انہیں فراغ دلی سے دے دی گئی تھیں۔ مجھے ڈاکٹر کی بات پر پہلے بھی شک تھا، وہ اس پروجیکٹ کو اپنا قرار دے رہا تھا لیکن اس قسم کے پروجیکٹ بیرونی سرپرستی کے بغیر کام نہیں کر سکتے ہیں اور اصل میں تو اس کی ضرورت بھی ان ملکوں کو ہے جو کسی بھی ایجاد کا سب سے پہلے جنگی استعمال سوچتے ہیں۔ موت کی نیند سلا دینے والے جرثوموں کو بایولوجیکل ہتھیاروں میں تبدیل کرنا بھی مغرب کا ایجنڈا ہے لیکن وہ اس کا الزام تیسری دنیا کے ممالک پر لگا کر ان پر حملے کرتے ہیں۔ ڈیوڈ شا یہ کام اپنے طور پر بھی کر سکتا تھا کیونکہ اس کے پاس وسائل اور ٹیکنالوجی تھی یا پھر کسی بڑی طاقت کے لیے بھی کر سکتا تھا جو اس سے یہ ہتھیار خرید سکتی تھی۔

اچانک مجھے ایک خیال اور آیا۔ میں جان چکا تھا کہ ڈیوڈ شا یہاں کیا کر رہا تھا تو کیا وہ مجھے چھوڑنے کا خطرہ مول لے سکتا تھا؟ مگر جب میں نے ذرا گہرائی سے سوچا تو مجھے اپنا خیال مہمل لگا تھا۔ میں بھلا اس کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ میں صرف اس ٹھکانے کو جانتا تھا اور یہ بھی اس کا نہیں تھا۔ ڈاکٹر سے اس کا تعلق ثابت کرنا بھی مشکل تھا اور وہ ڈاکٹر کے مرنے کے بعد اسے بھی بھٹی میں جلا کر راکھ کر دیتا اور اس کے بعد سارے نشانات مٹا کر یہاں سے جا سکتا تھا۔ کسی چیز سے اس کا تعلق ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا اور ثابت بھی اس صورت میں ہوتا جب وہ کسی معاملے میں پکڑا جاتا اور یہاں تو اس پر فرد جرم بھی عائد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ گویا ڈیوڈ شا کو اگر مجھ سے کوئی خطرہ تھا تو وہ براہِ راست تھا۔ میں اسے نقصان پہنچا سکتا تھا اور اس کے لیے اس جگہ کو صاف کر کے چھوڑ جانا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

مجھے ہوش میں آئے ہوئے کوئی ایک گھنٹا ہو چکا تھا اور اب میرے متانے کا دباؤ ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ ”کوئی ہے۔“ میں نے چلا کر کہا۔ ”مجھے باتھ روم جانا ہے... ارے کوئی ہے۔“

میں وقفے وقفے سے چیخ و پکار کر رہا تھا اور اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا مگر پھر جو ہوا وہ میرے لیے خاصا غیر متوقع تھا۔ چند منٹ بعد دروازہ کھلا اور ایک شخص مخصوص لباس میں اندر آیا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں ابھی تک کلیئر نہیں ہوا تھا۔ شاید اس کے لیے کوئی خاص ٹیسٹ کرنا تھا جو ابھی تک نہیں کیا گیا تھا۔ اس نے ایک مخصوص برتن اٹھا رکھا تھا۔ وہ پردے کے اندر آیا تو میں اس کا ارادہ بھانپ گیا۔ ”اے اس کی ضرورت نہیں ہے مجھے کھول دو۔“

لیکن اس نے ان سنی کر کے میرا پاجامہ نیچے سرکایا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ میری گفتار بے کار ثابت ہوئی تھی۔ اس نے اپنا کام کر کے میری طرف دیکھا یعنی اب میں اپنا کام کر سکتا تھا۔ مجبوری تھی اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا مجھے اسی برتن میں فارغ ہونا پڑا۔ بہر حال اس سے میرا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ اس نے احتیاط سے برتن اٹھایا اور واپس چلا گیا۔ جانے سے پہلے اتنی مہربانی کی تھی کہ میرا پاجامہ اوپر کر دیا تھا۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد ڈیوڈ شا آ گیا۔

”کیا حال ہے کیسا محسوس ہو رہا ہے؟“

”سکون کی کیفیت ہے۔“ میں نے کہا۔ ”شاید ابھی تک دوا کا اثر ہے؟“

”نہیں دوا کا اثر اب تک ختم ہو چکا ہوگا۔ اگر تم درد یا بے چینی محسوس نہیں کر رہے ہو تو اس کا مطلب ہے کہ وائرس ختم ہو چکا ہے۔“

”اس کا پتا کیسے چلے گا؟“

”اس کے لیے تمہارا ایک بلڈ ٹیسٹ ہوگا۔“ اس نے کہا اور ایک خالی سرنج لی۔ ”مجھے تمہارا بلڈ سیمپل لینا ہے۔“

”لے لو میں کہیں روک نہیں سکتا ہوں۔“ میں نے سر ہلایا۔

اس نے سرنج میری نس میں داخل کر کے خون کا نمونہ لیا۔ ”دو گھنٹے میں اس کا نتیجہ معلوم ہو جائے گا۔“

”اس کے بعد کیا ہوگا؟“

”اس کے بعد تمہیں اوزون سے غسل دیا جائے گا اور پھر تم کلیئر ہو جاؤ گے۔“ اس نے جواب دیا اور وہاں سے چلا گیا۔ ڈاکٹر کے نہ ہونے کی وجہ سے اسے سارا کام خود کرنا پڑ رہا تھا۔ میں متجسس تھا کہ ڈیوڈ شا مجھ پر اتنا مہربان کیوں تھا۔ لیکن میں نے اس سے پوچھا نہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ تھیلے میں جو بلی ہے جلد باہر آ جائے گی۔ میں جس بستر پر لیٹا ہوا تھا وہ شاید چمڑے کا تھا اسی طرح تکیہ بھی چمڑے کا تھا۔ کپڑوں کے مقابلے میں چمڑے سے جراثیم صاف کرنا آسان ہوتا ہے۔ اوزون آکسیجن کی ایک قسم ہے۔ یہ جرثوموں کے لیے نقصان دہ ... ہوتی ہے اور خاص طور سے بیکٹیریا اور وائرس اس سے فوراً ختم ہو جاتے ہیں لیکن اس سے انسانوں یا بڑے جانداروں کو نقصان نہیں ہوتا ہے۔ آج کل اسپتالوں اور اس قسم کی دوسری جگہوں پر جہاں جراثیم لگنے کا خطرہ ہوتا ہے صفائی کے لیے اوزون کو استعمال کیا جاتا ہے، اس کی خشک

پھوار تمام اقسام کے جرثوموں کو ختم کر دیتی ہے۔ دیگر جراثیم کش کے مقابلے میں یہ سستی پڑتی ہے، اس کے سائڈ ایفکٹ بھی نہیں ہیں اور یہ ماحول کے لیے بھی بہتر ہے کیونکہ کرہ ہوائی میں اوزون کی موجودگی ہمیں سورج سے آنے والی مضر تابکاری سے محفوظ رکھتی ہے۔ لیکن ہم نے اپنی اس محافظ گیس کو بے دریغ آلودگی پیدا کر کے ختم کرنے کے قریب پہنچا دیا ہے۔ ڈیوڈ شا کا مجھے ایسا ہی غسل دینے کا ارادہ تھا۔

میں صبر سے انتظار کرتا رہا اور تقریباً ڈھائی گھنٹے بعد دو افراد اسی حفاظتی لباس میں اندر آئے اور خاص بات یہ تھی کہ دونوں مشین گنوں سے مسلح تھے۔ ان میں سے ایک میرے سرہانے ذرا فاصلے پر کھڑا ہو گیا اور دوسرے نے میری جسم سے بیلٹس کھولنا شروع کیں۔ آخری بیلٹ کھولتے ہوئے اس نے مجھے وارننگ دی۔ ”کوئی غلط حرکت مت کرنا ورنہ مارے جاؤ گے۔“

بولنے والے کا لہجہ مقامی اور صاف تھا، شاید وہ پڑھا لکھا تھا۔ مجھے کھولتے ہی وہ پیچھے ہٹ گیا تھا اور اپنی مشین گن مجھ پر تان لی۔ ڈیوڈ شا نے انہیں میرے بارے میں کچھ زیادہ بریف کر دیا تھا اور وہ ڈرے ہوئے لگ رہے تھے۔ میں پہلے اٹھ کر بیٹھ گیا اور پھر بستر سے نیچے اتر آیا۔ انہوں نے پردے ہٹا دیے تھے۔ اب یہاں زیادہ روشنی تھی۔ انہوں نے اشارے سے مجھے کمرے سے باہر چلنے کو کہا۔ مستقل بندھے رہنے سے میرا جسم سن ہو گیا تھا پھر دواؤں اور وائرس کا اثر بھی ہوا تھا اور میں کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ اس لیے بہ مشکل بستر سے نیچے آیا تھا۔ چند لمحے تو مجھے زمین پر اپنے قدم جمانے میں لگے تھے۔ میرے پاس پیروں میں پہننے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ میری حالت کے باوجود وہ میری طرف سے پوری طرح محتاط تھے۔ ایسا لگ رہا تھا وہ مجھے کوئی موقع نہیں دینا چاہتے۔ میں اس کمرے سے باہر آیا تو دوسرا کمرا بالکل خالی نکلا تھا اور اس میں چھت سے ایک شاور نما چیز لگی تھی۔ مجھے کھولنے والے نے حکم دیا۔

”اس کے نیچے کھڑے ہو جاؤ۔“

میں نے حکم کی تعمیل کی اور فوراً ہی شاور سے کوئی چیز پھوار کی طرح برسنے لگی۔ مخصوص بو بتا رہی تھی کہ یہ اوزون تھی۔ یہ تقریباً گیس کی حالت میں تھی کیونکہ اس سے جسم یا لباس پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ میں کوئی پانچ منٹ اس شاور کے نیچے رہا تھا۔ اس کے بعد باری باری دونوں مسلح افراد اس شاور کے نیچے کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اچھی طرح اطمینان کر لیا تھا کہ اب جراثیم باقی رہنے کا کوئی امکان نہیں رہا ہے۔ پھر وہ مجھے اگلے کمرے میں لائے۔ یہاں لباس تبدیل کیے جاتے تھے اور وہاں مجھے ایک عدد برقی بھٹی بھی نظر آئی تھی۔ مجھے کھولنے والے نے اگلی ہدایت دی۔

”اپنا یہ لباس اتار کر بھٹی میں ڈال کر جلا دو اور یہ دوسرا لباس پہن لو۔“ اس نے ایک طرف رکھے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا۔ اس میں پوری آستین کی ٹی شرٹ تھی اور سیاہ رنگ کا ٹراؤزر تھا۔ دونوں گرم کپڑے سے بنے تھے۔ میں مجبور تھا کیونکہ وہ پوری طرح نگران تھے اور میں ان سے کہتا بھی کہ بھائی صاحب ذرا منہ دوسری طرف کر لو تو وہ یقیناً یہ بات نہ مانتے اس لیے میں نے رخ بدل کر لباس اتارا اور اسے بھٹی میں ڈال کر اس کا بٹن دبا دیا۔ دوسرے کپڑے پہن کر اب میں باہر جانے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ یہ تو واضح تھا کہ میری رپورٹ کلیئر آئی تھی۔ ورنہ مجھے باہر نکالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ تینوں کمرے ایک لائن سے تھے اور میں جس کمرے میں تھا وہ سب سے آخر میں تھا۔ ہم تیسرے کمرے سے باہر آئے تو ایک گیلری میں تھے اور... بالآخر یہ بھی اسی کوٹھی کا تہ خانہ ثابت ہوا تھا۔ کوٹھی اندر سے اوپر کے مقابلے میں کہیں زیادہ بڑی تھی اور اس کے شاید کئی فلور تھے کیونکہ ہم سیڑھیاں چڑھ کر ایک اور فلور تک آئے اور اب بھی ہم تہ خانے میں ہی تھے۔

اب میں بہتر محسوس کر رہا تھا۔ حرکت کرنے اور شاید کپڑے تبدیل کرنے سے یہ بہتری آئی تھی۔ سب سے اہم بات تھی کہ میں ایک خوف والی کیفیت سے نکل آیا تھا۔ انہوں نے مجھے ایک دروازے کے سامنے روکا اور پھر دستک دی۔ چند لمحے بعد دروازہ کھل گیا۔ سامنے ڈیوڈ شا کھڑا تھا۔ اس نے ایک طرف ہو کر مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے کسی دوست کو اندر آنے کو کہہ رہا ہو۔ اس کے انداز میں اب بے پروائی تھی۔ میں اندر داخل ہوا تو اس نے دروازہ بند کر دیا اور دونوں مسلح افراد باہر ہی رہ گئے تھے۔ میں نے حیرت سے ڈیوڈ شا کی طرف دیکھا۔

”تمہیں مجھ سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہو رہا ہے؟“

وہ اعتماد سے آگے بڑھ گیا اور ایک جھولنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے برابر میں تپائی پر ایک بوتل اور ایک عدد جام رکھا تھا۔ اس نے سامنے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”بیٹھو۔“ اس نے میرے سوال کا جواب دینے کی زحمت نہیں کی تھی۔ میں کرسی پر آ گیا۔ ”تمہاری رپورٹ آ گئی ہے،

www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تم کلیئر ہو۔"

"شکریہ۔" میں نے کسی قدر طنزیہ انداز میں کہا۔

اس نے اپنے لیے بوتل سے ایک جام بنایا اور میری طرف دیکھا۔ "تم تو پیتے نہیں ہو۔ تمہارے لیے کیا منگواؤں؟"

مجھے بھوک نہیں لگ رہی تھی اس لیے میں نے کافی کا کہہ دیا۔ اس نے تپائی سے ایک چھوٹا سا واکی ٹاکی اٹھا کر کسی سے کافی لانے کو کہا۔ پھر میری طرف دیکھا۔ "اگر چاہو تو کچھ کھانے کے لیے بھی منگوالو۔"

"کوئی ہلکی چیز منگوالو۔"

اس نے واکی ٹاکی پر یہی کہہ دیا۔ پھر اسے واپس تپائی پر رکھ دیا۔ لیکن میں نے نوٹ کیا کہ اس نے اس کا بٹن نہیں دبایا تھا یعنی رابطہ برقرار تھا۔ اسے مجھ پر مکمل اعتماد نہیں تھا، وہ صرف ظاہر کر رہا تھا۔ چند منٹ میں کافی اور گھر کے بنے بسکٹ آگئے۔ مجھے اس وقت کسی ایسی ہی چیز کی ضرورت تھی اس لیے میں نے کسی تکلف سے کام نہیں لیا اور پلیٹ صاف کر دی۔ جب تک میں بسکٹ کھاتا رہا ڈیوڈ شا مے نوشی میں مصروف رہا تھا لیکن وہ بہت کم پی رہا تھا، اتنی دیر میں اس نے مشکل سے آدھا پیگ ختم کیا تھا۔ جب میں کافی کا مگ سنبھالا تو وہ میری طرف متوجہ ہوا۔

"تم سوچ رہے کہ میں نے تم کو کیوں بچایا جبکہ تم مجھے دشمن سمجھتے ہو؟"

"کیا تم دشمن نہیں ہو؟" میں نے سادگی سے دریافت کیا۔

"ان معنوں میں نہیں جن معنوں میں لوگ ایک دوسرے سے دشمنی کرتے ہیں۔"

"یعنی تمہاری مجھ سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ بس بعض جگہوں پر میں تمہارے مفادات کے آڑے آتا ہوں۔ یہی کہنا چاہتے ہو نا تم؟"

"ہاں یہی بات ہے۔" اس کا لہجہ پُرسکون رہا تھا۔ "حالانکہ تم اسے غلط سمجھ رہے ہو۔"

"کیا میرے سمجھنے سے کچھ ہوتا ہے۔"

"بہت کچھ ہوتا ہے، اگر تم سمجھو تو۔" اس نے کرسی جھلاتے ہوئے کہا۔ "شہباز ملک میں صاف بات کرنا پسند کرتا ہوں۔"

"میں بھی صاف بات سننا پسند کرتا ہوں بغیر کسی لگی لپٹی کے۔"

"مجھے تمہارا تعاون درکار ہے۔" اس نے کہا۔

"کس معاملے میں؟"

"مجھے اس وادی تک جانا ہے۔"

"میں اسے ایک فینٹاسی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا" ..... میں نے بھی صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ "اور جس چیز کو میں اہمیت نہیں دیتا اس کی طرف جانے کی کوشش بھی نہیں کروں گا۔"

"تم راجا عمر دراز کے ساتھ جانے کے لیے تیار تھے؟"

"درست ہے لیکن تم جانتے ہو راجا عمر دراز کی بات الگ ہے۔"

"ٹھیک ہے میں تمہارے لیے ایک دشمن ہوں اور تم آسانی سے میرے لیے کام کرنے پر آمادہ نہیں ہوگے۔"

"مشکل سے بھی نہیں۔" میں نے تصحیح کی۔

"ایسا مت کہو انسان بعض اوقات مجبور بھی ہو جاتا ہے۔" اس کا لہجہ سرد ہو گیا تھا۔ میں مسکرایا۔

"ہاں میں سمجھ رہا ہوں کہ انسان مجبور بھی ہو جاتا ہے لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں اگر ایسا ہوا بھی تو یہ بالکل عارضی ہوگا اور میں موقع ملنے پر وہی کروں گا جو ڈاکٹر توفیق کے ساتھ کیا ہے۔"

"میں تم کو اس انداز میں مجبور کرنے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔" اس نے سر ہلایا۔ "مجھے گھٹیا انداز پسند نہیں ہے۔"

"او کے تم جس طرح چاہو مجھے مجبور کر سکتے ہو۔" میں نے فراغ دلی سے کہا۔ "تب فیصلہ ہو جائے گا۔"

"فی الحال تم آرام کرو۔" اس نے کہا۔ "پھر تم سے بات ہوگی۔"

"یعنی ابھی مجھے تمہاری قید میں رہنا ہوگا؟"

"ہاں چاہو تو ایسا کہہ لو، بعض معاملات طے کیے بغیر میں تم کو آزاد نہیں کر سکتا ہوں۔"

"میری ساتھی کے بارے میں ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ اس کی لاش جلا دی گئی ہے؟"

"ہاں مجبوری تھی کیونکہ وہ انفیکٹڈ لاش تھی۔ اسے جلا دینا ہی بہتر تھا۔"

میں نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ وہ دشمن تھے ان سے کسی اچھائی کی توقع ویسے بھی نہیں کی جا سکتی تھی، پھر منطق... لحاظ سے بھی انہوں ٹھیک کیا تھا۔ مجھے افسوس ہوا تھا کہ میں زرین کی آخری خواہش پوری نہیں کر سکا تھا۔ ڈیوڈ شا مجھے غور

سے دیکھ رہا تھا، اس نے بھانپ لیا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ اس نے کہا۔ "کیا تم اپنی ساتھی کی آخری خواہش پوری کرنا چاہتے ہو؟"

"اب یہ کہاں ممکن رہا ہے اس کی لاش ہی باقی نہیں ہے۔" میں نے سرد آہ بھر کر کہا۔

"یہ ممکن ہے۔ اب اس کا جسم راکھ کی صورت میں ہے۔ اس نے خواہش کی تھی کہ تم اسے دفناؤ اور کسی اور کو اس کے جائے مدفن کا علم نہ ہو تو تم اس کی یہ دونوں خواہشیں پوری کر سکتے ہو۔"

"اس کی راکھ دفنا کر؟" میں نے اس کی بات پر غور کیا۔

"ہاں راکھ بھی تو اس کے جسم کی ہے اور اگر تم لاش بھی دفناتے تو کچھ عرصے بعد وہ خود مٹی میں مل جاتی۔ اس لیے کیا فرق پڑتا ہے۔"

اس کی بات قابلِ غور تھی راکھ بھی زرین کی تھی اور میرے لیے اسے خود دفنانا اور اس طرح دفنانا کہ کسی اور پتا نہ چلے بہت آسان ہو گیا تھا۔ لیکن یہ کام میں ڈیوڈ شا کی قید سے رہائی کے بعد ہی کر سکتا تھا۔ میں نے سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے اس کی راکھ میرے حوالے کر دو۔"

"تمہیں مل جائے گی۔" اس نے کہا۔ "میں چھ گھنٹے بعد تم سے بات کروں گا۔ اس دوران میں تم سوچ سکتے ہو۔"

"کیا سوچ سکتا ہوں؟"

"یہی کہ تم دوبارہ اپنی پرانی نارمل زندگی میں واپس جانا چاہتے ہو یا نہیں۔" ڈیوڈ شا نے کہا اور میری طرف دیکھے بغیر انٹر کام اٹھا کر کسی سے بولا۔ "کم ان اینڈ گیٹ ہم۔"

اس کی بات سن کر مجھے جھٹکا لگا تھا۔ یہ خواب تو میں اس وقت سے دیکھ رہا تھا جب سے اس مصیبت میں پڑا تھا۔ پرانے دن سراب بن کر رہ گئے تھے، ان کی جھلک تو نظر آتی تھی لیکن وہ حقیقت میں نہیں تھے۔ پھر جب سویرا سے ملا اور اس سے تجدید تعلق ہوا تو یہ خواہش مزید شدت اختیار کر گئی تھی۔ مگر اس کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ اگرچہ میں نے مرشد اور دوسرے دشمنوں کے معاملے میں بہت ساری کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ ان کو بہت سارے نقصان پہنچائے تھے اور ان کے بہت سارے عزائم کو ناکام بنایا تھا لیکن جہاں تک میرے مسائل کا تعلق تھا تو ان میں کوئی کمی نہیں آئی تھی بلکہ اضافہ ہی ہوا تھا اور دشمنوں میں بھی اضافہ ہوا تھا۔ مرشد پہلے سے زیادہ خطرناک ہو گیا تھا، اب وہ سیاستدان بھی تھا اور حکومت کا ممبر بھی تھا۔ گویا پہلے کریلا تھا تو اب نیم چڑھا بھی ہو گیا تھا۔

مجھے اپنے مسائل کا کوئی حل نظر نہیں آتا تھا۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح مرشد کو یہ جنگ ختم کرنے پر آمادہ کر سکوں جس میں اس کا بھائی اپنی صحت سے اور میرا بھائی اپنی جان سے ہاتھ گنوا چکا تھا۔ مگر اس کی طرف سے ایسے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے کہ وہ اس جنگ کو ختم کرنے پر آمادہ ہے۔ اس کے بجائے وہ اسے پھیلا کر میرے خاندان تک لے آیا تھا۔ طاقت حاصل کر کے وہ فرعون صفت بن گیا تھا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ بالکل ہی فرعون بن گیا تھا۔ میں کسی فلم کا کوئی انا کا مارا ہیرو نہیں ہوں جو دشمن سے ہر قیمت پر جنگ جاری رکھنا چاہتا ہے، اگر میرا دشمن مجھے آبرومندانہ طور پر زندہ رہنے دیتا ہے تو میں بھی اسے چھوڑنے کے لیے تیار ہو سکتا تھا کیونکہ معاملہ صرف میری ذات کا نہیں تھا بلکہ مجھ سے منسوب میرے ساتھیوں اور میرے خاندان کا بھی تھا۔ یہ اور بات تھی کہ میری پرانی زندگی واپس ملنے کی اور کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس لیے جب ڈیوڈ شا نے یہ بات کہی تو میں چونک گیا اور اندر سے کچھ بے تاب ہو گیا تھا۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ یہ کس طرح ممکن ہے لیکن وہ اپنے آدمیوں کو حکم دے کر میری طرف سے بے نیاز بن گیا تھا۔

فوراً ہی دروازہ کھلا اور وہی دونوں مسلح افراد نظر آئے تھے۔ میں کمرے سے باہر آ گیا، ان کو معلوم تھا کہ مجھے کہاں پہنچانا تھا، مجھے اسی فلور پر ایک کمرے میں لے جایا گیا تھا۔ یہ چھوٹا سا کمرا تھا جس میں سوائے ایک مضبوط دروازے کے اور کوئی کھڑکی یا روشن دان تک نہیں تھا۔ دروازے پر اوپر والے حصے میں ایک چوڑی پٹی میں صرف شیشہ لگا تھا جس سے اندر یا باہر دیکھا جا سکتا تھا۔ کمرے میں فرش پر فوم کا گدا پڑا تھا اور اس کے ساتھ ہلکا کمبل تھا۔ وہاں ایک عدد پانی کی بوتل پہلے سے موجود تھی۔ ڈیوڈ شا کے سامنے میں خود کو سنبھالے ہوئے تھا ورنہ بیماری اور پھر اس کے علاج کے ساتھ مسلسل بندھے رہنے اور بے آرامی سے میرا جسم ٹوٹ رہا تھا اور مجھے شدت سے چند گھنٹے آرام کی ضرورت تھی۔ اس لیے میں پانی پی کر جیسے ہی بستر پر لیٹا نیند نے مجھے دبوچ لیا تھا اور میں ہر بات سے غافل ہو کر گہری نیند سو گیا تھا۔ حد یہ کہ میں نے پھر ڈیوڈ شا کی بات پر بھی غور نہیں کیا تھا حالانکہ جس وقت اس نے مجھ سے یہ بات کی تھی مجھے جھٹکا سا لگا تھا اور میں

www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جاننے کے لیے بے تاب ہو گیا تھا کہ یہ کس طرح ممکن ہوگا۔ میں بے خبر سوتا رہا تھا اور شاید سوتا ہی رہتا اگر مجھے جگایا نہ جاتا۔ جگانے والے نے کمبل ہلایا تھا۔

"اٹھو نواب کے بچے، کیا یہاں سونے آئے ہو؟"

میں اٹھ بیٹھا تھا۔ جگانے والا وہی مشین گن بردار تھا لیکن ابھی اس کے پاس مشین گن نہیں تھی۔ اس کے ساتھی کے پاس تھی۔ وہ میرے لیے کھانا لایا تھا۔ ٹرے میں ایک بڑے سائز کا پیالہ رکھا تھا جس سے بھاپ اٹھ رہی تھی، یہ نمکین دلیا تھا کیونکہ اس میں گوشت کی بوٹیاں اور سرخ مرچ کا پاؤڈر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ جاگنے کے بعد مجھے بھوک کا احساس ہوا تھا یعنی اب میں رفتہ رفتہ نارمل ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے جگانے والے کی طرف دیکھا اور چھوٹی انگلی سے اشارہ کر کے کہا۔ "مجھے باتھ روم بھی جانا ہے۔"

"پہلے کھالو پھر تمہیں ایک ساتھ ہی لے جائیں گے، چھوٹا بڑا ایک ساتھ کر لینا۔" اس نے طنزیہ انداز میں کہا اور باہر چلا گیا۔ دلیا گرم لیکن کسی قدر پھیکا تھا۔ اسے حلق سے اتارنا آسان نہیں تھا لیکن میں جانتا تھا کہ یہ قوت بخش چیز ہے اور میری توانائی جلد بحال کر دے گا۔ اس لیے میں نے پورا پیالہ کسی نہ کسی طرح حلق سے اتار لیا تھا۔ پانی کی بوتل خالی کر کے میں ایک بار پھر بستر پر دراز ہو گیا تھا۔ اب مجھے ان کی آمد کا انتظار تھا کہ وہ مجھے باتھ روم لے جائیں لیکن وہ ایک گھنٹے بعد آئے جب میں خود بے تاب ہو کر دروازہ بجانے والا تھا۔ دونوں میں سے اب تک ایک ہی نے مجھ سے بات کی تھی اور اس وقت بھی وہی اندر آیا تھا۔ یہ لمبے قد اور فوجیوں جیسے مختصر بالوں والا جوان آدمی تھا۔ اس کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ وہ تربیت یافتہ ہے، لہجے سے وہ پوٹھوہار کا رہنے والا لگتا تھا۔

"چلو تم کو صاحب نے بلایا ہے۔"

"لیکن پہلے مجھے باتھ روم جانا ہے۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "ایمرجنسی ہے۔"

اس نے واکی ٹاکی پر ڈیوڈ شا کو میری ایمرجنسی کی اطلاع دی اور اس سے تازہ ترین ہدایات حاصل کیں۔ "چلو لیکن زیادہ دیر مت کرنا۔"

"چلو تو..." میں نے بے تابی سے کہا کیونکہ اتنے دن بعد پیٹ میں کھانا گیا تھا تو وہ کچھ گڑبڑا گیا تھا اور گڑگڑ کر رہا تھا۔ باتھ روم اسی حصے میں تھا۔ وہاں سے فارغ ہوتے ہی مجھے سیدھا ڈیوڈ شا کے پاس پہنچایا گیا تھا۔ اس بار بھی دونوں افراد باہر ہی رہے تھے۔ دروازہ ڈیوڈ شا نے خود کھولا تھا۔ وہ نائٹ گاؤن میں تھا اور آرام کے موڈ میں تھا۔ لیکن اس وقت اس کے پاس مے نوشی کے لوازمات نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس کے بجائے اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی اور جب اس نے کتاب تپائی پر رکھی تو میں نے دیکھا یہ انگریزی زبان میں آسٹرولوجی کے موضوع پر تھی۔ اس کا نام تھا "اے بریف ہسٹری آف آسٹرولوجی۔"

"تمہیں اس قسم کے موضوعات سے دلچسپی ہے؟" میں نے کتاب کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں... تمہیں بھی ہے؟"

"نہیں لیکن میں نے اس بارے میں تھوڑا بہت پڑھ رکھا ہے۔"

"بیٹھو۔" اس نے سامنے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "مجھے صرف اس موضوع سے دلچسپی ہی نہیں ہے میں اس کا ماہر بھی ہوں۔"

"اوہ۔" میں ہنسا۔ "گویا تم کوئی بھی کام کرنے سے پہلے ستاروں اور قدرت کے اشارے دیکھتے ہو گے۔ شگون تلاش کرتے ہو گے۔"

"شگون کیا؟" اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"سائن۔"

"ہاں ایسا ہوتا ہے۔" اس نے سر ہلایا۔

"لیکن تم نے محسوس تو کیا ہوگا کہ سب کچھ کرنے کے باوجود بہت سارا ایسا کچھ نہیں ہو پاتا ہوگا جو تم چاہتے ہو؟"

"ہاں ایسا ہوتا ہے۔" اس کا لہجہ سپاٹ ہو گیا۔ "اسی کا نام تقدیر ہے۔"

"تم تقدیر کو مانتے ہو؟"

"ہاں لیکن اس طرح نہیں جس طرح تم مانتے ہو۔" اس نے جواب دیا۔

"کس طرح؟" میں نے ذرا چبھتے انداز میں کہا۔ "یعنی جو تمہاری مرضی کے مطابق کرے اس تقدیر کو مانتے ہو اس میں اپنا عمل دخل دیکھنا چاہتے ہو؟"

"تم چاہو تو ایسا بھی سمجھ سکتے ہو۔" اس نے کسی قدر اکتائے انداز میں کہا۔ "بہرحال یہ ایک لمبی بحث ہے۔ اسے کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھو۔ تم نے میری بات پر غور کیا تھا؟"

"کون سی بات پر؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

اس کا چہرہ ایک لمحے کو سرخ ہوا تھا لیکن اس نے خود پر

قابو رکھا۔ "میں نے تم سے کہا تھا کہ تم اپنی پرانی نارمل زندگی میں واپس جانا چاہتے ہو؟"

"ظاہر ہے کیوں نہیں جانا چاہوں گا۔" میں نے سرد انداز میں کہا۔ "لیکن کیا یہ ممکن ہے۔ ایک طرف مرشد جیسا طاقت ور شخص میرا دشمن ہو رہا ہے۔ پولیس مجھ پر مقدمات بنا کر شدومد سے مجھے تلاش کر رہی ہے اور شاید میں بھارتیوں کو بھی مطلوب ہو گیا ہوں۔ تمہارے پاس کیا الہٰ دین کا چراغ ہے جو میرے اتنے سارے مسائل حل کر دے گا۔"

"تمام مسائل حل ہو سکتے ہیں۔" اس نے یقین سے کہا۔ "اگر تم چاہو تو یہ سارے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ اس دنیا میں کوئی کام ناممکن نہیں ہے اگر آدمی کرنا چاہے تو۔"

"میں کیوں نہیں چاہوں گا؟" میں نے کسی قدر طنزیہ انداز میں کہا۔ "تمہارے خیال میں کیا میں اس زندگی کا عادی ہو گیا ہوں جس میں ہمہ وقت مار دھاڑ اور قتل و غارت گری جاری رہتی ہے؟"

"نہیں میرا اندازہ ہے تم اس زندگی سے بالکل خوش نہیں ہو حالانکہ تم نے بڑی کامیابی سے اپنا اور اپنے ساتھیوں کا دفاع کیا ہے۔ خاص طور سے تم نے انڈیا میں جو کیا ہے وہ تو کسی تربیت یافتہ کمانڈو کے بس کی بات بھی نہیں ہے۔"

"میں نے وہاں جو کیا وہ صرف اپنے دفاع میں کیا۔" میں نے محتاط انداز میں کہا۔ "میرا مقصد کسی کو نقصان پہنچانا نہیں تھا۔"

ڈیوڈ شا میرے انداز پر مسکرایا۔ "تم ڈر رہے ہو کہ شاید یہاں تمہاری باتیں ریکارڈ ہو رہی ہیں؟"

"اگر ہو بھی رہی ہیں تب بھی اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔"

"لیکن تم اعتراف کر چکے ہو کہ ڈاکٹر کو تم نے انفیکٹڈ کیا ہے۔" وہ معنی خیزی سے بولا۔

"میں نے ایسا کوئی اعتراف نہیں کیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "ویسے وہ کہاں ہے؟"

"اسے دیکھنا چاہتے ہو؟"

"ہاں۔" میں نے سر ہلایا۔

وہ کھڑا ہو گیا۔ "آؤ میرے ساتھ۔"

ہم کمرے سے باہر آئے جہاں دونوں گارڈز مستعد کھڑے تھے۔ جب ہم آگے بڑے تو وہ ہمارے پیچھے تھے۔ وہ یقیناً ڈیوڈ شا کے محافظ تھے اور اسے کسی بھی وقت اکیلا نہیں چھوڑتے تھے۔ مجھے یقین تھا جب ڈیوڈ شا کمرے میں میرے ساتھ ہوتا تھا تب بھی وہ صرف ایک آواز دے کر انہیں بلا سکتا تھا۔ اسے اعتماد تھا کہ میں اس کے خلاف کوئی کارروائی کرنے سے پہلے سو بار سوچوں گا کیونکہ اگر میں اسے مار دیتا یا خالی ہاتھوں قابو کر لیتا تب بھی میرے لیے اس جگہ سے نکلنا بہت مشکل تھا۔ پھر ڈیوڈ شا مجھے سمجھتا تھا اور اسی بنا پر وہ پُرامید تھا کہ میں کوئی غلط قدم اٹھا کر اپنے لیے مشکلات پیدا نہیں کروں گا۔

ایسا نہیں تھا کہ میں اندر سے بالکل پُرسکون تھا۔ میرے اندر ابال اٹھ رہے تھے۔ خاص طور سے زرین اور میرے ساتھ جو ہوا تھا اور ہمیں جس طرح انسانیت سوز تجربے کا نشانہ بنایا گیا۔ زرین نے کس طرح سسک سسک کر میرے سامنے جان دی تھی۔ جب یہ سب مجھے یاد آتا تو میرے اندر کا ابال تیز ہو جاتا تھا لیکن اس ابال کو میں نے اپنے اندر محدود رکھا تھا اور اس کا اثر میری ظاہری شخصیت پر نہیں آیا تھا۔ تجربات نے مجھے سکھا دیا تھا کہ ٹھنڈے لوہے پر چوٹ بے کار ہوتی ہے۔ ہاں جب گرم ہو تو ذرا دیر مت کرو اور دوسرے میرا خدا پر یہ پختہ ایمان ہے کہ وہ موقع ضرور دیتا ہے کیونکہ وہ سب سے بڑا انصاف کرنے والا ہے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا ہے کہ کسی کے ساتھ کوئی ظلم ہو اور خدا اس کا بدلہ لینے کا موقع نہ دے۔ بس ضرورت ذرا صبر کی ہوتی ہے۔

ڈیوڈ شا مجھ سے ذرا آگے تھا۔ اسی گیلری میں گھوم کر ہم ایک چھوٹے سے کمرے میں آئے۔ یہاں میز پر چھوٹے چھوٹے کئی ایل سی ڈی مانیٹرز رکھے تھے اور یہ سب ایک کمپیوٹر سے منسلک تھے۔ ان پر اس چیمبر کی مختلف زاویوں سے ویڈیو دکھائی جا رہی تھی جہاں میں نے اور زرین نے دو ہولناک دن گزارے تھے۔ اگرچہ مجھے توقع تھی کہ وہاں مجھے ڈاکٹر نظر آئے گا اس کے باوجود وہ نظر آیا تو میں چند لمحے کے لیے ساکت رہ گیا تھا۔ انسان کی کیا اوقات ہے اور مکافاتِ عمل کتنی تیزی سے اس کے سامنے آ جاتا ہے اس بارے میں وہ کبھی نہیں سوچتا، خاص طور سے جب وہ حالات پر حاوی ہو۔ یہ سوچیں اسے اس وقت آتی ہیں جب حالات اس پر حاوی ہو جاتے ہیں اور جو ان چیزوں کو پہلے سوچ لے وہی اچھا انسان ہوتا ہے۔ مگر دنیا میں ایسے لوگوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے اور ڈاکٹر، مرشد اور ڈیوڈ شا جیسے لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔

ڈاکٹر نے ہمارے جسموں پر لباس چھوڑا تھا لیکن اس

www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے آقا عالی مرتبت نے ایک انڈویئر کا بھی تکلف نہیں کیا تھا اور ڈاکٹر اسی حالت میں چیمبر میں پڑا تھا جس حالت میں اس کی ماں نے اسے جنم دیا تھا۔ وہ ایک دیوار سے لگا اور خود کو سمیٹ کر بیٹھا ہوا تھا۔ ڈیوڈ شا میز کے سامنے رکھی واحد کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں اس کے پیچھے کھڑا تھا اور میرے پیچھے اس کے دونوں محافظ تھے۔ ڈیوڈ شا نے ایک مانیٹر کے کیمرے کو زوم کیا اور وہ ڈاکٹر توفیق کو بہت قریب سے دکھانے لگا۔ یہ دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ اس کے عریاں جسم پر جابہ جا ویسے ہی سرخ دھبے نمودار ہو رہے تھے جیسے کہ زرین کے بدن پر آئے تھے۔ وہ جس طرح ہاتھوں کو حرکت دے رہا تھا۔ لگتا تھا اس کے اندر درد اور بے چینی کا آغاز ہو گیا تھا۔ ڈیوڈ شا نے آہستہ سے کہا۔

"صرف بیس گھنٹے میں اس کا یہ حال ہو گیا ہے اور یہ شاید دو دن بھی زندہ نہ رہے۔"

"خالق اپنی تخلیق کا نشانہ بن رہا ہے۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "تم سے ایک سوال ہے۔ جب مغربی طاقتوں کے پاس دنیا کو مٹانے کے لیے کافی سے زیادہ ہتھیار موجود ہیں تو اس قسم کے ہتھیار بنانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"یہ تو ان ملکوں کے کرتا دھرتا ہی بتا سکتے ہیں۔" اس نے بے پروائی سے شانے اچکا کر خود کو اس پروجیکٹ سے الگ کرنے کی کوشش کی تھی۔

"ڈیوڈ شا ایسی باتیں تم ان کے سامنے کیا کرو جو تم کو نہیں جانتے ہیں، میں تمہارے بارے میں سب کچھ تو نہیں لیکن بہت کچھ جان چکا ہوں۔ ڈاکٹر صرف ایک کارکن تھا یہ اس کا پروجیکٹ نہیں تھا۔"

"مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔" ڈیوڈ شا کا لہجہ حسبِ معمول سپاٹ ہو گیا۔ "میں صرف مڈل مین ہوں اور ڈاکٹر اور ان لوگوں کے درمیان معاملات طے کراتا ہوں جو اس سے کام لے رہے تھے، تم چاہو تو یہ بات ڈاکٹر سے بھی پوچھ سکتے ہو۔ یہ اب تمہارے ہر سوال کا جواب دے گا۔"

"میں کس طرح بات کر سکتا ہوں؟"

ڈیوڈ شا نے سامنے رکھے کی بورڈ کا ایک بٹن دبایا اور مائک میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے مائک پکڑ کر کہا۔ "ڈاکٹر توفیق تم میری آواز سن رہے ہو؟"

وہ بری طرح چونکا۔ "شہباز تم کنٹرول روم میں ہو؟"

"ہاں اور تم اس چیمبر میں ہو جہاں سے یہ قول تمہارے آدمی مر کر ہی نکلتا ہے لیکن میں اس میں سے زندہ نکل آیا اور اب تم یہاں ہو۔"

وہ پھیکے انداز میں مسکرایا۔ "مجھے معلوم ہے میں تمہاری طرح خوش قسمت نہیں ہوں اور یہاں سے میری لاش ہی باہر جائے گی۔ لیکن کیا تم مجھ پر طنز کر رہے ہو؟"

"نہیں میں حالات بدل جانے پر اپنی اوقات بھولنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔"

"پوچھو۔" اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "اگر میں جانتا ہوں تو بتا دوں گا۔"

موت کو سامنے دیکھ کر اس کے سارے کس بل نکل گئے تھے۔ "ڈاکٹر تم یہ پروجیکٹ کن لوگوں کے لیے کر رہے ہو؟"

"میں نہیں جانتا..... یہ ایک نجی امریکی کمپنی ہے۔ میرا ان لوگوں سے تعارف ڈیوڈ شا نے کرایا تھا اور اسی نے معاملات طے کرائے تھے۔"

"تمہارے ذمے کیا کام لگایا گیا تھا؟"

"ایبولا وائرس کو اتنا طاقت ور بنانا کہ جسے لگے وہ کسی صورت موت سے نہ بچ سکے اور تین دن کے اندر مر جائے۔"

"تم نے اپنا کام خوب کیا ہے ڈاکٹر۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "میں اس کا عینی گواہ ہوں۔ آدمی صرف دو دن میں مر جاتا ہے۔ تمہیں اس کا معاوضہ کیا ملا؟"

"ویسے ایک لاکھ ڈالرز ماہانہ اور تمام اخراجات اور سامان امریکی کمپنی کے ذمے تھا اور پروجیکٹ کی کامیابی کی صورت میں مجھے ایک کروڑ ڈالرز اور امریکا یا یورپ کے جس ملک کی چاہتا شہریت مل جاتی۔"

"افسوس کہ اب تم کو نہ ایک کروڑ ڈالرز ملیں گے اور نہ ہی کسی ملک کی شہریت ملے گی۔ تم نے کیا پایا اپنے بے گناہ ہم وطنوں کا خون کر کے؟"

"مجھے معلوم ہے میں نے سب کھو دیا ہے لیکن زندگی ایک جُوا ہے اس میں انسان پاتا ہے تو کھوتا بھی ہے۔"

"وہ انسان ہونے کی حیثیت سے کھوتا اور پاتا ہے لیکن تم نے انسانیت کی تمام حدیں پار کر لی تھیں۔"

"شاید میں اسی کی سزا بھگت رہا ہوں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "میں نے تمہارے اور تمہارے ساتھی کے ساتھ جو کیا اس کا مجھے افسوس ہے۔"

میں نے گہری سانس لی۔ "ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا۔"

ڈیوڈ شا نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا اسے اردو آتی تھی لیکن اتنی نہیں آتی تھی کہ غالب کی شاعری سمجھ لیتا جو آج کل اردو بولنے اور پڑھنے والوں کو بھی سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ میں نے اسے ممکنہ حد تک اس کا ترجمہ کر کے بتایا۔ وہ مسکرانے لگا۔ "تمہاری زبان کے شاعر بھی غضب کی بات کر جاتے ہیں۔"

"شاعر کسی بھی زبان کے ہوں وہ غضب کی بات ہی کرتے ہیں۔ ایک مصرع میں پوری کیفیت اور کہانی بیان کر دیتے ہیں۔" میں نے کہا اور پھر ڈاکٹر کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ وائرس کا شکار ہو چکا ہے اور اس کی موت یقینی ہے؟"

"تقریباً اتنی ہی جتنی کہ ہزار فٹ کی بلندی سے گرنے والے کی ہو سکتی ہے۔"

"لیکن بعض اوقات بلندی سے گرنے والے بچ جاتے ہیں۔"

"ہاں میں نے بھی سنا ہے لیکن اس کا بچنا ناممکن سمجھ لو۔" ڈیوڈ شا نے مضبوط انداز میں کہا۔ "یوں سمجھ لو کہ دنیا کا کوئی بایولوجیکل ہتھیار اتنا خطرناک نہیں ہے جتنا کہ یہ وائرس بن گیا ہے۔"

"تب تم اسے مار کیوں نہیں دیتے اس طرح سسک سسک کر مرنے کے لیے کیوں یہاں ڈالا ہے؟"

"میں اس وائرس کی تباہ کاری اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "ویسے کیا تمہاری خواہش نہیں ہے کہ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے دیکھو۔"

"میں ایسی خواہش کیوں کروں گا؟"

"اس نے تمہیں اور تمہاری ساتھی کو انفیکٹ کیا تھا۔"

"اس صورت میں تو مجھے موقع ملنے پر پہلے تمہاری گردن توڑنی چاہیے تھی اصل کرتا دھرتا تو تم ہو۔"

"میں صرف درمیان کا آدمی ہوں اور میری گردن توڑنا اتنا آسان نہیں ہے۔"

"تم فکر مت کرو میں نے جب یہ کام کرنے کا ارادہ کیا تو اسے دنیا کا مشکل ترین کام سمجھ کر کرنے کی کوشش کروں گا۔" میں نے جواب دیا۔ "ویسے میرا خیال ہے ڈاکٹر کا کام مکمل ہو چکا ہے اور اس وائرس کو ان لوگوں تک پہنچانا ہے جو اسے ایک ہتھیار کی صورت میں بدل سکتے ہیں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو بلکہ وائرس ان تک پہنچ چکا ہے۔" ڈیوڈ شا نے مانیٹر کی طرف دیکھا اور ڈاکٹر کی طرف اشارہ کیا۔ "تم چاہتے ہو اسے کسی اور طریقے سے مار دیا جائے؟"

"میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی ہے۔ میں نے صرف یہ کہا کہ اسے سسک سسک کر مرنے کے لیے یہاں کیوں ڈالا گیا ہے جبکہ یہ تمہارا اپنا آدمی ہے۔"

"ہمارا آدمی تھا۔" ڈیوڈ شا نے سرد لہجے میں کہا۔ "اب یہ بے کار ہو چکا ہے۔"

"اس لیے تم نے مناسب سمجھا کہ اسے تجربے میں استعمال کر لیا جائے۔"

اس نے میرے طنز کا اثر لیے بغیر شانے اچکائے۔ "اس میں حرج ہی کیا ہے اسے مر جانا تو ہے۔ تب کیوں نہ وائرس کی تباہ کاری کی مزید تصدیق کر لی جائے۔"

اس سے پہلے میں کچھ کہتا ڈاکٹر کو اچانک کھانسی آنے لگی اور پھر اس کے منہ سے خون کے چھینٹے اڑ اڑ کر سفید فرش کو سرخ کرنے لگے تھے۔ اسے بہت جلدی اندرونی جریان خون شروع ہو گیا تھا۔ میں ایک لمحے کو اندر سے ڈر گیا تھا اگر یہ وائرس کسی بھی طریقے سے عام لوگوں میں پھیل جائے تو یہ چیچک اور طاعون کی طرح لوگوں کا صفایا کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ ان دونوں بیماریوں نے آج سے دو سو سال پہلے تک دنیا میں تباہی مچا رکھی تھی اور ان کے ہاتھوں ہر سال دنیا کے کسی نہ کسی حصے میں لاکھوں افراد موت کی آغوش میں چلے جاتے تھے پھر ان بیماریوں کا علاج اور ویکسین نکل آئی تھی اور اب دنیا میں ان بیماریوں کا نام و نشان نہیں تھا۔

لیکن یہ قدرتی بیماریاں تھیں اور ان کا علاج بھی قدرت نے خود سجھا دیا تھا۔ اب جدید سائنس کی مدد سے تجربہ گاہوں میں بیماریوں کے عام سے جرثوموں کو طاقت ور اور ناقابلِ شکست بنا کر ان سے بایولوجیکل ہتھیار تیار کیے جا رہے تھے۔ اگر یہ جرثومے حادثاتی طور پر بھی پھیل جاتے تو ان سے پھیلنے والی تباہی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے باوجود بڑی طاقتیں اور کچھ ایسے ممالک جو بڑی طاقت بننے کا خمار رکھتے ہیں اس قسم کے ہتھیاروں کی تیاری میں مصروف ہیں اور ان کو کوئی پروا نہیں ہے کہ اس قسم کے ہتھیاروں کو محفوظ طریقے سے رکھنا کتنا مشکل کام ہے۔ ان کے حادثاتی طور پر لیک ہو جانے، چوری ہو جانے اور دہشت گردوں کے ہاتھ لگ جانے کا کس قدر امکان تھا۔

میں نے ڈاکٹر کو آنے والی خوف ناک موت سے نجات دلانے کے لیے کسی اور طریقے سے مارنے کی تجویز

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دی تھی مگر ڈیوڈ شا نے چالاکی سے اس معاملے کو گول کر دیا اور مجھے لے کر واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ یہ کوئی بہت آراستہ پیراستہ کمرا نہیں تھا لیکن وہاں مناسب فرنیچر اور اس کی ضرورت کا سامان موجود تھا۔ اس میں ایک جدید قسم کا لیپ ٹاپ بھی تھا جو ایک میز پر رکھا تھا۔ میں انتظار کر رہا تھا کہ وہ اپنی پیش کش کے بارے میں مزید کیا کہتا ہے۔ میں اس کے زیادہ کھلنے کا منتظر تھا کہ اس کے ذہن میں اصل میں کیا ہے۔ وہ خود تو کرسی پر بیٹھ گیا تھا لیکن اس نے مجھے بیٹھنے کی پیش کش نہیں کی تھی۔ اس لیے میں ذرا پیچھے دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر جھولنے کے بعد اس نے کہا۔

''شہباز میں بہت کم کسی کو آفر کرتا ہوں لیکن تمہیں میں نے آفر کی ہے اب اس سے فائدہ اٹھانا تمہارا کام ہے۔''

''اس آفر کے لیے میں شکر گزار ہوں۔'' میں نے سادگی سے کہا۔ ''لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ تم میرے اتنے سارے مسائل حل کر کے مجھے میری پہلے والی زندگی لوٹانے کی بات کس طرح کر رہے ہو۔''

''اس معاملے میں تمہیں مجھ پر اعتماد کرنا چاہیے۔''

میں ہنسا۔ ''ڈیوڈ شا کیا تم نے مجھے کوئی عقل سے پیدل تیسری دنیا کا پٹھو حکمران سمجھ رکھا ہے جو میں تم پر اعتماد کروں۔''

اس کے چہرے کے زاویے ایک لمحے کو بگڑے تھے۔ ''تب تم کیا چاہتے ہو؟''

''اگر تم کوئی سنجیدہ پیش کش کرنا چاہتے ہو تو اسے تفصیل کے ساتھ سامنے رکھو تب ہی بات ہو سکتی ہے۔''

وہ کچھ دیر مجھے غور سے دیکھتا رہا پھر یک دم مسکرایا۔ ''میں تمہیں تیسری دنیا کا کوئی پٹھو حکمران نہیں سمجھ رہا ہوں، تم یقیناً ان سے کہیں زیادہ ذہین ہو۔ اس لیے تمہیں سمجھنا چاہیے کہ مجھ پر اعتماد کے سوا تمہارے پاس اور کوئی راستہ نہیں ہے۔''

''او کے فرض کر لو میں تم پر اعتماد کر لیتا ہوں اور مان لیتا ہوں کہ تم وہی کرو گے جو کہہ رہے ہو اس کے بعد کیا ہو گا تم مجھے رہا کر دو گے؟''

''فوری طور پر تو یہ ممکن نہیں ہے۔'' اس نے انکار کر دیا۔ ''ویسے بھی اگر تمہیں مرشد سے اپنے معاملات طے کرنے ہیں تو تمہارا اور اس کا آمنے سامنے ہونا ضروری ہے۔''

''ڈیوڈ شا اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ مرشد اس معاملے میں تمہاری بات سچ مچ مان لے گا تو تم غلطی پر ہو، جو شخص خدا کو دھوکا دینے کی کوشش کرتا ہے وہ تمہیں کہاں خاطر میں لائے گا؟''

''میں خدا نہیں ہوں۔'' ڈیوڈ شا کا انداز سپاٹ ہو گیا۔ ''یہ بات مرشد بھی اچھی طرح جانتا ہے، وہ مجھ سے بگاڑ نہیں کر سکتا کیونکہ میں اسے معاف نہیں کروں گا۔''

''یعنی تم ایک طرح سے اپنی ضمانت دے رہے ہو لیکن فرض کرو کہ کل کو تم انتقال کر جاتے ہو کیونکہ ایک تو تمہاری عمر کوئی پچپن کے آس پاس ہے اور پندرہ بیس سال مزید زندہ رہ سکو گے۔ ممکن ہے اس سے پہلے ہی مر جاؤ۔ تم جس فیلڈ میں ہو اس میں انسان بستر پر کم ہی مرتا ہے۔ تب تمہاری ضمانت کہاں رہے گی؟''

''میرا تعلق ایک معزز لارڈ فیملی سے ہے اور میری ضمانت کو تم ہمیشہ کے لیے سمجھ سکتے ہو۔''

ڈیوڈ شا یا تو خود بھولا بن رہا تھا یا مجھے بھولا سمجھ رہا تھا۔ کیونکہ امکان یہی تھا کہ وہ مجھے بھولا سمجھ رہا ہے اس لیے میں نے بھولا بننے کا فیصلہ کر لیا۔ ''یعنی ایک طرح سے سرکاری ضمانت دے رہے ہو۔ اس بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔''

وہ خوش ہوا تھا۔ ''تمہارے پاس سوچنے کے لیے وقت ہے۔''

اس کے حکم پر مجھے میرے قید خانے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ میں کوئی چھ سات گھنٹے سویا تھا میری نیند کی ضرورت پوری ہو گئی تھی۔ اب میں اپنے جسم کو جانچنا چاہتا تھا۔ میں نے ہلکی پھلکی ورزش سے آغاز کیا اور پھر کچھ سخت ورزشیں کیں۔ اس سے میرا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی سانس بھی بے ترتیب ہوئی تھی لیکن یہ جان کر مجھے سکون ملا تھا کہ میری جسمانی کارکردگی میں کوئی خاص فرق نہیں آیا تھا۔ اگر پہلے یہ سوچی تو اب یہ نوے ضرور تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وائرس اور اس کے توڑ کے استعمال نے مجھے نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ کارکردگی میں کمی کی وجہ بھی مستقل آرام تھا۔ میں تقریباً ایک ہفتے تک لیٹا رہا یا بندھا پڑا رہا تھا۔ اس لیے کچھ نہ کچھ فرق تو پڑنا تھا۔ پانی کی بوتل ایک بار پھر بھر دی گئی تھی لیکن کھانے کو کچھ بھی نہیں تھا سوائے صبر کے پھل کے۔ ورزش کر کے میں نے کچھ دیر آرام کیا اور دوبارہ ورزش کی۔ جب کرنے کو کچھ نہ ہو تو انسان کو یہ دو کام کرنے چاہئیں، ایک تو سو جائے اور دوسرے ورزش کرے۔

اگلی بار مجھے کوئی چھ سات گھنٹے بعد کھانا ملا اور اس بار

بھی دلیا اور اس میں گوشت تھا۔ اس بار نمک مرچ کسی قدر بہتر تھا اور مقدار زیادہ تھی۔ کیونکہ مجھے بھوک لگ رہی تھی اس لیے زہر مار نہیں کرنا پڑا۔ کھانے کے بعد مجھے ایک بار واش روم جانے کا موقع ملا اور پھر میں سو گیا۔ دن رات کا کچھ پتا نہیں تھا لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے رات ہو گئی ہے۔ میں دیر تک سویا تھا اور اس بار بھی مجھے جگایا گیا تھا۔ یہ وہی لمبا پوٹھوہاری تھا۔

''تمہیں صاحب نے بلایا ہے۔''

میں نے انگڑائی لی۔ ''صبح سویرے ناشتے کے بغیر صاحب کا منہ دیکھنا پڑے گا۔''

''بکو مت۔'' وہ غرایا۔ ''صاحب کے لیے ادب سے بات کرو۔''

''کیوں کیا وہ تمہارا مجازی باپ ہے؟'' میں نے پوچھا تو وہ توقع کے عین مطابق طیش میں آ گیا تھا اور اس نے میری طرف بڑھنے کی کوشش کی لیکن اس کے ساتھی نے روک لیا۔

''چھوڑ اسے... بس لے کر چل۔''

اسے بھی عقل آ گئی تھی۔ اس نے پیچھے ہٹ کر مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اس کے ساتھی سے کہا۔ ''اچھا ہوا تم نے اسے روک لیا ورنہ میں اسے بتا دیتا میں اس کے مجازی باپ سے کسی طرح کم نہیں ہوں۔''

''بکواس کرنے کے بجائے اب چل دو ایسا نہ ہو صاحب کا موڈ خراب ہو جائے۔'' دوسرے گارڈ نے خبردار کیا۔ ''اس کا موڈ پہلے ہی ٹھیک نہیں ہے۔''

ڈیوڈ شا کا موڈ واقعی خراب لگ رہا تھا اور وہ تیار تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کہیں سے آیا تھا یا کہیں جانے کو تیار تھا۔ اس نے مکمل سوٹ کے اوپر بھاری اوور کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس بار دونوں مسلح افراد میرے ساتھ ہی اندر آ گئے تھے۔ مجھے لگا کہ کوئی بات ہوئی تھی۔ کیونکہ ڈیوڈ شا تو نہیں لیکن باقی دونوں کچھ پریشان اور عجلت میں محسوس ہو رہے تھے اس کا اظہار ان کی جسمانی حرکات سے ہو رہا تھا۔ ڈیوڈ شا نے بلا تمہید کہا۔

''شہباز کیا یہاں تمہارے کچھ مددگار ہیں؟''

''ہاں ہو بھی سکتے ہیں لیکن ان کو یہ نہیں معلوم کہ میں کہاں ہوں اور کس حال میں ہوں۔'' میں نے شانے ہلائے۔ ''کیوں کیا کوئی خاص بات ہوئی ہے۔''

''شاید ہمیں یہاں سے جانا پڑے۔'' اس نے کہا اور اچانک ایک پستول کوٹ سے نکال کر مجھ پر تان لیا اور اپنے آدمیوں سے کہا۔ ''اسے باندھ دو۔'' پھر مجھ سے کہا۔ ''شہباز کوئی غلط حرکت مت کرنا ورنہ میں گولی چلاتے ہوئے پروا نہیں کروں گا۔''

لمبا پوٹھوہاری ہاتھ اور پیروں میں پہنانے والی ہتھکڑی لے کر آگے آیا۔ میں نے ہاتھ آگے کر دیے اور اس نے ان میں یہ ہلکی پھلکی لیکن بہت مضبوط ہتھکڑیاں ڈال دیں۔ پھر دوسری ہتھکڑی جو اصل میں بیڑی تھی اس نے میرے پیر میں ڈال دی۔ میں نے ڈیوڈ شا کی طرف دیکھا۔ ''کیا کسی نے مجھے رہا کرانے کی کوشش کی ہے۔''

ڈیوڈ شا نے جواب دینے کے بجائے واکی ٹاکی پر کسی سے پوچھا۔ ''صفائی کر دی ہے؟ کوئی نشان باقی نہیں رہنا چاہیے۔''

دوسری طرف سے سن کر اس نے واکی ٹاکی بند کر کے جیب میں ڈال لیا اور میز سے اپنا لیپ ٹاپ اٹھا کر اسے لیدر کیس میں ڈالا اور میرے ساتھ آنے والوں حکم دیا۔ ''اسے گاڑی میں لے جاؤ۔''

اب یہ واضح ہو گیا تھا کہ وہ یہاں سے کہیں جا رہے تھے۔ شاید یہاں سے سارے نشانات مٹا دیے گئے تھے جن سے پتا چلتا کہ اس کوٹھی میں کیا ہو رہا تھا۔ ممکن ہے ان نشانات میں ڈاکٹر بذاتِ خود بھی ہو کیونکہ اس کا اتنی جلدی مرنے کا امکان کم تھا مگر وہ اسے زندہ بلکہ لاش کی صورت میں بھی چھوڑ کر نہیں جا سکتے تھے اور اسے یقیناً بھٹی میں ڈال کر راکھ میں تبدیل کر دیا گیا ہو گا۔ اس سے پہلے وہ دونوں مجھے باہر لے جاتے میں نے ڈیوڈ شا سے کہا۔ ''تم نے کہا تھا کہ زرین کی راکھ میرے حوالے کرو گے۔''

ڈیوڈ شا ایک لمحے کو ٹھٹکا جیسے یہ بات اس کے ذہن سے نکل گئی تھی۔ پھر اس نے پلٹ کر الماری کھولی اور اس میں سے ایک پاؤچ نکال کر میری طرف اچھال دی۔ یہ اچھی قسم کے چمڑے سے بنی پاؤچ تھی۔ میں نے کیچ کر کے اس میں موجود راکھ کو محسوس کیا۔ دکھ کی وہ کیفیت جو میں بھول رہا تھا ایک بار پھر مجھ پر حاوی ہونے لگی۔ زندہ اور زندگی سے بھرپور زرین اب ایک مٹھی خاک میں بدل گئی تھی، ہر انسان کا بالآخر یہی انجام ہوتا ہے۔ میں نے گہری سانس لی اور پاؤچ کو ٹراؤزر کی جیب میں رکھ کر ڈیوڈ شا سے کہا۔ ''اس کے لیے میں سچ مچ تمہارا شکر گزار ہوں۔''

اس نے سر ہلایا اور کہا۔ ''ناؤ گو۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے دونوں محافظ مجھے پہلے کوٹھی میں اوپر لائے۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا صبح کا وقت تھا اور سورج بلند ہو رہا تھا۔ اندر کی گرمی اور عام کپڑوں کی وجہ سے باہر آتے ہی میں سردی سے لرز اٹھا تھا۔ برف باری جاری رہی تھی اور وہاں ہر طرف برف کے انبار لگے تھے اور اب ہوا چل رہی تھی۔ اس کی کاٹ کسی ریزر سے کم نہیں تھی۔ جہاں جہاں سے جسم کھلا تھا اس پر کسی ریزر کی طرح اپنی دھار آزما رہی تھی۔ پھر پورچ میں کھڑی ایک بڑی گاڑی تک لائے۔ اس کے تین حصے تھے' سامنے ڈرائیونگ کمپارٹ میں آگے پیچھے نشستیں تھیں اور پیچھے کا حصہ بالکل الگ اور بند ہونے والا تھا۔ اس کے دوہرے دروازے عقب میں کھلتے تھے۔ اس میں صرف فرش تھا۔ انہوں نے مجھے اس میں دھکیل دیا اور پھر دروازے بند کر دیے اندر کوئی ہینڈل نہیں تھا جس سے دروازے کھولے جاتے۔ روشنی بھی نہیں تھی۔ دروازے کے اوپر لگے سیاہ شیشوں سے کسی حد تک روشنی آ رہی تھی۔ لیکن ان کے پار دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ڈیوڈ شا نے کس وجہ سے یہاں سے جانے کا فیصلہ کیا تھا لیکن کوئی نہ کوئی وجہ ضرور تھی ورنہ اسے ایک اچھے خاصے محفوظ ٹھکانے کو یوں چھوڑ کر جانے کی کیا ضرورت تھی۔

میرے اندر امید کی کرن چمکی تھی شاید میرے ساتھیوں نے اس کوٹھی کا سراغ لگا لیا تھا لیکن اس سے پہلے وہ یہاں کوئی کارروائی کرتے ڈیوڈ شا نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ انہوں نے کوئی ناکام کارروائی کی ہو اور اس کے بعد انہوں نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کیا ہو۔ کیونکہ ان کو عجلت تھی لیکن ایسا نہیں تھا کہ باہر کہیں محاصرہ ہو۔ وہ بنا کسی خوف کے جا رہے تھے۔ البتہ جانے سے پہلے وہ سارے نشانات مٹا رہے تھے اور اس کام میں یقیناً دیر لگتی۔ میں نے دیکھا تھا پورچ میں ڈاکٹر کی شاندار کار نہیں تھی اسے شاید پہلے ہی یہاں سے ہٹا دیا گیا تھا۔

مجھے اس جگہ بند کر کے دونوں وہاں سے چلے گئے تھے ..... آس پاس بالکل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کیونکہ یہ جگہ چھوٹی سی تھی اس لیے میں نے پشت دیوار سے ٹیک کر دونوں پاؤں دروازے سے لگا کر زور ڈالا۔ لیکن دروازے بہت مضبوط اور خاص طور سے اسی لیے بنائے گئے تھے کہ زور ڈالنے پر بھی نہ کھلیں۔ میرے پاس وقت تھا اور ان کی آمد سے پہلے میں کوشش کر سکتا تھا۔ دوسری بار میں نے خود کو ذرا آگے کھسکایا اور کمر کے ساتھ ہاتھ بھی دیوار سے ٹیک کر دروازے پر دباؤ ڈالا مگر اس بار بھی دروازہ ٹس سے مس نہیں ہوا تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے اندر باہر دونوں طرف سے فولاد کی موٹی چادر سے بنایا گیا تھا تھک ہار کر میں نے کوشش ترک کر دی۔ کوئی پندرہ یا بیس منٹ بعد میں نے ڈیوڈ شا کی آواز سنی۔ وہ کسی سے پوچھ رہا تھا۔ ''وائرز چیک کیے؟''

''یس سر۔'' جواب دینے والا غیر ملکی لگا تھا لیکن وہ انگریز نہیں تھا۔ ''آپ جانتے ہیں میں کام سے مطمئن ہونے والا نہیں ہوں۔ تمام چیزیں اچھی طرح چیک کی ہیں۔''

''سنو اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو ہم یہاں آنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں گے۔'' ڈیوڈ شا نے اسے خبردار کیا۔ ''اب نہیں کہا جا سکتا ہے کہ باہر وہ لوگ ہیں یا نہیں۔''

''آل از او کے سر۔'' دوسرے نے مختصر جواب دیا۔

''ٹھیک ہے چلو۔'' ڈیوڈ شا نے کہا۔ اس پر دوسرے آدمی نے کسی سے پوچھا۔

''راستہ کلیئر ہے؟'' مجھے دوسرے آدمی کی آواز نہیں سنائی دی تھی۔ وہ شاید کہیں دور تھا اور اس سے وائی ٹا کی پر رابطہ تھا۔ غیر ملکی نے پھر کہا۔ ''او کے راستہ کلیئر دیکھ کر ہمارے پیچھے آنا اور کچھ دور رہنا اگر کوئی روکنے کی کوشش کرے تو اس سے نمٹنا۔''

کچھ دیر میں سب گاڑی میں آ گئے تھے اور گاڑی روانہ ہو گئی۔ گیٹ سے نکل کر گاڑی غیر متوقع طور پر دائیں طرف مڑی تھی یعنی وہ بلندی کی طرف جا رہی تھی۔ جبکہ میں سوچ رہا تھا کہ گاڑی نیچے کی طرف جائے گی۔ ڈیوڈ شا اور اس کے ساتھی یقیناً گھات سے فکرمند تھے جو کسی نے لگا رکھی تھی اور ڈیوڈ شا کا غیر ملکی ساتھی اسی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ گھات لگانے والوں کو چکما دینے کے لیے وہ الٹی سمت میں گئے تھے۔ یقیناً وہ آگے سے کسی دوسرے راستے سے گھوم کر اسلام آباد کی طرف جاتے لیکن فی الوقت وہ اس سے دور جا رہے تھے۔ وین کا یہ خانہ بھی سرد خانہ بنا ہوا تھا اور یہاں گرمی نہیں تھی جبکہ اس قسم کی گاڑی میں ہیٹر لازمی تھا۔ اگر ہیٹر آن تھا تب بھی اس کا اثر پیچھے تک نہیں آ رہا تھا۔ بہرحال یہ خانہ بند ہونے کی وجہ سے میں سرد ہوا سے محفوظ تھا۔ سردی سے بچنے کے لیے میں خود میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔ گاڑی چلنے کے بعد سے اگلے حصے سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی یا تو سب خاموش بیٹھے تھے یا پھر انجن کی آواز سے ان کی آوازیں دب گئی تھیں۔

جب گاڑی باہر نکلنے لگی تو مجھے امید تھی کہ کچھ دھوم دھڑکا ہو گا اور شاید باہر موجود ان کے دشمن اور شاید میرے ہمدرد کوئی کارروائی کریں لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا اور گاڑی مزے سے نکلتی چلی گئی تھی۔ دس پندرہ منٹ میں کچھ نہیں ہوا تو میری امیدیں بھی دم توڑ گئی تھیں کیونکہ اتنی لمبی گھات لگانا ممکن نہیں تھا۔ بے شک یہ پہاڑی علاقہ تھا لیکن یہاں راستوں کی کمی نہیں تھی اور نکلنے کے لیے کئی راستے تھے۔ اگر کسی کو روکنا ہوتا تو اسے کوٹھی کے پاس ہی گھات لگانی پڑتی۔ اس کا مطلب تھا کہ ڈیوڈ شا کا اندیشہ غلط تھا یا وہ بروقت وہاں سے نکل آیا تھا۔

اب تک گاڑی اوپر کی طرف جا رہی تھی اور تقریباً آدھے گھنٹے بعد اس کا رخ بدلا اور پھر وہ نیچے جانے لگی۔ مری اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں اوپر جاتے ہوئے بھی بعض مقامات پر گہرائیاں آتی ہیں جن میں گاڑیاں نیچے اترتی ہیں لیکن یہ بہت مختصر دورانیے کی ہوتی ہیں۔ جبکہ چڑھائیاں زیادہ آتی ہیں اور گاڑیوں کا منہ اکثر راتوں کو رونے والے کتے کی طرح اوپر کی طرف رہتا ہے۔ جبکہ واپسی کے سفر میں گاڑی کا منہ زمین سونگھتے کتے کی طرح نیچے کی طرف ہوتا ہے۔ جب گاڑی کا رخ مستقل نیچے کی طرف رہا تو میں سمجھ گیا کہ اب وہ اسلام آباد جا رہے تھے۔ زرین کی راکھ والا پاؤچ میرے ٹراؤزر کی جیب میں تھا۔ میں نے اسے نکال کر دیکھا۔ پاؤچ کے اندر سچ مچ راکھ تھی۔ اس سے جلی ہڈیوں والی بو آ رہی تھی۔ پتا نہیں مجھے اس راکھ کو کہیں دفن کرنے کا موقع بھی ملتا یا نہیں۔ کم سے کم جب تک میں ڈیوڈ شا کی قید میں تھا تب تک تو یہ کام محال تھا۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر اسے واپس جیب میں رکھ لیا۔

گاڑی کا سفر کوئی ایک گھنٹے جاری رہا تھا اور جیسے جیسے یہ نیچے جا رہی تھی سردی کا اثر بھی کم ہوتا جا رہا تھا۔ ایک گھنٹے بعد ہم یقیناً اسلام آباد یا راولپنڈی پہنچ چکے تھے کیونکہ سردی تھی لیکن اس کی کاٹنے والی کیفیت باقی نہیں رہی تھی۔ اس دوران میں' میں نے غور کیا تھا کہ ڈیوڈ شا مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہتا تھا۔ وہ اس وادی تک جانا چاہتا تھا جو ہمالیہ میں کہیں ناقابلِ گزر قسم کے پہاڑوں کے بیچوں بیچ تھی اور ایک خاص دھند اسے دنیا والوں کی نظروں سے محفوظ رکھے ہوئے تھی۔ راجا عمر دراز وہاں جا چکا تھا اور اس کا وہی حال تھا کہ ایک بار دیکھا ہے اور بار بار دیکھنے کی ہوس ہے۔ ممکن ہے ڈیوڈ شا بھی وادی یاترا کر آیا ہو۔ ویسے وہ ایک حیرت انگیز جگہ ہے اور اس کے بارے میں سن کر ہی آدمی کو اسے دیکھنے کی خواہش ہو جاتی ہے۔ کئی بار مجھے بھی خیال آیا کہ اس وادی کو دیکھنا چاہیے۔ مگر فی الحال دوسری مشکلات اتنی تھیں کہ ان سے عہدہ برآ ہونا جان جوکھم سے کم نہیں تھا یعنی میں راضی خوشی اس طرف جانے کے لیے تیار نہیں تھا، ہاں کوئی زبردستی لے جاتا تو الگ بات تھی۔ ڈیوڈ شا یہی کوشش کر رہا تھا۔

نیچے آنے کے دس منٹ بعد گاڑی کہیں رک گئی۔ وہ لوگ نیچے اترے اور میں نے ڈیوڈ شا کو کہتے سنا۔ ''اسے اندر لے آؤ۔''

''یس سر۔'' غیر ملکی نے کہا۔ اس کے ایک منٹ بعد گاڑی کا دروازہ کھلا اور اچانک نیم تاریکی سے روشنی ہوئی اور بہت تیز روشنی ہوئی تو آنکھیں چکا چوند ہو گئی تھیں۔ سامنے تین افراد کھڑے تھے لیکن عقب میں سورج ہونے کی وجہ سے وہ صاف نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں نے آنکھوں کے سامنے ہاتھ کر لیا تھا۔ ''باہر آؤ۔'' غیر ملکی نے اپنی بگڑی انگریزی میں کہا۔

میں اسی طرح ہاتھ سامنے کیے ہوئے نیچے اتر آیا تھا۔ اب کسی قدر بہتر دکھائی دے رہا تھا۔ غیر ملکی سانولے رنگ کا اور کسی قدر موٹے نقوش والا تھا۔ وہ مقامی لگتا تھا لیکن مقامی نہیں تھا۔ ہمارے ہاں انگریزی اس طرح نہیں بولی جاتی ہے جس طرح وہ بول رہا تھا، شاید وہ اسپینش تھا۔ باقی دو وہی مقامی افراد تھے۔ میں نے اس جگہ کا معائنہ کیا۔ یہ ایک بڑی کوٹھی تھی جس کے چاروں طرف اونچی چار دیواری تھی۔ گیٹ سے ایک اور گاڑی اندر آئی تھی اور گیٹ بند کیا جا چکا تھا۔ اس گاڑی سے بھی تین مسلح افراد اترے تھے۔ شاید یہ وہی پارٹی تھی جسے ممکنہ اسپینش نے ریکی اور حفاظت پر مامور کیا تھا اور وہ ڈیوڈ شا کی گاڑی کے پیچھے پیچھے آئے تھے۔ ان میں سے ایک گیٹ کی طرف چلا گیا تھا اور باقی دو ہماری طرف آئے تھے۔ ان میں سے ایک نے ممکنہ اسپینش آدمی سے پوچھا۔

''مارشل صاحب اب کیا حکم ہے؟''

مارشل نے ان سے کہا۔ ''تم چاروں کوٹھی کے باہر اور چھت پر رہو گے۔ کم سے کم ایک آدمی چھت پر رہے لیکن مسلح اور نمایاں نظر نہ آئے۔ میری بات سمجھ رہے ہو؟''

مقامیوں میں شاید اسی کی انگریزی اس قابل تھی ورنہ کوئی اور مارشل کی بات سمجھنے کے قابل نہیں تھا، ویسے اس کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انگریزی خود انگریزوں کی سمجھ میں بھی مشکل سے آتی ہوگی۔

"جی صاحب سمجھ گیا۔" مقامی نے کہا۔

"چلو۔" مارشل نے میری طرف دیکھا اور اندر کی طرف اشارہ کیا اور میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کے ساتھ اندر کی طرف چل پڑا۔ پیروں میں پڑی بیڑی کی گنجائش بس اتنی تھی کہ میں چھ سات انچ کے قدم اٹھا سکتا تھا۔ ہم اس کوٹھی کے پورچ میں تھے اور مارشل مجھے سامنے کے بجائے ایک بغلی دروازے سے اندر لایا۔ مقصد یہی تھا کہ میں سامنے والا حصہ نہ دیکھ سکوں۔ مارشل کے پاس بہ ظاہر کوئی اسلحہ نہیں تھا لیکن اس کا مسلح ہونا یقینی تھا شاید اسے اعتماد تھا کہ وہ میرے لیے خالی ہاتھ بھی کافی تھا جبکہ میرے ہاتھ پاؤں بھی بندھے ہوئے تھے۔ دو طویل راہداریاں طے کرنے کے بعد وہ مجھے ایک کمرے میں لایا جہاں صرف ایک عدد صوفہ سیٹ تھا اور وہاں ڈیوڈ شا موجود تھا۔ اس نے اوور کوٹ اتار دیا تھا۔ یہاں اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس کے اشارے پر میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ مارشل میرے عقب میں موجود رہا تھا۔

"وہاں وقت نہیں تھا۔" ڈیوڈ شا نے کہا۔ "ہمیں جلدی میں نکلنا تھا، اس لیے تم سے پوچھنے کا موقع نہیں ملا۔ یہاں تمہارے کتنے ساتھی ہیں؟"

"صرف تین ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "اگر تم میرے حالات سے واقف ہو تو تمہیں پتا ہوگا کہ میرے اصل ساتھی دبئی میں ہیں۔"

"وہ اب دبئی میں نہیں ہیں بلکہ میری اطلاعات کے مطابق ایران کے راستے پاکستان آچکے ہیں۔" اس نے کہا تو میں دنگ رہ گیا تھا۔ میرے اور میرے ساتھیوں کے بارے میں اس کی معلومات حیرت انگیز طور پر اپ ڈیٹ تھیں اور جو بات مجھے معلوم تھی بالکل وہی بات اسے بھی معلوم تھی۔ لیکن میں نے اپنی حیرت ظاہر نہیں کی۔

"میں اس سے بے خبر ہوں۔" میں نے کہا۔ "کیا اس کوٹھی پر کسی نے حملہ کیا تھا؟"

"نہیں لیکن کچھ مشکوک افراد وہاں منڈلا رہے تھے اور جب کوٹھی کے گارڈ نے انہیں روکنے کی کوشش کی تو وہ فائرنگ کرتے ہوئے فرار ہو گئے۔

"ممکن ہے وہ کوئی عام جرائم پیشہ ہوں اور لوٹ مار کے چکر میں ہوں۔"

"ہو سکتا ہے۔" ڈیوڈ شا نے تسلیم کیا۔ "لیکن اگر وہ تمہارے ساتھی تھے اور دوبارہ وہاں جائیں تو ان کو وہاں کچھ نہیں ملے گا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اس کوٹھی کی جگہ اب جلے ہوئے ملبے کے سوا کچھ نہیں ہوگا اور اسی ملبے میں ڈاکٹر کی راکھ شدہ لاش بھی ہوگی۔"

"تو تم نے نشان مٹانے کے لیے اس پوری کوٹھی کو تباہ کر دیا۔"

"مجبوری تھی۔" اس نے جواب دیا۔ "ورنہ وہ بہت اچھا ٹھکانا تھا اسے تباہ کرنے کی اصل وجہ وہاں وائرس کی ممکنہ موجودگی ہے۔ اس لیے اسے پوری طرح جلانا لازمی تھا۔"

"تم نے کیمیکل سے آگ لگائی ہوگی، کہیں وہ آس پاس نہ پھیل جائے کیونکہ آس پاس گھنا جنگل ہے۔"

"اس موسم میں ممکن نہیں ہے۔ درختوں پر برف ہے اس لیے ان میں آگ نہیں لگ سکتی....." اس نے کہا تو بات سمجھ میں آگئی۔ "خیر چھوڑو، یہ بات اب ماضی کا حصہ بن گئی ہے۔ کام کی بات پر آؤ۔"

"کام کی بات کیا ہے؟"

"تم جانتے ہو۔" اس نے سپاٹ انداز میں کہا۔ "اگر تم میرا ساتھ دینے پر آمادہ ہو تو میں ابھی ہی مرشد سے تمہارے سامنے بات کر لیتا ہوں۔ وہ آنے والا ہوگا۔"

"میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ میں تمہارا ساتھ کس طرح دے سکتا ہوں۔"

ڈیوڈ شا نے گہری سانس لے کر مارشل کی طرف دیکھا اور وہ اس کی آنکھ کا اشارہ سمجھ کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ اس نے جاتے ہوئے دروازہ بھی بند کر دیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ڈیوڈ شا کا ایک ہاتھ اس کے کوٹ کی جیب کے پاس ہو گیا تھا جس میں کوئی بھاری چیز تھی۔ یہ بھاری چیز کوئی ہتھیار ہی ہو سکتا تھا۔ وہ مجھ سے پوری طرح ہوشیار تھا۔ حالانکہ میں ہاتھ پاؤں سے جکڑا ہوا تھا۔ ڈیوڈ شا کچھ دیر خاموش رہا تھا پھر اس نے کہا۔ "تمہیں راجا عمر دراز نے اپنے سفر کے بارے میں بتایا ہوگا؟"

"ہاں پہلے سفر کے بارے میں بتایا تھا لیکن ابھی وہ واپس آئے ہیں تو ان سے میری ملاقات نہیں ہوئی ہے۔" میں نے صاف گوئی سے کہا۔

"اس نے ایک برف والے بوڑھے کا ذکر بھی کیا ہوگا

جو شدید سردی میں بھی عام سے کپڑوں میں رہتا ہے اور نہ کھاتا ہے اور پیتا ہے اس کی خوراک بس برف ہے۔ اسی وجہ سے وہ برف والا کہلاتا ہے۔"

"ہاں میں جانتا ہوں۔"

"یہ برف والا اس وادی کا نگران ہے اور اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر کوئی وہاں نہیں جا سکتا۔"

"ایک سوال ہے۔ یہ بات تم اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ رہے ہو یا ولیم شا کے سفر سے حاصل شدہ تجربات کی بنا پر بتا رہے ہو؟"

"اپنا ذاتی تجربہ بیان کر رہا ہوں، میں بھی اس وادی میں جانے کی کوشش کر چکا ہوں۔" اس نے کہا اور پھر انکشاف کیا۔ "عین اس وقت جب راجا عمر دراز وہاں جا رہا تھا۔"

"تم دونوں کی اس مہم جوئی کا نتیجہ کیا نکلا؟"

اس نے گہری سانس لی۔ "بہت برا... ہماری پارٹیاں آپس میں لڑ پڑی تھیں اور آخر میں ہمارے ساتھ بس ایک ایک آدمی بچا تھا سب سے اہم بات ہماری خوراک بھی تباہ ہو گئی تھی۔"

"تب تمہاری واپسی کیسے ہوئی؟"

"برف والے کی وجہ سے۔ ہمیں تو نیچے اترنے کا راستہ بھی نہیں مل رہا تھا۔"

میں چونکا۔ "آں... کیا تم اور راجا صاحب ایک ساتھ تھے؟"

اس نے سر ہلایا۔ "مجبوری تھی حالات نے ہمیں دشمنی بھلانے پر مجبور کر دیا تھا۔ کیونکہ اس ویرانے میں زندگی کے لیے ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت تھی۔ میرے پاس محدود خوراک تھی اور عمر دراز وادی میں اترنے والا راستہ جانتا تھا۔"

"حالانکہ میری معلومات کے مطابق اس نے اترنے کے لیے غلط راستہ چنا تھا اور تین ہزار فٹ کی بلندی سے گرا تھا۔"

"ہاں لیکن واپسی اس کی ٹھیک راستے سے ہوئی تھی۔" ڈیوڈ شا نے یاد دلایا۔ "ہمیں اسی راستے کی تلاش تھی اور راجا عمر دراز نے اسے تلاش بھی کر لیا تھا۔"

اب مجھے اس داستان سے دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ "پھر کیا ہوا تم لوگ نیچے اترے تھے؟"

"نہیں کچھ نیچے جانے کے بعد وہ راستہ غائب ہو گیا تھا۔ جبکہ راجا کا کہنا تھا کہ یہ وہی راستہ ہے۔"

"ممکن ہے بعد میں کسی وجہ سے راستہ ختم ہو گیا ہو؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "راستہ تھا لیکن برف والے نے اسے ہماری نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔"

میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ "تمہارا مطلب ہے برف والے نے کوئی نظر بندی جیسا کام کیا تھا؟"

"ہاں وہ ذہنی طور پر بہت طاقت ور ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ میں اس میدان میں بہت آگے ہوں لیکن جب میرا اس کا سامنا ہوا تو مجھے ایسا لگا جیسے میں کوئی بچہ ہوں۔" وہ بہت صاف گوئی سے بتا رہا تھا۔ "وہ بہت عمر رسیدہ اور کمزور سا آدمی تھا لیکن میں اور باقی اس کے سامنے یوں مودب رہتے تھے جیسے ہم اس کے غلام ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے راستہ مل گیا تھا اور تم لوگ نیچے اترے تھے؟"

"نہیں اس کے برعکس ہم مرنے والے تھے کیونکہ رہی سہی خوراک بھی ختم ہو گئی تھی۔ ہمارے پاس ایندھن بھی ختم ہو رہا تھا اور اس کے بعد سردی اور بھوک سے موت سامنے تھی۔ لیکن ایک رات اچانک ہی برف والا ہمارے سامنے تھا۔ اس وقت ہم میں اٹھنے کی سکت بھی نہیں تھی، شاید ہم اس رات کی صبح تک زندہ نہ رہتے۔ لیکن جب برف والے نے ہماری آنکھوں میں دیکھا تو نہ جانے ہم میں کہاں سے توانائی آگئی اور ہم اس کے ساتھ چل پڑے۔ وہ اسی راستے سے ہمیں لے کر غاروں کے اس سلسلے تک آیا جہاں وہ رہتا تھا۔ اس نے آگ اور خوراک سے ہمارا علاج کیا اور ہم چند دن میں ٹھیک ہو گئے۔"

"تم لوگ وادی میں اترے تھے؟"

"نہیں برف والے نے اس کی اجازت نہیں دی تھی، اس نے راجا عمر دراز کو یاد دلایا کہ اس نے اس سے کیا کہا تھا کہ وہ ہاتھ والے کو لے کر آئے تبھی اسے وادی میں اترنے کی اجازت ملے گی۔"

"ہاتھ والا... کون؟" میں نے انجان بن کر پوچھا۔

اس نے غور سے میری طرف دیکھا۔ "تم اتنے انجان نہیں ہو۔ ہاتھ والے سے مراد تم ہو۔ کیا تمہارا ہاتھ صرف اس وجہ سے تمہارے جسم کے ساتھ نہیں ہے کہ حکیم قادس نے اس کا علاج اس پتھر کے سفوف سے کیا تھا؟ اور یہ پتھر اسے برف والے نے دیا تھا خاص طور سے تمہارے لیے۔"

"یہ درست ہے لیکن اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہ وہ مفروضہ ہاتھ والا میں ہی ہوں۔"

"تمہارے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔" ڈیوڈ شا نے یقین سے کہا۔ "برف والے نے کہا ہے اس کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اس سے پہلے تمہیں وادی تک پہنچنا ہوگا ورنہ پھر تم یا کوئی اور کبھی اس وادی میں داخل نہیں ہو سکے گا۔"

"کیوں، کیا اس کے بعد وادی اس دنیا میں نہیں رہے گی یا کہیں اور منتقل ہو جائے گی؟" میرا لہجہ کسی قدر استہزائیہ ہو گیا تھا۔

"مذاق مت اُڑاؤ۔" اس نے خبردار کرنے والے انداز میں کہا۔ "تم ابھی اس بارے میں کچھ نہیں جانتے۔"

"سوری۔" میں نے معذرت کر لی۔ "مگر سوال وہی ہے میں ہی کیوں ضروری ہوں۔ کیا برف والے نے مجھے اپنی جگہ دینی ہے۔"

یہ بات میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے بھی بالکل مذاق میں کہی تھی مگر ڈیوڈ شا کا ردِعمل حیرت انگیز تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ "مجھے بھی یہی خیال آیا یقین کرو وہ تمہارے لیے بہت بے تاب ہے۔"

کیونکہ میرا صرف برف کھا کر کسی غار میں اکیلے رہنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اس لیے میں نے اسی وقت سوچ لیا کہ کوئی بہت بڑی مجبوری نہ ہوئی تو میں اس وادی کے پاس بھی نہیں پھٹکوں گا۔ میں نے ڈیوڈ شا کی طرف دیکھا۔ "مگر اس نے راجا عمر دراز سے کہا کہ وہ ہاتھ والے شخص کو لے کر آئے تمہارا اس سے کیا تعلق ہے؟"

"میرا خیال ہے جو تمہیں لے کر جائے گا صرف اسے ہی وادی میں اترنے کی اجازت ملے گی۔"

میں ہنسا۔ "گویا میں کوئی پروانہ راہداری یا آج کی زبان میں ویزا ہوں جس کے پاسپورٹ پر لگ گیا اسے جانے کی اجازت مل جائے گی۔"

"ہاں اس بوڑھے کو اس سے کوئی غرض نہیں ہوگی کہ تم کو کون لاتا ہے، اسے صرف تم سے مطلب ہے۔"

"ممکن ہے وہ یہ بھی دیکھے کہ میں کس کے ساتھ آیا ہوں۔ ورنہ وہ راجا عمر دراز کے ساتھ تم سے بھی کہتا۔"

میرے سوال پر ڈیوڈ شا ایک لمحے کو چپ ہوا تھا پھر اس نے ضدی لہجے میں کہا۔ "ممکن ہے ایسا ہی ہو اس کے باوجود میں چانس لینا چاہوں گا۔"

"کیونکہ اس کی قیمت تم نہیں کوئی دوسرا دے گا۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "ویسے ڈیوڈ شا آج کل تم اس دنیا کے حکمران بنے ہوئے ہو پھر اتنی تکلیف کیوں اٹھاتے ہو اگر تم ایک فوجی دستہ لے کر براہ راست اس وادی تک پہنچ جاؤ تب بھی میرے خیال میں کوئی تمہیں روکنے کی کوشش نہیں کرے گا۔"

اس نے سر ہلایا۔ "اس طرح میرے مقاصد پورے نہیں ہوں گے۔ بات بھی کھل جائے گی اور تم جانتے ہو وادی اصل میں چین کی سرزمین پر ہے اور حکومت چین اسے اپنے معاملے میں مداخلت سمجھے گی۔"

"گویا کوئی بھی مہم صرف اس وقت کامیاب رہے گی جب چھپ چھپا کر کی جائے؟"

"یہی بات ہے۔"

"اور تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ جاؤں؟"

اس نے سر ہلایا۔ "ہاں اس کے بدلے میں تمہارے تمام مسائل حل کرانے کا ذمہ لیتا ہوں۔"

"ڈیوڈ شا خدائی دعویٰ مت کرو۔ انسان کے مسائل وہی حل کر سکتا ہے جس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔"

"اوکے... میں کوشش کروں گا۔" اس نے خلافِ توقع مفاہمانہ انداز میں کہا۔ "اگر تم راضی ہو تو میں پوری کوشش کروں گا اور مجھے یقین ہے میں کامیاب بھی ہو جاؤں گا۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ معاملہ صرف میرا ہی نہیں تھا بلکہ میرے ساتھیوں کا تھا۔ اگر مرشد کا کانٹا درمیان سے نکل جاتا تو باقی مسائل سے نمٹنا ہمارے لیے اتنا مشکل نہیں تھا۔ عدالتی معاملات ندیم کے ذمے ہوتے اور باقی سے ہم خود نمٹ سکتے تھے۔ ہمارے پاس اب دولت بھی تھی اور طاقت بھی تھی لیکن اگر میں ڈیوڈ شا کے لیے کام کرنے کو تیار ہو جاتا تو یہ میرے ضمیر کے خلاف ہوتا۔ میں ایک برے شخص کا برے کام کے لیے ساتھ دیتا۔ اس..... میں تو کوئی شبہ نہیں تھا کہ ڈیوڈ شا کے عزائم نیک نہیں تھے۔ اس کا ارادہ وادی کے راز اور وہاں سے انوکھی چیزیں حاصل کر کے ان کو اپنے مفاد میں استعمال کرنا تھا۔ چاہے اس کے لیے اسے انسانوں کا خون کیوں نہ بہانا پڑے۔ میں نے سوچ کر کہا۔ "ڈیوڈ شا میرے لیے ممکن نہیں ہے کہ میں تمہارے خون آشام منصوبوں میں تمہارا ساتھ دوں۔"

"خون آشام؟" اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ظاہر ہے تم کسی نیک مقصد کے لیے تو وادی کی طرف نہیں جا رہے ہو تمہارے اپنے مقاصد ہیں اور مجھے ذرا بھی

شبہ نہیں ہے کہ اس سے بہت سارے بے گناہ لوگوں کو نقصان ہوگا۔"

"یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔ اسے میری بات اچھی نہیں لگی تھی۔ "تمہارے مسائل وہ ہیں جن کا میں نے ذکر کیا ہے اور دوسرے میں تم سے ساتھ دینے کو نہیں صرف ساتھ چلنے کو کہہ رہا ہوں۔"

"تمہارا مطلب ہے میں صرف تمہارے ساتھ سفر کروں اور خود کو برف والے کے حضور پیش کر دوں تاکہ وہ تمہیں وادی میں اترنے کا پروانہ عطا کر دے۔"

"ظاہر ہے ورنہ جس طرح تم مجھ پر اعتماد نہیں کر رہے ہو اسی طرح میں تم پر کس طرح اعتماد کر سکتا ہوں۔ اگر تم میرے ساتھ ہوئے تو تمہاری حیثیت ایک قیدی سے زیادہ نہیں ہوگی۔"

"اس صورت میں غور کیا جا سکتا ہے، مجھے اپنے ساتھیوں سے پوچھنا ہوگا۔"

"شہباز ملک فیصلہ تمہیں کرنا ہے اور ابھی کرنا ہے۔" اس نے ذرا جھک کر کہا۔ "میرے پاس وقت نہیں ہے۔"

"فرض کرو میں انکار کرتا ہوں تب...؟"

"میں مرشد کو بلا چکا ہوں وہ اب سے ایک گھنٹے میں یہاں آ جائے گا اور اگر تم نے انکار کیا تو تمہیں اس کے حوالے کر کے چلا جاؤں گا۔"

ڈیوڈ شا کا لہجہ فیصلہ کن تھا اور میں اندر سے ہل گیا تھا۔ مرشد میرا ایسا دشمن تھا جو مجھے کسی صورت معاف نہیں کرتا۔ مجھے تڑپا تڑپا کر مارنا یقیناً اس کی سب سے بڑی خواہش تھی، اگرچہ ایک بار وہ فتح خان کی وجہ سے مجھے چھوڑنے پر مجبور ہو گیا تھا لیکن ہر بار ایسا ہونا ممکن نہیں تھا کیونکہ فتح خان اسے مل چکا تھا۔ میں اس کے ہاتھ نہیں آنا چاہتا تھا۔ ڈیوڈ شا نے غور سے مجھے دیکھا۔ "شہباز تمہارے پاس بھی وقت نہیں، اس بار تم مرشد کے ہاتھ آ گئے تو کل کا سورج نہیں دیکھ سکو گے۔"

"مجھے بھی یقین ہے لیکن تم جانتے ہو میں اس قسم کی باتوں کی پروا ذرا کم کرتا ہوں۔" میں نے نڈر ہونے کی کوشش کی۔

"بات صرف تم تک محدود نہیں رہے گی بلکہ تمہارے بعد تمہارے ساتھیوں کی باری آئے گی اور پھر تمہارے خاندان کی باری آئے گی۔ اپنے ایک بھائی کی موت سے تمہیں کسی قدر اندازہ تو ہو گیا ہوگا۔"

میرے ہونٹ بھنچ گئے تھے۔ "میں اپنے بھائی کا خون اسے معاف نہیں کروں گا۔"

"ابھی تو مرحلہ اپنی جان بچانے کا ہے اور جہاں تک تمہارے بھائی کے مرڈر کا تعلق ہے اس میں کوئی درمیانی راستہ بھی نکالا جا سکتا ہے۔"

"ڈیوڈ شا تم اسے ابھی درست طور پر نہیں جان سکے ہو، وہ اس وقت تمہاری بات مان لے گا اور پھر جب موقع دیکھے گا تو مجھ پر اور میرے ساتھیوں پر وار کر جائے گا۔"

"جب میں کہہ رہا ہوں کہ میری ضمانت صرف میری نہیں ہوگی اسے اچھی طرح معلوم ہوگا کہ ضمانت کے خلاف جانے پر اس کے ساتھ کیا ہوگا۔"

میں مرشد پر تو کسی صورت اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ مجھے ڈیوڈ شا پر بھی اعتماد نہیں تھا، اس کا تعلق ایک دغاباز قوم سے تھا جو قانون اور اصولوں کو صرف اپنے ملک کی سرزمین پر مانتی ہے اور ملک سے باہر وہ ان سب باتوں سے ماورا ہو جاتی ہے۔ ڈیوڈ شا یقیناً اپنی قوم کی اسی ذہنیت کا نمائندہ تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی میں معاملے کو اس حد تک خراب نہیں کرنا چاہتا تھا کہ انجام کار وہ مجھے مرشد کے حوالے کر دے۔ میں نے سوچ کر کہا۔ "اگر میں تمہارا ساتھ دینے پر تیار ہو جاتا ہوں تو کیا تم ابھی مجھے رہا کر دو گے؟"

"ہاں میں تمہیں ابھی چھوڑ دوں گا۔" اس نے سر ہلایا۔ "مرشد سے بات ہونے کے بعد میرے آدمی تم جہاں کہو گے تمہیں چھوڑ آئیں گے۔"

"تب مجھے منظور ہے۔" میں نے کہا۔

"گڈ۔" اس نے کہتے ہوئے واکی ٹاکی نکالا اور بولا۔ "عبدل کو لے آؤ۔"

میں چوکنا ہو گیا، عبدل کون تھا اور اسے بلوانے کی کیا وجہ تھی؟ ڈیوڈ شا نے میری رضامندی پاتے ہی اسے کیوں طلب کیا تھا؟ اس کا جواب عبدل کے آنے پر مل سکتا تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ کوئی خاص بات ضرور تھی۔ چند منٹ بعد دروازہ کھلا اور مارشل اندر آیا۔ اس کے ساتھ ایک نوکر نما آدمی اندر آیا اس نے سادہ سی شلوار قمیص اور سویٹر پہن رکھا تھا۔ عمر چالیس برس تھی اور صورت سے زمانے کے سخت حالات عیاں تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سینے پر کپڑے میں لپٹی کوئی چیز لگا رکھی تھی۔ جب میں نے غور کیا تو میرے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ یہ قرآن مجید تھا جو عبدل نے سینے سے لگا رکھا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہ تمہاری مقدس کتاب ہے۔" ڈیوڈ شا نے میرے تاثرات سے لطف اندوز ہونے والے انداز میں کہا۔ "میں نے سنا ہے کوئی مسلمان جو خدا سے ڈرتا ہو اس کی جھوٹی قسم نہیں کھاتا ہے۔"

"تو تم اس مقدس کتاب پر مجھ سے قسم لو گے؟" میرا لہجہ تلخ ہو گیا۔

"ہاں کیونکہ اس کے بغیر میں کس طرح اطمینان کر سکتا ہوں کہ تم وہی کرو گے جو کہو گے۔"

"میں جھوٹا نہیں ہوں اور اگر جھوٹا ہوں تو اس کتاب پر ہاتھ رکھ کر بھی جھوٹ بول سکتا ہوں۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے لوگ بے دھڑک اس پر ہاتھ رکھ کر جھوٹ بولتے ہیں اور ان کا ضمیر ذرا بھی ملامت نہیں کرتا ہے۔"

"میں جانتا ہوں لیکن مجھے یقین ہے تم ایسا نہیں کرو گے۔" اس نے یقین سے کہا۔ "ہاں اگر تم اس پر قسم نہیں کھاؤ گے تو مجھے اطمینان نہیں ہو گا۔"

میں نے بے بسی سے ڈیوڈ شا کی طرف دیکھا۔ "پلیز ایسا مت کرو، میں وعدہ کرتا ہوں تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

"میں نے کہا نا جب تک تم اس پر ہاتھ رکھ کر قسم نہیں کھاؤ گے مجھے اطمینان نہیں ہو گا۔ اگر مجھے اطمینان نہیں ہوا تو میں تمہیں مرشد کے حوالے کر دوں گا۔"

"ڈیوڈ شا یہ بلیک میلنگ ہے۔"

"تم چاہو تو ایسا ہی سمجھ لو۔" اس نے بے پروائی سے کہا اور کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی۔ "تمہارے پاس دس منٹ ہیں اس کے بعد مرشد آ جائے گا اور میرے پاس وقت نہیں ہے کیونکہ اب سے ڈھائی گھنٹے بعد میری فلائیٹ ہے۔"

میں نے سوچا اور گہری سانس لی۔ "ٹھیک ہے مجھے منظور ہے لیکن پہلے میں وضو کرنا چاہوں گا۔ میرا مطلب ہے ہاتھ منہ دھونا چاہتا ہوں۔"

"مجھے وضو کا پتا ہے۔" اس نے جواب دیا اور مارشل سے بولا۔ "اسے لے جاؤ۔"

مارشل مجھے ایک واش روم میں لایا جہاں میں نے بندھے ہاتھوں سے بہ مشکل وضو کیا کیونکہ مارشل نے مجھے کھولنے سے انکار کر دیا تھا۔ کسی نہ کسی طرح وضو کر کے میں اس کے ساتھ واپس آیا، عبدل بدستور قرآن مجید سینے سے لگائے کھڑا تھا۔ اس نے قرآن میری ... طرف بڑھا دیا۔ میں نے اسے ہاتھ میں لیا۔ ڈیوڈ شا غور سے مجھے دیکھ رہا تھا اس نے کہا۔ "اب تم کہو کہ تم وادی کی طرف جانے والے سفر میں میرا ساتھ دو گے۔"

"میں تمہارے ساتھ ایک قیدی کی طرح سفر کروں گا۔" میں نے کہا۔ "میں سوائے سفر کرنے کے تمہارے ساتھ اور کسی قسم کا تعاون کرنے کا پابند نہیں ہوں گا۔"

"قیدی کی طرح۔" اس نے میرے الفاظ پر غور کیا۔ "یعنی تم فرار ہو سکتے ہو۔"

"ایک قیدی کو فرار کا پورا حق ہوتا ہے اگر وہ ریاست کا قیدی نہ ہو۔"

"نہیں شہباز اس طرح کام نہیں چلے گا تمہیں میرا ساتھ دینا ہو گا اور تم فرار کی کوشش نہیں کرو گے۔"

میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ "ٹھیک ہے میں فرار کی کوشش نہیں کروں گا۔ لیکن مجھے ساتھ رکھنا تمہاری ذمے داری ہو گی، اگر کہیں میں تم سے بچھڑ گیا یا کہیں جان پر بن آئی تو میں اس عہد کا پابند نہیں رہوں گا یعنی اگر مجھے جان کا خطرہ ہوا تو میں تمہارا ساتھ چھوڑ سکتا ہوں۔ بعد میں، میں تمہیں تلاش کرنے کا پابند بھی نہیں ہوں گا۔"

"منظور ہے بہ شرط کہ خطرہ کسی اور طرف سے ہو۔" ڈیوڈ شا مان گیا۔ "اس کے علاوہ تم کسی صورت میرا ساتھ نہیں چھوڑو گے۔"

"دوسرے جب تم برف والے تک رسائی حاصل کر لو گے تو میرا اور تمہارا تعلق ختم ہو جائے گا اس کے بعد میں اپنا فیصلہ خود کرنے کا مجاز ہوں گا۔"

"مجھے یہ بھی منظور ہے۔" وہ مان گیا۔

"ٹھیک ہے ان تمام کنڈیشنز کے ساتھ میں تمہارا ساتھ دینے کا عہد کرتا ہوں۔ لیکن یاد رکھنا اگر مرشد نے میرے خلاف کوئی بھی قدم اٹھایا جس سے مجھے یا میرے ساتھیوں کو کوئی نقصان ہوا تو میں اس عہد سے بری الذمہ ہوں گا۔" میں نے کہا اور قرآن مجید عبدل کو واپس کر دیا۔ ایسا کرتے ہوئے میں نے خدا سے معافی مانگی۔ میں نے اس کتاب کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا تھا جو میرے جیسے انسان کے لیے بہت بڑی بات تھی۔ ڈیوڈ شا مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

"اب مجھے یقین ہے تم میرا ساتھ دو گے۔"

"میں دوں گا لیکن تم نے میرے ساتھ ظلم کیا ہے۔ میں اللہ کی کتاب کے اس استعمال کے خلاف ہوں۔"

"مجھے بھی مذہب کو اس طرح سے استعمال کرنا پسند نہیں ہے لیکن مجبوری تھی۔" اس نے کہا لیکن اس کے لہجے

میں کوئی افسوس نہیں تھا۔ اس نے ایک بار پھر گھڑی کی طرف دیکھا اور جیب سے موبائل نکال کر کسی کو کال کی۔ رابطہ ہونے پر اس نے صرف اتنا کہا۔ "کہاں ہو تم میں انتظار کر رہا ہوں۔" دوسری طرف سے جواب سن کر اس نے موبائل بند کر دیا اور مارشل سے کہا۔ "مرشد آنے والا ہے اسے آتے ہی یہاں لے آنا لیکن اس کے کسی آدمی کو گاڑی سے مت اترنے دینا اور ان کی پوری طرح نگرانی کرنا۔"

عبدل قرآن مجید لیتے ہی واپس چلا گیا تھا۔ مارشل کے جانے کے بعد میں نے ڈیوڈ شا سے کہا۔ "ویسے تو مرشد خود تمہارا مرید بنتا ہے لیکن ایسا لگتا ہے تم اس پر بھی اعتماد نہیں کرتے ہو؟"

"میں جس دنیا کا باسی ہوں اس کا اولین اصول یہ ہے کسی شخص پر اعتماد مت کرو جس پر اعتماد کرنے کو تمہارا دل نہ کہے۔"

"یعنی تم اندر سے مرشد پر اعتبار نہیں کرتے ہو؟"

"تم ایسا کہہ سکتے ہو۔" اس نے سر ہلایا۔

"میرے بارے میں کیا کہتے ہو؟"

"میرے اندر سے خیال آتا ہے کہ میں تم پر اعتماد کر سکتا ہوں لیکن ظاہری طور پر ہم دوست نہیں ہیں۔"

میں مسکرایا۔ "اس لیے کہ تم مجھ پر بھی اعتماد نہیں کرتے ڈیوڈ شا، تم دل اور دماغ دونوں کی ماننے والے لگتے ہو اس طرح تو تم شاید ہی کسی پر اعتبار کرتے ہو۔"

"نہیں ایک شخص ہے جس پر میں اعتبار کرتا ہوں۔" وہ مسکرایا۔

"اور وہ شخص تم خود ہو۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا تو وہ کچھ بولا نہیں تھا۔ میں اس سے ایمن کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا مگر پھر سوچ کر خاموش رہا، ممکن ہے اسے میرے اور ایمن کے حالیہ تعلق کا علم نہ ہو اور میں بات کروں تو اسے پتا چل جائے۔ چند منٹ بعد ڈیوڈ شا کو اطلاع ملی کہ مرشد پہنچ گیا ہے لیکن وہ اپنے دو محافظوں کو ساتھ لانے پر مصر ہے۔ ڈیوڈ شا نے واکی ٹاکی پر اس سے بات کرانے کو کہا۔

"مرشد تم مجھ سے ملنے آئے ہو اور مجھ سے جو ملنے آتا ہے وہ اکیلا ہوتا ہے... مجھے معلوم ہے تم اب کوئی وزیر بن گئے ہو اور اچانک تمہاری جان کے دشمن پیدا ہو گئے ہیں لیکن پھر بھی تمہیں اکیلے آنا ہو گا... ٹھیک ہے تم واپس جا سکتے ہو..." میں یہ سب سن رہا تھا اور مرشد کے مکالمے میری سماعت سے دور تھے۔ واکی ٹاکی بند کر کے ڈیوڈ شا مسکرایا اس نے مجھ سے کہا۔ "وہ آ رہا ہے۔"

"شاید وہ تمہاری بات ماننے میں تامل کر رہا تھا۔ اب تم دیکھنا اس کا انداز بدل گیا ہے۔ وہ پہلے سے زیادہ فرعون بن گیا ہے۔"

مرشد کچھ دیر بعد اپنے مخصوص مرشدانہ حلیے میں ہمارے سامنے تھا۔ اس نے خونی نظروں سے میری طرف دیکھا اور کسی قدر طنزیہ انداز میں بولا۔ "جناب والا یہ... اور آپ کے ساتھ۔"

"ہاں یہ میرے ساتھ ہے اب۔" ڈیوڈ شا نے لفظ ناؤ پر زور دیا تھا۔ مرشد چالاک آدمی تھا سمجھ گیا۔ وہ اپنا لبادہ سمیٹتے ہوئے ڈیوڈ شا کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"کیا اس سے آپ کی کوئی ڈیل ہو گئی ہے؟"

"تم ایسا ہی سمجھو۔" ڈیوڈ شا نے جواب دیا اور پھر اپنی بات سامنے رکھ دی۔ "میں چاہتا ہوں کہ اب تم دونوں صلح کر لو۔"

مرشد نے طنزیہ انداز میں میری طرف دیکھا۔ "صلح برابر کے لوگوں میں ہوتی ہے۔"

"یہ صلح اصل میں تمہارے اور میرے درمیان ہو رہی ہے۔" ڈیوڈ شا نے کہا۔ "شہباز اب میرے ساتھ ہے۔"

مرشد کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ڈیوڈ شا مجھے اپنا ساتھی قرار دے رہا ہے اور میری طرف سے وہ صلح کر رہا تھا۔ پھر اس نے سنبھل کر احتجاجی انداز میں کہا۔ "جناب کیا میری خدمات کا یہی صلہ ہے کہ آپ میرے دشمن کو اپنا ساتھی قرار دیں؟"

"تمہاری خدمات کا تمہیں کیا صلہ ملا ہے یہ تم جانتے ہو یا میں اپنے منہ سے بتاؤں۔" ڈیوڈ شا کے چیلنج پر مرشد کا سر مرغی کی گلفی کی طرح ڈھلک گیا تھا، ویسے بھی اپنے رنگ برنگے لبادے میں وہ کوئی دیسی مرغی ہی لگ رہا تھا۔ اس کی خاموشی پر ڈیوڈ شا نے گھڑی دیکھی۔ "میرے پاس صرف ایک گھنٹا رہ گیا ہے، مجھے اس دوران میں یہ مسئلہ حل کرنا ہے۔"

"جناب عالی آپ کا وقت بہت قیمتی ہے۔" مرشد عیاری سے بولا۔ "آپ کہاں ان چھوٹے چھوٹے معاملات میں پڑ رہے ہیں۔"

"تم مجھے بتانے کی کوشش کر رہے ہو کہ مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔" ڈیوڈ شا کا لہجہ سرد ہو گیا۔ مرشد نے جلدی سے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''میری اتنی جرات کہاں جناب عالی۔''

''میں نے تم کو بحث کرنے کے لیے نہیں بلایا ہے۔ صرف یہ بتانے کے لیے بلایا ہے کہ اب شہباز اور اس کے ساتھی میری ذمے داری ہیں اور اگر ان میں سے کسی کو نقصان ہوا تو اس کا ذمے دار تمہیں سمجھا جائے گا۔''

''کیا یہ آپ کا حکم ہے؟'' مرشد نے فوراً دم دبالی تھی لیکن مجھے اس کے انداز میں شرارت کی جھلک آرہی تھی۔

''ہاں تم اسے میرا حتمی فیصلہ سمجھ سکتے ہو۔''

''میں تو آپ کا خادم ہوں لیکن میرے خاندان والے اس بات کو نہ مانیں خاص طور سے میرا بھائی نادر اس کا سر اپنے سامنے دیکھنے کے لیے بہت بے چین ہے۔'' مرشد نے میری طرف دیکھا۔

''لگتا ہے اسے بستر پر بھی چین نہیں ہے اور وہ اسے بستر مرگ میں بدلنا چاہتا ہے۔'' میں نے جواب دیا تو مرشد کی آنکھوں میں ایک لمحے کو شعلہ سا چمکا تھا۔

''شہباز تم سے ابھی بہت سارے حساب لینے ہیں۔''

''وہ تو مجھے لینے ہیں۔ اپنے بھائی کا اور اپنے ساتھیوں کا۔'' میں نے لہجہ بدل کر کہا۔ ''تم صرف اس دن سے ڈرو جس دن میں نے تمہاری سطح پر آنے کا فیصلہ کر لیا، تمہاری بربادی میں چند دن سے زیادہ کا وقت نہیں لگے گا۔''

مرشد نے زخمی سانپ کی طرح بل کھا کر ڈیوڈ شا کی طرف دیکھا۔ ''آپ نے دیکھا یہ شخص دشمنی ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔''

''مرشد میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ قصور کس کا ہے اور کون اپنی حد سے تجاوز کر رہا ہے۔ میں نے تم کو اپنا فیصلہ سنا دیا ہے۔ اس کی خلاف ورزی کے نتائج کا تمہیں اچھی طرح اندازہ ہوگا اس لیے امید ہے کہ تم کوئی ایسی حرکت نہیں کرو گے جو تمہیں عرش سے اٹھا کر فرش پر لے جائے۔''

مرشد کچھ دیر ساکت رہا تھا، اس کے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ ڈیوڈ شا نے اسے اسی لیے بلایا ہوگا۔ پھر اس نے بادلِ ناخواستہ کہا۔ ''ٹھیک ہے جناب اگر آپ کا حکم ہے تو ماننا پڑے گا لیکن کیا یہ میرے خلاف کچھ کرنے سے باز رہے گا؟''

''میں نے پہلے بھی تمہارے خلاف از خود کچھ نہیں کیا ہے اور آئندہ بھی میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

''تم نے سن لیا۔''

''اس کے خلاف پولیس کیس بھی ہیں۔'' مرشد نے دوسرا نکتہ اٹھایا۔ ''اگر اسے پولیس نے پکڑ لیا تو میرا...''

''میں اسی طرف آرہا تھا۔'' ڈیوڈ شا نے اس کی بات کاٹی۔ ''شہباز کے خلاف تمام کیسز ختم کرانا بھی تمہاری ذمے داری ہے۔''

مرشد کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور اس نے ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی، مجھ پر اتنا بوجھ ڈالیں جتنا میں برداشت کر سکوں۔''

''مرشد میں تم پر اتنا ہی بوجھ ڈال رہا ہوں جتنا تم برداشت کر سکتے ہو ورنہ تم جانتے ہو اس ملک میں میرے ایک اشارے پر کیا ہو سکتا ہے، مجھے تم سے کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کسی سے بھی کہوں گا اور شہباز کے خلاف کیس دو دن میں واپس ہو جائیں گے۔ لیکن میں یہ موقع تمہیں دینا چاہتا ہوں۔ تمہاری گڈ بک میں اضافہ ہوگا۔''

مرشد نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ ممکن نہیں ہے، ان پولیس حکام اور سرکاری افسران کے سامنے میری کیا ساکھ رہ جائے گی جب میں ان سے اپنے دشمن کے کیس ختم کرنے کو کہوں گا۔''

''تمہیں ان معمولی لوگوں کی پروا ہے۔'' ڈیوڈ شا کے لہجے میں حقارت آگئی تھی۔ ''خیر تمہاری مرضی... تم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس معمولی سے کام کے عوض میں تمہیں کیا فائدہ دینے والا تھا۔''

فائدے کے نام پر مرشد چوکنا ہو گیا تھا اور اس نے فوری پینترا بدلا۔ ''نہیں جناب عالی میں انکار تو کر رہا ہوں اگر آپ کہیں تو...''

''نہیں اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' ڈیوڈ شا نے سرد لہجے میں کہا۔ ''تم نے وقت گنوا دیا ہے اور تم چند دن میں سن لو گے کہ کیسز ختم ہو گئے ہیں۔''

ڈیوڈ شا کے انکار پر مرشد نے بھی تیور بدل لیے تھے۔ ''یہ اتنا آسان بھی نہیں ہے جناب عالی۔''

''تمہارے لیے شاید مشکل ہو لیکن میرے لیے نہیں۔'' ڈیوڈ شا نے اعتماد سے کہا اور کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ ''تمہیں کوئی بھی مسئلہ ہو تو تم ہائی کمیشن کے فرسٹ سیکریٹری جانسن ہانز سے رابطہ کر سکتے ہو۔''

میں نے شکریہ کی ضرورت محسوس نہیں کی کیونکہ وہ مجھ پر کوئی احسان نہیں کر رہا تھا۔ مرشد بھی کھڑا ہو گیا تھا اور اس نے شکوہ کیا تھا۔ ''آپ نے مجھے اچانک آزمائش میں ڈال

دیا ہے۔''

''انسان کی زندگی میں آزمائشیں آتی رہتی ہیں، سب اچھا نہیں ہوتا ہے۔'' ڈیوڈ شا نے کہا اور باہر چلا گیا۔ اس نے ہم سے ہاتھ ملانے یا کوئی رسمی الوداعی جملہ کہنے کی زحمت نہیں کی تھی اور ایسے ہی رخصت ہو گیا۔ وہ جس قسم کا آدمی تھا اس سے مجھے ایسی ہی توقع تھی۔ اس کے جانے کے بعد مرشد نے میری طرف دیکھا۔

''تم نے اسے کیسے رام کر لیا؟''

''میں نے کوئی کوشش نہیں بلکہ میں تو تیار بھی نہیں تھا۔ اس نے جیسے تمہیں مجبور کیا اسی طرح مجھے بھی مجبور کر دیا۔''

اس نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ ''کیا تمہیں ڈیوڈ شا کی ضمانت پر اعتماد ہے؟''

''سچی بات ہے بالکل بھی نہیں کیونکہ میرا خیال ہے وہ تمہیں اتنی اچھی طرح نہیں جانتا جتنی اچھی طرح میں جانتا ہوں۔''

وہ مسکرانے لگا۔ ''اب شاید تم مجھے ٹھیک سمجھنے لگے ہو۔''

''مرشد جو شخص خدا کو دھوکا دینے کی کوشش کرے اس کے سامنے کسی انسان کی کیا حیثیت ہوگی بس اسی سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ تم وہ نہیں کرو گے جو ڈیوڈ شا تم سے چاہتا ہے۔''

اس کا منہ بگڑ گیا تھا۔ ''تم اپنی اوقات سے بڑھ کر بولنے لگے ہو۔''

''مرشد انسان کی کوئی اوقات نہیں ہوتی ہے اور تم بھی ایک انسان ہو اسے مت بھولا کرو۔'' میں نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ابھی تک میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں کھڑا ہوا تو مرشد خوف زدہ ہو گیا۔ حالانکہ میرے ہاتھ پیر جکڑے ہوئے تھے اور ڈیوڈ شا نے ان کو نہیں کھلوایا تھا۔ مرشد جلدی سے دروازے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ میں مسکرایا۔ ''فکر مت کرو میں عملی طور پر تمہیں تمہاری اوقات یاد نہیں دلا رہا ہوں۔''

اسی لمحے مارشل اندر آیا تھا۔ اس نے سرسری سی نظروں سے مرشد کو دیکھا اور بولا۔ ''تم جا سکتے ہو۔''

''بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے۔'' میں نے گنگنا کر کہا تو مرشد مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا ہوا رخصت ہوا۔ مارشل میرے پاس آیا اور ایک چابی سے ہاتھ اور پیر کی بندشیں کھول دی تھیں۔ اس سے پہلے اس نے مجھے خبردار کیا تھا کہ میں کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش نہ کروں۔ لیکن ظاہر ہے میں اس کی ہدایت کا پابند نہیں تھا۔ جیسے ہی اس نے میرے ہاتھ آزاد کیے میں نے اچانک اس کے جبڑے پر گھونسا مارنے کی کوشش کی۔ میرا خیال تھا کہ وہ غافل ہے لیکن اس نے نہایت پھرتی سے جھکائی دے کر میرا وار خالی جانے دیا۔ میں زور میں گھوم گیا تھا۔ اس نے عقب سے جھکا ہوا سر میری کمر پر مارا اور میں سامنے دیوار پر جا پڑا اگر ہاتھ آگے نہ کر لیتا تو میرا منہ ناک برابر ہو جاتے۔ دیوار سے ہاتھ ٹکاتے ہی عقب میں دولتی جھاڑی لیکن وہ یہ وار بھی بچا گیا اور جیسے ہی میرے پاؤں زمین سے ٹکے اس نے لات مار کر میرا توازن بگاڑ دیا تھا اور میں گر پڑا۔ وہ بہت تیز تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اس لیے میں نے فوراً ہاتھ اٹھا دیے۔

''ٹھیک ہے میں نے ہار مانی تم یقیناً زیادہ اچھے فائٹر ہو ویسے میں صرف پریکٹس کر رہا تھا۔''

اس نے ہاتھ آگے کیا۔ ''میں سمجھ گیا تھا... اگر تمہارے عزائم خطرناک ہوتے تو تم کوئی فیصلہ کن وار کرتے۔''

''مثلاً کون سا وار؟'' میں نے پوچھا تو اس نے جواب میں اچانک ہی کھڑی ہتھیلی سے میری گردن سے نیچے مارنے کی کوشش کی۔ یہاں دل سے آنے والی بڑی شریان ہوتی ہے اور اس پر ضرب آدمی کو کچھ دیر کے لیے مفلوج کر دیتی ہے۔ میں نے نیچے سے ہاتھ اوپر لاتے ہوئے اس کا وار روک دیا۔ میرے ہاتھ پر ہلکی چوٹ آئی تھی لیکن اس کا تباہ کن وار بے کار کر دیا تھا۔ وہ جواباً مسکرایا۔

''تم بھی کم پھرتیلے نہیں ہو جبکہ ابھی تم ایک خطرناک بیماری سے بچ کر آئے ہو۔''

''شکریہ... میرا خیال ہے تم اسپینش ہو؟''

''تمہارا اندازہ درست ہے، میرا پورا نام جارجی مارشل ہے۔ اصل میں میرا دادا انگریز تھا اور اس کا تعلق ڈیوڈ شا کے خاندان سے تھا لیکن میرا باپ اسپین میں مقیم رہا تھا اور میں خود کو اسپینش ہی سمجھتا ہوں۔''

میں چونکا۔ ''اس لحاظ سے تم ڈیوڈ شا کے رشتے دار بھی ہوئے لیکن اس کے ساتھ ہونے کی وجہ یقیناً اس سے تمہارا رشتہ نہیں ہے۔''

اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ ''تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''کیونکہ ڈیوڈ شا رشتوں کا پاس کرنے والا شخص نہیں ہے، میں نے سنا ہے اس نے اپنے گم ہو جانے والے کزن کی

www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جائداد اور خطاب پر قبضہ کرلیا ہے جبکہ اس کے کزن کی اولاد بھی موجود ہے۔"

مارشل نے سر ہلایا۔ "قبضہ نہیں کیا ہے' اس کے گم ہونے والے کزن برٹ شا نے اسے اپنا وارث مقرر کیا تھا۔"

"لیکن برٹ شا کی بیٹی کا کہنا ہے کہ اس نے دھوکے سے یہ کام کیا ہے اور اصل میں اپنے باپ کی وارث وہ ہے۔"

مارشل نے غور سے مجھے دیکھا۔ "تم اس کی بیٹی کو کس طرح جانتے ہو؟"

"بہت پہلے برٹ شا اور اس کی بیٹی ایمن مجھ سے شمالی پاکستان میں ملے تھے۔ میں وہاں راجا عمر دراز کا مہمان تھا اور پھر برٹ نے اس کے عجائب گھر سے کچھ نوادرات چوری کرائے تھے۔ تب سے میں اسے جانتا ہوں۔"

"جہاں تک مجھے علم ہے ایمن غلط کہتی ہے اور ڈیوڈ شا نے مجھے میری صلاحیت کی وجہ سے جاب دی ہے۔"

"تم یہاں اس کے امور کے نگراں ہو؟"

"تم چاہو تو ایسا ہی سمجھ لو۔"

"اوکے میں نے سمجھ لیا، اب یہ بتاؤ کہ مجھے رہا کرنے کا کیا پروگرام ہے؟"

اس نے گھڑی کی طرف دیکھا اور بولا۔ "کچھ دیر میں تمہیں تم جہاں کہو گے وہاں چھوڑ دیا جائے گا۔"

"مرشد واپس جاچکا ہے؟"

"یقیناً اس کی گاڑی اس وقت یہاں سے ایک کلومیٹر دور جاچکی ہوگی۔" اس نے یقین سے کہا۔

"تمہیں یقین ہے مجھے رہا کرتے وقت وہ کوئی مداخلت نہیں کرے گا؟"

"میں اس کی نیت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" اس نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ "میرا کام تمہیں وہاں پہنچا دینا ہے جہاں تم کہو اس کے بعد جو ہو وہ میری ذمے داری نہیں ہے۔"

"لیکن ڈیوڈ شا نے ذمے داری لی ہے کہ مرشد میرے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرے گا۔"

"اگر باس نے ایسی کوئی ذمے داری لی ہے تو تم بے فکر رہو مرشد یا کوئی بھی دوسرا شخص تمہارے خلاف کچھ کرنے کی جرات نہیں کرے گا۔" اس نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔

"تمہارا باس امریکا کا صدر نہیں ہے جس کی ضمانت سب مانیں۔" میں نے ناگواری سے کہا۔ "دوسرے تم مرشد کو نہیں جانتے، وہ کتے کی دم ہے جو کسی صورت سیدھی نہیں ہوسکتی ہے، چاہے اسے ہزار سال نلکی میں رکھو۔"

"میں کہہ چکا ہوں میں یہ سب نہیں جانتا۔" اس نے خشک لہجے میں کہا۔ "میں صرف یہاں ڈیوڈ شا کے معاملات کا نگراں ہوں اور اس نے مجھے ایسی کوئی ہدایت نہیں کی ہے کہ میں مرشد یا کسی بھی دوسرے شخص سے تمہارا بچاؤ کروں۔"

میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "مجھے معلوم نہیں تھا کہ ڈیوڈ شا کی ضمانت اتنی کمزور ہوگی کہ اس کے آدمی تک اسے تسلیم نہیں کریں گے۔"

"بکومت۔" وہ غرایا۔ "میں نے کہا نا ڈیوڈ شا نے مجھ سے اس قسم کی کوئی بات نہیں کی ہے۔ اگر اس نے کہا ہوتا تو میں اپنی جان کی قیمت پر بھی تمہاری حفاظت کرتا۔"

"چلو اس نے نہیں کہا اس لیے تمہاری جان بچ گئی۔" میں نے طنز کیا۔ "اب میں جاؤں گا۔"

"تمہیں کہاں جانا ہے؟" اس نے سوال کیا تو میں سوچ میں پڑ گیا تھا۔ میں اسے عبداللہ والی کوٹھی پر نہیں لے جا سکتا تھا، یہ تو دشمن کو خود اپنا گھر دکھانے والی بات ہوتی۔ باقی کسی دوسری جگہ کا میں نے سوچا نہیں تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میں عبداللہ سے مدد لے سکتا تھا۔ میں نے مارشل سے پوچھا۔

"کیا میں ایک کال کرسکتا ہوں؟"

"کرسکتے ہو۔" اس نے سر ہلایا اور ایک موبائل نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے موبائل لے کر عبداللہ کا نمبر ملایا۔ تیسری بیل پر اس نے کال ریسیو کی اور شاید اجنبی نمبر دیکھ کر محتاط انداز میں بولا۔

"ہیلو۔"

"عبداللہ... اگر آواز سے مجھے پہچان لیا ہے تو نام مت لینا۔"

اس نے پہچان لیا تھا، کچھ دیر بعد دھیمی آواز میں بولا۔ "آپ... آپ کہاں چلے گئے تھے، ہم نے آپ کو کتنا تلاش کیا۔" وہ بولا۔ "ابھی آپ کہاں ہیں اور یہ کس کا نمبر ہے۔"

"ایک مہربان کا ہے۔" میں نے مارشل کی طرف دیکھا۔ "یہ بتاؤ گھر کے پاس کوئی ایسی جگہ ہے جہاں تم کسی

سے مجھے ریسیو کرا سکو اور وہاں کوئی تیسری پارٹی آسانی سے دخل اندازی نہ کرسکے۔"

عبداللہ ذہین آدمی تھا وہ میری بات کا مفہوم سمجھ گیا۔ اس نے کہا۔ "آپ فیصل مسجد کے سامنے آسکتے ہیں۔ وہاں مرکزی دروازے پر یہ کام آسان ہوگا۔"

"تم کتنی دیر میں وہاں پہنچ سکتے ہو، تیاری کے ساتھ؟"

"صرف آدھا گھنٹا لگے گا۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے مارشل سے پوچھا۔ "تم کتنی دیر میں مجھے چھوڑنے جاؤ گے؟"

مارشل نے اشارے سے دو گھنٹے کا کہا تو میں نے عبداللہ سے کہا۔ "تم دو گھنٹے بعد آجانا ٹھیک ہے؟"

"آپ بے فکر رہیں میں وہاں موجود ہوں گا۔"

"آس پاس نظر رکھنا مجھے مرشد سے خطرہ ہے۔" میں نے خبردار کرنا مناسب سمجھا تھا۔

"ٹھیک ہے جناب میں نکل رہا ہوں۔" اس نے مسرت سے کہا۔

کال ختم کرکے میں نے کال بک سے نمبر ڈیلیٹ کیا اور موبائل مارشل کو واپس کردیا تبھی مجھے خیال آیا کہ میں نے وسیم اور سفیر کے بارے میں تو پوچھا ہی نہیں۔ بہرحال اب کچھ دیر کی بات تھی پھر میں اپنوں کے درمیان ہوتا۔ میں نے مارشل سے پوچھا۔ "دو گھنٹے بعد لے جانے کی کوئی خاص وجہ ہے؟"

"کچھ انتظامات کرنے ہیں۔" اس نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ "تب تک تم آرام کرسکتے ہو۔" اس نے کہا اور باہر نکل گیا، جب باہر سے لاک لگنے کی آواز آئی تو میں نے بے ساختہ دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ اسے باہر سے بند کرگیا تھا۔ گویا میں بدستور ڈیوڈ شا کا قیدی تھا جب تک کہ مجھے رہا کرنے کا حتمی وقت نہیں آجاتا۔ دروازہ بند کرنے کا مقصد یہی تھا کہ میں سکون سے یہاں بیٹھا رہوں اور بلاوجہ گھوم پھر کر ان لوگوں کے لیے کوئی مشکل نہ کھڑی کروں۔

بہرحال یہاں مجھے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں صوفے پر دراز ہوگیا۔ میرے پاس جوتے نہیں تھے اور اس کا امکان بھی نہیں تھا کہ یہاں میرے ناپ کے جوتے مل جاتے کیونکہ میرا پاؤں ذرا بڑا تھا۔ مجھے نارمل سائز کے جوتے مشکل سے آتے تھے اور دوسرے ان لوگوں سے اتنی مہربانی کی توقع بھی نہیں تھی کہ وہ مجھے جوتے مہیا کرتے۔ صوفے پر دراز ہوکر میں نے ایک بار پھر پاؤچ میں موجود زرین کی راکھ کو محسوس کیا۔ وقت آگیا تھا کہ میں اس کی آخری خواہش پوری کرتا۔ وقت گزر رہا تھا۔ اب شاید دوپہر کا وقت تھا اور مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی کیونکہ ناشتے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ مجھے بند ہوئے ایک گھنٹا گزر گیا تھا پھر شاید دوسرا گھنٹا بھی گزر گیا اور مارشل یا اس کے کسی آدمی کی آمد کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔

میں نے اٹھ کر دروازہ پیٹا اور پھر پیٹتا چلا گیا۔ چند منٹ کے بعد مارشل کی آواز سنائی دی۔ "کیا بات ہے؟"

"میرا خیال ہے دو گھنٹے ہوگئے ہیں اور میرے آدمی مقررہ جگہ انتظار کررہے ہوں۔"

"کرنے دو کچھ دیر اور انتظار کرنے سے وہ خشک نہیں ہوجائیں گے۔" مارشل بے پروائی سے بولا۔

"مارشل مسئلہ کیا ہے تم واضح بات کرو۔" میں نے تیز لہجے میں کہا۔

اس نے کچھ کہا نہیں لیکن دروازہ کھل گیا۔ وہ سامنے کھڑا تھا۔ خلافِ توقع اس نے نرم لہجے میں کہا۔ "میں نے کہا نا ایک مسئلہ ہوگیا ہے۔ تمہیں اس گاڑی میں لے جانا ہے جس میں ڈیوڈ شا ائرپورٹ گیا ہے اور وہ گاڑی اب تک واپس نہیں آئی ہے۔ اس میں کچھ خرابی ہوگئی ہے۔ جیسے ہی ٹھیک ہوگی اور وہ آئے گی تب تمہیں لے جائیں گے۔"

"اس صورت میں مجھے اپنے آدمیوں کو بتانے دو؟" میں نے مطالبہ کیا۔ اس نے کچھ سوچا اور موبائل نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔

"ایک منٹ سے زیادہ بات مت کرنا۔"

"تم فکر مت کرو۔" میں نے عبداللہ کا نمبر ملاتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔ "موبائل ریٹ کا مجھے بھی علم ہے۔"

اس نے مجھے گھور کر دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں تھا۔ عبداللہ نے اس بار فوراً کال پک کی تھی۔ "آپ کہاں ہیں؟"

"مجھے ذرا دیر ہوسکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم وہیں رہنا۔"

"ٹھیک ہے آپ فکر مت کریں جب تک آپ نہیں آجاتے ہم یہاں موجود رہیں گے۔"

اس سے پہلے میں مزید کچھ کہتا یا عبداللہ سے پوچھتا مارشل نے اچانک ہاتھ بڑھا کر موبائل چھین لیا۔ "ابھی ایک منٹ نہیں ہوا ہے۔" میں نے احتجاج کیا۔

"تم نے... کام کا بات... کرلیا... میں اردو جانتا۔" اس نے اٹک اٹک کر اردو اور شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

"یہ تو یہاں آنے والے گوروں کی خاص بات ہے،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اردو جانتے ہیں لیکن انجان بنے رہتے ہیں۔" میں نے بھنا کر کہا۔ "اور ضروری ہے کہ مجھے اسی گاڑی میں لے جایا جائے؟"

مارشل نے مجھے سرد نظروں سے دیکھا۔ "یہ ہم بہتر جانتے کہ تمہیں کیسے لے جانا ہے، اب دروازہ مت بجانا۔" اس نے کہا اور دروازہ دھڑ سے بند کر دیا۔ میں ٹھنڈی سانس بھر کر واپس صوفے پر دراز ہو گیا۔ اب مجھے تشویش ہو رہی تھی۔ آخر مارشل مجھے اسی گاڑی میں لے جانے پر کیوں مُصر تھا۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد دروازہ کھلا اور پہلے عبدل اور پھر مارشل اندر آئے۔ عبدل نے ایک ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ اس میں سادہ دال چاول اور اچار کی کٹوری تھی۔ عبدل نے ٹرے سامنے میز پر رکھی۔ "معاف کرنا صاحب... آج یہی پکا ہے۔"

مارشل نے کہا۔ "گاڑی آنے میں ابھی وقت لگے گا تب تک تم بھوکے رہتے۔"

"مہربانی ہے تمہاری۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا اور کھانے کی طرف متوجہ ہوا۔ عبدل نے کہا۔

"صاحب آپ کھالو تو میں آپ کے لیے چائے لے آتا ہوں۔"

"اللہ خوش رکھے۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔ "لیکن پہلے پانی لا دو یار۔"

عبدل پانی لے آیا اور پھر وہ دونوں چلے گئے اور میں نے دال چاول اچار کے ساتھ کھانا شروع کر دیے۔ سادہ ہونے کے باوجود یہ بہت مزے کے لگے تھے۔

جب تک میں نے کھانا ختم کیا عبدل چائے بھی لے آیا تھا۔ اس بار بھی مارشل اس کے ساتھ تھا۔ عبدل یقیناً یہاں ملازم تھا۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے لیے نرم گوشہ رکھتا ہے، یہ بات اس کے انداز سے عیاں تھی۔ یہ اور بات تھی اس نے مجھ سے کوئی بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کھانا کھا کر اور چائے پی کر میں خود کو آسودہ محسوس کر رہا تھا۔ حالات و واقعات کی فکر میں بھوک نہ لگنے کی علت میں بہت پہلے ترک کر چکا تھا کیونکہ میں نے جان لیا تھا کہ میں کتنے ہی فاقے کر لوں اس کا حالات پر کوئی اثر پڑنے والا نہیں ہے۔ اس لیے بہتر تھا کہ جب، جہاں اور جیسا کچھ کھانے کو مل جائے تو ہرگز کفرانِ نعمت نہ کیا جائے۔ وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا اور اس کمرے کی کھڑکی سے باہر دن شام میں بدل رہا تھا۔ شاید بارش ہو چکی تھی کیونکہ اب دھند بالکل صاف تھی لیکن سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ پتا نہیں مارشل کی گاڑی کہاں اور کیسے بن رہی تھی۔ مجھے شبہ ہونے لگا تھا کہ وہ کوئی چکر کر رہا تھا اور کسی وجہ سے مجھے رہا کرنے سے گریز کیا جا رہا تھا۔ اگر یہ کوئی چکر بھی تھا تو میرے پاس سوائے صبر سے انتظار کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ جب شام تاریک ہونے لگی تھی تو دروازہ کھلا اور مارشل کی صورت نظر آئی۔ اس کے ساتھ وہی لمبا پوٹھوہاری تھا اور حسبِ معمول مشین گن سے مسلح تھا۔ مارشل نے میری طرف دیکھا۔

"تیار ہو جاؤ ہم تمہیں چھوڑنے جا رہے ہیں۔"

"اس پروٹوکول کے ساتھ۔" میں نے پوٹھوہاری کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ حفاظت کے لیے ہے اور بھی ہوں گے۔" مارشل نے کھردرے لہجے میں کہا۔ "چلو۔"

میں ان کے ساتھ اسی بغلی دروازے سے باہر پورچ تک آیا جس سے مجھے اندر لے جایا گیا تھا۔ باہر اب روشن دن کے بجائے تقریباً تاریکی تھی اور اسی حساب سے سردی بھی تھی۔ جوان معمولی کپڑوں میں اور ننگے پاؤں کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔ پورچ میں وہی بڑی گاڑی موجود تھی جس کے پچھلے حصے میں بند کر کے مجھے یہاں تک لایا گیا تھا۔ میں عبداللہ کے بارے میں سوچ رہا تھا، اس کا انتظار کچھ زیادہ ہی طویل ہو گیا تھا۔ وہ وہاں موجود ہو گا یا نہیں؟ میں نے مارشل کی طرف دیکھا۔

"میرے ساتھی نے تمہیں کال کرنے کی کوشش کی تھی؟"

اس نے سر ہلایا۔ "کی تھی لیکن میں نے ریسیو نہیں کی۔"

"ٹھیک ہے مجھے اس کو اطلاع دینے دو۔" میں نے مطالبہ کیا۔ "ورنہ وہ پریشان ہو گا۔"

اس نے گاڑی کا عقبی خانہ کھولا اور بولا۔ "کچھ دیر پریشان ہونے سے اس کی صحت خراب نہیں ہو گی۔"

میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ "مارشل مجھے نہیں معلوم تم ایسا کیوں کر رہے ہو لیکن اگر تمہاری وجہ سے مجھے یا میرے ساتھیوں کو کوئی نقصان ہوا تو تمہارے لیے بھی اچھا نہیں ہو گا۔"

جواب میں مجھے عقب سے دھکا لگا اور میں گاڑی کے خانے میں جا گرا اور فوراً ہی دروازہ بند ہو گیا تھا۔ مارشل کی آواز آئی۔ "میرا پلان بدل گیا ہے، اب ہم تمہیں اپنی طے کی ہوئی جگہ پر چھوڑیں گے اور تمہارے ساتھیوں کو تمہیں لینے وہیں آنا پڑے گا۔"

میں نے دروازے پر لات ماری اور چیخ کر بولا۔ "مارشل تم ٹھیک نہیں کر رہے ہو۔ یہ ڈیوڈ شا سے کیے

موٹاپا آپ کی جان بھی لے سکتا ہے!!

سمارٹ بنو

سمارٹیب لو!

سمارٹیب بدن میں موجود فالتو چربی کو ختم کرتی ہے
اور بڑھے ہوئے وزن سے نجات دلاتی ہے۔

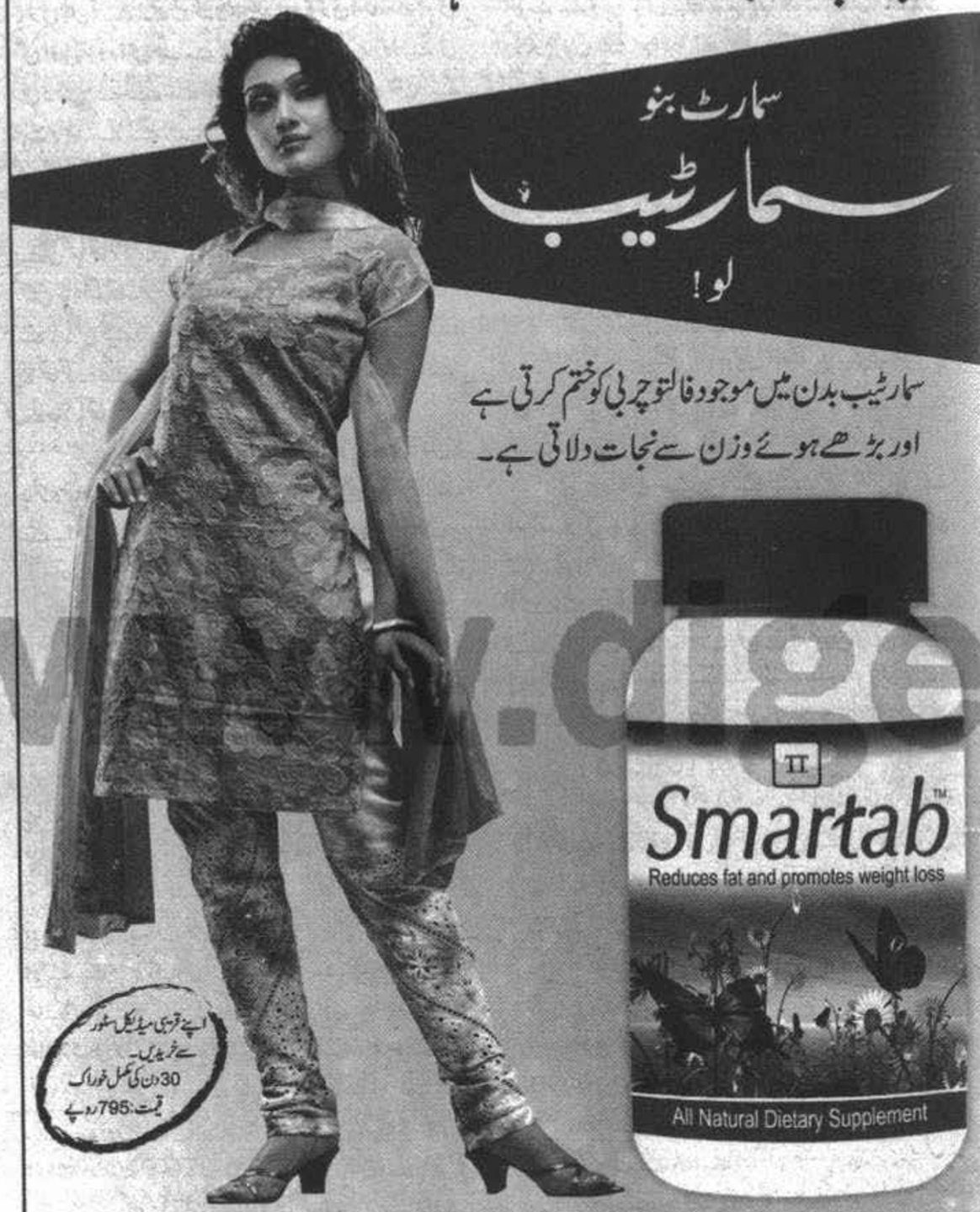

اپنے قریبی میڈیکل سٹور سے خریدیں۔
30 دن کی مکمل خوراک
قیمت: 795 روپے

مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے
0334-4266255, 0334-4266244
Email: toptreatments@gmail.com, Website: www.toptreatments.net
www.facebook.com/TT.Smartab

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

معاہدے کی خلاف ورزی ہے۔"

مارشل نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ لوگ شاید گاڑی میں آ گئے تھے کیونکہ چند سیکنڈ بعد گاڑی اسٹارٹ ہوگئی تھی اور پھر وہ اس جگہ سے باہر نکل کر سڑکوں پر دوڑنے لگی تھی۔ میں نے شیشے سے باہر دیکھنے کی کوشش کی لیکن شیشے بہت دھندلے تھے اور باہر کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مارشل کا رویہ اچانک کیوں بدل گیا تھا؟ کیا اسے ڈیوڈ شا نے کوئی نئی ہدایت دی تھی یا پھر وہ مرشد سے مل گیا تھا؟ اگرچہ اس کا امکان بہت کم تھا لیکن کچھ کہا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ مرشد کے پاس دولت کی طاقت تھی اور اس سے مارشل جیسے دس افراد کو خریدا جا سکتا تھا۔ اگر مارشل بک چکا تھا تو وہ مجھے میرے ساتھیوں نہیں بلکہ مرشد کے حوالے کرنے جا رہا تھا۔

میں نے ایک بار پھر دروازے کے اوپر لگے شیشوں کا جائزہ لیا، یہ کوئی ڈیڑھ فٹ لمبے اور کوئی آٹھ انچ چوڑے تھے۔ اگر میں ان کو توڑ دیتا تب بھی میں ان سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ دوسرے میں ان کو توڑنے کی کوشش کرتا تو آگے والوں کو فوراً پتا چل جاتا اور میں فرار سے پہلے پکڑا جاتا۔ لیکن مجھے کچھ تو کرنا تھا۔ میں اب مزید کسی دشمن کی قید میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا تھا۔ گاڑی کے آس پاس سے گزرتی گاڑیوں سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ ہم کسی سنگل سڑک پر سفر کر رہے تھے اور یہاں ٹریفک زیادہ نہیں تھا۔ جب تک گاڑی کہیں رک نہیں جاتی اور یہ دروازہ نہیں کھولتے میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

میرا اندازہ تھا کہ ہمیں سفر کرتے ہوئے کوئی آدھا گھنٹا ہونے کو آیا تھا۔ اگر ہم راولپنڈی یا اسلام آباد سے روانہ ہوئے تھے تو شہر میں کسی بھی جگہ جانے کے لیے اتنا وقت کافی تھا۔ لیکن ایک تو ہمیں کسی جگہ ٹریفک جام سے واسطہ نہیں پڑا تھا اور نہ ہی کوئی سگنل آیا تھا اس لیے ایسا لگ رہا تھا جیسے مجھے آبادی سے کہیں دور لے جایا جا رہا تھا۔ مزید دس منٹ گزرے اور سڑک پر تقریباً سناٹا محسوس ہونے لگا تو مجھے اپنا اندازہ درست لگا تھا۔ یہ مجھے شہر سے باہر کہیں لے جا رہے تھے۔ اب مجھے کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ مارشل کے ارادے ٹھیک نہیں ہیں۔ وہ مجھے یا تو مرشد کے حوالے کرنے جا رہا تھا یا میرے حوالے سے ڈیوڈ شا کی کسی خفیہ پلاننگ پر عمل کر رہا تھا۔ مزید دس منٹ سفر کے بعد گاڑی کسی کچے راستے پر مڑی اور چند منٹ چلنے کے بعد رک گئی۔ مجھے ایسی مہک محسوس ہوئی جیسے پاس ہی کہیں پانی تھا۔ کیونکہ کسی جھرنے کے بہنے کی آواز نہیں آ رہی تھی اس لیے امکان تھا ہم کسی جھیل یا تالاب کے آس پاس تھے۔ یہ پورا علاقہ جھیلوں، تالابوں اور جوہڑوں سے بھرا ہوا ہے کیونکہ زمین اونچی نیچی ہے اور بارش خوب ہوتی ہے۔

گاڑی رکی تو میں سنبھل کر بیٹھ گیا تھا۔ میں منتظر تھا کہ کوئی دروازہ کھولے۔ لیکن دروازہ کھلنے کے بجائے مجھے مارشل کے لیے پوٹھوہاری کی آواز سنائی دی۔ "صاحب یہاں کیوں آیا ہے یہاں تو بالکل جنگل ہے۔"

"اسی لیے تو آئے ہیں۔" مارشل بولا۔

"اس کا ساتھی اسے لینے کے لیے یہاں آئے گا؟"

"بالکل اسے یہیں آنا ہوگا۔" مارشل نے کہا۔ پھر شاید اس نے موبائل سے کسی کو کال کی۔ "میں تمہارے بندے کو لے آیا ہوں آ کر اسے لے جاؤ۔"

میرے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ کیونکہ اگر اس نے عبداللہ کو بھی کال کی تھی تو اس نے اس جگہ کا کیوں نہیں بتایا۔ یقیناً اس نے کسی اور کو کال کی تھی جسے معلوم تھا کہ کہاں آنا ہے؟ یہ بات اس پوٹھوہاری نے بھی محسوس کر لی تھی۔ اس نے مارشل سے کہا۔ "صاحب اس کے آدمیوں کو اس جگہ کا تو پتا ہی نہیں ہے۔"

"تم اپنا منہ بند کر کے نہیں رہ سکتے؟" مارشل نے غرا کر کہا۔ "باس میں ہوں یا تم ہو؟"

"سوری سر۔" پوٹھوہاری دب گیا تھا۔ ظاہر ہے وہ ملازم تھا اور اسے اختیار نہیں تھا کہ مارشل کے کسی معاملے میں دخل دے شاید اس نے اس وجہ سے پوچھا تھا کیونکہ مارشل اسے ڈیوڈ شا کی ہدایت کے برعکس چلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" مارشل کا لہجہ خراب تھا۔ "تم دونوں پوری طرح چوکس رہو۔"

گویا اس کے ساتھ صرف دو افراد تھے۔ میں نے دروازہ بجایا اور چلا کر کہا۔ "مارشل۔"

وہ خانے کے پاس چلا آیا تھا۔ "کیا ہے؟"

"تم نے کسے بلایا ہے؟"

"تمہارے ساتھیوں کو۔" اس نے تمسخرانہ انداز میں جواب دیا۔

"بکواس مت کرو ان کو اس جگہ کا علم نہیں ہے۔"

"اوہ یعنی تم نے سن لیا ہے۔" وہ چونکا۔ "میں نے تمہارے ساتھی کو ایس ایم ایس کر دیا تھا۔"

"مارشل تم مسلسل جھوٹ بول رہے ہو۔ مجھے لگ رہا ہے تم مجھے ہی نہیں ڈیوڈ شا کو بھی دھوکا دے رہے ہو۔"

"تمہارا وہم ہے۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ "کچھ دیر رک جاؤ ابھی تمہارے ساتھی آ جائیں گے اور تمہارے سارے شک دور ہو جائیں گے۔"

"اس کے برعکس میرا خیال ہے مجھے لینے میرے ساتھی نہیں بلکہ مرشد کے آدمی آ رہے ہیں اور تم نے ان سے میرا سودا کر لیا ہے۔"

وہ ایک لمحہ چپ ہوا تھا جیسے میرے درست اندازے نے اسے ششدر کر دیا ہو پھر اس نے غرا کر کہا۔ "تم بکواس کرنے کے بجائے خاموش بیٹھو۔"

"تم بھول رہے ہو، میں تمہارا ماتحت نہیں ہوں جو تم شٹ اپ کہو تو میں شٹ اپ ہو جاؤں۔" میں نے دروازے پر پھر لات ماری۔ "اسے کھولو مجھے باہر آنے دو۔"

اس بار اس نے جواب دینے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ اس کے ساتھی شاید گاڑی سے دور چلے گئے تھے اس لیے ہماری باتیں نہیں سن سکے تھے۔ میرے بدترین خدشات درست ثابت ہو رہے تھے۔ مارشل حرامزادے نے ڈیوڈ شا کی ہدایات کے برعکس مجھے رہا کرنے کے بجائے مرشد سے میرا سودا کر لیا تھا اور اب اس کے آدمی مجھے لینے آ رہے تھے۔ ان کے آنے سے پہلے مجھے کچھ کرنا تھا ورنہ میں ایک بار پھر کسی قید خانے میں جا پڑوں گا۔ بلکہ اس کا امکان کم تھا اور زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ مرشد مجھے فوری طور پر دوسری دنیا کا ٹکٹ تھما دے کیونکہ اب اسے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ میں پہلے جیسا کمزور دشمن نہیں رہا تھا اور وہ طاقت ور دشمن رکھنے کا قائل نہیں تھا۔ لیکن میں اس قید خانے میں کیا کر سکتا تھا یہاں سے نکلنے کے بعد ہی مجھے ہاتھ پاؤں ہلانے کا موقع مل سکتا تھا۔ ابھی میں سوچ رہا تھا کہ میں نے پاٹھوہاری کی آواز سنی وہ کہہ رہا تھا۔

"سر ایک گاڑی اس طرف آ رہی ہے۔"

"وہ آ گئے۔" مارشل نے کہا۔ "تم دونوں یہاں آ جاؤ... جلدی۔"

میری چھٹی حس نے کہا کہ مارشل کچھ کرنے جا رہا ہے اور چھٹی حس نے درست کہا تھا کیونکہ فائر کی ہلکی سی آواز کے ساتھ پوٹھوہاری چلایا۔ "یہ کیا کیا تم نے؟"

مارشل نے جواب میں ایک فائر اور کیا اور بولا۔ "یہ کیا۔"

مارشل نے یقیناً اپنے دونوں ساتھیوں کو گولی ماردی تھی۔ کیوں ماری تھی یہ کوئی بہت مشکل سوال نہیں تھا۔ وہ ڈیوڈ شا کو ڈبل کراس کرنے جا رہا تھا اور یقیناً اسے زندہ بھی رہنا تھا اس لیے وہ اپنے جرم کے عینی گواہوں کا وجود مٹا رہا تھا بلکہ مٹا چکا تھا۔ بعد میں وہ ڈیوڈ شا کے سامنے ان کی موت اور ذمے داری کو میرے ساتھیوں کے کھاتے میں ڈال سکتا تھا اور میرا بھی کوئی وجود باقی نہ رہتا جو اس کے جرم کا راز فاش کر سکتا تھا۔ اب وقت بالکل نہیں تھا۔ میں پشت والی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا اور پھر پاؤں جوڑ کر پوری قوت سے دروازوں کے درمیان میں لات ماری۔ ایک دھماکا ہوا اور دروازہ لرز گیا تھا۔ فوراً ہی مارشل کی دہاڑ سنائی دی۔

"کیا کر رہے ہو؟"

"دروازہ کھول رہا ہوں۔" میں نے کہا اور دوسری بار پاؤں مارے۔ اس بار دروازے زیادہ ہلے تھے۔ مارشل چلایا۔

"آرام سے بیٹھو ورنہ گولی مار دوں گا۔"

"ضرور مار دو۔" میں نے کہا اور تیسری ضرب لگائی اور اس بار دروازے ذرا باہر کی طرف ہو گئے تھے۔ چوتھی ضرب پر وہ مزید باہر نکلے تھے۔ مارشل دہاڑتا ہوا اسی طرف آ رہا تھا۔ اس کی زبان سے اسپینش میں یقیناً نا گفتنی نکل رہی تھی اور میں رک گیا۔ وہ دروازے کے سامنے آیا تھا۔ جیسے ہی اس نے ہینڈل گھمانے کی کوشش کی میں نے اس بار جسم و جان کی ساری توانائی استعمال کرتے ہوئے پاؤں دروازے پر مارے۔ وہ ہینڈل گھما چکا تھا اور میرا کام مزید آسان ہو گیا۔ دروازے ایک دھماکے سے کھلے اور مارشل سامنے تھا۔ بچنے کی کوشش کے باوجود ایک پٹ اس کو لگا اور وہ اچھل کر پیچھے جا گرا تھا۔ میں تڑپ کر باہر نکلا اور مارشل پر جا گرا تھا لیکن نہیں وہ میرے اندازے سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا تھا۔ وہ اس جگہ نہیں تھا جہاں گرا تھا۔ میں خالی زمین پر جا گرا اور تیزی سے پلٹا لیکن مجھے دیر ہو گئی تھی وہ نہ صرف مجھ سے پہلے کھڑا ہو گیا تھا بلکہ اس نے اپنا پستول بھی اٹھا لیا تھا اور اس کا رخ میری طرف کر دیا تھا۔ اس نے دانت پیس کر کچھ کہا ایسا لگ رہا تھا وہ مجھے مارنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ چند فٹ کے فاصلے سے نشانہ خطا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اسی لمحے مجھے ایک ہیولا سا اپنی طرف جھپٹتا دکھائی دیا۔

جاری ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یقین بے یقینی

محترمہ عذرا رسول صاحبہ!
السلام علیکم
امید قوی ہے کہ بخیریت ہوں گی. میں سرگزشت بڑے شوق سے پڑھتی ہوں. پُراسراریت نمبر کا اشتہار پڑھتے ہوئے میں نے اپنی زندگی کا ایک اہم واقعہ قلم بند کرنے کا سوچ لیا. یہ واقعہ مجھے لفظ بہ لفظ یاد ہے. اب یہ اور بات ہے کہ میرے بچے بھی میری داستان سن کر مسکراتے ہیں. شاید انہیں بھی یقین نہ آتا ہو لیکن مجھ پر تو یہ گزری ہے اس لیے میں اسے بھول نہیں سکی ہوں.

سعدیہ افتخار
(کراچی)

میں اب عمر کی اس منزل پر ہوں کہ کسی بھی وقت میرا بلاوا آ سکتا ہے۔ مجھے اب مزید جینے کی تمنا بھی نہیں ہے کہ اللہ نے مجھے زندگی کی ہر خوشی، ہر سکون سے نوازا ہے۔ میں نہ صرف اپنی اولاد کی بلکہ پوتی پوتوں اور نواسی نواسوں کی خوشیاں بھی دیکھ چکی ہوں۔ اب تو وہ بھی اولاد والے ہیں۔

اس طویل عمر میں بہت کچھ دیکھا ہے۔ اب تو بے شمار واقعات پہ گزرے ہوئے ماہ و سال کی گرد نے دبیز تہ جمادی ہے، بے شمار یادیں دھندلا گئی ہیں۔ حافظہ آنکھ مچولی کھیلنے لگا ہے مگر کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں جو ذہن پر نقش ہو جاتے ہیں اور بھلائے نہیں بھولتے بلکہ بڑھاپے میں تو ایسے بھولے بسرے واقعات کی بازگشت اکثر سنائی دیتی ہے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میری نئی نئی شادی ہوئی تھی یعنی جب سائے دھانی ہوتے ہیں، جب دھوپ گلابی ہوتی ہے۔ ہمارے گھرانے کا شمار متمول اور تعلیم یافتہ بلکہ ایک حد تک ماڈرن گھرانوں میں ہوتا تھا۔ ان دنوں لڑکیوں کی تعلیم کو بہت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ میرے بابا جان نے نہ صرف مجھے تعلیم دلائی تھی بلکہ کانوینٹ میں پڑھایا تھا۔ میں نے اس دور میں میٹرک کیا تھا جب لڑکیوں کی تعلیم ایک خواب ہوا کرتی تھی، وہ بھی انگریزی تعلیم!

میرے شوہر افتخار میرے تایا زاد تھے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن چلے گئے اور آکسفورڈ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد وطن لوٹ آئے۔ جاگیردار گھرانا تھا۔ میرے شوہر کو ملازمت کی ضرورت نہیں تھی مگر انہیں پولیس میں جانے کا شوق تھا اس لیے آئی سی ایس کرنے کے بعد وہ پولیس میں ملازم ہو گئے۔

اس زمانے میں پولیس کے ایک معمولی اہل کار کی بھی اچھی خاصی دہشت ہوتی تھی۔ تھانے دار اس زمانے میں داروغہ کہلاتا تھا اور انگریزوں کے دور میں اس کے اتنے اختیارات ہوتے تھے کہ وہ اپنے علاقے کا بے تاج بادشاہ ہوتا تھا۔ افتخار تو پھر ایس پی تھے۔ ان کے تحت تو کئی تھانے تھے۔ وہ تو ایک طرح سے پورے ضلع کے بے تاج بادشاہ تھے۔ ان کے اختیارات کو صرف ضلع کا ڈپٹی کلکٹر ہی چیلنج کر سکتا تھا۔ اس دور میں ہندوستانی خال خال ہی اس عہدے پر تھے۔ عموماً انگریز ہی ایس پی ہوا کرتے تھے۔

شادی کے بعد ان کی تعیناتی کانپور ہو گئی۔ انہیں شہر سے باہر خاصا وسیع و عریض بنگلا ملا تھا۔ اس بنگلے میں چار بیڈ رومز تھے، ڈرائنگ اور ڈائننگ روم اس کے علاوہ تھے۔ خاصا وسیع و عریض لان تھا۔ بنگلے کی پشت پر آم، جامن، امرود اور کیلے کے درخت تھے۔ پھر خاصے فاصلے پر سرونٹ کوارٹرز تھے۔ وہاں ہمارا مالی، خانساماں، ڈرائیور اور چوکیدار رہتا تھا۔

میں اپنی پرانی گھریلو ملازمہ خالہ زینب کو بھی اپنے ساتھ ہی لے آئی تھی۔ وہ سرونٹ کوارٹر کے بجائے میرے ساتھ ہی بنگلے میں رہتی تھیں۔ میرے ساتھ ساتھ افتخار بھی ان کا بہت احترام کرتے تھے کیونکہ انہوں نے ہم دونوں کو گودوں میں کھلایا تھا۔ ملازمہ سے زیادہ ان کی حیثیت گھر کے ایک بزرگ کی تھی۔ وہ نماز روزے کی پابند تھیں اور اکثر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وظیفے وغیرہ بھی پڑھتی رہتی تھیں۔ انہوں نے بہت کوشش کی کہ مجھے بھی نماز روزے کا پابند بنادیں مگر میں ان کی بات ہمیشہ ٹال جاتی۔

حیرت انگیز بات یہ تھی کہ میرے برعکس افتخار نماز کے پابند تھے۔ وہ کہتے تھے کہ نماز کی پابندی تو میں لندن میں بھی کرتا تھا۔

ہمارے بنگلے کے ساتھ ہی انگریز ڈپٹی کلکٹر کا بنگلا تھا۔ اس کی بیوی اکثر گپ شپ کے لیے ہمارے گھر آجاتی تھی۔ وہ انتہائی باتونی عورت تھی مگر اس کے آنے سے خالہ زینب کو بہت پریشانی ہوتی تھی کیونکہ اپنے ساتھ وہ چھوٹی نسل کا ایک کتا بھی لاتی تھی۔ اکثر وہ کتے کو اپنی گود میں بٹھالیتی۔ خالہ زینب نے پہلے تو دبی زبان سے اعتراض کیا مگر میں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔

ایک دن وہ ہتھے سے اکھڑ گئیں اور بولیں ''آئندہ اگر وہ منحوس گوری کتا لے کر گھر میں آئی تو میں یہاں نہیں رہوں گی۔ میں ہر وقت وظیفے پڑھتی رہتی ہوں۔ ان میں بہت سے وظیفے جلالی ہیں۔ کوئی وظیفہ الٹ گیا تو میں جان سے جاؤں گی، ناں بی بی ناں، مجھے معاف رکھو۔ تم اس کتے والی سے میل ملاقات رکھو مگر مجھے واپس بھجوادو۔''

''ارے خالہ، اس کا کتا ہر وقت صاف ستھرا رہتا ہے، کبھی یہاں گندگی نہیں کرتا، آپ تو بس خواہ مخواہ.....''

''خواہ مخواہ!'' خالہ نے میری بات کاٹ دی ''کتا نجس جانور ہے۔ وہ کتے کو گود میں بٹھاتی ہے، پھر انہی ہاتھوں سے گھر کے برتن چھوتی ہے۔ میں نے اس کا گلاس، کپ اور پلیٹ علیحدہ کردی ہے مگر پھر بھی میرا دل نہیں مانتا۔''

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ پھر یاد آیا کہ خالہ زینب واقعی اسے مخصوص برتنوں میں چائے وغیرہ دیا کرتی تھیں۔ مہمانوں کو چائے وغیرہ دینے کے لیے ایک بیرا بھی تھا مگر ڈپٹی کلکٹر کی بیوی کو خالہ خود ہی چائے وغیرہ دیا کرتی تھیں۔

شام کو افتخار آئے تو خالہ نے ان سے بھی یہی شکایت کی۔ وہ بھی کچھ پریشان ہوگئے۔ اگر وہ ڈپٹی کلکٹر کی بیوی کو منع کرتے تو نہ صرف وہ برا مانتی بلکہ اس کے شوہر کو بھی ناگوار گزرتا۔

''مجھے تو میاں اب واپس بھجوادو۔'' خالہ نے کہا۔

''مگر خالہ! یہ تو سوچیں کہ پھر سعدیہ اکیلی ہوجائے گی۔ میں تو سارا دن گھر سے باہر رہتا ہوں بلکہ بعض اوقات تو آدھی آدھی رات کو واپس آتا ہوں۔''

''میں وہاں سے رشیدہ کو بھیج دوں گی۔'' خالہ نے کہا۔ رشیدہ ان کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔

''اس کا مطلب ہے کہ آپ نے جانے کا فیصلہ ہی کرلیا ہے۔'' افتخار نے ہنس کر کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں کل ہی آپ کو واپس بھجوا دیتا ہوں۔''

رخصت ہوتے وقت انہوں نے مجھے ڈھیروں ہدایتیں دیں کہ دونوں وقت ملتے بال کھول کر باہر مت نکلنا، مغرب کے وقت دروازے بند رکھنا، اس وقت آسمان سے بے شمار بلائیں زمین پر نازل ہوتی ہیں۔ آخر میں انہوں نے عجب بات کہی کہ وہ آخری والا کمرا کبھی مت کھولنا، نہ اس میں جانا۔

''کیوں خالہ؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''بس زیادہ سوال جواب مت کرو، جیسے کہہ رہی ہوں، ویسے ہی کرنا۔'' پھر انہوں نے میرے گلے میں ایک تعویذ ڈالتے ہوئے کہا ''اس تعویذ کو گلے سے کبھی مت اتارنا۔ میں نے اسے اچھی طرح موم جامہ کردیا ہے۔ نہاتے وقت بھی گلے میں ڈالے رکھنا۔''

وہ ڈھیروں ہدایات دے کر رخصت ہوگئیں۔ ان کے جانے سے گھر ایک دم خالی خالی، ویران ویران سا ہوگیا۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ گھر میں اتنے ملازم تھے مگر کسی کے بھی بیوی بچے وہاں نہیں تھے ورنہ میں کسی کی بیوی ہی کو بلا لیتی۔

صبح دس بجے کے قریب ڈپٹی کلکٹر کی بیوی کلارا آگئی۔ کتا حسب معمول اس کی گود میں تھا۔

رسمی گفتگو کے بعد وہ بیٹھی ہی تھی کہ ایک عجیب سی بات ہوئی۔ اس کا کتا سامنے دیکھ کر اچانک غرانے لگا جیسے اسے کوئی غیر مرئی وجود نظر آرہا ہو۔

''وہاٹ از گوئنگ آن ڈیئر؟'' (کیا ہورہا ہے) کلارا نے اسے ڈانٹ پلائی ''بی آ گڈ ڈاگ!'' وہ اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

پھر مجھے دیکھ کر یوں مسکرائی جیسے شرارتی بچوں کی مائیں ان کی شرارت پر شرمندگی سے مسکراتی ہیں۔

میں خود بھی حیرت زدہ تھی۔ وہ کتا تو بہت بے ضرر سا تھا۔ سارا وقت یا تو کلارا کی گود میں بیٹھا رہتا یا پھر اس کی کرسی کے نزدیک ہی بیٹھ جاتا۔

کتا وقتی طور پر پرسکون ہوگیا تھا مگر فوراً ہی پھر غرانے لگا۔ اچانک وہ کلارا کی گود سے اچھلا اور یوں خوف زدہ انداز میں باہر کی طرف بھاگا جیسے اس نے کوئی بہت خوف ناک چیز دیکھ لی ہو۔

کلارا بھی گھبرا کے کھڑی ہوگئی اور آہستہ سے بولی ''آئی ایم سوری مسز خان!'' یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدم رکھتی باہر کی طرف چلی گئی۔

میں بھی اس کے پیچھے لپکی۔ میں نے دیکھا کہ کتا کھلے ہوئے گیٹ سے باہر کی طرف بھاگا جارہا ہے۔ کلارا بھی اسے آوازیں دیتی ہوئی باہر کی طرف دوڑی۔

''نواز خان!'' میں نے چوکیدار کو آواز دی ''دیکھو میڈم کا کتا کس طرف گیا ہے؟''

میرا حکم پاتے ہی نواز خان بھی کتے کے پیچھے دوڑ پڑا۔

وہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اعلیٰ سول اور پولیس افسران کے بنگلے تھے۔ کتا دوڑتا ہوا سیدھا گیا، پھر دائیں جانب گھوم گیا۔ نواز بھی اس کے پیچھے تھا۔

چند لمحوں میں کتا اور نواز خان میری نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

میں تھوڑی دیر تک گیٹ پر کھڑی رہی، پھر میں نے کلارا کو گاڑی میں دیکھا۔ اس وقت وہ خود ہی ڈرائیو کررہی تھی اور یقیناً کتے کی تلاش میں جارہی تھی۔

میں گیٹ بند کرکے واپس ڈرائنگ روم میں آگئی۔ وہاں ابھی تک چائے کا سامان رکھا ہوا تھا۔ کلارا نے جلدی میں چائے وغیرہ بھی نہیں پی تھی۔

میں نے دیکھا کہ میرے بٹلر نے بھی کلارا کے لیے وہی برتن نکالے تھے جن میں خالہ زینب اسے چائے وغیرہ دیا کرتی تھیں۔ مجھے ہنسی آگئی۔ خالہ زینب یقینی طور پر بٹلر کو بھی سب کچھ سمجھا کر گئی تھیں۔

میں نے اپنی پیالی میں چائے نکالی اور اس کے ہلکے ہلکے گھونٹ لینے لگی۔

میں چائے پی ہی رہی تھی کہ نواز خان ہانپتا کانپتا گھر میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''کیا ہوا نواز خان!'' میں نے چائے کا کپ رکھتے ہوئے پوچھا ''خیریت تو ہے؟''

''میم صاحب کا کتا مرگیا بیگم صاحب!'' اس نے یوں سر جھکا کر کہا جیسے کتے کی نہیں، کسی انسان کی موت کی خبر سنا رہا ہو۔

میں گھبرا کر کھڑی ہوگئی، میں جانتی تھی کہ کلارا اس کتے سے کتنا پیار کرتی تھی۔ اس کا کوئی بچہ تو تھا نہیں، وہ کتا ہی اس کے لیے سب کچھ تھا۔

''کتا مرگیا؟ کیسے نواز خان، کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ

اگست 2011ء

کے شمارے میں شامل

تحاریر کی ایک جھلک

کشکول

آپ کے جانے پہچانے اور شاہکار سلسلے وار کہانیوں کے خالق انوار صدیقی کا ایک نیا فن پارہ' اسرار و تحیر کے پردے میں ملفوف ایک منفرد و طویل سلسلہ۔

فاتح کی شکست

ڈاکٹر ساجد امجد کے قلم سے جاری تاریخ کے جھروکوں سے انتخاب' لازوال محبت کی عظیم نشانی تاج محل کے خالق شاہجہاں کی دلگداز داستان

خانہ خراب

دلوں میں چٹکی لیتی تحریر ناوا گست کے لیے ملک صفدر حیات کی ڈائری سے ایک کارنامہ

حضرت یرمیاہ علیہ السلام

بت پرستی کے اندھیرو ں میں گم بنی اسرائیل کی سرکشی اور انبیا کی جہد مسلسل کا احوال

ابن انشا

واپسی، اناڑی، محفل شعر و سخن اور آپ کے خط

مختار آزاد منظر امام تنویر ریاض سلیم انور رضوانہ ساجد ڈاکٹر عبدالرب بھٹی عمران درویش اور مریم کے خان کی منفرد تحاریر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"وہ بہت تیزی سے بھاگ رہا تھا بیگم صاحبہ!" نواز نے کہا "اچانک سامنے سے سائمن صاحب کی گاڑی آ گئی۔ کتا ان کی گاڑی کے نیچے آ گیا۔"

میں جانتی تھی کہ سائمن اسسٹنٹ کلکٹر تھا۔ وہ نوجوان لڑکا تھا اور ابھی چند مہینے پہلے ہی آئی سی ایس کرنے کے بعد یہاں تعینات ہوا تھا۔ وہ ڈپٹی کلکٹر مسٹر براؤن کا ماتحت تھا۔

"کتے کے پیچھے مسز براؤن بھی تو گئی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"میم صاحب وہاں پہنچیں تو کتا مر چکا تھا۔ وہ کتے کی لاش دیکھ کر بری طرح رونے لگیں، پھر اس نے سائمن کو بے نقط سنائیں۔ وہ بے چارہ سر جھکائے ہوئے سنتا رہا۔ پھر میم صاحب نے کہا "میرے ٹونی کو ابھی اور اسی وقت اسپتال لے کر چلو۔ شاید یہ بچ جائے۔"

"تو وہ کتے کو اسپتال لے گئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی میم صاحب!" نواز خان نے کہا۔

نواز خان گزشتہ پندرہ سال سے انگریز افسروں کی ملازمت میں تھا اس لیے اچھی خاصی انگریزی بھی بول اور سمجھ لیتا تھا۔ ایک نواز خان ہی کیا، میرے سبھی ملازم انگریزوں کے پاس ملازم رہے تھے اس لیے وہ سب ٹوٹی پھوٹی انگریزی بول لیتے تھے۔

میں نے باورچی خانے میں جا کر کھانے کا جائزہ لیا۔ خانساماں نے کھانا تقریباً تیار کر لیا تھا۔ افتخار دوپہر کے کھانے پر گھر ضرور آتے تھے اور ڈیڑھ دو گھنٹے آرام کرنے کے بعد واپس چلے جاتے تھے پھر ان کی واپسی کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ کبھی تو وہ شام کو سات بجے ہی لوٹ آتے تھے اور کبھی وہ رات کو دو تین بجا دیتے تھے۔ ویسے "عموماً" وہ دیر سے ہی گھر لوٹتے تھے۔

میں باورچی خانے سے باہر نکلی تو مجھے ڈپٹی کلکٹر کے گھر سے رونے کی آوازیں آئیں۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ کلارا اسپتال سے لوٹ آئی ہے۔

میں مروتاً اس کے گھر چلی گئی۔ کلارا یوں بلک بلک کر رو رہی تھی جیسے وہ کتا نہ ہو اس کا بیٹا ہو۔

مجھے دیکھ کر وہ روتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی اور ایک مرتبہ پھر بری طرح سسکنے لگی۔

"حوصلہ رکھو مسز کلارا!" میں نے کہا "اب ٹونی تو واپس آنے سے رہا۔"

وہ پھر زور زور سے رونے لگی "میں اس کم بخت سائمن کو چھوڑوں گی نہیں۔ میں نے مسٹر براؤن کو فون کر دیا ہے، وہ بھی آنے ہی والے ہیں۔"

کتے کی لاش برآمدے میں رکھی ہوئی تھی۔ کلارا نے اس پر سفید چادر ڈال دی تھی۔ ڈپٹی کلکٹر کے سب ملازم اپنی مالکن کو خوش کرنے کے لیے آنسو بہا رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد مسٹر براؤن اور افتخار دونوں ایک ساتھ گھر میں داخل ہوئے۔

کلارا روتے ہوئے مسٹر براؤن سے لپٹ گئی اور بولی۔

"اب میں کیسے زندہ رہوں گی؟"

"فکر مت کرو۔" مسٹر براؤن نے اس کا سر سہلاتے ہوئے کہا "آج شام تک ٹونی یہاں آ جائے گا۔"

"وہ کیسے آ سکتا ہے ڈارلنگ!" کلارا نے کہا "وہ تو مر چکا ہے۔"

"تم فکر مت کرو۔ شام تک ٹونی یہاں ہوگا۔" مسٹر براؤن نے کہا "مسٹر مائیکل کے پاس فوکس ٹیریر کا ایک جوڑا ہے۔ ان کی کتیا نے بچے بھی دیے ہیں۔ میں ان میں سے ایک بچہ تمہیں لا دوں گا۔"

"لیکن براؤن....." کلارا ایک دفعہ پھر رونے لگی۔

"کیلی پلیز!" مسٹر براؤن نے کہا "میں ابھی مسٹر مائیکل سے ایک پپی منگوا لیتا ہوں لیکن اب رونا مت!"

انہوں نے اسی وقت اپنے ڈرائیور کو مسٹر مائیکل کے بنگلے پر بھیج دیا۔

ہم لوگ تھوڑی دیر بیٹھ کر اپنے گھر واپس آ گئے۔

"سعدیہ! جلدی سے کھانا لگواؤ۔ مجھے بہت شدید بھوک لگی ہے۔"

"پڑوس میں موت ہوگئی ہے اور آپ کو بھول لگی ہے؟" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

افتخار نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ان کی حیرانی پر مجھے ہنسی آ گئی۔ وہ بھی بے اختیار ہنسنے لگے۔

پھر کافی دن گزر گئے۔ کلارا ہماری طرف نہیں آئی۔ شاید وہ اپنے ٹونی کا سوگ منا رہی تھی۔

میں ہی کبھی کبھار اس کے پاس چلی جاتی تھی لیکن وہاں کچھ کھاتے پیتے ہوئے مجھے شدید کراہیت محسوس ہوتی تھی۔ مجھے رہ رہ کر خالہ زینب کی بات یاد آتی تھی کہ یہ موئے فرنگی پاکی، ناپاکی کا خیال کب رکھتے ہیں۔ کلارا کا تو بٹلر بھی کرسچن تھا۔ کرسچن کیا اس کا باپ بھنگی تھا۔ اس نے بیٹے کو تھوڑا بہت پڑھا لکھا دیا تھا۔ یوں وہ مسٹر براؤن کا بٹلر بن گیا۔

کلارا کا نیا کتا بھی آ گیا تھا اور وہ ہر وقت اس کی خدمت میں لگی رہتی تھی۔ سفید براق چھوٹا سا وہ کتا واقعی بہت خوبصورت تھا۔

وہ کچھ بڑا ہوا تو کلارا اسے گود میں چڑھا کر پھر ہمارے گھر آنے لگی۔

ایک دن شام کو کلارا اپنے کتے کے ساتھ ہمارے گھر آئی۔ افتخار اس وقت کسی ضروری کام سے دفتر گئے تھے اور مجھے بتا گئے تھے کہ واپسی میں شاید دیر ہو جائے۔ جب وہ یہ کہتے تھے تو میں سمجھ جاتی تھی کہ اب وہ ایک دو بجے سے پہلے نہیں آئیں گے۔

خالہ زینب نے ابھی تک رشیدہ کو بھی نہیں بھیجا تھا۔

کلارا آئی تو میں لان میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بھی وہیں بیٹھ گئی۔

اسی وقت بیرا چائے کی ٹرے لے آیا۔ میں نے اس سے کہا "رحیم! میم صاحب کے لیے بھی ایک کپ لے آؤ۔"

وہ سر ہلا کر واپس چلا گیا۔

اچانک ایک حیرت انگیز بات ہوئی۔ کلارا کا کتا ایک طرف دیکھ کر بری طرح بھونکنے لگا۔

"ٹونی، کیا ہو رہا ہے؟" کلارا نے اسے ڈانٹ پلائی۔

"خاموش بیٹھو۔" دوسرے کتے کا نام بھی ٹونی ہی رکھا گیا تھا۔

کتا چند لمحے پُرسکون رہا پھر خوف زدہ ہو کر کلارا کی آغوش میں چھپنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ کلارا کی گود میں بری طرح مچل رہا تھا لیکن اس نے کتے کو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔

کتے نے ایک مرتبہ پھر مڑ کر دیکھا اور چیاؤں چیاؤں کرتا ہوا کلارا کی گود میں گھس گیا۔

"مسز خان!" کلارا نے کہا "میں چلتی ہوں، شاید ٹونی کی طبیعت خراب ہے۔" اس نے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا پھر ٹونی کو گود میں چھپا کر تیزی سے باہر نکل گئی۔

میں خود بھی حیرت زدہ تھی۔ وہی واقعہ دوبارہ پیش آیا تھا۔ آخر کتے نے ایسا کیا دیکھ لیا؟ میں نے اردگرد نظر دوڑائی۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ موسم بہت خوش گوار تھا۔ آتی سردیوں کے دن تھے اس لیے ہوا میں بھی خوش گوار خنکی تھی۔

رحیم بھی کچھ فاصلے پر کھڑا تھا، اس نے بھی کلارا کے کتے کا غیر معمولی ردِعمل دیکھا تھا۔

"رحیم!" میں نے اسے آواز دی۔

وہ فوراً ہی میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا "جی بیگم صاحب!"

"تم نے میم صاحب کے کتے کی حرکت دیکھی؟"

"جی بیگم صاحب!" رحیم نے پُرتشویش لہجے میں کہا پھر وہ دبی زبان سے بولا "بیگم صاحب! مجھے تو لگتا ہے کہ اس گھر پر کوئی اثر ہے۔ آپ کسی عامل سیانے کو بلائیں..... مجھے تو....."

"کیسی احمقوں والی باتیں کر رہے ہو؟" میں نے جھنجلا کر کہا "مجھے یہاں رہتے ہوئے دو مہینے سے زیادہ ہو گئے۔ مجھے تو ایسا کچھ محسوس نہیں ہوا اور یہ اثر ہوتا کیا ہے؟"

"بیگم صاحب! کہتے ہیں کہ وہ چیزیں جانوروں کو نظر آ جاتی ہیں۔"

"اچھا فضول باتیں مت کرو۔ یہ چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے، تم اسے گرم کر کے لاؤ۔"

رحیم چائے دانی لے کر چلا گیا۔ میں نے سوچا "عجیب جاہل آدمی ہے، اس دور میں بھی یہ بھوت پریت اور آسیب پر یقین رکھتا ہے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اس میں رحیم کا بھی کیا قصور؟ اس نے جو کچھ اپنے بزرگوں سے سنا ہوگا، وہی دہرا دیا۔

وہ چائے لے کر آیا تو ہوا مزید خنک ہو گئی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ چائے میرے ہی کمرے میں لے آؤ۔ مجھے یہاں ٹھنڈ لگ رہی ہے۔

چائے پینے کے بعد میں کچھ دیر ریڈیو سنتی رہی۔ آج کل کی طرح ان دنوں ٹی وی اور کیبل تو تھا نہیں، میں ایک ناول لے کر لیٹ گئی۔

میرے کمرے کی ایک کھڑکی باغ کی طرف کھلتی تھی۔ وہاں سے ٹھنڈی ہوا کمرے میں آ رہی تھی۔

میں کھڑکی بند کرنے کے خیال سے اٹھی، پھر ٹھٹک کر رہ گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے کوئی لڑکی کھلکھلا کر ہنسی ہو۔ میں نے سوچا، کیا رحیم سچ کہہ رہا تھا، کیا واقعی اس مکان پر اثر ہے؟ پھر مجھے خود ہی اپنے خیال پر ہنسی آ گئی۔

بھوت، پریت، آسیب وغیرہ پر مجھے شروع ہی سے یقین نہیں تھا۔ اپنی تمام چچا زاد، ماموں زاد اور خالہ زاد میں سب سے زیادہ نڈر میں ہی تھی۔ خاندان کی دوسری لڑکیاں تو کاکروچ، چھپکلی اور چوہے کو دیکھ کر بھی یوں چیختی تھیں جیسے ان کی جان پر بن گئی ہو۔ وہ اندھیرے سے خوف کھاتی تھیں، رات کو بالائی منزل پر جاتے ہوئے ان کی جان نکلتی تھی۔

www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہمارا گھر کیا تھا، ایک وسیع و عریض حویلی تھی۔

اس میں بے شمار کمرے تھے۔ حویلی کی بالائی منزل پر بھی بہت سے کمرے تھے جن میں سے زیادہ تر کمروں میں پرانا سامان، برتن، لحاف گدے، گاؤ تکیے بھرے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ دو تین کمرے اناج، گندم، چاول، دالوں اور چنے کے لیے مخصوص تھے۔ وہ کمرے عموماً غیر آباد ہی رہتے تھے۔ میری دادی نے سب بچوں خصوصاً لڑکیوں کو سختی سے منع کر رکھا تھا کہ مغرب کے بعد کوئی لڑکی اوپر نہیں جائے گی۔

دادا جان البتہ ان کے برعکس تھے۔ وہ اس عمر میں بھی قابلِ رشک صحت کے مالک تھے اور اکثر شکار پر جاتے رہتے تھے۔ وہ ہم بچوں کو بھی اپنی طرح بہادر اور نڈر دیکھنا چاہتے تھے۔

وہ بھی شدید سردیوں کے دن تھے۔ اس دن ہوا بھی بہت تیز چل رہی تھی۔ ہم سب لوگ ہال کمرے میں بیٹھے تھے۔ حویلی کا نقشہ کچھ یوں تھا کہ بالائی منزل میں کمروں کے آگے چھوٹا سا ایک کوریڈور تھا۔ اس کے آگے ایک جنگلا سا لگا ہوا تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ ہال کمرے کی چھت اور بالائی کمروں کی چھت ایک ہی تھی۔ بالائی منزل پر جانے والا جنگلے کے پاس کھڑا ہو کر کمرے میں دیکھ سکتا تھا۔

سب بچے دادی جان کو گھیرے بیٹھے تھے۔ دیگر افراد قریب کی چارپائیوں پر بیٹھے اپنے اپنے کاموں میں مشغول تھے، وہ حسبِ معمول اپنی نانی اور دادی سے سنی ہوئی پُراسرار کہانیاں سنا رہی تھیں۔

میری چچا زاد زینت نے کہا ''دادی جان! وہ واقعہ تو سنایئے، جب آپ اوپر گئی تھیں اور آپ نے.....''

''چپ رہ۔'' دادی جان نے اسے جھڑک دیا۔ ''وہ واقعہ میں ہزاروں مرتبہ سنا چکی ہوں کہ جب میں اوپر کی منزل پر گئی تو مجھے سفید کپڑوں میں ملبوس ایک بزرگ نظر آئے۔ پھر وہ مجھے دیکھ کر مسکرائے۔ میں الٹے قدموں بھاگی اور دو دو سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے نیچے آ کر دم لیا۔ پھر مجھے دو روز تک ایسا بخار چڑھا کہ لینے کے دینے پڑ گئے۔''

اچانک اوپر سے دھڑ دھڑ کی زوردار آوازیں آنے لگیں۔ سب بچے سہم کر رہ گئے۔ اماں بھی خوف زدہ ہو کر اوپر دیکھنے لگیں۔

بابا جان نے ناگواری سے کہا ''کوئی ملازم اوپر گیا ہوگا اور وہ شاید کوئی کھڑکی کھلی چھوڑ آیا ہے، ہوا سے کھڑکی کے پٹ بج رہے ہیں۔''

دادا جان نے مسکرا کر ہم سب کی طرف دیکھا اور بولے۔

''تم میں سے جو لڑکا اوپر جا کر کھڑکی بند کر کے آئے گا، اسے میں سو روپے دوں گا اور اگر کوئی لڑکی کھڑکی بند کرے گی تو اسے پانچ سو روپے انعام ملے گا۔''

ان دنوں ایک عام آدمی کی مہینے بھر کی تنخواہ دس روپے اور بارہ روپے ہوتی تھی۔ اس میں بھی وہ خاصی خوش حال زندگی گزارتا تھا۔ غریب آدمی تو پانچ سات روپے سے زیادہ نہیں کماتے تھے۔ سو روپے تو اتنی بڑی رقم تھی کہ اس میں ایک لڑکی کی شادی بہت دھوم دھام سے ہو سکتی تھی۔ پھر پانچ سو روپے تو ایسے تھے جیسے کسی کے ہاتھ کوئی خزانہ لگ جائے۔

اچانک افتخار کھڑے ہو گئے ''دادا جان! میں کھڑکی بند کر کے آتا ہوں۔'' ان دنوں وہ ساتویں یا آٹھویں میں پڑھتے تھے۔

''ٹھہر جا بیٹا، پہلے کسی لڑکی کو تو جانے دو۔'' دادا جان مسکرا کر بولے۔

''دادا جان!'' افتخار ہنس کر بولے ''آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ کسی بھی لڑکی میں اتنی جرأت تو ہے نہیں اس لیے آپ نے پانچ سو روپے کی خطیر رقم انعام میں رکھی ہے۔''

''پانچ سو روپے چاندی کے۔'' دادا جان نے مسکرا کر کہا ''اور تم کیا سمجھتے ہو کہ میری پوتیاں اور نواسیاں اتنی ہی بزدل ہیں۔''

''تو پھر آپ نے انعام کی رقم زیادہ کیوں رکھی ہے؟'' افتخار نے کہا ''لڑکوں کو بھی پانچ سو روپے ملنا چاہئیں۔''

''افتخار بیٹا!'' تایا جان نے کہا ''لڑکوں اور لڑکیوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اچھا چلو، ایسا کرو جو لڑکا سب سے اوپر والی چھت سے جا کر میرا حقہ لائے گا، اسے پانچ سو روپے ملیں گے۔''

''چلیے منظور ہے۔'' افتخار نے کہا پھر وہ اپنے دوسرے کزنز سے بولے ''تم میں سے کوئی جائے گا یا یہ انعام بھی میں ہی لے لوں؟''

''ماموں جان!'' میری پھپھو کے بڑے بیٹے سلطان بھائی بولے ''اگر دو آدمی یہ انعام جیتنا چاہیں تو کیسے جیتیں گے؟''

''بہت آسانی سے۔'' تایا جان نے کہا ''میرا حقہ سب سے اوپر کی چھت پر بنی ہوئی برساتی میں رکھا ہے۔''

تایا جان گرمیوں میں عموماً شام کو اور سردیوں میں دن

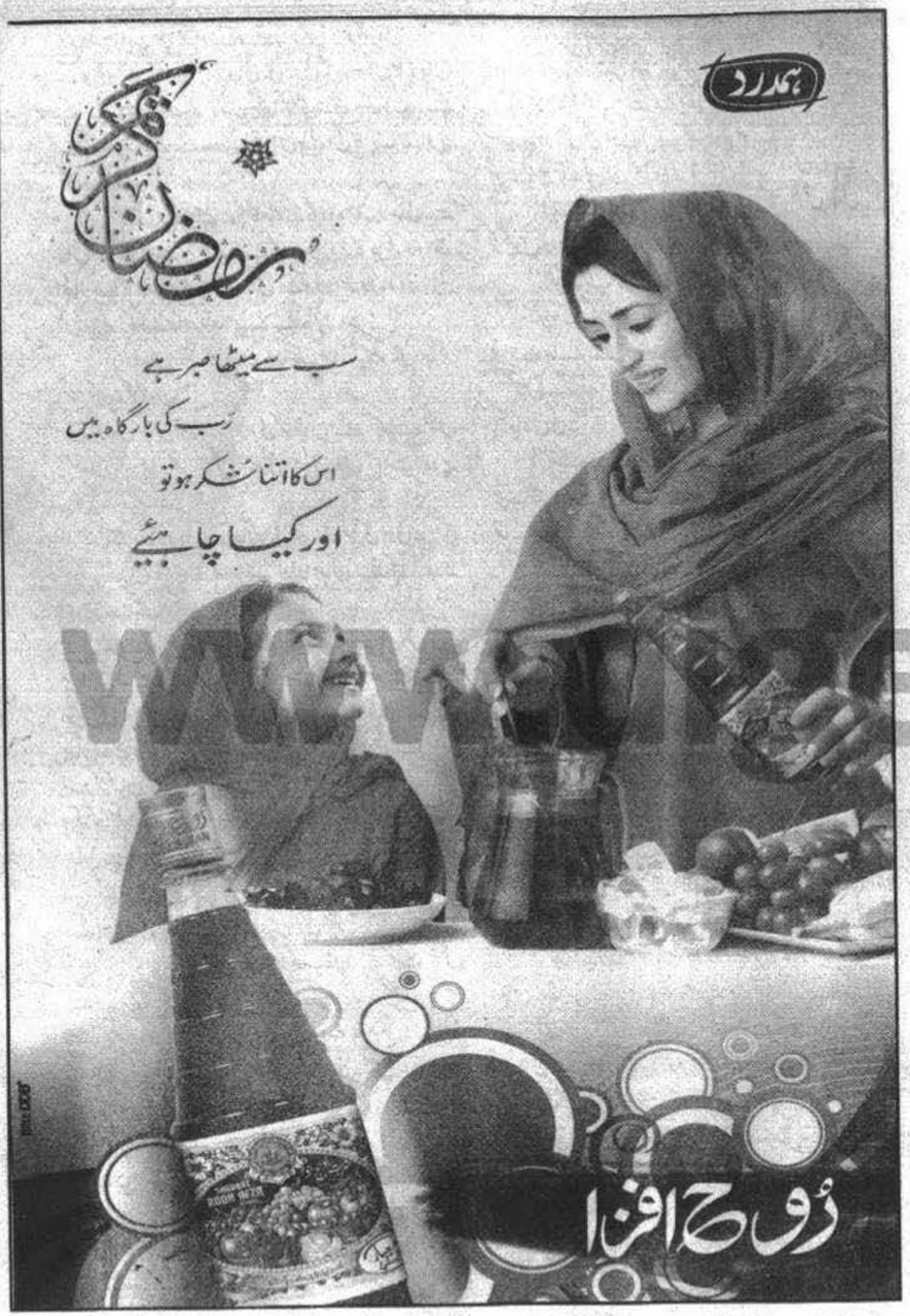

www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے وقت اوپر ہی گزارتے تھے۔ وہاں چند کمروں کے علاوہ ایک چھوٹی سی برساتی بنی ہوئی تھی۔ وہیں تایا جان کے لیے ایک تخت پر قالین بچھا کر گاؤ تکیے رکھ دیے گئے تھے۔ وہ حقہ پینے کے عادی تھے اس لیے ان کا ایک حقہ اوپر بھی رہتا تھا۔

''تم میں سے پہلے جو لڑکا جائے گا، وہ حقہ برساتی سے نکال کر کھلی چھت پر رکھ دے گا۔ دوسرا لڑکا جا کر وہ حقہ اٹھالائے گا اور اگر کوئی تیسرا بھی ہے تو وہ حقہ دوبارہ برساتی میں جا کر رکھ دے اور انعام لے لے۔''

''دادا جان!'' میں نے اچانک کہا ''پہلے میں جا کر کھڑکی بند کردوں۔''

دادی جان اور.... دوسری لڑکیاں مجھے سمجھانے لگیں۔

''سعدیہ! کیا تم پاگل ہوگئی ہو؟ اس وقت اوپر جاؤ گی..... تم.....''

''میں جاؤں گی دادا جان!'' میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

''یہ شمع دان لے جاؤ۔'' دادا جان نے کہا ''ورنہ اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتی پھرو گی۔''

میں نے شمع دان اٹھایا اور ہال کمرے سے باہر نکل گئی۔ میرا رخ زینے کی طرف تھا۔ میں آہستہ آہستہ قدم رکھتے ہوئے اوپر پہنچی اور ایک طویل راہداری سے گزر کے وہاں تک پہنچی جہاں سے ہال کمرا نظر آتا تھا۔ میں نے نیچے کی طرف دیکھا، سب لڑکیاں گویا سانس روکے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میں انہیں دیکھ کر مسکرائی اور شمع دان لے کر اس کمرے کی طرف بڑھ گئی جہاں سے کھٹ پٹ کی آوازیں آرہی تھیں۔

میں جوں ہی اس کمرے میں داخل ہوئی، مجھے سر سے لے کر پاؤں تک سفید لباس میں کوئی نظر آیا۔ وہ خوفناک آوازیں نکالتا ہوا میری طرف بڑھا۔ میں نے بہت مشکل سے اپنی چیخ کو روکا اور اس پُراسرار ہیولے پر شمع دان کھینچ مارا۔ پگھلا ہوا موم اس ہیولے پر گرا، پھر موم بتی اس سے ٹکرائی تو اس کے کپڑوں نے آگ پکڑ لی۔ میں نے وہاں پڑا ہوا ایک ڈنڈا اٹھالیا اور اس ہیولے کے جسم پر پوری قوت سے رسید کردیا۔

اسی وقت تیز ہوا سے موم بتی بجھ گئی۔

میں اس ہیولے پر دوسرا وار کرنے ہی والی تھی کہ وہ بول اٹھا ''بس کرو سعدیہ، یہ میں ہوں۔''

''سلطان بھائی، آپ؟'' میں نے آواز پہچان کر کہا۔ ''آپ مجھے ڈرانے آئے تھے تاکہ میں چیخ مار کے بھاگ جاؤں اور آپ مجھے بزدل ثابت کرسکیں۔ میں ابھی دادا جان کو جا کر بتاتی ہوں۔''

''ایسا غضب مت کرنا سعدیہ!'' سلطان بھائی نے اس سفید چادر میں لگی ہوئی آگ بجھاتے ہوئے کہا جو انہوں نے سر سے پیر تک لپیٹ رکھی تھی۔

''ایک شرط پر!'' میں نے کہا ''کل آپ ہم سب لڑکیوں کو امرود کے باغ میں لے کر جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے بھئی، لے جاؤں گا۔''

میں نے کھڑکی بند کی اور سلطان بھائی سے کہا ''آپ میرے جانے کے دس منٹ بعد آئیے گا ورنہ دادا جان یہی سمجھیں گے کہ آپ میرے ساتھ گئے تھے اور میں شرط ہار جاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے بھئی، میں پندرہ منٹ بعد آؤں گا۔ میری جیب میں گھڑی بھی ہے۔'' ان دنوں جیبی گھڑیوں کا رواج تھا۔

میں واپس پہنچی تو لڑکیوں کے کیا لڑکوں کے منہ بھی کھلے رہ گئے۔ افتخار بہت توصیفی انداز میں مجھے دیکھ رہے تھے۔ دادا جان، تایا جان اور بابا جان نے باری باری میری پیشانی چومی۔

دادا جان نے فخر سے کہا ''دیکھا تم لوگوں نے، سعدیہ صحیح معنوں میں میری پوتی ہے۔ نواب سعد اللہ جنگ کی پوتی! ہوا کی شدت سے اس کی شمع بھی گل ہوگئی لیکن اس کے باوجود یہ اندھیرے میں کھڑکی بند کر کے آگئی۔'' پھر وہ مجھ سے بولے ''سعدیہ بیٹا! آم کے پانچ باغات تیرے ہوئے۔''

مجھے اس وقت زمین اور باغات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے منہ بنا کر کہا ''دادا جان! آپ نے تو.....''

''بیٹا! یہ انعام تو پانچ سو روپے کے علاوہ ہے۔'' دادا جان نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔

اس دن افتخار اور سلطان بھائی نے بھی انعام جیتا تھا۔ سلطان بھائی اور افتخار دونوں ہی بہت نڈر تھے۔ حویلی کے دوسرے لڑکے اتنے نڈر اور بہادر نہیں تھے۔

یہ بات میں نے اس لیے بتائی ہے تاکہ آپ کو میری بے خوفی کا اندازہ ہوجائے۔

میں نے کھڑکی بند کی تو مجھے ایسا لگا جیسے کوئی لڑکی پازیب چھنکاتی ہوئی بھاگی ہو۔ لڑکی میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ کوئی عمر رسیدہ اور بوڑھی عورت اتنی تیزی سے بھاگ سکتی ہے، نہ پازیب پہنتی ہے۔

ایک لمحے کو مجھے خوف محسوس ہوا لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے خود پر قابو پالیا۔ میرا خیال تھا کہ پائیں باغ میں کوئی لڑکی چھپی بیٹھی ہے۔

میں نے اپنے جسم پر شال ڈالی اور کمرے کا دروازہ کھول کر چوکیدار کو آواز دی ''نواز خان!''

''جی بیگم صاحب!'' وہ فوراً دوڑا ہوا آیا۔ ''باہر ڈیوٹی پر جو پولیس گارڈ ہیں، ذرا انہیں بلاؤ۔''

''جی بیگم صاحب!'' وہ میرے درشت لہجے سے سہم گیا۔

فوراً ہی پولیس کے دو سپاہی اور نواز خان وہاں آگئے۔

''تم لوگ ڈیوٹی دیتے ہو یا یہاں سوتے ہو؟'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔

''کیا ہوا بیگم صاحب! خیریت تو ہے؟'' ایک سپاہی نے پوچھا۔

''بنگلے کے پیچھے والے باغ میں کوئی چھپا ہوا ہے۔'' میں نے کہا ''میرے خیال میں وہ کوئی لڑکی ہے، میں نے خود اس کے ہنسنے کی آواز سنی ہے۔''

''لل..... لڑکی.....'' سپاہی ہکلا کر بولا۔ برآمدے میں روشن بلب کی روشنی میں مجھے اس کے چہرے پر خوف اور بوکھلاہٹ کے آثار نظر آئے۔ ''آپ..... نے..... اس کی پازیب کی..... چھن چھن..... بھی سنی ہوگی؟'' وہ بدستور ہکلا کر بولا۔

''ہاں، میں نے اس کے بھاگنے اور پازیب کی کھنک کی آواز بھی سنی ہے۔'' میں نے کہا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ سپاہی یہ کیسے جانتا ہے، میں نے تو اسے ابھی کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔

''وہ..... بیگم صاحب..... وہ..... تو..... کوئی.....''

''کیا وہ وہ کررہے ہو؟'' میرا پارا چڑھتا ہی جارہا تھا۔

''وہ..... کوئی..... بدروح ہے..... اور.....''

''کیا؟'' میں نے بھنا کر کہا ''تم بدروح اور آسیب وغیرہ پر یقین رکھتے ہو؟''

''بیگم صاحب!..... بات یقین کی نہیں ہے..... آپ سے پہلے..... اس بنگلے میں..... ایک انگریز ایس پی صاحب رہتے تھے..... انہیں بدروحوں نے اتنا پریشان کیا کہ وہ اپنا سامان بھی یہاں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔''

''او یار، تم کیسا بات کرتا ہے؟'' نواز خان نے کہا۔ اس کا تعلق صوبہ سرحد کے کسی علاقے سے تھا۔ وہ ہمارا ذاتی ملازم تھا۔ افتخار اسے اپنے ساتھ لائے تھے ''کوئی بدروح ودروح نہیں ہوتا ہے خانہ خراب! ام دیکھتا ہے وہ کدر چھپ کر بیٹھا ہے؟'' نواز خان نے اپنے کمرے میں جا کر ٹارچ اٹھائی، کندھے سے رائفل لٹکائی اور مجھ سے بولا ''آپ آرام کرو بیگم صاحب! ہم اس خانہ خراب روح کو پکڑ کر ابھی اور لاتا ہے؟''

''تم لوگ کیا یوں ہی کھڑے تماشا دیکھتے رہو گے؟'' میں نے سپاہیوں کو جھڑکا۔

''بیگم صاحبہ! انگریز ایس پی کی گارڈ میں ایک سپاہی تھا رام سنگھ! وہ بھی اسی روح کی تلاش میں باغ کے پچھلے حصے میں گیا تھا اور مارا گیا۔''

''کیا؟'' میں نے حیرت زدہ لہجے میں کہا ''مارا گیا، کیسے؟''

''ایسا لگتا تھا جیسے کسی درندے نے اس کی گردن ادھیڑ ڈالی ہو۔'' سپاہی کی آواز لرز رہی تھی ''بیگم صاحبہ!..... آپ اس نواز خان کو روکیں ورنہ.....''

''مجھے مشورے مت دو۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''میں ایس پی صاحب سے کہہ کر کل ہی تم دونوں کی یہاں سے چھٹی کراتی ہوں۔ تمہیں پولیس میں ملازمت کس نے دی ہے؟''

''کوئی انسان ہو تو میں اکیلا چار پانچ سے بھی بھڑ جاؤں۔ میں جاٹ ہوں بیگم صاحبہ! مجھے..... بزدلی کا طعنہ مت دیں..... اب..... بھلا..... چلتی ہوا سے کون لڑسکتا ہے؟''

''ٹھیک ہے، پھر ملازمت چھوڑ کر گھر جا کر بیٹھو۔'' میں نے بپھر کر کہا ''میں کل نہ صرف یہاں سے بلکہ پولیس کی ملازمت سے بھی چھٹی کرادوں گی۔''

اس وقت تک نواز خان ہماری نظروں سے اوجھل ہوچکا تھا۔ میں پیر پٹختے ہوئے اپنے کمرے میں آئی اور پائیں باغ کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھول کر باہر جھانکنے لگی۔

اس طرف کوئی بلب بھی نہیں تھا۔ پھر گھپ اندھیرے میں مجھے روشنی کی ایک لکیر سی دکھائی دی۔ نواز خان باغ کے ایک ایک حصے کی تلاشی لے رہا تھا۔

وہ بائیں طرف مڑ کر میری نظروں سے اوجھل ہوگیا لیکن روشنی کی لکیر وقفے وقفے سے چمکتی رہی۔

اچانک میں نے رائفل کے فائر کی آواز سنی، دوسرے ہی لمحے مجھے نواز خان کی چیخ سنائی دی۔

میں نے الماری سے افتخار کی طاقت ور ٹارچ نکالی اور تیزی سے پیچھے کی طرف بھاگی۔ میں نے باغ کی صفائی کا حکم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تو دیا تھا لیکن ابھی پوری طرح صفائی نہیں ہوئی تھی۔ وہاں اب بھی بے ترتیب خودرو جھاڑیاں تھیں۔ میں انہی کی کانٹے دار جھاڑیوں میں راستہ بناتے ہوئے ادھر بھاگ رہی تھی جس طرف نواز خان گیا تھا۔

اپنے پیچھے بھی مجھے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

میں ہانپتے کانپتے وہاں پہنچ گئی جہاں نواز خان پڑا ہوا تھا۔ اس کی رائفل ایک طرف پڑی تھی اور اس کے دائیں شانے سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نے جھک کر اس کی نبض دیکھی، وہ ابھی زندہ تھا۔ اسی وقت میر ابیرار حیم، خانساماں غلام علی، مالی چند داور پولیس کے دونوں سپاہی وہاں پہنچ گئے۔ ان کے پیچھے پولیس کے دو سپاہی اور دو آدمی مزید تھے۔ وہ ڈپٹی کلکٹر صاحب کے ملازم تھے۔

''رحیم، غلام علی!'' میں نے ٹارچ کی روشنی میں اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ''نواز خان کو اٹھا کر لے چلو۔ یہ صرف بے ہوش ہوا ہے۔''

ان سب نے مل کر نواز خان کو اٹھالیا۔ ایک سپاہی نے نواز خان کی رائفل اور ٹارچ اٹھالی اور یہ سب واپس بنگلے کی طرف آ گئے۔

ان لوگوں نے برآمدے میں ایک چارپائی ڈال کر نواز خان کو اس پر لٹا دیا۔

برآمدے کی تیز روشنی میں مجھے نواز خان کے دائیں شانے کا گوشت ادھڑا ہوا نظر آیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے آہنی پنجے سے اس کا گوشت ادھیڑا ہو۔ اس کے شانے سے لے کر کہنی تک زخم کی لمبی لمبی کئی لکیریں تھیں۔

''رحیم! فون کر کے گاڑی منگواؤ۔ نواز خان کو فوراً اسپتال پہنچانا ہے۔'' میں کمرے میں جا کر اپنا ایک دوپٹا لے آئی اور اس کے شانے سے کہنی تک باندھ دیا۔

اسی وقت مسٹر براؤن اور کلارا آ گئے۔ وہ دونوں نائٹ گاؤن میں ملبوس تھے۔ مسٹر براؤن کا پائپ اس وقت بھی ان کے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا۔

انہیں دیکھ کر تمام ملازمین اِدھر اُدھر ہٹ گئے۔

مسٹر براؤن نے ایک نظر نواز پر ڈالی، پھر مجھ سے بولے ''کیا ہوا مسز خان؟''

میں انہیں واقعے کی تفصیل بتا ہی رہی تھی کہ گاڑی پہنچ گئی۔ اسپتال والے ضلع کے ڈپٹی کلکٹر کو وہاں دیکھ کر مزید مودب ہو گئے اور دو آدمی تیزی سے اسٹریچر لے کر دوڑے۔ میں نے دیکھا، اس وقت نواز خان کو ہوش آ رہا تھا۔ میں نے رحیم کو اس کے ساتھ ہی اسپتال بھیج دیا۔ پھر ڈپٹی کلکٹر صاحب اور کلارا کو بیٹھنے کی دعوت دی۔

''شکریہ مسز خان!'' مسٹر براؤن نے کہا ''ہم لوگ اب چلیں گے۔ ویسے آپ پریشان نہ ہوں۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

''لیکن ڈی سی صاحب! یہ سب ہے کیا؟'' میں نے پوچھا۔ مجھے حیرت تھی کہ میرے ایک ملازم کو کسی نے شدید زخمی کر دیا تھا اور کوئی ایکشن لینے کے بجائے ضلع کا ڈپٹی کلکٹر مجھے تسلی دے رہا تھا کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

''کیا مسٹر خان نے آپ کو کچھ نہیں بتایا؟'' مسٹر براؤن نے حیرت سے کہا۔

''مجھے تو انہوں نے کچھ بھی نہیں بتایا۔'' میں نے کہا۔

''مسز خان! اصل میں.....'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے کیونکہ افتخار کی گاڑی بنگلے میں داخل ہو رہی تھی ''لیجیے مسٹر خان آ گئے۔ اب آپ ان ہی سے پوچھ لیجیے گا۔''

افتخار گاڑی سے اتر کے تیزی سے ہماری طرف آئے۔ انہوں نے ڈپٹی کلکٹر کو سلام کیا پھر حیرت سے بولے ''سر، سب خیریت تو ہے؟''

''کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔'' مسٹر براؤن نے مسکرا کر کہا ''تفصیل آپ اپنی بیگم سے پوچھ لیجیے گا۔'' یہ کہہ کر دونوں میاں بیوی وہاں سے چلے گئے۔

''کیا ہوا سعدیہ؟'' انہوں نے پوچھا ''میں تو ایک کیس کے سلسلے میں دفتر سے باہر تھا، یہاں کیا ہوا؟ یہ ڈی سی صاحب اور ان کی بیگم اس وقت کیوں آئے تھے؟'' ان کے انداز میں پریشانی تھی۔ ''یہ انگریز وقت کے معاملے میں بہت اکھڑ ہوتے ہیں، پھر مسٹر براؤن تو اس ضلع کے ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ وہ تو بڑے بڑوں کو بے وقت گھاس نہیں ڈالتے۔ ضرور کوئی خاص بات ہے۔''

''آپ اندر تو چلیں۔'' میں نے کہا۔ ''کھانا وغیرہ کھالیں، پھر بات کروں گی۔''

''مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟'' افتخار کمرے میں آ کر بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولے ''مجھ سے تو کھانا بھی نہیں کھایا جائے گا۔''

''آپ نے مجھے پہلے اس گھر کے بارے میں کیوں نہیں بتایا تھا کہ یہاں عجیب وغریب پُراسرار قسم کے واقعات ہوتے ہیں؟'' میں نے شکوہ آمیز لہجے میں کہا۔

افتخار ایک دم ہنس پڑے ''اوہو، تو یہ بات ہے۔ بھئی،

میں نے تو ان باتوں پر یقین ہی نہیں کیا تھا۔ اس وقت کوئی دوسرا بنگلا خالی بھی نہیں تھا۔ میں نے کہا نہ میں ان باتوں پر یقین کرتا ہوں، نہ ہی میری بیوی کرتی ہے۔ وہ ہر قسم کے بھوت پریت اور آسیب سے نمٹ لے گی۔''

میں نے جواب میں انہیں شروع سے لے کر آخر تک پورا واقعہ تفصیل سے سنا دیا۔

''سعدیہ! ممکن ہے باغ میں کوئی درندہ آ کر چھپ گیا ہو۔''

''اور وہ لڑکی کی ہنسی اور پازیب کی چھن چھن! وہ آوازیں بھی غالباً وہی درندہ نکال رہا ہوگا؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

افتخار نے کپڑے بدل کر منہ ہاتھ دھویا اور بولے ''چلو، کھانا لگواؤ، مجھے شدید بھوک لگی ہے؟''

میں نے غلام علی سے کھانا لگانے کو کہا۔ اس دوران میں افتخار نے اسپتال فون کر کے نواز کی حالت کے بارے میں پوچھا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ نواز کی حالت اب بہت بہتر ہے۔ زخم سے زیادہ وہ کسی شدید ذہنی دھچکے سے بے ہوش ہوا تھا۔ اسے ہم صبح تک اسپتال سے رخصت کر دیں گے۔''

کھانا کھانے کے بعد میں نے افتخار کے لیے کافی بنائی۔ وہ کافی ہمیشہ میرے ہی ہاتھ کی پیتے تھے۔

وہ کافی پی ہی رہے تھے کہ پھر اس لڑکی کی مترنم ہنسی کی آواز سنائی دی جو میں نے پہلے سنی تھی۔ افتخار چونک کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے جھپٹ کر اپنا سروس ریوالور نکالا اور کھڑکی کھولی ہی تھی کہ باہر دوڑتے ہوئے قدموں کے ساتھ پازیب کی جھنکار سنائی دی۔ افتخار نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، وہ بھی اس کھڑکی سے باہر کود گئے۔ پھر مجھے ان کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔

میں گھبرا کر باہر کی طرف بھاگی اور گیٹ پر موجود پولیس والوں سے کہا کہ ایس پی صاحب کسی کے پیچھے اس طرف گئے ہیں۔

پولیس والوں کے چہرے پر مردنی چھا گئی لیکن معاملہ اس وقت ان کے افسر اعلیٰ کا تھا اس لیے وہ بھی بے دلی سے بھاگتے ہوئے اسی طرف چلے گئے۔

پھر یکے بعد دیگرے تین فائر ہوئے اور سناٹا چھا گیا۔

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

اس سے پہلے کہ میں چیخ کر افتخار کو آواز دیتی، وہ مجھے واپس آتے دکھائی دیے۔ ان کے چہرے پر پریشانی کے

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

اگست 2011ء کے شمارے کی ایک جھلک

عکس، عمیرہ احمد کے
قلم سے پُرتاثر سلسلے وار ناول

شیشوں کا مسیحا کوئی

نہیں، شیریں حیدر کا سلسلے وار ناول

خوشبو کا سفر، عالیہ بخاری
کا ناول ایک نئی مہک کے ساتھ

راحت وفا کا... ناول ایک تھی نینان
نفسیاتی احساسات وخیالات سے مزین

میمونہ خورشید اور رضوانہ پرنس
کے پُرتاثر ناولٹ سچے جذبوں سے مزین

فاخرہ گل، سیرینا راض،
بشریٰ نثار اعوان، عالشہ خان،
رابعہ نیازی اور دیگر مصنفین کی
دلچسپ ویادگار تحریریں

آپ کی آمد کا منتظر ہے

کیا آپ نے اس ماہ کا پاکیزہ پڑھا؟ نہیں! کمال ہے!

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آ ثار تھے۔ اس مرتبہ ڈی سی صاحب کے گھر سے بھی کوئی نہیں آیا۔

افتخار کمرے میں کچھ دیر ٹہلتے رہے، پھر مسہری پر نیم دراز ہو گئے اور سگریٹ سلگایا۔ وہ کچھ دیر کسی گہری سوچ میں گم رہے پھر مجھ سے بولے ''سعدیہ! میرا خیال ہے کہ تم واپس گھر چلی جاؤ۔''

میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''کیوں واپس چلی جاؤں؟'' میں نے پوچھا۔

''بھئی، میں کسی دوسرے مکان کا بندوبست کر کے تمہیں بلا لوں گا۔''

''تو کیا آپ ان توہمات پر یقین رکھتے ہیں؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''مجھے بالکل یقین نہیں ہے۔'' انہوں نے کہا ''اس کے باوجود میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ یہ سب کیا ہے؟''

''میں واپس نہیں جاؤں گی۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا ''پورے خاندان میں میرا مذاق اڑے گا کہ بہت نڈر اور بہادر بنتی تھیں۔ اب کیسے دم دبا کر وہاں سے بھاگی ہیں۔''

''تم سمجھتی کیوں نہیں ہو؟'' افتخار جھنجلا گئے ''میں تو زیادہ وقت گھر سے باہر رہتا ہوں۔ مجھے تمہاری ہی فکر لگی رہے گی اور.....''

''میں آپ کو بالکل پریشان نہیں کروں گی۔ آپ میری فکر بالکل مت کریں۔ میں واپس تو کسی بھی حال میں نہیں جاؤں گی۔''

''اچھا اس وقت تو سو جاؤ، صبح بات کریں گے۔'' افتخار نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

''صبح بھی میرا جواب یہی ہوگا۔'' میں نے کہا اور لیٹ گئی۔

پھر رات میں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا۔

صبح میرا سر کچھ بھاری بھاری تھا۔ نیند پوری نہ ہونے سے میری آنکھیں جل رہی تھیں۔ افتخار البتہ ہشاش بشاش تھے۔

ہم ناشتے کے لیے بیٹھے تو رحیم نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''صاحب جی! اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں؟''

''ہاں رحیم، بولو۔'' افتخار نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''صاحب جی! میرا ماموں زاد بھی یہیں کانپور کی ایک فیکٹری میں کام کرتا ہے۔ وہ ایک بہت پہنچے ہوئے اللہ والے کو جانتا ہے، اگر آپ کہیں تو.....''

''نہیں رحیم!'' میں نے درشت لہجے میں کہا ''تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟''

''تم ذرا گرم چائے لے کر آؤ۔'' افتخار نے کہا ''یہ چائے تو ٹھنڈی ہو گئی۔''

رحیم چائے دانی اٹھا کر لے گیا۔

''سعدیہ!'' افتخار نے کہا ''دیکھو تم ان باتوں کو نہیں مانتی ہو، میں بھی نہیں مانتا ہوں لیکن ہمارے تمام ملازم انتہائی توہم پرست اور ضعیف الاعتقاد ہیں۔ ان لوگوں کو اپنی تسلی کرنے دو ورنہ یہاں ایک ملازم بھی نہیں رہے گا۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ میں.....''

''ہاں سعدیہ!'' وہ جلدی سے بولے ''میرے خیال میں یہ رحیم کا نہیں بلکہ سبھی کا خیال ہے۔''

''ٹھیک ہے، آپ کی یہ بات مان لیتی ہوں۔ واقعی یہ لوگ تو بہت خوف زدہ ہیں۔ یہ چلے گئے تو گھر کا سارا کام ٹھپ ہو جائے گا۔''

اسی وقت رحیم چائے لے کر واپس آ گیا۔ افتخار نے کہا۔ ''رحیم! تمہارے وہ اللہ والے بزرگ رہتے کہاں ہیں؟''

''یہاں کانپور میں ڈپٹی کی سرائے میں رہتے ہیں۔''

''میں دفتر جا کر گاڑی بھیج دوں گا۔ تم ڈرائیور کے ساتھ جا کر انہیں لے آنا۔''

''بہتر ہے سرکار!'' رحیم نے کہا۔

''ہاں، نواز خان کی طبیعت اب کیسی ہے؟'' افتخار نے پوچھا۔

''اس کے بازو کا گوشت بہت زیادہ ادھڑ گیا تھا صاحب جی! اسے پچیس ٹانکے لگے ہیں۔ کل تک وہ گھر آ جائے گا۔''

''میں ابھی آفس جاتے ہوئے اسے دیکھتا جاؤں گا۔''

نواز خان ان سب میں بہت جی دار آدمی تھا۔ اس واقعے کے بعد تو میں دل سے اس کی قدر کرنے لگی تھی۔

☆☆☆

''بیٹی! تم نماز پڑھتی ہو؟'' تمام واقعات کی تفصیل سننے کے بعد ان بزرگ نے پوچھا جنہیں رحیم لایا تھا۔

میں نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

''نماز کی پابندی کرو بیٹی!'' نورانی چہرے والے ان بزرگ نے کہا ''اگر تم تہجد بھی پڑھنا شروع کر دو تو دنیا کی کوئی طاقت تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ میں تمہیں ایک دو وظیفے بھی بتاؤں گا لیکن ان کے لیے نماز لازمی ہے۔''

''جی بابا، کوشش کروں گی کہ.....''

''کوشش نہیں بیٹا، بس آج سے یہ طے کر لو کہ تمہیں ہر صورت میں نماز کی پابندی کرنا ہے۔'' پھر وہ رحیم سے بولے۔ ''یہاں کوئی ایسا الگ تھلگ کمرا ہے جہاں بیٹھ کر میں سکون سے اپنا کام کر سکوں؟''

''جی بابا!'' رحیم نے عقیدت بھرے انداز میں کہا۔ ''میرے ساتھ آیئے۔''

اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ سکتی، رحیم انہیں اسی کمرے میں لے گیا جسے خالہ زینب نے بند رکھنے کی تاکید کی تھی۔

میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن بزرگ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو چکے تھے۔

اچانک کمرے سے انتہائی خوف ناک آوازیں آنے لگیں۔ رحیم سہم کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ پھر کچھ ایسی آوازیں آئیں جیسے کمرے میں بھونچال سا آ گیا ہو۔ دوسرے ہی لمحے دروازہ کھلا اور وہ عامل بابا کمرے سے یوں باہر آ گرے جیسے کسی نے انہیں اٹھا کر پھینک دیا ہو۔ ان کے چہرے اور ہاتھوں پر بھی نیل تھے۔ گرنے سے بھی انہیں اچھی خاصی چوٹ آئی تھی۔

رحیم نے بڑھ کر انہیں اٹھایا اور سہارا دے کر برآمدے کے تخت تک لایا۔ غلام علی نے جلدی سے انہیں پانی کا گلاس پیش کیا۔

وہ پانی پی کر مجھ سے بولے ''بیٹی! یہ تو بہت شرارتی قسم کے جن ہیں۔ یہ میرے قابو سے باہر ہیں۔'' وہ رحیم سے مخاطب ہوئے ''میاں، تم ہمیں واپس لے چلو۔''

''لیکن بابا.....'' رحیم نے کچھ کہنا چاہا۔

''دیر مت کرو بیٹا! میں اب یہاں نہیں رک سکتا۔'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

میں نے رحیم کو اشارہ کیا کہ انہیں لے جاؤ۔

مجھے خوف نہیں بلکہ پریشانی تھی کہ آخر یہ سب کیا ہے؟ میری عقل اب تک یہ ماننے کو تیار نہیں تھی کہ یہ سب آسیب کی کارستانی ہے۔ پھر یہ سب کچھ کیا تھا۔ سوچ سوچ کر میرا دماغ شل ہو گیا۔

میری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو اب تک واپس بھاگ گئی ہوتی یا خوف سے اس کی حرکتِ قلب بند ہو چکی ہوتی۔

دنیا کے کسی بھی کونے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 6,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 5,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر یا ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جا سکتی ہے۔ مقامی حضرات دفتر میں نقد ادائیگی کر کے رسید حاصل کر سکتے ہیں
رابطہ: شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

سفید داغ قابلِ علاج مرض ہے

ڈاکٹر سید اجمل زیدی

STEROIDS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

ایوارڈز ہولڈر

برص (سفید داغ) کے دواخانہ پاکستان کا مستند پروگرام

ASIAN EXCELLENCE PERFORMANCE AWARD

AWARD OF BEST ACHIEVEMENT

AWARD PILLAR OF LEUCODERMA

اسلام آباد

9-اپریل تا 30 مئی
9-اگست تا 30 ستمبر
9-دسمبر تا 30 جنوری
مستقل پتہ

مکان نمبر 462، سٹریٹ نمبر 20، G-8/1
کریانہ (تھیلی پوک) اسلام آباد
فون: (051) 2854595 - 2265880
موبائل: 0300-8566188
فیکس: 2261636

پشاور

یکم فروری تا 11 فروری
یکم جون تا 11 جون
یکم اکتوبر تا 11- اکتوبر
قیام

ہوٹل امین

کی ٹی روڈ نزد جھنگی چوک پشاور
فون: 9-2218215 (091)
موبائل: 0300-8566188

لاہور

14-فروری تا 27 فروری
14-جون تا 27 جون
14-اکتوبر تا 27-اکتوبر
قیام

ہوٹل عامر

لوئر مال نزد سیشن کورٹ لاہور
فون: 19-7115015 (042)
موبائل: 0300-8566188

کراچی

13-مارچ تا 27 مارچ
13-جولائی تا 27 جولائی
13-نومبر تا 27 نومبر
قیام

ٹورسٹ سینٹر

آفس 706، 7 فلور، شاہراہ فیصل
نرسری اسٹاپ بالمقابل K.F.C کراچی
فون: 9-7012068-021
موبائل: 0300-8566188

ملتان

28 مارچ تا 6-اپریل
28 جولائی تا 6-اگست
28 نومبر تا 7 دسمبر
قیام

ہوٹل سنٹر سیفٹی

ریلوے روڈ نزد چوک عزیز ہوٹل ملتان
فون: 62-4518061 (061)
4582803 (0300-8566188)

www.leucodermatologist.com
E-mail: syedajmalzaidi@hotmail.com - syedajmalzaidi@yahoo.co.uk

میں نے وہ کمرا دوبارہ بند کردیا جس میں بزرگ گئے تھے لیکن دوسرے ہی لمحے کمرے کا دروازہ پھر کھل گیا۔ میں نے دوبارہ بند کر کے باہر سے کنڈی لگانا چاہی لیکن اس سے پہلے ہی دروازہ دوبارہ کھل گیا۔

شکر ہے کہ اس وقت وہاں کوئی ملازم نہیں تھا۔

رحیم ان بزرگ کو چھوڑ کر آچکا تھا اور بہت گم صم تھا۔ میں نے تمام ملازموں کو برآمدے میں بلایا اور ان سے کہا۔

''یہاں کے حالات تو تم لوگ دیکھ ہی رہے ہو۔ تم میں سے جو بھی جانا چاہے، وہ چلا جائے۔ میری طرف سے پوری آزادی ہے۔''

''اور آپ.....؟'' غلام علی نے آہستہ سے پوچھا۔

''میں یہیں رہوں گی۔'' میں نے کہا ''میں کسی آسیب، بھوت پریت یا بدروح پر یقین نہیں رکھتی۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔''

''تو پھر میں بھی یہاں سے نہیں جاؤں گا۔'' غلام علی نے کہا۔

''رحیم! تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

''بیگم صاحبہ، میں یہاں نہیں رہ سکتا۔'' اس نے کہا۔ ''کوئی انسان ہو تو اس سے لڑا جاسکتا ہے لیکن ہوا سے کون لڑ سکتا ہے۔''

پھر غلام علی کے علاوہ ہر ملازم نے وہاں رہنے سے انکار کردیا۔

''ٹھیک ہے، تم سب چلے جاؤ۔ میں یہاں اکیلی بھی رہ سکتی ہوں۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔

تھوڑی دیر بعد افتخار بھی آگئے۔ وہ دوپہر کو کچھ دیر کے لیے گھر آیا کرتے تھے۔ میں نے انہیں تمام واقعات تفصیل سے بتادیے۔

''یہ تو ہونا ہی تھا۔'' وہ فکرمندی سے بولے ''یہ بے چارے تو ہم پرست اور ضعیف العقیدہ لوگ ہیں اس لیے میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ تم بھی واپس چلی جاؤ۔''

''میں واپس نہیں جاؤں گی۔'' مجھے بھی اب کچھ ضدی ہوگئی تھی۔ افتخار بھی میری ضدی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھے۔

''تو تم اتنے بڑے گھر میں اکیلی رہ لوگی؟'' انہوں نے پوچھا۔

''ہاں، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' میں نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد غلام علی کے علاوہ تمام ملازم رخصت ہوگئے۔ رحیم نے تو دبی زبان سے کہا بھی ''بیگم صاحبہ! آپ بھی چلی جائیں۔'' میں نے اسے گھور کر دیکھا تو وہ خاموش ہوگیا۔

افتخار کے چہرے پر فکرمندی اور پریشانی کے تاثرات تھے۔

''آپ پریشان نہ ہوں، مجھے کچھ نہیں ہوگا۔'' میں نے ہنس کر ان کا موڈ بحال کرنا چاہا۔

سہ پہر کو انہیں پھر جانا تھا۔ وہ جانے ہی والے تھے کہ دروازے پر ایمبولینس آکر رکی۔ اس میں سے نواز اترا اور برآمدے میں آگیا۔ اس کا سرخ وسفید چہرہ دو دن میں مرجھا کر رہ گیا تھا۔ ایک بازو پر شانے سے لے کر کہنی تک پٹی بندھی ہوئی تھی۔

''کیسے ہو نواز؟'' میں نے پوچھا۔

''ام تو بالکل ٹھیک اے بیگم صاب!'' نواز نے کہا۔ پھر متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا بولا ''یہ رحیم کدر اے؟''

''غلام علی کے علاوہ سب چلے گئے۔'' میں نے کہا۔

وہ یہ سن کر حیران رہ گیا ''سب چلا گیا، یہ کیسا مرد لوگ تھا بیگم صاب!''

''تم آرام کرو نوازا'' افتخار نے کہا ''اور اپنی بیگم صاحب کا خیال رکھنا۔'' یہ کہہ کر وہ اپنی گاڑی کی طرف چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد میں نے نواز سے پوچھا کہ تمہارے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا؟

''کچھ سمجھ نہیں آیا بیگم صاب!'' نواز نے کہا ''ہمیں اُدر ایک لڑکی دکھائی دیا تھا جو باغ میں اندر کی طرف بھاگ رہا تھا۔ ہم نے اسے رکنے کو کہا لیکن وہ نہیں رکا۔ ہم نے اسے دھمکی دیا کہ ہم فائر کردے گا لیکن وہ پھر بھی نہیں رکا۔ اسے ڈرانے کے لیے ام نے ہوا مین فائر کیا۔ پھر کسی نے ہم پر چھلانگ لگایا اور ہمارا گلا پکڑنے کا کوشش کیا، لیکن فوراً ہی ہمارا گردن گھبرا کر چھوڑ دیا اور ہمارے بازو پر کسی چاقو سے حملہ کردیا۔ اس بدبخت نے امارا سر زور سے ایک درخت سے ٹکرادیا۔ اس کے بعد ام بے ہوش ہوگیا۔ ام اس خانہ خراب کو چھوڑے گا نہیں۔'' نواز نے دانت پیس کر کہا۔

''اچھا، ابھی تو تم آرام کرو۔ بعد میں دیکھیں گے۔'' میں نے غلام علی سے کہا کہ نواز خان کو اس کے کمرے میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لے جاؤ۔

کھانا کھا کر میں تھوڑی دیر آرام کرتی تھی۔ میں اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔

شام کو کلارا آ گئی۔ حسبِ معمول کتا اس کی بغل میں تھا۔

اچھی خاصی سردی ہونے لگی تھی اس لیے میں کلارا کے ساتھ برآمدے ہی میں بیٹھ گئی۔

وہ رسمی باتوں کے بعد مجھ سے بولی ''مسز خان! میں اس گھر کے بارے میں تمہیں پہلے ہی بتا دیتی لیکن مسٹر خان نے کہا تھا کہ آپ میری وائف کو کچھ مت بتایئے گا۔ میں نے اس دن.....''

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ اس کا کتا خوف زدہ ہو کر اس کی گود سے کود گیا تھا۔ پھر وہ چیاؤں چیاؤں کرتا ہوا خوف زدہ ہو کر وہاں سے بھاگا۔

''او مائی گاڈ!'' کلارا نے کہا اور وہ بھی کتے کے پیچھے دوڑی۔

شکر ہے کہ کتا کسی اور طرف بھاگنے کے بجائے ڈپٹی کلکٹر کے بنگلے ہی کی طرف بھاگا۔ میں نے سوچ لیا، اب کلارا کو منع کر دوں گی کہ اپنا کتا لے کر نہ آیا کرے۔ برا مانتی ہے تو مانے!

میں نے چائے پی اور دیر تک اس صورتِ حال پر غور کرتی رہی۔

اندھیرا آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا، فضا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ میں نے جسم کے گرد شال لپیٹی اور برآمدے میں کھڑے ہو کر باہر لان کی طرف دیکھنے لگی۔

اچانک وہاں مجھے چھوٹا سا ایک عجیب الخلقت آدمی نظر آیا۔ اس کا قد تو بہ مشکل ایک فٹ ہو گا لیکن سر بہت بڑا تھا، سر پر بڑے بڑے بال تھے اور چہرہ فٹ بال کی طرح گول تھا۔ وہ اچانک لٹو کی طرح گھومتا ہوا میری طرف بڑھنے لگا۔ میں اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی، پھر آہستہ آہستہ اس کا قد بڑھنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ لان میں لگے پام کے درخت سے بھی اونچا ہو گیا۔ اس کی شکل بھی انتہائی بھیانک ہو گئی اور وہ دانت نکوس کر میری طرف یوں بڑھا جیسے مجھے توڑ پھوڑ کر رکھ دے گا۔ میں یوں کھڑی تھی جیسے اس نے مجھے ہپناٹائز کر دیا ہو۔

وہ میری طرف جھپٹا تو میں غیر ارادی طور پر پیچھے کی طرف ہٹی۔ اچانک وہ ہنستا ہوا فضا میں کہیں تحلیل ہو گیا۔

میں سر جھٹک کر سوچنے لگی کہ یہ میری نظر کا فریب تھا یا میں نے جو کچھ دیکھا، وہ حقیقت تھی؟

اس واقعے کے بعد سے پہلی دفعہ میرے ذہن پر خوف طاری ہوا لیکن میں نے اسے فوراً ہی ذہن سے جھٹک دیا۔ پھر کئی دن گزر گئے، مزید کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔ میں نے بھی اس واقعے کو نظر کا فریب سمجھ کر بھلا دیا لیکن یہ خاموشی اور سناٹا بھی مجھے عجیب لگتا تھا۔

رات کا کھانا میں عموماً افتخار کے ساتھ کھایا کرتی تھی۔ جب انہیں دیر سے لوٹنا ہوتا تھا تو وہ فون کر دیتے تھے۔

رات کو نو بجے کے قریب ان کا فون آ گیا اور وہ مجھ سے بولے ''سعدیہ! مجھے دیر ہو جائے گی، تم کھانا کھا لینا اور کھڑکیاں دروازے اچھی طرح بند کر کے سو جانا۔''

''کیوں، کیا آپ رات میں گھر نہیں آئیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''بھئی ممکن ہے، مجھے واپسی میں صبح ہو جائے۔ میں پولیس پارٹی لے کر ڈاکوؤں کے ایک گروہ کے پیچھے جا رہا ہوں۔ تم ڈرنا مت۔ میں کوشش کروں گا کہ جلدی گھر پہنچ جاؤں۔''

''آپ میری فکر مت کریں، بس اپنا خیال رکھیے گا۔''

میں نے ریسیور کریڈل پر رکھا اور غلام علی سے کہا کہ میرا کھانا کمرے ہی میں لے آؤ۔

سردی کی شدت میں اچانک اضافہ ہو گیا تھا۔ اچانک بارش بھی شروع ہو گئی، اس سے سردی مزید شدید ہو گئی۔ غلام علی کھانا لے کر آیا تو میں نے اس سے کہا کہ آتش دان میں آگ جلا دو۔ آج تو بہت ہی سردی ہے۔

غلام علی نے آتش دان میں لکڑیاں رکھیں اور آگ جلا دی۔

میں آتش دان کے نزدیک ہی آرام دہ کرسی پر کمبل لپیٹ کر بیٹھ گئی اور ایک ناول اٹھا لیا۔

باہر بارش کے قطروں سے گویا جلترنگ بج رہے تھے۔ برسات کا موسم مجھے پسند تھا لیکن اس وقت تو میرے ذہن پر عجیب سا خوف طاری تھا۔ باوجود کوشش کے میں اس خوف کو ذہن سے جھٹک نہیں پا رہی تھی۔ اچانک بارش تیز ہو گئی اور بارش کی بوچھاڑ کھڑکی کے شیشوں سے ٹکرا کر عجیب سی آواز پیدا کرنے لگی۔

اچانک مجھے ایسا لگا جیسے کھڑکی کے پاس کوئی کھڑا ہو۔ میں اسے اپنا وہم سمجھ کر کتاب پڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔ پھر

مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے کھڑکی کے شیشے پر دستک دی ہو۔

میں نے چونک کر دیکھا تو حیران رہ گئی۔ کھڑکی کے پاس خوبصورت سی ایک لڑکی کھڑی تھی۔ بارش میں بھیگنے کی وجہ سے اس کا لباس جسم سے چپک گیا تھا اور اس کے لمبے، گھنے بالوں سے بارش کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اس نے ایک مرتبہ پھر دستک دی اور ہاتھ جوڑ کر کچھ کہنے لگی لیکن مجھ تک اس کی آواز نہیں پہنچی۔

میری ریڑھ کی ہڈی میں سردی لہر دوڑ گئی اور زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے شدید خوف کا احساس ہوا۔ میں اگر عام حالات میں اسے دیکھتی تو مجھے اس پر ترس آ جاتا کہ اتنی شدید سردی اور بارش میں کھڑی وہ بری طرح کانپ رہی تھی اور خوشامدانہ انداز میں مجھ سے کچھ کہہ رہی تھی لیکن میں جانتی تھی کہ وہاں کسی لڑکی کی موجودگی ممکن ہی نہیں ہے۔

اس مرتبہ اس نے زور سے شیشہ بجایا۔ اب مجھے اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ میرا خوف لمحہ بہ لمحہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ میں نے سوچا، افتخار کو فون کر کے پوچھوں کہ وہ کب تک واپس آئیں گے؟ فون میرے کمرے ہی میں تھا اور میرے نزدیک ہی تپائی پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے فون سیٹ اٹھا کر اپنی گود میں رکھا اور ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا لیکن فون میں تو کسی بھی قسم کی کوئی آواز نہیں تھی۔ شدید بارش کے باعث وہ بھی مردہ ہو چکا تھا۔ اس دور میں ٹیلی فون کا نظام بھی ایسا نہیں تھا جیسا آج ہے۔ ذرا سی بارش یا آندھی آتی تھی تو فون لائنیں بے کار ہو جاتی تھیں۔

ابھی ریسیور میرے کان ہی سے لگا ہوا تھا کہ فون کی گھنٹی تیز آواز میں بجی۔ میں بری طرح اچھل پڑی اور بولی۔ ''ہیلو!''

''سعدیہ!'' دوسری طرف سے افتخار کی آواز آئی۔

ان کی آواز سن کر میری جان میں جان آئی۔ میں نے پوچھا ''آپ کہاں ہیں، کب تک گھر آئیں گے؟''

''بس میں آ رہا ہوں۔'' انہوں نے جواب دیا، پھر کچھ توقف کے بعد بولے ''ہاں، وہ کانتا وہاں پہنچ گئی؟''

''کون کانتا؟'' میں نے پوچھا۔

''بھئی، وہ میرے ایک سب انسپکٹر کی بیوی ہے۔ میں نے اسے اس خیال سے تمہارے پاس بھیج دیا تھا کہ تمہاری تنہائی دور ہو سکے۔''

''لیکن وہ یہاں تو نہیں پہنچی۔'' میں نے کہا۔

''ہو سکتا ہے بارش کی وجہ سے جیپ خراب ہو گئی ہو۔ وہ بس پہنچنے ہی والی ہو گی۔''

''اس کا حلیہ تو بتائیں۔ میں اب کسی پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں ہوں۔''

افتخار زور سے ہنسے اور بولے ''کیا تم ڈر رہی ہو؟ تمہاری آواز سے تو ایسا ہی لگ رہا ہے۔ کانتا بہت خوبصورت ہے۔ سفید رنگت ہے اور گھنے سیاہ بال ہیں۔ اس کے اوپری ہونٹ پر ایک مسا ہے۔''

اچانک مجھے اس لڑکی کا خیال آیا جو کھڑکی پر نظر آئی تھی۔ میں نے افتخار سے کہا ''آپ ذرا ہولڈ کریں۔''

میں نے فون سیٹ اور ریسیور تپائی پر رکھا اور اٹھ کر کھڑکی کی طرف جھپٹی۔ بارش میں بھیگی ہوئی وہ لڑکی افتخار کے بتائے ہوئے حلیے کے مطابق تھی۔ اس کے اوپری ہونٹ پر

فرح ناز کا شعری مجموعہ

خزاں میں پھول

کتابی شکل میں
شائع ہو گیا ہے

ملنے کا پتا:

ویلکم بک پورٹ۔ اردو بازار کراچی

حسین نیوز ایجنسی کراچی فون: 021-32763140

احمد حسین نیوز ایجنسی لاہور فون: 042-37352265

اشرف نیوز ایجنسی راولپنڈی فون: 051-5531610

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مسا بھی تھا۔ میں دوبارہ فون تک آئی تا کہ افتخار کو بتا سکوں کہ کانتا پہنچ چکی ہے۔

میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا تو لائن کٹ چکی تھی۔ میں نے دوبارہ افتخار کا نمبر ڈائل کرنا چاہا لیکن فون تو پہلے کی طرح مردہ تھا۔

اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ جب افتخار کی کال آئی تو ٹیلی فون کا ریسیور میرے کان سے لگا ہوا تھا، پھر گھنٹی کیسے بجی؟ اب اچانک ٹیلی فون مردہ کیوں ہو گیا؟ لیکن افتخار کی آواز تو میں نے خود سنی تھی۔ یہ سب کیا تھا؟ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ ریسیور، کریڈل پر نہ ہو اور گھنٹی بجنے لگے۔

اچانک مجھے شدید خوف کا احساس ہوا اور میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔

باہر کھڑی ہوئی لڑکی اب کچھ غصے میں تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے مجھے گالیاں دے رہی ہو اور کھڑکی کھولنے کا اشارہ کر رہی ہو۔

میں نے آیت الکرسی اور چاروں قل پڑھ کر خود پر اور کمرے میں پھونکا اور درشت لہجے میں اس لڑکی سے کہا۔ ''دفع ہو جاؤ۔''

مارے غصے کے اس لڑکی کا خوبصورت چہرہ مسخ ہو گیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک کریہہ صورت بڑھیا میں تبدیل ہو گئی۔ اس کی رنگت سیاہ تھی اور بال جھاڑ جھنکاڑ کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے لمبے لمبے دانت نکوس کر مجھے کھڑکی کھولنے کا اشارہ کیا۔

خوف کے مارے میں سن ہو کر رہ گئی۔ میری سب بہادری اور بے خوفی ہوا ہو گئی۔ اس نے پہلے زور سے کھڑکی پر ہاتھ مارا پھر مجھے اس کے ہاتھ میں ٹیڑھی میڑھی سی ایک لاٹھی نظر آئی۔ وہ لاٹھی اس نے زور سے شیشے پر ماری۔ دوسرے ہی لمحے کھڑکی کا شیشہ ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا اور ٹوٹے ہوئے شیشے کے ٹکڑے کمرے میں بکھر گئے۔

میں دہشت کے عالم میں یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ پھر ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے سیاہ رنگ کا ایک استخوانی ہاتھ اندر آیا۔ وہ ہاتھ اتنا خوف ناک اور مکروہ تھا کہ بے اختیار میرے حلق سے ایک چیخ برآمد ہوئی اور میں وحشت زدہ ہو کر دروازے کی طرف بھاگی۔ میں اس بوکھلاہٹ میں کسی سے ٹکرا گئی۔

وہ افتخار تھے۔ انہوں نے مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا ورنہ میں اوندھے منہ گرتی۔ میرے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ بس میرا جسم بری طرح لرز رہا تھا۔

''سعدیہ.....!'' افتخار نے پکارا ''کیا ہوا سعدیہ!''

''وہ..... وہ..... کھک..... کھڑ..... کی.....'' میں نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا لیکن اب وہاں کچھ نہیں تھا۔

''کیا ہوا کھڑکی کو؟'' انہوں نے نرم لہجے میں پوچھا پھر مجھے سہارا دے کر مسہری تک لے گئے اور بولے ''تم اطمینان سے بیٹھو اور مجھے بتاؤ کہ کیا ہوا ہے؟''

اسی وقت بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں آئیں اور غلام علی ہانپتا کانپتا کمرے میں داخل ہوا اور بولا ''آپ ٹھیک تو ہیں بیگم صاحبہ!''

''تم ایسا کرو غلام علی ایک گلاس گرم دودھ لے آؤ۔''

''جی صاحب!'' غلام علی نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

میرے اوسان اس وقت تک کچھ بحال ہو چکے تھے۔ افتخار کے کپڑے پانی میں شرابور تھے۔ ان کے بالوں سے ابھی تک پانی ٹپک رہا تھا۔

انہوں نے پانی کا گلاس میرے ہاتھ میں دیا اور بولے۔ ''تم پانی پیو۔''

میں نے پورا گلاس ایک سانس میں خالی کر دیا اور آہستہ سے بولی ''آپ پہلے کپڑے بدل لیں ورنہ بیمار پڑ جائیں گے۔''

''اور تم.....''

''میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا ''آپ کے کپڑے بھیگ کیسے گئے؟''

''گھر سے کچھ فاصلے پر میری جیپ کا انجن بند ہو گیا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ تم جیپ کو سڑک کے کنارے لگا دو، صبح دیکھنا اس میں کیا خرابی ہے؟ پھر میں نے ڈرائیور کے ساتھ مل کر جیپ کو سڑک کے کنارے لگایا اور ہم پیدل ہی گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ بارش اتنی شدید تھی کہ جیپ سے اترتے ہی میرے کپڑے پانی میں شرابور ہو گئے تھے۔ بارش اور شدید سردی میں گھر پہنچا تو مجھے تمہاری زوردار چیخ سنائی دی۔ میں بری طرح گھبرا گیا کہ نہ جانے تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ میں دیوانہ وار کمرے میں بھاگا تو تم سے ٹکرا گیا۔''

افتخار کپڑے بدلنے کے لیے باتھ روم میں چلے گئے۔

وہ تولیے سے اپنے بال رگڑتے ہوئے باہر نکلے تو غلام علی میرے لیے دودھ کا گلاس لے آیا تھا اور آتش دان میں مزید لکڑیاں ڈال رہا تھا۔

افتخار آتش دان کے پاس ہی کرسی پر بیٹھ گئے اور مجھ سے بولے ''ہاں، اب بتاؤ، کیا ہوا تھا؟''

''آپ پہلے کھانا تو کھا لیں۔'' میں نے کہا۔

''کھانا تو میں نے رنگ پور ہی میں کھا لیا تھا۔''

رنگ پور وہ گاؤں تھا جہاں وہ مجرموں کی تلاش میں گئے تھے۔

''تو پھر میں آپ کے لیے گرما گرم کافی لے کر آتی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''تم آرام سے بیٹھو۔ کافی غلام علی لے آئے گا۔'' انہوں نے غلام علی کو آواز دی اور اس سے کافی لانے کو کہا پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے ''سعدیہ! آخر ہوا کیا تھا؟''

میں نے انہیں شروع سے لے کر آخر تک تمام واقعات تفصیل سے بتا دیے۔

افتخار میری باتیں سن کر ہنسنے لگے۔

غلام علی کافی کی پیالیاں میز پر رکھ کر چلا گیا۔

''آپ ہنس کیوں رہے ہیں؟'' میں نے برا مان کر پوچھا۔

''زندگی میں پہلی دفعہ تمہاری دل خراش چیخ سنی ہے، تم بھی ڈر گئیں؟''

''آپ نے مجھے فون کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے تمہیں فون کرنے کی کوشش کی تھی لیکن فون میں شاید کوئی خرابی ہو گئی ہے۔''

''اس کے باوجود آپ سے میری بات بھی ہوئی۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، تم بتا چکی ہو۔'' افتخار پھر ہنسے۔

''آپ کو شاید میری بات پر یقین نہیں آ رہا ہے۔''

اچانک میری نظر کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے پر پڑی۔ ''دیکھیے، کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا ہوا ہے اور شیشے کے ٹکڑے کمرے میں بکھرے ہوئے ہیں۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ شیشہ..... کیا نام بتایا تھا تم نے..... ہاں کانتا..... کانتا نے یا اس بڑھیا نے توڑا ہے؟''

''ہاں، اسی کانتا نے جس پر کل رات آپ نے دو فائر کیے تھے۔'' میں نے چڑ کر کہا۔

افتخار سنجیدہ ہو گئے اور بولے ''میں تمہیں جھٹلا نہیں رہا ہوں۔ میں نے کبھی ان باتوں پر یقین نہیں کیا لیکن اس رات خود میں نے کسی لڑکی پر فائر کیے تھے۔''

''آپ..... مجھے..... گھر..... بھجوا دیں..... اور خود..... بھی یہاں..... سے کہیں اور..... منتقل ہو جائیں۔'' میں نے ان سے نظریں چراتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

''کیا؟'' افتخار اچھل پڑے ''یہ تم کہہ رہی ہو سعدیہ خان..... تم..... تم شاید بھول گئیں کہ تم ان باتوں پر یقین نہیں کرتی ہو اور.....''

''میں اب بھی یقین نہیں کر رہی لیکن..... یہ سب کیا ہے؟ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ہے۔''

''سمجھ میں تو میری بھی نہیں آ رہا ہے لیکن میں بھاگوں گا نہیں۔'' افتخار نے کہا ''جب میں نے یہ بنگلا الاٹ کرایا تھا، اسی وقت محکمے کے کچھ لوگوں نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ اس بنگلے میں منتقل نہ ہوں ورنہ بہت پریشان ہو جائیں گے اور ایک ہی مہینے بعد وہ بنگلا چھوڑ کر بھاگیں گے۔ میں نے اس بات پر ان کا بہت مذاق اڑایا تھا کہ مجھے ان باتوں پر یقین نہیں ہے اور انسان تو اشرف المخلوقات ہے، یہ بھوت پریت اور آسیب اس کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔''

''اگر آپ یہ بنگلا نہیں چھوڑیں گے تو پھر میں بھی نہیں جاؤں گی۔'' میں نے کہا۔

''بھئی مجھ پر رحم کرو۔ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں اور اتنی جلدی تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔'' افتخار ہنس کر بولے۔

''میں تو یہ سوچ کر تمہیں یہاں لے آیا تھا کہ خاندان کی دوسری لڑکیوں کے مقابلے میں تم بہت نڈر ہو اور اس قسم کی باتوں پر یقین بھی نہیں کرتی ہو لیکن.....''

''لیکن کیا؟'' میں نے منہ بنا کر کہا ''میری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو وہ اسی دن خوف سے مر گئی ہوتی جب نواز خان

شمارہ جولائی 2011ء کی منتخب سچ بیانیاں
ہماری پیش کش..... آپ کا انتخاب
☆ اول: بے گناہ مجرم..... فریدہ (سکھر)
☆ دوم: تعبیر خواب..... روبی شاہ (گوٹھ محمد شاہ)
☆ سوم: شیریں فرہاد..... فرہاد (کوئٹہ)
پہلے دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بھی انتخاب کیجیے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زخمی ہوا تھا یا پھر یہاں سے بھاگ گئی ہوتی۔"

"یہ چکر کچھ اور ہی ہے۔" افتخار نے سوچتے ہوئے کہا۔ "کوئی نہیں چاہتا کہ میں اس بنگلے میں رہوں، ایسا کون ہے؟ اس کا سراغ مجھے خود ہی لگانا ہوگا ورنہ بھوت پریت یوں کھڑکیوں کے شیشے نہیں توڑتے۔ اگر ایسی کوئی مخلوق ہوتی ہے تو وہ بند دروازوں اور کھڑکیوں سے بھی دھواں بن کر گزر سکتی ہے، پھر اس لڑکی کو کھڑکی پر دستک دینے کی کیا ضرورت تھی؟"

افتخار کی باتوں سے میرا بھی کچھ حوصلہ بڑھا "لیکن میں نے تو اس عجیب الخلقت آدمی کو لان میں ناچتے اور پام کے برابر بلند ہوتے بھی دیکھا تھا۔ میں نے اس لڑکی کو بھی مکروہ صورت بڑھیا کے روپ میں آتے دیکھا تھا، تو کیا یہ سب کچھ میری نظر کا دھوکا تھا، پھر ان بزرگ کی حالت یاد آئی جسے رحیم لایا تھا، ان کا خوف زدہ ہو کر یہاں سے بھاگنا، یہ سب کیا تھا؟"

"اب سو جاؤ سعدیہ!" افتخار ہنس کر بولے "اب کوئی لڑکی آئی تو میں اس سے نمٹ لوں گا۔ میں نے تو لندن میں بڑی بڑی چڑیلوں کو سیدھا کر دیا، یہ کانتا تو پھر مقامی ہے۔" انہوں نے ماحول کی کشیدگی کو کم کرنے کو کہا "ان میں سے ایک تو ایسی پیچھے پڑی تھی کہ میرے ساتھ ہندوستان آنے کو تیار ہو گئی تھی۔"

"تو پھر لے آتے۔" میں نے منہ بنا کر کہا۔

"بھئی بندۂ بشر ہوں، ایک وقت میں دو چڑیلوں سے کیسے نمٹ سکتا تھا، ایک چڑیل تو پیدا ہوتے ہی میرے گلے پڑ گئی تھی۔"

"میں پیدا ہوتے ہی آپ کے پیچھے پڑ گئی تھی؟" میں نے منہ بنا کر کہا۔

"تم..... تم چڑیل کب ہو، تم تو میری جان ہو۔" انہوں نے رومینٹک لہجے میں کہا۔

"اچھا اب سو جائیں صبح جلدی اٹھنا ہے آپ کو۔"

اس رات مجھے اچھی طرح نیند بھی نہ آئی۔

رات میں اچانک میری آنکھ کھلی تو افتخار میرے برابر موجود نہیں تھے۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ وہ ایک کونے میں مصلا بچھائے نماز پڑھ رہے تھے۔ اس رات پہلی دفعہ مجھ پر انکشاف ہوا کہ افتخار تہجد کی نماز بھی پڑھتے ہیں۔

نماز پڑھ کر وہ دیر تک دعا مانگتے رہے، پھر مصلے سے اٹھ کر میرے برابر آئے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ انہوں نے میرے چہرے اور جسم پر کچھ پڑھ کر پھونکا اور بیڈ پر بیٹھ کر تسبیح پڑھنے لگے۔

میرا ذہن اچانک ہلکا پھلکا ہو گیا اور مجھے بہت گہری اور پُرسکون نیند آ گئی۔

صبح میری آنکھ کھلی تو افتخار وردی پہنے جانے کو تیار کھڑے تھے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ پھر مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ کمرے میں خالہ زینب بھی موجود تھیں۔

میں بے اختیار ان کے گلے سے لگ گئی "کیسی ہیں خالہ!"

"سعدیہ بیٹی!" خالہ نے کہا "یہ تو نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔ تو اتنی پریشان تھی تو مجھے خبر کیوں نہ کی؟" ان کے انداز میں شکوہ تھا۔ "وہ تو اگر رحیم نہ پہنچتا تو مجھے تو اب بھی خبر نہ ہوتی۔"

"رحیم!" میں نے حیرت سے کہا "وہ آپ کو کہاں مل گیا؟"

"رحیم وہاں کب گیا؟" افتخار بھی حیران تھے۔

"پرسوں صبح گھبرایا ہوا رام پور پہنچا تھا۔ اس نے یہاں کے حالات بتائے تو میں پریشان ہو گئی اور فوراً ہی اس کے ساتھ آ گئی۔ رحیم بتا رہا تھا کہ بیگم صاحبہ تو کسی بھی قیمت پر بنگلا چھوڑنے کو تیار ہی نہیں ہیں۔" پھر وہ چونک کر بولیں "وہ موئی فرنگن تو اب یہاں نہیں آتی، اپنا پلا لے کر؟"

ان کے انداز پر مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا "وہ اب نہیں آئے گی اور آئے گی بھی تو میں اسے منع کر دوں گی۔"

"خالہ، آپ آرام کریں، سفر میں تھک گئی ہوں گی۔" افتخار نے کہا۔

"اے لو، تھکن کیسی بیٹا! رام پور یہاں سے دور ہی کتنا ہے؟"

خالہ کے آنے سے افتخار کے چہرے پر بھی مجھے سکون نظر آ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ڈرائیور ان کی جیپ لے آیا تو وہ دفتر چلے گئے۔

خالہ زینب منہ ہاتھ دھو کر کمرے سے نکلیں تو ٹھٹک کر رک گئیں۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

"سعدیہ! یہ کمرا کس نے کھولا تھا؟" ان کا اشارہ اس کمرے کی طرف تھا جسے انہوں نے نہ کھولنے کی تاکید کی تھی۔

میں نے انہیں بتایا کہ رحیم کسی بزرگ کو لے کر آیا تھا۔

انہوں نے یہ کمرا کھولا تھا۔

"خیر، میں دیکھوں گی۔" انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

میں یہ تو جانتی تھی کہ شوہر کے مرنے کے بعد خالہ زینب نے بس مصلا پکڑ لیا تھا۔ وہ نہ جانے کون کون سے چلے اور وظیفے کرتی رہتی تھیں۔ میں اکثر ان پر ہنسا کرتی تھی۔

ایک دن بابا جان نے مجھے سمجھایا تھا کہ زینب کلام الٰہی کا ورد کرتی ہیں اور تم ہنستی ہو؟ آئندہ ان کا مذاق مت اڑانا بیٹا، ورنہ نقصان اٹھاؤ گی۔

بابا جان کبھی ایسی بات کرتے نہیں تھے۔ وہ اس دن بہت سنجیدہ تھے اس لیے میں نے بھی اپنے رویے پر ان سے معافی مانگ لی۔

خالہ زینب نے مغرب کی نماز کے بعد بہت دیر تک کوئی وظیفہ پڑھا۔ عشا کی نماز پڑھ کر انہوں نے بہت معمولی سا کھانا کھایا اور رحیم سے کہا "میری چوکی اسی کمرے میں پہنچا دو۔"

"مم..... میں..... تو....."

"تو نے تو لڑکیوں کو بھی مات دے دی ہے۔" خالہ زینب جھنجلا کر بولیں "چھوڑ دے، میں وہاں فرش پر اپنا مصلا بچھا لوں گی۔" پھر وہ مجھ سے بولیں "دھیان رکھنا سعدیہ! کوئی کمرے میں داخل نہ ہونے پائے۔"

انہوں نے لوبان سلگایا اور ایک بوتل پانی لے کر جانماز بغل میں دبائی اور زیر لب کچھ پڑھتے ہوئے کمرے میں داخل ہو گئیں۔

اچانک بادل زور سے گرجا اور دوسرے ہی لمحے بارش شروع ہو گئی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے بارش شدید ہو گئی۔

عجیب پُراسرار اور وحشت زدہ سا ماحول تھا لیکن نہ جانے کیوں اب مجھے کل کی طرح خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

ایک عجیب بات یہ بھی تھی کہ خالہ زینب نے کمرے کا دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ میں نے غلام علی اور نواز خان کو بھی سختی سے تاکید کر دی تھی کہ اس کمرے میں کوئی نہ جائے۔

تھوڑی دیر بعد کمرے سے خالہ زینب کی آواز آئی۔ وہ بلند آواز میں کوئی وظیفہ پڑھ رہی تھیں۔ میں نے غور کیا تو وہ بلند آواز میں سورۂ فیل کا ورد کر رہی تھیں۔ اچانک ایسی دھمک کی آوازیں آنے لگیں جیسے کئی ہاتھی گھر میں دھما چوکڑی مچا رہے ہوں۔ پھر ان کے کمرے سے ایک دلخراش چیخ سنائی دی۔ میں گھبرا کر ان کے کمرے کی طرف دوڑی لیکن

سرطان کی اقسام

سرطان کی سو سے زیادہ اقسام میں سے ہر قسم اپنی جگہ پر ایک علیحدہ مرض ہے جن کی وجوہات، علامات جنس کے لحاظ سے تقسیم، جغرافیائی تقسیم، بہ لحاظ عمر تقسیم اور ادویات (اگر کچھ ہوں) سب مختلف ہیں۔ صرف ان کے ممکنہ عروج یکساں ہیں کہ تقریباً تمام ہی اقسام کے سرطان کے علاج میں جراحی یا سرجری اور اشعاعی علاج (Radiation Therapy) مشترک ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حکیم بقراط بھی سرطان کے مرض سے واقف تھے۔ تب سے اب تک اس مرض کی وجوہات تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے مگر اس میں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے۔ ہر قسم کے سرطان کی ممکنہ ظاہری وجوہات کا تو پھر بھی کچھ علم اور اندازہ ہو گیا ہے مگر باطنی یا اصل وجوہات ابھی تک صیغۂ راز میں ہیں۔ مثلاً پھیپھڑوں کے سرطان کی ممکنہ وجہ تمباکو نوشی اور ایسبسٹاس اور سیمنٹ کی صنعت سے وابستگی ہے۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ جو بھی شخص تمباکو نوشی کرے گا یا ایسبسٹاس کی صنعت سے وابستہ ہو گا وہ لازماً پھیپھڑوں کے سرطان میں مبتلا ہو جائے گا۔ بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ تمباکو نوشی پھیپھڑوں کے سرطان کے پیدا ہونے کے خطرے میں اضافے کا باعث ہوتی ہے یا شراب نوشی اور دوسری نشہ آور اشیا جگر اور اعضائے بول کے سرطان میں اضافے کا باعث ہیں۔

مرسلہ: خرم ملک، گجر خان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دروازے پر پہنچ کے ٹھٹک گئی۔ مجھے خالہ کی تاکید یاد آ گئی تھی کہ کمرے میں کوئی قدم نہ رکھے۔ خالہ زینب کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔

بارش اچانک شدت اختیار کر گئی۔ اچانک مجھے پازیب کی چھن چھن سنائی دی، پھر وہی لڑکی خالہ کے سامنے آ کھڑی ہوئی جسے میں نے گزشتہ رات کھڑکی پر دیکھا تھا۔

خالہ زینب نے بوتل میں سے کچھ پانی ہاتھ پر ڈالا اور اس لڑکی کی طرف اچھال دیا۔

وہ زمین پر گر کے بری طرح تڑپنے لگی اور بولی۔

''مجھے..... مجھے معاف کر دیں..... مجھے..... معاف کر دیں۔''

''تو کون ہے اور یہاں کیوں آئی ہے؟''

''میں تو..... برسوں..... سے یہیں رہ رہی تھی..... لیکن..... میں نے آج تک یہاں کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔''

''جھوٹ مت بول۔'' خالہ زینب نے پانی کا ایک اور چھینٹا مارا ''تو کالنتا ہے نا؟''

''مم..... میں..... تو..... موہنی ہوں.....''

''تو پھر کالنتا کون ہے؟'' خالہ زینب نے گرج کر کہا۔

''ساری مصیبت اس کالنتا اور رمیش کی وجہ سے آئی ہے۔'' موہنی نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔

خالہ آنکھیں بند کر کے پھر کسی وظیفے کا ورد کرنے لگیں۔ موہنی ان کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھی رہی۔

اچانک کمرے میں ایک خوف ناک آواز گونجی۔ ''بس بند کر یہ تماشا اور یہاں سے نکل جا ورنہ بھسم کر دوں گا۔''

''سامنے آ کر بات کر۔'' خالہ نے چیخ کر کہا، پھر بلند آواز میں کوئی ورد کرنے لگیں۔

''پڑھنا بند کر دے، ہم لوگ آ رہے ہیں۔'' پھر دو تین ہیولے سے مجھے نظر آئے۔

''تم لوگ کہاں سے آئے ہو؟'' خالہ زینب نے گرج کر پوچھا ''اور کیوں آئے ہو؟''

جواب میں مجھے ایک بھیانک قہقہہ سنائی دیا۔ وہ آواز اتنی بھیانک اور بلند تھی کہ غلام علی اور نواز خان بھی اپنے کوارٹروں سے نکل کر اس کمرے کی طرف دوڑے لیکن میں نے انہیں کمرے میں جانے سے روک دیا۔

اچانک کمرے میں ایک شعلہ سا لپکا اور میں نے خالہ زینب کو جانماز پر گرتے دیکھا۔ میرا دل اچھل کر گویا حلق میں آ گیا۔

خالہ زینب کے چہرے پر شدید تکلیف کے آثار تھے۔ وہ فوراً ہی اٹھ بیٹھیں اور بلند آواز میں کسی وظیفے کا ورد کرتے ہوئے بوتل سے پانی لیا اور ان ہیولوں کی طرف اچھال دیا۔

اس کے بعد تو ایسی دل خراش چیخیں گونجیں کہ میں نے نواز خان کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑتے دیکھیں۔ خالہ زینب نے دوسری مرتبہ ہاتھ کا چلو بنا کر زیادہ پانی لیا اور جھٹکے سے ان ہیولوں کی طرف پھینک دیا۔ پھر ایسی آوازیں آئیں جیسے کسی کو ذبح کیا جا رہا ہو۔ اس کے بعد وہی گونج دار آواز آئی ''ارے مر گیا..... مر گیا..... ہمیں شما کر دو مائی..... تجھے تیرے..... اللہ کا واسطہ..... ہمیں شما کر دے۔'' پھر کسی بڑھیا کی منمناتی ہوئی آواز گونجی ''ارے..... جل گئی..... مر گئی..... شما کر دے..... مجھے..... بچاؤ.....''

خالہ زینب اس وقت جلال کے عالم میں تھیں۔ وہ اچانک کھڑی ہو گئیں اور اپنی تسبیح ہاتھ میں پکڑ کر زور سے ہوا میں گھمائی۔ پھر دل خراش آوازیں آئیں ''ہائے..... جل گئے..... مر گئے..... ہمیں..... شما کر دے..... مائی.....''

خالہ زینب نے پھر زیر لب کسی آیت کا ورد کرتے ہوئے پانی ہاتھ میں لے کر ان پر چھینٹے مارے۔

بڑھیا کی منمناتی آواز کے ساتھ بہت سی دوسری آوازیں بھی آئیں ''ہم..... جا رہے ہیں مائی..... ہمیں..... جانے دے..... ہم یہاں سے بہت دور چلے جائیں گے..... پھر کبھی اِدھر نہیں آئیں گے۔ شما کر دے مائی!'' بڑھیا منمنائی۔

میں گویا پتھر کی ہو کر رہ گئی تھی۔ غلام علی اور نواز خان بھی سکتے کی سی کیفیت میں وہاں کھڑے تھے۔

خالہ زینب نے پانی کے چھینٹے مار کے اپنی تسبیح ایک مرتبہ پھر لہرائی پھر ایسی آوازیں آئیں جیسے بہت سے لوگ خوف ناک انداز میں ایک ساتھ چیخ رہے ہوں۔ آہستہ آہستہ وہ ہیولے دھواں بن کر لہرائے اور ہوا میں تحلیل ہو گئے۔

اب مجھے وہاں راکھ کے ڈھیر نظر آ رہے تھے۔

خالہ زینب بھی نڈھال سی ہو کر بیٹھ گئیں اور بوتل سے تھوڑا سا پانی پی لیا۔

''مم..... مجھے..... معاف کر دیں..... میں..... وعدہ کرتی ہوں..... کہ یہاں سے اتنی..... دور چلی جاؤں گی..... کہ.....'' ہاتھ جوڑے بیٹھی موہنی نے التجا کی۔

''نہیں۔'' خالہ زینب نے جلال کے عالم میں کہا۔ پھر اس پر بھی پانی کا چھینٹا مارا۔ وہ ذبح کیے ہوئے مرغے کی طرح تڑپنے لگی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کرب ناک آواز میں چیخ بھی رہی تھی ''ارے..... مر گئی..... جل گئی..... مر گئی..... مر... گئی.....'' موہنی کی آواز آہستہ آہستہ مدھم ہو گئی، پھر بالکل ہی خاموشی چھا گئی۔

اس کے ساتھ ہی میں نے ایک اور دل دہلا دینے والا منظر دیکھا۔ فرش پر ایک خوبصورت لڑکی کے بجائے وہی بڑھیا پڑی تھی جو گزشتہ رات مجھے دکھائی دی تھی۔ اس کے سیاہ استخوانی ہاتھ، پتلی پتلی اور سیاہ انگلیاں اور بڑھے ہوئے، مڑے تڑے ناخن مجھے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ استخوانی ڈھانچا بھی راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو گیا۔

خالہ زینب نے پانی کی بوتل سے دو تین گھونٹ پیے اور یوں نڈھال ہو کر بیٹھ گئیں جیسے برسوں کی مریض ہوں۔

میں آنکھیں پھاڑے انہیں دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ اٹھیں اور نڈھال نڈھال سی کمرے کے باہر آ گئیں۔

''خالہ! آپ ٹھیک تو ہیں؟'' میں دوڑ کر ان سے لپٹ گئی۔

''میں ٹھیک ہوں پگلی!'' انہوں نے نقاہت زدہ لہجے میں کہا۔ ''مجھے کوئی بڑی سی چادر اور ایک جھاڑو لا دے۔'' وہ رحیم سے مخاطب ہوئیں۔

رحیم فوراً ہی جھاڑو اور چادر لے آیا۔

خالہ نے کمرے میں بکھری ہوئی راکھ جھاڑو کے ذریعے اس چادر میں ڈالی اور چادر کو اچھی طرح پوٹلی کی طرح باندھ دیا۔ وہ پوٹلی اٹھا کر کمرے سے باہر آ گئیں اور رحیم سے کہا کہ اب اس کمرے کو اچھی طرح دھو دو۔ اب وہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔

خالہ وہاں سے اپنے کمرے میں چلی گئیں اور بستر پر جا کر گر سی گئیں۔ میں ان کے تلوے سہلانے لگی، پھر گلاس میں پانی بھر کے انہیں دیا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں اور اسی بوتل میں سے کچھ پانی لے کر گلاس میں ملایا اور پورا گلاس خالی کر دیا۔

ان کی حالت اب قدرے بہتر تھی۔ میں نے غلام علی سے کہا کہ جلدی سے چائے بنا لاؤ۔

بارش ابھی تک اسی شدت سے ہو رہی تھی۔

چائے پینے کے بعد خالہ کی حالت بہت حد تک سنبھل گئی۔

میں نے ان سے کہا ''خالہ، یہ سب کیا تھا؟''

خالہ نے طویل سانس لیا اور مسکرا کر بولیں ''اس مکان میں برسوں سے بدروحوں کا بسیرا تھا۔ مجھے یہاں آتے ہی محسوس ہو گیا تھا کہ اس بنگلے پر اثر ہے۔ میں نے ایک طرف کر کے انہیں اس کمرے میں بند کر دیا اور اس کے دروازے اور کھڑکیوں پر حصار باندھ دیا۔ اب وہ اس کمرے سے باہر نہیں نکل سکتی تھیں۔

''لیکن خالہ! جب مجھے وہ لڑکی نظر آئی تھی تو وہ کمرا کھلا بھی نہیں تھا۔'' میں نے کہا۔

''وہ ایک دوسری بدروح تھی۔ وہ آ کر باغ میں رہ رہی تھی۔ میری موجودگی میں تو اس کی ہمت ہوئی نہیں، میرے جاتے ہی وہ آزادی سے بنگلے میں گھومنے پھرنے لگی۔ میں نے تمہارے گلے میں جو تعویذ ڈالا تھا، وہ اس کی وجہ سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی۔ اس میم کے کتے کو وہی دکھائی دیتی تھی۔ جانوروں میں یہ حس ہوتی ہے کہ وہ اس قسم کی مخلوق کو دیکھ لیتے ہیں۔ کتا اسی لیے خوف زدہ ہو کر بھاگا تھا۔ نواز خان کو بھی اس نے زخمی کیا تھا۔ افتخار میاں کو بھی وہی نظر آئی تھی پھر سونے پر سہاگا یہ ہوا کہ رحیم نے وہ کمرا بھی کھول دیا۔ اس کے بعد تو یہی ہونا تھا۔ اگر میں اب بھی نہ آتی تو خدانخواستہ..... خدانخواستہ..... میرے منہ میں خاک تمہیں کوئی بڑا نقصان بھی پہنچ سکتا تھا۔''

افتخار نہ جانے کس وقت وہاں آ گئے تھے۔ میں خالہ زینب کی باتوں میں اتنی محو تھی کہ مجھے ان کے آنے کا بھی

عالم ہو

عالم مثال کے پہلے طبقے کو ''عالم ہو'' کہا جاتا ہے۔

عالم ہو کے بعد عالم باہوت، پھر عالم لاہوت، پھر عالم جبروت اور عالم ملکوت واقع ہیں۔ ان دنیاؤں کو جنوں کی دنیا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ناسوت وہ دنیائیں ہیں جنہیں جہنم کے طبقات کہہ کر یاد کیا جاتا ہے۔ ان تمام عالموں میں لطیف روحیں رہتی ہیں۔

اقتباس: عالم برزخ از رئیس امروہوی
مرسلہ: نعمان عباسی، لاڑکانہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

احساس نہ ہوا۔

''اچھا، اب خالہ کو آرام کرنے دو۔'' افتخار نے کہا۔ ''ان سے باقی باتیں صبح کر لینا۔''

''چلیے، آپ کپڑے بدلیں، میں کھانا لگواتی ہوں۔'' میں نے کہا۔

اس رات مجھے کئی دنوں کے بعد بہت ہی گہری اور پُرسکون نیند آئی۔

میں صبح سو کر اٹھی تو بہت ہشاش بشاش تھی۔ افتخار فجر کی نماز پڑھنے کے لیے اٹھتے تھے تو پھر نہیں سوتے تھے۔

میں نے ان کے لیے ناشتا لگوایا اور خود چائے کا ایک کپ لے کر ان کے سامنے بیٹھ گئی۔ افتخار نے چائے پیتے ہوئے کہا ''سعدیہ! میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا ہوں۔ اس پورے بنگلے پر ایک بوجھل پن سا تھا۔ اب تو ہر چیز بہت خوشگوار لگ رہی ہے۔''

''ہاں، میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔ کئی راتوں کے بعد مجھے گزشتہ رات اتنی گہری اور پُرسکون نیند نصیب ہوئی ہے۔''

افتخار جانے کے لیے کھڑے ہوئے تو دروازے پر ایک تانگا آ کر رکا۔

''تانگے میں اس وقت کون آ گیا؟'' افتخار خود کلامی کے انداز میں بولے۔

دوسرے ہی لمحے مجھے رحیم نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا کپڑوں کا ایک بکس تھا۔

''رحیم!'' افتخار نے پوچھا ''تم اتنی صبح کو کہاں سے آ رہے ہو اور یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟''

''میں رام پور سے آیا ہوں سر اور میرے ساتھ خالہ زینب ہیں۔''

''کیا؟'' ہم دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

''کیوں، صبح صبح مجھ سے بکواس کرتا ہے؟'' افتخار اچانک بپھر گئے۔ انہیں غصہ کبھی کبھار ہی آتا تھا لیکن اس بدبخت نے بات ہی ایسی کی تھی کہ غصہ آنا لازمی تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے رحیم ہمارا مذاق اڑا رہا ہو۔

افتخار کے درشت لہجے پر وہ بری طرح سہم گیا۔

اسی وقت خالہ نے آگے بڑھ کر اپنے برقع کا نقاب الٹ دیا۔

''خالہ! یہ سب کیا ہے؟'' افتخار نے اسی لہجے میں پوچھا۔

''ارے میاں! پریشان کیوں ہوتے ہو؟'' خالہ نے سرد لہجے میں کہا ''میں تو تم لوگوں کی محبت میں چلی آئی۔ بارش کی وجہ سے رات بھر ریلوے اسٹیشن پر بیٹھی رہی۔ میاں! تمہیں میرا آنا اتنا ہی ناگوار گزرا ہے تو میں واپس چلی جاتی ہوں۔'' پھر وہ آنسو پونچھ کر رحیم سے مخاطب ہوئیں۔ ''چل بھئی، مجھے واپس لے چل۔''

''یہ بات نہیں ہے خالہ!'' میں نے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا ''آپ تو کل صبح آ چکی ہیں نا؟'' میں نے احمقانہ انداز میں کہا۔

''ارے بیٹی! کیوں اول فول بک رہی ہے۔'' خالہ نے کہا۔

افتخار نے مختصراً انہیں سب کچھ بتا دیا۔

''اگر آپ یہاں ہیں تو پھر کمرے میں کون ہے؟'' میں نے کہا۔

ہم لوگ کمرے میں پہنچے تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ نہ خالہ کا سامان تھا اور نہ وہ راکھ کی گٹھڑی تھی۔

اسی وقت غلام علی آ گیا۔ وہ رحیم کو دیکھ کر بولا ''واہ بیٹا! صبح ہی صبح لاٹ صاحب بن کر نکل لیا۔''

رحیم نے اس وقت پینٹ کوٹ پہن رکھا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میں نے بھی رحیم کو قمیص پاجامے اور ایک جرسی میں دیکھا تھا۔

اب رحیم قسمیں کھا رہا تھا کہ میں تو ابھی سیدھا رام پور سے چلا آ رہا ہوں۔ آپ لوگوں کو یقین نہ ہو تو خالہ سے پوچھ لیں۔

خالہ نے سنجیدگی سے کہا ''اب جو ہوا، سو ہوا اور جو کچھ بھی ہوا، اچھا ہی ہوا۔ اب اس بات کو بھول جاؤ۔''

☆☆☆

لیکن آج تک، جب میری عمر پچانوے برس ہونے کو آئی ہے، میں اس بات کو نہیں بھول سکی۔ اب تو افتخار بھی اس دنیا میں نہیں ہیں جو میری بات کی تصدیق کر سکیں۔ میرے بیٹے اور پوتے پوتیاں میری بات کو سنتے ہیں اور زور زور سے ہنسنے لگتے ہیں۔ میری طرح ان لوگوں کو بھی ایسی باتوں پر یقین نہیں ہے لیکن کوئی یقین کرے یا نہ کرے، میرے ساتھ جو کچھ پیش آیا ہے، میں نے آپ کو بتا دیا۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ بھی میری باتوں کا یقین نہیں کریں گے۔ میں تو بس دعا ہی دے سکتی ہوں کہ میرے بیٹوں اور پوتوں کے ساتھ ساتھ اللہ آپ کو بھی خوش رکھے، آمین۔

ڈنڈا سانپ

محترمہ عذرا رسول صاحبہ!
السلام علیکم

پُراسراریت نمبر کے لیے ایک الگ انداز کی روداد بھیج رہی ہوں۔ یہ کہانی سو فی صد سچ ہے اور سرگزشت میں صرف سچی روداد شائع ہوتی ہے، اسی خیال سے میں نے اس روداد کو آپ کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ امید ہے قارئین کو بھی یہ معلوماتی تحریر پسند آئے گی۔

شمع خانم
(کراچی)

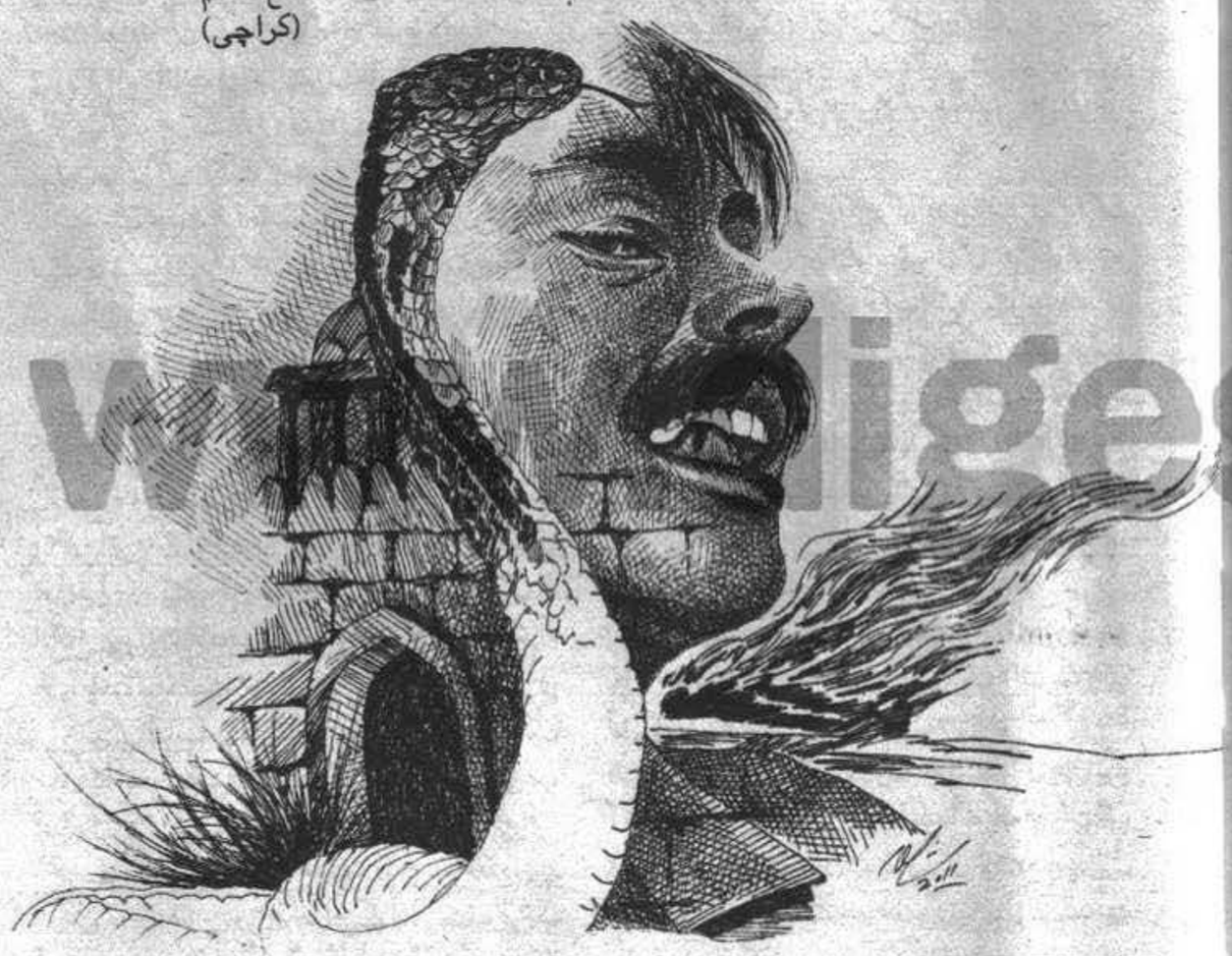

ہانسی کا تاریخی قصبہ ضلع حصار سے تقریباً بارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ راجاؤں، مہاراجاؤں اور پھر بادشاہوں نے ہمیشہ ہی اس علاقے کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے رکھا۔ موجودہ قصبے کے باہر اب بھی ایک مضبوط قلعے کے کھنڈر موجود ہیں۔ کھنڈر میں کھیلنے والے بچے اکثر چاندی کے سکّے، ایک آدھ برتن یا استعمال کی کوئی اور چیز زمین سے کھود نکالتے ہیں۔ ایک دفعہ تو یوں بھی ہوا کہ مٹی کھودنے والے کمہاروں کو منہ بند ہنڈیا ملی جو سونے کے سکوں سے بھری ہوئی تھی، گو کہ کمہاروں نے اس خبر کو آپس کی رضامندی سے چھپا لیا مگر چند ماہ نہ گزرے تھے کہ ان کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کچے مکانات پکی حویلیوں میں تبدیل ہو گئے اور انہوں نے مٹی کھودنے کا کام چھوڑ کر بازار میں دکانیں کھول لیں۔

قلعے کے کھنڈر کے بالکل سامنے ایک شکستہ باؤلی تھی جو پختہ اینٹوں کی بنی ہوئی تھی۔ باؤلی کا پانی اتر چکا تھا۔ دیواروں کی اینٹیں بھی جگہ جگہ سے نکل گئی تھیں البتہ سیڑھیاں کافی حد تک سالم تھیں۔

قلعے کے کھنڈر کے دائیں طرف کیکر اور شیشم کا گھنا جنگل تھا جو آگے جا کر چھدرا ہوتے ہوتے نہر تک ختم ہو جاتا تھا۔ نہر کے دونوں طرف قابلِ کاشت زمینیں تھیں۔ ایک پگڈنڈی جنگل کے اندر سے گزرتی ہوئی نہر تک جاتی تھی جبکہ دوسرا عام راستہ کھنڈر اور جنگل کے گرد گھومتا ہوا نہر تک جاتا تھا۔

نہر اور جنگلات کی وجہ سے اس علاقے میں سانپوں کی کثرت تھی۔ گھر کے کونوں کھدروں، چوکھٹوں کے ساتھ یہاں تک کہ بعض اوقات چھت کی کڑیوں کے ساتھ ساتھ سانپ رینگتے ہوئے نظر آ جاتے۔ اندھیرے کمروں میں بغیر دیکھے بھالے پاؤں رکھنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا تھا۔

قصبے کی حدود ختم ہونے پر ایک راستہ ڈیوالی گاؤں کو جاتا تھا، اچھا خاصا پختہ راستہ تھا مگر راستے کے دونوں طرف ریت کے ٹیلے ہی ٹیلے تھے۔

قریب ہی ریل کی پٹڑی تھی۔ جب ریل اس جگہ سے گزرتی تو اکثر ایک حیران کن منظر دکھائی دیتا۔ لائن کے ساتھ ساتھ واقع ٹیلوں میں بے شمار سانپ سر نکال کر گزرتی ہوئی ریل کو دیکھتے۔ شاید پہیوں کے چلنے سے زمین میں جو ارتعاش پیدا ہوتا تھا، وہ انہیں متحرک کر دیتا تھا ورنہ سننے میں تو یہی آیا ہے کہ سانپ سماعت سے محروم جانور ہے۔

یہ جس زمانے کی داستان ہے وہ تقسیم سے تقریباً بیس سال پہلے کا زمانہ تھا۔ بانسی کا قصبہ اس وقت بھی خاصا مہذب اور شہری سہولتوں سے مستفید تھا۔ سڑکیں پکی اور بازار صاف ستھرے تھے۔ آبادی کا بڑا حصہ ہندوؤں اور شودروں پر مشتمل تھا۔ مسلمان اور سکھ تعداد کے لحاظ سے بالترتیب تیسرے اور چوتھے نمبر پر تھے۔ مشہور صوفی بزرگ اور ولی سید جمال الدین بانسویؒ کی خانقاہ قطب صاحب کے نام سے قصبے سے باہر واقع تھی جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں ہی کے لیے متبرک تھی۔

سالہا سال سے ایک جگہ رہتے ہوئے دونوں قوموں میں یگانگت تھی۔ ہندو مسلم فساد کی ہوا اس علاقے تک نہیں پہنچی تھی۔ بھائی چارا ہو نہ ہو، دوستی اور ہم آہنگی کی فضا قائم تھی۔ ہندوؤں کی دیوالی اور ہولی آتی تو مسلمان ان کے مشاغل میں شریک ہوتے۔ مٹھائی کی سب دکانیں ہندوؤں کی تھیں۔ ان دکانوں سے طرح طرح کی مٹھائیاں خریدی جاتیں اور تحفتاً ایک دوسرے کو بھیجی جاتیں۔ اسی طرح مسلمانوں کی عید، بقرعید پر ہندو احباب بھی مبارک باد دیتے اور سویاں کھاتے۔ گوشت نہ کھانے والے بے تکلف دوست، چھپ چھپ کر نان قورمہ اڑاتے۔

عورتوں کے تعلقات بھی خوب تھے۔ برہمن عورتیں کسی تقریب میں شریک ہونے آتیں تو اپنے کپڑے سمیٹ کر خاص قسم کی پیڑھیوں پر بیٹھتیں۔ بازار سے لائی ہوئی اشیا پتوں پر رکھ کر کھاتیں۔ اسی طرح مسلمان عورتیں جو پردے کی پابندی کی وجہ سے ڈولیوں اور پالکیوں میں بیٹھ کر آتیں، پان کے سوا کسی اور چیز کو ہاتھ نہ لگاتیں مگر گھنٹوں بیٹھی دکھ سکھ شیئر کرتیں۔

شہر میں پولیس بھی تھی، افسر بھی اور عدالت بھی مگر اصل حکومت شہر کے رئیس مرزا غفار بیگ کی تھی جو پشتنی نواب تھے۔ مرزا صاحب روایتی نواب نہیں تھے۔ بہت ہی مہربان، متحرک، صلح جو، دیالو اور ہر دلعزیز شخص تھے۔ شہر کے ہر فرد پر ان کی مہربانی یکساں تھی۔ بیوہ عورتوں کے وظائف اپنی جیب سے دیتے۔ نادار طلبا کے تعلیمی اخراجات ان کے ہی خزانے سے پورے ہوتے تھے۔ پولیس یا دیگر افسران کسی بھی کارروائی سے پہلے مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر مشورہ کرتے۔ پھر کارروائی شروع ہوتی۔

چراغ بیگ کے والد مرزا نیاز بیگ، مرزا صاحب کے چچازاد بھائی تھے۔ تھوڑا سا رقبہ بارانی زمین کا ان کے پاس تھا۔ بارشیں ہو جاتیں تو اچھی فصل کی وجہ سے ہاتھ کھل جاتا ورنہ تنگدستی کا شکار رہتے۔ مگر غیرت مند ایسے کہ کبھی بھائی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ مزارعوں کے ساتھ لگ کر زمین میں ہل چلاتے، بیج بوتے، پانی دیتے اور فصل تیار ہونے پر کٹائی کرتے۔ آدمی محنتی تھے اور صابر بھی۔ بڑی عزت سے گزر بسر ہو رہی تھی۔

نیاز بیگ کی تین اولادیں تھیں۔ شمع بیگ، چراغ بیگ اور زہرہ بیگم۔ زہرہ بیگم بچپن میں ہی چیچک کا شکار ہو کر چل بسی تھی۔ شمع بیگ اکہرے بدن اور تیکھے نین نقش والا کم گو مگر محنتی جوان تھا۔ اس نے قصبے کے اسکول سے مڈل پاس کر کے تعلیم چھوڑ دی تھی اور باپ کے ساتھ کھیتی باڑی کرنے لگا تھا۔ اس کی ان تھک محنت کا نتیجہ تھا کہ ان کی کوٹھری اب

اشیائے خورونوش سے بھری رہتی۔ گڑ اور چاول کے کنستر کبھی خالی نہیں رہتے تھے۔

البتہ چراغ بیگ ذرا مختلف قسم کا جوان تھا۔ بچپن ہی سے مضطرب، بے چین اور کچھ نہ کچھ کرتے رہنے والا۔ میٹرک کا امتحان حصار جا کر دیا جاتا تھا جو اس نے بہت اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ کھیتی باڑی سے اسے دلچسپی نہیں تھی اس لیے کمیٹی کے دفتر میں کلرک بھرتی ہو گیا۔ مگر ٹک کر کام کرنا اسے مشکل لگتا۔ پھر اس کا شوق ہی ایسا تھا جو اسے ہر وقت متحرک ہی رکھتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی اسے نوکری سے جواب مل گیا۔ جس پر نیاز بیگ اس سے ناراض رہنے لگے۔

نیاز بیگ بھلے ہی ناراض رہیں، پورا قصبہ چراغ بیگ کا دیوانہ تھا۔ ہر ایک سے ہنس کر بات کرنا، ہر ضرورت مند کی مدد کرنا، بزرگوں کی چلمیں بھر بھر کر دینا، بوڑھی کمزور عورتوں کے لیے پانی کی مشکیں بھر بھر لانا..... غرضیکہ کوئی بھی کسی وقت بھی چراغ بیگ کو پکار سکتا تھا۔ وہ ماتھے پر شکن لائے بغیر حاضر ہو جاتا۔

شکل صورت بھی چراغ نے ایسی پائی تھی کہ نظر بھر کر دیکھو تو میلا ہو۔ موتی کی طرح چمکتا ہوا گندمی رنگ۔ کھڑی اور ستواں مغلیہ ناک اور بے حد چمکدار، بڑی بڑی آنکھیں جو ہر وقت مضطرب اور کچھ کھوجتی ہوئی معلوم ہوتیں۔ نیاز بیگ کی سیدھی سادی بیوی نفیسہ بیگم جب بھی بچے کو دیکھتیں، یوں لگتا کچھ پوچھ رہا ہے۔ کچھ کہہ رہا ہے..... ابھی دس مہینے کا تھا جب ایک حیران کن واقعہ ہوا۔

نفیسہ بیگم کوٹھڑی سے چاولوں کی بٹنی لے کر باہر نکلیں تو جیسے زمین نے ان کے قدم پکڑ لیے۔ گھٹنوں چلنے والا چراغ جو صحن میں کھیل رہا تھا، زور زور سے قلقاریاں مار رہا تھا۔ وہ بار بار اپنا دایاں ہاتھ بلند کرتا اور زمین پر مارتا، ساتھ ہی زور سے قلقاری مارتا۔ دائیں ہاتھ میں گردن سے پکڑا ہوا کوڑیالہ سانپ منہ کھولے اس کھیل کا حصہ بنا ہوا تھا۔ سانپ کا بقیہ حصہ دم سمیت چراغ کے گھٹنوں اور ٹانگوں پر پڑا ہوا تھا۔

جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا گیا کہ اس علاقے میں سانپوں کی کثرت تھی، اس لیے خواتین بھی موقع پڑنے پر سانپوں سے نمٹ لیتی تھیں مگر نفیسہ بیگم کے لیے یہ صورتِ حال انوکھی تھی۔ وہ چیخ کر بچے کو متوجہ نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ ہو سکتا ہے توجہ بٹنے پر بچے کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے اور سانپ کو ڈسنے کا موقع مل جائے، وہ سانپ کو بھی چھیڑنا نہیں چاہتی تھیں کہ وہ غصے میں آ کر بچے کو ڈسنے کی کوشش کرے۔ ماں کی مامتا تڑپ رہی تھی ''کیا کروں؟'' انہوں نے گھبرا کر سوچا۔

جب کچھ نہ سوجھا تو انہوں نے آنکھیں بند کر کے دعا کی۔

''الٰہی! اس معصوم کی حفاظت فرما۔''

اسی لمحے چراغ نے مٹھی کھول دی اور سانپ کو کسی کھلونے کی طرح دور پھینک دیا جو بڑے مزے سے رینگتا ہوا نالی کے ذریعے باہر نکل گیا۔ نفیسہ بیگم نے جھپٹ کر چراغ کو اٹھا لیا اور فرطِ جذبات سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اتفاق سے وہ اس وقت گھر میں اکیلی تھیں۔ نیاز بیگ نے گھر آ کر یہ واقعہ سنا تو خدا کا شکر ادا کرنے مسجد میں نفلیں پڑھنے چلے گئے۔

جوں جوں چراغ بڑا ہوتا گیا، سانپوں سے اس کی دلچسپی بڑھتی گئی۔ کھیتوں کی منڈیروں میں اکثر سوراخ نظر آیا کرتے ہیں۔ چراغ ان سوراخوں کو دیکھ کر اور سونگھ کر بتا دیا کرتا تھا کہ یہ کوئی عام سوراخ ہے یا کسی سانپ کی بانبی۔ سانپوں کو بلوں سے نکالنا، انہیں زندہ پکڑنے کی کوشش کرنا، اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اس کے داہنے ہاتھ کی انگلیوں میں کوئی خاص بات تھی یا اس کی سمجھ بوجھ تھی۔ لہراتے ہوئے یا بھاگتے سانپ کو ایک جھٹکے سے گردن سے پکڑتا اور سانپ کا منہ خود بخود کھل جاتا۔ پھر سانپ کی زور آزمائی شروع ہو جاتی مگر چند منٹ کے بعد ہی اس کی مزاحمت کمزور پڑ جاتی اور اس کا جسم بے جان ہو جاتا۔ اس وقت چراغ ایک زوردار جھٹکے سے اسے دور پھینک دیتا، چند لمحوں بعد وہ مر جاتا۔ کبھی کبھی چراغ سانپ کو پکڑتے ہی جنگل میں پھینک دیتا اور وہ رینگتا ہوا جنگل میں غائب ہو جاتا۔

یہی نہیں، چراغ کو جوگیوں اور سپیروں سے بہت دلچسپی تھی۔ جہاں کوئی جوگی، سپیرا یا سنیاسی نظر آتا، یہ وہاں پہنچ کر اس کے تجربات بغور سنتا اور سوال کر کے اپنی معلومات بڑھاتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسے سانپ کے کاٹے کا علاج کرنے کے لیے بہت سی نایاب جڑی بوٹیوں کے بارے میں معلومات حاصل ہو گئیں۔ وہ انہیں ڈھونڈ کر لاتا، کوٹ پیس کر دوائیں تیار کرتا اور ضرورت پڑنے پر مارگزیدہ کا علاج کرتا۔ اس کام نے چراغ کی ہر دلعزیزی میں اور اضافہ کیا۔

نیاز بیگ کو یہ سارا کام ناپسند تھا۔ وہ کئی بار اسے سرزنش کر چکے تھے مگر چراغ ہمیشہ ہنس کر ٹال جاتا۔

ایک دن چراغ ہاون دستے کی مدد سے جڑی بوٹیاں پیس پیس کر انہیں چھان کر باریک سفوف بنا رہا تھا کہ نیاز

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیگ اس کے پاس آ کھڑے ہوئے۔

''کیا کر رہے ہو چراغ بیگ!''

اس نے لہجہ نارمل رکھنے کی کوشش کی ''ابا جی، یہ زمین پر اگنے والی باریک سی ایک بوٹی کی جڑیں ہیں۔''

''ان کا کیا کرو گے؟'' نیاز بیگ نے غصہ دباتے ہوئے کہا۔

''ابا جی! یہ دوائی بڑی مجرب ہے۔ جس شخص کو ناگ ڈس لے، اس کو ہر علاج سے پہلے ایک چمچ بھر سفوف پانی کے ساتھ دے دیا جائے تو سونے کے بجائے مریض درد سے تڑپنے لگے گا اور اسہال کے ساتھ زہر کا اثر آدھا رہ جائے گا، اس طرح بقیہ علاج میں سہولت رہے گی۔''

چراغ نے تفصیل بتائی تو نیاز بیگ ایکدم ہی ہتھے سے اکھڑ گئے ''چراغ، تم کوئی سپیرے یا سنیاسی تو نہیں ہو۔ یہ کام انہی لوگوں کو زیب دیتا ہے۔ تم الحمدللہ مسلمان ہو، ان بے دین جوگیوں اور سپیروں میں گھسے رہنا تمہیں زیب نہیں دیتا۔ کوئی ڈھنگ کا کام کرو۔''

''ابا جی، آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ میں نیک کام ہی کر رہا ہوں۔ پتا نہیں کتنے لوگ انہی جڑی بوٹیوں سے شفایاب ہو چکے ہیں۔''

نیاز بیگ کے ماتھے پر بل پڑ گئے مگر وہ چراغ کی بات کو جھٹلا نہیں سکے کیونکہ شہر میں سانپ کے ڈسنے سے ہونے والی اموات اب نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھیں۔ چراغ دوا کے پیسے نہیں لیتا تھا مگر شکریے کے طور پر لوگ گھر میں کچھ نہ کچھ ڈال جاتے یہاں تک کہ ایک زمیندار اپنے اکلوتے بیٹے کے ٹھیک ہونے پر نیاز بیگ کے دروازے پر اٹھارہ کلو روز کا دودھ دینے والی گائے باندھ گیا۔

مگر نیاز بیگ کو ان چیزوں کا کوئی لالچ نہیں تھا۔ ان کے خیال میں چھ فٹ کا یہ کڑیل جوان ضائع ہو رہا تھا جس پر وہ ہر وقت کڑھتے تھے۔

''شمع بیگ کے سسرال والے چاہ رہے ہیں کہ بیاہ کی تاریخ دے دیں۔'' ایک دن نفیسہ بیگم نے بتایا۔

''اچھا! ذرا ساوتی اٹھ لے پھر سوچیں گے۔'' نیاز بیگ نے حقے کی نے منہ سے ہٹا کر جواب دیا۔

''اور چراغ کے بارے میں کیا سوچا ہے؟'' نفیسہ بیگم نے آہستہ سے کہا۔

''سوچنا کیا ہے، تمہاری بہن کی بیٹی نور النساء ٹھیک ہی ہے۔ دیکھی بھالی ہے پھر گھر کی بیٹی ہے، اپنی بہن کو ہاں کر دو۔ ایک دو سال تک اسے بھی بیاہ لائیں گے۔'' نیاز بیگ نے فیصلہ سنایا۔

''مگر چراغ تو مانتا ہی نہیں۔'' نفیسہ بیگم نے بتایا۔

''کیا..... چراغ انکار کر رہا ہے؟'' نیاز بیگ نے حیران ہو کر پوچھا کیونکہ نور النساء واقعی نور تھی۔ بے حد حسین اور نازک سی۔

''صاف انکار تو نہیں کرتا مگر شادی کا ذکر ہمیشہ ہی ٹال جاتا ہے۔'' نفیسہ بیگم نے فکرمند لہجے میں کہا۔

''سانپوں سے جان چھوٹے تو کچھ اور سوجھے نا۔ پتا نہیں کہاں سے یہ گندہ شوق پال لیا ہے۔ اپنے تو دادا پڑ دادا میں کوئی سپیرا نہیں تھا۔'' نیاز بیگ نے شاکی لہجے میں چراغ کو دیکھتے ہوئے کہا جو نہا دھو کر گھر سے باہر جا رہا تھا۔ جیسے ہی باہر نکلا پارو نے شش کر کے اسے مخاطب کیا اور باؤلی کی طرف اشارہ کیا۔

سامنے سے تیسرا گھر لالہ دھنی رام کا تھا جو بازار میں مٹھائیاں بناتا تھا۔ اس کے دو ہی بچے تھے۔ پارو اور کاشی رام۔ اس کی دھرم پتنی ان بچوں کے بعد مر گئی تھی، دھنی رام نے دوسری شادی نہیں کی اور روڈھو کے بچے بڑے ہو ہی گئے۔ کاشی رام کا دھیان پڑھائی میں کم لگتا تھا۔ سارا دن آوارہ لڑکوں کے ساتھ پھرتا تھا۔ تنگ آ کر دھنی رام نے اسے اس کے ماموں کے پاس دہلی بھیج دیا جہاں وہ ایک مل میں بھرتی ہو گیا۔

گھر میں پارو اور دھنی رام رہ گئے۔ گھر کا چولھا چوکا صفائی ستھرائی سب پارو کے ذمے تھا۔ دھنی رام نے پارو کی سگائی اپنے بھتیجے گوپال سے کر رکھی تھی۔ گوپال کے والدین کلکتہ میں تھے اور وہ میڈیکل کے تیسرے سال میں تھا۔ ڈاکٹر بن جاتا تو دھنی رام، پارو کے ہاتھ پیلے کر دیتا۔ ڈاکٹری پڑھنے کا سارا خرچ دھنی رام کے ذمے تھا۔

چراغ بیگ اور پارو ایک ہی جگہ رہے اور ایک ساتھ ہی کھیل کود کر بڑے ہوئے اس لیے دونوں میں بڑی انسیت تھی۔ پارو جب بھی کوئی خاص چیز پکاتی یا دھنی رام کوئی اچھی مٹھائی گھر لاتا، وہ اس کا بڑا حصہ چراغ کے لیے نکال لیتی۔ پھر جیسے ہی چراغ نظر آتا یہ اسے باؤلی کی طرف اشارہ کر دیتی۔ باؤلی کی سیڑھیوں کے عین درمیان میں چوڑی سی جگہ بنی ہوئی تھی، یہیں بیٹھ کر پارو، چراغ کا انتظار کرتی۔ چراغ بھی بغیر کسی جھجک کے چلا جاتا اور باتوں کے درمیان کھانا پینا چلتا رہتا۔ پارو اسے کھاتے دیکھ کر خوش ہوتی۔ شاید یہی اس کی چاہت کا

اظہار تھا۔ سادگی اور معصومیت کے اس دور میں سفلی جذبات کے پیدا ہونے یا ابھرنے کے لیے ترغیبات نہیں تھیں۔ پارو کی اوڑھنی اکثر میلی ہوتی اور وہ اس کا بکل مار کر چراغ کے سامنے آتی۔ اسی طرح چراغ نے بھی کبھی پارو کی خوبصورت آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی آنکھیں لڑکیوں اور عورتوں کے سامنے ہمیشہ جھکی رہتیں۔

ان دنوں ''ڈنڈا'' بستی کا موضوع تھا۔ قلعے کے کھنڈر کے ساتھ والے جنگل میں لکڑہارے لکڑیاں کاٹتے رہتے۔ اِکا دُکا مسافر بھی وہاں سے گزر کر نہر کی طرف آتے جاتے ورنہ زیادہ تر جنگل ویران ہی رہتا تھا۔ وجہ یہی ''ڈنڈا'' اور دوسرے خطرناک سانپ تھے جو درختوں کی ٹہنیوں سے لٹکے رہتے یا گھنی جھاڑیوں میں سرسراتے اور پھنکارتے تھے۔

چراغ ذرا کی ذرا پلک جھپکانے کے لیے اپنی بیٹھک میں لیٹ گیا تھا۔ باہر کا دروازہ کھلا تھا کہ بشیر لکڑہارا پھولے ہوئے سانسوں کے ساتھ اندر آیا اور چراغ کو جھنجوڑ کر بولا۔

''چراغ..... چراغ..... جنگل میں ڈنڈا پڑا ہے۔''

چراغ اچھل پڑا۔ ''ڈنڈا تو نے آپ دیکھا ہے، صحیح بتا؟''

''ہاں ہاں چراغ بیگ! میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میں لکڑیاں کاٹ کر اکٹھی کر رہا تھا۔ میں نے دور پڑی ایک لکڑی کو اٹھانے کے لیے قدم بڑھایا تو وہ لکڑی آپ ہی آپ لڑھکنے لگی تو میں حیران رہ گیا۔ پہلے تو سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ یہی ڈنڈا سانپ ہے، میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔''

''چل تو مجھے دکھا، جہاں تو نے ''ڈنڈے'' کو دیکھا۔''

چراغ وہاں پہنچا مگر ڈنڈا دوبارہ نظر نہیں آیا۔ ایک دن دوپہر کے وقت وہ ڈنڈے کی سن گن لیتا پھر رہا تھا کہ علاقے کا ڈاکیا رمضان آتا دکھائی دیا۔

''کیسے ہو بھائی رمضان! کوئی چٹھی ہمارے نام بھی لے آیا کرو۔'' چراغ نے رمضان سے مذاق میں کہا۔

''چٹھی تو نہیں ہے مگر تمہارے مطلب کی ایک خبر ہے۔'' رمضان سائیکل سے اترتے ہوئے بولا۔

''ہاں ..... ہاں، بتاؤ۔'' چراغ نے اشتیاق سے پوچھا۔

''ساتھ والے گاؤں میں ایک جوگی اور دو تین سپیرے آئے ہوئے ہیں۔ وہ تمہیں ''ڈنڈے'' کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتے ہیں۔''

جادو ایک بڑا نخلستان نیز ٹیلوں کا وہ سلسلہ جو نائیجیریا کے گیاہستانوں تک اور دوسری طرف کورا اور تشاد کی طرف نکل جاتا ہے۔

اس نخلستان کے کنارے پر چند باغات کے آثار ملتے ہیں جن میں سے تین 1950ء تک موجود تھے۔ اور اردگرد صحرا میں چٹائیوں سے بنی ہوئی جھونپڑیاں ہیں۔ یہ گاؤں کنوری قوم کے حضروی گروہوں نے بسائے تھے۔

جادو طرابلس الغرب میں جبل نفوسہ کے مشرقی خطے کا قدیم صدر مقام جو آج کل ضلع فساطو میں ایک قصبے کی صورت میں تین ناہموار پہاڑیوں پر واقع ہے۔ جہاں تک قدیم شہر کا تعلق ہے اس کے بارے میں کچھ زیادہ تفصیل سے معلومات نہیں ملتی۔ تاریخ کے جھروکوں سے جو معلومات ہم تک پہنچی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جادو شہر کی بنیاد مسلمانوں کی فتح شمالی افریقا سے بہت پہلے پڑ چکی تھی۔ چونکہ یہ شہر اس قدیم شاہراہ پر واقع تھا جو طرابلس شہر کو خزان اور وسطی سوڈان سے ملاتی تھی۔ یہی بات اس شہر کی خوشحالی اور ترقی کا سبب بنی۔

اقتباس: اسلامی انسائیکلوپیڈیا از قاسم محمود

مرسلہ: آمنہ سلیم، وہاڑی

رمضان، چراغ کی ''ڈنڈے'' میں دلچسپی سے واقف تھا۔ چراغ کی آنکھیں چمک اٹھیں ''بھائی رمضان، یہ تو تم نے اچھی خبر سنائی۔ پتا تو چلے اس ڈنڈے کی اصل کہانی ہے کیا.....؟''

چراغ، رمضان کی سائیکل پر بیٹھ گیا اور دونوں قصبے میں آ گئے۔

اگلے دن چراغ صبح سویرے سائیکل لے کر گھر سے نکلا اور ساتھ والے دیہات کی طرف چلا گیا۔ سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا، وہ تیز تیز پیڈل مارتا اپنی منزلِ مقصود تک جا پہنچا۔ رمضان کی اطلاع بالکل صحیح تھی۔

سپیروں نے اپنی جھگی بستی سے باہر ہی لگا رکھی تھی۔ جھگی کے سامنے پڑی کھاٹ پر ایک بہت بوڑھا جوگی کھانس کھانس کر اِدھر اُدھر تھوک رہا تھا۔ ایک سپیرا ایک خوفناک ناگ کو ششکار ششکار کر ٹوکری میں جانے پر مجبور کر رہا تھا جبکہ دوسرے دو سپیرے نالے کے کنارے بیٹھے منہ پر چھپکے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مار رہے تھے۔ چراغ بیگ کو دیکھ کر بوڑھے جوگی نے آنکھیں سکیڑ کر اسے پہچاننے کی کوشش کی مگر ناکامی کی صورت میں دوبارہ کھاٹ پر لیٹ گیا۔

چراغ کچھ دیر کھڑا رہا پھر جوگی کی کھاٹ کی پٹی پر ٹک گیا۔

''کون ہے بھئی!'' جوگی بے زاری سے بولا۔

''بابا جی، میں ہوں چراغ!'' چراغ ادب سے بولا۔

''کون چراغ؟ یہاں کیا لینے آیا ہے؟ چل بھاگ یہاں سے۔'' جوگی نے چراغ کو پھٹکارا۔

''بابا جی، میں ڈنڈے کے بارے میں پوچھنے آیا ہوں۔'' چراغ آہستہ سے بولا۔

جوگی ایکدم اٹھ کے بیٹھ گیا ''کہاں ہے ڈنڈا!''

''ادھر جنگل میں دکھائی دیتا ہے۔''

''دیکھ جوان..... جو تجھے جان پیاری ہے اور چار دن اس جگ میں کھیلنا کودنا چاہتا ہے تو اس کو بھول جا..... جا چلا جا۔''

''بابا جی..... مجھے پتا چلا ہے کہ تم ڈنڈے کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو، مجھے اس کے بارے میں بتاؤ۔'' چراغ نے التجا کی۔

جوگی نے مکاری سے چراغ کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''کچھ پیسا ٹکا لائے ہو یا یونہی معلومات لینے آ گئے ہو؟''

جوگی، چراغ کی دلچسپی بھانپ گیا تھا اور دام کھرے کرنے کے چکر میں تھا۔ چراغ ان جوگیوں کے لالچ اور ہتھکنڈوں سے خوب واقف تھا۔ اس نے خاموشی سے تہبند کی ڈب کھولی اور ہاتھ پیچھے کر کے چاندی کے دو روپے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ جوگی نے اِدھر اُدھر دیکھا اور جلدی سے روپے اپنے چولے کی اندرونی جیب میں ڈال لیے۔

چراغ خاموش بیٹھا، منتظر نگاہوں سے جوگی کو دیکھ رہا تھا۔ جوگی پھر کھانسا اور وہیں بیٹھے بیٹھے تھوک کر چراغ سے مخاطب ہوا۔

''دیکھ بالک! ڈنڈا ہے تو سانپ ہی مگر ایسی نسل ہے جس کے بارے میں اچھی طرح کوئی نہیں جانتا۔ پرکھے تو یہ بھی کہتے تھے کہ یہ سانپ کے روپ میں کسی دیوتا کا شراپ ہے۔ کوئی ڈیڑھ ہاتھ لمبا مٹیالے رنگ کا یہ سانپ دونوں سروں سے ایک جیسا ہے۔ نہ منہ کا پتا چلتا ہے نہ دم کا۔ اس کی آنکھیں کسی نے نہیں دیکھیں۔ پتا نہیں ہیں بھی کہ نہیں۔ دیکھنے میں درخت کی موٹی کٹی ہوئی شاخ نظر آتا ہے۔ اس کی چال بھی سانپ جیسی نہیں، یہ بل کھا کر چلنے کے بجائے سیدھا لڑھکتا جاتا ہے اور ضرورت پڑنے پر زمین سے اچھل کر بھی آگے بڑھ سکتا ہے۔ عام طور پر درختوں کی کھوہ یا جڑ میں بنے ہوئے گہرے بلوں میں رہتا ہے۔''

جوگی چپ ہو کر سانس درست کرنے لگا۔ چراغ بے چین ہو رہا تھا مگر جوگی چپ تھا۔

''بابا جی، کچھ اور بتاؤ..... یہ کیسے ڈستا ہے؟''

جوگی ہنس پڑا ''یہ ڈستا نہیں بلکہ اپنے شکار پر سبز رنگ کے زہر کی ایک پھواری چھوڑتا ہے اور اس کا شکار اگلا سانس نہیں لیتا، بلکہ جہاں وہ گرتا ہے وہ زمین بھی سبز اور زہریلی ہو جاتی ہے۔''

''اس کی مادہ، انڈے اور بچوں کے بارے میں بھی بتاؤ بابا جی!'' چراغ سب کچھ جان لینا چاہتا تھا۔

''کیسی مادہ..... کیسے انڈے.....! او کملے! یہ ہمیشہ سے اس جنگل میں ایک ہی ہے، نہ کسی نے دوسرا دیکھا، نہ سنا۔'' جوگی نے چراغ کے سوال کا مذاق اڑایا۔

''تو یہ کہاں سے آیا ہے؟'' چراغ حیران ہو کر بولا۔

''او بھئی، میں کوئی بھگوان ہوں جو بتاؤں یہ کہاں سے آیا ہے، کب آیا۔''

پھر اس نے چراغ کے خوبصورت جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ''بڑا کڑیل جوان ہے بھئی..... جا اپنی جوانی پر رحم کھا اور ڈنڈے کو بھول جا۔ اگر کہیں دکھائی دے تو پرے ہو کر گزر جانا کیونکہ اگر اسے نہ چھیڑو تو یہ کچھ نہیں کہتا بلکہ آہٹ پا کر کھوہ میں گھسنے کی کوشش کرتا ہے۔''

''جوگی بابا، اس کے ڈسے کا کوئی علاج نہیں؟ کوئی جڑی بوٹی تو ہوگی۔ تم تو بڑے سنیاسی ہو، بتاؤ نا۔'' چراغ، جوگی کی خوشامد کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

جوگی نے چراغ کو گہری نظروں سے دیکھا ''دو روپے میں تجھے علاج بھی بتا دوں؟''

جوگی نے چراغ کی ڈب میں کچھ اور روپے شاید دیکھ لیے تھے، چراغ نے دوبارہ ڈب کھولی اور ایک روپیا اور جوگی کی جھولی میں ڈال دیا۔

''ایک اور دے۔'' جوگی کا لالچ بڑھتا جا رہا تھا۔ مجبوراً چراغ نے اسے ایک اور روپیا دے دیا۔ ایک روپے کی اس زمانے میں بڑی قیمت تھی مگر وہ جو کہتے ہیں کہ شوق کا کوئی مول نہیں اس لیے چراغ کو زیادہ افسوس نہیں ہوا۔ جوگی لاٹھی ٹیکتا ہوا جھگی کے اندر گیا اور کافی دیر بعد باہر آیا۔

''دیکھ جوان، تو ابھی کچا ہے۔ ڈنڈے کا خیال چھوڑ دے۔ اگر پکی عمر میں جا کر بھی ڈنڈے کا شوق ختم نہ ہو تو اس کے قریب جانے سے پہلے انہیں منہ میں رکھ لینا۔ جوگی نے مٹھی کھولی تو اس کی ہتھیلی پر دو عجیب شکل کی کوڑیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے وہ کوڑیاں چراغ کی مٹھی میں دے کر مٹھی بند کر دی۔

اس کے بعد جوگی نے اپنے جھولے سے تھوڑی سی افیون نکالی، منہ میں رکھی اور پاس پڑے جھجر سے مٹی کے پیالے میں تھوڑا سا پانی انڈیلا اور پی گیا پھر منہ پر کپڑا ڈال کر پڑ گیا۔ چراغ نے مزید رکنا فضول سمجھا۔ سورج کافی اونچا ہو گیا تھا۔ دھوپ تیز تھی اور اسے واپس قصبے جانا تھا۔ اس نے سائیکل سنبھالی اور واپسی کا سفر شروع کر دیا۔

☆☆☆

شمع بیگ کی شادی کا ہنگامہ شروع ہو چکا تھا۔ نزدیک کے کئی رشتے دار ایک ہفتے پہلے ہی آ گئے تھے۔ گھر میں رونق بھی تھی اور کام بھی۔ رقیہ بیگم، شمع بیگ کی چچا زاد تھی۔ ٹھیکرے کی مانگ تھی۔ خوب شوق پورے کیے جا رہے تھے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی رسم ہوتی تھی۔ آج پیلے کپڑے پہنائے جانے ہیں۔ رات کو مینڈھی بندھنی ہے۔ صبح بھات آنا ہے۔ یہ بھی دلچسپ رسم تھی۔ نفیسہ بیگم کے میکے سے کپڑے، زیور، مٹھائی اور نقد رقم باقاعدہ ڈھول کے ساتھ آنی تھی۔ نفیسہ بیگم ایک چوکی پر خالی تھالی لے کر کھڑی ہو جاتیں اور میکے والے حسب توفیق اس تھالی میں زیور یا نقدی ڈالتے جاتے۔ اس کے بعد بھاتیوں کو بہت اچھا کھانا کھلایا جاتا۔ مہندی کی رات رت جگے کے ساتھ دلہن کی مینڈھی کھلائی کی رسم ہوتی۔

برات عام طور پر تین دن روکی جاتی تھی۔ تیسرے یا چوتھے دن ڈولی نکلتی پھر چوتھے دن چوتھی اور چالے کی رسم ہوتی۔ غرض کہ ایک شادی میں تقریباً دس دس دن لگ جاتے۔ رشتے دار، دوست اور پڑوسی پوری شادی میں بھرپور حصہ لیتے۔ اصل میں اس زمانے میں تفریح کے مواقع بس اسی طرح ہی حاصل کیے جاتے تھے۔

شمع بیگ کی شادی میں چراغ اتنا مصروف ہوا کہ اسے ڈنڈے کا خیال ہی نہیں آیا۔ ہر طرف چراغ چراغ کی آوازیں پڑتیں۔ اللہ اللہ کر کے رقیہ بیگم کی ڈولی آنگن میں اتری۔ پھر چوتھی چالے ہوئے۔ رفتہ رفتہ مہمان رخصت ہونے لگے۔ اس ہنگامے کے دوران پارو سارا دن نیاز بیگ کے گھر میں گھسی نفیسہ بیگم کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ آتے جاتے چراغ سے بھی ہنسی مذاق چلتا رہتا۔ رقیہ کئی مہینے گھونگٹ نکالے چارپائی پر نئی دلہن بنی بیٹھی رہی۔ دن کے وقت اسے شمع بیگ سے بھی گھونگٹ نکالنا ہوتا تھا۔ چراغ بیگ اگرچہ تایا زاد بھائی اور دیور بھی تھا مگر وہ خود ہی شرمایا شرمایا پھرتا۔ اس زمانے کا رہن سہن اور رسم و رواج بھی عجیب ہی تھے!

ایک دن چراغ گائے کو چارا ڈال رہا تھا کہ پارو نے آدھا پٹ کھول کر اسے باؤلی کی طرف جانے کا اشارہ کیا اور چھپاک سے اندر چلی گئی کیونکہ نیاز بیگ، چراغ کو آوازیں دیتے ہوئے باہر آ رہے تھے۔ گائے دروازے کے باہر بندھی تھی۔

''چراغ، میں ذرا پٹواری تک جا رہا ہوں۔ تو ذرا گائے کا دودھ نکال لینا۔''

''جی اچھا ابا جی!'' چراغ نے جواب دیا۔ نیاز بیگ باہر نکل گئے اور چراغ کو گائے کا دودھ نکالنے میں پارو کا اشارہ یاد ہی نہیں رہا۔ جب وہ فارغ ہو کر باہر نکلا تو یاد آیا۔ وہ جلدی جلدی باؤلی کی طرف چلا۔ باؤلی کی سیڑھیوں پر کئی بچے ابھی تک کھیل رہے تھے۔ چراغ نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر پارو نظر نہ آئی۔

''شاید واپس چلی گئی ہوگی۔''

اس نے واپسی کے لیے قدم اٹھایا تو اسے پارو کی ''شش'' سنائی دی۔ کافی ڈھونڈنے پر پارو اسے جنگل میں ایک درخت کے پیچھے نظر آئی۔ چراغ نے اس کے قریب پہنچ کر غصے سے کہا۔

''تو یہاں جنگل میں اکیلی کیا کر رہی ہے؟''

''باؤلی کی سیڑھیوں پر بچے کھیل رہے تھے نا۔'' پارو

بذریعہ خواب

سوال پیدا ہوتا ہے کہ عالم آخرت کی سزا اور جزا اور عذاب و ثواب کی صورت کیا ہوگی۔ وہ کہاں ہوں گے؟ اسلامی نظریات کی رو سے دوزخ ان عذابوں کا نام ہے جو حواس کے ذریعے محسوس ہوں گے۔ قرآن مجید میں ہے کہ ''دوزخ کے سات دروازے ہوں گے اور سات دروازوں میں سے دوزخی کا ایک ایک حصہ گزرے گا۔''

اقتباس: عالم برزخ حصہ دوم از رئیس امروہوی

مرسلہ: نسرین امتیاز، جہانیاں

www.pdfbooksfree.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پوٹلی کھولتے ہوئے بولی۔ ''دیکھو، آج کیا ہے میرے پاس؟'' پارو اس کی ناراضی کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

''کیا ہے؟''

''مونگ کے لڈو، رات کو بابو لایا تھا۔''

چراغ کے منہ میں پانی آ گیا کیونکہ مونگ کی دال کے لڈو اس کی کمزوری تھے۔ اس نے ایک لڈو پورا ہی منہ میں رکھ لیا اور جلدی جلدی منہ چلانے لگا۔

''تو بھی کھا۔'' اس نے پارو کو بھی دعوت دی۔

''گھر میں اور بھی رکھے ہیں۔ گھر جا کے کھالوں گی۔ یہ سب تیرے ہیں۔''

وہ پوٹلی سے لڈو نکال نکال کر چراغ کو دے رہی تھی۔ اچانک پارو نے دیکھا کہ لڈو کی طرف بڑھتا ہوا چراغ کا ہاتھ جیسے سن ہو گیا۔ وہ ایک درخت کی جڑ میں نگاہیں جمائے کھڑا تھا۔ اس کا چلتا ہوا منہ بھی رک گیا تھا۔

پارو نے حیران ہو کر چراغ کو ٹہوکا دیا ''چراغ! کھانا..... مجھے دیر ہو رہی ہے، تو پہلے ہی اتنی دیر کر کے آیا ہے۔''

چراغ سکتے کے عالم میں تھا۔ اس نے پارو کی بات نہیں سنی، جھنجلا کر پارو نے چراغ کی نظروں کا تعاقب کیا۔ جس درخت کی جڑ کو چراغ گھور رہا تھا، وہ چند گز کے فاصلے پر تھی۔ پتوں میں سے دھوپ چھن چھن کر زمین پر پڑ رہی تھی۔ اس درخت کی جڑ کے قریب ایک موٹی سی بھورے سے رنگ کی لکڑی پڑی تھی۔ اس کے علاوہ کوئی اور خاص بات نہیں تھی۔

پارو نے غصے میں آ کر چراغ کو جھنجوڑ ڈالا۔ چراغ جیسے نیند سے جاگ گیا۔ اس نے غصے سے پارو کو دیکھا اور منہ پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ پارو کچھ نہ سمجھتے ہوئے بہت آہستہ سے پوچھنے لگی۔ ''کون ہے وہاں؟''

''دیکھ نہیں رہیں، ڈنڈا پڑا ہے۔'' چراغ نے سرگوشی کی۔

پارو ساری جان سے لرز گئی۔ وہ پوٹلی سمیٹ کر جنگل سے باہر کی طرف بھاگی۔ اس نے چراغ کو بھی ساتھ گھسیٹنا چاہا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہیں نظریں گڑائے کھڑا رہا۔ اچانک ڈنڈے میں حرکت ہوئی اور وہ لڑھکتا ہوا ایک کھوہ میں اتر گیا۔

چراغ جلدی سے آگے بڑھا اور کھوہ میں جھانکنے کی کوشش کی مگر اندر اندھیرا تھا۔ کچھ نظر نہیں آیا۔ وہ مسحور سا کھڑا رہا پھر پلٹ کر گھر کی طرف چل دیا۔ آج پہلی بار اس نے ڈنڈے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ جوگی نے سچ کہا تھا، واقعی ڈنڈے کی شکل وصورت میں سانپوں والی کوئی شباہت نہیں تھی۔

''لے بھئی چراغ بیگ، ناگ، کوبرے، کوڑیالے اور کھپرے تو بہت پکڑ لیے، اب جو ڈنڈا نہ پکڑا تو کیا پکڑا۔'' چراغ فیصلہ کر چکا تھا۔

چند دنوں میں ہی سارے قصبے میں خبر پھیل گئی کہ چراغ بیگ نے ڈنڈے کا ٹھکانا ڈھونڈ لیا ہے اور وہ اسے زندہ پکڑنے کی تیاری کر رہا ہے۔ نیاز بیگ نے سنا تو وہ گھبرا کر مرزا غفار بیگ کے پاس پہنچے۔

''بھائیا جی! آپ چراغ کو سمجھاؤ..... کیوں اپنی جان کا دشمن ہوا ہے۔ بڑے بڑے جوگی ڈنڈے کے راستے سے پرے ہٹ کر گزرتے ہیں۔ یہ کل کا چھوکرا کیا کر لے گا۔ اسے روکو بھائیا جی..... اس کی ماں کا رو رو کر برا حال ہے۔'' کہتے کہتے نیاز بیگ خود بھی رو پڑے۔

مرزا صاحب نے اسی وقت چراغ کو بلوا بھیجا مگر وہ بھی ایک ہی کائیاں تھا، اِدھر اُدھر ہو گیا۔ پیغام لانے والے کو ملا ہی نہیں۔ اسے پتا تھا کہ ایک دفعہ مرزا غفار بیگ کے منہ سے اسے روکنے کا حکم نکل گیا تو وہ ٹل نہیں سکتا تھا کیونکہ ہانسی کے باشندے مرزا صاحب کی حکم عدولی کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے، کئی دن خاموشی سے گزر گئے۔

پھر ایک دن وہی ہوا، چراغ بیگ نے اعلان کر دیا کہ وہ ڈنڈے کو پکڑنے جا رہا ہے تاکہ قصبے سے ڈنڈے کا خوف دور ہو اور لوگ جان لیں کہ ڈنڈا بھی ایک سانپ ہی ہے، کوئی مافوق الفطرت مخلوق نہیں اور سانپ چراغ بیگ کے سامنے زیادہ دیر اڑی نہیں کر سکتا۔

چراغ سورج چڑھے تیار ہو کر گھر سے باہر آیا۔ گھر میں ماں نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا، کچھ کہنے کی کوشش کی مگر چراغ کی فطرت سے واقف تھیں، خاموشی سے اس کے بازو پر تعویذ باندھا اور منہ پھیر کر کمرے میں چلی گئیں۔ نیاز بیگ گھر کے باہر چبوترے پر مونڈھا بچھائے بیٹھے تھے۔ سامنے حقہ رکھا تھا مگر آج کی صبح کچھ عجیب سی تھی۔ کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ چراغ کہیں جانے سے پہلے ہمیشہ باپ کے گھٹنے چھوتا تھا اور وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیتے مگر آج جب چراغ باپ کے گھٹنے چھونے کو جھکا تو نیاز بیگ نے منہ پھیر لیا۔ چراغ کے چہرے کا رنگ ایک لمحے کو بدلا مگر پھر ہنستا ہوا گلی سے نکل گیا۔ نیاز بیگ اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔

پارو بھی دروازے کی جھری سے جھانک رہی تھی۔ ایک بڑا سا قطرہ اس کی آنکھ سے ٹپکا اور اوڑھنی میں جذب ہو گیا۔

''اچھا ابا..... زندہ رہے تو شام کو ملیں گے۔''

جدید طبی تحقیق ''ہارموٹانک کریم'' رنگ گورا کرنے اور اکثر جلدی امراض کیلئے انتہائی مفید بے ضرر اور سستی ثابت ہوئی

صبح، دوپہر، شام تین دن مسلسل استعمال سے کیل، دانے، چھائیاں ختم اور رنگ گورا ہو جاتا ہے۔ چہرہ معصوم، شگفتہ اور شاداب نظر آتا ہے

ایک ہاتھ پر ''ہارموٹانک کریم'' اور دوسرے پر کوئی بھی مہنگی سے مہنگی کریم لگا کر دیکھیں

''ہارموٹانک کریم'' والا ہاتھ واضح طور پر نرم وملائم اور گورا ہوگا

رنگ:

انسانی جلد پر موسم، آب وہوا اور ماحول کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس لیے افریقہ کے لوگ کالے، یورپ کے لوگ گورے اور ایشیاء کے لوگ سانولے ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے دور دراز پہاڑی علاقوں کے لوگ بھی گورے ہوتے ہیں مگر سرخ رنگت ان کے خون میں (Red Blood Carpus Cells) کی زیادتی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ رنگ گورا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ زیادہ سردی کی وجہ سے موٹے کپڑے پہنتے ہیں۔ اس طرح ان کی جلد آب ہوا، موسم اور ماحولیاتی آلودگی کے اثرات سے محفوظ رہتی ہے۔ نیز شہروں میں موجود کیمیائی صنعتوں اور ٹریفک کی پیدا کردہ آلودگی وہاں تک نہیں پہنچتی۔

صحت مند جلد کے فوائد:

ہر جاندار کی کھال کا کام جسم کی حفاظت، شکل شباہت کو برقرار رکھنا، بیرونی حملوں سے اندرونی جسم کی حفاظت کرنا نیز عضلات کی تھکاوٹ کو دور کرنا ہے۔ اگر کسی جاندار کی کھال اس طرح اتاری جائے کی خون کی نالیاں کٹنے نہ پائیں تو اس کی موت نہیں آجاتی مگر کھال کے بغیر اسکو زندگی گزارنے میں کافی دقت ہوتی ہے کہ نہ تو وہ زیادہ حرکات وسکنات کر سکتا ہے اور نہ ہی اپنے جسم کو مختلف بیماریوں سے بچا پاتا ہے۔ اس طرح وہ مختلف بیماریوں میں گھر کر بہت جلد مر جاتا ہے۔

جلد اور حفاظت:

کھال مختلف خلیوں (Cells) سے مل کر بنی ہوتی ہے اور ایک ہی کھال کے مختلف جگہ کے خلیے مختلف خواص کے حامل ہوتے ہیں۔ آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کھال بھی ایک مکمل جان ہے بلکہ ہر خلیہ بھی ایک مکمل جاندار ہے یہی وجہ ہے کہ اندرونی بازوؤں (بغلوں کے قریبی) اور رانوں وغیرہ کی جلد ہماری باقی جلد سے زیادہ صحت مند، صاف، خوبصورت، گوری اور ملائم نظر آتی ہے کہ ان حصوں کی جلد کے خلیات ملحوظ ساخت بھیڑ جھکے رہنے کے محفوظ رہتے ہیں اور اس طرح جلد ہمیں مجموعی طور پر صاف اور صحت مند نظر آتی ہے۔ خارش، تھکاوٹ اور مختلف جلدی امراض کی وجہ بھی یہی ہے کہ پوری جلد بیمار نہیں ہوتی بلکہ جلد کا مخصوص حصہ متاثر ہوتا ہے۔ کیونکہ موسمی اثرات، جراثیموں کا حملہ کسی ایک جگہ پر ہوتا ہے اور یہی متاثر ہوتی ہے۔ ہاں ایسا ضرور ہوتا ہے کہ شروع تو تھوڑی جگہ سے ہوتی مگر آہستہ آہستہ وہ شکایت پھیل کر پوری جلد کو متاثر کر دیتی ہے۔ بلکہ دوسرے افراد کو بھی متاثر کر دیتی ہے۔ جب کہ اگر جلد کی صحت صحیح ہو تو نہ صرف جلد خارش، پھوڑے اور پھنسیوں وغیرہ سے بچی رہتی ہے بلکہ تھکاوٹ بھی کم محسوس ہوتی ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ اپنی جلد کی مکمل حفاظت کریں۔ ناخن کاٹ کر رکھیں صاف ستھرے اور سوتی کپڑے کا استعمال کریں، جلد پر لگانے کی عام کریمیں وغیرہ لگانے سے پرہیز کریں کہ بنانے اور بیچنے والے تو فائدہ میں رہتے ہیں مگر استعمال کرنے والے بعض اوقات ایک عارضی یا مستقل عذاب میں پھنس جاتے ہیں۔ وراثتی جلدی امراض میں مبتلا افراد ہرگز پریشان نہ ہوں کہ یہ دوسروں کو نہیں لگتیں بلکہ کروموسوم میں موجود ہوتی ہیں۔

صارفین کے تاثرات:

صارفین کے ملے جلے تاثرات ہمیں بذریعہ خطوط، فون اور مختلف نمائشوں میں ان کی حاضری پر ملے کہ ابھی تک کریم بنانے والوں کی تمام تر توجہ کریم بنانے پر ہی رہی کہ وہ چمکدار ہو، سفید ہو، لہروں بھروں والی ہو، دیدہ زیب پیکنگ ہو، اس کے اشتہارات زبردست ہوں اور اس پر امپورٹڈ کا لیبل ہی بڑا اوپر سے کسی فلمی ہیروئن، خوبصورت ماڈل گرل یا کسی خوبصورت بڑی شخصیت کی خوبصورتی کو ان کریموں کی بدولت کہہ کر ہم عوام کی خوب کریم نکالی گئی اور اب تو ہارموٹانک کریم جیسی پیکنگ میں ملتف کریمیں بھی آ گئی ہیں۔ جبکہ ہارموٹانک کریم اس وقت مارکیٹ میں آئی جب ہزاروں روپے قیمت والی کریمیں عوام کی کریم نکال رہی تھیں اور ہارموٹانک کریم تو واقعی ایک کریم ہے۔

ہارموٹانک کریم کے استعمال، فوائد:

دانے، چھائیاں، جھریاں، کھلیاں، خارش، پمپل ریشز، بواسیر، پھوڑے کاٹنے (Vaginal Infection) انگلیوں، ناخنوں، جلد اور بالوں کی الرجی، داد، پھنسیاں، دھبے، چھپاکی، جوڑوں اور سر درد، جلے، کٹے زخموں، زچگی، چیچک، تالکوں کے نشانات، بعد بخار ہونٹوں پر نکلے گرمی دانوں، گرمیوں میں بغلوں اور رانوں میں بھیجہ گڑ اور خارش، پھٹی ایڑیوں پاؤں کے تلوؤں میں بدبو یا جلن اور تھکاوٹ یا جسم میں سوئیاں سی چبھتی ہوں تو متاثرہ جگہوں پر ہارموٹانک کریم مکمل آرام تک لگائیں۔ کان میں درد ہو تو 5 گنا زائد پانی میں ہارموٹانک کریم حل کر کے ایک قطرہ ٹپکائیں۔ کھمبی، مچھر، کھٹمل، پسو کے کاٹے کا فوراً ہارموٹانک کریم لگانے سے درد جلن اور سوجن کم اور زہریلے اثرات ہلکے پیلے زرد پانی کی صورت میں فوراً خارج ہو جاتے ہیں۔ دیر تک دھوپ میں رہنا ہو تو چہرے پر ہارموٹانک کریم لگا کر سورج کی مضر شعاعوں، گرد وغبار اور ماحولیاتی آلودگی سے بچیں۔ دمے اور سانس کی تکلیف کی صورت میں انگلیوں پر ہارموٹانک کریم لگا کر سونگھنے سے مکمل شفا ہو جاتا ہے۔ مذکورہ فوائد بعد الطویل تحقیق ثابت شدہ ہیں۔ گھر، دکان، دفتر اور گاڑی میں ہارموٹانک کریم کی موجودگی فوری ابتدائی طبی امداد ہے۔

عمل بھاپ سے ایک ہی دن میں نکھرنا:

نیم گرم پانی سے چہرہ دھو کر خشک ہونے پر ہارموٹانک کریم لگائیں ایک گھنٹہ بعد ابلتے ہوئے پانی کا برتن چہرے سے اتار کر ایک منٹ بھاپ چہرے پر لیں اس کے ایک گھنٹہ بعد چہرہ نیم گرم پانی سے دھولیں۔ خشک ہونے پر ہارموٹانک کریم لگائیں اور یہ عمل تین بار مسلسل کریں۔ ایک ہی دن میں رنگ گورا اور چھائیاں ختم ہو جائیں گی۔ (حساس جلد والے یہ عمل نہ کریں)

پرہیز:

سوتی کپڑے پہنیں، دھوپ سے بچیں اور ناخن کاٹ کر رکھیں، ہارموٹانک کریم کے استعمال سے پہلے تین دن صابن استعمال نہ کریں۔ بھاپ کا عمل 28 دن میں صرف ایک بار کریں۔

نوٹ:

دہی، پھٹکیوں وغیرہ پر خالص ہارموٹانک کریم صرف ایک بار استعمال کریں۔ ازاں بعد پانچ گنا زیادہ تیل یا ویسلین سادہ میں ملا کر استعمال کریں تاکہ دہی مر جائیں۔ خارش نہ ہو اور جلد ٹھیک ہو۔

تیار کردہ: اے۔کے۔کاسکو پانڈ، مینگورہ (سوات)
042-37666818
0300-9486848

نوٹ: ہارموٹانک کریم حقوق (پیکنگ، ڈیزائن، بروشر، مونوگرام، کیلی گرافی، ٹریڈ مارک وغیرہ بحق رفیق شاکر محفوظ ہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چراغ کا یہ جملہ اس کے ذہن میں گونجتا رہا۔

لوگوں کا ایک ہجوم چوک میں جمع تھا۔ وہ سب چراغ کے ساتھ جنگل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ایک محفوظ فاصلے پر چراغ نے انہیں روک دیا تھا۔ اس کے منہ میں جوگی کی کوڑیاں اور بازو پر تعویذ بندھا تھا اور اسے اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا۔

بے آواز چلنے کے ساتھ ساتھ وہ گہری نظروں سے درختوں کی جڑوں اور جھاڑیوں کو بھی دیکھتا جارہا تھا۔ دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ یہ ڈنڈے کی پسندیدہ بات تھی۔ وہ ہمیشہ دھوپ میں ہی پڑا نظر آتا تھا۔ مگر آج ڈنڈے کا کہیں پتا نہیں تھا۔ شاید وہ ابھی اپنے ٹھکانے سے نہیں نکلا تھا۔ چراغ کی نگاہیں اس مخصوص کھوہ پر جمی ہوئی تھیں۔ تبھی چراغ کے حساس کانوں نے ہلکی سی پھنکار سنی۔ وہ حیران ہوا کیونکہ ابھی تک کسی نے ڈنڈے کی آواز کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

پھنکار پھر سنائی دی، اس دفعہ آواز واضح تھی اور ایک نیچی جھاڑی سے آرہی تھی۔ چراغ بیگ بے آواز چلتا ہوا جھاڑی کے نزدیک پہنچا۔

اس کی آنکھوں نے ایک حیران کن منظر دیکھا۔ جھاڑی کے پیچھے ذرا کشادہ جگہ پر ڈنڈا اپنی مخصوص حالت میں پڑا تھا اور ایک خوبصورت ناگن بڑی محبت سے اس کے اردگرد لہرا رہی تھی اور ہلکی ہلکی آواز میں پھنکار رہی تھی۔ چراغ اس پھنکار کا مطلب جانتا تھا مگر اس کے ذہن نے یہ بات قبول کرنے سے صاف انکار کردیا۔ وہ سانپوں کی ایک ایک حرکت کا مطلب جانتا تھا۔ مگر دو مختلف نسل کے سانپ کبھی ایک دوسرے کے قریب نہیں جاتے، پھر یہ کیسے ممکن تھا؟

اچانک ناگن ڈنڈے کی طرف جھکی اور دوسرے ہی لمحے وہ ڈنڈے کے قریب ہی گری اور بے جان ہوگئی۔ ڈنڈا آہستہ آہستہ لڑھکتا ہوا جھاڑی کے ساتھ ساتھ کھوہ کی طرف بڑھنے لگا۔ چراغ جیسے نیند سے جاگ گیا۔ وہ ڈنڈے کے پیچھے لپکا۔ وہ اسے کھوہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی پکڑ سکتا تھا مگر ڈنڈے کو جیسے اس کے ارادے کی خبر ہوگئی، وہ ایک دم ہی اکٹھا ہوکر ذرا سا اچھلا اور سیدھا کھوہ کے اندر جا گرا۔ چراغ نے جلدی سے کھوہ میں جھانکا۔ ڈنڈا کھوہ کے اندر ایک سوراخ میں غائب ہورہا تھا۔ بس ذرا سا ہی باہر تھا۔ چراغ نے کھوہ میں ہاتھ ڈال دیا اور اس کے بقیہ حصے کو کھینچ کر باہر نکالنا چاہا۔

دور کھڑے لوگوں نے بس اتنا دیکھا کہ چراغ نے ہاتھ جھٹکے سے باہر نکالا اور دوسرے ہاتھ سے اسے پکڑا۔ دوسرے ہی لمحے جھکا ہوا چراغ سیدھا ہونے کے بجائے ریت کے بورے کی طرح زمین پر گرا۔

لوگ سانس روکے سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ اسے بے حرکت دیکھ کر چند نوجوان چیختے ہوئے آگے بڑھے مگر چند قدم کے فاصلے پر ہی رک گئے۔ چراغ کے جسم سے پسینے کی طرح پانی پھوٹ پھوٹ کر زمین کو گیلا کررہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ پانی سبز رنگ کے رقیق مادّے کی شکل اختیار کرگیا اور اردگرد کی زمین بھی سبز سبز دکھائی دینے لگی۔

قصبے میں کہرام مچ گیا۔ کسی نے نیاز بیگ کو اطلاع دے دی۔ وہ بھاگتے ہوئے آئے اور چراغ کی طرف جانے لگے۔ لوگوں نے بڑی مشکل سے انہیں پکڑا۔ شمع بیگ شہر میں نہیں تھا۔ وہ اپنی بیوی کو لینے سسرال گیا ہوا تھا۔

مرزا غفار بیگ، شہر کی پولیس اور دیگر متعلقہ افسران بھی موقع پر پہنچ گئے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اجلاس ہوا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ جنگل کی دوسری طرف سے لاش سے محفوظ فاصلے پر ایک گہرا گڑھا کھودا جائے، پھر لمبے لمبے بانسوں کے آگے لگے ہوئے بیلچوں کی مدد سے گوشت کے اس ڈھیر کو دھکیل کر اس گڑھے میں ڈال دیا جائے اور پاس پڑی مٹی سے انہی بیلچوں کی مدد سے اسے بھر دیا جائے۔ اس کے بعد متاثرہ جگہ پر مٹی کا تیل ڈال کر آگ لگادی جائے اور یہ بانس بھی آگ میں جھونک دیے جائیں۔

جب قبر کھودی جارہی تھی تو نیاز بیگ رو رو کر التجائیں کررہے تھے۔ ''بھائیو! میرا چراغ مسلمان تھا۔ کیا اسے نہلائے اور کفنائے بغیر قبر میں ڈال دو گے؟'' وہ ایک ایک سے فریاد کررہے تھے۔

سب کے سر جھک گئے۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ چراغ کو جواب چراغ نہیں بلکہ بگڑے ہوئے اعضا اور بدبودار گوشت کا ڈھیر بن چکا تھا، غسل دیتا یا کفن پہناتا۔

یوں وہ حرماں نصیب بے کفن ہی اپنی لحد میں اتر گیا۔

پروگرام پر عمل کیا گیا۔ مٹی کا تیل ڈال کر آگ لگادی گئی۔ آس پاس کی جھاڑیوں اور درختوں نے بھی آگ پکڑلی جو دو تین دن سلگتی رہی۔ پتا نہیں اس آگ میں وہ ظالم ڈنڈا جل گیا یا زمین کی پاتال میں اتر گیا مگر اس کے بعد کسی نے ڈنڈے کو کبھی نہیں دیکھا۔ یوں چراغ بیگ نے مر کر اپنا کام پورا کردیا۔

★★★

کالا آدمی

محترم مدیر اعلیٰ!
سلامِ تہنیت
اس دنیا میں کیسے کیسے مکروہ خصلت لوگ ہیں اور کیسے کیسے قابلِ نفرت علوم، آپ کے رسالے میں پراسراریت نمبر کا اشتہار دیکھا تو ایک پرانا واقعہ یاد آگیا۔ اس واقعے کے چشم دید گواہ ہی نہیں کئی کردار بھی اب تک حیات ہیں۔ اگر پسند آئے تو اسے سرگزشت کے صفحات پر جگہ ضرور دے دیں۔

صدف
(حیدرآباد)

یہ کہانی میری نہیں ہے۔

لیکن یہ میری کہانی اس لیے ہے کہ میں بھی ایک عورت ہوں، ایک لڑکی ہوں اور یہ کہانی اس معاشرے کی تقریباً ہر لڑکی کے لیے ہے اور یہ اس لیے تحریر کررہی ہوں تاکہ اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بے شمار دنیاؤں میں سے صرف تین سے بحث کرنا کافی ہے یعنی کرۂ ارض یا خاکی دنیا، جذباتی دنیا اور ذہنی دنیا! ان میں سے ہر دنیا ایسی ہستیوں سے آباد ہے جو اپنے اپنے ماحول میں بسنے کے لیے موزوں ہیں۔ اس کرۂ ارض پر بنی نوع انسان، حیوانات، نباتات، معدنیات وغیرہ ہیں اور ان میں سے ہر نوع ایک نوعی شعور رکھتی ہے۔ معدنیات میں پست درجے کا شعور ہے۔ اس کے بعد نباتات کا درجہ ہے پھر حیوانات کا پھر انسان کا۔ انسان میں شعور کی تکمیل ہوجاتی ہے۔ شعور کا قانون یہ ہے کہ وہ پستی سے بلندی کی طرف حرکت کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ معدنیات، نباتات اور حیوانات انسان کی طرف ارتقا کرتے رہتے ہیں۔ انسان قبل اس کے کہ فوق الانسان بنے اپنی حیات میں ارتقا کی نہ جانے کتنی منزلیں طے کرسکتا ہے اور طے کرلیتا ہے۔ اس وقت انسان کو نہ صرف اپنے خیالات وجذبات بلکہ تمام کرۂ ارض اور کرۂ ارض سے نکل کر جذباتی دنیا اور دوسری دنیاؤں پر بھی قابو حاصل ہوجاتا ہے۔ عام طور پر انسان کو صرف اپنی جسمانی دنیا اور ذہنی دنیا اور اس کے گردوپیش کا ادراک ہوتا ہے۔ اس لیے کہ انسان کی جسمانی ہستی پوری ترقی کرچکی ہوتی ہے۔ ہم کو جذباتی دنیا اور ذہنی دنیا اور دوسری دنیاؤں کا کہاں تک علم ہے، یہ موقوف ہے اس پر کہ ہم نے اپنی دوسری ہستیوں کو کہاں تک ترقی دی ہے۔ اور اس ترقی کا انحصار ہماری قوتِ ارادی پر ہے۔ جتنا ہمارا ارادہ قوی اور پختہ ہوگا، اتنا ہی زیادہ ہمیں اپنے مختلف وجودوں (جذباتی وجود، ذہنی وجود اور روحانی وجود) پر تصرف حاصل ہوگا۔ اور جتنا ہمیں اپنے مختلف وجودوں پر اختیار ہوگا، اتنا ہی زیادہ ہم کو دوسری دنیاؤں (برزخ کے مختلف طبقات) میں مداخلت کا اختیار ہوگا۔ ریاضتِ نفس کرنے والوں کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے اس لیے کہ انہیں اپنے جذبات پر مکمل قابو حاصل ہوتا ہے۔ اس انسان کی قوتِ ارادی اس ارادۂ کل کا کرشمہ ہے جو کل کائنات میں جاری وساری ہے۔ اس قوتِ ارادی کے بل پر انسان نہ صرف اپنی زندگی کی مختلف تہوں کی تہذیب وترتیب کرتا ہے بلکہ اپنے گردوپیش کی دنیاؤں اور وہاں کی ذی شعور ہستیوں پر بھی اثرانداز ہوسکتا ہے۔ ہندو فلسفے میں انسان کو ترلوکی کہا گیا ہے۔ ترلوکی کے معنی ہیں تین دنیاؤں

قسم کے واقعات کی روک تھام ہوسکے۔

ایک دن میں اپنے گھر میں تھی کہ میری ایک دوست کشور مجھ سے ملنے چلی آئی۔ ہم کالج میں ایک ساتھ ہوا کرتے تھے، وہ بہت ہنس مکھ اور شوخ لڑکی تھی۔

دنیا بھر کے لطیفے اسے یاد تھے۔ وہ جب آتی قہقہوں کی برسات شروع ہوجاتی۔ کالج میں بھی اس کا یہی حال تھا۔ شوخ اور شریر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بے حد خوبصورت بھی تھی۔

اس کی سب سے بڑی خوبی جامہ زیبی تھی۔ وہ جو لباس پہن لیتی وہ اس پر سج کر رہ جاتا۔ اس کے والدین بھی خوش حال تھے، اچھا سا مکان، گاڑی سب کچھ تھا اس کے پاس۔

آپ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ میں نے اس کے لیے اتنی تمہید کیوں باندھی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کہانی کشور ہی کی ہے۔ اسی لیے اس کا بیک گراؤنڈ بتانا ضروری ہے۔

خیر تو اس دن کشور اپنے مزاج کے برخلاف بالکل خاموش تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی پریشانی اسے لاحق ہوگئی ہو ورنہ اس جیسی لڑکی سے سنجیدگی کی تو توقع ہی نہیں ہوسکتی تھی۔

میں اس کے موڈ کو دیکھ کر اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے کمرے میں لے آئی۔ ''ہاں اب بتا یار کیا پریشانی ہے تجھے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں تو۔'' اس نے انکار میں گردن ہلا دی۔ ''کوئی خاص پریشانی نہیں ہے۔''

''دیکھ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش مت کر۔'' میں نے کہا۔ ''کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔''

''یار یہ محبت کیا چیز ہوتی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''اوہ۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''میں نے سمجھ لیا تھا کہ تیرے ساتھ کچھ اسی قسم کا مرحلہ ہے۔ کیا تجھے کسی سے محبت ہوگئی ہے۔''

''ہاں ایسا ہی سمجھ لو۔'' اس نے کہا۔ ''کچھ عجیب سی کیفیت ہوتی جارہی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ اس کو اپنا لوں۔''

''تو اپنا لو۔ تمہارے گھر والے تو تمہاری کسی بات سے انکار نہیں کریں گے۔''

''یہی تو پرابلم ہے کہ میں اسے اپنا نہیں سکتی۔'' اس نے کہا۔ ''اگر ایسا ارادہ بھی ظاہر کیا تو قیامت آجائے گی۔''

''کیوں اس میں کیا پرابلم ہے؟''

''ہے پرابلم۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

میں کام کرنے والا۔ یعنی انسان (ہندو نظریہ کے مطابق) تین دنیاؤں کا باشندہ ہے۔ جسم کی دنیا، ذہن کی دنیا اور روح کی دنیا! انسان کے شعور کا بیشتر حصہ عموماً جسم کی دنیا میں صرف ہوجاتا ہے۔ جب وہ بے خبر سو جاتا ہے تو اس کا شعور جسمانی دنیا کی حدود سے بلند تر ہوکر توفیق واستعداد کے مطابق برزخ کی جذباتی دنیا یا ذہنی دنیا میں پہنچ جاتا ہے اور وہاں پوری قوت سے کام کرنے لگتا ہے۔ اس بیان سے یہ نتیجہ نہ نکالا جائے کہ انسانی ہستی کی صرف تین ہی ہیں، نہیں انگنت ہیں ہیں جو ہنوز مکمل نہیں ہوئیں۔ عموماً انسانی ہستی کی صرف مذکورہ بالا تین ہی مکمل ہوتی ہیں جن کے ذریعے وہ عموماً تین دنیاؤں کی سیر کرسکتا ہے۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ یہ تینوں ہستیاں ایک دوسرے کے اندر موجود ہیں اور ساتھ کام کرتی ہیں البتہ ان میں سے ایک ہستی دوسرے پر غالب رہتی ہے۔ بعض لوگوں کی جذباتی اور ذہنی ہستی دوسرے پر غالب رہتی ہے۔ بعض لوگوں کی جذباتی اور ذہنی ہستی اس قدر کمزور اور خام ہوتی ہے کہ وہ اپنی جسمانی ہستی سے آزاد ہوجانے کے بعد بھی اپنے جسمانی وجود کے ماحول میں پھنس کر رہ جاتے ہیں لیکن بعض تربیت یافتہ افراد میں ان کے ذہنی اور جذباتی وجود اس قدر مکمل اور پختہ ہوتے ہیں کہ وہ جسمانی زندگی ہی میں نہ صرف دوسری دنیاؤں کی سیر کرسکتے ہیں بلکہ ان دنیاؤں میں رہنے والی مخلوق کے ارتعاشات بھی قبول کرتے اور اپنے وجود کے ارتعاش (لہروں) سے ان کا جواب بھی دیتے ہیں یعنی ان کا نادیدہ مخلوق سے مکمل رابطہ قائم ہوتا ہے۔ خواب کی حالت میں عام طور پر یہ روابط بڑھ جاتے ہیں۔ ہم خواب میں نہ صرف ان ہستیوں سے ملتے جلتے ہیں بلکہ ان سے پیغامات بھی وصول کرتے ہیں۔ خواب میں نہ صرف عالمِ برزخ کے باسیوں سے ملاقات ہوتی ہے بلکہ اس دنیائے آب وخاک کے ان باشندوں سے بھی ملنا ہوجاتا ہے، ہماری طرح جن کا شعور عالمِ خواب میں کارفرما ہوتا ہے۔

اقتباس: تین دنیا از اظہار الحسن

مرسلہ: اسد علی خان، لاہور

''اچھا وہ کرتا کیا ہے۔ کون ہے؟''

''نہیں میں یہ بھی نہیں بتا سکتی۔'' اس نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے کہ وقت آنے پر تمہیں خود ہی معلوم ہوجائے لیکن ابھی نہیں۔''

وہ کچھ دیر بیٹھ کر اسی طرح باتیں کرنے کے بعد چلی گئی۔ اس نے اپنی محبت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ چونکہ میری بہت اچھی دوست تھی اسی لیے مجھے اس کی طرف سے پریشانی سی ہوگئی تھی۔

جب کچھ دنوں تک اس سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تو میں خود اس سے ملنے اس کے گھر چلی گئی۔

وہ اس وقت اپنے کمرے میں تھی لیکن میری ملاقات اس کی امی سے ہوگئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ خوش ہوگئی تھیں۔

''صدف بیٹا، اچھا ہوا تم خود آگئیں، اب تم خود ہی اپنی دوست کو سنبھالو۔''

''کیا ہوا ہے میری دوست کو۔''

''خود جا کر دیکھ لو اس نے اپنے آپ کو کمرے میں بند کر رکھا ہے۔''

میں کشور کے کمرے میں پہنچی اور دستک دے کر دروازہ کھلوا لیا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے ایک شاک سا لگا تھا۔ الجھے ہوئے بال، آنکھوں کے گرد حلقے جیسے کئی راتوں سے جاگ رہی ہو، میں نے پوچھا۔ ''ارے کیا ہوا ہے تجھے؟''

''وہ مجھ سے لپٹ کر بری طرح رونے لگی۔

''صدف میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں پاگل ہو رہی ہوں۔''

''اب ایسا بھی کیا پاگل پن ہے۔ آنٹی اور انکل سے بات کرلو۔ وہ خود ہی کوئی راستہ نکال دیں گے۔''

''نہیں یہی تو مصیبت ہے کوئی راستہ نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اگر میں نے اظہار کردیا تو قیامت آجائے گی۔''

''کیا پاگل پن ہے۔''

''ہاں میں پاگل ہی ہوگئی ہوں۔ اس کے بغیر میری زندگی ادھوری ہے۔ وہ میرے اعصاب پر چھا گیا ہے۔ میں رات دن اس کے خواب دیکھتی رہتی ہوں، اس کو یاد کرتی رہتی ہوں تو ساری رات نیند ہی نہیں آئی۔ تم میری حالت دیکھ رہی ہو، یہ سب اسی کی وجہ سے ہوا ہے۔''

''میری جان تو نے اپنے آپ کو یہ کیسا روگ لگا لیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بہ زبانِ محبت کی تتلی

امیر سعید نصر بن احمد سامانی، ابُوعلی قہستانی کو خراسان بھجوانا چاہتا تھا جب اُس نے ابُوعلی کو بُلوایا اور دونوں آپس میں باتیں کرنے لگے تو ابوعلی کے چہرے کا رنگ سفید پڑ گیا۔ جیسے کوئی شدید درد ہو۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا مگر وہ برابر گفتگو کرتا رہا اور مطلقاً کسی تکلیف کا اظہار نہ کیا۔ جب گفتگو ختم ہو چکی تو باہر نکلا اور ایک جگہ پہنچ کر کپڑے اتارے۔ دیکھا تو ایک خطرناک زہریلا بچھو نکلا جس نے ابُوعلی کے جسم پر سترہ جگہ ڈنک مارا تھا۔

امیر سعید کو یہ خبر پہنچی تو بہت حیران ہُوا ابوعلی کو بُلا کر پوچھا۔ "جب پہلی مرتبہ بچھو نے کاٹا تھا۔ اُسی وقت اُٹھ کر کیوں نہ چلے گئے؟"

ابوعلی نے جواب دیا: "بڑی شرم کی بات تھی کہ میں حضور کے "نوش سمن" کے مقابلے میں "نیش کژدم" کی پروا کرتا اگر میں حضور کے سامنے بچھو کا حملہ برداشت نہیں کر سکتا تو میں حضور کے پیٹھ پیچھے دشمنوں کی تلواروں کے زخم کیونکر برداشت کر سکتا ہوں۔"

امیر سعید کو ابُوعلی کا یہ فصیح و بلیغ اور مزیدار جواب بہت پسند آیا اور اُس نے ابُوعلی کے منصب اور جاگیر میں کئی گنا اضافہ کر دیا اور اس کا مرتبہ اتنا بلند کر دیا کہ وہ سلطنت کا ایک اہم رکن سمجھا جانے لگا۔ **

مرسلہ: راجہ محمد یٰسین، الریاض

ہے۔"

"میں بالکل بے بس ہو کر رہ گئی ہوں صدف، بالکل بے بس۔" اس نے کہا۔

"یہ تو بتا دے کہ وہ ہے کون۔"

"نہیں میں یہ نہیں بتا سکتی۔"

"تو پھر جہنم میں جاؤ۔" مجھے بھی غصہ آ گیا۔ "آخر پورے گھر کو پریشان کیوں کر رکھا ہے۔"

اس نے پھر رونا شروع کر دیا تھا۔

اس کی حالت دیکھ کر افسوس ہو رہا تھا لیکن میں کیا کر سکتی تھی۔ وہ اگر اس لڑکے کے بارے میں بتا دیتی تو شاید کوئی راستہ نکالا جا سکتا تھا لیکن وہ تو کچھ بتانے کے لیے راضی ہی نہیں تھی۔

گھر آ کر میں سوچتی رہی کہ اس پاگل لڑکی کو آخر ہوا کیا ہے، اگر اس نے کسی سے محبت کر ہی لی ہے تو یہ کوئی ایسی ان ہونی بات بھی نہیں ہے، محبت تو ہوتی رہتی ہے لیکن یہ کیسی محبت ہے کہ وہ اپنے محبوب کے بارے میں کچھ بتانے کو تیار ہی نہیں ہے۔"

دو دنوں کے بعد کشور کی امی کا فون آیا۔ وہ بہت پریشان تھیں۔ "بیٹا، کشور تمہاری طرف تو نہیں آئی؟"

"نہیں تو۔" میں نے بتایا۔ "بات کیا ہے؟"

"بیٹا تم میرے پاس آ جاؤ میرا بہت دل گھبرا رہا ہے۔" کشور کی امی نے کہا۔

کچھ دیر کے بعد میں ان کے پاس پہنچ گئی۔ "بیٹا وہ صبح سے نکلی ہوئی ہے۔ شام ہونے والی ہے اور ابھی تک واپس نہیں آئی ہے۔ کچھ دیر کے بعد گھر کے مرد بھی واپس آ جائیں گے۔ انہیں کیا جواب دوں گی۔"

"آپ نے اسے موبائل کیا تھا۔"

"ہاں اس کا نمبر ملانے کی بار بار کوشش کر رہی ہوں لیکن موبائل بند ہے۔"

میں نے بھی ٹرائی کی لیکن موبائل آف ہی ملا تھا۔

ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ کشور واپس آ گئی۔ ہم اسے دیکھ کر خوش ہو گئے تھے لیکن اس کی عجیب حالت تھی۔ اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا پھر کچھ بولے بغیر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی جیسے وہ ہمیں جانتی ہی نہ ہو۔ یہ بالکل انہونی بات تھی۔

ایسا تو ممکن ہی نہیں تھا کہ کشور مجھے دیکھ کر اپنے آپ پر قابو رکھ سکتی ہو لیکن اس وقت تو وہ بالکل اجنبی ہو گئی تھی۔

"آنٹی کیا ہوا ہے اس کو۔" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"پتا نہیں بیٹا، میں خود نہیں جانتی تم جاؤ جا کر دیکھو کیا معاملہ ہے۔ خدا جانے یہ لڑکی کن چکروں میں پھنس گئی ہے۔"

میں جب کشور کے کمرے میں پہنچی تو مجھے دیکھ کر اس نے اپنے تیور بگاڑ لیے۔ "کیا بات ہے، کیا میرا تماشا دیکھنے آئی ہو؟"

میں تو حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ شاید زندگی میں پہلی بار اس نے مجھ سے اس انداز میں بات کی تھی اور وہ بھی اتنے بگڑے ہوئے تیور کے ساتھ۔ مجھے اس کی آنکھوں میں کچھ عجیب سی وحشت دکھائی دی تھی۔

"کشور، کیا ہوا ہے تمہیں۔" میں آگے بڑھنے لگی۔

"یہ تم مجھ سے کیسی باتیں کرنے لگی ہو۔"

"بس بس جاؤ یہاں سے۔ جس کو دیکھو ہمدردی کرنے چلا آ رہا ہے۔ کیا میں پاگل ہوں۔ تماشا بنا رکھا ہے..... جاؤ۔"

اس کے تیور ایسے ہو رہے تھے کہ میں اس کے کمرے سے باہر آ گئی۔ میں نے کشور کی امی کو ساری صورتِ حال بتا دی۔ "آنٹی مجھے تو ایسا لگا جیسے یہ کشور ہی نہیں ہے، یہ کوئی اور ہے۔"

"خدا خیر کرے۔" اس کی امی نے پریشان ہو کر اپنا سر تھام لیا تھا۔

"آنٹی سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ صرف اس پر دھیان رکھیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ معاملہ کچھ اور ہے۔"

"ہاں بیٹا، اس وقت وہ جنونی ہو رہی ہے لیکن کیوں؟"

اب کچھ چھپانا فضول تھا۔ اس لیے میں نے بتا دیا۔ "آنٹی آپ کی بیٹی کسی کو پسند کرنے لگی ہے۔"

"پسند کرنے لگی ہے۔" انہوں نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ "اگر پسند کرنے لگی ہے تو اس میں ایسی کون سی بات ہو گئی۔ یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔"

"یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا۔" میں نے کہا۔ "اور وہ کچھ بتاتی بھی نہیں ہے کہ وہ کون ہے۔"

"یہ تو واقعی عجیب بات ہے کیونکہ ہم نے بھی اس سے کہہ رکھا ہے کہ اگر کوئی ایسی بات ہو تو ہمیں بتا دے۔ ہم اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں بنیں گے۔"

"تو پھر وہ کیوں نہیں بتا رہی۔"

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے۔

"اور سورج اپنے ٹھکانے کی سمت دوڑا چلا جا رہا ہے۔ یہ بہت زبردست، خوب جاننے والے اللہ کا متعین کردہ راستہ ہے۔"

(سورۂ یٰسین 38:36)

سولہویں صدی عیسوی میں پولینڈ کے ماہر نجوم نکولاس کوپرنیکس نے یہ اعلان کیا کہ سورج ساکن ہے اور زمین اس کے گرد چکر لگاتی ہے۔ اس سے دنیائے علم میں ایک بھونچال آ گیا۔ جب دنیا نے کوپرنیکس کے اس نظریے کو ایک حقیقت سمجھ لیا تو عالمِ اسلام میں ایک اضطراب کی کیفیت پیدا ہوئی اس لیے کہ قرآن مجید سورج کو متحرک قرار دیتا ہے پھر اس کے بعد اٹھارہویں صدی میں سر فریڈرک ولیم ہرشل نے یہ اعلان کیا کہ سورج متحرک ہے۔ اس نے کہا "سورج خلا میں سفر کر رہا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے قرآنی بیان کی تصدیق کر دی۔

سورج کس طرح سفر کر رہا ہے؟ کیلیفورنیا کی ایک رصدگاہ کے ڈائریکٹر آر جی اینڈرسن کا اندازہ یہ ہے کہ سورج اپنے نظامِ شمسی سمیت اپنی کہکشاں کے ساتھ چوبیس ہزار میل فی گھنٹا کی رفتار سے کسی نامعلوم منزل کی طرف جا رہا ہے اور جدید ترین انکشاف جو سائنس نے کیا ہے، وہ یہ ہے کہ سورج مجمع النجوم شلیاق میں کسی نامعلوم مرکز کی طرف نہایت تیزی سے بھاگا جا رہا ہے، اس مرکز کو سولر ایپکس (Solar Apex) کہا گیا ہے۔

اقتباس: "اسلام کی سچائی اور سائنس کے اعترافات"
از آئی اے ابراہیم/محسن فارانی
انتخاب: اظہر جمیل صدیقی، کراچی

"اب خدا ہی جانے کہ کیا سلسلہ ہے۔"

کچھ دیر اور رہ کر میں اپنے گھر واپس آ گئی۔ راستے بھر اس کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ "ایسا کیوں ہو رہا ہے، کیا ہو رہا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیا جن عورت سے مسلمان مرد کا نکاح جائز ہے؟

حضرت خواجہ حسن بصریؒ سے کسی شخص نے سوال کیا کہ جن عورت سے مسلمان مرد کا نکاح جائز ہے یا نہیں، فرمایا جائز ہے بشرطیکہ دو گواہوں کے سامنے ایجاب وقبول عمل میں آئے۔ فتاویٰ سراجیہ میں جن اور انسانوں کے باہمی نکاح کو جائز رکھا گیا ہے۔

بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بعثت نبویؐ سے پیشتر دیگر انبیاء علیہم السلام کے زمانے میں جنات اور انسان کی بیاہ شادی ہوا کرتی تھی چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں مذکور ہے کہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ بلقیس زوجہ سلیمان کے ماں باپ میں سے ایک جن تھا۔

کتاب حیوۃ الحیوان کے مصنف نے لکھا ہے کہ مجھ سے ایک ایماندار حامل قرآن نے بیان کیا تھا کہ میں نے 4 جن عورتوں سے پے در پے نکاح کیے اسی طرح ایک اور شخص نے مجھ سے بیان کیا کہ میں نے ایک جن عورت سے نکاح کیا ہے تو مجھے اس کی بات پر یقین نہ آیا اور میں نے کہا "یہ کیونکر ممکن ہے کہ جسم لطیف اور جسم کثیف یکجا جمع ہوسکیں پھر عرصہ کے بعد وہ شخص مجھے نظر آیا تو اس کے سر پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں لوگوں کے دریافت کرنے پر اس شخص نے بتایا کہ میرا اپنی جن بیوی سے کسی بات پر جھگڑا ہوگیا تھا تو اس نے میرا سر پھاڑ دیا۔

اقتباس: جنات کے پُراسرار حالات از شبیر حسن چشتی
مرسلہ: نعمان صدیقی، رحیم یار خان

دوسرے ہی دن اچانک کشور میرے پاس آ گئی۔ اس وقت وہ نارمل دکھائی دے رہی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ پہلے جیسی تو نہیں تھی پھر بھی بہت بہتر تھی۔ اس کی آنکھوں کی وحشت بھی کہیں کھو گئی تھی۔ "صدف سوری یار، میں نے کل تیرے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ میں رات بھر سوچ سوچ کر پریشان ہوتی رہی ہوں۔"

"چلو کوئی بات نہیں۔" میں مسکرا دی۔ "دیر آید، درست آید۔"

"نہ جانے مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "اس کی محبت نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔ ویسے یہ احساس بھی ہے مجھ کو، اس کے باوجود میں بے بس سی ہو کر رہ گئی ہوں۔"

"چلو آج تو بتا دو کہ وہ ہے کون۔"

"ہاں آج تو یہی بتانے آئی ہوں۔" اس نے کہا۔ وہ بولتے بولتے رک گئی۔ ایسا لگا جیسے کسی نے اس کی زبان پکڑ لی ہو۔ ایک لمحے میں اس کی آنکھوں میں وہی وحشت نمایاں ہو گئی تھی پھر اس نے شور کرنا شروع کر دیا۔ "کیا میں پابند ہوں، کیوں بتاؤں کہ وہ کون ہے اور یہ تم بار بار کیوں پوچھتی ہو۔ تمہارا اس سے کیا واسطہ ہے۔"

میں واقعی سہم کر رہ گئی تھی۔

اس کی چیخ پکار سن کر امی بھی چلی آئی تھیں۔ "کیا ہوا بیٹا، کس پر ناراض ہو رہی ہو؟"

"آنٹی آپ منع کریں اپنی بیٹی کو۔" کشور نے میری طرف اشارہ کیا۔ اس نے میرا دماغ خراب کر رکھا ہے، یہ کیوں بار بار ایک ہی سوال کرتی ہے۔"

"امی میں نے تو کچھ نہیں کہا۔" میں پریشان ہو کر بولی۔ اس وقت امی نے آنکھ سے اشارہ کر کے مجھے خاموش کروا دیا تھا۔

کشور اسی وقت ناراضی کے عالم میں چلی گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد امی نے کہا۔ "بیٹا اس لڑکی پر کوئی اثر ہے۔"

"اثر!" میں نے حیرت سے امی کی طرف دیکھا۔ "یہ کیا کہہ رہی ہیں؟"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ اس کا یہ پاگل پن یونہی نہیں ہے۔ ویسے بات کیا ہوئی تھی۔ تم نے اس سے کیا پوچھ لیا تھا؟"

"امی کشور کسی کو پسند کرنے لگی ہے اور اس کے لیے پاگل ہو رہی ہے۔ جنونی کیفیت ہے اس کی لیکن اس نے آج تک یہ نہیں بتایا کہ وہ کون ہے۔ آج اس نے بتانے کا ارادہ کیا تھا لیکن بتاتے بتاتے اچانک رک گئی اور شور کرنے لگی۔"

"او خدا پھر تو یہ سراسر جادو ہے۔" امی نے کہا۔ "یہ جس کو پسند کرتی ہے اسی نے اس پر کچھ کر رکھا ہے۔"

"امی، اس دور میں یہ سب کیسے ہوسکتا ہے؟"

"یہ ہر دور میں ہوسکتا ہے۔ جاؤ اس کے گھر والوں سے کہو کہ اس کا توڑ کروائیں ورنہ لڑکی ہاتھ سے چلی جائے گی۔"

کشور کے گھر والے بہت ماڈرن قسم کے لوگ تھے۔ انہیں ایسی باتوں پر یقین نہیں تھا۔ میں نے کشور کی غیر موجودگی میں یہ بات اس کی امی، اس کے بھائیوں اور اس کے ابو کو بتائی تھی۔

"ارے یہ سب ڈراما ہے ابو۔" اس کے ایک بھائی نے کہا۔ "آج کل کس کے پاس اتنی فرصت ہے کہ وہ بیٹھ کر جادو کرتا رہے۔"

"تو پھر وہ اس کا نام کیوں نہیں بتاتی؟"

"وہ ہم لوگوں کے خوف سے نام نہیں بتاتی۔" دوسرا بھائی بھی بول پڑا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ اگر کسی کو پسند کرنے لگی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔" اس کے ابو نے کہا۔ "اس کو بلا کر سمجھا کر اس سے نام پوچھ لو اگر وہ لڑکا اچھا ہے تو ہمیں اس رشتے پر کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔"

"ہاں یہ طریقہ مناسب ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ لوگ اسے اطمینان دلا دیں کہ اس کی خواہش کا احترام کیا جائے گا۔"

"میں اسے یہیں لے کر آتی ہوں۔"

کشور کی امی اسے اس کے کمرے سے لے کر آ گئیں۔ اس وقت وہ ہمیشہ کی طرح نارمل تھی۔ میری طرف دیکھ کر اس نے اپنائیت سے پوچھا۔ "ارے تم کب آئیں۔"

"بس ابھی آئی ہوں۔"

"بیٹا۔" کشور کے ابو نے اسے مخاطب کیا۔ "ہم نے آج تک تم پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ تمہاری ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کی ہے، بتاؤ یہ درست ہے یا نہیں۔"

"جی ابو بالکل درست ہے۔"

"پھر تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ تم نے جس کو پسند کیا ہے ہم اس کو ناپسند کریں گے۔"

سحر

سحر کے معنی لغت میں امر مخفی اور پوشیدہ چیز کے ہیں اور علمی اصطلاح میں ایسے عجیب وغریب امور کا نام ہے جن کے وجود میں آنے سے اسباب نظر سے پوشیدہ ہوں۔

تفسیر کبیر میں امام رازی نے فرمایا ہے۔ "لفظ سحر اصطلاحِ شریعت میں ایسے امر کے لیے مخصوص ہے جس کا سبب مخفی ہو اور وہ اصل حقیقت کے خلاف خیال میں آنے لگے۔

علما کی رائے ہے کہ سحر واقعی ایک حقیقت ہے اور مضرت رساں اثرات رکھتا ہے، حق تعالیٰ نے اپنی حکمت اور مصلحت کاملہ کے پیشِ نظر اس میں اس طرح مضر اثرات رکھ دیے ہیں جس طرح زہر یا دوسری نقصان رساں ادویات میں موجود ہیں۔ یہ بات نہیں کہ سحر بذات خود قدرتِ الٰہی سے بے نیاز ہو کر موثر بالذات ہے، سحر کو موثر بالذات سمجھنا کفر خالص ہے۔

علامہ حماد الدین ابن کثیر نے لکھا ہے۔

"وزیر مظفر یحییٰ بن محمد بن ہبیرہ نے اپنی کتاب الاشراف فی المذاہب الاشراف میں ایک باب سحر کے متعلق بھی لکھا ہے، اس میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ علما کا اس پر اتفاق ہے کہ سحر کی بھی حقائق کی طرح ایک حقیقت ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے "مہلک باتوں سے بچو یعنی شرک اور جادو سے۔" (بخاری)

اقتباس: جنات کے پُراسرار حالات از شبیر حسن چشتی
مرسلہ: نعمان صدیقی، رحیم یار خان

"جی ابو... وہ بات یہ ہے کہ....."

"بتاؤ، کون ہے وہ، کیا نام ہے اس کا؟"

"ابو..... وہ دراصل....." اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہوگئی۔ اس کی آنکھیں پھر سے وحشت زدہ ہوگئی تھیں۔ "نہیں بتاؤں گی اس کا نام۔" وہ چیخ کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بولی۔ ''کیا سمجھ رکھا ہے تم لوگوں نے۔ جب دیکھو اس کا نام پوچھتے رہتے ہو۔ زندگی بھر نہیں بتاؤں گی۔''

اتنا کہہ کر وہ دندناتے ہوئے اندر چلی گئی۔ سب کے سب سکتے میں رہ گئے تھے پھر اس کے ابو نے دھیرے سے کہا۔ ''اس وقت وہ اپنے ہوش میں نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں سے اس کی وحشت کا اظہار ہو رہا تھا۔''

''ہاں ابو۔'' اس کے ایک بھائی نے بھی گردن ہلا دی۔ ''میں نے اس طرح اسے کبھی نہیں دیکھا۔ لگتا ہے جیسے کسی کے ٹرانس میں آئی ہوئی ہو۔''

''خدا خیر کرے! اب کیا ہوگا میری بچی کا۔'' کشور کی امی رونے لگی تھیں۔

''خدا پر بھروسا کرو۔ وہ کوئی نہ کوئی راستہ نکال دے گا۔''

''آخر کون ہے وہ جس نے کشور کا یہ حال کر دیا ہے۔'' اس کا بھائی غصے سے اپنی مٹھیاں بھینچنے لگا تھا۔

''ہوش میں آؤ۔ ایسے معاملات جوش سے حل نہیں کیے جاتے۔ اس کے لیے دوسرا راستہ ہوتا ہے۔''

''تو کیا کریں۔ خدا کے لیے کچھ کریں۔'' کشور کی امی نے کہا۔ ''کسی عامل بزرگ کو بلا کر لائیں۔''

''ہاں، اس کا علاج روحانی ہی ہو سکتا ہے۔''

''کاش ایک بار یہ نام تو بتا دے۔'' میں نے کہا۔

''وہ نہیں بتائے گی بیٹا، تم نے دیکھ لیا کہ جب وہ نام بتانے لگتی ہے تو اس کی زبان پکڑ لی جاتی ہے۔''

یہ سب کچھ بہت حیرت انگیز ہو رہا تھا۔ میں نے اس قسم کے واقعات سنے تو تھے لیکن یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ خود میری سب سے عزیز دوست کے ساتھ ایسا ہونے لگے گا اور میں اس پُراسرار کہانی کا خود ایک کردار بن جاؤں گی۔

میں گھر چلی آئی۔ میں نے اپنے گھر والوں کو بھی یہ سب بتا دیا تھا کیونکہ وہ سب ہی کشور سے بہت پیار کرتے تھے۔ دو دنوں کے بعد کشور کی امی کا فون آیا۔ ''صدف بیٹا، کیا تم میرے گھر آ سکتی ہو؟''

''خیریت تو ہے نا آنٹی۔'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''ہاں بیٹا، فی الحال خیریت ہی ہے۔'' انہوں نے کہا۔ ''کشور کے ابو ایک بزرگ کو لے کر آنے والے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم بھی اس موقع پر موجود رہو۔''

''کیوں نہیں، میں آ رہی ہوں۔''

کچھ دیر بعد میں ان کے گھر پہنچ گئی تھی۔ گھر کا ماحول ہی اب کچھ اور ہو گیا تھا۔ ورنہ اس گھر میں ہر وقت کشور کے قہقہے گونجتے رہتے تھے۔ عجیب سوگواری کی فضا تھی۔

''کشور کہاں ہے آنٹی؟'' میں نے پوچھا۔

''اپنے کمرے میں۔'' انہوں نے بتایا۔ ''اس کے ابو ایک بزرگ کو لانے کے لیے گئے ہیں۔ تم کشور کے پاس جاؤ۔ جب وہ آ جائیں تو کشور کو کسی طرح ڈرائنگ روم میں لے آنا۔''

میں جب کشور کے کمرے میں پہنچی تو وہ بالکل نارمل حالت میں بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ چہک اٹھی۔ ''اچھا ہوا یار تو خود آ گئی ورنہ میں فون کر کے بلانے والی تھی۔ گھر والوں نے تو میری زندگی عذاب کر دی ہے۔ نہ جانے کیا سمجھ رہے ہیں۔ مجھ پر جن آ گئے ہیں یا کسی نے مجھ پر جادو کر دیا ہے۔ کتنی بے وقوفی کی باتیں ہیں۔''

''تو پھر یہ سب کیا ہے۔''

''کچھ نہیں یار، تھوڑی ایکٹیویٹی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''دیکھ، میں نے تو تجھے بھی بے وقوف بنا دیا۔''

میں حیرت سے اس کی باتیں سنتی رہی۔ کیا یہ سب اس کا مذاق تھا یا اس کے ساتھ واقعی کوئی ایسا معاملہ تھا؟ یہ فیصلہ کرنا اس وقت مشکل ہو رہا تھا۔

لیکن اس وقت وہ بالکل نارمل تھی۔ وہ ہنس رہی تھی۔ اپنے اسی پرانے انداز سے۔ کسی طرح بھی یہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ اس کے ساتھ کسی قسم کی کوئی پرابلم ہے۔

''یار صدف میرا ایک کام کر دے گی؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں بتا، کیا کام ہے۔''

''ابھی کچھ دیر میں کوئی صاحب یہاں آنے والے ہیں۔ خواہ مخواہ کا تماشا ہوگا۔ میں کہیں باہر جانا چاہتی ہوں۔ تو مجھے نکال کر لے جا اور یہ کام تیرے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا۔''

''کشور، آنٹی اور انکل اس وقت تمہیں باہر نہیں جانے دیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''خواہ مخواہ مجھ سے بھی ناراض ہو جائیں گے۔''

''ارے کچھ بھی نہیں ہوگا۔'' اس نے کہا۔ ''تم کوشش تو کرو۔ تم ہمت کرو گی تو میں گھر والوں کی اس بے وقوفی سے بچ سکوں گی۔''

کشور نے مجھے ذہنی عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔ اگر میں اس کا ساتھ نہیں دیتی تو وہ ناراض ہو جاتی۔ اگر ساتھ دیتی تو اس کے گھر والے میرے پیچھے پڑ جاتے۔

عجیب چکر چل گیا تھا۔ اس نے جب ایک بار اور

درخواست کی تو میں نے اس سے کہا۔ ''چلو ٹھیک ہے، آؤ میرے ساتھ۔'' ہم دونوں اس کمرے سے باہر آ گئے۔

مگر دوسرے کمرے میں کشور کے ابو ان بزرگ کے ساتھ موجود تھے۔ کشور ٹھٹک گئی تھی۔ اس کے ابو نے پوچھا۔ ''بیٹا، کہاں جا رہی ہو تم دونوں۔''

''ابو ہم تھوڑی دیر کے لیے باہر جا رہے ہیں۔'' کشور نے کہا اور میرا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ ''چلو آؤ میرے ساتھ۔''

''نہیں۔'' اچانک ان بزرگ نے کشور کو مخاطب کیا۔ ''کیوں، تم کون ہوتے ہو مجھے روکنے والے؟'' کشور کے تیور اچانک بدل گئے تھے۔

''حمید صاحب'' ان بزرگ نے کشور کے ابو کو مخاطب کیا۔ ''آپ کسی قیمت پر اسے جانے نہ دیں۔ اگر یہ اس وقت نکل گئی تو واپس نہیں آئے گی۔''

یہ سنتے ہی کشور نے دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی لیکن وہ بزرگ دروازے کے درمیان آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ پھر اس گھر میں جو ہنگامہ ہوا ہے وہ میں بتا نہیں سکتی۔ کشور نے طوفان کھڑا کر دیا۔ اس نے توڑ پھوڑ مچا دی تھی۔ اسے زبردستی کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔

میں اس وقت خدا کا شکر ادا کر رہی تھی کہ اگر یہ میرا سہارا لے کر گھر سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو جاتی تو پھر کیا ہوتا۔ میں کیسے قابو میں کرتی۔

اس وقت ان بزرگ نے کشور کے ابو کو بتایا۔ ''حمید صاحب آپ کی بچی پر انتہائی خطرناک سفلی عمل کیا گیا ہے۔''

''کس نے کیا ہے؟''

''یہ تو میں نہیں بتا سکتا لیکن کرنے والا انتہائی غلیظ اور گھناؤنا انسان ہے۔'' بزرگ نے بتایا۔ ''اس کو کسی بھی قیمت پر گھر سے باہر نہ جانے دیں۔''

''لیکن ہوگا کیا۔ کیا یہ ایسی ہی رہے گی؟''

''میں کچھ دعائیں اور وظیفے وغیرہ تجویز کر رہا ہوں۔'' بزرگ نے بتایا۔ ''ان کا ورد جاری رکھیں۔ روز رات کو اس کے کمرے کے گرد حصار قائم کر دیا کریں۔'' پھر کچھ اور احتیاطی تدابیر بتا کر وہ رخصت ہو گئے۔

بہرحال کشور کے ساتھ جو کچھ بھی ہو رہا تھا، وہ بہت برا تھا۔

میں فون کر کے اس کی خیریت معلوم کرتی رہتی تھی۔ اس کے گھر والوں نے ان بزرگ کی ہدایت پر عمل کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسے گھر سے باہر بھی نہیں جانے دیا۔

کشف القبور

کشف القبور (قبر میں مردوں سے ملاقات) کا طریقہ تو تمام اولیائے کرام کے سلسلوں میں مشہور و معروف ہے لیکن دعوت القبور کا طریقہ حضرت سلطان العارفین سلطان باہو قدس سرہ کی دریافت ہے، آپ کی تصانیف میں بکثرت اس طریقے کا ذکر موجود ہے۔ اور آپ ہی کے سلسلۂ قادری و سروری کے خلفا و مریدین میں بیشتر حضرات کو فتح باطنی سے اس پر مکمل تصرف حاصل ہے۔ چنانچہ میرے پیشوا اور روحانی مربی حضرت فقیر نور محمد رحمۃ اللہ علیہ کو اس عمل دعوت القبور پر مکمل دسترس حاصل تھی۔ اسی لیے ہمارے دارالعلوم جامعہ صوفیہ (پناہے شریف) میں دعوت القبور کو حاصل کرنے اور اس طریقے سے روحانی فیض پانے پر عبور کرایا جاتا ہے۔

اقتباس: دعوت ارواح از محمد ارشد قادری

مرسلہ: نیاز احمد، کراچی

کچھ دنوں تک تو وہ شور مچاتی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ نارمل ہوتی چلی گئی۔ میں اس دوران کئی بار اس کے گھر گئی۔ اب اس کی وحشت ختم ہوتی جا رہی تھی۔

پھر ایسا بھی ہوا کہ وہ اپنی نارمل زندگی کی طرف واپس آ گئی۔ وہ ویسے ہی ہو گئی جس طرح پہلے ہوا کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کے گھر والے بھی مطمئن ہوتے چلے گئے۔

اور یہی ان کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ شاید انہوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ اب نارمل ہو گئی ہے۔ اس پر سے برے اثرات ختم ہو گئے ہیں۔ اسی لیے انہوں نے تھوڑی بے پروائی برتی اور کشور گھر سے غائب ہو گئی۔

اس کے گھر والوں پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔

ایک دن تو وہ خاموش رہے لیکن دوسرے دن سے اس کی تلاش شروع کر دی گئی۔ مجھے بھی اطلاع ہو گئی۔ میں فوری طور پر اس کے گھر پہنچ گئی۔

گھر والوں کا بہت برا حال تھا۔ پورا گھر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کی امی کی آنکھیں رو رو کر شاید خشک ہو گئی تھیں۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ کمرے سے نکل کر لان میں ٹہلنے کے لیے گئی تھی اور وہاں سے اچانک غائب ہو گئی۔

اسے تلاش کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ بدنامی کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خوف سے اس واقعے کی پولیس میں رپورٹ نہیں کی گئی تھی۔ لیکن ان بزرگ کو ضرور بلا لیا گیا تھا۔

''آخر کیوں۔'' انہوں نے آتے ہی ڈانٹ ڈپٹ کرنا شروع کر دی تھی۔ ''آپ لوگوں نے یہ کیسے سمجھ لیا تھا کہ اس پر سے اثرات ختم ہو چکے ہیں۔ کم از کم مجھ سے تو پوچھ لیا ہوتا۔ دوسری بات یہ کہ مجھے اتنی دیر سے اطلاع دی جا رہی ہے جبکہ سارا کھیل ختم ہو چکا ہے۔''

''ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ شاید وہ اپنی کسی دوست کے پاس ہے۔'' کشور کی امی نے بتایا۔ ''اسی لیے ہم اس کی تلاش میں لگے ہوئے تھے۔''

''وہ اسی خبیث انسان کے قبضے میں ہے جس نے اس پر یہ عمل کیا تھا۔''

''تو پھر اب کیا ہوگا۔''

''واپس آ جائے گی وہ۔ وہ اسے رکھ نہیں سکے گا۔'' بزرگ نے کہا۔ ''لیکن آپ لوگوں کے لیے ایک امتحان بن کر آئے گی اور آنے کے بعد وہ پھر نہیں جائے گی لیکن اس کی واپسی آپ لوگوں کے لیے امتحان ہوگی۔''

ان کی باتیں کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ نہ جانے وہ کیا کہہ گئے تھے۔

بہر حال ان کی بات اس طرح درست ہوئی کہ دوسری رات کو کشور چپ چاپ واپس آ گئی تھی لیکن بہت تھکی تھکی اور نڈھال سی۔

اس کی امی نے اس سے کچھ پوچھنا چاہا لیکن وہ اپنے کمرے میں جا کر بند ہو گئی تھی۔ گھر والوں کے لیے اتنا ہی بہت تھا کہ وہ واپس آ گئی ہے۔

میں اس کے پاس جاتی رہی۔ اس نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا اور نہ ہی میں نے کچھ معلوم کرنے کی کوشش کی۔ میں تو یہ دیکھ کر خوش تھی کہ اس کی وحشت ختم ہو گئی ہے۔ اب وہ ٹی وی دیکھا کرتی یا اپنی پسند کے میگزین پڑھتی رہتی۔ گھر والے بھی ایک طرح سے اس کی طرف سے مطمئن ہو گئے تھے۔

پھر یہ ہوا کہ میں کچھ عرصے کے لیے اپنے گھر والوں کے ساتھ انگلینڈ چلی گئی۔ وہاں جانے کے بعد بھی میں اس کے بارے میں فون کر کے پوچھتی رہتی تھی۔

انگلینڈ سے واپس آئی تو تازہ دم ہو کر سب سے پہلے اس کے گھر پہنچی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی امی مجھ سے لپٹ کر بری طرح رونے لگیں۔ میں یہ دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔ ''کیا ہوا آنٹی، خیریت تو ہے۔ کہاں ہے کشور؟''

''کاش، وہ پہلے دن ہی مر جاتی بیٹا۔''

''ایسا کیوں کہہ رہی ہیں۔ بتائیں تو سہی، کیا ہوا ہے اس کو؟''

''وہ اس وقت اسپتال میں ہے بیٹا۔'' انہوں نے بتایا۔

''اسپتال میں.....!'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''وہ کیوں؟''

پھر انہوں نے جو کچھ بتایا وہ انتہائی وحشت ناک اور شرم ناک تھا۔ کشور حاملہ ہو گئی تھی۔ وہ ناجائز بچے کو جنم دینے والی تھی۔

کسی شیطان کا تخم اس کی کوکھ میں پرورش پا رہا تھا۔

میں تو یہ سب سن کر سکتے میں رہ گئی۔ ''آنٹی، آپ نے.....'' میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ پائی تھی۔

''ہاں بیٹا میں نے ضائع کرانے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے زمین آسمان ایک کر دیا۔ خودکشی تک کرنے کی کوشش کی تھی۔ مجبوراً یہ ہوا ہے کہ بہت کوشش سے سفارش کے ذریعے ایک اسپتال میں اسے داخل کروا دیا گیا ہے۔ شاید آج ہی وہ اس کو جنم دینے والی ہے حالانکہ یہ ایک جرم ہے بیٹا لیکن ہم یہ جرم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔'' اتنا کہہ کر انہوں نے رونا شروع کر دیا تھا۔

میں ان کے دکھ کو سمجھ رہی تھی۔ نہ جانے ان لوگوں پر کیا گزر رہی ہوگی جبکہ خود میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں خودکشی کر لوں۔

اس کی امی نے بتا دیا کہ وہ کون سے اسپتال میں ہے اور کس طرح اسے خاموشی سے رکھا گیا ہے۔ انہوں نے میرے بارے میں فون کر کے ڈاکٹر نصرت کو بھی بتا دیا تھا۔ ڈاکٹر نصرت ہی اس پرائیویٹ اسپتال کے مالک تھیں۔

جب میں وہاں پہنچی تو پتا چلا کہ کشور نے ایک مردہ بچے کو جنم دیا ہے اور اس وقت وہ اس مردہ بچے کی لاش کے ساتھ اپنے کمرے میں موجود ہے اور کسی کو لاش کے قریب نہیں آنے دے رہی۔ ہنگامے سے بچنے کے لیے اس وقت ڈاکٹر وغیرہ بالکل خاموش تھے۔

صورتِ حال چونکہ خراب ہو گئی تھی اسی لیے میں نے فون کر کے کشور کی امی کو بھی بلا لیا۔ ہم دونوں جب کمرے میں پہنچے تو وہاں کی صورتِ حال عجیب تھی۔

کشور نے مردہ بچے کو اپنے سینے سے لگا رکھا تھا۔ وہ

اسے پیار کیے جا رہی تھی۔ اس کی کیفیت اس وقت جنونیوں جیسی ہو رہی تھی۔ ہمارے ساتھ ایک ڈاکٹر بھی تھا۔ ہم سبھوں نے بڑی مشکلوں سے اس مردہ بچے کو کشور کی گود سے چھینا تھا۔ میرے خدا! اس مردہ بچے کو دیکھ کر میں کانپ کر رہ گئی تھی۔

کیا بھیانک اور بدصورت چہرہ تھا اس کا۔ چہرے پر بے شمار داغ۔ انتہائی سیاہ رنگ۔ ایسا چہرہ تھا کہ وہ آج تک میرے ذہن پر نقش ہے اور سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ مردہ ہونے کے باوجود اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

وہ آنکھیں بھی ایسی تھیں کہ ان سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ ''ارے..... یہ..... یہ تو.....'' کشور کی امی کہتے کہتے رک گئیں۔ پھر چکرا کر گر پڑیں۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھیں۔

بہر حال ہزار دشواریوں کے بعد اس بچے کی لاش ضائع کی گئی۔ کشور کو گھر لایا گیا جہاں اس کی حالت اور خراب ہوتی چلی گئی۔

ایک بار پھر انہی بزرگ کو زحمت دی گئی۔ انہوں نے بہت دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''..... بالآخر اس کم بخت نے اپنا مقصد حاصل کر ہی لیا۔''

''میں ایک بات بتانا چاہتی ہوں۔'' کشور کی امی نے روتے ہوئے کہا۔ ''اس بچے کو دیکھ کر مجھے کسی کا خیال آ گیا تھا۔ مجھے ایسا لگا تھا کہ اس بچے کی شکل جس سے ملتی ہے میں اسے جانتی ہوں لیکن اس وقت پوری طرح یاد نہیں آ رہا تھا لیکن اب یاد آ گیا ہے۔ اس کی صورت موہن سے ملتی ہے۔''

''کون موہن۔''

''ہمارے یہاں کا جمعدار۔'' انہوں نے بتایا۔ ''جو ہمارے یہاں سے کچرا اٹھا کر لے جاتا ہے۔''

''اب سمجھ گیا۔'' وہ بزرگ اچھل پڑے تھے۔ ''یہ اسی کی حرکت ہو سکتی ہے۔ اسی قسم کے لوگ ایسا غلیظ کام کرتے ہیں۔''

''میں تو اسے جان سے مار دوں گا۔'' کشور کا بھائی اپنی مٹھیاں بھینچنے لگا تھا۔

''نہیں بیٹا، میں پھر کہوں گا کہ تمہیں ابھی اتنا جذباتی نہیں ہونا ہے۔'' بزرگ نے کہا۔ ''پہلے مجھے مکمل طور پر تصدیق کر لینے دو۔''

''اس کا پتا کیسے چلے گا۔''

''کیا وہ ابھی بھی کچرا اٹھانے آتا ہے۔''

''ہاں، یہ اس کا روز کا معمول ہے۔''

پھر انہوں نے ایک بوتل میں پانی منگوایا اور اس پر کچھ پڑھ کر دم کرتے ہوئے کشور کی امی سے کہا۔ ''آپ اس پانی کو کچرے کی بالٹی میں اچھی طرح چھڑک دیں اور کل صبح کچرے کی بالٹی اس کے حوالے کر دیجیے گا۔ اگر یہ اسی کی حرکت ہوئی تو ساری بات سامنے آ جائے گی۔''

پھر انہوں نے کشور پر بھی دم کر کے کچھ پانی اِدھر اُدھر چھڑک دیا تھا۔

اس رات میں وہیں رہ گئی تھی۔ کشور کی امی نے روک لیا تھا۔ میں نے اپنے گھر فون کر کے بتا دیا تھا۔ وہ رات کشور کے گھر والوں نے تقریباً جاگ کر گزاری تھی۔

دوسری صبح جب موہن نامی وہ جمعدار آیا تو اسے کچرے کی بالٹی معمول کے مطابق دے دی گئی۔ اس وقت میں نے بھی اسے چھپ کر دیکھ لیا تھا۔

خدا کی پناہ! یہ بالکل وہی تھا۔ ویسا ہی بدصورت اور بھیانک۔ بالکل اس مردہ بچے کی طرح۔ یعنی آنٹی کا خدشہ

Monthly Digest
SUSPENSE
سسپنس
SARGUZASHT
سرگزشت
PAKEEZA
پاکیزہ
JASOOSI
جاسوسی
مکتبہ اعلا و سہلا
Sole Distributor
ویلکم بک شاپ
WELCOME BOOK SHOP
P.O.Box 27869
Karama, Dubai
Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015
Mobile: 050-6245817
E-mail: welbookshop@emirates.net.ae
JD Group of Publications

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کی طرف سے بالکل درست تھا۔

وہ اپنے ساتھ کچرے کی گاڑی لے کر آیا تھا۔ اس نے بالٹی کا کچرا اس گاڑی میں انڈیلا اور اچانک ہی اس کی حالت غیر ہوگئی۔

وہ چیختا ہوا زمین پر بیٹھ گیا تھا۔ ''ارے میں جل رہا ہوں۔ جل رہا ہوں میں۔ میرے دونوں ہاتھ جل رہے ہیں۔ ارے یہ میرے ساتھ کیا کر دیا۔''

ہم سب سکتے کے عالم میں اس کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ ذرا سی دیر میں اس کی حالت غیر ہوتی چلی گئی تھی۔ وہ زمین پر پڑا ہوا ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ اس کے منہ سے جھاگ جاری ہوگیا تھا۔

یہ سب چونکہ احاطے میں ہو رہا تھا۔ اسی لیے باہر والوں کو اس کی خبر نہیں تھی۔ کشور کے ابو نے فون کر کے ان بزرگ کو بھی بلا لیا تھا۔

میں ان باتوں پر یقین نہیں رکھتی تھی لیکن اس وقت اپنی آنکھوں سے اس بھیانک منظر کو دیکھ رہی تھی۔ خود کشور کا پورا خاندان دم بخود سا کھڑا ہوا تھا۔

بزرگ نے آتے ہی اس جمعدار پر برسنا شروع کر دیا تھا۔ ''بول کم بخت! کیا کیا تھا تو نے ؟''

''مجھے معاف کر دو۔'' وہ بہ مشکل بول رہا تھا۔

''میں پوچھتا ہوں کیا کیا تھا تو نے ؟''

''اپنے مہاراج سے اس لڑکی کے لیے جادو کروایا تھا۔'' اس نے بتایا۔

''کس طرح۔''

''کپڑے۔ اس نے مجھے اپنے اترے ہوئے کپڑے دیے تھے کہ میں انہیں برادری میں کسی لڑکی کو دے دوں۔'' اس نے بتایا۔

اس وقت کشور کی امی نے بھی تصدیق کر دی کہ انہوں نے کشور کے کپڑے اس جمعدار کو دیے تھے۔

''کیا تو ہی اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔''

''ہاں جی، میں ہی لے گیا تھا۔ بس مجھے معاف کر دو، میں مر رہا ہوں، رحم کرو مجھ پر۔''

''تو نے اس لڑکی پر رحم کیا تھا۔''

''معاف کر دو مجھے۔'' وہ بدستور تڑپ رہا تھا۔

''نہیں، تجھے اس کی پوری سزا ملے گی اور تیرے مہاراج کو بھی سزا دی جائے گی۔ بول کون ہے تیرا مہاراج۔ کیا نام ہے اس کا ؟''

''رگھوناتھ۔ پجاری ہے جی۔''

''ٹھیک ہے۔'' بزرگ نے ایک گہری سانس لے کر کچھ پڑھتے ہوئے اس جمعدار پر پھونک دیا۔ اس کی حالت اور خراب ہونے لگی تھی۔ ''اب دفع ہو جا یہاں سے۔'' بزرگ نے کہا۔

وہ جمعدار چوٹ کھائے ہوئے پلّے کی طرح چیختا چلّاتا ہوا وہاں سے رخصت ہوگیا تھا۔

''کیا ہم اس کو پولیس کے حوالے نہیں کر سکتے۔'' کشور کے ابو نے پوچھا۔

''نہیں، ہم نے اس کو سزا دے دی ہے۔ یہ زندگی بھر اسی طرح جلتا رہے گا۔ اس کا مہاراج بھی اسے ٹھیک نہیں کر سکے گا۔''

''اور میری بچی کا کیا ہوگا ؟'' کشور کی ماں نے پوچھا۔

''وہ اب ٹھیک ہو جائے گی لیکن میرا مشورہ ہے کہ اسے یہاں سے کہیں اور لے جائیں اور کسی نیک نوجوان سے اس کی شادی کرا دیں۔ لیکن یاد رکھیں کہ اس نوجوان سے کچھ چھپایا نہ جائے۔ اسے سب کچھ بتا دیں۔ خدا نے چاہا تو ایسا نوجوان ضرور مل جائے گا اور ہاں سب سے اہم بات یہ ہے کہ جوان لڑکیوں کے کپڑے اس طرح کسی کو اٹھا کر نہ دے دیا کریں جو کپڑے جسم سے لگ چکے ہوں۔ ان کے ذریعے بڑی آسانی سے گندے عمل کیے جا سکتے ہیں۔''

یہ کہانی اب سے پانچ چھ برس پہلے کی ہے۔

کشور کے والدین مکان بیچ کر کہیں اور چلے گئے اور بزرگ کی دعاؤں کے طفیل کشور کی شادی ہوگئی۔ اس کے شوہر سے کوئی بات نہیں چھپائی گئی تھی۔ اس نے بھی یہی کہا تھا کہ اس میں بے چاری کشور کا کیا قصور ہے۔ اس کمینے کی حرکتوں کی سزا کشور کو کیوں دی جائے۔

اب وہ دو سالہ بچی کے ماں باپ ہیں۔ بہت پیاری بچی ہے۔ کشور اب بالکل نارمل ہو چکی ہے اور ہم سب کو ایک بہت بڑا سبق یہ ملا ہے کہ اس طرح کسی لڑکی کے کپڑے اٹھا کر کسی کو نہیں دیے جاتے۔

ہو سکتا ہے کہ بہت سے پڑھنے والوں کو اس بات پر یقین نہ ہو لیکن یہ ایسی حقیقت ہے جس کا کوئی سائنسی جواز پیش نہیں کیا جا سکتا۔

میں یہ کہانی اسی لیے تحریر کر رہی ہوں کہ اسے پڑھ کر اگر لڑکیاں محتاط ہو جائیں تو یہ ان کے لیے بہت اچھا ہوگا۔

پرچی والے بابا

محترمہ عذرا رسول صاحبہ!
السلام علیکم
ہمارے اردگرد کیسی کیسی ہستیاں، کیسے کیسے لوگ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مجھے بھی ایک ایسی برگزیدہ ہستی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ وہ کس کمال کی ہستی تھی، میری سرگزشت سے آپ کو بھی اندازہ ہو جائے گا۔ ایسی باکمال ہستی کے بارے میں پُراسراریت نمبر میں ضرور آنا چاہیے۔

نوید احسن
(لاہور)

میں کیا کوئی بھی ان کا نام نہیں جانتا تھا۔ ہم سب انہیں بڑے صاحب کہا کرتے تھے۔

میں کئی بار اپنی تحریروں میں بتا چکا ہوں کہ میں کرداروں کی تلاش میں رہتا تھا اور شاید اب بھی رہتا ہوں۔

ایسے کردار جن کے روپ بہت مختلف ہوتے ہیں۔

جو بڑے لوگ ہوتے ہیں یا جن کی کہانیاں بہت مختلف ہوتی ہیں۔ ایسے کردار مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں اور میں ان کا ہو کر رہ جاتا ہوں۔

بڑے صاحب بھی ایک ایسے ہی کردار تھے۔ نہ جانے کون تھے، کہاں سے آئے تھے۔ کسی کو ان کے بارے میں

www.digestpk.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پروفیسر مجنوں گورکھ پوری لکھتے ہیں کہ ”ہمارے علاقے میں ایک بابا جی رہتے تھے۔ لوگ انہیں صاحبِ کشف و کرامات تصور کرتے تھے۔ اکثر لوگ اپنی مرادیں لے کر ان کے پاس آتے۔ بابا جی کبھی منت سماجت سے انہیں لوٹا دیتے۔ کبھی جھنجلاہٹ میں گالیاں دینے لگتے لیکن عقیدت مندوں کی آمد و رفت میں کمی نہ آتی تھی۔ اس یورش سے بچنے کے لیے بابا جی کو اپنی کُٹیا کے دروازے بند رکھنے پڑتے تھے۔ ایک بار میں نے انہیں اپنے گاؤں کے بندیسری نامی شخص کا قصہ سنایا کہ ہر ماہ ایک بار اس پر موت جیسی غشی طاری ہوتی ہے۔ بابا جی نے کہا کہ اچھا! تم اس کے جاگنے پر ہی تلے ہوئے ہو تو آج رات میری جھونپڑی میں بسر کرو اور یہ وعدہ کرو کہ جو کچھ دیکھو گے اس سے نہ ڈرو گے اور نہ کسی سے اس کا ذکر کرو گے۔ میں نے وعدہ کیا اور پھر بابا جی کی کُٹیا میں رات گزارنے کا فیصلہ کیا۔ بابا جی نے پھر مجھ سے عہد لیا کہ جو کچھ دیکھو گے خاموش رہو گے۔ میں اور بابا جی کُٹیا میں تنہا تھے۔ انہوں نے چراغ گل کیا اور مجھے اپنی بغل میں لے کر بیٹھ گئے۔ میں یہ دیکھ کر دم بخود رہ گیا کہ بابا جی کے سارے جسم سے ایک روشنی نکل کر سامنے کی دیوار پر پڑنے لگی اور دیوار آئینہ کی طرح شفاف ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ ایک لطیف پیکر بہ صورت انسان سامنے والی دیوار پر نمودار ہوا اور بابا جی کا اشارہ پا کر کہنے لگا کہ میں ایک روح ہوں، میرا نام گوبند ہے، میں بچپن سے لکھ پتیا (بدنصیب عورت) کا پجاری تھا۔ شاید میری شادی لکھ پتیا کے ساتھ ہو جاتی مگر میں وہ وقت آنے سے پہلے مر گیا اور لکھ پتیا کی محبت کا سودا ساتھ لے گیا۔ اس واقعے کو پندرہ برس گزر چکے ہیں۔

کچھ نہیں معلوم تھا اور شام کو وہ کہاں چلے جایا کرتے یہ بھی کوئی نہیں جانتا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہم بے فکری کی زندگی گزار رہے تھے۔

ہمارا کام کیا تھا۔ ہوٹلوں میں بیٹھنا، لاابالی پن کی زندگی اور اس دوران کردار کی تلاش کرتے رہنا۔ ہم میں سے ہر ایک کی آنکھوں میں خواب بسے ہوئے تھے یہ اور بات ہے کہ کسی کو بھی ابھی تک خوابوں کی تعبیر نہ مل پائی ہو۔ بہر حال یہ ایک الگ داستان ہے۔ اس وقت میں بڑے صاحب کے بارے میں بتا رہا ہوں۔ ان کے چہرے پر بہت ہلکی سی ڈاڑھی تھی۔ عربی انداز کا جبہ پہنے رہتے تھے اور آنکھوں میں بلا کی کشش تھی۔

وہ کسی سے بات نہیں کرتے۔ ہوٹل میں آتے، چائے پیتے اور سر جھکائے بیٹھے رہتے۔ ہوٹل کے مالک کا نام اچھے بھائی تھا۔ اچھے اس کا لقب تھا یا نام یہ آج تک پتا نہیں چل سکا۔

وہ ایک بدمعاش قسم کا انسان تھا۔ بہت صحت مند، چاقو باز۔ پورے محلے میں اس کی دھاک تھی۔ اس لیے اس کے ہوٹل میں کبھی ہنگامہ وغیرہ نہیں ہوتا تھا۔

وہ مجھ پر اور میرے دوستوں پر بہت مہربان تھا۔ یہ اس کی شخصیت کا ایک اور پہلو تھا۔ وہ ہم سے کہا کرتا۔ ”دیکھو بھائی تم لوگ پڑھے لکھے نوجوان ہو اس طرح ہوٹلوں میں بیٹھ کر اپنا وقت برباد مت کیا کرو۔“

ہم نے یہ دیکھا تھا کہ جب وہ بڑے میاں ہوٹل میں آتے تھے تو اچھے ان کے سامنے باادب ہو جاتا تھا۔ اس نے شاید بڑے میاں سے کبھی چائے کے پیسے بھی نہیں لیے ہوں گے۔

ہم بھی یہ دیکھا کرتے کہ بڑے میاں اپنے وقت پر آتے ہیں۔ بہت دیر تک اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھے رہتے ہیں۔ یہاں یہ بھی بتا دوں کہ اچھے بھائی نے ان کے لیے ایک کرسی مخصوص کر رکھی تھی۔ وہ اس پر کسی اور کو بیٹھنے نہیں دیتے تھے۔

ایک دن میں نے اچھے بھائی سے پوچھا۔ ”اچھے بھائی، یہ بڑے صاحب کون ہیں؟“

”بہت پہنچے ہوئے آدمی ہیں۔“ اچھے بھائی نے بتایا۔ ”انہوں نے مجھے منع کر رکھا تھا کہ میں کسی کو ان کے بارے میں نہ بتاؤں لیکن آج تم کو بتا دیا ہے۔“

کوئی گیارہ برس ہوئے کہ لکھ پتیا کی شادی بندیسری کے ساتھ ہوگئی۔ میں اب مجبور تھا آخر وہ دن آیا کہ بندیسری بیمار پڑ گیا اور آخر کار مر گیا۔ میں بڑی التجاؤں اور منتوں کے بعد عالمِ ارواح میں اپنے سرگروہ سے اجازت لے کر بندیسری کے جسم میں داخل ہو گیا چنانچہ اب میں بندیسری کی صورت میں موجود ہوں۔ دنیا والے مجھے بندیسری سمجھتے ہیں لیکن میں اصل میں گوبند ہوں لیکن کبھی کبھی مجھے بندیسری کے قالب سے نکل کر عالمِ ارواح میں جانا پڑتا ہے اور اس غصب کردہ جسم کو ترک کرنا پڑتا ہے۔ لوگ اس وقت سمجھتے ہیں کہ بندیسری پر سکتے کا دورہ پڑ گیا ہے، یہ کہہ کر گوبند کی روح غائب ہوگئی، بابا جی پھر اپنی حقیقی اصل حالت میں آ گئے اور چراغ روشن کر کے کہنے لگے۔

”تم نے دیکھا کہ ایسے معاملات میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے اور نہ ہی تحقیق کے درپے ہونا چاہیے۔ آج اگر میں تم سے مجبور نہ ہو جاتا تو ہرگز اس معاملے میں مداخلت نہ کرتا لیکن کم سے کم اتنا سمجھ لو کہ میں ان معاملات کی روک تھام نہیں کر سکتا۔ یہ عالمِ ارواح کے راز ہیں اور اس عالم پر ہمارا بس نہیں چل سکتا۔ اتنا تو تمہیں اندازہ ہو گیا کہ موت کے بعد جو زندگی گزرتی ہے، وہ ماضی کے واقعات سے پابہ زنجیر ہوتی ہے۔ یعنی انسان مرنے کے بعد بھی ویسا ہی رہتا ہے جیسا حیاتِ ارضی میں تھا۔ جاؤ اور کوشش کرو کہ تمہاری یہاں کی زندگی خوشگوار گزرے۔“

اقتباس: عالم برزخ حصہ دوم
مرسلہ: نعمان صدیقی، فیصل آباد

”کیا مطلب! کس طرح پہنچے ہوئے ہیں۔“

”بس میاں، اللہ والے لوگ ہیں۔“ اچھے بھائی نے کہا۔ ”ان کا ایک اشارہ کافی ہوتا ہے۔ یہ سمجھ لو کہ یہ مجذوب ہیں لیکن سکون کی حالت میں ہیں۔“

اب مجھے بھی بڑے صاحب سے دلچسپی ہو چلی تھی۔ اچھے بھائی جیسا آدمی جب ان کے بارے میں ایسی بات کر رہا تھا تو کچھ نہ کچھ تو ضرور ہوگا۔

ایک دن میں نے اچھے بھائی کے ہوٹل میں ایک عجیب تماشا دیکھا۔ ایک عورت کرسی پر بیٹھی ہوئی روئے جا رہی تھی۔ اچھے بھائی اس کے سامنے کرسی پر بیٹھے اسے دلاسا دے رہے تھے۔ میں اتفاق سے اکیلا ہی تھا۔ یعنی میرے ساتھ میرے دوست نہیں آئے تھے۔ میں بھی ایک طرف بیٹھ کر یہ تماشا دیکھنے لگا۔

کچھ دیر بعد اچھے بھائی اس عورت کے پاس سے اٹھ کر میرے پاس آ گئے۔ ”مجھے افسوس ہوتا ہے یہ سب دیکھ کر۔ یہ پولیس والے اسی طرح بے گناہوں کو ستاتے ہیں۔“

”کیا بات ہوگئی اچھے بھائی؟“

”ارے بھائی یہ بے چاری غریب عورت ہے۔ پولیس والے اس کے بیٹے کو بے گناہ پکڑ کر لے گئے ہیں۔ رات سے تھانے میں بند ہے۔ یہ بے چاری اس لیے میرے پاس آئی ہے۔“

”تو آپ کچھ کریں۔“

”میں کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ اس علاقے کا جو تھانے دار ہے اس سے میرے تعلقات خراب چلے آ رہے ہیں۔ وہ الٹا کوئی اور کیس بنا دے گا بے چارے پر۔“

”تو پھر کیا سوچا ہے بے چاری کے لیے۔“

”کچھ نہیں۔ اب یہ معاملہ بڑے صاحب کے حوالے کر دوں گا۔ وہی سنبھال لیں گے۔“

”کیوں، بڑے صاحب کیا کر لیں گے؟“

”میاں، تم کو ان کے مقام کا اندازہ نہیں ہے۔ ان کی صرف ایک پرچی کام دکھا دے گی، صرف ایک پرچی۔“

”ان کی پرچی سے کیا ہوگا؟“

”یہی تو نہیں معلوم کہ وہ پرچی میں کیا لکھ کر دیتے ہیں۔“ اچھے بھائی نے بتایا۔ ”لیکن جس کو بھی انہوں نے پرچی لکھ دی ہے اس کا کام ہو گیا ہے۔“

اچھے بھائی نے بہت حیران کرنے والی بات بتائی تھی۔ بہر حال دیکھنا تھا کہ بڑے صاحب کی پرچی اس عورت کے کیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کام آتی ہے۔

بڑے صاحب کچھ دیر کے بعد اپنے وقت پر آئے اور اپنی مخصوص کرسی پر جا کر بیٹھ گئے۔

اچھے بھائی نے خود ان کے لیے چائے بنائی اور چائے کی پیالی سامنے رکھ کر ادب سے ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ میں یہ دیکھ رہا تھا کہ اچھے بھائی کیا کرتے ہیں اور بڑے صاحب کس طرح اس مسئلے کو حل کرتے ہیں۔

بڑے صاحب نے کچھ پوچھا۔ اچھے بھائی نے کچھ بتایا پھر اس عورت کی طرف اشارہ کیا۔ بڑے صاحب نے اپنی گردن ہلا دی۔ کچھ سوچتے رہے پھر اچھے بھائی سے کچھ کہا۔ اچھے بھائی لپک کر کاؤنٹر سے قلم اور کاغذ لے کر آ گئے تھے۔

بڑے صاحب نے اس کاغذ پر کچھ لکھ کر اسے کئی تہ میں بند کرتے ہوئے وہ کاغذ اچھے بھائی کو دے دیا۔ اس کے بعد اٹھ کر چلے گئے۔

ان کے جاتے ہی میں اچھے بھائی کے پاس پہنچ گیا۔

''کیا ہوا اچھے بھائی؟'' میں نے پوچھا۔

''اس عورت کا کام بن گیا ہے۔'' اچھے بھائی نے بتایا۔ ''بڑے صاحب نے تھانے والے کے نام پرچی لکھ کر دے دی ہے۔''

''کیا لکھا ہے پرچی میں۔''

''نہیں اس کی اجازت نہیں ہے۔'' اچھے بھائی نے کہا۔ ''بڑے صاحب کا سختی سے حکم ہے کہ ان کی لکھی ہوئی پرچی کو کبھی کھول کر نہ دیکھا جائے۔''

بہرحال اب مجھے یہ دیکھنا تھا کہ اس عورت کا مسئلہ کس طرح حل ہوتا ہے۔ اچھے میاں نے وہ پرچی اسے دے دی اور وہ پرچی لے کر دعائیں دیتی ہوئی ہوٹل سے چلی گئی تھی۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس ایک سادہ سی پرچی سے اس عورت کا مسئلہ کیسے حل ہو گا لیکن دوسرے دن اچھے بھائی نے یہ بتایا کہ پرچی ملتے ہی تھانے دار نے اس عورت کے بیٹے کو رہا کر دیا تھا تو میں حیران رہ گیا.....''اچھے بھائی یہ سب کیسے ہوا؟''

''بس میاں، اللہ والوں کے بھید اللہ ہی جانے۔'' اچھے بھائی نے کہا۔

مجھے بڑے صاحب کی صورت میں ایک زبردست کردار مل گیا تھا۔ ایک ایسا پُراسرار آدمی جس کی پُراسرار پرچی سے کام ہو جایا کرتے تھے۔

ایک دن وہ حسبِ معمول چائے پینے آئے تو میں ادب سے سلام کر کے ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے گہری نگاہوں سے میری طرف دیکھا پھر ان کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔

اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ پھر اپنی چائے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ چائے ختم کر کے وہ ہوٹل سے باہر نکلے اور میں ان کے پیچھے چل پڑا۔

اس بار انہوں نے پلٹ کر میری طرف دیکھا تھا پھر کچھ کہے بغیر اپنی رفتار تیز کر دی۔ یہ ایک عجیب تجربہ تھا میرے لیے، مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ چل نہیں رہے بلکہ تیر رہے ہوں۔ ان کی رفتار حیرت انگیز حد تک تیز تھی حالانکہ ان دنوں میں جوان تھا اور وہ ایک بوڑھے انسان تھے اس کے باوجود کچھ دیر بعد وہ نہ جانے کہاں سے کہاں نکل چکے تھے۔

دوسری شام میں نے جب اچھے بھائی کو یہ بتایا کہ میں نے ان کا تعاقب کرنے کی کوشش کی تھی تو اچھے بھائی بھڑک اٹھے۔ ''یہ تم نے کیا کیا۔ وہ تو خود کو چھپا کر رکھتے تھے۔ تم نے ان کا پیچھا کر کے اچھا نہیں کیا۔ اب دیکھ لینا وہ گئے۔ یہ سمجھو کہ ہمارے ہوٹل سے برکت ختم ہو گئی، اٹھ گئی۔''

''اچھے بھائی میں بہت شرمندہ ہوں۔''

''کیا فائدہ تمہاری شرمندگی سے۔'' اچھے بھائی نے کہا۔ ''کیونکہ اب وہ یہاں نہیں آئیں گے۔''

لیکن اچھے بھائی کا اندیشہ غلط ثابت ہوا تھا۔ بڑے صاحب ٹھیک وقت پر اسی طرح آئے تھے جس طرح پہلے آیا کرتے تھے۔ اس کا مطلب اچھے بھائی نے یہ بتایا کہ وہ ناراض نہیں ہوئے تھے۔

جب وہ چائے پینے لگے تو میں پھر ان کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس بار انہوں نے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا کہ میں بیٹھ جاؤں۔

میں ادب سے ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے دریافت کیا۔ ''کیا چاہتے ہو؟''

''کچھ نہیں حضرت، صرف آپ کی توجہ۔'' میں نے کہا۔

''کیا میری توجہ سے بات بن جائے گی۔''

''کیوں نہیں بنے گی۔'' میں نے کہا۔ ''آپ ہی لوگوں کی توجہ تو سب کچھ ہوتی ہے۔''

''مت مانگو مجھ سے توجہ ورنہ کہیں کے نہیں رہو گے۔''

مجھے بھی نہ جانے کیا خبط سوار ہو گیا تھا۔ اس لیے میں نے کہا۔ ''یہی تو چاہتا ہوں کہ کہیں کا نہ رہوں۔ صرف آپ کا

JASOOSI DIGEST
PUBLICATIONS
Convey Your Message to
Millions of Our Readers,
World Wide
Through
JASOOSI DIGEST SUSPENSE DIGEST MONTHLY PAKEEZA MONTHLY SARGUZASHT
63-C, PHASE II EXTN., D.H.A., MAIN KORANGI ROAD, KARACHI 75500-PAKISTAN.
PHONES : (92-21) 35802552-35804200-35895313 FAX : (92-21) 5802551
Email : jdpgroup@hotmail.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوجاؤں۔"

"اچھا..." ان کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہوگئی پھر انہوں نے ایک انگلی سے میرے سینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "بس اس کو سنبھالے رکھنا پھر دیکھنا کیا ہوتا ہے۔"

صرف اتنی سی بات تھی۔ انہوں نے اپنی انگلی سے میرے سینے کی طرف اشارہ ہی کیا تھا لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ میرا یہ حال ہوجائے گا۔

ایسا لگا جیسے دل میں اور سینے میں آگ سی لگ گئی ہو۔ پورا جسم گرمی سے پھنکنے لگا تھا۔ میں بُری طرح لرز رہا تھا اور پسینے میں بھیگ گیا تھا۔

ایسی کیفیت تھی کہ میں اسے الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا۔ وہ میرا یہ حال دیکھ کر مسکراتے ہوئے اٹھے اور ہوٹل سے باہر چلے گئے جب کہ میں کرسی سے نیچے گر کر بے ہوش ہوگیا تھا۔

خدا جانے کتنی دیر کے بعد ہوش آیا ہوگا۔ میرے گھر والے، میرے دوست اور اچھے بھائی میرے چاروں طرف جمع تھے۔

"کیا ہوا ہے تمہیں؟" میرے ابو نے پوچھا۔

"آگ، آگ، سینے میں آگ۔ پانی، پانی۔" میں اپنے سینے کو سہلاتے ہوئے بولا۔ "جل رہا ہوں میں۔" مجھے کئی گلاس پانی پلا دیا گیا لیکن آگ بڑھتی ہی جارہی تھی۔

"آخر اسے ہوا کیا ہے؟" ابو نے اچھے بھائی سے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ بڑے صاحب کی وجہ سے یہ سب ہوا ہے۔" اچھے بھائی نے کچھ سوچ کر بتایا۔

"کون بڑے صاحب؟"

اچھے بھائی نے مختصر الفاظ میں بڑے صاحب کا تعارف کروا دیا تھا۔ یہ سب سن کر ابو کا رنگ اتر گیا تھا۔

"میرے خدا، اس بے وقوف نے کیا کیا۔ ایسے لوگوں سے چھیڑ چھاڑ نہیں کرنی چاہیے۔ وہ رہتے کہاں ہیں؟"

"یہ کسی کو نہیں معلوم۔" اچھے بھائی نے بتایا۔ "وہ اپنے مخصوص وقت پر آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ اب اگر آئے تو کل شام تک آئیں گے۔"

"اور اس وقت تک اس کا نہ جانے کیا حشر ہو چکا... ہوگا۔"

"میرا خیال ہے کہ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ بڑے صاحب بے رحم نہیں ہیں۔" اچھے بھائی نے کہا۔ "انہوں نے شاید اسے کوئی سزا نہیں دی ہے بلکہ کسی طرح کی تربیت کا مرحلہ ہے۔"

"ہوسکتا ہے۔"

بہر حال مجھے کسی طرح گھر واپس لایا گیا۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ ایک طرف تو اس آگ کی شدت نے مجھے جھلسا کر رکھ دیا تھا دوسری طرف ایک انوکھی سی لذت بھی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک ناقابلِ بیان سی کیفیت تھی۔

ایک طرف تو یہ خواہش کہ یہ آگ بجھ جائے اور دوسری طرف یہ آرزو کہ نہیں، یہ اسی طرح لگی رہے۔ نہ جانے کس طرح میں نے وہ رات گزاری۔

دوسرا دن بھی ایسا ہی تھا۔ ابو کچھ پڑھ پڑھ کر دم بھی کرتے رہے تھے لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ بہر حال اسی شام کو اچھے بھائی ایک بوتل میں پانی لے کر آگئے۔ "یہ لو پانی پی جاؤ۔ بڑے صاحب نے دیا ہے۔"

میں اسی وقت وہ پانی پی گیا تھا اور ایسا محسوس ہوا جیسے اس آگ پر برف رکھ دی گئی ہو۔ مجھے سکون تو مل گیا تھا لیکن مجھ پر بڑے صاحب کی ہیبت طاری ہوگئی تھی۔

اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ کتنے پہنچے ہوئے اور کس پائے کے انسان ہیں۔ وہ ان میں سے تھے جن کی نگاہیں تقدیر بدل دیتی ہیں۔

دوسری شام میں پھر اچھے بھائی کے ہوٹل پہنچ گیا۔ اچھے بھائی مجھے دیکھتے ہی ہنس پڑے۔ "ہاں میاں اب کیا حال ہے تمہارا کیا ابھی بھی بڑے صاحب سے کوئی بات کرنی رہ گئی ہے۔"

"نہیں اچھے بھائی، مجھ میں اتنی قوتِ برداشت ہی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "میں ایک کمزور سا بندہ ہوں۔"

"تو پھر اب کیا ارادے ہیں؟"

"میں بڑے صاحب کے دامن سے تو چمٹا ہوا رہنا..... چاہتا ہوں لیکن ان سے یہی کہوں گا کہ مجھے کسی آزمائش میں نہ ڈالیں، ہلکی پھلکی توجہ کرتے رہیں تو بہت اچھا ہو۔"

پھر جب بڑے صاحب ہوٹل میں اپنے وقت پر تشریف لائے تو میں ان کے سامنے جا کر کھڑا ہوگیا۔ بڑے صاحب مجھ سے ناراض نہیں تھے بلکہ مجھے دیکھ کر ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوگئی تھی اور اس سے پہلے کہ میں ان سے کچھ کہہ سکتا انہوں نے خود ہی کہنا شروع کر دیا۔ "میری بات سنو، اس راستے میں ہلکی پھلکی کوئی چیز نہیں ہوتی یا تو پوری

طرح اس راستے پر چلنے لگو یا پھر بالکل الگ ہوجاؤ۔"

"حضرت میں ایک کمزور انسان ہوں۔" میں نے کہا۔

"مجھ میں اتنی ہمت ہی نہیں ہے میں تو بس آپ کی ایسی توجہ چاہتا ہوں کہ میری پریشانیاں ختم ہوتی رہیں۔"

لیکن انہوں نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اپنی چائے کی طرف متوجہ ہوگئے۔ میں نہ جانے کیا کیا بولتا رہا تھا لیکن وہ بالکل خاموش تھے۔

اسی وقت اچھے بھائی نے آکر میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "بس میاں زیادہ حجت مت کرو خاموش ہوجاؤ۔ ورنہ یہ ناراض ہوجائیں گے۔"

میں ان کی ناراضی کے خوف سے خاموش ہوگیا تھا۔

لیکن وہ مجھ سے ناراض نہیں تھے بلکہ مسکرا مسکرا کر میری طرف دیکھتے رہے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ کوئی بات نہیں کر رہے تھے لیکن ان کے انداز سے ناراضی کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

ایک بار پھر ایک مسئلہ ہمارے سامنے آگیا تھا۔

یہ مسئلہ ہماری پوری ٹیم کے لیے تھا۔ ہمارے محلے میں ایک زیدی صاحب ہوا کرتے تھے۔ وہ ایک عجیب انداز کے آدمی تھے۔ انہیں بلاوجہ جھگڑا مول لینے کا شوق تھا اور فوراً اس پر مقدمہ کردیا کرتے۔

وہ ایک ریٹائر پولیس آفیسر تھے۔ ریٹائرمنٹ کے باوجود ان کے مزاج کی بدمعاشی ابھی تک برقرار تھی۔ چونکہ پولیس والوں سے ان کی بہت جان پہچان تھی اسی لیے پورے محلے پر دھونس جمایا کرتے۔ محلے والے ان سے عاجز آچکے تھے۔

انہوں نے کسی بات پر میرے ابو پر ایک کیس کر رکھا تھا۔ یہ کیس بہت دنوں سے چلا آرہا تھا اور یہ خیال کیا جارہا تھا کہ اس بے بنیاد کیس کا فیصلہ زیدی صاحب کے حق میں ہو جائے گا کیونکہ جس مجسٹریٹ کے پاس یہ کیس تھا وہ زیدی صاحب کا سگا بھانجا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب میاں بھئے کوتوال تو ڈر کاہے کا۔

بے چارے ابو بہت پریشان تھے کیونکہ انہیں پتا چل گیا تھا کہ فیصلہ ان کے خلاف آنے والا ہے۔ مجھ سے ابو کی ایسی حالت دیکھی نہیں جارہی تھی۔ اسی لیے میں بڑے صاحب کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہوگیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا بھی کہ میں سامنے والی کرسی پر بیٹھ جاؤں لیکن میں کھڑا ہی رہا۔

میں نے ان سے کچھ نہیں کہا تھا کہ میرے ساتھ کیا

ہالۂ نور

1967ء میں ماسکو اور لینن گراڈ (پیٹرزبرگ) کے درمیان "ٹیلی پیتھی" کا کامیاب تجربہ کیا گیا۔ اس تجربے میں فنِ خلانوردی کے جدید ترین آلات استعمال کیے گئے اور کمپیوٹرز کی مدد سے پیغام بھیجنے والے اور پیغام وصول کرنے والے کی دماغی لہروں کو ریکارڈ کیا گیا۔ روسی سائنس دانوں کا بیان ہے کہ مشین کی مدد سے ٹیلی پیتھی کے ذریعے بھیجنے والے اشارات کو Decode کیا گیا اور چار سو میل کے فاصلے (ماسکو سے لینن گراڈ تک) پر ذہن کا ذہن سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اسی کے ساتھ روس کے فنی رسالوں (ٹیکنیکل میگزینز) اور روسی یونیورسٹیوں نے کمپیوٹرائزڈ ٹیلی پیتھی سے کہیں زیادہ حیرت انگیز حقیقت کا انکشاف کیا، یہ کہ انسانی جسم کے گرد ایک "ہالۂ نور" پایا جاتا ہے۔ انہوں نے انسان کے ہالۂ نور کی رنگین و روشن تصاویر شائع کیں۔ کیا یہی وہ دائرہ روشن (AURA) ہے جس کا تذکرہ بار بار پُراسرار علوم کی کتابوں میں کیا گیا ہے۔ انسانی جسم سے برقی لہریں سی نکلتی ہیں۔ نہایت تیز، کبھی کبھی ان کا رنگ نارنجی اور نیلا ہوتا ہے۔ روسی سائنس دانوں کے اس انکشاف نے سائنسی دنیا کو غرق حیرت کردیا ہے۔

اقتباس Aura By Nil O Thompson:

مرسلہ: روبی جوکھیو، حیدرآباد

پرابلم ہے لیکن کمال ہے کہ انہوں نے اشارے سے قلم کاغذ لانے کے لیے کہا۔ میں جلدی سے اچھے بھائی سے قلم اور کاغذ لے کر ان کے پاس پہنچ گیا۔ انہوں نے اس پر کچھ لکھا اور تہ کر کے میرے حوالے کرتے ہوئے بولے۔ "بس یہ آخری ہے۔ اس کے بعد سب ختم، سب ختم۔"

"حضرت اس پرچی کا کیا کرنا ہے؟" میں نے ادب سے پوچھا۔

"صاحب انصاف کے حوالے کر۔"

واضح اشارہ تھا کہ یہ پرچی مجسٹریٹ کو دے دوں۔ پرچی دینے کے بعد وہ کھڑے ہوئے اور سب ختم سب ختم کی گردان کرتے ہوئے ہوٹل سے باہر چلے گئے۔

میں نے بڑے صاحب سے پرچی لے لی تھی لیکن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہی سوال میرے سامنے آ کھڑا ہوا تھا کہ آخر اس پرچی میں بڑے صاحب نے ایسی کون سی بات لکھ دی ہوگی کہ مجسٹریٹ اسے دیکھ کر ابو پر مہربان ہو جائے گا۔

راستے میں نہ جانے میرے دل میں کیا آئی کہ میں نے وہ پرچی کھول کر دیکھ لی۔ آپ اسے میری حماقت کہیں یا تجسس کہہ لیں بہر حال میں نے وہ پرچی کھول کر دیکھ لی تھی اور اس پر کچھ نہیں لکھا ہوا تھا جی ہاں وہ کاغذ بالکل سادہ تھا۔

اس پر ایک جملہ، ایک حرف بھی نہیں تھا۔ میں اس سادہ کاغذ کو دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔ بڑے صاحب نے ایسا کیوں کیا تھا۔

اگر مجسٹریٹ کے پاس یہ سادہ کاغذ پہنچ جاتا تو پھر اس کا کیا رویہ ہوتا۔ ممکن تھا کہ وہ ابو کے خلاف کوئی سخت ایکشن لے لیتا۔ کیونکہ اس قسم کا مذاق تو توہینِ عدالت کے زمرے میں آتا ہے۔

میں نے گھر جا کر بھی ابو سے اس پرچی کا ذکر نہیں کیا۔ ورنہ وہ میرا مذاق اڑانے لگتے اور نتیجہ یہ ہوا کہ ابو دوسرے دن وہ مقدمہ ہار گئے۔

مقدمہ ہار جانے کے بعد جو کچھ پریشانیاں ہوئیں وہ ایک الگ داستان ہے۔ اصل بات یہ ہوئی کہ بڑے صاحب غائب ہو گئے تھے۔ وہ پھر مجھے دکھائی نہیں دیے۔

اچھے بھائی بار بار مجھ سے یہ کہتے تھے۔ ''میاں یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ وہ تم سے ناراض ہو کر غائب ہوئے ہیں۔''

لیکن میں نے ان کے غائب ہونے کا مطلب یہ نکالا تھا کہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ مجسٹریٹ کے خلاف وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے، چاہے وہ کچھ بھی لکھ کر دے دیں۔ اس لیے وہ غائب ہو گئے تھے کہ انہیں شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔

بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ کسی کو سادہ پرچی دے دی جائے اور وہ کام بھی کر دے۔

بہر حال بڑے صاحب دوبارہ پھر دکھائی نہیں دیے۔

بہت دنوں کے بعد میں نے اسی عورت کو دیکھا جو میرے سامنے بڑے صاحب سے پرچی لے کر گئی تھی۔ وہ اسٹاپ پر اکیلی ہی کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے اس کے پاس جا کر اسے سلام کیا۔

وہ مجھے پہچان نہیں سکی تھی۔ ''کون ہو بیٹا؟'' اس نے پوچھا۔

''اماں آپ کو یاد ہوگا آپ ایک بار بڑے صاحب سے اپنے بیٹے کے لیے پرچی لے کر گئی تھیں۔''

''ہاں بیٹا اچھی طرح یاد ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''میرا بیٹا ایک ظالم تھانے دار کے چنگل میں پھنس گیا تھا۔''

''کیا آپ کو یقین ہے کہ بڑے صاحب کی پرچی کی وجہ سے اس نے بیٹے کو چھوڑا ہوگا۔''

''ہاں بیٹا سو فیصد یقین ہے۔'' اس نے کہا ''حالانکہ وہ پرچی بالکل سادہ تھی۔ اس پر کچھ بھی نہیں لکھا ہوا تھا۔''

''کیا!'' مجھے یہ سن کر ایک شاک سا لگا تھا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔''

ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ میرے میاں نے وہ پرچی کھول کر دیکھ لی تھی۔ اس پر کچھ بھی نہیں لکھا تھا۔ وہ تو بہت منع کر رہے تھے لیکن میرا عقیدہ ایسا تھا کہ میں نے وہ سادہ پرچی ہی لے جا کر تھانے دار کو دے دی۔''

''اور..... اور تھانے دار کو کیا ہوا تھا۔'' میں نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔

''کیا بتاؤں اس کا کیا حال ہوا تھا۔ اس کے تو پورے بدن پر لرزہ سا طاری ہو گیا تھا۔ پھر اس نے ایک لفظ بھی کہے بغیر حکم دیا کہ میرے بابر کو چھوڑ دیا جائے اور میں بابر کو لے کر گھر آ گئی۔''

اس عورت نے شاید کچھ اور بھی بتایا ہوگا لیکن اب میں کچھ سننے کے قابل ہی کہاں رہا تھا۔ میں نے تو ان پر شک کر کے اپنے پیروں پر خود کلہاڑی ماری تھی۔ اس پرچی کو کھول کر دیکھ لیا تھا۔

اگر وہی سادہ پرچی ابو مجسٹریٹ کو لے جا کر دے دیتے تو شاید آج مقدمے کا فیصلہ ان کے حق میں ہوتا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا، کچھ بھی نہیں۔

اب تو اس بات کو بہت دن گزر چکے ہیں۔ پرچی والے بڑے صاحب پھر کبھی دکھائی نہیں دیے۔ اچھے بھائی کا ہوٹل اُجڑ گیا۔ اب وہاں بسیں آ کر کھڑی رہتی ہیں اور وہاں کا مانوس لیکن اداس ماحول یہ احساس دلاتا رہتا ہے کہ مت سہل ہمیں جانو..... پھرتا ہے فلک برسوں۔

نہ جانے کیسے کیسے لوگ کہاں بیٹھے ہوئے ہوں گے اور ہم جیسے نہ جانے کتنے ہوں گے جو یہ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ بڑے صاحب تو فراڈ معلوم ہوتے ہیں۔

اور جب ہمیں ان کی اصلیت کا علم ہوتا ہے تو اس وقت بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے اور وہ پھر نظر نہیں آتے۔ نہ جانے ایسے لوگ کہاں سے آتے ہیں اور کس طرف چلے جاتے ہیں۔